DUE DATE

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.

درس

ادارہ ارشاد

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء — فون نمبر (۳۵۲۰۹)

جلد (۲۷) شمارہ (۱) — جنوری — ۱۹۶۴ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

نگران۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی

مجلسِ مشاورت:۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ نصیر الدین ہاشمی
رمن راج سکسینہ۔ منظور احمد۔ وقار خلیل

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

زرِ سالانہ ہندوپاک سے ۶ روپے
ششماہی ۳ "
بیرونِ ممالک سے ۱۰ "
ماہانہ فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

مہتمم ادارہ ادبیاتِ اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوانِ اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

گذشتہ تین مہینوں کا مشترکہ شمارہ سب رس (نومبر) ۴۰۰ صفحات کی ضخامت کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا گیا تھا۔ اس کی تیاری میں غیر معمولی وقت اور محنت صرف ہوئی۔ اس کی ترسیل اور مراسلت ابھی جاری ہے۔ اسی وجہ سے جنوری کا شمارہ کچھ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ ہماری دیرینہ روایت کے مطابق اس کو جنوری کے پہلے ہفتہ میں شائع ہونا چاہیئے۔ امید ہے کہ ان خاص حالات میں ناظرین کرام اس تاخیر کو بنظر معافی دیکھیں گے۔

ڈسمبر کے آخری اور جنوری کے پہلے عشرے میں حیدرآباد میں دو بڑی علمی اور تاریخی محفلیں منعقد ہوئیں ایک تاریخی سمینار اور دوسرے یوم محمد قلی۔ ادارہ معلومات ایشیائی کے زیر اہتمام جو حیدرآباد کا پرانا ادارہ ہے جامعہ عثمانیہ میں ایک تاریخی سمینار ترتیب دیا گیا تھا جس میں حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے اکثر علما جن کو تاریخ دکن اور تمدن سے گہری دلچسپی ہے شریک ہوئے۔ یہ سمینار ۲۲ ڈسمبر سے ۲۴ ڈسمبر تک منعقد ہوا اور صبح و شام اس کے اجلاس ہوئے اور مختلف عنوانات پر تقریباً پچاس مقالات پڑھے گئے جو تاریخ و تمدن دکن پر مشتمل تھے اور ان پر کافی بحث ہوئی۔ ہر مقالہ کافی دلچسپ اور پر از معلومات تھا۔ بحث سے پہلے تمام مقالات ٹائپ شدہ صورت میں تمام شرکاء سمینار کو دیئے گئے تھے تاکہ وہ پہلے تیار ہو کر بحث میں حصہ لے سکیں۔ اس طریقے سے بحث کے لئے کافی مواقع فراہم ہو گئے اور تاریخ دکن اور تمدن پر وسیع مواد فراہم ہو گیا۔ جناب پی۔ وی۔ جی راجو وزیر تعلیم آندھرا پردیش اور ڈی ایس ریڈی صاحب وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ نے اس سمینار کی سرپرستی کی اور اپنی ضیافتوں سے شرکاء سمینار کو محظوظ کیا۔ اول الذکر یعنی راجو صاحب وزیر تعلیم اس کے افتتاحی جلسہ میں [illegible]

۱۱ جنوری سے ادارۂ ادبیات کی جانب سے یوم محمد قلی منعقد ہوا۔ یہ ادارے کی روایتی تقریب ہے جو ادارے کی جانب سے منائی جاتی ہے اور اس کا مقصد تاریخی حقائق کو واشگاف کرنا اور اس کی روشنی میں مستقبل کی تعمیر کرنا ہے۔ ۱۱ سے ۱۳ جنوری تک اس کے چار اجلاس ہوئے۔ پہلا اجلاس ۱۱ کو محمد قلی قطب شاہ کے گنبد میں منعقد ہوا جس کو جناب پی رام کرشنا راؤ صاحب سابق گورنر اتر پردیش نے اپنی عالمانہ تقریر کے ساتھ افتتاح فرمایا اور اس کے بعد پر لطف نظمیں اور مقالے پڑھے گئے۔ شاہی مزار پر چادر گل چڑھانے کے بعد آتشبازی کا مظاہرہ اور قوالی ہوئی۔ جس سے حاضرین لطف اندوز ہوئے۔ غیر معمولی فاصلے کے باوجود کئی ہزار آدمی اس جلسے میں شریک ہوئے۔

۱۲ جنوری کو ایوان اردو میں ادبی محفل منعقد ہوئی اس کی صدارت جناب مسعود حسین خاں صاحب صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے کی۔ اس میں کئی تقریریں ہوئیں اور نظمیں پڑھی گئیں۔ لیکن اس ادبی محفل کے انعقاد سے پہلے ادارے کے صدر جناب پروفیسر علی اکبر صاحب نے ایوان کے بالائی حصے میں تاریخی نمائش کا افتتاح کیا۔ اس میں قطب شاہی اور آصفجاہی دور کے نوادر سلیقے کے ساتھ جمع کئے گئے تھے۔ بے شمار لوگوں نے اس نمائش کا معائنہ کیا۔ اور معلومات حاصل کئے۔ اسی شام کو نواب عنایت جنگ بہادر کی صدارت میں محفل شعر منعقد ہوئی جس میں ملک کے چند ممتاز اور جواں سال شعرا نے اپنا کلام سنایا اور یہ خوش گوار محفل تقریباً ۱۲ بجے شب کو برخواست ہوئی۔

۱۳ کی شام کو تلنگی اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت شری ڈی راماراج راؤ معتمد آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی نے کی اور ملک کے جواں سال اہل علم نے تلنگی میں تقریریں کیں اور تلنگی ادب کے ارتقا پر روشنی ڈالی جو قطب شاہی دور میں پیدا ہوا تھا۔ اس تقریب کے لئے ملک کے مشاہیر مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر بی گوپال ریڈی، ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور اور خواجہ احمد فاروقی نے پیامات ارسال کئے تھے۔ ادارے کی یہ تجویز ہے کہ اس تمام مواد کو ایک ارمغان یوم قلی کی صورت میں شائع کیا جائے۔ اس تمام تقریب یعنی افتتاحی اجلاس اور تمام اجلاسوں کی تمام کارروائی آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر کی گئی۔

سخاوت مرزا

میر معین علی شاہ تجلّی حیدر آبادی

شاہ معین تجلی، حیدر آباد دکن کے مشہور و معروف خطاط، صوفی، اور عالم تھے۔ آپ کا مختصر شجرۂ نسب یہ ہے :—

شاہ معین علی تجلی ابن شاہ نورالدین قلندر، از اولاد جبار بیگ قطب شاہی، و از خاندان ترکمانان سایم خانی۔ قوم مغل ترکمان، سپاہ پیشہ۔

جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے اجداد ترکستان سے بزمانہ سلاطین قطب شاہی، گولکنڈہ آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

میر معین الدین علی تجلی کا ذکر مرأت سکندری[1] اور ماہ نامہ مولفہ غلام حسین جوہر بیدری میں موجود ہے، جو درج ذیل ہے :—

"میر معین الدین علی تجلی از اولاد جبار بیگ قطب شاہی، وسلسلہ دودمانش ترکمانان سایم خانی منتہی میشود، و در ریعان شباب قطع نظر از تعلقات دنیوی نمودہ منزوی گشت و خط بہ طرز ملا شفیعائی بروے می نوشت کہ در عہد خود بے نظیر و عدیل نداشت، خوش نویسان آں عصر اصلاح خط شفیعا استفادہا بر میداشتند از بسکہ مزاج شریفش مایل بہ تصوف بود، طریقۂ بیعت و مریدی جاری داشت، مرد سخی طبع و صاحب ہمت، قلندر روش، درویش منش بود انچہ دست بہمش بآں می رسید بسفرۂ اخلاص نہادہ ضیافت احبا می نمود، در سنہ ماتین بعد الف محفل آرائے بزم جنت گردید۔"

مولوی غلام حسین جوہر بیدری، معاصر ماہ لقا بائی چندا و رکن ادارۂ تصنیف و تالیف نواب شمس الامراء آپ کا اس طرح تعارف کراتے ہیں :—

"شاہ معین[2] علی تجلی از قوم مغل ترکمان است، بہ لباس فقر مخلع می بود، در خوشنویسی ممتاز، خصوص در خوشنویسی طرز آغا شفیعا نظیرے نداشت، خطش بر زلف عروساں خط نسخ می کشید، اکثر شفیعہ نویساں مثل شاہ تجلی و ہدایت علی شاہ، برادر عبدالغنی از شاہ مذکور مستفید اصلاحش بودند، در خلق مروت و عجز و انکسار از جملۂ ابرار بود و در سالہ بقا شتافت، فرزندانش بدرجۂ کمال رسیدند۔"

---

[1] مرأت سکندری مخطوطہ کتب خانہ ابو محمد عمر الیافعی مرحوم۔ مولفہ سلطان نواز خاں تالیف ۱۲۴۰ھ۔

[2] تاریخ ماہ نامہ معنون بہ مہ لقا بائی چندا۔ قلمی کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن۔

شجرۂ طریقت :۔ شاہ معین علی تجلی ابن شاہ نور الدین قلندر خلیفہ حضرت شہید عشق توحید، کو خواجہ عارف گنج بخش چشتی سے اُن کو شاہ بابا حسینی پسر و خلیفہ شاہ امین الدین اعلیٰ چشتی ابن شاہ برہان الدین بیجاپوری ابن حضرت میراں جی شمس العشاق بیجاپوری قدس سرہٗ ۔ نیز آپ نے شاہ تراب چشتی سے بھی فیض حاصل کیا، اور ایک اور بزرگ سید شاہ یداللہ حسینی از اولاد خواجہ سید محمد گیسو دراز سے بھی۔

منقبت امام حسینؑ :۔ رباعی ؎

چوں رشتۂ تسبیح بجمعیت تام — فرسودہ بخاک کربلا چشم دوام
صد سال بہ دل سیر خفی کرد معین — تا دید سر خویش در آغوش امام

آپ کے عقاید :۔ رباعی ؎

آں عقل کل ازل رسول سبحاں — شد گرہ خاک از وجودش تاباں
بعد رسہ خلیفہ شد علیؑ جائے نشیں — چوں بعد موالید ظہور انساں

معطل اند بجز علم صدق و عدل و حیا — معین ز لولائی لہلک عمر بشناس

اے ختم رسل قرب تو معلوم شد

مولانا جامی کی رباعی کا مشہور مصرع ع "دیر آمدۂ زراہ دور آمدۂ" جس کی طرح میں شاہ صاحب کی رباعی درج ذیل ہے :—

در ہستی واجب چو قدیر آمدۂ — بر عالم ممکنات امیر آمدۂ
اے ختم رسل پیش تو اینہا منسوخ — ناسخ بودی ازاں اخیر آمدۂ

معنائے اسم معین :۔ در شاہ بہ ہم محمدؐ معین ام

بہ یار رساں ضد جنوبی — بہ قلب قلب از تصحیف قلبی

کسی معتقد غالباً تمنا اورنگ آبادی نے شاہ صاحب کی منقبت کہی تھی دو شعر یہ ہیں ؎

قبلۂ ارباب عرفاں کعبۂ اہل یقیں — قدوۂ دوراں جناب حضرت شاہ معیں
ہے وہ عاشق اور علیؑ معشوق اسکے رمز کو — کوئی کیا سمجھے نہ سمجھیں گے کراماً کاتبیں

بعض معاصرین :۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے جنوبی ہند کی بھی سیر کی ہے۔ قطب الدین شیرازی شہاب الدین فلاحی، سید قطب الدین شیرازی ۔ نواب خلیل خاں ۔ مبارز علی خاں

۱؎ فتوح المعین قلمی ۔

تاریخ ورود نیلور کہی ؎

قطب دیں سید عالی نسب حق آگاہ　　　داد تشریف بہ نیلور بہ تمکیں آمد

نیلور (مدراس) صوفیائے کرام اور علمائے عظام کا مرکز رہا ہے۔ مولانا بدر عالم و جام عالم وغیرہ بڑے مشہور کامل صوفی اور عالم تھے۔

شاہ معین تجلی، حیدرآباد میں خصوصاً خطاطی کے گویا جگت استاد تھے، جن میں مشہور مورخ و شاعر شاہ تجلی علی، مؤلف تزک آصفیہ، معاصر و درباری نواب ارسطو جاہ وزیر حیدرآباد اور محمد علی خاں شوق اورنگ آبادی۔ منعم خاں ہمدانی اورنگ آبادی مؤلف سوانح دکن وغیرہ اکابر حیدرآباد آپ کے مرید و معتقد اور شاگرد تھے۔ آپ نے ایک جدید خط الموسوم بہ خط معینا ایجاد کیا تھا۔ آپ کی سکونت محلہ پنجہ شاہ حیدرآباد میں تھی۔ ۱۱۹۹ھ میں وفات پائی۔ چنانچہ آپ کے مرید صادق محمد علی خاں شوق اورنگ آبادی مصنف چہار درویش اردو نے قطعہ تاریخ وفات کہا تھا جو یہ ہے۔ عنوان "قطعہ وفات شاہ معین تجلی": ؎

جناب معین و معلی جناب　　　کہ تھا نسخۂ فخر کا انتخاب
ریاضت کے گلشن کا وہ تازہ گل　　　حقیقت کا و معرفت کا وہ دل
تھا وابستہ اشغال سے اس کا دم　　　ذوالفقر فخری پہ ثابت قدم
تعلق سے دنیا کے آزاد تھا　　　مگر صاحب آل و اولاد تھا
عجب خوشنویسی سے ماہر تھی ذات　　　کہ محکوم تھے جسکے خط آٹھ سات
چو راہی شد آں رہبر راہ بہشت　　　بہ گلزار خوبی ز دنیائے زشت
خرد دانہ سال تاریخ او　　　چو در مزرعہ سینۂ شوق کشت

بدیہ بگفتم ایں سال وفات
ہویدا محمد معیں در بہشت

۱۱ھ ۹۹

آپ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے، شوق کے قطعے سے ۱۱۹۹ھ برآمد ہوتے ہیں اور مؤلف مرات سکندر (تاریخ سکندر جاہ) نے ۱۲۰۰ھ لکھا ہے، اور ماہ نامہ مولفہ غلام حسین جوہر میں تاریخ وفات مبہم ہے یعنی ۱۱ھ اس سے مراد ۱۲۱۱ھ تو نہیں، یا کچھ اعداد ۱۱ھ کے بعد ۹۹ کے عدد متروک ہو گئے ہیں۔

مخطوطہ دیوان شاہ معین تجلی:- یہ مخطوطہ ایک بیاض کی صورت میں ہے جو کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر میں محفوظ ہے، جو شاہ صاحب کے فارسی اور اردو کلام پر مشتمل ہے جس میں ۲۰ غزلیں ۱۷ رباعیات، نیز بعض مخمس اور مسدس بھی ہیں۔ دیوان کا عنوان اور مطلع یہ ہے: —

ہو العلی الاعلیٰ، مطلع دیوان حضرت شاہ معین الدین تجلی مدظلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از ہویت کن فکاں حق خواند بر اعیان ما   نور میم احمدی گل کرد در بستان ما
دست قدرت ساخت جلدش از پر سبوحیاں   نقطۂ عین است روشن مصحف دیوان ما
معنی ام الکتاب از ہفت جوہر خواندہ ایم   قاب قوسین است جامع حضرت انسان ما
ہر سخن از وصف لعل او بدخشاں در بغل   اے معیں بر قطبیت زاں رو بود امکان ما

در دوئی بہ رخ خویش بستن است اینجا   خدا رسی ہمہ با خود رسیدن است اینجا
چو شمع باش اگر ذوق خسروی داری   کہ تاج زر بسر از سر گذشتن است اینجا
بہار عیش چو گل از خزاں ہم آغوش است   حنا ز خون جگر دست بستن است اینجا
ز رنگ و صوت بود خلوت خفی بیرون   چہ جائے دیدن و گوش شنیدن است اینجا

معین ز بیخودی خویش لامکاں سیرم
چہ جستجوئے ما و او مسکن است اینجا

ما جوہر بسیط محیط خلائق ایم   باشد بچشم اہل بصر اعتبار ما

(رباعی)

جب دل میں خدا ادراک و بہا دیکھا   آئینے میں معین آپکو جانا دیکھا
چاہا کہ حباب اپنی حقیقت پاوے   کھولا جو نظر آپ کو دریا دیکھا

مخمس مدحت خواجۂ بندہ نواز گلبرگوی قدس سرہٗ (٥ بند) :—

اس بہار نوجوانی میں اسیر رنج ہوں   دور کر میرے سیں اے شہباز یہ غم کا قفس
مجھ پو اب کر دیجئے عنایت ہوں تیرا امیدوار   ہے میرا فریاد تجھ سے اے مرے فریاد رس
ملکہ میرا تیری طرف آئے آفتاب دیں پناہ   مصطفیٰ ہو و مرتضیٰ کے واسطے کر یک نگاہ

ہفت بند مدح حضرت خواجہ بندہ نواز قدس سرہٗ :—

(١) فیض میں تیرے ہے آثار چراغ دہلوی   تجھ میں سب دستے ہیں اطوار چراغ دہلوی
حضرت راجو ولی حق کے تم فرزند ہو   جانشین صدر دربار چراغ دہلوی

(۴) میری مجبوری کی بیتابی سے تم آگاہ ہو — کر ترحم مجھ پہ اے یار چراغ دہلوی
تم عنایت کے چراغ اور میں ہوں ظلمت میں اسیر — رو نما ہے تم میں اظہار چراغ دہلوی

اے امیر صدر دیں اے شمس وحدت کے چراغ — واحدیت کا ظہور خاص ہے تجھ میں دوام
ہے تمہارے جسم کا تخمیر الوہیت کے ساتھ — تجھ میں اور حق میں ہے قربت جیسے معنی اور کلام
ہے ربوبیت تمام افعل اسمائے الٰہ — پرورش عالم کی جس معنی میں رکھتا ہے قیام
تجھ میں ظاہر ہے حقیقت حق کی تو ہے عین حق — تیرے ہیں مربوب جگ میں تجھ سے کئی بندہ غلام

اے امام دیں معین کے عاجزی کا حال دیکھ — اب ترحم سے کرم کر مضطرب احوال دیکھ

من تصنیف ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۱۹۳ھ

غزل

پیا بدر الدجیٰ کا مجھ طرف اے ماہ آتے ہیں — شعاع نور سے پرتو فروز راہ آتے ہیں
ارے اے ہوش کر تعظیم یاں پی کی حضوری تجھ — کہ شب تاریک میں روشن جمال اللہ آتے ہیں
خودی کی ساری نکہت کو نکال اے دل کے سندر تجھ — صفا کی چاندنی کر فرش صاحب جاہ آتے ہیں
رکوع بندگی میں یک طرف قدوسیاں قائم — صف سبوحیاں ہمرہ شہود آگاہ آتے ہیں
عجب ہیں ہوئے دانائی اگر آئینہ بینا — مرے اس خانۂ دل میں علی سے شاہ آتے ہیں

معین اس شوخ چنچل کا کچھو ڑو حشر تک دامن
کہ بعد از انتظار ہائے سال و ماہ آتے ہیں

ہے نظر سے قریب کیا دیکھوں — کچھ یہاں احتمال ہی نہیں ہے

شاہ تجلی کی دوسری تصنیف :—

کلام المعین اردو، شرح دوایر جام جہاں نما۔

مع نقشہ جات دوایر، ۳۶ صفحات سطر ۱۲

تصنیف : سنہ ۱۰۴۳ھ ۔ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے، دراصل اس کا سنہ تصنیف ۱۲۰۳ھ ہے جو غدر سے ۵۴ سال قبل کی تالیف ہے۔

شاہ معین علی تجلی :— ابن شاہ نور الدین قلندر، مرید و خلیفہ حضرت شہید عشق توحید ۔ مرید و خلیفہ خواجہ عارف گنج بخش چشتی

مرید و خلیفہ خواجہ من عرف گنج بخش چشتی۔ مرید و خلیفہ شاہ باباحسینی ۔ مرید و خلیفہ معشوق ربانی شاہ امین الدین علی چشتی (بیجاپوری المتوفی ۱۰۸۶ھ) ۔۔ (ساکن بیچہ شاہ حیدرآباد دکن، خطاط اور صوفی موجد خط طرز معینا) تربیت یافتہ حضرت گنج الاسرار شاہ تراب چشتی خلیفہ حضرت پیر بادشاہ جانشین حضرت امین الدین علی قدس سرہٗ ۔۔

استاد تجلی علی شاہ حیدرآبادی، مؤلف تزکِ آصفیہ ۔ معاصر ارسطو جاہ وزیر حیدرآباد دکن ۔

نمونہ : ۔۔ جان اے عزیز دایرہ اول جام جہاں نما کا یہ ہے کہ اسے حقیقت محمدی کا دائرہ کہتے ہیں :۔

احدیت



یہ دائرہ او پر دو قوس کے ہے اول احدیت یعنی منقطع الاشارات، یعنی قطع ہیں وہاں سب دریافت جیا کہ احدیت ہے، ولا تفکروا فی ذات اللہ یعنی مت کرو فکر ذات الٰہی میں، اسکی معنی یو ہے کہ جو چیز شناخت میں آئی وو پچھانت کے قید میں آئی تو ذات نہیں ہے کس واسطے کہ ذات مطلق ہے یعنی بے قید ہے یہ مرتبہ احدیت کا ہے کہ لاتعین ہے یعنی مقرر نہیں کیا جاتا ہے اُس کتیں شرط لاشی کہتے ہیں، یعنی وو شرط کہ وہاں شی نہیں۔ اور اُسے انتفائے تعدد و انسب کہتے ہیں۔ اس واسطے اُس کوں ایکہ نہیں کہتے ہیں۔ کس واسطے کہ ایک بولنا بھی قید ہے ۔ اوراشارات ہے "الخ"

خاتمہ میں مترجم نے ویدانت کی اصطلاحات کی مطابقت، اسلامی صوفیا کی اصطلاحات سے کی ہے مثلاً احدیت یعنی ہسن ۔ مجہول النعت : نرارکار ۔ منقطع الاشارات : نراکار ۔ مطلق : نرادھار ۔ ذات بیرنگ : نرالم ۔ علم مطلق : ہرن گربہ ۔ برزخ برازخ : لنگ سریر وغیرہ ۔

پروفیسر انور علی آنور
(راولپنڈی)

فارسی ادب میں مرثیہ نگاری

مرثیہ شاعری کی وہ صنف ہے جس کا وجود دنیا بھر کی زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ مرثیہ غم والم کے ایسے جذبات و احساسات کے اظہار کا نام ہے جن کا تعلق کسی شخص کی مرگ ورحلت سے ہو۔ مرگ وفنا کا حادثہ دنیا کے ہر فرد کا حیات کو پیش آتا ہے اور اس کے ساتھ جو احساسات وجذبات وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ تمام بنی نوع انسان کا مشترک سرمایہ ہیں۔ دنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جس کا دامن مرثیہ گوئی سے خالی ہو۔ فارسی زبان میں مراثی کا ایک ضخیم بیش بہا اور قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔ جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

فارسی کی ابتدائی مرثیہ گوئی

گمان غالب ہے کہ فارسی کی شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی مرثیہ گوئی وجود میں آگئی ہوگی۔ لیکن ان ابتدائی مراثی کا کوئی نمونہ محفوظ طور پر ہم تک نہیں پہنچا۔ سب سے پہلا شاعر جس کے رثائی اشعار تذکروں میں موجود ہیں رودکی ہے۔ یہ اشعار قطعات کی صورت میں ہیں جن میں شاعر نے اپنے کسی مرحوم دوست یا کسی ہمعصر شاعر کی وفات پر رنج وغم کا اظہار شعر کی زبان میں یوں کیا ہے ؎

دوست کی موت پر :-

مُرد مرادی نہ ہمانا کہ مُرد   مردن آں خواجہ نہ کاریست خُرد
جانِ گرامی بہ پدر باز داد   کالبد تیرہ بہ مادر سپُرد
کاہ نبد او کہ ببادی پرید   آب نبُد او کہ بسرما فسُرد

شہید بلخی کی موت پر :-

کاروان شہید رفت از پیش   وآں مارفتہ گیر وی اندیش
از شمار دو چشم یک تن کم   وز شمار خرد ہزاران بیش

بعد ازاں سلسلۂ سامانیہ کے آخری دور کے ایک ممتاز شاعر عمادہ مروزی کے دو اشعار تذکروں میں ملتے ہیں۔ جو سامانی شہزادہ اسمٰعیل بن نوح کی جوانمرگی پر شاعر نے رقم کئے تھے ؎

از خونِ او چو روی زمی لعل فام شد | روی وفا سیہ شد و چشم امید زرد
تیغش بخواست خورد ہمی خونِ مرگ را | مرگ از نہیب خویش مرآں شاہ را بخورد

شعر و سخن کی ہر صنعت کے لئے ایک نہ ایک ہئیت شعری موزوں سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ

فارسی مرثیہ نگاری کے اسالیب فارسی زبان کے اکثر و بیشتر مراثی ترکیب بند کی ہئیت میں لکھے گئے ہیں۔ ترکیب بند کے بعد بالعموم قصیدہ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہی دو قوالب شعری مرثیہ سرائی کے لئے موزوں ترین قرار دیئے گئے ہیں۔ اگرچہ دیوانِ حافظ کے چند ایسے اشعار غزل کے اسلوب میں ملتے ہیں اور مثنوی کے انداز میں بھی فردوسی کے لکھے ہوئے چند اشعار شاہنامہ میں درج ہیں۔ جن میں شاعر نے اپنے نوجوان بیٹے کی موت پر اظہارِ غم کیا ہے۔ قصیدہ اور ترکیب بند کے بعد فارسی مرثیہ کے مقبول ترین شعری قوالب رباعی اور قطعہ ہیں۔ جن کے متعدد نمونے شعراء کے دواوین میں موجود ہیں۔ خاقانی کے چند اشعار جو قطعہ کے پیرائے میں ہیں شاعر کے چچا کافی الدین کی رحلت پر لکھے گئے تھے ؎

رفت آں کہ فیلسوفِ جہاں بود در جہاں | در ہائی آسمان معانی کشودہ بود
شد نفس مطمئنۂ او باز جای خویش | کاداز ارجعی ہم از انجا شنودہ بود
او را فلک برای طبیبی خویش برد | کز دیر باز دارو ی او آزمودہ بود
آدینہ بود صاعقۂ مرگ او دلی | طوفانِ نوح نیز در آدینہ بودہ بود

رباعی کے پیکر میں فارسی مرثیہ کی نہایت عمدہ مثال مجد ہمگر کی وہ مشہور رباعی ہے جو شمس الدین محمد صاحب دیوان کی موت پر لکھی گئی تھی ؎

در ماتم شمس از شفق خوں بچکید | مہ چہرہ بکند و زہرہ گیسو ببرید
شب جامہ سیاہ کرد در ماتم و صبح | بر زد نفس سرد و گریباں بدرید

فارسی مرثیہ کی انواع مختلفہ بہ اعتبار موضوع فارسی مرثیہ کی تین اقسام ہیں:۔

۱۔ رسمی مرثیے۔ یہ مراثی شاعروں نے درباری زندگی کے زیر اثر لکھے ہیں۔ اور ان کی حیثیت مدحیہ قصائد کی سی ہے۔ جن میں شعر کا حقیقی جوہر یعنی خلوص و واقعیت کا عنصر مفقود ہے۔ بایں ہمہ فارسی میں چند ایک ایسے رسمی مراثی موجود ہیں جنھیں بلا خوفِ تردید بہترین ادبی شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ فرخی کا مشہور و معروف مرثیہ جو اس نے سلطان محمود غزنوی کی موت پر لکھا زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو ؎

شہر غزنیں نہ ہمانست کہ من دیدم پار | چہ فتادست کہ امروز دگر گوں شدہ کار

امیر معزّی نے سلطان ملک شاہ سلجوقی کی موت پر جو مرثیے لکھے ہیں وہ بھی فارسی ادب میں یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ایک مرثیے کا مطلع پیشِ خدمت ہے ؎

شغل دولت بے خطر شد کار دولت با خطر | تا تہی شد دولت و ملت ز شاہ دادگر

بعض ایسے شعراء نے بھی رسمی مرثیے لکھے ہیں جو کسی دربار سے وابستہ نہ تھے۔ یہ مرثیے مشاہیر و اکابر زماں اور ائمہ

رحلت کی یاد میں لکھے گئے ہیں۔ اسی طرح شیخ سعدیؒ کا مرثیہ در زوال بغداد فارسی ادب کا ایک لازوال شاہکار ہے۔ نیز خاقانی کا مرثیہ جس میں امام محمد یحییٰ کی موت پر اظہار رنج و الم کیا گیا ہے۔ وہ بھی فارسی ادب کا ایک نادر نمونہ ہے۔ مرثیے کا ابتدائی شعر یہ ہے ؎

تا در دو محنت است درین تنگنای خاک	محنت برای مردم و مردم برای خاک

بعض شعرانے درباری یا رسمی مرثیے میں یہ اپج پیدا کی ہے کہ انھوں نے متوفی بادشاہ کی وفات کے تذکرے کے ساتھ قائم مقام بادشاہ کی تخت نشینی کا مضمون بھی باندھ دیا ہے۔ اس طرح اشعار میں ایک انوکھی جدت اور ندرت پیدا ہو گئی ہے۔ اس انداز کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بادشاہی گذشت خوب نژاد	بادشاہی نشست فرخ زاد
زاں گذشتہ جہانیاں غمگین	زیں نشستہ جہانیاں دلشاد
بنگر اکنوں بہ چشم عقل نکو	کانچہ از ما گرفت ایزد داد
گر چراغی ز پیش ما برداشت	باز شمعی بجای او بہ نہاد

متاخرین میں سے صبا کاشانی نے اپنے اکثر مراثی میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔

شخصی مرثیے اس قسم کے مرثیے شعرانے اپنے مرحوم عزیزوں اور دوستوں کی یاد میں لکھے ہیں۔ باعتبار فن اس قسم کے مرثیوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ ان میں شعرانے اپنے حقیقی جذبات و احساسات الم کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً حافظ شیرازی اپنے بیٹے کی موت پر یوں ماتم کناں ہے ؎

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند	چہ دید اندر خم ایں طاق رنگیں
بجای لوح سیمیں بر کنارش	فلک بر سر نہادش لوح سنگیں

امیر خسرو نے اپنی محبوب ماں اور عزیز بھائی کے مرثیہ کا آغاز ان پُر درد الفاظ میں کیا ہے ؎

امروز دو نور ز اخترم رفت	ہم مادرم و ہم برادرم رفت

جامی نے اپنے بھائی مولانا محمد اور اپنے یک سالہ بیٹے کی موت پر دو ترکیب بند لکھے ہیں۔ جو نہ صرف انتہائی رقت انگیز اور پُر تاثیر ہیں بلکہ شاعر کے قلبی رنج و غم کے بھی آئینہ دار ہیں۔ چنانچہ بیٹے کی یاد میں لکھے ہوئے ترکیب بند کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رفتی و سیر ندیدہ رخ تو دیدہ ہنوز	گوش یک نکتہ ز لبہائی تو نشنیدہ ہنوز
چید دست اجل اے غنچۂ نو رستہ ترا	یک گل از شاخ امل دست تو نا چیدہ ہنوز
بر تن عاجز تو بہر چہ بود ایں ہمہ رنج	زیر پا سو رچہ ای از تو نہ رنجیدہ ہنوز
ہر سر موی بہ فرقت ز بلا شد تیغی	فرقت از موی ولادت نہ تراشیدہ ہنوز
عمر تو یک شد از نہفت ہفتاد مرا	ہرگز ایں واقعۂ صعب نیفتاد مرا

مولانا شبلی مرحوم نے شعر العجم میں فیضی کے چند اشعار نقل کئے ہیں جو فاضل شاعر نے اپنے بیٹے کے سوگ میں لکھے تھے ؎

ای روشنیٔ دیدہ تو بی من چگونۂ — من بی تو تیرہ روز تو بی من چگونۂ
ماتم سرا ست خانۂ من در فراقِ تو — در زیر خاک ساختہ مسکن چگونۂ

امیر معزی کی یاد میں حکیم سنائی کا یہ قطعہ ملاحظہ کیجئے۔

سخن را بخواب اندروں دوش گفتم — کہ گر شد معزی تو دائم ہمی زی
سخن سرد بادی بر آورد و گفتا — دریغا! معزی! دریغا معزی !!

مسعود سعد سلمان لاہوری نے اپنے ایک ہمعصر شاعر سید حسن غزنوی کا نوحہ ان اشعار میں کہا ہے ؎

بر تو سید حسن دلم سوزد — کہ چو تو ہیچ غم گسار نداشت
تن من زار بر تو می نالد — کہ تنم ہیچ چوں تو یار نداشت
زاں اجل اختیار جان تو کرد — کہ بہ از جان تُت اختیار نداشت

جدید ایرانی شعراء میں صبار کے مراثی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں جو شاعر مرحوم نے اپنے بعض معاصرین کی وفات پر لکھے۔

مذہبی مرثیے

ان مراثی کا رواج ایران میں صفویہ عہدِ حکومت سے ہوا۔ جب کہ شیعیت کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ اس نوع کے مرثیوں میں سید الشہداء امام حسینؓ اور ان کے رفقاء کے تکلیفیں اٹھانے اور شہادت پانے کے واقعات نہایت خوبی سے بیان کئے گئے ہیں۔ جو محرم کی مجالس میں پُر سوز لہجے میں پڑھے جاتے ہیں۔ اور جنھیں سن کر عقیدت مندان حسین خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ محتشم کاشی کا ترکیب بند اس صنعت کی نمایاں ترین مثال ہے۔ محتشم کاشی ابتداءً مدح سرائی اور عشقیہ شاعری کے میدان میں جولانیٔ طبع کا اظہار کرتا رہا جس کی بدولت مرثیہ نگاری کا فن اپنے معراج تک پہنچا۔ طہماسپ صفوی نے اسے مرثیہ گوئی کی ترغیب دلائی۔ متاخرین میں ملک الشعراء محمود خاں نے محتشم کی تقلید میں حادثۂ کربلا پر ایک نہایت بلند پایہ ترکیب بند لکھا ہے۔ جو چودہ بندوں پر مشتمل ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر محتشم کا ترکیب بند اولیت کا شرف نہ رکھتا ہو تو محمود خاں ملک الشعراء کے ترکیب بند کو اس پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اس ترکیب بند کے افتتاحی اشعار یہ ہیں۔

باز از افق ہلالِ محرم شد آشکار — وز غم نشست بر دلِ پیر و جواں غبار
باز آتشی ز زردی ذی گشت شعلہ در — کافتاد از آں بخرمنِ ہفت آسماں شرار
برخاست از زمیں و زماں شورِ رستخیز — وز ہر طرف علامتِ محشر شد آشکار
گفتی رسیدہ وقت کہ زیر و زبر شود — یکسر بنائے محکم ایں نیلگوں حصار
.......اسپ شہنشاہ....... — برگشت سوی خیمہ دگر بارہ بیسوار
پیرایہ بخش مہرۂ صبر و رضا حسینؓ — سرمایۂ شفاعت روزِ جزا حسینؓ

دوم محی الدین

خورشید احمد جامی کی شاعری

پڑا ہے عکس جو رخسارِ شعلۂ مے کا
تو آئینے تری یادوں کے جگمگائے ہیں　　(جامی)

رخسارِ سحر یادوں اور امیدوں کے شاعر خورشید احمد جامی کی نئی غزلوں کا منتخب مجموعہ ہے۔ اس میں شاعری وہ زلیں ہیں جو اس نے اس طرف ۱۹۵۵ء سے کہنا شروع کی ہیں جو بیک نظر اپنی سادگی، اثر اور تازگی کے طفیل غزل نئے امکانات کی نشان دہی کرتی ہیں۔

جامی اردو کے پختہ کار شاعر ہیں۔ فن پر عبور اور زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ اُردو کے اکثر شاعروں کی طرح سے انھوں نے روایتی انداز میں شاعری کی ابتدا کی۔ کچھ تو گھر کا اثر جس میں وہ پیدا ہوئے۔ مذہبی، قدیم علمی، ادبی ماحول میں آنکھ کھولی، جو پایا، اب سے پچیس برس کا وہ حیدرآباد ہے جہاں جامعہ عثمانیہ نے اردو نظم و نثر، اور علم و فن کو آزاد کر دیا تھا۔ حیدرآباد میں ان ا سلیم، طباطبائی، عظمت اللہ خاں، علی اختر، جوش اور فانی تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے نئے ادیب اور شاعر اپنا اثر اور رسوخ رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک شروع ہو چکی تھی مگر بڑی دھوم دھام سے، خوش قسمتی سے جامی نے ایک ایسے دور میں شعور کی آنکھ جو اپنی انقلابی کیفیات میں بے مثل ہے مگر اپنے اندرونی تضادات میں بے حد پیچیدہ، بیرونی تسلط، ملکی مطلق العنانیت، ستی، معاشی بدحالی، لوٹ کھسوٹ، نکبت و ادبار اور ان کے خلاف جمہوریت اور آزادی کی انقلابی تحریک جو قدامت کی کاٹ رہی تھی، دوسری طرف مقتدر رجعت پرستی کی مردہ طاقتیں پتھر کی طرح راستے سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ تے میں آنے والے پتھر ایک ایک کرکے اٹھا کر پھینک دیئے گئے۔ ہندوستان آزاد ہوا، ملک بٹ گیا۔ حیدرآباد میں خود بڑی پلٹ ہوئی۔ ریاست کے "تا ابد" قائم رہنے کے ترانے ختم ہوئے، اس مقام نے حساس اور نیک دل جامی کو رک کر ٹھہرنے چنے پر مجبور کیا، جو شاعری کی تلاش، دوست کی تمنا، اور وطن کا درد لئے بھٹک رہا تھا، آزادی کے بعد کے انقلابات میں مت سے گزر رہا اور بڑے التفات اور پیار سے زمانہ کی آواز کو سننے لگا اور اس کی زبان کو سمجھنے لگا۔ قدامت کا آسیب فکر و نظر کا سانچہ ہی بدل گیا۔ شعر کے کوئی دس گیارہ مجموعوں اور سات سَو سے زیادہ غزلوں کو اقط کر دیا، سوچ بچار کے بعد

احتیاط کے ساتھ ۱۹۵۰ء سے نئی غزل لکھنا شروع کیا، اور قدم قدم پر دل و دماغ سے پوچھ پوچھ کر لکھنے لگا۔
مزاج کی بے کلی، حسن اور سچائی کی لگن نے درد رسیدہ، محروم، ناآسودہ شاعر کو نئے افق اور نئی سحر کی طرف گامزن کر دیا، کتنے ایسے ہیں جو ظلمتوں کا زہر پی کر ہمارے دیکھتے دیکھتے مر نہیں گئے، جامی روحانی شفا کے بعد صحت اور توانائی کے ساتھ زندگی، انسان، اس کے درد و غم، اس کی آرزوؤں، تمناؤں کو دل میں بسائے خون کی مشعلیں جلاتا، صلیب اٹھائے کبھی اکیلا، کبھی قافلے کے ساتھ، کبھی آگے، کبھی پیچھے غزل کے راستہ پر چل رہا ہے، مگر چل رہا ہے، ایک پُر غرور یقین کے ساتھ۔

رہِ حیات میں کتنے ہی پیچ و خم آئے
بچھڑ گیا ہے کوئی کب، کہاں، پتا بھی نہیں   (جامی)

جامی کی غزلوں میں نہ وہ تہہ در تہہ باتیں ہیں، جس کے نمائندے فراق اکیلے ہیں اور نہ وہ سپاٹ پن جو کئی مشہور شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ جامی سیدھے سادے، دلکش اور کھلے ہوئے انداز میں غزل کی علامتوں میں اپنی اور اپنے زمانے کی کہانی سنا رہا ہے۔ غزل میں تخصیص سے تعمیم کا عمل کارفرما رہتا ہے۔ وہ ساری محرومیوں کو "رات" کی علامت میں بند کر دیتا ہے۔ "صبح" گہرا امیدوں کو پیکر بخشتا ہے۔ صلیب قربانی کی مظہر ہے۔ اس کے اشعار میں بار بار ایک سحر کا ذکر خیر آتا ہے جو ابھی ہوئی ہی نہیں۔ سوادِ غم میں وہ آرزوں کا ایک نیا شہر بسائے اسی صبح کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ کروڑوں انسان انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ دور ایک اعتبار سے انتظار کا دور بھی ہے اور امکانات کا بھی۔ انتظار کی شبِ تار کو شاعر کبھی "شعلہ بدن اور زہرہ جبیں" کے تصور سے جگمگاتا ہے، کبھی لہو کے چراغ جلا جلا کر رات کاٹتا ہے تو کبھی روشن ستاروں سے باتیں کر کے۔ شاعر اس دور کے صبر آزما کرب اور "نگارِ صبح" کے بے پایاں انتظار سے تنگ ہے۔ اس کی "نگارِ صبح" محض ایک تصور ہے، ایک رومانی تصور، جو حقیقت اور منطق پر مبنی نہیں ہے، وہ اس گروہ کا شاعر معلوم ہوتا ہے جو بحرِ ظلمات پر پہنچ کر جام توڑتے ہیں۔ "ناآسودگی جن کا مقدر ہے"، وہ ان لوگوں میں سے ہے جو سر اٹھائے آسمان کے تاروں کی دلکشی میں گم ہیں اور یہ نہیں جانتے ہیں کہ اس سفر میں کتنے خوبصورت زیرِ پا ذرّوں کے جمال کی لطافتوں سے محروم ہیں۔ وہ دورانِ سفر کی بنتی ہوئی جنتوں سے لطف اندوز نہیں ہو رہے ہیں۔ انقلاب یا سوشلزم جنت کی شاخِ طوبیٰ نہیں کہ دل میں خواہش کے ساتھ ہی میٹھے پھل، وہ بھونا ہوا تیتر پیٹ میں پڑ جائے۔ اس کے لئے محنت کش عوام کی منظم تحریک، پارٹی اور جد و جہد درکار ہے۔ جامی ان شاعروں میں معلوم ہوتا ہے جو اپنی صبح انقلاب سے ہمکنار ہو کر بھی اس سے دور ہی رہے گا۔ ان کا تصور ان پیغمبروں کا سا نظر آتا ہے جو اپنی امت کی افتاد و حالی کا حل نہ پا کر خدا سے لڑ بیٹھتے ہیں (دیکھو انجیل میں یرمیاہ کا نوحہ)
شدتِ کرب میں جامی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آخری صلیب نہیں، ہر شہید شاید ایسا ہی سمجھتا ہو، مگر تاریخ کا سفر رکا ہے نہ اس کے تضادات، نہ شہادتیں ختم ہوئی ہیں نہ صلیبیں۔
جامی صاحب!   "ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

(رخسارِ سحر، پیش لفظ)

شید احمد جامی

میں شعر کیسے کہتا ہوں؟

میں شعر کیسے کہتا ہوں۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دیتے ہوئے میں آج کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ ۔ زندگی کی طویل اور پیچ وخم کھاتی ہوئی راہوں میں تقریباً بیس برس سے میں اور میرے شعر پیمانِ رفاقت اور فا کی مشعلیں جلائے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں اور اس لمبے سفر میں ہم نے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھا اور بہت اچھی طرح سے پہچان لیا ہے۔ میرے شعر دراصل میرے مختلف تجربات کی ایک تاریخ ہیں جن کے سینے میں کے دل کی اضطراب انگیز دھڑکنیں بھی ہیں۔ حال کے جنوں خیز ولولے بھی اور مستقبل کی حیات افروز امنگیں بھی اندھیرو ں کی ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے جیب و دامن میں جن کو میں انتہائی محنت اور خلوص کے ساتھ آہنگ اور الفاظ باس پہناتا ہوں لب و رخسار کے سائے میں دیکھے ہوئے چمکتے خواب۔ ہجر و فراق کے دشت و صحرا میں جمع کئے ہوئے تے زخم اور حقائق کی سنگین چھاتی سے پھوٹتے ہوئے شرارے تاثراتی لمحوں کی شکل میں موجود ہیں۔ مجھے شعر کہنے کے کسی تحریک یا خاص اہتمام کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی بے نام سے زلزلے کا ایک شدید جھٹکا ہے کچی نیند کے طلسمی حصاروں کو توڑ کر میرے قریب پہنچ جاتا ہے اور آدھی رات کے سناٹے میں میری تمناؤں کا ت بیکراں یکایک مانوس آہٹوں سے گونج اٹھتا ہے۔ سارا ماحول ایک پُراسرار شاعرانہ فضا میں کھو جاتا ہے میں اس ایک لمحے کا۔ اس ایک تاثر کا اس ایک خیال کا جو میرا اپنا ہی کوئی تجربہ ہوتا ہے یا میری اپنی ہی کوئی ۔ وہ بڑے ہی پر تپاک انداز میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس طرح ایک ہی وقت اور بیٹھک میں میں اپنی نظم یا غزل کو ا کر لیتا ہوں۔

میں ذاتی طور پر ہر اچھی تخلیق کو شاعر کا انفرادی کارنامہ سمجھتا ہوں جسے اس کے اپنے فنی شعور نے زندگی کی کبھی نہ ختم ہونے والی ش اور ہنگاموں کے درمیان انجام دیا ہو یہ اور بات ہے کہ اس کا تجربہ سارے زمانے کو اپنی ہی داستان معلوم لگے اور ایسا ہونا ہی چاہیئے کیونکہ کوئی تجربہ کوئی جذبہ اور کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جسے نیا کہا جائے۔ محبت و نفرت۔ شی اور خیال و فکر کے زمین و آسمان جغرافیائی حد بندیوں سیاسی نظریات کی اونچی فصیلوں اور زبانوں کے فرق کے باوجود ہر

رکے انسانوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس بھرپور حقیقت کی آب و تاب کو مرعوب کن اصطلاحات یا
مبہم اعراض کے گرد و غبار میں گم کر دینا ممکن نہیں ہے۔ عصر حاضر کو میں شعر و ادب کی سرگرمیوں کے وسیع پس منظر میں نئے
رجحانات اور نئے تجربات کے باعث ایک فیصلہ کن موڑ سمجھتا ہوں۔

میں شاعری کے اسی نئے قافلے میں شریک ہوں جو زندگی کی راہوں میں اپنے لہو سے نئے چراغ جلا رہا ہے۔
خیال، جذبہ یا موضوع کتنا ہی پیش پا افتادہ کیوں نہ ہو الفاظ، علامات اور اشارات کے نئے سانچوں میں ڈھل کر
بے صوتی۔ اثر آفرینی اور نئی زندگی کی تازگی حاصل کر لیتا ہے اور میں اس بات پر ایقان رکھتا ہوں کہ شعر تشبیہوں
اور استعاروں کی نئی دوشیزہ صبحوں سے ہم آغوش ہو کر بے پناہ ہو جاتا ہے۔ اس دور کی جن مشہور شخصیتوں نے میری
شاعری پر کم و بیش اپنا اثر ڈالا ہے ان میں جوش، مخدوم، فیض اور احمد ندیم قاسمی کے نام بہت نمایاں ہیں۔

ہمارے شعری ادب کی عظیم روایات ایک بے بہا خزانہ سے کسی طرح کم نہیں اور مجھے اس سے انکار بھی نہیں مگر آج جبکہ
حالات کے جدید تقاضوں کی روشنی میں جمالیاتی قدریں سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ اور پیار کے انداز تک بدل گئے ہیں صرف روایات
کے سہارے فن کی سنگلاخ رہ گذار میں سینہ تان کر چلنا بہت مشکل نظر آتا ہے اور جو لوگ اس طرح چلنے کی کوشش کرتے ہیں وہ
جلد ہی تھک کر کسی نادیدہ محبوبۂ دل نواز کے گیسوؤں کی چھاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں نے ارادی
طور پر اپنے خیالات اور احساسات کو نیا پیرایۂ اظہار و بیان دینے میں مقدور بھر کوشش کی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میری کوشش
کامیاب بھی ہوئی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ زمانے کا نقاد آج نہیں تو کل کر دے گا۔ البتہ ایک بات جو میں اپنے بارے میں خود اعتمادی
اور دیانت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے شعر گوئی کے سلسلہ میں کبھی ذہنی تھکاوٹ محسوس نہیں کی ہے اس کی
وجہ یہ ہے کہ میں اپنے فن کے لئے صرف جھکی ہوئی پلکوں اور مہکتی ہوئی بانہوں سے ہی حرارت و حسن حاصل نہیں کرتا
بلکہ ان بے شمار ناآسودگیوں اور محرومیوں میں بھی زندگی کا جمال اور بانکپن تلاش کر لیتا ہوں۔ اور جد و جہد کے انہیں بھاگتے
اور اڑتے ہوئے لمحات کے تصادم سے میں اپنے لئے گیتوں کے نئے جال بنتا ہوں۔

تیرے پیمانِ محبت کی حسین راہوں میں
دل کے ہر زخم کو آواز بنا دیتا ہوں

ملک زادہ طیب انصاری

عادل شاہی دور میں اردو زبان و ادب کی ایک جھلک

سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں سلطنت بہمنیہ کا خاتمہ ہوا اور ساتھ ہی دکن میں پانچ نئی مملکتیں وجود میں آئیں۔ ہ
یدشاہی، نظام شاہی، قطب شاہی، عماد شاہی اور عادل شاہی کے ناموں سے تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔
ن نئی حکومتوں کے قائم ہونے کے باوجود سلطنت بہمنیہ کی جو قائم کردہ روایات تھیں بحیثیت مجموعی ان ہی روایات کو ان
سلطنتوں میں فروغ حاصل ہوا۔ جہاں تک تہذیب و تمدن یا پھر علم و ادب کا سوال ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ان سلطنتوں میں یکساں
پر ترقی ہوئی۔ بات چیت، لب و لہجہ، رسم و رواج اور تقاریب و عیدین سبھی ایک جیسے رہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ
سلطنتوں کا تعلق ایک ایسی مملکت سے رہا ہے جس میں علم و ادب اور تہذیب و معاشرت کے اقدار مضبوط اور پائیدار ہو چکے
۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو بادشاہ ان مختلف سلطنتوں میں گزرے ہیں ایک ہی نسل اور ایک ہی مذہب سے تعلق
رکھتے تھے۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر ان سلطنتوں کی تہذیب و تمدن اور فن تعمیر و فنون لطیفہ میں بڑی حد تک یکسانیت اور
[redacted] زبان و ادب کے تعلق سے بھی کم و بیش یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ دکن کی دو بڑی سلطنتوں میں [redacted] زبان و
ب کا جائزہ لیں تو ہمیں پتا چلے گا کہ جہاں گولکنڈہ میں قطب شاہیوں کی زیر سرپرستی [redacted] زبان و ادب جو
نگ بدلتا رہا اور جو نکھار و ستھراپن اختیار کرتا گیا وہیں بیجاپور میں بھی عادل شاہیوں کے دور حکومت میں [redacted]
بان کو کافی عروج حاصل ہوا اور ادب کا دامن بیش بہا جواہر سے مالا مال ہو گیا۔

یوسف عادل شاہ جو سلطنت عادل شاہیہ کا بانی ہے ۱۵۱۱ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یوسف
عادل شاہ کی یہ قائم کردہ مملکت تقریباً دو سو سال تک بیجاپور پر پورے شان و شوکت و فر کے ساتھ باقی رہی اور نو بادشاہوں
نے حکومت کی۔ یوسف علم و ادب کا دلدادہ تو تھا مگر استحکام سلطنت کے کاموں نے اسے اس بات کا موقع ہی نہیں دیا
وہ اس میدان میں اپنا کوئی کارنامہ چھوڑ جاتا۔ یوسف کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ ۱۵۱۰ء میں تخت نشین
ہوا۔ اس کے دور میں فنون لطیفہ کو کافی عروج حاصل ہوا۔ اسمٰعیل کے بعد ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کی سلطنت کا وارث
بنا اور درحقیقت یہی سال ۱۵۳۴ء [redacted] تاریخ میں نقطہ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔
ابراہیم عادل شاہ کا دور فنون لطیفہ کی حیثیت سے کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھتا ہو [redacted] زبان و ادب کے

ہے بھی بہت اہم سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جس میں [redacted] زبان کو فارسی اور [redacted] زبانوں پر فوقیت حاصل
ی اور [redacted] ملک کی سرکاری زبان قرار پائی۔ یہیں سے [redacted] ادب کا بھی ایک نیا دور شروع ہوتا ہے اس نئے دور
و امام حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق ہیں۔ "خوش نامہ" و "خوش نغز" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔
ابراہیم کے بعد ۱۵۵۸ء میں علی عادل شاہ بادشاہ بنا۔ یہ "قلندر صفت" بادشاہ اپنے آپ کو "علی شیر" کہا کرتا
یا۔ شاہ برہان الدین جانم جو میراں جی کے فرزند تھے اس زمانہ کے مایۂ ناز نثر نگار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی نظم
ارشاد نامہ" کافی طویل ہے اور "سکھ سہیلا" کے علاوہ ان کی نثری کتاب "کلمۃ الحقایق" کافی مشہور ہے۔
علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۷۹ء میں تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کا عہد [redacted]
بان و ادب کا دور ہے۔ ابراہیم خود بھی کافی رنگین مزاج اور باذوق تھا۔ موسیقی کا "جگت گرو" [redacted] ادب میں "نورس نامہ"
کا مصنف کہلایا۔ اس کے دور حیات میں [redacted] زبان و ادب کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ مشہور زمانہ مورخ ابوالقاسم
فرشتہ، ملا ظہوری، حکیم آتشی، ملک قمی اور مقیمی اپنے وقت کی مشہور ہستیاں گزری ہیں۔ عبدل کی مثنوی "ابراہیم نامہ"
ور مقیمی کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" اس زمانے کے ناقابل فراموش ادبی شہ پارے ہیں۔
۱۶۲۸ء میں محمد عادل شاہ سلطنت کا مالک بنا اور اس کے دور حکومت میں [redacted] کی ترقی کا سلسلہ روز افزوں ارتقائی
منازل طے کرتا رہا۔ چنانچہ [redacted] کے باکمال شاعر کمال خان رستمی، صنعتی اور ملک خوشنود اس کے زمانہ میں موجود تھے۔ رستمی
کی طویل رزمیہ نظم "خاور نامہ"، صنعتی کی مثنوی "قصۂ تمیم انصاری" اور ملک خوشنود کی دو مثنویاں "ہشت بہشت" اور "یوسف و
زلیخا" اس زمانے کے تاریخی ادبی کارنامے ہیں۔
جس زبان و ادب کی داغ بیل ابراہیم عادل شاہ نے ڈالی تھی اور جس کی آبیاری علی عادل شاہ، ابراہیم عادل شاہ ثانی اور
محمد عادل شاہ نے مل کر کی تھی اس کے انتہائی عروج کا دور علی عادل شاہ ثانی کا دور حکومت ہے۔ اس عہد زریں میں علم و ادب
کے جو سوتے پھوٹے ہیں) اور جو غنچہ ہائے رنگا رنگ کھلے ہیں اس کی مثال پورے عادل شاہی عہد میں ملنی مشکل ہے۔ علی عادل شاہ
ثانی ۱۶۵۶ء میں تخت نشین ہوا اور یہ زمانہ دکن میں اردو کی انتہائی ترقی کا دور سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس وقت صرف
بیجاپور ہی نہیں بلکہ گولکنڈہ بھی [redacted] علم و ادب کا گہوارہ بن چکا تھا۔
علی عادل شاہ ثانی صاحب ذوق بادشاہ تھا۔ وہ اہل ہنر کا قدرداں خود بھی ہنرمند تھا۔ وہ اپنے زمانہ کا بہت
بڑا شاعر اور شاہی کے تخلص سے مشہور تھا۔ چنانچہ ملک الشعرا [redacted] نصرتی جو اپنے وقت کا واحد باکمال شاعر تھا
علی عادل شاہ کی شعری صلاحیتوں کو تسلیم کرتا ہے ؎

ترے شعر تے شاعراں کو ہے نور   مضامین و معنیاں کے گر دوں کا طور

شاہی کے یہاں عشق و محبت کی بے چینیاں و ہنگامہ آرائیاں ہمیں بہت کم ملتی ہیں۔ برخلاف اس کے
مذہبی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ حضرت بندہ نواز گلبرگوی اور حضرت علاء الدین انصاری الندی سے اسے
خاص عقیدت تھی چنانچہ اس کے ثبوت میں جہاں عطیات و جاگیرات کے کاغذات پیش کئے جا سکتے ہیں وہیں

ملاحظہ ... صدیقی صاحب نے مرتب کرکے شائع کر دیا ہے۔

اس کا کلام بھی موجود ہے ۔ ایک جگہ تو وہ لکھتا ہے کہ "لوگ حج کے لئے مکہ و مدینہ جاتے' مسافتیں طے کرتے اور تکالیف برداشت کرتے ہیں لیکن میرے لئے تو مکہ و مدینہ یہیں ہیں ۔ حضرت گیسو دراز کا آستانۂ مبارک میرے لئے مکہ اور حضرت علاء الدین انصاری کی بارگاہ میرے لئے مدینہ ہے ' اس لئے گلبرگہ اور الند ہی میرے لئے کافی ہیں ۔" اس سے شاہی کی وسیع المنظری اور بزرگانِ دین سے غیر معمولی عقیدت کا پتہ چلتا ہے ۔

نصرتی نہ صرف سلطنت عادل شاہیہ کا بلکہ اپنے عہد کا ہندستان میں سب سے بڑا اور مایۂ ناز شاعر گزرا ہے' وہ ایک طرف عشق و محبت کے راگ الاپتا اور پھر جنگ کے خونیں واقعات بھی درد انگیز انداز میں قلمبند کرتا ہے ۔ اس کے کلام میں جہاں حسن کی جلوہ گری ہے وہیں عشق و جنوں کی بے تابیاں بھی موجود ہیں ۔ وہ شعلہ بیان شاعر جب موسم بہار کا نقشہ کھینچتا ہے تو نظروں کے سامنے حسن رقصاں نظر آتا ہے ۔ اس کی شاعری "عشق" کا "گلشن" تھی جہاں رنگا رنگ کے پھول اپنی بھینی بھینی خوشبو سے ساری فضا کو معطر بنا دیتے ۔

نصرتی کے عشقیہ کلام کا نادر نمونہ "گلشن عشق" ہے جس کے بارے میں وہ کہتا ہے :

محبت کی پایاس ہر ٹھاوں ہیں ‏ ‏ ‏ رکھیا گلشن عشق کرناؤں ہیں
دھریا اس کی تاریخ یوں ہجرتی ‏ ‏ ‏ مبارک یو ہے ھذا یہ نصرتی

۱۰۶۸ھ

"گلشن عشق" در حقیقت مدمالتی اور کنور کی محبت کی ایک دلگداز اور رنگین داستان ہے جسے نصرتی کے قلم نے اور بھی دردناک بنا دیا ہے ۔ نصرتی صرف حسن و عشق کا شاعر ہی نہ تھا بلکہ وہ اپنے زمانہ کا مورخ بھی گزرا ہے' اور "علی نامہ" اور "تاریخ اسکندری" اس کے دو زبردست تاریخی لیکن منظوم کارنامے ہیں ۔

"سمعس ہور اسی پر جوتے تین سال"

اس سے نصرتی کی آخری کتاب "تاریخ اسکندری" کی سنہ تالیف ۱۰۸۲ھ نکلتی ہے ۔ "علی نامہ" جیسا کہ خود نام سے ظاہر ہے عہد علی عادل شاہ ثانی کے عہد کی ولولہ انگیز تاریخ ہے ۔ اگر کوئی سیواجی کا صحیح اور مکمل نقشہ دیکھنا چاہتا ہو تو وہ علی نامہ کا ایک مرتبہ ضرور مطالعہ کرے ۔ تاریخ اسکندری در حقیقت عہد عادل شاہیہ کے مرثیہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ بیجاپور کے زوال کی ایک دردناک حکایت جس کے پڑھنے سے دل کانپ اٹھتا ہے اور آنکھیں آنسو بہانے لگتی ہیں ۔ اس [illegible] مرتبت شاعر کی تاریخ پیدائش کے تعلق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ "گلشن عشق" کے مقدمہ سے تاریخ وفات ۱۰۸۵ھ ظاہر ہوتی ہے :

ضرب شمشیر سوں یہ دنیا چھوڑ ‏ ‏ ‏ جا کے جنت کے گھر میں خوش ہو رہے
سال تاریخ آ ملائک نے ‏ ‏ ‏ یو کہے "نصرتی شہید ہوئے"

۱۰۸۵ھ

نصرتی کے ہم عصروں میں میراں جی کے پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ صوفی شاعر گزرے ہیں "رموز السالکین" "محبت نامہ"

---

۱ ~~[illegible]~~

اور "نظم وجود" ان کے خاص اور گراں قدر کارنامے ہیں۔ اور "گنج مخفی" اور "گفتار شاہ امین" بھی ان کی تحریر کے اچھے نمونے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ شاہ ملک کی تصانیف "شریعت نامہ" اور "احکام صلوٰۃ" اور مرزا کے مرثیے و قصیدے کافی مقبول رہے۔

ان میں بعض شعرا کا تعلق کسی نہ کسی طور پر دربار شاہی سے تھا لیکن ان درباری شعراء کے علاوہ ایک ایسا شاعر بے نیاز گزرا ہے جو اپنے میدان کا مرد جوان ہمت تھا جسے ہم ایاغی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ علی کے عہد کا یہ مذہبی شاعر اس بات پر فخر محسوس کرتا ہے کہ وہ علی جیسے دیندار حکمران کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہا ہے: ؎

کروں ہر گھڑی شکر پروردگار — کہ اس دور میں ہیں علی شہریار
زہے شاہ عادل زہے بادشاہ — کہ سنت کو جوں فرض کرتا ادا
کدھیں ترک ہرگز کیا نیں نماز — کہ حق سات دھرتا ہے راز و نیاز
شب و روز ہے دین پر استوار — تو خوشنود ہے اس پہ پروردگار
الٰہی اچھے جب تلک آسماں — شہنشاہ عادل کوں تھر درجہاں

علی عادل شاہ کے عہد کا خاتمہ دراصل دکنی ادب کے ایک سنہری دور کا خاتمہ ہے۔ بلاشبہ سکندر عادل شاہ کے دور میں بھی شاہ ابوالمعانی، ملا عبدالرزاق، رفعت، قادر، لطیف کے علاوہ ریختی کا مشہور دیوان شاعر ہاشمی بھی گزرا ہے۔ اس مختصر سے دور حکومت میں زبان و ادب کو وہ ترقی حاصل نہ ہوسکی جو پیش رو بادشاہوں کے دور میں ہوئی۔ ان لوگوں کی ایجادات نے اس مختصر سے غیر اہم زمانہ کو بھی اہم ترین بنا دیا۔ مختصراً عہد عادل شاہیہ میں دکنی زبان و ادب کو غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی جسے دکنی ادب کی تاریخ میں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے بھی تو اپنی ایک چیز کی بازی لگا دی ہے ـــــ ایمان داری ـــــ میں رکھ صاف صاف کہہ دوں گا کہ وہ میرے پتا کو جاننے کی کوشش نہ کریں ـــــ میں انسان کو ایک پھول سمجھتا ہوں ـــــ خوب صورت پھول ـــــ اور دنیا کو صرف پھول سے سروکار رکھنا چاہئے، اس پھلواری سے جہاں کہ وہ پھول پیدا ہوا۔

مبارک حسین ۔

حضرت حمید عظیم آبادی

آپ کی ولادت یکم رمضان المبارک ۱۳۱۴ھ م ۱۰ فروری ۱۸۹۶ء عظیم آباد کے محلہ لودی کٹرہ میں ہوئی۔ آپ نے ۱۹۱۵ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ والد کے انتقال کے باعث کالج کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن مطالعہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ فارسی کی درسی کتابیں بالاستیعاب ختم کیں اور عربی میں صرف صحاح ستہ سنانا باقی رہ گیا تھا۔ بی۔ اے (آنرز) اور ایم اے تک کے طلبا کو فارسی اور اردو پڑھایا کرتے تھے۔

آپ اپنے وقت کے بہترین اسپورٹس مین بھی تھے اور فٹ بال کے بہترین کھلاڑیوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ آپ کو حضرت شاہ رشید الحق رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی سے شرف بیعت حاصل تھا اور یہ انھیں کا فیض تھا کہ آخری وقت تک صوم و صلوٰۃ اور وظائف و اوراد کے پابند رہے۔

موضع قطب پور ضلع پٹنہ کے ایک معزز سید خاندان[1] میں آپ کی شادی ہوئی۔ آپ کے خسر حاجی سید شاہد حسین مرحوم نے ۱۹۴۶ء کے حشر بداماں ہنگامہ بہار میں جام شہادت نوش فرمایا۔ آٹھ اولادوں میں اس وقت چار بیٹے اور دو بیٹیاں بقید حیات ہیں۔

۱۹۱۳ء سے شعر کہنا شروع کیا اور تین برس تک ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی مرحوم شاگرد حضرت داغ مرحوم سے تلمذ رہا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۱۵ء کو حضرت شاد عظیم آبادی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں جو غزل حضرت شاد مرحوم کی خدمت میں بہ نظر اصلاح پیش کی گئی اس کے حاشیہ پر حضرت شاد نے درج ذیل شعر لکھ دیا۔

واللہ ہیں حمید کے سب شعر دل پسند　　اصلاح ان پہ دوں یہ دیانت سے دور تھا

حضرت شاد اپنے شاگردوں کا تذکرہ خود مرتب فرما رہے تھے لیکن وہ مرحوم کی زندگی ہی میں ان کی آخری عمر کی غزلوں کے ساتھ تلف ہو گیا۔ پس ماندہ مسودات میں ایک کاپی پر حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی جو ہنوز موجود اور محفوظ ہے۔

• حمید تخلص عبد الحمید نام۔ سید یوسف حسین مرحوم خلف میر احمد حسین عرف میر کلو مرحوم کے فرزند مولوی سید یوسف حسین مرحوم

---

[1] اس خاندان کے جد امجد مولانا محب اللہ بہاری مصنف "مسلم العلوم" "مسلم الثبوت" تھے۔ جو جامع ازہر تک میں پڑھائی جاتی ہیں۔

عیان ور وسائے شہر سے تھے۔ مدتوں آنریری مجسٹریٹ رہے۔ زمینداری آپ کی بہت اچھی تھی۔ محل اولیٰ سے اولاد موجود ہے۔ محل دوم سے اب حمید اور صاحب زادی ہے۔ انگریزی میں انٹرنس پاس کیا۔ عربی فارسی میں نسبتاً کافی دست گاہ رکھتے ہیں۔ بڑے ذکی، ہوشیار، منکسر، خلیق ہیں۔ شاعری کا شوق فطری اور مشاق ہیں۔"

حضرت حمید نے یوں تو شاعری کی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی۔ لیکن انھیں غزل گوئی سے خاص رغبت تھی۔ ان کی غزلوں میں ان تمام روایات تغزل کا رچاؤ موجود ہے جو ولی، درد، آتش اور غالب کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ لیکن خواجہ میر درد شاد، آتش کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ مرحوم کا نظریہ شاعری حسب ذیل سطور سے ظاہر ہوتا ہے جو آپ کے غیر مطبوعہ دیوان کے دیباچہ سے ماخوذ ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ اس وقت ایسی شاعری کی ضرورت ہے جو انسانی زندگی کے تعمیری پہلو سے بحث کرے اور قوم کے قوائے خوابیدہ کے بیدار کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہو اور صرف خیالی باتوں میں ہمارا وقت ضائع نہ کرے۔ لیکن جس طرح روح اور جسم کا ربط باہمی حیات انسانی کا ضامن ہے اسی طرح اصلاحی شاعری کے ساتھ ساتھ روحانی اور پاک جذباتی شاعری بھی سماجی زندگی کا جزو لاینفک ہے اور اب جبکہ ہمارا ملک آزاد ہو چکا ہے۔ ہمیں روحانیت اور اخلاقیات کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے روحانی اور اخلاقی بیماریاں قوم کے قوائے مسلم کو معطل کرتی جاتی ہیں اور اس طرح قوم آزادی کی نعمت رکھتے ہوئے بھی ملک کی پریشان حالی کا سبب بن جاتا ہے۔ اور فرحت و سرور کے آفتاب درخشاں پر نکبت و انتشار کے بادل چھا جاتے ہیں۔ عرفانی شاعری ہی اس مرض کا علاج بن سکتی ہے۔ جس بادۂ عرفان کا دور حضرت درد سے سلسلہ بہ سلسلہ حضرت شاد تک چلتا رہا اور بزم شاعری کو پر کیف بناتا رہا۔ ضرورت ہے کہ وہ دور ذرا تیزی سے چلایا جائے اور اس طرح ہماری شاعری قوم کے لئے مفید تر ثابت ہو۔"

حضرت حمید عظیم آبادی کو فن عروض پر کامل دست گاہ حاصل تھی اور اس فن پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں جامع العروض، رموز العروض اور مفتاح العروض قابل ذکر ہیں۔ حضرت حمید کے اہم کارناموں میں سے ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے استاد حضرت شاد کے اکثر و بیشتر کلام کو عوام کے سامنے پیش کرنے کی ہر ممکن جدوجہد کی۔ آپ صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ مختلف مقالوں اور مضامین کے علاوہ کئی کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں "بہار میں اردو" (غیر مطبوعہ) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

آپ ۱۹۵۶ء میں عظیم آباد سے ترک وطن کرکے سکھر آگئے اور وادی سندھ کے اس پس ماندہ علاقے میں علم و ادب کے چراغ کو فروزاں کرنے میں ہمہ تن کوشاں تھے۔ مجلس ادب سکھر کا قیام آپ ہی کا رہین منت ہے۔ علاوہ ازیں ایک سہ ماہی جریدہ "جام جم" بھی آپ کی ادارت میں تشنگان ادب کی پیاس بجھاتا رہا۔ آپ رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان کے بھی سرگرم کارکن تھے۔

آپ جب عظیم آباد سے رخصت ہو رہے تھے تو وہاں کے اہل قلم حضرات نے انتہائی رنج والم کا اظہار کیا تھا۔ اس موقع

جو الوداعی نظمیں وغیرہ آپ کی خدمت پیش کی گئیں ان میں سے دو رباعیات حسب ذیل ہیں۔

اے صاحبِ تخت و تاجِ اقلیمِ سخن　　　وائے مظہرِ شاد و مشرقِ نیرِ حسن
در ہجرِ حمید کے تواں زیستِ قتیل　　　اے آبروئے بہار! اے جانِ وطن

شاہ قائم قتیلؔ (داناپور)

شاگردِ رشید و وارثِ مسندِ شادؔ　　　فن کا ہے ادب نواز فخرِ استاد
یارانِ وطن سے ہو رہا ہے رخصت　　　فریاد جوادثِ زمانہ فریاد

رازؔ عظیم آبادی مرحوم

---

۲۷ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو آپ کچھ عرصہ کے لئے عظیم آباد گئے لیکن وہاں کی خاک میں کچھ ایسی کشش تھی کہ آپ واپس نہ آسکے اور ۶ نومبر ۱۹۶۳ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

پروفیسر منظور حسین صاحب شورؔ صحیح فرماتے ہیں:۔

"ایسی بزرگ اور شفیق شخصیت کا سایہ کسی گھر اور ماحول سے ہمیشہ کے لئے اٹھ جانا ایک ایسا ثقافتی، اخلاقی، روحانی اور ادبی نقصان ہے جس کی تلافی تا حشر ممکن نہیں"

آپ کی ایک غزل ناظرین کے مطالعہ کے لئے پیش کی جاتی ہے۔

کیا اپنی زباں سے کہے دیوانہ کسی کا　　　زنجیر کی جھنکار ہے افسانہ کسی کا
پروانہ شفاعت کا ہو ہر تارِ گریباں　　　ہو کر کوئی دیکھے بھی تو دیوانہ کسی کا
کس حسن سے بیڑی کو علائق کی اتارا　　　عاقل کو سبق دیتا ہے دیوانہ کسی کا
ہر نقشِ قدم مہرِ خُمِ بادۂ ادراک　　　کہنے کو تو دیوانہ ہے دیوانہ کسی کا
اے مشقِ تصور کہیں ہو جاؤں نہ کافر　　　کعبہ کہیں ہو جائے نہ بُت خانہ کسی کا
اک دل کی کہانی کا یہ طومار ہے سارا　　　قصہ نہ کسی کا ہے نہ افسانہ کسی کا

بیکار بھی ہوتے ہیں حمیدؔ آپ پریشاں
ہوگا نہ ہوا ہے دلِ دیوانہ کسی کا

سلیمان خطیب

یاد

یاد بولے تو آنسو کی ڈھلتی لڑی　　گھپ اندھارے میں چھوٹی ہوئی پھلجھڑی
یاد بولے تو رَینی پو مدھم لکیر　　جیسے بارے میں اڑتی ہے ہلکی عبیر
یاد بولے تو پلکاں پو آنسو کی اوٹ　　کالے بادل پو چاندی کی چمکیلی گوٹ
یاد روتے سو انکھیاں میں گوری کا روپ　　جیسے چاندی کی رم جھم میں سونے کی دھوپ
یاد بولے تو نظراں جھکانے کا نام　　ایک نقشہ بنا کو مٹانے کا نام
یاد بولے تو تکیہ میں گجرے کی بو　　جیسے کیوڑے کا کانٹا کلیجے کے پاس
یاد بولے تو خالی دیوانے کا خواب　　ایک بالک کا جیسے ادھورا جواب
یاد بولے تو بچپن کی بھولی نراس　　لال اودی دھنک کو پکڑنے کی آس
یاد بولے تو جوہی کی کھِلتی کلی　　سوتے بالک کے ہونٹاں پو جیسے ہنسی

یاد بولے تو دل میں چھپانے کی بات
چپ ذرا سوچ کو مسکرانے کی بات

کاوش بدری

قصیدۂ جلال و جمال

یہ لوچ یہ رنگ روپ تیرے خط و خال
سنگیت کے زیر و بم، مصور کا خیال

سر تا بہ قدم فروغِ مینائے جمال
یا آتشِ سیال کا رگ رگ میں ابال

رک رک سی گئی ہے میرے انفاس کی چال
پائل کے چھناکے ہوں کہ بجتی ہوئی تال

سرچشمۂ صہبائے ابد میرا خیال!
ہر جرعۂ افکار مرا سحرِ حلال

ظلمات میں لعلِ شب چراغ تیرے دہاں
ہر صبح پہ بھاری ترے گیسو ترے خال

مہندی سے رچے ہوئے گل نار قدم!
تپتے ہوئے شعلے میں جیسے سونے کا جمال

چلنا ترا رک رک کے یاد آتا ہے مجھے
جیسے کچھار سے کوئی طرار غزال

والشمس کی تشریح تری پیشانی
واللیل کی تفسیر ترے گیسو و خال!

پوچھے یہ کوئی معرفت کسی جوگی سے
بیٹھے ہیں تری راہ میں ہم کب سے نڈھال

ہر آن ہے کلِّ یومٍ ھو فی الشان کا حسن
آیا ہے نہ آئے گا کبھی تجھ پہ زوال

جادہ جادہ حیاتِ تازہ کی نمود
منزل منزل دوام، ہستی کا جمال

ہر گوشۂ دل جلوہ گہِ ایجاب و قبول
ہر بزمِ خرد افتراق و مائل بہ زوال

ہر گل کی مہک میں کوئی خوشبوئے بدن
ہر غنچۂ بستہ لب ہے معشوق خصال

ہر سمت تکا پوئے نظر کی یورش!!
ہر سمت تنے ہوئے حجابات کے جال

اک زخم اگر ہو تو دکھا دیں تجھ کو
یاں سلسلۂ داغِ جگر کی ٹکسال!

اب اس کے سوا کیا سر و سامانِ حیات
آنسو نالے سرشک فریاد سوال!

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل
مرنا بھی محال اور جینا بھی محال!

لمحہ لمحہ حیاتِ تازہ کی نوید
عرصہ عرصہ حیاتِ ماضی کا مآل

یہ کیسی ہما ہمی یہ کیا شور بے شمار
ہیں جمع نقطۂ عدو پئے استقبال

اے حاتمِ فطرت اسے کچھ تو دیدے
پھیلاتا ہے ہر آن کوئی دستِ سوال

تسلیم و رضا کا تخم بویا ہم نے
پھر کیا سکون و امن کیا اقبال

ہیں سطوت و طمطراقِ عالم عالم
پیدا مجھ سے ہزار جنگ و جدال

مریم کا تقدس ہے مرا احساس ہیں گم
سیتا سے عبادت مری تصویرِ خیال

ہر سانس مری مروحۂ حسنِ ازل
ہر ایک نظر مرأتِ فردوسِ جمال

الہام ہی الہام دمِ فکرِ سخن
اعجاز ہی اعجاز برنگِ اجمال

گویا دمِ عیسیٰ مرے ہر فکر میں بند
منصور کی جرأت مری معراجِ خیال

آیاتِ بلیغ ہیں کہ فصاحت کا نچوڑ
یہ میری زبان ہے کہ موسیٰ کا کمال

ہر مصرعِ تر میں مرے دل کی دھڑکن
ہیں میری غزل میں ہر غم کے احوال

ہیں خاتمِ نگینۂ معشوقِ غزل
ہیں مہر و مہ چرخِ زبان اور خیال

موجوں کی روانی سی روانی میری
ہنگامۂ طوفاں میں مرا استقلال

دیکھا ہے ہر اک شعر نے آنکھوں سے مجھے
پائی ہے ہر اک شعر نے میری پامال

بے موسمِ گل بھی جو اگر میں چاہوں
خود برگِ خزاں دیدہ بھی ہو جائے نہال

کھلتے ہیں بس اک گھونٹ سے دنیا کے رموز
ہر جام پہ بھاری ہے مرا جامِ سفال

سُبحانکَ لا عِلمَ لَنا پڑھتا ہوں
کیا میری بساط و علم کیا میرا کمال

وا ہوتا ہے ہر عقدہ لاینحل بھی
اللہ رے کاوش کی تگاپوئے خیال

انوار ظہوری

شیشے پر تماشا دیکھتی ہے
...یرت سے کیا کیا دیکھتی ہے
...غر مجھ میں ایسے کون سے گُن
... سے جو دنیا دیکھتی ہے
...ہے کہ با چشم تحیر!
...یری تمنا دیکھتی ہے
... دیکھ! تیری کارسازی
... بھر کو تڑپتا دیکھتی ہے
... بے مہری و ناآشنائی
...ت شرم آسا دیکھتی ہے
...چھ سوچنا پڑتا ہے ان کو
...جانب جو دنیا دیکھتی ہے
...فل میں جھک جاتی ہے اُن کی
...ؤں جب دل سے اٹھتا دیکھتی ہے
...ب دیکھتی ہے چشم حیرت
...ت کا نتیجہ دیکھتی ہے
...مید کو ترساں نہ کیجے!
...مدت سے رستہ دیکھتی ہے
...ب جس طرف اٹھتی ہے میری!
... ہی نرالا دیکھتی ہے
... اتنی توجہ سے نہ دیکھو
... ایک دنیا دیکھتی ہے

فرحت کیفی

ختم وفا غیر پر اور جفا میرے ساتھ
پوچھتے ہو کیا ہوا کیا نہ ہوا میرے ساتھ
شوقِ فزوں کے لئے جوشِ جنوں چاہیئے
تا حدِ منزل رہی لغزشِ پا میرے ساتھ
اتنا تعلق تو ہے ترکِ تعلق کے بعد
میرے فسانہ میں ہے نام ترا میرے ساتھ
جینے کی خاطر مرے مرنے کی خاطر جئے
آج دوانوں کا سا حال ہوا میرے ساتھ
چرخ کی یہ کج روی دیکھئے کب تک رہے
معرکہ آرا رہا وقت سدا میرے ساتھ
رات میں دیدی خبر صبح کی تنویر کی
میرے جلے دل نے وہ کام کیا میرے ساتھ
دوست کنارے سے ہی محوِ تماشا رہے
جبکہ ہم آغوش تھی موجِ بلا میرے ساتھ
گردشِ شام و سحر بچ نہ سکی دوستو
نشہ میں جب رک گیا وقت رکا میرے ساتھ
خاکِ چمن کے سوا چاکِ کفن کے سوا
بادۂ گل رنگ بھی جذب ہوا میرے ساتھ
دیکھئے فرحت ذرا حوصلۂ اہلِ فن
موضوعِ شعر و سخن وقت رہا میرے ساتھ

کیف انصاری

یں لچکتی ہوئی شاخوں پہ نظر رکھتے ہیں
ہم بہاروں کے عزائم کی خبر رکھتے ہیں

چاند ڈوبا ہے تو مایوس نہیں ہیں ہم لوگ
تو اندھیرے میں ہیں امیدِ سحر رکھتے ہیں

کون کہتا ہے کہ تنہا ہیں رہِ فرقت میں
ہم تو سائے کو بھی سرگرمِ سفر رکھتے ہیں

ہم نہیں ایسے کہ پلکوں پہ سجائیں گوہر
غم تو رکھتے ہیں بہ اندازِ دگر رکھتے ہیں

کیا عجب لوگ ہیں اے کیفؔ یہ دیوانے بھی
کس قدر جرم ہے احساس مگر رکھتے ہیں

اختر حمیدی

عجب موجِ خزاں مہنگی پڑی ہے
بہارِ گلستاں مہنگی پڑی ہے

چمن میں پھول یوں بھی رو رہے ہیں
نگاہِ باغباں مہنگی پڑی ہے

حدیثِ گردشِ غم کے علاوہ
ادائے دلبراں مہنگی پڑی ہے

ترے کوچے میں کھائے زخم کتنے
یہ راہِ کہکشاں مہنگی پڑی ہے

وفا تو ہر زمانے میں گراں تھی
جفا بھی اب یہاں مہنگی پڑی ہے

بدن میں ہو گئے پیوست کانٹے
شگوفوں کی دکاں مہنگی پڑی ہے

صلیبیں ہر جگہ آراستہ ہیں
ہمیں اپنی زباں مہنگی پڑی ہے

زمانے کو ملا موقع ہنسی کا
مجھے آہ و فغاں مہنگی پڑی ہے

کسی کی جستجو میں ہم کو اخترؔ
یہ گردِ کارواں مہنگی پڑی ہے

مظفر حنفی ہسوی

کیا ہم خیالِ یار کو اذنِ خرام دیں
پھر اے غمِ حیات قریب آرہی ہے شام

اس وادیٔ جنوں میں اگر ساتھ دے سکے
دل کو بھی ساتھ لیتے چلیں اے سبک خرام

زہاد و قیس بھی تو ہمارے ہی روپ تھے
کہیے سبھی گناہِ محبت ہمارے نام

سچ ہے کہ چاند ڈوب گیا، رات ڈھل چکی
بس ایک جام پیرِ مغاں! صرف ایک جام

یہ نقشِ پا ضرور اسی فتنہ گر کا ہے
یہ ہے مرا مقام یہی ہے مرا مقام

وہ بات خارزارِ جنوں کی مگر کہاں
ویسے تو راستے میں پڑے سیکڑوں مقام

گھرا کوئی فریب ہمیں باغباں نہ دے
کیسا ہے گلستاں کہ نہ دانہ کہیں نہ دام

ہم اہلِ میکدہ کی بھی ہو جائے گی نجات
اچھا ہوا کہ آ ہی گئے شیخ جی! سلام

صدیاں گذر چکی ہیں سناتے ہوئے ہمیں
یہ داستاں ہنوز نہیں ہو سکی تمام

منزل قریب ہے ارے منزل قریب ہے
اے میرِ کاروانِ جنوں تو ہمیں نہ تھام

اب آپ یوں بھی طول نہ دیں داستان کو
رکیے جنابِ شیخ! بہک جائیں گے عوام

اختر نظمی

رندوں کی محفل سے نکل کے ۔۔۔ چل نہ سکے دو گام سنبھل کے
دل میں یاد کی موجیں اٹھیں ۔۔۔ دھیمے دھیمے، ہلکے ہلکے
میں نے قدم جب بزم میں رکھا ۔۔۔ صہبا مچلی، ساغر چھلکے
میری نظر کی ہر جنبش پر ۔۔۔ کتنے رنگیں آنچل ڈھلکے
چھیڑ رہا ہے سازِ تمنا ۔۔۔ آج کوئی پھر ہلکے ہلکے
ان ہونٹوں کی بات نہ پوچھو ۔۔۔ مصرعے ہیں رنگیں غزل کے
خواب ہے یا وہ پیشِ نظر ہیں ۔۔۔ دیکھ رہا ہوں آنکھیں مل کے
ساقی مجھ تک آتے آتے ۔۔۔ ہاتھ نہ بہکے، جام نہ چھلکے
پھول بچھے ہیں راہِ وفا میں ۔۔۔ میرے ساتھ تو دیکھو چل کے
پھر مجھ سے روٹھے ہو ۔۔۔ بھول گئے سب وعدے کل کے
اپنے فسانے، ان کے آگے ۔۔۔ دہراتے عنوان بدل کے
شامِ الم کی صبح نہ دیکھی ۔۔۔ بجھ گئے کتنے دیپک جل کے
کتنے سیہ خانوں میں نظمی
افسانے ہیں رنگ محل کے

روشن پٹیالوی

چراغِ انبساط

آہ مظلوماں سے اے سفاک انسانو بچو
دیوِ استبداد کے پنجے سے ہم جائیں نکل
نخلِ دنیا میں محبت کے لگیں پھر پھول پھل
زندگی کے عقدۂ دشوار کا دل جائے مل
ہو نہ حاصل ڈھونڈنے سے بھی فلاکت کا سراغ

راحتوں اور کلفتوں کو اس طرح سے دیں سمو
صبر کے قلزم میں ہو یہ کشتیٔ عمرِ رواں
حسرتوں کا صفحۂ ہستی سے مٹ جائے نشاں
عزم بھی ہوں مستقل اور ہمتیں بھی ہوں جواں
ہو مسرت سے ہر اک انسان کا دل باغ باغ

دھوئیں فرقِ دہر سے ظلماتِ شر کی گرد کو
ہو مجلاّ نورِ ایماں سے جبین کائنات
جلوہ ہائے طور کا منظر دکھائیں شش جہات
پھر نظر آنے لگیں دنیا میں آثارِ حیات
جگمگا اٹھیں شبستانِ تمنا کے چراغ

بزمِ ہستی کا ہر اک ذرہ مثالِ برق ہو
مطلعِ امید پر چمکے خوشی کا آفتاب
ساقیٔ دوراں پلائے عیش کی رنگیں شراب
گوشے گوشے میں جہاں کے آئے ایسا انقلاب
عرش پر اڑنے لگیں افسردہ روحوں کے دماغ

راز امتیاز

مہرِ نوروز

قاصدِ درد بھٹک جاتے ہیں پلکوں کے قریب
ایسی تاریک فضاؤں میں سفر کون کرے!
عرقِ شرم کے موتی بھی ستارے نہ ہوئے
میرے چہرے کی سیاہی نہ گئی
اف! یہ بجھتی ہوئی شمعوں کا دھواں کیسا ہے.....

یاد آتا ہے مجھے
اپنے چہرے کو چھپانے کا مقام
اپنا ہی دل ہے کوئی اور نہیں ———.
آتشِ دل ہی جلا سکتی ہے چہرے کی یہ تاریک فضا———...

تم سے بس اتنی گزارش ہے مری
اپنے دامانِ رفاقت کی ہوائیں دے دو
زخم چہرے کے بھر آئیں گے سحر ہونے تک———...

کل مجھے چہرۂ بے داغ کے ساتھ
مہرِ نوروز سے ملنے کے لئے جانا ہے———...

قاضی سلیم

پروانہ

دیکھیں کیا ہے
آؤ پس دیوار چلیں
گہرے نیلے گنبد کے اس پار چلیں
چاند ستاروں کی آنکھوں سے پیار کا امرت چھنتا ہے
ذہن میں صدیوں سے اک مشفق باپ کا چہرہ بنتا ہے
انجانی فردوس میں شاید اپنا ہی کچھ حصہ ہے
خوف و عقیدت کے یہ پردے اٹھتے ہیں کچھ اور اندھیر
گھنگھور گھٹائیں اور چھٹتیں کچھ اور چھٹیں

اس دھرتی کے سینے پر تاریک گڑھوں کے زخم لٹے
رینگتے کیڑے سانپ دفینے کند فضائیں بند ہوا
کتنی ہاہا کار مچی
کھوج میں سونے چاندی کی
پاتال تلک پیکار چلی
جو زہر تھا اپنا بانٹ چکے
اپنی اپنی لاشوں سے دھرتی کے گڑھے سب پاٹ چکے
تیئے نئے ارمانوں کو ہے خواہش نئے مزاروں کی
یا آج خلا میں کھنچ رہی ہے چاہت چاند ستاروں کی
جو کچھ بھی ہو
آؤ پس دیوار چلیں

(ہندی کہانی)

شیو پرشاد سنگھ

ترجمہ

ممتاز راشد اجمیری

میں، کلیان، اور جہانگیر نامہ

ہاسٹل کے اسی کمرے کی کھڑکی سے جس میں کہ میں رہتا تھا سامنے کا میدان ایک پہاڑی لینڈ اسکیپ معلوم ہوتا تھا۔ ایک سے ہاتھ پر سرخ رنگ کی ایک سڑک تھی جو ایک ہرے بھرے کھیت پر جاکر ختم ہوتی تھی اور اس کھیت میں باجرے کے پودے اپنی کلغی نما بالیوں کو ہلا ہلا کر آسمان میں اُڑتی ہوئی کسی ہنس پری کو اشارے کرتے رہتے تھے۔ کھیت کے پاس ہی جہاں پر کھیت نہ تھا۔ صرف اوبڑ کھابڑ زمین تھی جس میں کہ گھاس اُگی ہوئی تھی، وہاں ایک لڑکی روزانہ اپنے جانوروں کے درمیان میں پھدک پھدک کر تتلیاں پکڑا کرتی تھی۔ جیسے اس کے پھدکنے سے جانور کسی قسم کی شرارت نہ کرتے ہوئے صرف گھاس چرتے رہیں گے۔

کمرے کا دروازہ بند کر دینے پر بھی برآمدے سے اٹھتا ہوا لڑکوں کا شور، نوکروں کی دوڑ دھوپ اور اخبار والوں کے جوتوں کی کھٹ کھٹ کی آوازیں میرے کانوں میں ایک عجیب طرح کی سحر آفریں کیفیت پیدا کرتی ہیں۔

میں ابھی ابھی سو کر اٹھا ہوں لیکن نہ تو مجھے ہاتھ منہ دھونے کی جلدی ہے اور نہ ہی مجھے نہانے کے لئے تولیہ اور صابن لے کر باتھ روم کے سامنے لائین میں کھڑے ہونے کی تمنا۔ مجھے کسی بھی چیز کی عجلت نہیں ہے کیونکہ میں سامنے کے اس حسین منظر کو پوری طرح اپنی آنکھوں، دل، اور دماغ میں جذب کر لینا چاہتا ہوں۔

"کھٹ، کھٹ، کھٹ ——" باہر سے کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

"کون ہے —— ؟"

"میں ہوں چرن —— !"

اگر کوئی دوسرا نوکر ہوتا تو شاید مجھے غصہ آجاتا اور میں دروازہ نہ کھولتا۔ اور اگر کھولتا بھی تو اس طرح کہ وہ نوکر میرے غصے کی زد میں آجاتا۔ میں چلا چلا کر اسے ڈانٹتا۔ میرے چلانے کی آواز سن کر آس پاس کے کمروں سے لڑکے نکل کر آجاتے۔ ونگ کا نوکر دوڑا دوڑا آتا۔ اور کوئی دوسرا آدمی جاکر میس منیجر کو اس کے نوکر کی اس بری حالت کی خبر دیتا اور میس منیجر بھاگا بھاگا میرے کمرے کے دروازے تک آجاتا مگر میری سرخ آنکھیں دیکھ کر وہیں دروازے پر ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا اور پھر بڑی عاجزی سے کہتا —— "بابو! ہم نے اس لونڈے کو کئی بار سمجھایا کہ بابو صاحب کافی رات گئے تک پڑھتے رہتے ہیں اس لئے برتنوں کے لئے جلدی مت کیا کر اور جب بابو صاحب اپنے آپ ہی جاگ کر دروازہ کھولیں تب جاکر برتن لایا کر

لیکن یہ گدھا بھول جاتا ہے۔ اس بار آپ اور معاف کردیں جناب ——— !"

میرا مقصد نوکر کو ٹھکانے لگانا نہ ہوتا، میں تو محض مینیجر کی یہ درخواست سننے کے لئے ہی یہ سب کچھ کیا ہوتا، تاکہ سبھی لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں ایک ریسرچ اسکالر ہوں، بی۔ اے یا ایم۔ اے کا کوئی گاؤدی قسم کا چھوکرا نہیں ہوں جو نوکریا میں مینیجر کی خوشامد کرے۔ اور پھر میں سب لوگوں پر یہ دھاک بھی جمانا چاہتا ہوں کہ میں رات کو کافی دیر تک پڑھتا رہتا ہوں۔ بیچارہ نوکر سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا جھوٹے برتن اٹھا کر کمرے سے باہر نکل جاتا۔ تب میں بس مینیجر سے ایک کپ چائے کے لئے کہتا اور چائے آجانے پر کھڑکی کے پاس بیٹھ کر مزے لے لے کر پیتا۔ سگریٹ جلا کر طویل کش لیتا اور بڑے اطمینان سے دھواں اڑاتا تاکہ وہ دھواں کھڑکی پر گول سوراخ والی جالیاں بنادے۔

"کھٹ، کھٹ، کھٹ ——— !"

"او ہو؟ آجا نا بھائی، کنڈی تو بہت دیر سے کھلی ہوئی ہے ——— !"

چرن کمرے میں گھستا ہے تو مجھے کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا پا کر آہستہ سے ہنستا ہے مگر میں فوراً ہی گردن گھما کر اس کی اس بدتمیزی کو دیکھ لیتا ہوں اور چرن جیسے میرے خیالات کو پڑھ کر کانپ جاتا ہے اور پھر کچھ اداس ہو کر برتنوں کو سمیٹنے لگتا ہے ——— لیکن آج یہ اتنا اداس کیوں ہے؟ ابھی ابھی تو یہ شرارت سے ہنسا تھا۔ مجھے وہ آدمی بہت برا معلوم ہوتا ہے جس کے ہونٹ تو مسکرائیں مگر آنکھیں اس طرح ٹھنڈی رہیں جیسے کہ جم گئی ہوں۔ اس وقت انسان کا چہرہ جانے کیوں چوکور ہو جاتا ہے۔ اور چوکور چہرے سے مجھے سخت نفرت ہے۔

"کیوں بے آج تو اتنا اداس کیوں ہے ——— ؟"

لیجئے میں نے جیسے ہمدردی نہیں کی بلکہ مٹھائی کی پلیٹ سامنے رکھ دی ——— چرن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ رونے لگا۔ میں نے کئی بار پوچھا مگر وہ گدھا خاموش رہا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں وہ صرف گردن ہلاتا رہا تاکہ میں یہ سمجھوں کہ اسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔

"جہنم میں جا، اٹھا یہ سب برتن اور یہاں سے دفع ہو جا۔ بتاتا ہی نہیں کہ کیا بات ہے؟ کیا مینیجر نے تجھے مارا ہے؟ اگر مارا ہے تو مجھے بتادے میں ابھی اس کی گردن ناپ لوں گا۔ کل سالے نے پھر ٹھنڈا کھانا بھیجا تھا ——— !"

چرن جھوٹے برتن اٹھا کر چلا جاتا ہے، میری سگریٹ ختم ہو چکی ہے، اگر میں چاہوں تو دوبارہ سگریٹ سلگا سکتا ہوں مگر اس کم بخت نے تو دھوئیں کی وہ ساری جالیاں توڑ ڈالی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ نہا دھو کر ذرا تازہ دم ہو جاؤں آخر اس کام کو بھی نبٹا ہی دینا ہے ——— !"

"کھٹ، کھٹ، کھٹ ——— !"

"پھر آگیا کم بخت، کیوں بے اب تجھے کیا ہوا ہے ——— ؟" میں نے غسل خانے میں سے پوچھا

"بابو ———"

"ہاں، ہاں! بول بھائی کیا بات ہے ——— ؟"

"بابو ——— وہ میم صاحب آئی ہیں ——— !"

"کون ؟ ——— اوہ !" میں نے بیچ میں ہی اپنے شوق کی گردن پر چھری پھیر دی ——— "بیوقوف کہیں نہ جانے کتنے گاؤدی قسم کے لوگ صاف اور تولیہ لئے ہوئے باہر چکر لگا رہے ہیں اور یہ گدھا ——— " میں نے دفعتہً چابیوں کا گچھا اٹھایا اور دروازے کے اوپر کی خالی جگہ میں سے اس کی طرف بڑھا دیا۔ ایک ہاتھ چھپکلی کی طرح لپکا اور میرے ہاتھ سے گچھا لے کر دبک گیا۔

"کب آئیں تم ——— ؟" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس طرح پوچھا کہ جیسے مجھے معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کب آئی۔ سوال کرنے کے بعد میں بھی ریکھا کی طرح خاموش ہو گیا کیونکہ وہ آج ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہی ہے۔

"دیا ! میں تم سے ایک خاص بات کرنے کے لئے آئی ہوں ——— !"

میں خاموش رہا کیونکہ میں اس بات کا ہی انتظار کر رہا تھا

"پہلے چائے تو پی لو میں ابھی ابھی کینٹن میں کہتا ہوا آیا ہوں، اب آتی ہی والی ہوگی ——— " میں نے مزید خاموشی کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے اس سے کہا :

"کینٹن کا نوکر چائے لے آیا ہے، آج چائے بھی میں نے ہی بنائی ہے۔ ریکھا نے باوجود میرے شدید اصرار کے چائے کے علاوہ کسی دوسری چیز کو ہاتھ نہیں لگایا ہے اور چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر بھی وہ کہیں اور دیکھتی رہی اس آنکھوں کا نادیدہ پہرہ جب اس کے چہرے پر نہیں ہوتا تو وہ کچھ اور بھی حسین نظر آتی ہے۔ وہ خاموشی سے چائے پیتی، چائے ختم ہو جانے پر پیالی کونے میں رکھ کر رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے وہ بولی :

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم پتا جی کو اپنا پتہ کیوں نہیں بتانا چاہتے ——— ؟"

"پتہ ——— ؟"

"ہاں ! میں نے تم سے کہا ہے کہ پتا جی تمہارے پتا جی کا نام جاننا چاہتے ہیں اور وہ مجھ سے کئی بار کہہ چکے ہیں وہ تمہارے پتا جی سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں ——— !"

اور پھر میرے چہرے کو دیکھ کر ریکھا خاموش ہو جاتی ہے۔

"تمھیں برا معلوم ہوا ڈیر ——— وہ دھیرے سے کہتی ہے۔"

"میں تم سے سو بار کہہ چکا ہوں ریکھا ——— میں جھنجھلا جاتا ہوں۔ آخر یہ ہمارا اور تمہارا ہی معاملہ ہے نہ : اس میں پتا جی سے کیا واسطہ ؟ شادی میں کروں گا یا میرے پتا جی ——— ؟

ریکھا بری طرح جھینپ جاتی ہے اور اپنے فقرے کی حماقت کا احساس ہوتے ہی میں اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے ہی ہی کر کے ہنسنے لگتا ہوں ——— !

"خیر تم کچھ بھی کہو، مگر آج شام کو پانچ بجے تمھیں ہر صورت میں آنا ہے، پتا جی چائے پر تمہارا انتظار کریں گے

ر تم انھیں سمجھا دینا کہ شادی کون کرے گا ؟
وہ چلی گئی تو میں نے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا۔ مگر اب سامنے نہ تو وہ جانور تھے اور نہ ہی وہ لڑکی، لاچار ولڑ تھیسس کی طرف میں نے اپنے دماغ کو موڑنا چاہا۔ پچھلے دو دنوں سے یہ سامنے رکھا ہوا ہے ـــــ جہانگیر نامہ ـــــ یہ جہانگیر بھی ایک ہی آدمی تھا۔ اپنی تعریف کرنے کا آرٹ تو کوئی اس سے سیکھے، لکھتا ہے :-

"میں نے عدل کی حفاظت کے لئے شاہ برج سے جمنا کے کنارے پر گڑے ہوئے ایک کھمبے تک ریشم کی ایک ڈور بندھوا دی تھی جس کے ایک سرے میں سونے کی گھنٹیاں لٹکی ہوئی تھیں اور دوسرا سرا جمنا کے کنارے گڑے ہوئے اس کھمبے سے بندھا ہوا تھا، اگر کوئی فریادی فریاد کرنا چاہتا تو وہ اس کا سرا پکڑ کر کھینچ لیتا۔ میں نے اس بات کی سخت تاکید کر دی تھی کہ گھنٹیوں کے بجنے کی اطلاع مجھے فوراً دی جائے"

میں نے بنگال کے صوبیدار شیر افگن کی احمقانہ حرکتوں کو کئی بار معاف کیا۔ مگر اس کا دماغ کچھ ایسا خراب ہو گیا تھا کہ وہ باغیوں کے بہکانے میں آکر حکم عدولی کر بیٹھا۔ میں نے اسے سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ مجھے امید تھی کہ وہ شاہی فوج کے نام سے ڈر جائے گا اور راجدھانی سے باہر نکل کر مجھ سے معافی مانگے گا۔ مگر معافی مانگنا تو درکنار اس نے کچھ باغیوں لے کر شاہی فوج پر حملہ کر دیا ـــــ آخر کار یہ کتا جہنم رسید ہوا۔ مہرالنساء سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں اسے اپنے ساتھ لے کر آگرہ واپس آ گیا"

اچانک جیسے کورٹ یارڈ میں قیامت آ گئی۔ کچھ لوگ تالیاں بجا بجا کر ہنس رہے ہیں تو کچھ سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ میں کمرے سے باہر آیا تو عجیب منظر تھا..... گیٹ کے سامنے نل کے پاس ایک کرسی پر ڈی۔ پی۔ این یعنی دینیشور پرساد نرائن بیٹھے ہوئے ہیں ایک صاف دھوتی اور بنین پہنے ہوئے وہ بار بار اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ آج ڈی۔ پی۔ این اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے وہ ریسرچ اسکالر ہی نہیں بلکہ جج بھی ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دھاڑ کر ہنسے۔

"ارے آئیے بھوا دیا نا تھ جی! آپ کو ہم ایسا تماشہ دکھاتے ہیں کہ آپ کبھو نہیں بھول سکے گا"

"کیا تماشہ ہے بابو صاحب ـــــ ؟"

"ارے واہ رے بھوا جی! آپ کو دکھتا نہیں ہے کہ سامنے چرنا کو ہم مسک ڈلوا کرا وندھا دئے ہیں" میں نے دیکھا کہ سامنے چرنا گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا ہے اور اس کے دونوں ہاتھوں کو پیٹھ کے پیچھے کسی نے لال انگوچھے سے باندھ دیا تھا س ہی ایک بڈھا بھی ہاتھ جوڑے ہوئے اس طرح بیٹھا ہے کہ جیسے ابھی تک تو صرف تماشہ ہوا ہے صحیح اضافہ تو اب ہو گا۔

"معاملہ کیا ہے ـــــ ؟" میں نے چرنا، بڈھے اور بابو صاحب کو دیکھتے ہوئے پوچھا:

"آشنائی کا معاملہ ہے، ای سار چون چرنا ہے نہ تو ن چھوکری کو بہلائے رہا تھا کہ ـــــ کیوں جی بڈھو ٹھیک ہے نہ ـــــ ؟"

"ہاں بابو! ای کئی دن سے وو کا بہلائے رہا ہے کہ آؤ بھاگ چلیں' آؤ بھاگ چلیں ——— !"

"لیکن چرنا کیا کہہ رہا ہے؟" ڈی۔ پی۔ این صاحب! آپ نے اس سے بھی کچھ پوچھا ——— ؟"

"ای سار کا کہی' بچھو کی نس نس ڈھیلی ہوئے رہی ہے۔ ای سار ہمیشہ گر بر گر بر تبیا تا تھا' ہم تو پہلے ہی بوجھ گئے تھے ———"

"خیر آپ اس سے پوچھئے تو سہی' پہلے آپ اس کے ہاتھ کھلوائیے اور پھر اس سے پوچھئے آپ نے تو بس یک طرفہ فیصلہ دے دیا ——— !"

ڈی۔ پی۔ این کو شاید میری تجویز پسند نہیں آئی' مگر سب لوگوں کی رائے اس بارے میں پاکر انھوں نے ایک نوکر کو حکم دے کر اس کے ہاتھ کھلوا دئے۔ چرنا نے اپنی گردن اٹھائی تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ جب میں نے اسکو تسلی دی تو اس نے ہکلاتے ہوئے بتلایا ——— "وہ لڑکی اس کی مہرارو تھی جس سے اس کی شادی چار سال پہلے ہوئی تھی اور یہ بڈھا اس لڑکی کا باپ ہے۔ شادی کے دو چار روز کے بعد ہی یہ اپنی لڑکی کو گھر لے آیا۔ چار سال ہو گئے مگر یہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اپنی لڑکی کو روک لیتا ہے۔ میں اس کے لئے یہاں آیا۔ میس میں نوکری کی' میرے کہنے پر وہ لڑکی اپنے جانوزمل کے ہاسٹل کے پیچھے آنے لگی اور اسی سے یہ معلوم ہوا کہ اس بڈھے کو گانجہ پینے کی لت ہے اور پانچ سو روپئے میں لڑکی کو بیچنا چاہتا ہے ——— !"

چرنا کی بات سن کر بڈھا غصے میں پھنکارتا ہوا بولا ——— "ای جھوٹ ہے سرکار! کمینہ سویدا کہیں کا۔ آپ تو بتاؤ سرکار ای سار کے گھر لڑکی بھلا کا کرے گی' دو جون کی روٹی تو ملتی نہیں ہے۔ اٹھائی گیروں ایسے کے گلے بھلا ہم لڑکی باندھیں گے ——— ؟"

"ہونہہ! تو ای ماجرا ہے' ارے بڈھوا تو ای سب پہلے کا ہے نہیں بولا ہم سے' تو سار بیٹی بیچا چاہت ہے' کا باندھو سک ای بڈھوا کی ——— !" بابو ڈی۔ پی۔ این گرم ہو چکے تھے۔

"ارے باپ ——— بڈھا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا ——— ای ہاں کون رہجنی پڑی ہے' ابہن ہم پولیس میں لکھہ کر ای مت سمجھ لیہو سرکار ہم ایسن مس ناہی ———" کہتا ہوا بڈھا وہاں سے چلا گیا۔ پولیس کا نام سن کر بابو ڈی۔ نے اس طرح کھیس نکال دی جیسے کہ اب تک جو کچھ کر رہے تھے وہ سب محض مذاق تھا۔

"چلو ہٹاؤ تماشہ ——— بابو ڈی۔ پی۔ این کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولے ——— کلو! ہٹاؤ ای سب جانے کہاں کے پھر بیٹھو بٹور لائے' بھاڑ ما جائے ای سار چرنا اور لو چھوکری ———"

ڈی۔ پی۔ این کو نجانے کیا خیال آگیا کہ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گئے اور بڑے سلیقے سے مسکراتے ہوئے بولے:

"کا رے چرنا! ارے سارے تو دوسری چھوکری سے کاہے نہیں بیاہ کر لیتا' او ماں کو نو سر کا باپ کا پڑا ہے کیا آئیں ———"

"جب او ہم کا ناہی چھوڑت تو ہم کیسے چھوڑ دیں بابو ——— ؟"

"مرسار ــــ ایسی پریت ہے تم دونوں کو تو دے دے بڈھوا کو پانچ سو روپئے ــــ دے گا ــــ !"

"ہاں بابو! اگر او پانچ سو روپیہ ہم سے مانگے تو ہم مجبوری کر کے بھر دیں گے ــــ !"

"ہوں ــــ ڈی۔ پی۔ این جانے کیا سوچنے لگے تھے، انھوں نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنے گالوں کو سہلاتے ایک زور کی سانس لی اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میں پھر اپنے کمرے میں آ کر اسی کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ کھڑکی میں اب جالیاں نہیں ہیں، اس لئے ہوا سے ہلتا ہوا وہ باجرے کا کھیت اور کلغی نما بالیاں مجھے صاف نظر آ رہی ہیں۔ ان کی سوندھی خوشبو کی چھاؤں میں ہی ان دونوں نے اپنے پیار کے لئے سب کچھ بازی پر لگا دینے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ محبت کے سامنے انسان اتنا کمزور کیوں ہو جاتا ہے؟

میں نے میز کے اوپر سے جہانگیر نامہ اٹھا لیا ہے۔ لیکن دماغ تو بیچ میں چرنا کی ان گیلی آنکھوں میں اٹکا ہوا ہے۔ وہ صبح برتن اٹھاتے ہوئے اداس تھا۔ اور اب جا کر ان گیلی آنکھوں کا راز مجھے معلوم ہوا تھا۔ اچانک میری نظر جہانگیر نامہ کے صفحہ سات سو تیس پر رک گئی۔ لکھا تھا:

"ایک دن مجھے کچھ نوکروں نے بتایا کہ پاس کے ایک گاؤں میں کلیان نامی ایک لوہار عشق میں ایسا پاگل ہو گیا ہے کہ گاؤں میں روزانہ کوئی نت نئی آفت پیدا ہو جاتی ہے۔ ادھیڑ عمر کی وہ عورت جس سے کلیان محبت کرتا ہے کئی بار سرکاری افسروں سے اس کی شکایت کر چکی ہے، وہ عورت بیوہ ہے۔ اور ایسی کوئی خوب صورت بھی نہیں ہے، میں نے ان دونوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ وہ عورت اپنی پریشانیوں کا ذکر کرنے لگی تو میں نے ہنستے ہوئے کلیان سے کہا کہ اگر واقعی اس کی محبت سچی ہے تو اس کا ثبوت دینے کے لئے وہ سامنے کی چھت سے کود جائے۔ کلیان نے کہا کہ حضور، اگر اس کے ساتھ آپ میری شادی کرا دیں تو میں چھت تو کیا چیز ہے سامنے کے اس برج سے کود جاؤں گا۔ میں نے مذاق میں 'ہاں' کہہ دیا۔ وہ جھپٹ کر چھت پر چڑھا اور کود گیا ــــ وہ بالکل لہو لہان ہو گیا تھا اور کچھ دیر کے بعد ہی وہ مر گیا ــــ یہ عشق بھی کتنا کم عقل ہوتا ہے۔

میں کتاب بند کر کے میز پر رکھ دیتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں چپ چاپ اٹھوں اور بکس کھول کر وہ پلندہ نکالوں جسے میں نے اب تک گناہوں کی طرح چھپا رکھا ہے۔ اس پلندے میں بہت سے کاغذ ہیں، کچھ پیلے، کچھ مڑے ہوئے اور کچھ سفید، کچھ کسی اسکول کے بچے کی کاپی سے پھاڑے ہوئے رول دار ــــ یہ سبھی خطوط ہیں۔ سبھی خطوط میں تقریباً ایک ہی عبارت ہے کہ ــــ "آپ صرف ایک بار ہی آ جائیے، منا اب بڑا ہو گیا ہے، دوسری کلاس میں پڑھ رہا ہے، آپ کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئی ہیں۔ مجھ سے کیا قصور ہوا ہے؟ میں ان پڑھ، بدصورت اور گنوار سہی لیکن آپ کے قدموں میں بیٹھنے کی عزت تو مجھ سے نہ چھینئے۔ دیوتا! میری لاج آپ کے ہاتھ میں ہے، میں اس کے لئے اپنی ہر چیز بازی پر لگا سکتی ہوں۔ آپ چاہے میری جان لے لیجئے لیکن ایک بار واپس آ جائیے، منا آپ کو سلام کہتا ہے ــــ!"

بازی ــــ بازی ــــ ساری دنیا بازی لگانا چاہتی ہے۔ جہانگیر نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ یہ عشق بھی کتنا کم عقل ہوتا ہے۔

اور اسی وقت مجھے یاد آ جاتا ہے کہ آج ریکھا نے مجھے اپنے گھر چائے پر بلایا ہے۔

باقی صفحہ (۲۰) پر ملاحظہ ہو

نقد و نظر

تبصرے کے لئے دو دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔

انتخاب کلام صفی

(اورنگ آبادی) مرتبہ پروفیسر سید مبارز الدین صاحب رفعت ناشر حیدرآباد اردو اکاڈیمی۔ صفحات ۲۰۱ خوب صورت گٹ اپ قیمت دو روپے۔

بہبود علی صفی اورنگ آبادی عصر حاضر کے ان بلند پایہ شعراء کی صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں جنھیں زبان و بیان پر قدرت تامہ حاصل تھی۔ ان کا تعلق داغ اسکول سے تھا اور داغ کی زبان اور انداز بیان کو جس خوبی اور نفاست کے ساتھ برتا اس تک بہت کم شعراء رسائی حاصل کرسکے ان میں نوح ناروی عزیز یار جنگ عزیز اور رضی الدین حسن کیفی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ صفی نے جب مارچ ۱۹۵۴ء میں انتقال کیا تو شاگردوں کا ایک جم غفیر سوگوار چھوڑا۔ بڑی توی توقع تھی کہ صفی کا مکمل دیوان جس کا ان کی زندگی میں طباعت کے لئے اصرار کیا جاتا رہا جلد چھپ جائے گا لیکن معتقدین اور شاگردوں کی آرزو بیا بوجوہ چند در چند پوری نہ ہوسکیں اور صفی کے قول کے بموجب۔

یہ "پراگندہ" ہے جو کچھ بھی غنیمت ہے صفی
میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں

"پراگندہ" ہی رہا صفی کے عزیز شاگرد پروفیسر رفعت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ یہ کلام شائقین کی نظروں سے اوجھل رہے اس لئے موصوف نے اپنے مقدمہ کے ساتھ انتخاب شائع کرکے ایک اہم فریضہ انجام دیا۔ صفی حیدرآباد کے بہت ہر دل عزیز شاعر تھے۔ اس کا انھیں احساس تھا وہ خود کہتے ہیں۔

سو دولتوں کی ایک یہ دولت ہے اے صفی
مجھ کو قبول خاطر و لطف سخن ملا

اور یہ واقعہ ہے کہ یہی ایک دولت ان کے پاس رہی۔ نہ انھوں نے کبھی جم کر نوکری کی اور نہ فکر روزگار میں الجھنے کی کوشش کی وہ بیدل کے اس شعر پر کاربند تھے۔

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

ظاہر ہے کہ محض قناعت پیٹ تو نہ بھر سکی البتہ ان کی شاعری نے داد و تحسین کے مینار کھڑے کردیئے اور مفلسی کا پرچم ہمیشہ ان

میناروں پر لہرا تا رہا۔ اردو اور فارسی شعرا کے لئے یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔ کسی نے فاقوں پر گزر کی اور کسی کو روکھی سوکھی مل گئی۔
صفی کی زبان میں سرمستی و رندی، شوخ بیانی و رنگینی، سادگی و حلاوت ہے۔ وہ محاورے کے استعمال پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ بہت کم شعرا ان کا جواب ہو سکتے ہیں۔ چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

یہ نیند کے آثار نہیں تیرے تصدق
انداز ہی کچھ اور ہے اس لغزش پا کا

جو دوست کی خوشی ہے وہ اپنی خوشی رہے
ہے تو یہی ہے ایک طریقہ نباہ کا

کہو آخر ذرا میں بھی تو سن لوں
مری نسبت سنا ہے تم نے کیا کیا

سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو
یہ دل ہے جدھر آ گیا آ گیا

صفی کو بھی اچھا سمجھنے لگے
زمانہ اب ایسا برا آ گیا

ہائے ماتھے پہ شکن، آنکھوں میں رس، لب پہ ہنسی
آپ جو چاہیں سزا دیں مجھے پیار آ گیا

ان کو دیکھو وہ نظر آیا کئے ہر رنگ میں
مجھ کو دیکھو دیدہ و دانستہ اندھا ہو گیا

واقعی بار امانت کے لئے موزوں بھی ہوں
یا فقط سرکار کی بیگار میں پکڑا گیا

یہ صرف ردیف "آ" سے چند شعر پیش کئے گئے ہیں ورنہ صفی کا سارا دیوان ایسے جواہر پاروں سے بھرا پڑا ہے۔ رفعت صاحب ترتیب اور حیدرآباد اکاڈمی اس کی اشاعت کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ پراگندہ کل نہ سہی جز ہی شائقین تک پہنچ سکا۔ اب بھی صفی کے شاگرد کل کی اشاعت کا تہیہ کریں تو نہ صرف استاد کی بلکہ شعر و ادب کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔

شیطان جاگ اٹھا

مصنفہ عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی۔ ناشر ہنچ بھون پبلی کیشنز جہانگیرآباد۔ بھوپال۔ صفحات ۱۴۲ مجلد قیمت صرف دو سو پچہتر پیسے۔

تخلص بھوپالی اپنی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور پاندان والی خالہ حصہ اول کے مصنف کی حیثیت سے اردو کے ان چند گنے چنے ادیبوں میں ہیں جو اپنی ایک ہی تصنیف پیش کرکے مشہور ہو جاتے ہیں۔ تصنیف میں کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے۔ جو مصنف کو لے اڑتی ہے۔ عصر حاضر کا جائزہ جس وقت نظر سے لیا گیا اور جس چابک دستی سے انھیں اپنے مضامین میں پیش کیا گیا ہے وہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ "شیطان جاگ اٹھا" ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو مزاحیہ سے زیادہ طنزیہ ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے تو ناروا نہ ہوگا کہ یہ ہندوستان کی چودہ سالہ معشوقہ آزادی کی طنزیہ تاریخ ہے۔ مختلف مضامین میں جس سبک روی سے حالات حاضرہ کو پیش کیا گیا ہے اس سے ہمارے قائدین کی اسکیموں کے معائب اور نقائص سامنے آتے ہیں اس کے لئے مبہم عنوان، ہمارے قبرستان، مرغی کے پر، ہماری ایٹمی تعلیم، صحت مند تنقید، مسلم کوہ قاف اور خطوط بھرپور طنز کے حامل ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

پان دان والی خالہ (حصہ دوم)

مصنفہ عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی۔ صفحات ۲۰۰ مجلد خوب صورت گرد پوش قیمت دو روپیہ پچہتر نئے پیسے

پان دان والی خالہ کا یہ دوسرا حصہ ہے۔ انھیں باتوں کو لئے ہوئے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ خالہ کا بیٹا ننھے کانگریس سے ٹکٹ حاصل کرنے کی مہینہ کوشش کرتا ہے اور بڑھیا سے روپیہ وصول کرتا چلا جاتا ہے

یہ ہمارے لکھنؤ نوجوانوں کا کردار ہے جو بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔ خالہ ننھّی کی شادی رچاتی ہیں۔ دولہن کچھ پڑھی لکھی اور پھوہڑ ملتی ہے لیکن وہ اپنے شناساؤں سے اس کے سلیقے کی تعریف کرتی ہیں اور یہ پرانے لوگوں کے طور طریق کی ایک کامیاب جھلک ہے۔ اس طرح جتنے واقعات پیش کئے گئے ہیں ان کا تعلق قدیم وجدید تہذیب وتمدن سے ہے۔ عصری سیاست پر بھی گہرا طنز ملتا ہے لیکن اس کی تکرار کہیں کہیں پر لطف ہونے کی بجائے بے لطفی پیدا کرتی ہے۔

کانگریس اور کانوجی بھی پان دان والی خالہ کا ایک کردار ہی بن گئے ہیں اور اس تنظیم میں جو نقائص پیدا ہو گئے ہیں ان کا اظہار اکثر و بیشتر نئے نئے زاویوں سے کیا گیا ہے اور بھرپور طنز کرنے میں مصنف بے حد کامیاب ہے۔ مزاحیہ اور طنزیہ ادب میں پان دان والی خالہ کے ہر دو حصے گراں قدر اضافہ ہیں۔

شادی کے ستارے

مصنفہ احمد منجم۔ مبارک منزل پہلا مالا روم نمبر ۶ مرزا علی اسٹریٹ بمبئی ۹ صفحات ۹۶ قیمت عا

یہ علم نجوم پر مختصر سا رسالہ ہے جس میں زوج و زوجہ کے ناموں کے سر حروف معلوم ہونے پر ان کے سوانح معلوم کئے جاتے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس کے طریقوں کو نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں سمجھانے کی کوشش کی ہے اور ادبی رنگ دینے کے لئے غالبؔ و اکبرؔ وغیرہ کے اشعار استعمال کئے ہیں۔ علم نجوم پر احمد منجم صاحب نے معلوماتی سلسلہ نکالنے کا پروگرام بنایا ہے جس کی یہ پہلی کڑی ہے۔ علم نجوم سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے ان کی یہ کوشش نہایت مفید اور بار آور ثابت ہوگی۔

سرگذشت امام

امام کاؤ ہاؤ جان مترجمہ محمد صغیر ناشر مکتبہ تحریک ۹۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۶ صفحات ۴۰ قیمت ۵۰ نئے پیسے۔

یہ امام موصوف کا سفر نامہ ہے۔ انھوں نے کانمعظہ میں کافی عرصہ گزارا اور جب چین کی آزادی کی خبریں سنیں تو وہ کبھی تو خطرہ محسوس کرتے اور کبھی خوش بھی ہوتے۔ غرض تبلیغِ اسلام کا جذبہ دل میں لئے چین پہنچے اور حکومت کے نمایندے کی حیثیت سے چین کا دورہ کیا اور عوام کی حالتِ زار کا نقشہ اپنے اس سفر نامہ میں پیش کیا۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ چین کے دیہات اور دور دراز کے علاقے کس عالم میں زندگی گذار رہے ہیں۔ ترجمہ نہایت رواں سلیس اور دلچسپ ہے۔ اس کا مطالعہ معلومات آفریں ہوگا۔

اندیشۂ شہر

مصنفہ احمد جمال پاشا۔ پنچ پبلشرز کچا احاطہ امین آباد لکھنؤ۔ صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت چار روپے۔

احمد جمال پاشا نے ایڈیٹر اودھ پنچ کی حیثیت سے اپنا تعارف کرالیا ہے۔ یہ کتاب انھیں کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں گیارہ مضامین اور چند حسینوں کے خطوط کے زیرِ عنوان ذیل کے خطوط ملیں گے۔

۱۔ کتے کا خط پیلس کے نام۔ ۲۔ گدھے کا خط کرشن چندر کے نام۔ ۳۔ معمارِ اعظم کا خط نئی نسل کے نام اور ۴۔ پڑھے لکھوں کے خطوط محمد فاضل کے نام۔

مضامین میں یونیورسٹی کے لڑکے بھرپور طنز کا حامل ہے۔ مجھ سے ایک چائے کی پیالی نے کہا میں مصنف نے ہوٹل بازو کی ذہنیت کا خاکہ پیش کیا ہے۔ رستم امتحان کے میدان میں اور غدر سن ستاون کے اسباب دلچسپ مضامین ہیں۔ کچھ ایک تحقیقی تنقیدی مطالعہ اور مرزا ظاہر دار بیگ کا فی ہاؤس میں نہایت فن کارانہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اس میں کہیں کہیں

ظرافت بھی ہے اور کہیں محض طنز اور کہیں ان کا امتزاج بھی۔ احمد جمال پاشا کے مضامین کا یہ مجموعہ صد درجہ دلچسپ ہے اور توقع ہے ادبی حلقوں میں مقبول ہوگا۔

روزگار فقیر فقیر سید وحید الدین۔ فقیر سنز لمیٹڈ، کراچی۔ صفحات ۲۵۶ قیمت ۸/-

یہ شاعر مشرق سے چند ملاقاتوں کی یادداشت ہے۔ یہ آرٹ پیپر پر دو رنگ میں عکسی چھپی ہے۔ جدول خوبصورت ہے اور متن سیاہ۔ کئی تصاویر ہیں جن میں بعض تصویریں تو غالباً پہلی دفعہ منظر عام پر آرہی ہیں۔ مثلاً علامہ اقبالؒ کے والدین مولانا میر حسن، ان کے صاحبزادے ڈاکٹر علی نقی شاہ کا گروپ، علامہ اقبالؒ کے بڑے بھائی عطا محمدؒ اور ان کے صاحبزادے اعجاز احمد، علی بخش (خادم)، علامہ اقبالؒ کی قیام گاہیں اور مکتب۔ اس میں کی دو ایک تصویریں نیرنگِ خیال کے اقبال نمبر میں شائع ہوئی تھیں لیکن باقی تصویریں منظر عام پر نہ آسکیں۔ ظاہری لحاظ سے یہ نہایت حسین و جمیل کتاب ہے۔ بلحاظ متن پہلے فیض احمد فیض کا تعارف ہے جو پہلے اڈیشن پر لکھا گیا تھا اور پہلے اڈیشن پر ریڈیو پاکستان سے صلاح الدین احمد ایڈیٹر ادبی دنیا نے جو تبصرہ کیا ہے اس کا دوسرا عنوان ہے۔ اب یہ دوسرا اڈیشن بہت کچھ اضافہ کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کے سوانح حیات کے تعلق سے ابتدا میں احمد دین کی تالیف "اقبال" اور آخر میں سالک صاحب کی "ذکر اقبال" اہم کتابیں ہیں لیکن دونوں نے اپنا نقطۂ نظر علٰحدہ رکھا ہے ایک کتاب میں اگر اقبال مفکر، فلسفی اور قومی شاعر نظر آتے ہیں تو دوسری میں ایک سیاسی اور قومی رہنما۔ لیکن "روزگار فقیر" میں علامہ اقبالؒ مرد مومن، درویش، فقیر اور ایک سچے عاشق رسولؐ دکھائی دیتے ہیں۔ جن پر سرکار دو عالمؐ کا اسم مبارک سن کر نہ صرف رقت طاری ہوتی ہے بلکہ زار و قطار روتے ہیں۔ ایک مسلمان جب اس واردات کو پڑھتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور اس پر بھی ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی ہے اس وقت احساس ہوتا ہے کہ اقبالؒ کے پاس عشق رسولؐ کا کیا مفہوم تھا۔

فیض نے تعارف میں بالکل بجا فرمایا ہے کہ "روزگار فقیر محض ایک دلچسپ تصنیف ہی نہیں قابل قدر بھی ہے ..... لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر چند مرحوم کے متعلق تنقیدی ادب کا ایک ذخیرہ جمع ہوچکا ہے۔ ان تصنیفات میں شاعر مشرق کی ذات شاذ ہی دکھائی دیتی ہے۔ بیشتر لکھنے والوں نے اپنا زور قلم اقبال کے فلسفیانہ عقاید اور تعلیمات کی تفسیر و تشریح پر صرف کیا ہے اور اقبال کے شعر میں بھی اقبال کی ذات کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی"

روزگار فقیر میں اس کا بالکل برعکس کرنل وحید الدین صاحب کے پیش نظر علامہ کی شاعری اور فلسفہ سے زیادہ ان کی ذات ہے۔ اگر یہ کتاب منظر عام پر نہ آتی تو حیاتِ اقبال کے بہت سے گوشے پردۂ خفا میں رہتے۔

ان میں چند واقعات کی طرف اشارہ نامناسب نہ ہوگا۔ نقش اول (پہلے اڈیشن) میں علامہ اقبال کے شعر کہنے کی کیفیت اور اس سلسلہ میں علامہ کی ڈاکٹر لوکس سے گفتگو، علامہ کی مسولینی سے ملاقات کا ذکر، علامہ اور مولانا میر حسن کے تعلقات کی گہرائی، اس کے بعد نقش ثانی میں مسجد قرطبہ کا ذکر، علامہ کی برگسان سے ملاقات، اور علامہ کا پسندیدہ شعر ابوتراب کی تفسیر پروفیسر یوسف سلیم سے علامہ کی گفتگو یہ چند نمونہ از خروارے ہیں ورنہ ایسے واقعات کتاب کے ہر صفحہ پر ملیں گے۔

آخر میں علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کی بابت تحقیق کے ساتھ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ علامہ کی ولادت جمعہ ۹ نومبر سنہ ۱۸۷۷ء

ہے نہ کہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء جیسا کہ عام طور پر مشہور ہو گیا ہے۔

غرض اقبال کے شیدائیوں کو کرنل فقیر سید وحید الدین صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اقبال کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے انھوں نے اپنی تصنیف کا نہ صرف نقش اول بلکہ گرانقدر اضافہ کے ساتھ نقش ثانی بھی عطا فرمایا اور ساڑھے سات روپے ایسی حسین و جمیل کتاب کے لئے بیچ ہیں۔ اردو کی کوئی لائبریری خواہ شخصی ہو یا سرکاری اس سے خالی نہ ہونی چاہیئے۔

کلام بے نیام

از ناشاد (این، بی، سین) ناشر نیو بک سوسائٹی آف انڈیا قرول باغ دہلی۔ صفحات ۲۰۷ قیمت پانچ روپے۔

یہ ناشاد کے چند قطعات کا مجموعہ ہے جن میں اکثر چار تا آٹھ مصرعوں کے ہیں اور جنھوں نے ایک ایک صفحہ کا احاطہ کر رکھا ہے۔ ناشاد کا یہ کلام جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بے نیام ہے اور ان کے نظموں غزلوں کے مجموعہ کی طرح بے لگام بھی ہے۔ بے لگام کلام بے ساختہ اور برجستہ کی تعریف میں آکر ضرورت سے زیادہ آگے نکل جاتا ہے اور کبھی حد سے گزر کر ہزل تک پہنچ جاتا ہے۔ سنجیدہ طبیعت بعض مقامات پر گرانی محسوس کرتی ہے لیکن عصر حاضر کے فیشن پرست نوجوان یقیناً اس سے حظ حاصل کریں گے۔ کلام شعری نقائص سے پاک ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہ بار ملک کے چار مشہور اساتذہ سخن محترم تلوک چند محروم، جناب منور لکھنوی، جناب ابراحسنی گنوری اور جناب سحر نے اٹھا لیا ہے۔

گنوری صاحب نے کلام بے نیام پر جو مقدمہ لکھا تھا اس میں شامل ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے ناشاد کی شاعری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

امید کہ کلام بے نیام بھی کلام بے لگام کی طرح بہت جلد مقبول انام ہوگا۔ (ا۔ ح۔ ص۔)

کلس

مجموعۂ کلام راجندر ناتھ رہبر۔ ۱۱۲ صفحات، کتابت اور طباعت عمدہ۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔ سہ رنگی دیدہ زیب سرورق اور آخری صفحہ پر شاعر کا سادہ و پرکار فوٹو۔ ملنے کا پتہ :- انڈین بک ڈپو۔ دی مال۔ شملہ ۲

راجندر ناتھ رہبر جواں سال اور ذہین شاعر ہیں، ان کی شعری عمر کچھ زیادہ نہیں مگر کلام میں خاصی ذہانت اور رنگینی کے ساتھ ساتھ خیالات کی ستھرائی اور تابناک مستقبل کی پرچھائیں ملتی ہیں۔

رتن پنڈوروی نے رہبر کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ "رہبر صاحب جو کچھ کہتے ہیں سوچ سمجھ کر اور چچے تلے الفاظ میں کہتے ہیں ان کی شاعری کا تعلق جذبات و احساساتِ انسانی سے ہے۔" غرض شملہ جیسے حسین و جمیل مرزعہ کا یہ شاعر ہر طرح کی حوصلہ افزائی کا مستحق ہے اور اولین انتخاب "کلس" پڑھے جانے کے قابل ہے۔

جستہ جستہ غزلوں کے چند شعر آپ بھی پڑھئے اور میری رائے سے اتفاق کیجئے ؎

شب غم اور تو نہ کچھ ہو گا　　اک صدائے سحر سحر ہوگی
سحر کا وقت ہو یا شام کے ڈھلتے ہوئے سائے　　جدا دل سے خیالِ یار دم بھر ہو نہیں سکتا!
تم آجاتے تو کیا جاتا تمہارا　　کسی نے رات بھر رستہ تکا ہے
اس جہاں میں وفا شعاری کو　　ڈھونڈتا ہوں نظر نہیں آتی
قدم قدم پہ دیا ہے فریب تونے مجھے　　یہ دوستی ہے کہ اس دور کی سیاست ہے

"مکس" میں قطعات، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ (و ا خ)

ہمالہ پکارتا ہے

از کشن دت طوفان۔ صفحات ۹۰۔ کتابت طباعت عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔ ناشر مکتبہ قصر اردو۔ اردو بازار۔ دہلی۔

چین کے جارحانہ حملے نے اہل ملک میں جذبات کا طوفان پیدا کیا اور اردو کے شعرا نے بھی اپنی آبدار نظموں کے ذریعہ بھرپور تعاون عمل کیا جس کی مثال ہند کی مسلمہ دیگر بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ اردو شعرا نے حب وطن اور ملک کے دفاع کے تعلق سے ہزاروں نظمیں لکھیں۔ جنھیں عوام الناس سے لیکر عمائدین نے بھی پسند کیا ہے۔ زیر نظر نظموں کا مجموعہ "ہمالہ پکارتا ہے" جناب کشن دت طوفان ایم اے کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ بقول انور صابری صاحب "طوفان کی ان نظموں میں ادبی چاشنی کم اور جرأت عمل زیادہ ہے۔ وہ بہادر خاندان کا فرد ہے اس لئے جنگی اسپرٹ اس کی رگوں میں موجود ہے۔ جذبات کی اس عکاسی میں اس کے اپنے ولولوں کی للکار ہے۔

"ہمالہ پکارتا ہے" میں کشن دت نے قوم کو جوش دلایا ہے، وطنی غیرت کو ابھارا ہے، عزم راسخ کا پیام دیا ہے اور عظمت ماضی کی یاد دلائی ہے اور اس مجموعہ کو شاعر نے نیفا اور لداخ میں اپنے خون سے ہندوستانی تاریخ کا نیا باب لکھنے والے نوجوانوں کے نام معنون کیا ہے۔ جذبۂ حب الوطنی سے سرشار دو جنوں نظمیں اور غزلیں اس مجموعہ میں شامل ہیں اور کئی ایک خوب سے خوب تر ہیں دو قطعات ؎

آج اپنے وطن کی راہوں میں پاؤں اپنے بڑھا کے دم لیں گے
اہل ہند کی تو بات ہی کیا ہے جان بھی ہم لٹا کے دم لیں گے

کس قدر ہے ہندیوں میں جذبۂ حب وطن
فکر اپنی جان، اپنے مال کی کرتے نہیں
ہند کے ویروں کو دیکھو، جنگ کے میدان میں
توپ سے، بندوق سے، تلوار سے ڈرتے نہیں

مجموعی طور پر یہ مجموعہ پاکیزہ شعری احساسات کے سبب اس قابل ہے کہ خرید کر پڑھا جائے۔ (و۔ خ)

للکار (قومی نظموں کا مجموعہ)

مصنف گوپال داس مسرور، ۳۲ صفحات، قیمت ۳۰ نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ ۱۲/۱ ایس۔ چاند کالونی بخت گڑھ روڈ۔ نئی دہلی ۱۵۔

یہ مختصر مجموعہ ہند پر چین کے حملے کے بعد بے شمار شایع شدہ دفاعی نظموں کے مجموعوں کی ایک کڑی ہے جس میں مسرور صاحب کی مختصر اور دلچسپ نظمیں شامل ہیں اور ہر نظم حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے۔ دو شعر نمونتاً پیش ہیں۔

وطن پہ بات آئی ہے وطن کے نوجواں بدلو فضا بدلو، ہوا بدلو، زمیں و آسماں بدلو
کفن سر سے لپیٹو اور تم میدان میں آجاؤ ڈبو دو آج کہ اب ناکامیوں کی داستاں بدلو

(و۔ خ)

شاعر بمبئی کا خاص نمبر ۶۳ء

ادارہ اعجاز صدیقی اور مہندر ناتھ، صفحات ۱۴۸، سالانہ سات روپے۔ ناشر مکتبہ قصر الادب۔ پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۸

ماہنامہ شاعر علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کی ادبی یادگار ہے، جسے مرحوم کے فرزند دلبند، ملک کے ممتاز شاعر اور انجمن ترقی ا[ردو] شاخ بمبئی کے قابل معتمد جناب اعجاز صدیقی گزشتہ چونتیس سال سے شائع کر رہے ہیں۔ حالات کی ناہمواریوں کے باوجود بھی اعجاز صاحب اس ستھرے ادبی مجلّہ کو چلا رہے ہیں اور پھر خاص نمبر اور سالناموں کے ذریعہ چونکاتے رہتے ہیں۔ اور ہر خصوصی شمارہ سابقہ اشاعتوں سے کیفیت و کمیت میں آگے ہی رہتا ہے۔

اس خاص نمبر میں پانچ مقالے، نو نظمیں، تیرہ غزلیں اور آٹھ افسانے شامل ہیں۔ جن کے لکھنے والوں میں ممتاز او[ر] صف اول کے اہل قلم حضرات شامل ہیں۔ ڈاکٹر احتشام حسین اور جناب نصیرالدین ہاشمی کے مقالے اور شاکر اورنگ آباد[ی] کا مشاہیر کے آٹوگراف پر پرسنل فیچر "بے ساختہ تحریریں" خاصی دلچسپ اور معیاری ہیں۔ نظموں میں جمیل مظہری، شمیم کرہا[نی]، اعجاز صدیقی، زبیر رضوی اور سلام مچھلی شہری نے متاثر کیا۔ افسانے قریب قریب سبھی نمائندہ اور معیاری ہیں۔ جن میں کرشن [چندر]، سہیل عظیم آبادی، کوثر چاندپوری اور رام لال کے دوش بدوش انور عنایت اللہ، آمنہ ابوالحسن اور اکرام جاوید بھی شامل ہیں۔ غزلوں میں فراق، ملا، وجد، تاباں، حرمت الاکرام اور صابر شاہ آبادی کی عمدہ تخلیقات شامل ہیں۔

"ادب پارینہ" کے زیر عنوان پانچ تحریریں شامل کی گئی ہیں جن کے لکھنے والوں میں مولانا انتظام اللہ شہابی، علامہ سیماب، مولانا احسن، سر سپرو اور شوکت تھانوی مرحوم کی نمائندہ مطبوعات ڈائجسٹ کی گئی ہیں۔ سیماب صاحب کا ڈرامہ "شاہجہاں کی اسیری" محررہ سنہ ۱۹۳۰ء اور سر سپرو کا مقالہ "اردو، ہندی، ہندوستانی" محررہ سنہ ۱۹۳۴ء فی الواقعی اپنی ا[ہمیت] کے سبب ڈائجسٹ کئے جانے کے قابل تھے۔

تیس سال پہلے کے ایک یادگاری طرحی مشاعرہ کی شمولیت نے بھی "شاعر" کے معیار کو بڑھا دیا ہے۔ غرض زرق آبہ قد[ر] خاص نمبر دستاویزی اہمیت کا حامل ہے جس کے لئے ادارۂ شاعر مبارکباد کا مستحق ہے۔ (و۔خ)

ماہنامہ "خاتونِ دکن" حیدرآباد

ماہنامہ "خاتون دکن" گزشتہ ایک سال سے پابندی کے ساتھ شا[ئع ہو رہا] ہے۔ اکتوبر، نومبر سنہ ۱۹۶۳ء کی مشترکہ اشاعت جو ۹۶ صفحات پر مشتمل سالنامہ کی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔ خاتون دکن کی مجلس ادارت یکسر خواتین سے عبارت ہے مگر اس رسالے کے لکھنے وا[لوں] میں خواتین کے ساتھ مرد بھی ہیں۔ سالنامے میں چند مستقل ابواب کو چھوڑ کر چار مضامین قافیوں کا مقام (پروفیسر ابوظفر عبدالو[احد])، حیات سعدی کا مطالعہ (قاضی عیاذ انصاری)، صفی کی شخصیت (اوج یعقوبی) اور منظوم ڈرامہ (رشید قریشی)۔ بھارت چند کھنہ کا طنزیہ اور پروفیسر مبارزالدین رفعت کا گھر کے بجٹ پر میاں بیوی کا مکالمہ اور ..... اظہر افسر کا ریڈیائی گنبد (ڈرامہ) شامل ہے۔ عیاذ انصاری، اوج یعقوبی اور رشید قریشی کی تحریریں خاصی وزنی اور اہم ہیں۔ طنزیہ، مکالمہ اور ڈرامہ بھی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ ابوظفر عبدالواحد صاحب اردو شاعری کے رموز اور ا[سرار] مختصراً ہر ماہ کچھ نہ کچھ خاتون دکن میں لکھتے رہتے ہیں اور ایسی تحریروں کا پیش کیا جانا نئی شعری پود کے لئے استفادہ کا باعث ہو[گا]۔ خواتین کے لئے پکوان اور ڈیزائین کے نمونے بھی شامل ہیں۔ غرض خاتون دکن کے اس سالنامہ کی اشاعت کے باب...

مدیرہ صالحہ الطاف اور آرٹ ایڈیٹر عذرا سعید مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی بہتر صلاحیتوں نے خاتونِ دکن کو نیرِ درخشاں بنا دیا ہے۔ سالنامہ کی قیمت پچہتر نئے پیسے اور زرِ سالانہ چھ روپے۔ ملنے کا پتہ: نگر باؤلی۔ حیدر آباد۔ ۲ اے پی (و۔ ح)

یادگارِ کلثوم

(مجموعہ کلام، کلثوم شہزادی) مرتبہ اکبر جے پوری۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ۔ نذیر جان سیلی کمشنز۔ بابا پورہ۔ سری نگر (کشمیر)

عشق کو حسن کے سانچے میں ڈھلتے اور حسن کو عشق کی بھٹی میں پگھلتے دیکھنا ہو تو شہزادی کلثوم کی طرف دیکھئے۔ ناقدین نے اس پھول کی خیابانِ جنت کشمیر سے نسبت بتا کر ہماری توجہ شاعرہ کی مختصر ترین حیاتِ جسمانی کی طرف مبذول کروائی ہے۔ لیکن جب میں نے اس کی شاعری پر نظر ڈالی تو اس میں "انیتِ حسن" کی جگہ عشق کی بانگِ اناالحق گونجتی سنائی دی اور پتہ چلا کہ شاعرہ نے حسن و عشق کی تصویر کا رخ بدلنے کی ٹھان لی اور بدل دیا ؎

رخ بدل دو آج حسن و عشق کی تصویر کا تم بھی دامن تھام لو اب اپنے دامن گیر کا

اس مجموعہ کے مرتب نے کلثوم کی زندگی کو وضاحت سے نہیں پیش کیا جس کے سبب دو ہی باتوں پر گمان گزرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ کام کسی اور کا ہے۔ جس کسی نے حسنِ عقیدت سے شاعرہ کے نام منسوب کر دیا ہو، پھر یہ حقیقت کہ کلثوم کی زندگی ان سارے مراحل و منازل سے گزر چکی تھی جو اس سے اس کا معیارِ سخن کہلوا سکے۔ ع عشق عصیاں است اگر مستور نیست، یہ ٹھیک ہی ہوا کہ سرِ کلثوم سِر مکتوم ہی رہا۔

کلثوم نے جے پور میں زندگی گزاری ہو یا کشمیر میں۔ یہ دونوں مقامات ایسے ہیں جہاں ٹکسالی اور معیاری اردو کا وجود نہیں۔ پھر کلثوم کو فیضِ سخن کہاں سے ملا۔ جہاں تک زبان اور فن کا تعلق ہے، مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسے کلامِ فانی سے غیر معمولی لگاؤ رہا ہے۔ تاہم اس کا مسلک فانی کا مسلک نہیں ہے۔ فن، زبان، اسلوب اور آہنگ کے اعتبار سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اشعار فانی کے کسی شاگردِ معنوی نے کہے ہیں ؎

بقدرِ ذوق اگر اختیار وہ دے دیں پلٹ دوں رخ میں ادھر سے ادھر زمانے کا
شامِ غم جب دل کراہا، کانپ اٹھی کائنات اللہ اللہ زنگ میرے نالۂ شب گیر کا
اے صبحِ قیامت کیا کہنا اس عہدِ عہد کے قرباں وہ پردے سے اب نکلے ہیں جب دیکھنے والا کوئی نہیں
منجدھار میں کشتی پار ہوئی ساحل پہ جب آئی ڈوب گئی تقدیر تو سب کی ساتھی تھی تقدیر کا ساتھی کوئی نہیں
مرنا نہ میرا مرنا جینا نہ میرا جینا پھر کیوں گِنا رہا ہے کوئی میری خطائیں

کلثوم کی شاعری ہماری معلومات میں اضافہ نہیں کرتی۔ یہاں نہ فلسفیانہ موشگافیاں ہیں نہ نظریاتی اختلافات۔ اکیس سال کی عمر میں اس کے ذہن نے حیات و کائنات سمجھنے کے لئے اپنے طور پر کچھ زاویے متعین کر لئے تھے۔ یہ تو ابتدا تھی، لیکن اس کی روح میکدے سے مستِ الست ہو کر حریمِ ذات اور بت کدۂ صفات میں شور مچاتی زماں و مکاں کے زنداں خانہ میں حبس محسوس کرتی اپنا منزلِ تکمیل کے لئے کسی اور عالمِ امکاں کی وسعتوں کی متلاشی معلوم ہوتی ہے اور پکار اٹھتی ہے کہ ؎

اب حکم ہو تو ختم کروں اس سفر کو میں
طے کر چکی ہوں عرصۂ شام و سحر کو میں

اس تمام زندگی میں وہ یاد یار سے غافل نہ تھی کہ اچانک موت نے اُس کا استقبال کیا ؎

محو تھی یاد یار میں کلثوم
موت کب آگئی خدا جانے

(۱۶۰) صفحات پر مشتمل "یادگار کلثوم" پر ڈاکٹر شکیل الرحمن اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کے علاوہ سیدہ اختر نے بھی تعارفی مضامین لکھے ہیں۔ (ضیاء الدین شکیب)

اچھا شہری

باون صفحات پر مشتمل اس سرکاری کتابچے میں جو پبلی کیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ دہلی ۶ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ بالغوں اور بچوں کے لئے علم شہریت سے متعلق با تصویر مواد پیش کیا گیا ہے۔ آسان اور عام فہم زبان میں آزاد ملک کے شہری کے حقوق و فرائض کو کہانی کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ چند ایک عنوانات یہ ہیں۔ آزادی کا مطلب، شہریوں کے حقوق اور فرائض، اچھے پڑوسی، کمسن شہری، آزاد ہندوستان کے مسائل وغیرہ" سرکاری لٹریچر کم قیمت ہونا عوامی استفادہ کے لئے مفید ہوگا۔ یہ کتابچہ وسطانی درجوں کے طلبا کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ (د۔ ح)

بڑھے چلو

مرتبہ :- ڈاکٹر خلیق انجم

ہندوستان پر چین کے جارحانہ حملے نے ملک اور قوم میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ اردو کے ادیبوں نے بھی روایاتی انداز فکر کو چھوڑا اور چین کے جارحانہ اقدام کے خلاف غم و غصے کا اظہار کرنے لگے۔

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی مرتبہ کتاب "بڑھے چلو" چین کے جارحانہ حملے کے خلاف شعراء کا دفاعی مورچہ ہے۔ جس میں مشہور و نامور، کہنہ مشق اور نوجوان ہر قسم کے شاعروں کے دلی احساسات اور غیض و غضب کی چنگاریاں ہیں۔ چھیانوے صفحات پر مشتمل اس مجموعہ میں پینتالیس نظمیں شامل ہیں اور ہر نظم موضوع کے اعتبار سے خوب ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے "پیش لفظ" میں ہند چین تعلقات کے کئی خوشگوار و ناخوشگوار گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے اور مختصر مگر مفید اشارے کئے ہیں۔ ایک جگہ خلیق صاحب نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے کہ اردو شاعر محبت کے حسین اور دلنواز نغمے سناتا رہا ہے۔ اس نے ہمارے دکھ اور سکھ کی ترجمانی کی ہے۔ اس نے ہمیشہ امن و اتحاد انسانی دوستی اور وسیع المشربی کا پرچار کیا ہے اور وقت آنے پر اس کا قلم تلوار بھی بن گیا ہے اور خود شاعر زندگی کے عیش و آرام چھوڑ کر خاک و خون میں نہانے کیلئے میدان جنگ میں آیا ہے اور جنگ آزادی کے ہر مرحلے پر اردو شاعر مجاہدوں کے ساتھ رہا ہے۔ اسی اردو کے ساتھ ہندوستان میں جس قسم کا سلوک ہو رہا ہے اس سے عوام الناس اور ارباب حل و عقد پوری طرح واقف ہیں۔ اردو زبان کا کوئی علاقہ نہیں ہے اور جب بھی ملک پر کوئی برا وقت آیا اردو زبان کو سینہ سپر بنایا۔ اس کے نعرۂ انقلاب نے انگریزوں کے تسلط سے ملک کو آزاد کرایا اور آج چینی جارحیت کے خلاف عوام میں وطن دوستی اور جرأت کے جذبات کو ابھارنے کیلئے اسی محبت کا نہ اردو کے قلمکاروں نے اپنی عظیم اور بے لوث خدمات انجام دی

ڈاکٹر خلیق انجم نے جیسا کچھ بھی یہ مجموعہ ترتیب دیا ہے ٹھیک ہی ہے۔ کاش وہ اس قدر عجلت نہ کرتے تو اس موضوع پر کئی اچھی اور عمدہ نظمیں بھی انھیں مل جاتیں۔

"بڑھے چلو" بزم ادب کروڑی مل کالج۔ یونیورسٹی دہلی سے ڈیڑھ روپے میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ (وقار خلیل)

سب رس کا زور نمبر
میری نظر میں

لک رام (برسلن): زور نمبر موصول ہوا۔ آپ نے واقعی بہت اچھا نمبر شایع کیا جو زور مرحوم کے شایانِ شان ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی پریشانیوں کے باعث اس میں شرکت نہ کر سکا۔ اگر اعمال کا مدار نیتوں پر ہے تو پھر مجھے بھی ثواب تو ضرور ہی مل جائے گا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ): زور نمبر مل گیا۔ ہر اعتبار سے اچھا نکلا۔ مرحوم کا خیال آتے ہی کتنی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اب تک یقین نہیں آتا کہ مرحوم ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ آپ یقیناً تہنیت کے مستحق ہیں کہ اتنا اچھا نمبر شایع فرما سکے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ آمین۔

ناوش بدری (مدراس): سب رس کا زور نمبر ملا۔ یہ بڑے زور کا نمبر ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں جتنی محنت صرف ہوئی ہے بڑی نیک نیتی اور خلوص کی حامل ہے۔ دکن کی تاریخ میں یہ نمبر گویا ایک مقدس دید کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادہر ادہر سے چند چیزیں دیکھنے پایا ہوں۔ آپ کا ادارہ قابلِ مبارک باد ہے جو اس نمبر کی پیشکش سے دکن کے سچے خدمت گار کو جو پہلے سے امر تھا۔ نورٌ علیٰ نور بنا دیا۔

ان بانو نقوی (حیدرآباد): زور نمبر ملا۔ بے حد شکریہ۔ آپ نے ایک شایانِ شان جریدہ نکالا ہے۔ یہ شمارہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ پرسوز مبارک باد قبول فرمائیے۔

فیسر محمد خاں (میسور): زور نمبر پروفیسر زور مرحوم کی نفاست اور سنجیدگی اور آپ کی اپنے استاد سے عقیدت اور گرویدگی کا شاہد عادل ہے۔ اللہ آپ کو اور ادارہ کو اس نیک نیتی کی جزائے خیر عطا فرمائے۔

سیر سید مبارز الدین رفعت (گلبرگہ): آپ یقین فرمائیں پرسوں کالج سے واپس آنے کے بعد سے جو زور نمبر لے کر بیٹھ گیا تو بیچ میں رات کے کھانے کے ایک وقفہ کے سوا رات کے ڈھائی بجے تک بس اسی کو پڑھتا رہا۔ اور جب تک ختم نہ کر لیا سو نہ سکا۔ آپ کے سلیقے آپ کی محنت .... اور آپ کی عقیدت کی داد کس منہ سے ... پھر ان حالات کو بھی پیش نظر رکھوں جن کے درمیان آپ نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو مجھے واقعی یہ معجزہ نظر آتا ہے۔

آپ کی اور استاد مرحوم کی کرامت نظر آتی ہے۔ دل گواہی دیتا ہے کہ سب رس کا یہ زور نمبر سب رس کے تمام خصوصی نمبروں میں سب سے منفرد و بے مثل ہے ہی۔ دوسرے رسالوں کے خصوصی نمبروں میں بھی ایک امتیازی شان کا حامل رہے گا۔ انشاء اللہ ایسے اچھے خصوصی نمبر کی ترتیب و اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ بعض مضامین تو بڑے معیاری اور چونکا دینے والے ہیں۔ خداوند عالم اخلاص و محبت کے اس تحفہ کو قبول عام اور بقائے دوام کی سند بخشے اور استاد مرحوم کی روح کو اس سے شاد کرے۔

سلیمان خطیب (گلبرگہ):- دلنواز زور نمبر ملا۔ ع کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے۔ کاغذی پیرہن میں یہ "حدیثِ غم" تاج محل کی تابانیوں سے کچھ کم نہیں اس کو چابک دست معماروں نے تعمیر کیا تھا۔ اس کو سحر نگار قلم کاروں نے تخلیق کیا ہے۔ آپ بھی شاہجہانی دل و دماغ رکھتے ہیں۔ سلیقہ شعاری اور حسن عمل تو کوئی آپ سے سیکھے۔ رسالہ کا بانکپن تو سرورق سے ہی شروع ہوتا ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ سرورق کو خود "تاریخی دستاویز" کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ رسالہ کا کاغذ، گٹ اپ، لکھائی چھپائی آفتاب و مہتاب ہیں۔ تصاویر کا اہتمام بھی داد طلب ہے۔ "مصور سوانح" ہے اب تک صرف ڈاکٹر رحیم الدین کمال اور ضیاء انصاری کو پڑھا ہے۔ مضامین خوب ہیں۔ رسالہ ہنوز "ماں اور بچوں" میں گھوم رہا ہے۔ باپ حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ رسالہ پڑھوں تو رائے لکھوں یہ تو رسالے کی رسید ہے۔ اور بس۔

انوار ظہوری (راولپنڈی):- سیاہ حاشئے میں سب رس زور نمبر دیکھ کر دل چیخ اٹھا۔ روح تھرتھرا گئی جس شخص نے سیکڑوں نہیں ہزاروں شخصیتوں کو زندہ کیا اور بہت سوں کو زندۂ جاوید بنا دیا آج اس کا نمبر نظروں کے سامنے تھا۔ اللہ باقی من کل فانی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

آپ کی محنت کو میں نہیں سراہ سکتا۔ اس کا اجر اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ مجھے تو حروف چیختے سنائی دے رہے تھے۔ الفاظ ماتمی نظر آرہے تھے۔ وہ الفاظ و معانی جو صف در صف مرحوم کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوجاتے کہ جیسے چاہیں حضور باندھیں اب سینہ زنی کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں۔

اللہ مغفرت کرے۔ زور صاحب بڑے "کائیاں" تھے: جیتے جی کسی کو بخشا نہیں سبھی سے کام لیا۔ لیکن جب دیکھا کہ میری دوری رفتار کار کو دھیما کر چکی ہے تو چپکے سے چل دیئے کہ لو سست الوجود میرے ہوتے لکھنے اور قلم گھسنے سے کتراتے تھے۔ میرے جاتے ہی مجبور ہو کر کچھ تو لکھو گے۔ یا بہت ممکن ہے سوچتے رہے ہوں کہ خواہ اور کئی ایوان اردو تعمیر کردوں۔ نہ جیتے جی پدم بھوشن بنا دیا جائے گا۔ نہ کوئی اعزازی ڈگری ملے گی اور نہ کوئی زور نمبر نکالا جائے گا۔ اب بہتر ہے بوریہ بستر گول کر جاؤں۔

آپ نے زور نمبر نکالا آپ کا خصوصی حق تھا یا آپ ہی پر حق تھا۔ جیسے ہی زور نمبر ملا بس اسی میں جٹ گیا۔ کل رات بھر جاگتا رہا اور اسے تقریباً ختم کرلیا۔ جَزَاکَ اللّٰہُ فِی الدَّارَیْنِ خَیْرًا

یوسف ناظم (بمبئی):- زور نمبر دیکھا یقین مانئے خوشی بھی ہوئی اور دل بھی بھر آیا۔ اتنا ضخیم اور عمدہ نمبر نکال کر آپ نے ہنگامہ کردیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس قدر اچھا مواد جمع کریں گے۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جو لوگ آپ کی محنت کی داد نہ دیں وہ مرتد ہیں۔ زور نمبر کے تمام مضامین کے بارے میں علٰحدہ رائے لکھوں گا۔ فی الحال اسے رسید سمجھئے۔

مجلسِ اشاعت دکنی مخطوطات کی کتابیں

گذشتہ شمارہ سب رس میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مجلسِ اشاعت دکنی مخطوطات حاصل کرکے اس کی فروخت شروع کرے گا۔ ہم مسرت کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے یہ کتابیں حاصل کرلی ہیں اور ان کی شروع کر دی ہے۔ فہرست ملاحظہ ہو۔

کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ:۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ گولکنڈے کے پانچویں تاجدار اور اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے اردو کلام کا مجموعہ (۳۵۲) صفحات مقدمہ ہے جس میں موصوف نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اس کی شاعری پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ اس کا کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ صفحات معہ تصاویر ایک ہزار اڑسٹھ قیمت (پندرہ روپے)

کلیاتِ سراج:۔ مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ یہ سید شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے کل اردو اور فارسی کلام اور فارسی خطوط کا مجموعہ ہے۔ (۱۲۸) صفحات کا طویل مقدمہ جس میں سراج کی حیات، تصنیفات اور شاعری پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ (۶۶۳) صفحات پر مشتمل ہے۔ فی جلد آٹھ روپے۔

قصۂ بے نظیر:۔ (۱۱۵۰ھ) از صنعتی بیجاپوری مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ یہ منظوم قصہ تمیم انصاریؓ کے نام سے مشہور ہے۔ تین سو سال پہلے کی اردو کا نمونہ ہے اس کا مصنف صنعتی عادل شاہی خاندان کے چھٹے حکمران [عا]دل شاہ کا معاصر تھا۔ یہ ایک مہماتی طرز کا قصہ ہے جس کی مرکزی شخصیت حضرت تمیم انصاریؓ ہیں۔ فاضل مرتب نے ۱۳۶ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔ اصل قصہ ۴۰۴ صفحات پر مشتمل ہے قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپے۔

پھول بن:۔ (۱۰۶۶ھ) از ابن نشاطی مرتبہ پروفیسر سروری۔ ابن نشاطی گولکنڈہ کا باشندہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر ہے۔ اس کی تصنیف "پھول بن" صوری اور معنوی ہر اعتبار سے ایک قابلِ قدر کارنامہ اور اس زمانہ کی بہترین نظموں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ (۱۹۱) صفحات کا طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں شاعر کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے اصل قصہ کی بھی تشریح کردی ہے جس سے قصہ بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اصل کتاب (۱۷۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپے۔

مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال (۱۰۳۵ھ) از غواصی مرتبہ میر سعادت علی رضوی ایم اے۔ ملا غواصی سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ [کے زمانہ میں] مثنوی لکھتا رہا لیکن اس کو دربارِ شاہی میں کوئی جگہ نہ مل سکی۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں اس کو شہرت نصیب ہوئی [اور] ملک الشعرا کے رتبہ تک پہنچ گیا۔ یہ بحیثیت سفیر بیجاپور بھی بھیجا گیا تھا۔ اس کی تصنیفیں "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور [طوطی نامہ] مشہور ہیں۔ مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کا مقدمہ ۲۰۳ صفحات پر مشتمل ہے اور بقیہ کتاب کے ۱۹۹ صفحات ہیں۔

[illegible] مجلد [illegible]

طوطی نامہ (۱۰۴۹ھ) از غواصی مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔ طوطی نامہ کی زبان بہ نسبت سیف الملوک کے سلیس ہے لیکن شاعرانہ خوبیوں سے سیف الملوک کا اسلوب طوطی نامہ پر فوقیت رکھتا ہے۔ ۱۴۳ صفحات کا مقدمہ ہے اور کتاب ۲۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت غیر مجلد پانچ روپیہ۔

کلام الملوک: سلاطین دکن کا فارسی کلام۔ مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔ سلاطین بہمنیہ، سلاطین عادل شاہیہ اور سلاطین قطب شاہیہ کا فارسی کلام کلام الملوک کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ اور قارئین کی سہولت کے لئے ان خاندانوں کے شجرے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب ۲۱۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپیہ۔

۸۔ کلیات عبداللہ قطب شاہ: (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) مرتبہ پروفیسر سیدہ محمد۔ بانی حیدرآباد سلطان محمد قلی قطب شاہ کے نواسے اور گولکنڈہ کے ساتویں فرماں روا سلطان عبداللہ قطب شاہ کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے غیر مجلد پانچ روپیہ۔

۹۔ گلشن عشق (۱۰۶۸ھ) از نصرتی مرتبہ پروفیسر سیدہ محمد۔ یہ بیجاپور کے سب سے بڑے شاعر اور دربار علی عادل شاہ ثانی (۱۰۷۰ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے ملک الشعراء ملا نصرتی کی مشہور عشقیہ مثنوی ہے جس میں حسن و عشق اور رزم و بزم کے دلکش مرقع پیش کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں نصرتی کے حالات زندگی اور اس کی تصانیف کے بارے میں بڑی تحقیقی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ نیز اس کے شاعرانہ کمال پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ فی جلد پانچ روپے۔

۱۰۔ علی نامہ: از نصرتی۔ مرتبہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ علی عادل شاہ ثانی کے دور کے حالات ہیں۔ یہ اردو کی بہترین رزمیہ مثنوی ہے۔ اور فاضل مرتب کے مقدمہ کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ قیمت سات روپے۔

۱۱۔ مثنوی رضوان شاہ و روح افزا: تصنیف فائز ۱۰۹۴ھ۔ مرتبہ پروفیسر سیدہ محمد صاحب۔ یہ مثنوی فائز کی واحد ادبی یادگار ہے۔ فائز قطب شاہی خاندان کے آخری فرماں روا ابوالحسن تانا شاہ کے عہد کا شاعر تھا۔ قصہ رضوان شاہ و روح افزا فارسی نثر میں تھا۔ فائز نے اس کو اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کی زبان سلیس و شستہ ہے۔ یہ کتاب ۱۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی شریک ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنہ۔

۱۲۔ مثنوی چندر بدن و مہیار: تصنیف مرزا محمد مقیم مقیمی بیجاپوری۔ مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی۔ مقیمی سلطان محمد عادل شاہ کے عہد کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے عمر کا بڑا حصہ بیجاپور میں گزارا۔ گولکنڈہ اور احمد نگر میں بھی اس نے سفارتی خدمات انجام دی ہیں۔ چندر بدن و مہیار کا قصہ دکن میں ہر شخص کی زبان پر تھا۔ مقیمی نے اس کو اردو میں نظم کیا۔ مرتب نے ۴۸ صفحات کا طویل مقدمہ لکھا ہے۔ کتاب کے صفحات ۱۲۰ ہیں۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

۱۳۔ مثنوی تصویر جاناں: تصنیف لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی ۱۲۱۸ھ۔ مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد۔ شفیق کی سب سے زیادہ اہم مثنوی تصویر جاناں ہے۔ شفیق نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد کے مشہور شاعر تھے۔ مرتب نے ۴۴ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔ مثنوی (۹۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

۱۴۔ پنچھی باچھا (۱۲۱۶ھ) از وجدی مرتبہ پروفیسر سیدہ محمد۔ حضرت شیخ فرید الدین عطار کی مشہور مثنوی منطق الطیر کا آزاد ترجمہ ہے۔ یہ دکن کی قدیم کتابوں میں بہت ہی مقبول کتاب ہے۔ شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ ہے جس میں وجدی کی ادبی خدمات پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔

بیادگار ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء فون نمبر ۳۵۲۰۹

جلد ۲۷ شمارہ (۲) فروری ۱۹۶۴ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

نگران: پروفیسر عبدالمجید صدیقی

مجلسِ مشاورت:

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ نصیر الدین ہاشمی

رمن راج سکسینہ۔ منظور احمد۔ وقار خلیل

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

زرِ سالانہ ہند و پاک سے	۶ روپے
ششماہی	۳ "
غیر ممالک سے	۱۰ "
فی پرچہ	۵۰ نئے پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل پرنٹنگ پریس میں چھپ کر

دفترِ ایوانِ اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن ۴ سے شائع ہوا۔

یومِ قلی نمبر

ترتیب

اپنی بات

جنوری کے اداریہ میں اس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ یوم قلی قطب شاہ منعقدہ ۱۱ر۲۰ و ۲۱ر جنوری کے موقع پر جو مقالات پڑھے گئے انھیں ایک مجموعے کی شکل میں پیش کیا جائے گا اس وعدہ کی تکمیل میں فروری کا شمارہ یوم قلی نمبر کی شکل میں پیش ہے۔

ی قطب شاہ کے بارے میں ہر سال فاضل مقالہ نگار کوئی نہ کوئی نئی بات پیش کرتے ہیں اور اس کی زندگی، اس کی تہذیب اس کی روایات اور زبان کے بارے میں ایک نیا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ جناب ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے ادبی اجلاس یوم قلی کی صدارت فرمائی اور قلی قطب شاہ کے کلام کا لسانیاتی جائزہ لیا۔ یہ مقالہ خیال افروز اور فکر انگیز ہے اور یقیناً دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ دوسرا مقالہ جو قلی قطب شاہ کے تعمیراتی کارناموں پر سرنیواسن لاہوٹی صاحب نے لکھا تھا ہمیں افسوس ہے کہ باوجود کوشش کے یہ مقالہ ہمیں نہ مل سکا اور لاہوٹی صاحب نے کسی دوسرے رسالے کو بھیجدیا۔

قلی قطب شاہ اور گنبدوں کے بارے میں علامہ اقبالؒ کی نظم "گورستانِ شاہی" کے دو بند اور جگناتھ آزاد کی نظم بھی اس میں شریک ہے۔ ان کے علاوہ حیدرآباد کے شعرا نے محمد قلی کی بارگاہ میں جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس کو بھی ان صفحات پر پیش کر دیا گیا ہے۔ مشاعرہ یوم قلی کا انتخاب بھی اس شمارے میں شریک ہے کہ قارئین مشاعرہ میں شرکت نہ کرتے ہوئے بھی اس محفل سے لطف اندوز ہوسکیں۔

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ شاد عارفی رام پور میں ۱۰ر فروری ۱۹۶۴ء کو رحلت فرما گئے۔ شاد عارفی مشاعروں میں پڑھنے سے گریز کرتے اور رسائل کو کلام دینے میں تامل نہ فرماتے۔ حیدرآباد کے علی منظور مرحوم اور شاد عارفی کے کلام میں بہت زیادہ مماثلت تھی۔ مالی اعتبار سے دونوں ایک کشتی کے سوار تھے۔ ہماری سماجی روایات اور تہذیبی اقدار کو دونوں نے اپنے کلام میں پیش کیا۔ طنز بھی کیا تحریض بھی کی دونوں ترقی پسند خیالات کے حامل تھے۔ علی منظور کے کلام کو ہندوستان کے دو چار رسالوں، ادبی دنیا، ہمایوں، ساقی، سب رس وغیرہ میں جگہ ملی لیکن شاد ہند و پاک کے سب ہی رسائل پڑھنے والوں کے محبوب شاعر تھے۔ ان کے کلام کا انتخاب انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔

ہمیں توقع ہے کہ اب ان کی یادگار ان کے کلام کا مجموعہ جلد سے جلد منظرِ عام پر آجائے گا۔

ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ
(معتمد اعزازی ادارہ)

خیر مقدمی تقریر

(یوم محمد قلی قطب شاہ)

۱۱ر جنوری سنہ ۱۹۶۴ء

جناب ڈاکٹر بی۔ رام کشن راؤ صاحب۔ خواتین و حضرات

آج ہم اپنے شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد کے بانی اور اردو زبان کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کی ۳۵۲ ویں برسی کی چھٹی تقریب منانے کے لئے گولکنڈہ کے اس تاریخی مقام پر جمع ہیں۔ آج سے ٹھیک پانچ سال پہلے ان ہی دنوں سنہ ۱۹۵۸ء میں قیام آندھرا پردیش کے فوری بعد آندھرائی تہذیب و تمدن کے اولین معمار اور قومی یکجہتی کے علمبردار سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام اس کے لائق معتمد دبستان دکن کے آخری معلم اور کلیات محمد قلی قطب شاہ کے مرتب، ملک کے ممتاز انشاپرداز ڈاکٹر زور مرحوم کی نگرانی میں پہلی مرتبہ شایان شان طریقے پر منائی گئی۔ ساری اردو دنیا میں تقریب کے چرچے ہونے لگے۔ اور ہم میں سے بہت سوں کو اب تک اس تقریب کے روح پرور نظاروں کی یاد تڑپاتی ہے۔ اور پھر ہر سال یہ تقریب منائی جانے لگی۔ گورنر سے لیکر مرکزی حکومت کے وزیروں اور شہزادے سے لیکر ایک محنت کش مزدور نے بھی اس تقریب میں شرکت کرکے اپنے شہر کے بانی، اردو کے اولین صاحب دیوان شاعر اور امن پسند بادشاہ کے کارناموں کو نذرانہ عقیدت پیش کیا تھا۔

سنہ ۱۹۶۲ء میں اس تقریب کے بانی ادارہ ادبیات اردو کے روح رواں ڈاکٹر زور صاحب کے اچانک ہم سے بچھڑ جانے کے روح فرسا عظیم سانحہ نے سچ پوچھئے تو ہماری کمر ہمت توڑ دی۔ ہم اپنے اس محسن کے بے وقت اٹھ جانے کے صدمے سے اب تک خود کو سنبھال نہ سکے۔ آج پھر بھی مرحوم ڈاکٹر زور صاحب کی روایات کو ہم نے بہر طور جاری رکھا۔ ان کا لگایا ہوا پودا ادارۂ ادبیات اردو آج تناور درخت کی صورت میں علم و ادب کے راہیوں کے لئے شجر سایہ دار بنا ہوا ہے۔

ہم سب ہو لسنے اسی یادگار مقام پر ڈاکٹر زور صاحب مرحوم کو یوم محمد قلی قطب شاہ کے انتظامات کرتے جلسے کی کارروائی کو چلاتے۔ خیر مقدمی تقریر کرتے ہنستے اور مسکراتے دیکھا ہے۔ آج وہ موہنی سجیلی۔ پر وقار اور عظیم المرتبت شخصیت

ہم میں نہیں ہے تاہم آج بھی ہم ان کے عطا کردہ حوصلوں۔ امنگوں۔ اور ارادوں کو مشعل راہ بنائے ہوئے ہیں۔ اہل حیدر آباد نے محمد قلی کے عہد سے اپنے میں اتحاد و تنظیم۔ اور رواداری کی روایتیں برقرار رکھی ہیں۔ آج ہمارا ملک ہنگامی حالات سے گزر رہا ہے مگر اس عبوری دور میں بھی ہم اپنے تابناک مستقبل کی کرنوں کو فروزاں دیکھ رہے ہیں۔ علم ادب۔ تہذیب و تمدن اور تعلیم کی شمعیں آج بھی ہم حتی المقدور فروزاں کئے ہوئے ہیں۔ آج اس سرزمین کے ہر فرد پر یہ روشن ہو چکا ہے کہ اس ملک کے سابق حکمرانوں نے یہاں کی زبان اور مذہب کے ساتھ نہ صرف رواداری بلکہ فیاضانہ سرپرستی کا برتاؤ کیا تھا۔ اور ہر کامیاب اور روشن خیال شہری کا فرض ہے کہ ان روایات کو نہ صرف جاری رکھے بلکہ اس میں اضافہ کر کے اپنی کامرانی اور سرخروئی کو دوچند کرے۔

محمد قلی قطب شاہ نے فراخدلانہ روایات کا جو پودا لگایا تھا اس میں آج بھی پھل پھول لگ رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کی یاد روز بروز تازہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس کے کارناموں کا جس قدر گہرا مطالعہ کیا جا رہا ہے اتنا ہی اس کی خوبیاں واضح ہو رہی ہیں۔ ہمارا شہر محمد قلی کی تہذیب اس کی علمی اور ادبی سرپرستی اور اس کی شاعری کا شہر ہے جو غزل ہے جہاں کا گنگا جمنی کلچر۔ جہاں کا زندہ و پائندہ ادب۔ صدیوں اہل ہند کے لئے مشعل راہ رہے گا۔ اسی شہر میں دور آصفی میں جیسی کچھ علم و ادب کی سرپرستی ہوئی اس سے آپ سبھی حضرات واقف ہیں۔

اس اجلاس کے صدر عالیجناب ڈاکٹر بی۔ رام کشن راؤ صاحب نے ریاست حیدر آباد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے سب کے بزرگ اور قابل قدر رہنما کی صورت میں حیدر آباد کی ادبی اور تہذیبی قدروں کی پائیداری کے لئے جیسی کچھ کوششیں کیں ان سے اس ملک کا ہر فرد واقف ہے۔ ڈاکٹر بی رام کشن راؤ اردو اور فارسی کے ساتھ تلگو اور سنسکرت کے بھی عالم ہیں۔ ان کے ہاتھوں ۱۹۵۵ء میں ادارے کی عمارت "ایوان اردو" کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔

ادارۂ ادبیات اردو گذشتہ نصف صدی سے دکن کے ادب کلچر اور ثقافت کو زندہ اور تابندہ کرنے کی حتی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا اندازہ خود آپ کر سکتے ہیں کہ اس نے اپنے مخطوطات۔ مطبوعات اور تہذیبی سرمائے کے ذریعے کہاں تک علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کے خزانوں کو تباہ ہونے سے بچایا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کو اس پر فخر ہے کہ شہر حیدر آباد اور دکن کا ہر پڑھا لکھا ادیب اور شاعر پروفیسر اور طالب علم آج بھی اس کا ذکر قدر و منزلت عزت و احترام سے کرتا ہے۔

یوم محمد قلی قطب شاہ بقول ڈاکٹر زور مرحوم ادارے کی ایک سالانہ تقریب ہے۔ حیدر آباد کے ادب اور ثقافت کی ترقی کی رفتار کا سالانہ جائزہ ہے۔ اس موقعہ پر میں ادارے کے تعلق سے چند باتیں آپ سب کے گوش گذار کروں گا۔ مجھے اس کی اجازت دیجئے کہ ادارہ ادبیات اردو پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی سرپرستی اور گولکنڈہ کے مورخ پروفیسر صدیقی صاحب کی نگرانی میں اپنے علمی و ادبی اور تحقیقاتی کاموں میں مشغول ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان دو بزرگوں کا سایہ ادارے کی بقا اور ترقی کے لئے ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ ادارے میں گذشتہ

اس مختصر مدت میں بھی نمایاں اور ترقی پذیر کام ہوئے ہیں۔ ادارے کی مطبوعات۔ ادارے کا روز بروز بڑھتا ہوا کتابوں کا قابل قدر سرمایہ اردو میوزیم اور ماہنامہ سب رس کی اشاعت اس کی ہر جہتی ترقی کا آئینہ دار ہے۔ ایک سال کے قلیل عرصے میں ادارے نے نصف درجن کتابیں شائع کیں۔ جن میں پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی صاحب کی مرتبہ "فہرست مطبوعات جلد سوم" ملک کے مشہور مزاحیہ نگار یوسف ناظم کا مجموعہ "کیف و کم" سب رس کا "ظفر نمبر"۔ اور ڈاکٹر زور مرحوم کے عالمانہ مضامین کا مجموعہ "ادبی تحریریں" پروفیسر عبد المجید صدیقی نائب صدر ادارہ کی مشہور تصنیف "تاریخ گولکنڈہ" سب رس کا دستاویزی اور یادگاری "زور نمبر" شامل ہے۔ یہ معلوم کر کے آپ مسرت محسوس کریں گے کہ گذشتہ ایک سال سے حیدرآباد کی منظوم ادبی تاریخ کا کام بھی ادارے کی طرف سے ہو رہا ہے۔ جسے حیدرآباد کے مشہور اور قادر الکلام شاعر جناب تاج قریشی صاحب انجام دے رہے ہیں۔

مجلس اشاعت تاریخ و تمدن کے سلسلے کی کئی کتابیں ادارے نے شائع کی ہیں۔ جن میں سے چند کتابوں کے اجرا کی رسم اسی مقام پر یوم محمد قلی کی تقریب کے سلسلے میں انجام پائی تھی۔ اس سلسلے کی ایک اہم کتاب "مکتوبات قطب شاہیہ بنام شاہان مغلیہ و ایران" جسے دکن کے ہونہار جواں سال مورخ حیدرآباد کے ایک برگزیدہ خانوادے کے چشم و چراغ نواب عباس حسین صاحب نے مرتب کی ہے۔ بہت جلد شائع کی جاری ہے۔ اس کے علاوہ آصفجاہ اول کے عہد کی مستند و نایاب تاریخ "مآثر نظامی" مولفہ لالہ منسا رام بھی شائع کی جا رہی ہے۔ اس نادر تاریخی سرمایہ کو مولوی سید محی الدین صاحب نے اپنے حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے "مزارات اولیائے دکن" بھی ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے جلد ہی شائع ہو جائے گی۔ ادارے کی طرف سے تذکرۂ نوادر ایوان اردو کی دوسری جلد کی ترتیب کا کام بھی قریب قریب مکمل ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی جلد ہی چھپ جائے گی۔ دکن کی تاریخ اور تہذیب سے متعلق ایسی بہت سی دستاویزی اور اہم کتابوں کی اشاعت ادارے کے پیش نظر ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ آئندہ یوم محمد قلی تک ہماری ادبی کاوشوں کا بیشتر پروگرام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ ادارے کے اردو امتحانات میں ہر سال اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اور آندھرا اور تلنگانے کے ضلعوں سے بڑی تعداد میں امیدوار امتحانات میں شریک ہو رہے ہیں۔ ادارے کا ترجمان ماہنامہ 'سب رس' اپنے ستائیسویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ یہ ماہنامہ ڈاکٹر زور کی زندہ یادگار ہے۔ اور اس کی باشعور مجلس ادارت کی شبانہ روز مساعی مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی کے زیر نگرانی اس کی دن دونی ترقی کی ضامن ہے۔ ادارے کے تاریخی میوزیم میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس کے محسن نواب عنایت جنگ بہادر کے احسانات کا لامتناہی سلسلہ جاری و ساری ہے اس میوزیم کی شبانہ روز نگرانی اس کی ترقی اور اس کی تنظیم میوزیم کے معتمد میر سراج الدین علی خاں صاحب کی رہین منت ہے۔

ادارے کی ہر جہتی ترقی میں نہ صرف اراکین مجلس انتظامی اور بہی خواہان ادارۂ ادبیات اردو مولوی عارف الدین احمد صاحب مولوی حسین ضابط صاحب اور میر یسین علی خاں صاحب برابر کے شریک ہیں بلکہ دکن کی قدیم تہذیب کے مستند

راؤ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی حکومت حیدرآباد کے باشعور معتمد تعلیمات شری ایل این گپتا اور لائق معتمد فینانس
شری محمد علی عباسی کی ہمدردیاں بھی بطور خاص اس کے شامل حال رہی ہیں۔

یوم محمد قلی قطب شاہ کے مختلف شعبہ جات کے معتمدین جوان سال اور مستقل مزاج افراد ہیں جن کی
کا ادارہ معترف ہے۔ اس افتتاحی اجلاس کے بعد کل صبح "ایوان اردو" میں نوادر قطب شاہی کی نمائش کا افتتاح
ادارے کے صدر پروفیسر سید علی اکبر صاحب کے ہاتھوں عمل میں آئے گا۔ اور گیارہ بجے سے ہماری جامعہ کے صدر شعبہ
اردو ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی صدارت میں ادبی اجلاس منعقد ہوگا۔ اور پھر رات کے ساڑھے
آٹھ بجے ممتاز مورخ ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ نواب عنایت جنگ بہادر کی صدارت میں محفل شعر و سخن منعقد
جس میں حیدرآباد کے ممتاز شعرا حصہ لیں گے۔ اور اپنے شہر کے بانی علم و ادب کے غواص اور اردو زبان کے پہلے صاحب دیوان
شاعر محمد قلی قطب شاہ کو خراج عقیدت ادا کریں گے۔

۱۳ جنوری کو پانچ بجے شام آندھرا سارسوتی پریشد میں شری پی۔ راما نجا راؤ معتمد آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی
کی صدارت میں تلگو اجلاس منعقد ہوگا۔ میں استدعا کروں گا کہ آپ سب حضرات ان تقاریب میں شریک ہو کر اپنے
عمل سے انہیں کامیاب بنائیں۔

آخر میں ڈاکٹر بی۔ رام کشن راؤ صاحب اور آپ خواتین و حضرات کا اس افتتاحی تقریب میں شرکت کرنے کا دلی شکریہ
ادا کرتا ہوں خاص طور پر جناب سید محمد حسین صاحب رضوی لائبریرین جامعہ کشمیر و صدر شعبہ لائبریری سائنس کا جنہیں جامعہ کشمیر نے خاص
طور پر اس جلسے میں جامعہ کی نمائندگی پر مامور کیا ہے۔

اس داستان کی روداد یقیناً نامکمل رہے گی اگر اس موقع پر اس مرحوم برگزیدہ ہستی کی یاد تازہ نہ کی جائے۔ جن کے
دم سے نصف صدی تک دکن کی ادبی محفلیں آراستہ رہیں۔ وہ چراغ بزم علم جو بجھ گیا اور وہ میر کارواں تہذیب و تمدن
اب ہم میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور کی یاد ایسے موقعوں پر اہل وطن کو بری طرح ستاتی ہے۔ اور بھلائی بھلائی نہیں جا سکتی۔
اس میں شک نہیں کہ اب بھی بیگم صاحبہ زور کی سرپرستی اور ان کے فرزند ارجمند مولوی سید تقی الدین صاحب قادری کی
ہمیشہ ہمارے شامل حال رہی ہے۔ جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار رہیں۔ جئے ہند

بنارسی لال گپتا
(میئر بلدیہ حیدرآباد)

محمد قلی قطب شاہ

(کومیئر بلدیہ کا خراج عقیدت)

جناب صدر خواتین و حضرات:

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے سنہ ۱۵۹۱ء میں حیدرآباد شہر کا سنگ بنیاد رکھا اور ۱۵۹۱ء میں حیدرآباد ایک شہر کی حیثیت سے موسیٰ ندی کے کنارے عالم وجود میں آیا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ بانی حیدرآباد قطب شاہی دور کے ایک قابل احترام بادشاہ رہے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ قطب شاہ کی عظمت ان کے ادبی اور تہذیبی کارناموں کی وجہ سے بہت اونچی ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے قلی قطب شاہ نے دکھنی فارسی اور تلگو زبان میں اعلیٰ پیمانہ کی شاعری کی ہے۔ قلی قطب شاہ کی شاعری تلنگانہ کی تہذیب کا ایک مرقع ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں تلنگانے کی تمام روایات کو ایک جا کر دیا ہے۔ اس دور پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ کہنے پر ہر فرد اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ قلی قطب شاہ صرف بادشاہ نہیں بلکہ تہذیب و تمدن کے معمار بھی تھے۔ ارتقائے تمدن میں قلی قطب شاہ نے بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔
محمد قلی کے دور میں گولکنڈہ کی سلطنت سریکاکولم سے انت پور تک پھیل گئی تھی۔ اور اس سلطنت کو ایک چھوٹی سی شہنشاہیت کا مقام مل گیا تھا۔ اس بڑی ریاست کے لئے گولکنڈہ کا دارالخلافہ اپنی کوتاہ دامنی کا گلہ کرنے لگا جس کی وجہ سے قلی قطب شاہ نے موسیٰ ندی کے کنارے اس عظیم شہر حیدرآباد کو بساتے ہوئے یہ دعا کی تھی کہ میرا شہر ہمیشہ لوگوں سے معمور رہے۔ اور ان کی دعا تھی کہ شہر کی آبادی میں ایسا اضافہ ہو جیسے پانی میں مچھلیاں پھیلتی پھولتی ہیں۔ خدا نے ان کی یہ دعا قبول کی ہے کہ اس وقت سے لیکر آج تک ہمارا شہر پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ اور اس کی آبادی میں روزانہ اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس شہر کو اس ریاست کے دارالحکومت کی حیثیت ہمیشہ حاصل رہی ہے آندھرا پردیش کے بننے کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ دارالحکومت ہی حیدرآباد میں قائم رکھا گیا بلکہ آج بھی قدیم روایات اور اتحاد کے لئے اس شہر کے عوام سرگرم و کوشاں ہیں۔
سلطان قلی قطب شاہ کی (۳۵۲) ویں برسی کے موقعہ پر جب ہم اپنی تہذیبی اور تمدنی ترقی پر نظر ڈالتے

ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قلی قطب شاہ کے بعد بھی حیدرآباد ہمیشہ ابتداء سے لیکر آج تک ترقی کر رہا ہے۔ قطب شاہ کا دور رواداری بھائی چارہ میل ملاپ اور قومی یکجہتی کا ایک ایسا مینارہ نور تھا کہ اس سے نکلنے والی روشنی سے آج تک حیدرآباد منور ہے۔ اور آج بھی حیدرآباد کے رہنے والے عوام ملنساری بھائی چارہ اور قومی اتحاد کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ قلی قطب شاہ کے دور میں زبان اور ذات پات کا کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ قطب شاہ کے فرامین اردو کے علاوہ تلگو زبان میں بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ قلی قطب شاہ نے حیدرآباد کو ایک قابل فخر شہر کے بنانے کے سلسلہ میں بڑی محنت سے کام لیا۔ اس زمانے میں حیدرآباد بیرونی سیاحوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ باہر سے آنے والے سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں قلی قطب شاہ کے دور کو ایک اچھے دور سے تعبیر کیا ہے۔ اس زمانے میں چارمینار کے اطراف مکانات سڑکیں اور شہر میں پانی کی سربراہی کا معقول انتظام دارالشفاء میں علاج معالجے اور میڈیکل کالج کے قیام کے علاوہ مسافروں کے لئے کارواں سرائیں قائم تھیں اور تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں مختلف انتظامات اس امر کا ثبوت ہیں کہ قلی قطب شاہ حیدرآباد کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کی بنیادی ضرورتوں کو محسوس کرتے تھے۔

حیدرآباد میں قلی قطب شاہ کی بہت سی ایسی یادگاریں موجود ہیں جن کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ قلی قطب شاہ کی شخصیت میں ایک آرٹسٹ کا ذہن بھی کارفرما تھا۔ چارمینار کو دیکھنے والا قلی قطب شاہ کے اس ذہن کا باآسانی پتہ چلا سکتا ہے۔

قلی قطب شاہ کا فارسی کلام ایک مسلمہ معیاری کلام ہے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ والوں نے دکھنی زبان کو فروغ دیا اور دکھنی زبان بول چال کی ایک زبان بن گئی۔ محمد قلی قطب شاہ نے دکھنی زبان میں بھی شاعری کے تجربے کئے۔ زبان کے نئے سانچے بنائے جس سے دکھنی زبان کو ایک اچھی علمی زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی ابتداء میں دکھنی زبان کو ذریعہ تعلیم کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن قلی قطب شاہ نے اس زبان کے نکھارنے اور بنانے میں وہ نمایاں حصہ لیا ہے کہ آج بھی یہ زبان اپنی اہمیت کا لوہا منواتی ہے۔

قلی قطب شاہ صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں اور انہوں نے سب سے پہلے دکھنی زبان میں قصیدے۔ مرثیے۔ نظم غرض ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی۔ ان کی شاعری میں مذہبی رواداری رسم و رواج کھیل کود اور تہواروں کی معاشرتی زندگی کی تمام جھلکیاں ملتی ہیں کھیل کود میں قلی قطب شاہ نے "بھگڑی بہو" اور "آنکھ مچانی" پر نک شاعری کی ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ قلی قطب شاہ کا دیوان تلنگانہ کا ایک ایسا تہذیبی خزانہ ہے جس سے آنے والی نسلیں بھی فیض حاصل کرینگی۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس عظیم بادشاہ کو جس نے حیدرآباد کی بنیاد رکھی تھی اور جس نے اس شہر کو تہذیب و تمدن کی لازوال دولت سے مالا مال کیا تھا آج حیدرآباد کے عوام خراج عقیدت پیش کرنے اسکی آخری آرام گاہ پر جمع ہوئے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کے بانی ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ۱۹۵۸ء میں پہلی بار یوم قلی قطب شاہ کے تقاریب کا آغاز کیا اور ہر سال اچھے پیمانے پر یہ تقاریب

ٔ جاتی ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج ڈاکٹر زور ہم میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن میں ادارۂ ادبیات اردو کے کارکنوں کو
یبا د دیتا ہوں کہ انھوں نے یوم قلی قطب شاہ کی تقاریب کے سلسلہ کو جاری رکھا ہے۔ اس طرح یہ اجتماع ہمیں ڈاکٹر زور کی
بی دلاتا ہے اور اسی طرح ہمیں اس عظیم شہر اور اس شہر کے بانی کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک موقع ملتا ہے۔
ںاطور پر ایسے حالات میں جب کہ ہمارے ملک پر دشمنوں کی نظریں لگی ہوئی ہیں اور ہمارا ملک ہنگامی حالات سے گذر رہا ہے یہ
یہ ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے ملک میں قومی یکجہتی اور اتحاد کا جذبہ بنائے رکھنے کے لئے سرگرم عمل ہو جائیں۔ بلاشبہ یہ ایک امر
ہے کہ قلی قطب شاہ کے دور سے ہم قومی یکجہتی بھائی چارہ اور میل ملاپ کا ایسا روح پرور سبق حاصل کرسکتے ہیں جو ہمارے
ضروری ہے اور جسکو پڑھ کر ہم ان ہی جذبات کو اپنی قومی زندگی میں رچا بسالیں تو پھر متحدہ ہندوستان کو دنیا کی کوئی طاقت
ضرب نہیں کرسکتی فقط جئے ہند

م آزاد اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات

ب التذکرہ (مولانا ابوالکلام آزاد) 6=00
مرتبہ ڈاکٹر میر ولی الدین

سٹر رام چندر۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر 3=50

سیر سورۂ فاتحہ (تلنگی میں) مولانا ابوالکلام آزاد
مترجم۔ پیران نظامی 3=50

ولانا ابوالکلام آزاد (تلنگی) 4=50
مرتبہ ڈاکٹر وینکٹا ودھانی

اعلان

بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند فارم، رول ۸ ماہنامہ سب رس حیدرآباد

ایڈیٹر کا نام: (پروفیسر) عبدالمجید صدیقی
قومیت: ہندوستانی
پتہ: ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد (آندھرا پردیش)
پرنٹر کا نام: (پروفیسر) عبدالمجید صدیقی
قومیت: ہندوستانی
پتہ: " ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد (اے پی)
پبلشر کا نام: (پروفیسر) عبدالمجید صدیقی
قومیت: ہندوستانی
پتہ: " ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد (اے پی)
نام و پتہ مالک: " ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد (اے پی)

میں عبدالمجید صدیقی، تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں
وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

(دستخط) عبدالمجید صدیقی

محمد قلی قطب شاہ کی زبان

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

نہ لکھ سکے گا کینے شرح مجہ کتاباں کا
ہمارا علم ہے سب عالماں میں جیوں اعجاز

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا شمار اُردوئے قدیم کی ان بزرگ ہستیوں میں ہوگا ۔ جنھوں نے اس زبان کو نہ صرف ایک ادبی لہجہ عطا کیا، بلکہ اپنی پُرجوش شخصیت کی تمام گرمی اور توانائی بھی ۔ میں نے اُردوئے قدیم کی ترکیب جان بوجھ کر استعمال کی ہے اس لئے کہ قلم و شعر کے اس سلطان کو مقامیت کی حد بندیوں میں محصور کر دینا سراسر ظلم ہے۔

قلی قطب شاہ کی زبان دراصل حضرت امیر خسروؔ کی "زبان دہلوی" کی جنوبی ہند کی جانب توسیع شدہ شکل ہے جو علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق کے جلو میں چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں دکن پہونچتی ہے اور "امیران صدہ" کی نو آبادیوں اور لشکروں کے ذریعہ مرہٹواڑہ، کنڑا اور تلنگانہ کے علاقوں میں مخصوص طبقات کے اندر پھیل جاتی ہے ۔ دکنی محققین میں اردو کی نسبت سے جو مقامیت کا رجحان رہا ہے اس کے سیاسی عوامل جو کچھ بھی رہے ہوں ایک بڑی وجہ یہ بھی رہی ہے کہ نواح دہلی کی بولیوں اور دکنی زبان کے باہمی رشتوں پر ان محققین کی نظر نہیں رہی ہے ۔ اس کی تاریخی وجہ بھی بیان کی جا سکتی ہے۔

۷۴۸ھ میں سلطنت بہمنیہ کے قیام کے بعد سے لے کر فتح بیجاپور و گولکنڈہ تقریباً سوا دو سو برس تک، دکن اور شمالی ہند کے سیاسی و لسانی رشتے تقریباً منقطع سے ہو جاتے ہیں ۔ زبانوں کے اجنبی ماحول میں یعنی مرہٹی، کنڑی اور تلنگی علاقے میں "زبان دہلوی" کے ارتقا کی ایک نئی ڈگر قائم ہو جاتی ہے ۔ لہجہ بدلتا ہے، نئے الفاظ داخل ہوتے ہیں حتیٰ کہ محاورہ اور قواعد میں بھی یہاں کی زبانوں کے بعض کلیے لگ جاتے ہیں ۔ مرہٹی چوں کہ خود ایک آریائی زبان ہے اس لئے بیشتر اثرات اسی کے پڑتے ہیں لیکن لہجہ اور محاورہ کو تلگو اور کنڑی نے بھی متاثر کیا ہے ۔ قواعد کے نقطۂ نظر سے دکنی کی

سب سے بڑی پہچان "چ" تاکیدی کا استعمال ہے جو اس نے مرہٹی سے لیا ہے اور جو تاحال قائم ہے شمالی ہند اور دکن کے مخطوطات کی سب سے بڑی پہچان یہی "چ" تاکیدی ہے۔ اس کے ذریعہ سے آپ شمالی ہند کے ان مصنفین کا بھی پتہ چلا سکتے ہیں جو "ابراھیم نامہ" کے مصنف کی طرح شمال سے آکر بیجاپور میں بس گئے تھے اور جنھیں یہاں کے محاورے پر نوواردہونے کی حیثیت سے پوری قدرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ کی آمد سے قبل "زبان دہلوی" کو دکن میں بننے اور بگڑنے کے لئے تقریباً ڈھائی سو سال ملتے ہیں چونکہ شہر دہلی چار اہم بولیوں کے سنگم پر واقع ہے یعنی مغرب میں ہریانی، مشرق میں کھڑی بولی، جنوب مشرق میں برج بھاشا اور جنوب مغرب میں راجستھانی کی بولی میواتی۔ اسلئے شہر دہلی ان تمام بولیوں کی زور آزمائی کے لئے اکھاڑہ بنا رہا۔ خود شہر دہلی ہریانی کے علاقہ میں واقع ہے اور ہمسایہ بولی ہولے کی حیثیت سے ہریانی پر پنجابی اثرات غالب رہے ہیں۔ ہریانی جاٹوں اور گوجروں کی زبان ہے۔ کبھی کبھی میں اس خیال سے محظوظ ہوکر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اہل دکن تک جاٹوں کی صرف زبان پہونچی ہے دوسری صفات نہ پہونچیں ورنہ قلی قطب شاہ سے عقیدت کے ساتھ ساتھ آج ہم ہمدردی بھی کرتے نظر آتے۔ میں قلی قطب شاہ کی زبان کا ماخذ پنجابی کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں کہ "دکھن کی مٹھی بولی" اور پنجابی میں ہریانی کے رشتے سے بعض مماثلتوں کے قائم ہوجانے کے باوجود بنیادی لسانی اختلافات بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے جو طبعاً اردو کے "دہلوی نژاد" کو بہت زیادہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس کے ماخذ پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک نیا حل یہ پیش کیا ہے کہ اردوئے قدیم نہ پنجابی سے نکلی ہے اور نہ دو آبہ گنگ وجمن کی کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے نکلی ہے جو ان سب کی ماں تھی اور مسلمانوں کے داخلہ دہلی کے وقت راولپنڈی تا الٰہ آباد یکساں طور پر رائج تھی۔ اس طرح ان کے خیال میں یہ بات بھی صحیح ہوجاتی ہے کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے اور یہ بات بھی کہ اردو کھڑی بولی پر مبنی ہے تاہم جب تک اس قدیم زبان کے نمونے دستیاب نہ ہوجائیں اس وقت تک لسانیاتی طریقہ کار صرف یہی رہ جاتا ہے کہ موجودہ محقق بولیوں کے دریچوں سے داخل ہوکر بارھویں صدی عیسوی کی زبان کی تشکیل کرے۔ اس طریق کار پر عمل کرتے ہوئے اگر اردوئے قدیم (اس کے پہلے مستند نمونے دکن میں ملتے ہیں) کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل نتائج مرتب ہوں گے۔

(۱) اردوئے قدیم میں پنجابی زبان کے عناصر اس قدر پائے جاتے ہیں جس قدر کہ ہریانی میں جس کے علاقے میں شہر دہلی واقع ہے۔

(۲) اردوئے قدیم کا ڈھانچہ جدید ہریانی سے قریب تر ہے۔

(۳) اردوئے جدید کا ڈھانچہ جمنا پار کی کھڑی بولی پر قائم ہے۔

(۴) قلی قطب شاہ سے قبل اردو کو ارتقا کی ایک صدی دہلی اور تقریباً ڈھائی صدیاں دکن میں مل چکی تھیں۔

اس لسانیاتی پس منظر میں اگر محمد قلی قطب شاہ کی زبان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قلی قطب شاہ کے عہد تک اردو کا ادبی معیار متعین ہو چکا تھا۔ قلی قطب سے قبل جن اہم مصنفین کی تصنیفات ہماری تاریخ کا جزو بن چکی ہیں حسب ذیل ہیں :-

(۱) خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ' معراج العاشقین ۱۳۲۱ تا ۱۴۲۲ء

(۲) نظامی بیدری صاحب مثنوی پدم راؤ کدم ۸۶۰ء سنہ تصنیف کے قریب

(۳) فیروز (دلبستان گولکنڈہ کا مسلم استاد) توصیف نامہ ۱۵۶۴ء سے قبل

(۴) اشرف نوسرہار ۱۵۰۳ء

(۵) شاہ میراں جی شمس العشاق ۱۴۹۶ء پیدائش خوش نامہ، خوش نغز، مثنوی، شہادت الحقیقت (نثر) شرح مرغوب القلوب

(۶) شاہ برہان الدین جانم ۱۵۴۳ تا ۱۵۹۱ء ارشاد نامہ

(۷) عبدل ابراہیم نامہ ۱۶۰۳ سنہ تصنیف

(۸) ابراہیم عادل شاہ ۱۵۸۰ - ۱۶۲۶ء

خواجہ بندہ نواز کی تصانیف کی زبان کے بارے میں کسی قسم کا حکم لگانا بے جا ہوگا۔ اس لئے خواجہ صاحب کی بیشتر حصہ دہلی میں گزرا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اس عہد کی زبان دہلی کے ترجمان ہیں نہ کہ دکنی اردو کے "معراج العاشقین" میں "چ" تاکیدی کا ملنا ہی اسبات کا ثبوت ہے کہ اس میں کافی تحریفات ہوتی رہی ہیں۔ نظامی، اشرف اور شاہ میر شمس العشاق برہان الدین جانم کی زبان ارتقا کی سطح کی غماز ہے۔ کہ وہ غیر متعین ہوتی ہے۔ مثلاً اشرف نے نوسرہار میں جمع کی تین شکلیں استعمال کی ہیں۔

(۱) "اں" جو عام مروج تھی جس کا تعلق ہریانی اور کھڑی مغربی سے ہے۔

(۲) "ملا" جو کم تر مروج تھی اور جو جدید اردو میں رائج ہے جس کا تعلق مشرقی کھڑی بولی سے ہے۔

(۳) "آن" جس کا تعلق برج سے ہے اور جو سب سے کم استعمال کی گئی ہے۔

شاہ میراں جی اور برہان الدین جانم کی زبان گجرات کے لسانی ماحول سے متاثر نظر آتی ہے اور گجراتی اور بر

بھاشا کی اکثر شکلیں ان کے کلام میں مل جاتی ہیں۔ ان دونوں کی زبان ڈول اور کینڈ گجری یا گوجری کا ہے۔ جو زبان بولی کی وہ شکل ہے۔ جس نے گجرات میں نشو ونما پائی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیروز اور محمود جو دبستان گولکنڈہ کے مسلمہ طور پر استاد تسلیم کئے جاتے تھے۔ قلی قطب شاہ کے مدکی ادبی زبان کے بھی موجد ہوں گے۔ فیروز کی مثنوی "توصیف نامہ" میں الفاظ کا دروبست، متروکات سے اجتناب بات کا غماز ہے کہ ان اساتذہ نے ایک ایسا وسیلہ اظہار تیار کردیا تھا جسے بعد کو محمد قلی قطب شاہ اور وجہی نے ماہرانہ انداز استعمال کیا ہے۔

صوتیاتی سطح پر قلی قطب کی زبان میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس دور کے دیگر شاعروں سے مخصوص ہیں

(۱) تخفیف حرف میں (تخفیف مصوتہ)

پھل۔ انند (آنند)۔ اسمان۔ اپر۔ چمنا (چوسنا)

یہ بارھویں صدی کی ہند آریائی کی خصوصیت تھی جو پنجاب، ہریانی اور کھڑی کے علاقہ میں عام تھی۔ برج بھاشا اور راودھی نے اردو پر سے اس اثر کو اٹھارویں صدی میں کم کیا ہے۔

(۲) بر زیادتی حرف علت :۔ دین (دن)۔ مائی (مٹی)۔ جاگہ (جگہ)۔ لوھو (لہو)

(۳) ھ کاری آواز :۔ کہتے (کہتے)۔ کیں (کہیں)۔ چڑائی (چڑھائی)

زیادتی ھ : اٹھا۔ تقلیب ھ : بھوت۔ بھار

(۴) ڈ۔ ڈھ ۔ ڑ۔ ڑھ (جھڑنا۔ چڑنا)

قلی قطب کے یہاں "ڑ۔ ڑھ" معنی دار ہوگئی ہے۔

(۵) ا، ع کا مسئلہ   ییک۔ یتا (یم، یے)

(۶) "ق" "خ" کا مسئلہ   قلی قطب؟   تاریخ شمالی ہند   ۔ مزاخ۔ صندوخ

(۷) جنگل۔ کنچن۔ پنچل۔ سندر (سکی کا کھ برن جھلکے کنچن خاص)

سندر کے ادھر میں شکر تھے الذ پہ ترے بوسے نبات نر تھے الذ

صرفی سطح پر :۔

اسما :۔ جمع "اں"۔ تذکیر و تانیث :

اسمائے ضمیر :۔ منج (مجھے)، تج (تیرے) منجے منجے   او (ریختی)

همنا (ہم کو) مو (میرا) ریختی

جے (جو) (سب رس میں نہیں ملتا۔)

ٹھوں (میں) برج اور گجراتی

(ہوں تل تل تمن پر تجھے واری ہو پیاری

جتمن کہ تن من جوبن آپ ہوں تو یہ واری) تو (برج)

جنے (جو)

دو

حروف

کوں۔ ہور (تائیں۔ تیئں) (غالب) تھے (سے)

رسیتی۔ سوں۔ منجے (میں)

افعال لیتا (ردیف)

"یا" چلیا۔ پڑیا۔ کین (جوکوئی) جے کو کہ ہتیلی جام لیتا

سلطانی جم مدام لیتا

مصدر "نا" گر دیکھن

"کہ جوں حاجی کہ کعا آکے منگتا ہے دیکھیں برقع"

"سی" کا صیغہ مضارع مستقبل۔ دونوں میں

سکنا۔ مانگنا۔

صرفی

کیاں۔ رنگ برنگیاں

جواہرات کیاں رنگ برنگیاں کوٹھریاں بھریاں تھیاں

جواہرات کی رنگ برنگی کوٹھریاں بھری تھیں

رنگ برنگیاں کوٹھریاں بھریاں تھیں

بھریں تھیں.

مخصوص الفاظ :- انپڑنا ۔ ویں　نکو　دینا　اچھنا　ہے

محمد قلی قطب کی زبان معیاری کلاسیکی اردو ہے ۔ شہنشاہیت کے نظام میں قلعہ شاہی کی زبان، زبان
ہ متعین کرتی تھی ۔ کلام الملوک اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن لسان الملوک کا تتبع اہل دربار عام تھا ۔ قلی قطب کو
ـ وقت ہونے کی حیثیت سے اجتہاد اور ایجاد کا اجارہ بھی تھا ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قلی قطب کی زبان میں جس قدر
؛ ملتا ہے ۔ اس عہد کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتا ۔ وہ اصناف سخن کی رعایت اور اظہار کے تقاضوں
ر ایک وسیع پیمانہ پر اردوئے قدیم کے تنوع کو استعمال کرتا ہے ۔ اس کی غزلوں کا لہجہ اس کی نظموں سے مختلف ہے
ین یہی زبان زیادہ محدود سمٹی ہوئی اور پابند نظر آتی ہے ۔ نظموں میں تلفظ کا جس قدر تنوع ملتا ہے غزلوں
ب ملتا ۔ قلی قطب شاہ کا عہد ایک طریقے سے اردو قدیم کے دکنی ، لسانی ماحول میں ارتقا کا آخری زینہ بھی ہے اس لئے
شد قطب شاہ کے وقت سے دکن کی سرحدوں میں شمالی ہند کی اردو کی دست اندازی پھر شروع ہو جاتی ہے اور
ید زبان کا خاکہ بننے لگتا ہے جس کی درمیانی کڑی ولی کی زبان ہے اور جو پیش خیمہ ہے اس لسانی بازگشت کا
دکن نے آصفیہ دور میں قدیم "زبان دہلوی" سے جدید "زبان دہلوی" تک مسلسل کی ہے جس کا شاندار تکملہ اور خاتمہ مرحوم
ہ عثمانیہ پر ہوگا

سید دلدار حسین
(رکن مجلس منصوبہ بندی)

پرانا پل
وجدانیت یا حقیقت

زمانہ ماضی میں دریائے موسیٰ ندی کی طغیانیوں کی وجہ سے پرانا پل اور اس کی وجہ سے شہر حیدرآباد پر کیا گزری اس پر ایک اجمالی نظر بے محل نہ ہوگی چنانچہ قدیم تاریخ سے پایا جاتا ہے کہ سنہ ۱۶۳۱ء میں پرانا پل طغیانی میں بالکل ڈوب گیا تھا اور حیدرآباد کی آبادی کے بہت سے حصے سیلاب کی نذر ہو گئے تھے اس کے بعد سنہ ۱۸۲۰ء میں نواب سکندر جاہ منغفر منزل کے عہد حکومت میں زبردست طغیانی آئی۔ پرانا پل پھر غرق ہوگیا اور پانی کی بلندی کی وجہ سے جہاں آبادی کو کثیر وجانی نقصان پہونچا۔ وہاں پل کو بھی خاصہ ضرر پہونچا چونکہ یہی ایک پل شہر کے عبور و مرور کا کام دیتا تھا اس لئے مدا وقت... راجہ چندولال نے (جن کا تخلص شاداں تھا) اس پل پر خاص توجہ کی اور پورن سنگھ انجینیر کی نگرانی میں پل کی تعمیر کی گئی جس کی تاریخ ذیل کے قطعہ سے ملتی ہے ؎

بعہد شاہِ اسکندر شدہ تعمیر پل یکسر ❊ زسعئ راجہ چندولال، از ادل بود بہتر
بہ شاداں شد ندا جائے غریبے سر تا ربخش ❊ ز سیل اینک بود محفوظ چوں اندر صدف گوہر
۱۲۳۶

یہ قطعہ اس وجہ سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس سے پرانا پل اور اس کے محل وقوع پر دریائے موسیٰ کی اجمائے آب صلاحیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس پل کی تجویز ہی ایسی ہے کہ پانی میں اس کا غرق ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے پلوں کی مثالیں ہندوستان میں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں مثلاً سرنگا پٹن، پونہ، تاپتی وغیرہ اس قسم کے پلوں کو جدید کی انجنیری اصطلاح میں (SUBMERSIBLE BRIDGE) یعنی غرقاب پل کہتے ہیں۔ ہندوستان میں ۲۰ صدی عیسوی کی ابتدا میں انگریزی حکومت نے اس وضع کے چند پل تعمیر کئے تھے لیکن اب یہ نظریہ مسترد ہو چکا ہے کیونکہ تیز رفتار عبور و مرور اور تجارتی نقل و حمل میں تاخیر یا رکاوٹ نقصان کا باعث ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ پرانے پل

جتہ "چوں اندر صدف گوہر" کی تلمیح اس نکتہ کو واضح کرتی ہے کہ آیندہ پل ڈوبے تو ڈوبے لیکن اس کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا
مآثر دکن مولفہ علامہ علی اصغر بلگرامی سے پایا جاتا ہے کہ پرانا پل ۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۸ء میں تعمیر ہوا تھا اور چونکہ ابراہیم قلی شاہ کا حکم تھا کہ اس کو جلد از جلد تعمیر کیا جائے تو انجینر وقت رنگیا چودھری نے جس کو بعد میں ہنرمند خاں کا خطاب دیا گیا تھا سال کی مدت میں تیار کر دیا چنانچہ اس کی تاریخ "گذرگہہ ما" سے نکلتی ہے ۔

۱۹۰۸ء میں بہ عہد میر محبوب علی خاں بہادر غفران مکان دریائے موسی ندی میں جو طغیانی آئی تھی وہ بدترین تھی اس کے سبب شہر کو جو نقصان پہونچا اس کے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پرانے پل کے خانوں کی دوسعت اور تنگنائی تھی جس کی وجہ سے پانی اکٹھا اور اونچا ہونے پر مجبور تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ نئے پل کے خانوں کی وسعت تقریباً سات ہزار مربع فٹ ہے اس کے مقابلے میں افضل گنج یعنی نئے پل کے خانوں کی وسعت تقریباً پندرہ ہزار مربع فٹ اور چادر گھاٹ پل کی تقریباً (۱۳) ہزار مربع فٹ ہے پانی کے سائنس (HYDRAULI) کا مسئلہ ہے کہ جب کسی وجہ سے پانی کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو پانی جمع ہو کر اونچا ہوتا جاتا ہے اس کو ابھار یا (AFFLUX) کہتے ہیں جس کی بلندی سیلاب کے تسلسل اور بارش کی کثرت پر منحصر ہے پانی بنا راستہ نکلنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں یہی ہوا کہ اقبال گنج، کاروان، گولہ واڑی، اکبر جاہ بازار مان شاہی، بازار گھانسی اور بہت سے محلے بری طرح سیلاب کی زد میں آئے جس کا نتیجہ بقول غالب ؎ "یکھناان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں"۔ شہر لکھنؤ میں ہر تیسرے چوتھے سال دریائے گومتی کی طغیانی اور سیلاب کی تباہ کاریوں کی داستان سنائی دیتی ہے ۔ وہاں کے انجینروں کی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ دریائے گومتی کی عنان گیختگی کے ذمہ دار وہ متعدد پل ہیں جن کی تنگی کی وجہ سے پانی رک جاتا ہے مثلاً لوہے والا پل اور پکا پل وغیرہ۔ حکومت اتر پردیش نے اب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ لکھنؤ کو بچانے کے لئے پلوں کو وسیع و عریض کیا جائے اور بڑے پیمانہ پر نئے پل تعمیر کئے جائیں ۔ چنانچہ ان تجاویز کا آغاز ہو چکا ہے ۔

سر وشویشوریا نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ پرانے پل کے بجائے دوسرا پل تعمیر کرنا مناسب ہوگا لیکن مقامی وجدانات (SENTIMENT) بہ لحاظ تاریخی روابط غالباً اس تجویز کی راہ میں حائل ہوں گے ۔ چنانچہ وہی بات آج محترم پروفیسر جناب ہارون خاں شروانی صاحب جیسے مبصر کے رشحات قلم سے پائی جاتی ہے ۔ سال حال بارش ویسی معرکہ آرا تو نہیں تھی لیکن اگر (CYCLONE) کی شدت اور دو چار روز جاری رہتی تو احتمال تھا کہ ۱۹۰۸ء تاریخ اپنا ورق پلٹتی ۔ ایک اور امر لائق ذکر ہے ـــ کرہ ارض کے موسمیاتی اور قطراتی (HYDNOLOGY)

علماء کے نزدیک یہ مسئلہ مقرر ہو چکا ہے کہ بارش اور نتیجتاً دریاؤں کی طغیانی کے مختلف ادوار (CYCLES) ہوا کرتے ہیں جن کا فصل سو برس، پانچ سو برس، ہزار برس اور پانچ ہزار برس کے لگ بھگ ہوا کرتا ہے اور ہر دور یعنی (HYDRO-LOGICAL CYCLE) میں کوئی ایک ایسا بھی ہوا کرتا ہے جس میں بارش کی مقدار انتہائی شدید ہوتی ہے اس کے علاوہ ہر دور کا درجۂ انتہا دوسرے دور کے درجۂ انتہا سے مختلف اور ممتاز ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ براعظم آفریقہ کے شمالی RHODESIA دریائے (ZAMBESI) پر جو نادر العصر بند (DAM) اور سمندر نما خزانۂ آب حال میں تیار ہوا ہے۔ اس کے دورِ تعمیر میں جو قیامت خیز سیلاب آیا تھا اور جس کی وجہ سے ڈیم کی تجویز کو سرتاسر بدلنا پڑا تھا، ایسا تھا جو پانچ ہزار سال میں ایک مرتبہ آسکتا ہے۔

چنانچہ دریائے موسیٰ کی ۱۹۰۸ء کی طغیانی کے بارے میں سر ویشوریا نے لکھا کہ رقبہ آب گیر (CATCHMENT AREA) شرح روانی آب (RUN OFF) یعنی [illegible] پون اینچ فی گھنٹہ کی نظیر دنیا میں کہیں پائی نہیں جاتی۔ یہ امر بھی لائق غور ہے کہ شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے قیام (۱۵۹۲ء) کے بعد سے ۱۹۰۸ء تک دریائے موسیٰ میں گیارہ مرتبہ مختلف پیمانہ کی طغیانیاں آئیں۔

بہر حال اب سوال صرف وجدانیت یعنی (SENTIMENTS) اور سائنٹفک حقایق کے تقابل و توازن کا ہے۔ حیدرآباد کی متمدن زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضے اس امر کے طالب ہیں کہ شہر کی آبادی اسی قسم کے حوادث سے حتی الامکان محفوظ رہے اس کی پیشرفت میں اہل حیدرآباد کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا پرانا پل جو (BULLOCK CART AGE) بیل گاڑی کے عہد کی یادگار ہے علی حالہ قائم رہے یا اس کی جگہ دوسرا عصر جدید کا وسیع و عریض پل تعمیر کیا جائے۔ اب رہا قطب شاہی آثار کی بقا کا سوال تو اس کے متعلق یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ پرانا پل سے کہیں اعلیٰ اور ارفع حسین و جمیل جاذب نظر یادگاریں جیسے چار مینار اور مکہ مسجد کی شکل میں اس تاریخی دور کی منقبت خواں ہیں جس پر عرفی کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے ؎

آثار پدید است صنادید عجم را

نمائش نوادر قطب شاہی

یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر ادارہ میوزیم ایوان اردو میں قطب شاہی نوادر پر مشتمل ایک تاریخی نمائش ترتیب دی گئی تھی جس کا افتتاح ۱۲ جنوری ۱۹۶۴ء کو صبح دس بجے عالی جناب سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ نے فرمایا۔ افتتاح سے قبل معتمد نمائش نے نمائش کی تفصیلات پر روشنی ڈالی اور ادارہ میوزیم میں قطب شاہی سکوں کے جدید شعبے کے قیام کا اعلان کیا۔ نمائش میں کئی ایسے نوادر بھی رکھے گئے تھے جو اب تک منظر عام پر نہیں آئے۔ نمائش قطب شاہی فرامین، نادر مخطوطات، مطبوعات نایاب، سکہ جات، اسلحہ، قلمی و عکسی اور ہاتھی دانت کے تصاویر، نقشہ جات، کتبات اور حربوں کے علاوہ حضرت میر محمد مومنؒ کے آثار وغیرہ پر مشتمل تھی۔

ہم معتمد تعلیمات جناب ناظم صاحب، اسسٹنٹ آرکیوز جناب ناظم صاحب محکمۂ آثار قدیمہ، نواب عنایت جنگ بہادر، غلام محمد اشرف صاحب اور عباس علی صاحب سجادہ درگاہ حضرت میر محمد مومن صاحبؒ کے شکر گزار ہیں جن کے عملی تعاون سے یہ نمائش کامیاب رہی۔ نمائش تین دن تک جاری رہی۔

پروفیسر سید محمد

محمد قلی قطب شاہ

سلطان محمد قلی جس کو اس دور فانی سے رخصت ہوئے ساڑھے تین سو سال کی مدت گزر چکی ہے اپنے کارناموں کی وجہ سے آج بھی اہل دکن کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کا یہ ہم عصر بلاشبہ دکن کا اکبر اعظم ہے۔ اس کی پالیسی وہی تھی جو اکبر اعظم کی تھی۔ وہی تالیف قلوب' رعایا پروری' رواداری' علم پروری اور وسیع النظری جو اکبر کے کردار کی نمایاں خصوصیات ہیں' یہی ہمارے محمد قلی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ملک گیری وجہاں کشائی' جہاں گیر اور فاتح کہلانے کے بجائے اس نے "جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ" کے اصول کو اپنایا اور اپنے آبائی ملک کی حدود میں پاس پڑوس کے علاقوں پر کسی نہ کسی حیلے بہانے حملہ کرنے کی بجائے اس نے استحکام سلطنت اور رعایا کی خوش حالی اور فارغ البالی کو اپنا مقصد حکمرانی قرار کر دیا۔ اس کی اس بالغ نظری اور دور بینی وسیع مشربی نے اسکو کیا اپنے اور پرائے سب کے نزدیک ہر دل عزیز بنا دیا۔ اس نے رعایا کے تمام طبقات کو ایک نظر سے دیکھا۔ کوئی طبقہ خواہ وہ دکنی ہو یا آفاقی' ہندو ہو یا مسلمان سنی ہو شیعہ اس کے نزدیک پرایا نہیں تھا۔ سب اس کے اپنے تھے۔ سلطنت کا نظم و نسق' پیدل اور سوارہ فوج سفارتی خدمات غرض حکومت کے ہر شعبے کے دروازے سب ہی طبقات کیلئے یکساں طور پر کھلے ہوئے تھے کسی کو کسی پر امتیاز حاصل نہ تھا۔ اگر ایک طرف حضرت میر مومن صاحبؒ بزرگ پیشوائے سلطنت اور وزیر اعظم تھے تو دوسری طرف حضرت حسین شاہ ولیؒ جو حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے پوتے تھے وزیر تعمیرات تھے جن کی یادگار حسین ساگر آج بھی اپنے بنانے والے کی اعلیٰ فنی قابلیت اور روشن ضمیری کی یادگار ہے۔ مرزا محمد امین اصفہانی جن کا تالاب میر جملہ اب تک مشہور ہے' میر جملہ کی خدمت پر فائز تھے تو اسی راؤ دھرم راؤ جگپت راؤ سری راؤ اور رادت راؤ مختلف پیدل اور سوارہ فوج کی سرداری اور سرلشکری پر مامور تھے۔ یہی وہ سرداران فوج ہیں جنہوں نے محمد قلی کے عہد میں ہر قسم کی چھوٹی بڑی بغاوتوں کو فرو کرنے کا کام انجام دیا اور انہی کی شایستہ خدمات نے ملک میں امن و امان قائم رکھنے میں بادشاہ کی مدد کی۔

محمد قلی علم و فن کا سچا شیدائی اور عالموں اور فنکاروں کا بڑا قدر دان اور سرپرست تھا۔ وہ خود اردو اور تلنگی کا بڑا شاعر تھا

اس کا اردو کلیات جو خاصا ضخیم ہے اور نواب سالار جنگ مرحوم کی سرپرستی میں شائع ہوگیا ہے۔ اسکی اعلیٰ شاعرانہ صلاحیت اس کے ستھرے ادبی مذاق کا ثبوت ہے۔ نیز یہ اس کے عہد کے دکنی دکھنی تہذیب یہاں کے رسم و رواج، عیدوں تیوہاروں اور جلسوں غرض مجلسی زندگی کا مرقع ہے۔ محمد قلی کا باپ ابراہیم قلی تلنگی زبان کا ماہر تھا۔ اس نے اپنے تمام بچوں کو تلنگی زبان کی تعلیم بھی اس طرح دلائی تھی جس طرح کہ فارسی کی۔ محمد قلی کو بھی اس تعلیم سے بہرہ یاب ہونے کا موقع ملا تھا۔ وہ فطرتاً شاعر واقع ہوا تھا اس نے اپنی جولانی طبع کے جوہر اس زبان میں بھی دکھلائے ہیں۔ اور کم و بیش تمام مورخین اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ ابتدا از زمانہ کا تلنگی کلام تا حال مدون نہیں ہوا لیکن مورخوں کی شہادت اس کا زبردست ثبوت ہے۔ کیا تعجب ہے کہ تلنگانہ کے عوامی گیت اور جوان بڑھے دیہاتیوں کی زبانی سنے جاتے ہیں ان میں بہت سے محمد قلی کے ہوں۔ اس کی شعر دوستی اور علم پروری کا شہرہ تھا دور دور شاعر، طبیب، نقاش، خوشنویس، معمار، مصور سب ہی گولکنڈے میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کا دربار باکمالوں کا مرجع تھا شہادت محمد قلی کے عہد کے ادبی کارناموں، طبیبوں کی کتابوں، نقش و نگار کتابت، طغرے، گنبد، مسجدیں، مندر، تصویریں اور دیتے ہیں۔ محمد قلی کا بنایا ہوا چار مینار اور یہ عالی شان گنبد جہاں آپ اس وقت تشریف رکھتے ہیں اسکے اعلیٰ ذوق تعمیر کا ثبوت ہیں۔ اس نے اپنے حسن کارانہ مذاق سے ہندی اور ایرانی فن تعمیر کی بہترین خصوصیات کو یکجا سمو کر قطب شاہی کی بنا ڈالی۔ اور آج پورے عہد قطب شاہی میں مسجدیں اور دوسری عمارتیں اپنے مخصوص تعمیری خصوصیات کی وجہ سے ہندوستان کے فن تعمیر میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔

محمد قلی بڑا عالی حوصلہ بادشاہ تھا۔ اس کے دور کے امن و امان نے اس کے مستقر ریاست قلعہ گولکنڈہ اور اس کی وسعت کو جو موسیٰ ندی تک پھیلی ہوئی تھی ناکافی بنا دیا تھا۔ اب بادشاہ کو ایک نیا شہر تعمیر کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی اس نے ۹۹۹ھ میں شہر حیدرآباد بسانے کا نقشہ بنایا۔ سب سے پہلے چار مینار کی لاجواب عمارت بطور مرکز شہر تعمیر ہوئی۔ سن تعمیر ۱۰۰۰ھ ہے اور یا حافظ سے یہ تاریخ نکلتی ہے۔ اس کے چاروں طرف آبادی قائم کی گئی۔ ایک طرف محلات شاہی ہوئے باقی تین طرف امرا اور رعایا کے محلات و مکانات، سرکاری دفاتر، بازارت اور محلے بنائے گئے۔

اگرچہ ہمارا یہ شہر دنیا کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں بہت زیادہ قدیم نہیں ہے لیکن اسکے بانی کی نظر انتخاب، حسن نیت کی تعریف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ لیکن نیک گھڑی تھی جو اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور کیسے مبارک ہاتھ اسکی بنیاد رکھی کہ باوجود سیکڑوں آفات سماوی و ارضی کے یہ آج بھی نہ صرف بارونق اور آباد ہے بلکہ ہر حادثہ اور ہر آفت ایک حیات تازہ حاصل کرتا جاتا ہے اور اسکی آبادی اور چہل پہل پہلے سے زیادہ ہی ہوتی جاتی ہے۔ محمد قلی نے اپنے محلات عوام کے لئے جو بہت سے حمام، مسجدیں، عاشور خانے، لنگر خانے، مدرسے، مہمان خانے، کاروان سرائیں اور دواخانے بنوائے تھے ان ہی سے چند حمام، اکثر مسجدیں، عاشور خانے، کاروان سرائیں اور دار الشفا کی عمارتیں یا ان کے آثار باقی ہیں اور اس شکستہ حالت میں بھی اپنے بانی کے اعلیٰ ذوق اور شان و شوکت کی نشانی ہیں۔ گولکنڈہ اور حیدرآباد

عمارتیں جسامت، مضبوطی اور بلندی کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں لیکن ان کی تعمیر میں مضبوطی اور بلندی کے ساتھ ساتھ خوبصورتی اور لطافت کو بھی خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ مشہور مورخ فرشتہ جو مغلوں کے فن تعمیر کے نمونے دیکھ چکا تھا اور آگرہ، لاہور اور فتح پور سیکری جیسے عظیم الشان شہروں میں رہ چکا تھا حیدرآباد کے متعلق لکھتا ہے۔

" شہرے کہ در تمامی ہندوستان شرقاً، غرباً، شمالاً، جنوباً مثل او در لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود"

اگر فرشتہ کو سارے ہندوستان میں شمال سے لیکر جنوب تک اور مشرق سے لیکر مغرب تک کہیں ایسا صاف ستھرا اور پاکیزہ شہر نظر نہیں آیا تو ایک دوسرا مورخ جو حیدرآباد کی تعمیر کے صرف (۲۵) سال بعد اس کو دیکھا ہے یہ محسوس کرتا ہے کہ یہاں کی لطیف آب و ہوا، آرائش و زیبائش جنت کے مانند ہے۔ بوڑھا بھی یہاں آجائے تو جوان ہو جائے۔ ہر جگہ عیش و مسرت اور خوشی اور خوشحالی ہے۔ رنج و غم اور دکھ درد کا نام نہیں۔ وہ کہتا ہے

شہرے چو بہشت در نکوئی یابی در آن شہر ہر چہ جوئی
گر پیر بہ دیدنش شتابد ز و عمر گذشتہ باز یابد
ز و ہر چہ نکوست کم تو یابی یابی ہمہ چیز و غم نہ یابی

ملکوں اور قوموں کی طرح شہروں کی زندگی میں بھی نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ حیدرآباد کی تاریخ نے بھی کئی پلٹے کھائے ہیں اور اس شہر اور اس کے بسنے والوں کی زندگی میں بھی کئی انقلاب آئے اور گزر گئے۔ ایک بڑا انقلاب اس وقت آیا جب کہ اس شہر کے بانی محمد قلی کے خاندان کی حکومت ختم ہو گئی اورنگ زیب نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ قطب شاہی فرمان روا ابو الحسن کو قید کر کے دولت آباد بھیج دیا اور اس ریاست کو سلطنت مغلیہ میں ضم کر کے یہاں مغلی گورنر کا راج قائم کر دیا۔ اس انقلاب سے حیدرآباد اتنا متاثر ہوا تھا کہ اسکی صورت ہی مسخ ہو گئی تھی لیکن زیادہ دن نہیں گزرے کہ آصفی سلطنت قائم ہو گئی اور اس شہر کی رونق پھر سے عود کر آئی اور وہ تمام روایتیں جو قطب شاہی عہد میں قائم ہوئی تھیں پھر سے یہاں جاری ہو گئیں۔ شکستہ آثار ہی کی تعمیر جدید نہیں ہوئی بلکہ شکستہ دلوں کو بھی جوڑا۔ قطب شاہی عہد کے باقی ماندہ خاندانوں کی اس روایتی رواداری اور وسیع النظری سے پرورش کی گئی جو عہد سابق میں پائی جاتی تھی۔ حالیہ دور کے انقلاب عظیم کے بعد بھی بحمد اللہ پھر رونق تازہ حاصل کر رہا ہے اور آج نہ صرف اپنی خوب صورت عمارات، روز افزوں آبادی اور خوشگوار آب و ہوا کے لئے ہر آیند و روند سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے بلکہ یہاں کی تہذیب و تمدن، علمی و ادبی سرگرمیوں اور سماجی اور تہذیبی مصروفیتوں کی ہر چھوٹا بڑا اور اپنا پرایا سبھی دل سے تعریف کر رہا ہے۔ اور محمد قلی کی یہ دعا یقیناً مقبول ہوئی کہ میرے شہر کو اس طرح آباد رکھ جس طرح سمندر میں مچھلیاں ہوتی ہیں۔

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

محمد قلی کے عہد میں سارے آندھرا دیس پر اس کا راج تھا۔ کچھ عرصہ تک مغلیہ حکومت کی فوج کشی نے اسکی ہر خصوصیت

ختم کردی لیکن آصفی دور کے ابتدائی زمانے میں پھر یہ سارا علاقہ ایک جھنڈے کے تلے آگیا۔ پھر انقلاب زمانہ سے کچھ علاقے نکل گئے
آجکل کے ہندوستان میں لسانی ریاستیں بننے کی وجہ سے پھر یہ وحدت قائم ہوگئی اور آج حیدرآباد پھر اپنی سابقہ عظمت حاصل کر رہا
اور وہ نہ صرف آندھرا کی انگوٹھی کا نگینہ ہے بلکہ سارے ہندوستان میں دہلی کے بعد دوسرا پایہ تخت بن سکتا ہے تو وہ یہی شہر ہے

محمد قلی جیسے محسن ملک و قوم بادشاہ کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ وہ بادشاہ جس نے دیسیوں اور پردیسیوں کو مل جل کر زندگی
کرنے کا سبق پڑھایا۔ جس نے اس ملک کی ملکی زبانوں یعنے تلنگی اور اردو کی سرپرستی کی۔ جس نے حیدرآباد فرخندہ بنیاد جیسا خوبصورت
شہر بسایا جس نے علم و حکمت اور شعر و ادب کی نہریں جاری کیں جس کی روایات نے اس ملک کو جینا سکھایا جس کا ہر فعل
ہر عمل اسکی انسان دوستی اور رعیت پروری کا شاہد ہے۔ کیا اس کا نام مٹ سکتا ہے۔ کیا اسکی یادگاریں زبان حال سے ہمیں
اسکی عظمت کا گن گانے پر مجبور نہیں کرتی ہیں۔ اس کے نام اور کام کی عظمت کو انگریزوں کے دور میں نظر انداز نہیں کیا
حیدرآباد میں اگلے زمانے میں جو وائسرائے بھی آتے تھے ایک عرصے تک یہ طریقہ رائج تھا کہ انھیں گنبد محمد قلی کی سیر کرائی جاتی اور
اس چبوترے پر بیٹھ کر چائے پیتے اور محمد قلی کی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کا ایک نقش اپنے دل میں لیکر یہاں سے اٹھتے

انگریزی حکومت کا دور گزر گیا۔ اب ہندوستان آزاد اور خود مختار ملک ہے جس کا ہر علاقہ اپنی علاقائی خصوصیات
کے ساتھ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے اصول کو لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔ اس عہد میں اہل حیدرآباد یقیناً ایک خود دار
اور باعزت قوم کی حیثیت سے اپنے اس محسن کو یاد کرینگے۔ اور ہر سال یہ جلسہ اسی شان بلکہ زیادہ آن بان کے ساتھ
جائے گا۔ اس موقع پر میں اس ہستی کی یاد میں دو آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے ساڑھے تین سو سال کی فراموشی
غفلت کو دور کرکے اہل حیدرآباد کو اسکی یاد دلائی اور اپنی بے بضاعتی کے باوجود محض حسن نیت اور خلوص سے اس رسم
کی بنا ڈالی۔ ڈاکٹر زور جو گولکنڈہ اور اس کی یادگاروں کے عاشق زار تھے جنہوں نے یہاں چپے چپے پر عظمت رفتہ کے
نشان ڈھونڈھے انہوں نے ان فراموش شدہ یادگاروں سے خاص و عام کو روشناس کرایا۔ آج ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی
خاکی بھی ہماری سرزمین سے ہزاروں کوس دور کشمیر کے سبزہ زار میں آسودہ ہے لیکن ہم ان کی یاد اپنے دل سے بھلا نہ سکے۔
کے اس لائق فرزند نے باوجود یکہ وہ نہ امیر تھے نہ وزیر، نہ دولت رکھتے تھے نہ اقتدار لیکن ایک مخلص دل اور
پناہ جذبہ خدمت ملک اپنے اندر رکھتے تھے اس رسم کی بنا ڈالی اور ہمیں ایک ایسی روایت بنا کر دی کہ اگر ہم اسے
برقرار رکھیں تو ہمارے قومی جذبات اور قومی افتخار میں دن بدن اضافہ ہوتا رہے گا۔ اور آئندہ نسلیں
بزرگوں کے کارناموں کو یاد کرینگی اور ان سے نئے حوصلے اور نئے ولولے حاصل کرینگی۔

نصیرالدین ہاشمی

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عوامی کارنامے

آج کل کے جمہوری دور میں شخصی بادشاہوں کے کارناموں اور ان کی اچھی باتوں کو اجاگر کرنا بھی شاید بعض اصحاب پسند نہ کریں مگر حقیقت حقیقت ہوتی ہے اور صداقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ ہمارے اکثر بادشاہ نہ صرف رعایا پرور تھے بلکہ عوام کی بہبودی اور بھلائی میں پورا حصہ لیا کرتے تھے ان کو اپنی رعایا عزیز اور جان سے زیادہ پیاری ہوتی تھی وہ انسانی فلاح و بہبودی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے اور ان کی ترقی کے لئے پوری جد و جہد کرتے تھے۔ امن و اماں اور خوشحالی و فارغ البالی سے ان کی زندگی بسر کرنے کے آرزومند رہا کرتے تھے۔ جب کسی آسمانی مصیبت یا آفت میں رعایا گرفتار ہوتی تو اپنی امکانی کوشش اور امداد سے دریغ نہیں کرتے تھے۔

حیدرآباد کی دونوں حکومتوں یعنی قطب شاہی اور آصف جاہی بادشاہوں کے ایسے متعدد واقعات تاریخ میں ثبت ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ رعایا کی بھلائی۔ عوام کی بہبودی کے لئے انھوں نے کیسے اہم امور انجام دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں صرف دو واقعات آصف جاہی بادشاہوں کے سنائے جاتے ہیں جو تاریخ سے مٹ نہیں سکتے۔ نواب نظام علیخاں آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں ایک مرتبہ حیدرآباد میں قحط ہوا تھا تو موصوف نے اپنی جیب خاص سے ایک لاکھ روپیہ مرحمت کئے اور ولی عہد یعنی سکندر جاہ کو ترغیب دی کہ وہ قحط کی مصیبت دور کرنے میں مدد دیں۔ اس طرح جب ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کو طغیانی ہوئی تو میر محبوب علیخاں آصفجاہ نے اپنے محلات کے دروازے عوام کے لئے کھول دیئے تھے اور گرانقدر رقم مصیبت زدوں کے لئے دی تھی۔ ان کا یہ شعر ہمیشہ یادگار رہے گا جس پر آپ کاربند رہے۔

آصف کو جان و مال سے ہرگز نہیں دریغ ؎ گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے

بہرحال اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ہمارے بادشاہ رعایا کی بھلائی میں غفلت نہیں کرتے تھے؛ ہو یا غلہ کی گرانی یا غنڈہ گردی اس کا انسداد ضروری تصور کرتے ۔ رعایا کے مل جل کر اتحاد اور اتفاق سے ر کا بڑا خیال رہا کرتا تھا اور اس کی کوشش ان کا نصب العین تھا۔

قطب شاہی بادشاہوں کے عوامی کارناموں کی صراحت کی جائے تو اس کے لئے طویل مضمون درکا یہاں سلطان محمدؒ قلی کی عوامی خدمات اور کارناموں کا مختصر تذکرہ سنایا جاتا ہے

واضح ہو کہ عوام کے لئے سب سے پہلے رہنے کی آسایش صحت بخش ہوا اور شیریں پانی کی ضرو اہم حیثیت رکھتی ہے ۔ ان کی تندرستی کے لئے اچھی ہوا، کشادہ صحت بخش مقام اور پینے کے لئے شیر پانی افراط سے دستیاب ہونا ضروری ہے ۔

سلطان قلی نے اپنی تخت نشینی کے بعد اس امر کا اندازہ کیا کہ قلعہ گولکنڈہ کی آبادی زیادہ ہو گئی اور آب و ہوا خراب ہوتی جارہی ہے لوگوں کے رہنے کے لئے تکلیف ہے اور پھر قلعہ گولکنڈہ کی آبادی ہر وقت دشمن کے حملہ سے جان و مال کے نقصان کا خطرہ اور اندیشہ رہا کرتا ہے اس لئے ۱۰۰۰ھ یعنی آج سے تین سو تراسی سال پہلے حیدرآباد کو آباد کیا اور اس شہر میں لوگوں کے رہنے کے لئے مکانا بنائے ۔ ایک اندازہ کے لحاظ سے دو لاکھ گھر تھے۔ خرید و فروخت کے لئے وسیع دکانات، چوک، ب کے لئے کشادہ راستے بنائے چودہ ہزار دکانات کا شمار کیا گیا تھا۔ باہر سے آنے والے مسافروں کے کئی سرائے تعمیر کئے گئے ۔ مدرسے بنائے گئے ۔ چنانچہ چارمینار میں ایک کالج بھی تھا۔ جامع مسجد اور اس ساتھ طلبہ کیلئے اقامتی کمرے بنائے گئے۔ دواخانے قائم کئے ۔ شہر کی تعمیر کے ساتھ ساتھ دوسری عوا کا پورا خیال رکھا گیا تاکہ عوام کو کسی قسم کی تکلیف اور زحمت نہ ہو اور وہ ہر طرح آرام اور آسایش خوش و خرم زندگی بسر کر سکیں ۔

سلطان محمدؒ قلی کا شہر حیدرآباد کی تعمیر سے نہ صرف یہ منشا تھا کہ سلاطین قطب شاہی کا دارالسلـ دنیا کا ایک مشہور شہر بن جائے بلکہ سلطان کو اپنے بلند خیالات کے لئے ایک وسیع متمدن شہر بنانے ایک اجتماعی زندگی پیدا کرنے کی دلی خواہش دامن گیر تھی' تا کہ اہل شہر ایک جگہ رہ کر اپنے اخلاق ذہنی قوی کو ترقی دے سکیں اور ان کی سماجی اور تمدنی تہذیب میں ترقی اور ہم آہنگی پیدا ہو اور اثر تمام ملک میں پھیلے اس لئے اہل شہر کے رہنے بسنے کے لئے خاطر خواہ سہولت اور ان کی زن

بسر کرنے کے پورے لوازم مہیا اور فراہم کئے۔ شہر کو اس طرح آباد کیا گیا کہ اس میں بازار بھی ہوں، چوک بھی، مدرسے بھی ہوں اور سرائے بھی، مہمان خانے بھی ہوں اور تفریح کے لئے باغ اور کھلے میدان بھی، بیمار کے لئے دوا خانے بھی ہوں۔ جہاں لائق طبیب اور جراح اہل شہر کا علاج کریں اور ان کو دوا اور غذا مفت دیجائے ان تمام امور کا خاطر خواہ نئے شہر میں انتظام کیا گیا تھا۔

سلطان محمد قلی نے جہاں اپنے لئے اور عوام کے لئے شہر میں ہر قسم کی سہولت کا انتظام کیا تھا۔ یعنے جو شاہی اور عوامی عمارتیں بنائی تھیں بعض عمارتیں یا ان کے آثار ابتک باقی ہیں۔ ان کی شکستگی کے باوجود یہہ واضح ہوتا ہے کہ محمد قلی کس قدر اعلیٰ ذوق، شان و شوکت، تدبر و فراست کا بادشاہ تھا۔

دکن کا مشہور مورخ فرشتہ جس نے اکبر کے بنائے ہوئے آگرہ، لاہور، فتح پور سیکری جیسے عظیم الشان شہروں کو دیکھا تھا حیدرآباد کے متعلق لکھتا ہے۔

"شہرے کہ در تمامی ہندوستان شرقاً غرباً شمالاً جنوباً
شہرے کہ مثل آں در لطافت و صفا ہرگز یافتہ نمی شود"

اس طرح فرانس کے دو سیاح موسیو ٹیورینز اور برنیر جن کی آنکھوں میں فرانس کا دارالسلطنت عروس البلاد پیرس سمایا ہوا تھا۔ جب حیدرآباد آئے تو اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

" شہر نہایت سلیقہ سے بنایا گیا ہے اور اسمیں بڑے بڑے راستے چار پانچ کارواں سرائیں موجود ہیں۔ دو منزلہ ہیں"۔

حدیقتہ العالم کا مصنف شہر حیدرآباد کے متعلق صراحت کرتا ہے۔

" ہر بازار میں چوراہا ہے جو مساوی الاضلاع ہے اس کے علاوہ کئی بازار ہیں۔ دوکانوں کی تعداد جو دو ہزار بیان کی جاتی ہے۔ ہر محلہ میں حمام، خانقاہ، مدرسے، مسجدیں، لنگر خانے، مہمان خانے موجود ہیں۔ شاہی محلات ایسے عمدہ ہیں کہ دنیا کے مسافروں نے کہیں اور نہ دیکھا ہوگا"

انسانوں کی زندگی کے لئے صحت بخش ہوا کے ساتھ پانی کی ضرورت ہوتی ہے"۔ محمد قلی نے عوام کو پانی افراط ملنے کے لئے نہ صرف چار مینار پر نل کے ذریعہ پانی لایا تھا بلکہ شہر کی آبادی کے لئے موسیٰ ندی پر بند بنا کر پانی فراہم کیا گیا تھا۔ چنانچہ تاریخ قطب شاہی کا مورخ لکھتا ہے" محمد قلی نے عوام کے لئے بازاروں میں پانی کی نہریں دوڑا دی تھیں یہہ یاد رہے کہ یہہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ شاہ جہاں آباد میں نہر چاندنی چوک کی تعمیر میں ابھی نصف صدی

زیادہ زمانہ باقی تھا۔

حدیقۃ العالم کے بیان کے مطابق حیدرآباد کے اکثر محلوں اور بازاروں میں دونوں طرف پانی کی نہر
تھیں اور ان کے تحت سایہ دار درخت لگائے جاتے تھے۔ ایک یورپین سیاح ولیم میتھولڈ لکھتا ہے۔

"شہر حیدرآباد اپنی خوش گوار آب وہوا اور پانی کی بہتات کی بدولت ہندوستان کا بہترین شہر۔
مابعد یعنی عالمگیر کا مورخ خافی خاں لکھتا ہے کہ:۔

"اس شہر کے حوض اور یہاں کی لطیف آب وہوا اور حسن نمکین اور دولت مندی خاص اہمیت
اسی طرح دوسرا مورخ محمد ساقی نے بھی حیدرآباد کی خوشگوار آب وہوا اور پانی کے چشموں، سرسبزی وش
تذکرہ کیا ہے۔

محمد قلی کو پانی اور سبزے سے جو دل بستگی اور دلچسپی تھی وہ اس سے واضح ہوسکتی ہے کہ کئی کئی
پانی پہونچایا جاتا اور محل کی دوسری تیسری منزل کے صحنوں پر چمن بندی کی گئی تھی اور یہ گل وگلزار سے م
سلطان محمد قلی نے صرف حیدرآباد بلکہ قلمرو قطب شاہی میں مسجدیں اور مدرسے تعمیر کئے تھے
تاریخ قطب شاہی کا مصنف لکھتا ہے۔

"مسجدیں، مدرسے، خانقاہ و دار الشفا و عاشور خانے اس بادشاہ نے بنائے تھے"
شہر کی آب وہوا پاکیزہ اور صحت بخش رہنے کا خیال سلطان محمد قلی کو ہمیشہ پیش نظر رہا۔
حیدرآباد میں کئی وسیع باغ بنائے تھے جن میں باغ محمد شاہی، ندی محل زیادہ مشہور تھے ان میں چ
علاوہ میوہ دار اور سایہ دار درخت موجود تھے۔ حوض میں فواروں سے پانی چھوٹا کرتا اس کے
باغ حیدرآباد میں موجود تھے۔ بادشاہ کے پسند کے مدنظر امرا بھی اپنے ایوانوں کے ایک حصہ کو خان
میں رکھا کرتے تھے اس کی وجہ سے آبادی کی کثرت کے باوجود ہوا پاکیزہ رہا کرتی تھی۔ یوروپین
کو باغوں کا شہر کہتے اور شہر کے اندر داخل ہوتے ہی باغوں کے موجود ہونے کی صراحت کی ہے۔

سلطان ابراہیم کے زمانہ میں تلنگانہ چور اور ڈاکوؤں کا مرکز تھا۔ سلطان نے پوری طرح
انسداد کر دیا تھا چنانچہ سلطان محمد قلی کے دور میں قلمرو قطب شاہی چور اور ڈاکوؤں سے پاک تھا اور
آسودگی سے اپنی زندگی بسر کرتی تھی۔

قطب شاہی سلطنت تلنگانہ یا آندھرا کی حکومت تھی اور یہاں مسلمانوں سے زیادہ ہندو آ

امرا میں بہت سارے ہندو مدبر شامل تھے۔ کئی ہندو امیر اعلیٰ اور بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ بادشاہ کو ان پر کامل اعتماد تھا حتیٰ کہ ان کی رائے اور ایما سے بڑے بڑے مسلمان امیر اور سپہ سالار بھی بدل دیئے جاتے تھے۔ محمد قلی کے عہد کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں کرتا تھا۔ اور ہمیشہ دونوں سے مساویانہ سلوک کرتا تھا۔"

سلطان محمد قلی کو تلنگانہ کے ہندوؤں سے جو دلچسپی اور خلوص تھا اسی کا اثر تھا کہ اس نے اپنا ایرانی اور ترکستانی لباس تبدیل کرکے تلنگانہ کا لباس اختیار کیا اور تلنگانہ رسم ورواج اور رسم شادی بیاہ حتیٰ کہ مذہبی رسومات میں ہندی طرز اختیار کر لیا تھا اس کے لباس اور صورت شکل سے وہ تلنگانہ کا باشندہ معلوم ہوتا تھا یہ اسلئے کیا تھا کہ ایک مخلوط تمدن بن جائے اور ایک ملی جلی تہذیب اور کلچر پیدا ہوسکے جس میں تلنگانہ کے تمام باشندے بلا تفریق مذہب حصہ لیں گے۔ اگر اس موقع پر ان امور کی تفصیل کیجائے تو مضمون طویل ہو جائے گا اسلئے صراحت نظر انداز کی جاتی ہے۔

آخر پر ایک اور امر بھی قابل صراحت ہے۔ محمد قلی کا خدا داد محل جو سات منزلہ ایوان تھا اس کی ہر منزل آرٹ اور مصوری کی ایک نمایش گاہ تھی۔ ایک منزل پر بہترین آرٹ کے نمونے جمع کئے گئے تھے۔ ایک منزل میں کتب خانہ تھا ایک منزل میں جلد سازی اور کاغذ کو منقش کرنے کا کام ہوتا تھا اور پھر اسی محل کے در و دیوار پر مصوری کے جو نقش کئے گئے تھے وہ قابل دید تھے کہیں بادشاہ کے دربار اور جلوس کی نقاشی تھی کہیں ایران کے بادشاہ خسرو کا دربار تھا کہیں شکار کا منظر تھا تو کہیں بزم رقص و سرود کی عکاسی کی گئی تھی۔ غرض شاہی محل ایک عجائب گھر یا میوزیم کی حیثیت رکھتا تھا۔ عصر حاضر میں زار روس کے محل کو عوام کے دیکھنے کے لئے عام کر دیا گیا ہے۔ آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے سلطان قلی بھی عید میلاد النبی صلعم کے موقع پر عوام کے دیکھنے کے لئے اپنے شاہی محل کے دروازے کھول دیا کرتا تھا اور عوام شاہی محل کے عجائب بلا کسی مزاحمت روک ٹوک کے دیکھا کرتے تھے۔ سلطان محمد قلی نے اپنی زندگی میں اپنے محلات کے میوزیم کو عوام کے استفادہ کے لئے ہر سال عام کرتا تھا۔ اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا

اس تفصیل سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ سلطان محمد قلی کے عوامی کارنامے کس طرح قابل قدر اور لائق ستایش ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آندھرا پردیش اس پر فخر کرسکتا ہے۔

قلی قطب شاہ کی شاعری

محمد اکبرالدین صدیقی

قلی قطب شاہ اپنے دور کا بہت بڑا شاعر ہے۔ اس نے دکنی اور فارسی کے علاوہ تلنگی میں بھی شاعری کی ہے جس کا پتہ ملتا ہے لیکن کلام ابھی تک نہ مل سکا۔ دکنی اور فارسی کلام جتنا طبع ہو چکا ہے لیکن اسی مطبوعہ کلام کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی بہت کچھ ملنا باقی ہے اس نے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ خود بادشاہ تھا اس لیے حمد و نعت اور منقبت میں خوب خوب زور قلم دکھایا ہے۔ اس کے تخیل کی جولانیوں تک اس کے عہد کا کوئی شاعر نہیں پہنچتا۔ وجہی اس کے شاعر رہ چکا ہے لیکن یہ اس کے عنفوان شباب کا زمانہ ہے اور قیاس کہتا ہے اس نے بھی قلی قطب شاہ کی شاعری نے میں سپر ڈال دی ہو۔ اس کے دور میں یا اس کے شہزادگی کے دور میں محمود اور فیروز موجود تھے اور ان کی شاعری کو تسلیم کرتا تھا۔ فارسی شعراء کے کلام پر اس کی نظر گہری تھی۔ دیوان حافظ کا وہ حافظ تھا کئی غزلیں قطب شاہ کی میں ایسی ملیں گی جو حافظ کی غزلوں کی زمین میں ہیں یا ان کا اس نے ترجمہ کر دیا ہے وہ ظہیر فاریابی اور انوری کے کلام کا بھی مطالعہ کر چکا تھا لیکن حافظ کا کلام اس کو اس لیے پسند تھا کہ وہ خوش بخور و خوش بدار ایام را کا درس دیتے ہیں۔ اگرچہ علامہ اقبال کے نزدیک یہ تعلیم جہد و عمل اور زندگی کے منافی ہے لیکن قطب شاہ اقبال سے قبل تھا اس لیے اس نے عشق و محبت کی سلطنت میں بھی حکمرانی کی۔ اور زندگی کو عیش کوشی کا مترادف بنا دیا۔ اس کے کلام میں حافظ کے علاوہ بعض اور شعراء کے نام ملتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی شعر میں وہ محمود، فیروز اور ظہیر اور انوری کا ذکر کرتا ہے۔

اگر محمود ہور فیروز بے ہوش ہوش عجب کیا ہے۔ ہوے تجھ ناکر سک ظہیر ہور انوری لبے ہوش

اور حافظ کے تعلق سے ان کا پورا احترام محفوظ رکھتے ہوئے کہتا ہے:۔

شعر تیرا در و گوہر ہے معانی سب میں　　　تجھ　　　شعر حافظ کے سر اوپر رہے تاج پہ

یہ بات ذہن نشین رہنے کہ قلی قطب شاہ قطب، معانی اور ترکمان تین تخلص اپنے کلام میں استعمال

اس کا امکان ہے یہ تخلص مختلف دور میں استعمال کئے ہوں۔ سب سے پہلے قطب اور ترکمان اور آخر میں معانی۔ داخلی شہادتوں سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

غزل میں داخلی اور خارجی پہلو کی اہمیت کا اظہار اس دور میں عام ہوگیا ہے۔ ابتدائی دور میں جو غزلیں لکھی جاتی رہی ہیں ان میں داخلی اور خارجی پہلو نمایاں ہوتے رہے لیکن لکھنے اور پڑھنے والے دونوں ان اصطلاحوں سے نابلد تھے اسی طرح غزل کی شان کو دوبالا کرنے میں جمالیاتی ذوق کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے آج جن شعرا کی عظمت کا سکہ عوام کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اس کا بڑا اثر جمالیاتی پہلو کی وجہ سے ہے۔ اس لئے کہ غزل کی تمام نزاکتیں اسی کے تحت آتی ہیں۔ غزل کی زمین، تشبیہہ و استعارہ، ترنم و تسلسل، الفاظ کا دروبست۔ یہ سب مل کر غزل کو ایک آن اور ایک پھبن عطا کرتے ہیں غزل کی مقبولیت کا راز اسی میں ہے ورنہ اس کی قریب قریب صورتیں گیتوں میں بھی ہیں بلکہ جذبات کا اظہار گیت میں کھلے بندوں ہوتا ہے اور یہ راست اثر کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود قبولیت کا سہرا غزل کے سر ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کا دور عیش و عشرت امن و سلامتی کا دور ہے۔ یہی بات کیا کم ہے کہ اس کی ۳۲ سالہ حکمرانی کے دور میں ایک لڑائی ہوئی اور نہ بادشاہ نے کسی کے قتل کا حکم دیا۔ خون کی ندی کہیں نہیں بہی خواہ یہ مزدوروں کا خون ہو یا ظالموں کا۔ اس لحاظ سے اس کو پہلا اشتراکی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کی نگاہیں دوررس تھیں اور وہ جزمیں کل کی تصویر دیکھنے کا عادی تھا۔ اس کی کشادہ قلبی اور وسیع النظری اور عمیق مطالعے نے اس کو ایک خاص انداز اور خاص اسلوب عطا کیا اسی لئے اس کے کلام میں ہر قسم کی تصویریں ملتی ہیں جو نظر کے راستے سے دل میں اتر کر جاگزیں ہوجاتی ہیں۔ ربع صدی پہلے اس کی ایک غزل پیا باج پیالہ پیا جائے نا۔ منظر عام پر آئی اور زبان زد خاص و عام ہوگئی اس غزل کے لوچ اور مٹھاس نے ادیبوں کو اس کے دیوان کے مطالعہ کی ترغیب دلائی اور کلیات منظر عام پر آگیا۔ اس طرح اس کی رنگین زندگی سہانے سپنوں کی طرح نگاہوں میں بس گئی وہ یہ جانتا تھا کہ عوام کے قلوب کو مذہبی عقائد سے قریب ہو کر مسخر کیا جا سکتا ہے اسی لئے اس نے اپنی نعت میں لکھا ہے اور کتنی خوبی سے یہ مضمون باندھا ہے کہ تو ابراہیم (قلی قطب شاہ) کا بیٹا ہے اور جس طرح اسمٰعیل کی خدا نے حفاظت کی اور ذبح ہونے سے بچایا خدا تجھے بھی بچائے گا۔ کہتا ہے۔

تون ابراہیم کا فرزند تجے رنج دوستاں سوں ل　　٭　　جوں اسمٰعیل کوں حق پیارسوں دائم نگہبان ہے

اس کے بعد کس لطافت کے ساتھ یہ مضمون پیش کرتا ہے کہ تیرے ساتھ اگر کسی نے دشمنی کا اظہار کیا تو گویا اس نے محمدؐ سے دشمنی کی اور محمدؐ سے دشمنی کرنے والے ہمیشہ ذلیل و خوار رہے ہیں۔ کہتا ہے :-

جو کوئی تج سات یک چت نین سو دشمن ہے محمدؐ کا　　٭　　جو دشمن ہے محمدؐ کا سدا خوار و پریشان ہے

قلی کے معنی غلام کے ہیں اس کا نام محمد قلی یعنی غلام محمد تھا اس نے غلام کے علاوہ اپنے نام کے ساتھ داس کا بھی استعمال کیا ہے اور ایک مقتدر اور با جبروت بادشاہ رہ کر بھی اس نے اپنا سر نیاز بارگاہ رب العزت و رسالت جھکایا ہے۔ اس نے حیدرآباد بسایا اور بہت سے بادشاہوں نے بھی شہر آباد کئے لیکن قلی نے شہر بسانے سے پہلے اس کی بارگاہ میں دعا کی۔

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر　　٭　　رکھیا جوں توں دریا میں مِن یا سمیع

اے مجیب الدعوات، دریا کو تو نے جس طرح مچھلیوں سے آباد رکھا ہے میرا شہر بھی لوگوں سے آباد رکھ مرا شہر کے الفاظ میں اس کی کتنی تمنائیں اور محبت کے کتنے گلزار کھلے ہیں آج اگر ہم غور کریں تو کیا کوئی انکار کر سکتا ہے کہ اس کی دعا قبول نہ ہوئی۔ ۴۰ لاکھ کی آبادی چار گنا بڑھ گئی اور چار سو سال بعد بھی سلطنت آندھرا نے دوبارہ اور محمد قلی کے سہانے سپنے کی تعبیر ہم نے دیکھ لی — تشبیہیں۔ استعارے شاعری کی جان ہیں اس سے شاعر کی فکر کا اندازہ ہوتا ہے اس نے تشبیہوں اور استعاروں میں مقامی رنگ بہت زیادہ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ وہ شاعر ہے لیکن فارسی ادب سے کچھ حاصل کرنا اس نے کسر شان سمجھا۔ دکنی تصورات اور خیالات کو اپنے کلام میں نعت میں ایک شعر کہتا ہے:۔

باتاں گہرسیاں نرملیاں وار یا جو تیرے ناؤں پر　　٭　　سو جائے کر اسماں پر ہر اک بچن تارا ہویا

آپ آسمان میں تارے دیکھتے ہیں۔ درخشندہ اور تابندہ یہ کیا ہیں۔ میں نے موتی جیسی صاف، شفاف آپکے نام پر نثار کر دیں تو یا نبی آپ کے صدقے میں اترے ہوئے یہ موتی آسمان پر جاکر تاروں کی صورت اختیار کر گئے۔

اسی طرح کا مضمون ایک اور مقام پر کہتا ہے:۔

چندر، غواص ہو آیا، گگن سمدر بھیتر دھایا۔ نبی پرواز نے لیایا، نثار موتیاں سو تارے ہیں

آسمان سے سمندر میں اتر کر غواصی کی بڑی محنتوں اور تکالیف کے بعد اس نے چند موتی منتخب کئے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نثار کرے لیکن جب یہ موتی اس نے نثار کر دیئے تو آسمان پر جاکر یہ تارے بن گئے۔ ایسی تشبیہیں بعد کے شعراء میں کم آتیں۔ پانی میں چاند کا عکس تو بہتوں نے دیکھا اور دکھایا ہے لیکن چاند سے یہ سعادت حاصل کرنے کا موقع کسی نے نہیں کیا۔

معشوق کے سراپا میں تو اس نے نئی نئی تشبیہیں تلاش کی ہیں۔ اس سلسلے میں جس جودت و ذکاوت اور جدت کا ثبوت دیا ہے اس کی بطلی الحس بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شعر ہے کجل نیناں سہیلیاں کے سو پر مل

باداماں ہو ٹھنڈی ہے سیب دسناں جوں کے چاروںاں ہیں چاریاں کی معشوق اور اس کی سہیلیوں کی آنکھوں، ٹھوڑی اور دانتوں کی تشبیہ ہے کہ ان کی کجلائی ہوئی آنکھیں حسین نازک گہرے نیلے رنگ کے بادام ہیں۔ ان کی ٹھوڑیاں سیب کی طرح ہیں اور دانت چارہ کی چرونجی کے جیسے۔ چارہ دکن کے سوا ہندوستان میں شاید ہی کہیں ہوتا ہو دانتوں کو در عدن تو بہتوں نے کہا لیکن اس چار سو سال کے عرصہ میں کسی نے چارہ کی چرونجی سے تشبیہ نہ دی۔ اس لیے کہ دوسرے شعراء نے فارسی شعراء کا کلام پیش نظر رکھا اور محمد قلی کے لئے دکن دیس کا ایک ایک پتہ معرفت کردگار کا درس دیے رہا تھا۔ اس مشاہدہ اور اس کی نظر تک کسی کی رسائی نہیں تھی۔ اس نے اپنے دیس کو اپنے رسم و رواج کو اپنے دیس میں پیدا ہونے والی چیزوں کو صرف بھاگ متی ہی کو نہیں بلکہ ہر اس چیز کو جس میں اس نے دلکشی پائی ان سے محبت ہی نہیں کی بلکہ اس کو عشق کے درجے تک پہنچایا۔ اس کے کلام میں جو مثالیں ملتی ہیں اتنی اور ایسی مثالیں اس کے ڈیڑھ دو سو سال بعد نظیر اکبرآبادی کے پاس نظر آئیں گی۔

حرم شاہی میں گل رخوں کی کیفیت ملاحظہ ہو کہ ہاتھوں میں مہندی کی بوندیں ہیں اور رخسار کونپل کے پتے کی طرح سرخی لئے ہوئے، بات کرتی ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں اس رشک میں سمندر کھاری ہو گئے ہیں شعر سنیئے

بند مہندی کے ہاتاں منے، گل لال جوں پاتاں منے　⁂　موتی جھڑیں باتاں منے جن سے سمد کھارے اہیں

ایک جگہ معشوق کی زلفوں اور ابرو کی تعریف کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ میرا قلم سیدھا ہے۔ وہ تیری پیچ در پیچ ژولیدہ و پریشاں زلفوں کی تعریف کیسے لکھ سکے گا اور تیرے ابرو کے چاند سے ہلال کا تو کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا وہ اس سے بہت کم درجہ رکھتا ہے۔ شعر ہے:۔

کیوں لکھے بنگی تری لٹ کا صفت سیدھا قلم　⁂　ہے نوا چاند، بہوت تیرے بھوان چاند سے کم

ایک مضمون ہے کہ جہاں محبوب ساتھ ہو وہ جنت ہے اور جب وہ ساتھ نہ ہو تو دوزخ۔ کہتا ہے کہ جنت۔ دوزخ اور اعراف میرے لئے کچھ نہیں جہاں تو ہے وہی میرے لئے جنت ہے اور جہاں تو نہ ہو دوزخ۔ شعر ہے:۔

جنت ہور دوزخ ہور اعراف کچ نیں ہے میرے لیکھے　⁂　جدھر توں واں مرا جنت جدھر نیں واں سقر مجکو

ابوالاثر حفیظ جالندھری کا ایک شعر ہے۔

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے　⁂　تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

چار سو سال پہلے قلی نے اس کے قریب المعنیٰ یہ شعر کہا ہے۔

جو منج بسرتے ہیں تمیں، تمنا بسر رہتے ہیں۔　　ہے۔　　ہمنا تمن بن ناگیں جاتا بہت دشوار سوں

یعنی آپ ہمیں بھول جاتے ہیں تو ہمیں بھی چاہیئے تھا کہ آپ کو بھول جاتے مگر ہمیں آپ کے بغیر زندگی گزارنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔

غالب کے پاس رشک کے مضامین کی کمی نہیں لیکن یہ مضمون غالب کو بھی نہ سوجھا کہتا ہے۔

پیا مورت رکھی ہوں یوں نین میں　　ہے　　کہ اپ پتلیاں کو رشکو رہیں دکھائی

میں نے محبوب کی تصویر کو اپنی آنکھوں میں اس طرح رکھ لیا ہے کہ اپنی پتلیوں کو بھی خبر ہونے نہیں دی مبادا کہ پتلیاں محبوب کی مورت کو دیکھ پائیں اور میری رقیب بن جائیں۔ اچھوتے اور تازہ مضمون کے اور دو تین شعر سنیئے۔

تیرے نین کا کاجلا دیکھ دھن　　اپے کا جلا ہونے جلتا شمع

اے نازنین! شمع نے تیری آنکھوں میں کاجل کی تحریر پائی اور یہ سمجھ رہی ہے کہ اگر خود جل کر کاجل بن جائے تو آنکھوں تک بار پانے کا موقع مل جائے گا۔

دوسرا شعر ہے۔

خدا کالے ناؤں پیرت پھل کھلائیں　　ہے　　تو تازے اُپر تازے بھی بار لیائیں

قاعدہ ہے کہ پھول ایک بار آجانے اور پھل بن جانے کے بعد اگر انھیں توڑ دیا جائے تو اسی موسم میں دوبارہ پھل پھول نہیں آسکتے لیکن شاعر کہتا ہے کہ اگر خدا کا نام لے کر ہم محبت کے پھول کھلانے لگیں تو بار آجانے کے باوجود پھر دوبارہ بار آجائے گا۔ کیونکہ محبت کی تر و تازگی میں کمی نہیں ہوسکتی۔

قلی قطب شاہ نے اپنے کلام میں انتہائی مترنم اور رواں بحریں استعمال کی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں پیا باج پیالہ پیا جائے نا مشہور غزل ہے ایک اور مطلع ملاحظہ ہو۔

سکی باتاں شکر کرتی ولے میٹھائی آسے نا　　ہے　　دوانی نیشکر میں کوئی کدھیں نا بات پاسے نا

اس نے عربی اور فارسی کے الفاظ بطور ردیف استعمال کئے ہیں اور یہ الفاظ بطور ردیف اس چابکدستی سے اردو میں کھپائے ہیں ایک مطلع سنئے۔

بک دو پیالی پیار سوں منج بات تجھے اے یار خذ　　ہے　　اپنے ادھرامرت میں منج لب تقل کے ٹھار خذ

اس طرح اس نے آخذ، اخاذ، انفاذ، الذ، نبیذ اور معاذ ردیف ذ میں استعمال کئے ہیں۔

ایک اور خصوصیت ہمیں اس کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ قدیم شعرائے اردو نے ایک مصرع فارسی ا

مصرع اردو لکھا ہے یا تین ٹکڑے اردو اور ایک فارسی لکھا ہے ۔ محمد قلی نے اس کے برعکس صرف ایک لفظ ہے اور یہ عموماً بطور ردیف استعمال کیا ہے ۔ اکبرالہ آبادی جس طرح انگریزی کے الفاظ قافیہ کی شکل میں بلا تکلف ال کرجاتے ہیں ۔ محمد قلی نے فارسی الفاظ استعمال کئے ہیں مثلاً دو تین شعر ملاحظہ ہوں ۔

جکوئی قدم رکھے کج باٹ میں سو اُن افتاد ٭ جتنے رکھے قدم اب کام بھی نکو فریاد

پوچھو خورشید سوں کس تھے تجے یہ نور رسید ٭ ہے بڑائی جو ہمن شاہ پو تم نور پڑے

رقیباں اپنے تار دپو دمیانے لجے غم سیتی کو خدایا ان کے بستر کونکو ہرگز کدھیں گسترد

لے دیوان میں ایسے بھی اشعار ملتے ہیں جو یہ اس بات کی شہادت ہیں کہ وہ دکنی فارسی اور عربی زبان پر قدرت رکھتا ہے اور بلا ۔ ان سب کو ایک ساتھ استعمال کرکے دکنی کا دامن نئے الفاظ سے بھر دیتا ہے ۔

قطب شاہ کے بارہ سو صفحات کے کلیات میں معنی آفرینی بھی ہے اور جدت خیال بھی ، ریختی بھی ہے اور بھی ، شیرینی بھی ہے اور تیکھا پن بھی ، سطوت شاہانہ بھی ہے اور جمال بھی ۔ مقامی رنگ بھی ہے اور رنگ بھی ، غرض کہ کلیات معانی گنجینۂ سخن ہے اور چار سو سال پہلے کی زندگی کا ایک جیتا جاگتا مرقع س کے معاشرہ کی ایک زندہ تاریخ ۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ٭ چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

پروفیسر عبدالمجید صدیقی

محمد قلی کی تعمیر

محمد قلی قطب شاہ نے آندھرا دیش میں تینیس سال راج کیا۔ دکن کا بہت بڑا سورما اور معمار تہذیب ہے۔ یہ ایسے د
تخت نشین ہوا تھا جبکہ دنیائے اسلام میں نئے زمانے نئے تصورات اور نئے جذبات کی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ شمالی ہند میں شہنشاہ اکبر
میں ابراہیم عادل شاہ ثانی اور محمد قلی قطب شاہ دور جدید کے قاصد تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے آندھرا پردیش میں پاکیزہ تمدن
اور اس ملک کو جدید تہذیب کے نور سے ایسا سنوارا کہ ملک جگمگانے لگا۔ محمد قلی کی تمام زندگی تعمیر تمدن میں گزری۔ اس
حکومت کو آندھرا پردیش کا زریں دور کہنا چاہیئے۔ جس میں سماج کی زندگی پاکیزہ بنائی گئی۔ معیار زندگی اونچا ہوا۔ تر
تربیت کے سامان مہیا کئے گئے۔ حسین عمارتیں تعمیر ہوئیں اور سیدھی اور صاف سڑکوں سے شہر حیدرآباد آراستہ ہو
علاوہ ذہنی اور اخلاقی تربیت سے اہل شہر کا معیار تہذیب بہت بلند کیا گیا۔

محمد قلی قطب شاہ ۱۴ رمضان ۹۷۳ھ ۱۵۶۵ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش سے تمام ملک میں مسرت کا اظہار کیا گ
وقت ابراہیم قطب شاہ اس شاہزادہ کی پیدائش سے اس قدر خوش ہوا کہ اس تقریب میں کئی جشن کئے۔ غربا کو خیرات د
امراء اور علماء و مشائخین کو خلعتوں اور انعامات سے سرفراز کیا گیا۔ کئی شاعروں نے اس پیدائش کی مسرت میں نظمیں لکھی تھیں
دربار سے بیش بہا انعامات ملے۔ ان نظموں میں یہ قطعہ بہت مشہور ہے۔

شاہ را داد خدا فرزندے ❀ کہ شد از دیدن او دل خرم
پے شکرانہ شہ دیار دل ❀ کرد با خلق بہ صد لطف و کرم
سال مولودش را یافت فلک ❀ باعث روزی اہل عالم
۹۷۳ھ

ملا وجہی جو دکھنی زبان کا شاعر تھا قطب مشتری کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی اس میں محمد قلی کی پیدائش کو ان ا

اجالا پڑیا آج یوں نور کا ❀ کہ حاجت نہیں چاند ہور سور کا
وو جگ آج نور علی نور ہے ❀ زمیں چاند ہور آسماں سور ہے
لیناداں بالک نہنالا ڈکا ❀ نو پھول سے شاہ کے جاڑ کا

محمد قلی قطب شاہ اپنے باپ ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے بعد ۹۸۱ھ ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے دو سر

اس کا قطب شاہی تخت پر بیٹھنا تاریخ قطب شاہی کا ایک عجوبہ ہے اور تاریخ نے اس کو ایک رازِ سربستہ بنا کر چھوڑ دیا ہے اور
نہیں معلوم ہوتے۔ اس میں بعض طبقوں اور اہل غرض کی سازش معلوم ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس کے بڑے بھائی شاہ
حسین قلی تخت نشین ہو جاتے تو آج گولکنڈے کی تاریخ کا رنگ کیا ہوتا لیکن محمد قلی کی تخت نشینی سے آندھرا پردیش کو جو فائدے
پہنچے انتہا ہیں پورا دیش اس کے معاشی اور تمدنی کارناموں سے بھرا ہوا ہے۔ اس نے اس دیس کی ایسی خدمت کی
یہ اور متمدن مملکت بن گئی اور اس کی شائستگی کے دور دور چرچے ہونے لگے۔

محمد قلی قطب شاہ بہت کمسنی میں تخت نشین ہوا تھا اور اس وقت اس کی عمر پندرہ سال سے کم تھی لیکن اس نے ملک کی
رہبری کی کہ گویا وہ ایک عمر رسیدہ پختہ کار سیاس ہے۔ وہ سلطنت کے بست و کشاد سے کبھی غافل نہیں رہا۔ اور بیدار مغز
اس کی نظر سلطنت کے چاروں گوشوں پر پڑتی تھی۔ ایک طرف وہ مغل حملہ آوروں کی روک تھام اور آزادی دکن کی حفاظت
دوسری طرف اندرون ملک قیام امن اور ارتقائے تمدن کی تدبیریں سوچتا تھا۔ جہاں تک ملک کے خارجی مسلک کا معاملہ تھا
دور دراز حدود سلطنت کو ایسا مستحکم بنا دیا کہ وہ بیرونی خطروں سے محفوظ ہو گئے۔ دوسری طرف اندرون سلطنت
ہوئے اور بغاوتیں کھڑی ہوئیں ان کی پوری سرکوبی کر دی اس کے عہد میں قطب شاہی سلطنت قدرتی حدود تک پہنچ
چکی جنوب اور جنوب مشرق میں اس سلطنت کے حدود دریائے تنگبھدرا کے نیچے پنگنڈہ اور کنڈی کوٹہ تک پہنچ گئے تھے
شرق میں دریائے گوداوری کے اوپر سکاکول سے جا ملتے تھے۔ بیرونی حملوں کی مدافعت کے لئے ان سرحدوں پر جرار
میں۔ دریائے گوداوری پر راجمندری اور اس کے شمال میں سکاکول بڑے فوجی مستقر تھے اور اس کے علاوہ گنٹور،
کی چھاؤنی تھی اور حسب ضرورت ان چھاؤنیوں سے فوجی نقل و حرکت عمل میں آتی تھی اس طریقہ سے اس عہد میں
سا قدر وسیع ہو گئی جس کے شمال میں دستر سے لیکر جنوب میں کنڈی کوٹہ تک پھیلی ہوئی تھی اور ایک شہنشاہت معلوم ہوتی
بڑی راجدھانیاں تھیں جو قطب شاہی سلطنت کی باجگذار تھیں۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ نے اپنے ایک شعر میں اپنے کو
شہنشاہ کہا ہے۔

سدا بارہ اماماں مرے نگہدار ہیں ؎ سدا اوں کی غلامی تھے قطب راج ادھیراج

محمد قلی قطب شاہ کی سیاسی رہبری اور توسیع مملکت تھی لیکن اس کا گراں قدر کارنامہ تمدن کی تعمیر ہے۔ محمد قلی بہت بڑا
ہے۔ اسی تعمیر تمدن کی بدولت اس کو تاریخ دکن میں حیات جاوید حاصل ہے اور اہل دکن تو کجا تمام اہل ہند اس کو نہیں بھول سکتے
طرف اس وقت ہو سکتی ہے۔ جبکہ ملک میں امن قائم ہو جائے اور حکومت کے کل پرزے پورے سکوت کے ساتھ
گولکنڈہ کی سلطنت ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں مستحکم ہو چکی تھی اور ہر طرف امن و اماں تھا۔ گولکنڈے کے باشندے
ہوتے تھے۔ زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کو پورا فروغ تھا۔ قیام امن کا جو کام باقی رہ گیا تھا۔ اس کو
شاہ نے اپنے حسن تدبیر سے پورا کر دیا۔ اس کے بعد اہل ملک کی زندگی سنوارنا اور ذہنی اور اخلاقی تربیت کا انتظام

کرنا تھا۔ محمد قلی کو ابتدائے عہد سے اس بات کا شوق تھا کہ سلطنت کو تمدن کے زیور سے سنوارے وہ اس منصوبہ سے تخت شاہی پر بیٹھا تھا اس کے مزاج میں تمدنی لطافت تھی۔ وہ بے ڈول زندگی اور دقیانوسی طور طریق سے خوش ہونے والا نہ تھا بلکہ جدید زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق اپنی سلطنت کو آراستہ کرنا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے اس کے ذہن میں ایک مہذب اور خوشنما شہر کی تعمیر کا خیال آیا کیونکہ گولکنڈہ کا پرانا شہر اور پایۂ تخت ترقی پذیر سلطنت کے شایان شان نہ تھا بلکہ اس سلطنت کے دنیا کے مختلف ممالک سے مراسم پیدا ہوگئے تھے۔ باہر سے نہ صرف امراء بلکہ تاجر اور اہل علم بھی یہاں آنے لگے تھے۔ اس لئے محمد قلی قطب شاہ نے ایک نئے شہر کا نقشہ بنایا —— تعمیر شہر کے منصوبے میں جلیل القدر حضرت میر مومن صاحب ہی اس کے شریک تھے۔ جدید شہر کے نقشے میں بلند خیالی اور پاکیزہ ذوق شامل تھا۔ قرون وسطیٰ میں کسی جگہ اس کی مثال نہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ محمد قلی ٹاؤن پلاننگ کے تمام گر جانتا تھا اور جو اس نے نقشہ بنایا تھا۔ دسویں اور گیارھویں صدی ہجری کے لئے ایک عجوبہ معلوم ہوتا ہوگا۔

شہر حیدرآباد کی بنیاد ۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء میں رکھی گئی تھی اور دو تین سال میں یہ شہر تیار ہوا۔ موسیٰ ندی کی وادی میں اس شہر کی تعمیر ہوئی۔ شہر کے بیچ میں چار مینار کی تعمیر کر کے اس کے چاروں طرف چار سیدھی سڑکیں بنائی گئیں۔ چار مینار کی تاریخ "یا حافظ" کے الفاظ سے برآمد ہوتی ہے۔ خود چار مینار کی عمارت تعمیر کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس قدر بڑی عمارت کو فن کاری کے انداز میں اس قدر سڈول بنانا بہت مشکل ہے لیکن محمد قلی قطب شاہ کے ذوق فنکاری نے اس مشکل کو ایسا حل کر دیا کہ حیرت ہوتی ہے۔ "تمام عمارت میں غایت درجہ کا تناسب ہے اور جب شاہی تقریبوں میں روشن کر دی جاتی ہے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ فرانسیسی سیاح تھیونو نے کہا تھا کہ یہ دنیا کی اہم باشان عمارت ہے" سڑکوں کے چاروں طرف مساوی الاضلاع عمارتیں بنائی گئیں، بازار لگائے گئے اور باغ لگائے گئے۔ بازاروں کی تنظیم میں بھی بیحد سلیقہ تھا۔ باغ محمد شاہی نہر کے مشرقی طرف ندی کے برابر چلا گیا تھا۔ اس میں بڑے اور چھوٹے درخت اور پھولوں کے پودے اس خوش اسلوبی سے لگائے گئے تھے کہ دیکھنے والے سراہتے تھے بلکہ اس شہر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ظاہری حسن و جمال کے ساتھ اس میں عمرانی ضرورتیں بھی بہم پہنچائی گئیں۔ تمام شہر میں پانی کی زیر زمین نہریں دوڑتی تھیں اور ہر شہری کو بلا مکان صبح و شام پانی آسانی سے میسر آتا تھا۔ آبرسانی کا انتظام اسقدر باضابطہ تھا کہ اس سے شہریوں کو نہ صرف سہولت ہی ملی بلکہ کارکردگی پیدا ہوگئی تھی۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ چار مینار اور شہر کے دونوں عمارتوں اور محلات اوپر بھی پانی چڑھایا جاتا تھا۔ شہر کے جنوب میں جل پلی کے تالاب سے پانی کی نہریں شہر میں آتی تھیں اور بلند عمارتوں میں بھی چڑھ جاتا تھا۔ شہر میں داد محل اور خداداد محل کئی منزل بلند تعمیر ہوئے ہے اور ان کی ہر منزل پر پانی پہنچتا تھا۔ شہر میں حمام، مہمان خانے مسجدیں، سرائیں بھی متعدد تھیں جن سے نہ صرف شہری بلکہ بیرونی مسافر فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس کے علاوہ شہر کے مشرق میں دار الشفا نام سے ایک ہسپتال تعمیر ہوا تھا جس میں علاج معالجہ کی تمام عصری ضرورتیں مہیا تھیں۔ اس میں سرکاری خرچ سے بیمار رکھے جاتے تھے اور ان کا باضابطہ علاج ہوتا تھا۔ اس میں لائق طبیب اور جراح مامور تھے جو ہر وقت مریضوں کی خبر گیری کرتے تھے قرون وسطیٰ کی سہولتوں میں شاذ و نادر ہی ایسے طبی انتظام ملتے ہیں۔ محمد قلی کو اپنی رعایا کی جسمانی ضرورتوں کا جو خیال تھا

سلاطین کو بہاں تھا۔ اس سے اس بادشاہ کی انسانی ہمدردی اور شائستگی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں طلبا کی تعلیم
طام بھی تھا۔ چار مینار کے اوپر مسجد کے علاوہ ایک مدرسہ بھی تھا جہاں طلبا کی تعلیم ہوتی تھی اور اس میں لائق اساتذہ مقرر تھے
ہریوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی ہو سکے جو ایک شائستہ قوم اور ملک کے لئے ضروری ہے۔ عمرانی ضروریات کی فراہمی سے
التمیر نہیں ہوتی ہے بلکہ ذہنی و اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے۔ اس انتظام کا نتیجہ یہ تھا کہ حیدرآباد سترھویں صدی کا ایک
ن شہر ہو گیا تھا اور دنیا میں شاید ہی اس کی نظیر ہو۔ مورخ فرشتہ اس کو ہندوستان کا بینظیر شہر کہتا ہے ولیم میتھولڈ لکھتا ہے
ہندوستان کا بہترین شہر ہے۔ مغل مورخ خافی خاں کہتا ہے کہ یہ ایسا شہر ہے کہ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ شہنشاہ
ب زیب کا درباری مورخ کہتا ہے کہ اس شہر کی تعریف ناممکن ہے۔

یہ تو اس کی سیاسی رہبری اور تمدنی تعمیر تھی۔ لیکن علمی میدان کا بھی وہ ایسا شاہسوار تھا جیسے میدان سیاست میں وہ جولانیاں
ناتھا۔ محمد قلی قطب شاہ ایک بہت بڑا ادیب شاعر تھا۔ جہاں اس نے ملک میں اہل ملک کی ذہنی تربیت کے لئے مدرسے
ے تھے اور علما کو جمع کیا تھا وہاں اس نے ادب و زبان میں اپنے قلم سے بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ فارسی اور دکھنی زبان دونوں
اس کا کلام ملتا ہے۔ فارسی میں اسکا اس قدر پختہ کلام ہے کہ ایرانی شاعر معلوم ہوتا ہے۔ فارسی میں قطب شاہ تخلص کرتا تھا۔ دکھنی
ری کا کیا کہنا۔ اس نے اپنی شاعری سے دکھنی کو ارتقائی منزل پر پہنچا دیا۔ اس کے قلم کے زور سے دکھنی ایک شائستہ زبان ہو گئی
نی میں وہ معانی تخلص کرتا تھا۔ اس کے دکھنی کلام کا ایک وسیع مجموعہ موجود ہے جس کو کلیات محمد قلی قطب شاہ کہتے ہیں۔ اس
ت میں قصیدے، غزلیں، مرثیہ اور قطعات سے کئی اصناف سخن پائے جاتے ہیں اس کے کلام میں اس قدر ادبی روانی
گھلاوٹ بھری ہوئی ہے کہ اور جگہ مشکل سے ملے گا اردو کی ادبی تاریخ اس کلام پہ جس قدر فخر کرے بجا ہے۔ اس کلام کا ایک
ا وصف یہ ہے کہ اس میں متنوع خیالات پائے جاتے ہیں۔ مذہب و معاشرت اور تاریخ کے تمام پہلو اس میں موجود ہیں۔
ھرا پردیش کی تمام زندگی اس میں جھلکتی ہے۔ محمد قلی نے آندھرا پردیش کی سماجی اور قومی زندگی کا اس قدر گہرا مطالعہ کیا تھا
ن کی مثال نہیں۔ اس کے کلیات میں آندھرا پردیش کے رسم و رواج، کھیل کود، عید تہوار سبھی چیزیں پیش کی گئی ہیں۔
اصل یہ کلیات ایک ادبی خزانہ اور آندھرا پردیش کا ایک زندہ مرقع ہے۔

(باقی آئندہ)
مریم یٰسین علی خاں
[illegible]

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ

گورستانِ شاہی

آہ! جولاں گاہِ عالمگیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنے اٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کی ہنگاموں کا گورستان ہے

اپنے سکّانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا!
دیدۂ عبرت! خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا
ہے تو گورستان، مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر
جنبشِ مژگاں سے ہے، چشمِ تماشا کو حذر
کہہ رہی ہے کوئی ایامِ کہن کی داستاں
چاندنی کرتی ہے، میناروں سے کیا سرگوشیاں

کیفیت ایسی ہے، ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں، آئینۂ تحریر میں

جگنا تھ آزاد

یاد سحر

گولکنڈہ کے مقبروں میں

نگاہیں پھر رہی ہیں گولکنڈے کے مناظر میں
نہ جانے کتنے ہنگامے ہیں خوابیدہ مقابر میں
تمنا دل میں پیہم اُٹھ رہی ہے شعر کہنے کی۔
ادب میں مقبروں کا ذکر کر کے زندہ رہنے کی۔
خموشی مقبروں کی دل کا عالم کہہ نہیں سکتا ہے
فغاں! اے راہبر! یہ کیفیت دل سہہ نہیں سکتا ہے
کہیں غنچہ ریاضِ فکر میں کھلتا نہیں کوئی ہے
تفکر کے تسلسل کا سرا ملتا نہیں کوئی

یہ ہے وہ کیفیت جس کو بیاں کرنا نہیں ممکن
حقیقت کو سخن میں داستاں کرنا نہیں ممکن

عجب طوفاں کی زد پر فکر شاعر کا سفینہ ہے
ذرا اے عزم! رک جانا، یہ نازک آبگینہ ہے
یہ جوئے شیر کے لانے سے کم مشکل نہیں اے دل
یہ شعلوں سے گزر جانے سے کم مشکل نہیں اے دل
یہ مضموں کیا ہے اے دل، دھار ہے شمشیر براں کی
یہ مضموں کیا ہے گویا نوک ہے، خنجر کی، پیکاں کی
یہ مضموں بوئے گل سے بھی ہے کچھ آگے لطافت میں
نسیم صبح سے بھی کچھ زیادہ ہے، نزاکت میں
نہ سوچ اس ڈھنگ سے اے دل کہ یہ شاہوں کی باتیں ہیں
یہ ہے فریاد کی روداد یہ آہوں کی باتیں ہیں ہے

کہاں ممکن کہ میں چپ چاپ ہی ان سے گزر جاؤں
کہاں ممکن کہ میں ان کو لباس نطق پہناؤں

ٹھہر اے ہمنشیں! یہ دل سے کیا آواز آتی ہے
جو میری اضطرابی کیفیت پہ چھائی جاتی ہے
یہ کس آواز نے یوں مطمئن سا کر دیا دل کو ہے
یہ کس آواز نے پیہم سکوں سے بھر دیا دل کو
یہ کیا آواز ہے بھٹکی کو جو ساحل پہ لے آئی
بھٹکتے قافلے کو خود بخود منزل پہ لے آئی
یہ کس نے نظم کہنے کی تمنا چھین لی دل سے
یہ کس آواز نے بےساختہ تحسین لی دل سے

یہ کس نے کر دیا، یہ کہہ کے دل کے بوجھ کو ہلکا
کہ حصہ ہے یہ "گورستان شاہی" کے مصنف کا

بانو طاہرہ سعید

محمد قلی قطب شاہ کی زبانی

عجب رنگین ہے میرا فسانہ ابھی تک یاد کرتا ہے زمانہ
کئی صدیاں ہوئیں لیکن ہے باقی مرا قصہ، مرے دل کا ترانہ
دکن کے منچلے گاتے ہیں ابتک مرے اشعار با چنگ و چغانہ
جہاں میں جو بھی ہے فانی ہی فانی ہے لافانی حیات عاشقانہ
مرے دلدار تھے ہندو مسلماں مجھے آتا تھا سب کا ناز اٹھانا
محبت میں نے سیکھی اور سکھائی کسے کہتے ہیں نفرت یہ نہ جانا
محبت میں نہ ذاتیں ہیں نہ قومیں محبت کا مذہب ہے صوفیانہ
مری دنیا تھی رنگ و نور و نغمہ مری محفل تھی خواب شاعرانہ
عوامی زندگی کا جزو تھا میں رعایا سے تھا میرا دوستانہ
دلوں کا موہ لینا مجھ سے سیکھو! نہیں آسان دلوں میں گھر بنانا
وطن والو! تمہارے ساتھ ہوں میں ہے ابتک تم سے ربط غائبانہ
رفیقو! غم گسارو! میرے پیارو! تمہیں راس آئے یہ برسی منانا
تمہارا شہر ہے، شہر محبت محبت کا سدا جادو جگانا

رہوں گا منتظر میں سال بھر تک
مجھے مت بھولنا، تربت پہ آنا

(یوم محمد قلی قطب شاہ منعقدہ ۱۱ جنوری میں پڑھی گئی)

نیر النساء بیگم بشیر

یادِ صنادید

دکن کی سرزمیں پر جب قطب شاہی حکومت تھی
ہماری یہ ریاست صفحۂ گیتی پہ جنت تھی

امورِ سلطنت میں کارفرما نیک نیت تھی
رعایا کے دلوں پر حکمراں شخصی حکومت تھی

نہ ہندو تھا، نہ مسلم تھا وفاداروں کی بستی تھی
دلوں میں تھی رواداری رگوں میں شہ پرستی تھی

وہ شاہِ گولکنڈہ یعنے پہلا حیدرآبادی
کیا تازہ یہاں جس نے فنِ مانی و بہزادی

چمک اٹھی تھی قسمت شاعروں کی باکمالوں کی
زمیں پربس گئی تھی ایک بستی خوش مقالوں کی

سنہری دور تھا، رنگیں فضا تھی عام خوش حالی
اسی ماحول نے دکنی تمدن کی بنا ڈالی ؏

رہا ہر دور میں ضرب المثل جاہ و جلال ان کا
مسلّم ساری دنیا میں ہے تعمیری کمال ان کا

(مشاعرہ یوم محمد قلی قطب شاہ، منعقدہ ۱۲ر جنوری ۱۹۶۴ء میں پڑھی گئی)

حسن طبسی یزدی نیّر

نذرِ محمد قلی قطب شاہ

میزنم اندر چمن چہچہ بسانِ بلبلی ؛ خوش بحالت ای غلام حضرتِ مولا علی

پیکرت در زیرِ خاک و روح پاکت در بہشت ؛ سورۂ قرآں بخوانم بر مزارت ای قلی

شاہ بودی و رعیت پرور و با عدل و داد ؛ کشورت پیکر رعیت سر تو بر سر کاکلی

مسلم و ہندو روا باشد بہ روی خاک تو ؛ جان بیفشانند مثال بلبلان بر نو گلی

ہمچو تو ہر کس طرفدار غریباں گر کند ؛ سر فدا باید بپایش کرد ہمچون سملی،

در دکن دیگر نیاید پادشہ مانند تو ؛ دفتر تاریخ می گوید باآوازِ جلی

عالم رؤیا خبر از جنت الماوی رسید ؛ کز خم وحدت بنوشیدی می از دستِ ولی

نیّرا از ایران و اجدادِ تو ایرانی بودند

مرحبا آں باغ و بستانی کز ایشاں سنبلی،

یوم محمد قلی قطب شاہ منعقدہ ۱۱ جنوری ۱۹۶۴ء میں پڑھی گئی

ت عبدالقیوم خاں

سرزمینِ وطن

...یا گیتوں کی، رنگین بہاروں کی زمیں
...ـگاتے ہوئے آکاش کے تاروں کی زمیں
باغِ فردوس کے شاداب نظاروں کی زمیں
جس کی محفل میں ہیں گوتم کی صدائیں اب بھی
جابجا عظمتِ فن کے وہ ہزاروں شہکار
چپے چپے میں یہ مشرق کا فسونِ بیدار
آج بھی شامِ اودھ، صبحِ بنارس کی قسم
اپنی تاریخ کا ہر نقش ابھارا تو نے
لیکے اخلاص و محبت کا سہارا تو نے
تیری آغوش میں پل کر ہوئی اک قوم جواں
ہر طرف آج ہے بیداریٔ احساس و نظر
تیرے ذرّے بھی نظر آتے ہیں الماس و گہر

امن و آسائش و الفت کے اشاروں کی زمیں
زندگانی سے ہیں معمور فضائیں اب بھی
کیفِ تقدیس لیے تاج و اجنتا کا وقار
اُف یہ تابندہ روایات کا خوابوں کا دیار
ماضی و حال کا کس درجہ ہے دلکش سنگم
زلفِ تہذیب و تمدن کو سنوارا تو نے
کتنے طوفانوں میں ڈھونڈا ہے کنارا تو نے
یہ ہمالہ کی بلندی تری عظمت کا نشاں
تیری محفل میں اجالا، تری دنیا میں سحر
ماہ و انجم سے بھی روشن ہے تری راہگذر
آج دنیا کی زباں پر ہے فسانہ تیرا

بن گیا امن کا پیغام ترانہ تیرا
تیری آزاد فضاؤں میں ہے پیغامِ حیات
تیرے میخواروں کے ہاتھوں میں ہے اب جامِ حیات
تیرے افسانے کا عنوان بنا نامِ حیات
دیدیا تو نے ہر اک قوم کو انعامِ حیات

(زیرِ ترتیب مجموعہ "زرِگل" کا ایک ورق)

حکیم یوسف حسین خاں

قلی قطب شاہ

(۔۔ار کی زبانی)

اے میرے پرستارو!
جمہور کی "شاہی" میں، اے میرے گنہ گارو"
اے شاہ کے دلدارو،

دلدار کے شہ پارو
اے خواب کی وادی میں بینائی کے سیارو

اے میرے پرستارو
خورشید کی تفسیریں   کرنوں کے چمکنے تک
مہتاب کی تعبیریں   سورج کے نکلنے تک
انسان کی تسخیریں   اک سانس کے چلنے تک
موت آئے تو پھر دارا، دارا تو نہیں رہتا
ٹوٹا ہوا اک تارا تارا تو نہیں رہتا

پھر کیوں میں تمہارا ہوں؟
تم کس لئے آئے ہو؟
میں کیوں تمہیں پیارا ہوں؟
یہ پھول جو لائے ہو!
اے میرے پرستارو   تم اس لئے آئے ہو
میں دل جسے ہارا ہوں
تم ایسے پرائے ہو
یہ ہار یہ دل دینا سو جیت پہ بھاری ہے

اب کچھ بھی نہیں ہوں میں
ماضی کا امیں ہوں میں
پیوند زمیں ہوں میں
پر میرا جو سکہ تھا وہ آج بھی جاری ہے
وہ بھاگ متی میری
یہ مسند و مینارہ
درویش کی وہ پھیری
شاعر کا یہ سی پارہ
اے شاہ کے دلدارو
وہ صرف کہانی تھے، اک طرح کے سپنے
قبضہ میں فقط دل تھے، دل آج بھی اپنے
اے خواب کی وادی میں بینائی کے سیارو!
خورشید کی تفسیریں   کرنوں کے چمکنے تک
مہتاب کی تعبیریں   سورج کے نکلنے تک
انسان کی تسخیریں   اک سانس کے چلنے تک
لیکن وہ کہت حاکم جس میں دل انسا

جمہور کی شاہی ہو
یا شاہ کی جمہوری
ہر دور میں حاکم ہے ہر دور میں سلطا
اے میرے گنہ گارو
اے میرے پرستارو!

(یوم قلی قطب شاہ ۱۹۶۲ء میں پڑھی گئی)

فیض الحسن خیال

جلترنگ

یہ دکن کی وادی ہے ، یہ دکن کا گلشن ہے
جانے کس حسین بت نے اپنے نرم ہونٹوں سے
دائمی تبسم کے پھول یہ بکھیرے تھے
ہر روش گلستاں کی اب بھی جگمگاتی ہے

کس کا پیرہن چمکا ، کس نے لی ہے انگڑائی
موجِ گل میں شامل ہے ، بوئے پیرہن اب تک
بھاگ، تیری انگڑائی ، پیار کا فسانہ ہے

جلترنگ الفت کے آج تک بھی بجتے ہیں
چاندسی محبت کی، چاندنی ٹپکتی ہے
یہ وفا کے بندے کا اک حسین گوشہ ہے
دور اک کنارے پر وادیٔ محبت ہے
اس کے بام و در پر اب روشنی سی ہوتی ہے

علم و فن کا دیوانہ ، اپنا خون دل دے کر
دائمی محبت کا اک چراغ سلگایا
اُس چراغ کی لو سے ہر روش اجالا ہے
سو چراغ جلتے ہیں دیکھئے محبت کے

ذرّہ ذرّہ گلشن کا لے رہا ہے انگڑائی
نام سے قطب شہ کے بج رہی ہے شہنائی

وقار خلیل

حیدرآباد

مرا شہر ہے ایک شہرِ نگاراں　　جہانِ وفا محفلِ گل عذاراں
ہر اک خواب تعبیرِ حسنِ بہاراں　　یہ ارضِ مہ و مہر یہ بزمِ یاراں
مرا دیس صد رشکِ سرو و سمن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

یہیں عظمتِ فکر و تہذیب فن ہے　　یہیں شعر و نغمے کا البیلا پن ہے
یہیں مہر و الفت کا ہر سو چلن ہے　　یہیں زندگی کا ہر اک بانکپن ہے
ہر اک دل یہیں مثلِ گل خندہ زن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

یہ بزمِ غزالاں یہ سرو خراماں　　یہ طاؤسِ رقصاں، یہ ابرِ بہاراں
یہ صبحِ خراماں، یہ شامِ فروزاں　　یہ پکھراج و نیلم، یہ گلزار و ایواں
اجالوں کی مہکی ہوئی انجمن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

جہاں اعتبارِ ریاضِ سخن ہے　　جہاں ہر خوشی گل رخ و گلبدن ہے
جہاں ہر نفس، ہر قدم بانکپن ہے　　جہاں آرزو رازدارِ چمن ہے
وہ دلدار ہے، دلربا ہے، سخن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

ہر اک شام رنگین و گل پیرہن ہے　　ہر اک صبح زرکار و شکر دہن ہے
سدا مہرباں اس پہ چرخِ کہن ہے　　بصد عز و شاں زندگی موجزن ہے
یہ دارالاماں مرکزِ علم و فن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

دیارِ دکن عظمتِ قطب شاہاں　　دیارِ دکن صولتِ کج کلاہاں
دیارِ دکن قسمتِ خوش نگاراں　　دیارِ دکن دولتِ داد خواہاں
ہر اک لب پہ نامِ دیارِ دکن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

اسی خاک سے جامعہ ہے عبارت　　اسی خاک نے علم کی دی بشارت
اسی خاک نے دی نویدِ بصارت　　اسی خاک میں زندگی کی حر
یہی خاک اکسیرِ ہر مادمن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

اسی خاک کا نورِ چشمِ غزالاں　　یہی خاک ہے سرمۂ د
سرورِ غزل، فکرِ نازک خیالاں　　یہی خاک ہے پیکرِ خوش ج
یہی مرکزِ حسنِ گنگ و جمن ہے
کہانی کی جنت، غزل کا وطن ہے

محفلِ شعر و سخن

یوم محمد قلی قطب شاہؒ کے سلسلے میں ۱۳ رجنوری سنہ ۱۹۶۴ء کو رات کے ۹½ بجے ایوان اردو میں نواب عنایت جنگ بہادر کی صدارت میں محفل شعر و سخن منعقد ہوئی جس میں راشد آذر، سلیمان خطیب، صادق نقوی، بشیر النساء بیگم بشیر، خورشید نذیر اور ... ادری نے نظمیں سنائیں۔ جن شعراء نے اس موقع پر اپنی غزلیں سنائیں، اس کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ خیرات ندیم ... علی خاں ثاقب کی غزلیں وصول نہ ہونے کے سبب افسوس ہے کہ ہم ان کا صرف ایک ایک شعر انتخاب میں شامل کر رہے ہیں ... فن کا اختتام ڈاکٹر زور کی غزل پر ہوا۔ جسے صلاح الدین نیر نے ترنم سے سنایا۔ وقار خلیل نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام ...

(ادارہ)

...سر واجدی

...و پابندِ زندگی ❊ دل میں فریاد سینے میں دم قید ہیں
...ت جوں چمن کی قسم ! ❊ بند مٹھی میں کتنے بھرم قید ہیں
...ر کی راہوں میں وہ کم سے ❊ تیری یادوں کے نقش قدم قید ہیں

...انصاری

...پہنچا ہے کوئی منزل تک ❊ اچھے اچھے رہِ الفت میں بھٹک جاتے ہیں
...کا سلیقہ نہیں آتا جن کو ❊ میکشی کا نہ کریں قصد جو چھلک جاتے ہیں
...یمن جو آسودہ ہوتے ہیں ❊ چشم صیاد میں تنکے وہ کھٹک جاتے ہیں

...احمد علی

...ادر گھٹا جھوم کے برسے ❊ اک برق سی گر جاتی ہے ساقی کی نظر سے
...گود غریباں میں یہ دیکھو ❊ آیا ہے مسافر کوئی ہستی کے سفر سے
...ہستی کا بس اتنا ہے فسانہ ❊ ہستی سے میں گزرا ہوں محبت کی نظر سے

...سفی

...ھتی بہ نظر گرد راہ ہے ❊ فکر و نظر ہے نام، مری گمرہی کا درد
...ہ آپ کے رخسار کی چمک ❊ سج سج گیا ہے دل میں حسین چاندنی کا درد
...لہ پڑی ہے جو سے شراب ناب ❊ تب تب اٹھا ہے حرف لب تشنگی کا درد

تاباں شمس الدین

وہ آئے اور نہ دل کو قرار آیا ہے ❊ وفا کو راس غمِ انتظار آیا ہے
وہ آنے والے ہیں، وہ آ رہے ہیں، وہ آئے ❊ یہی خیال مجھے بار بار آیا ہے
زمانہ دعوتِ عشرت نہ دے کہ مدت میں ❊ حیاتِ عشق کو غم سازگار آیا ہے

تاج قریشی

بے فائدہ ہے گردشِ چرخ کہن کی بات ❊ یہ دور ارتقاء ہے کرو فکر و فن کی بات
صد چاک دل سے گیسوؤں پر اترے طفیل ❊ سنتا ہوں ان کی زلف شکن در شکن کی بات
نکلی حدیثِ قامت و گیسو کے درمیاں ❊ کس والہانہ طور سے دار و رسن کی بات
فوراً نقیب وقت کا لہجہ بدل گیا ❊ جب چھڑ گئی عروجِ بہارِ چمن کی بات
شہرِ وفا، دیارِ نگاراں کے تاج یہ ❊ آتی نہیں کسی میں بھی میرے دکن کی بات

ثاقب پرنس نقی علیخاں

بے نام صلیبوں کے در و بام سجا لو ❊ کچھ دیر سہی جشن چراغاں تو منا لو

خیال فیض الحسن

مدت سے کسی کا کوئی پیغام نہ آیا ❊ اے ذوقِ طلب جذبۂ دل کام نہ آیا
اک بار دیا تیری نگاہوں نے سہارا ❊ پھر مرحلۂ گردشِ ایام نہ آیا
کس وقت تری یاد کے غافل تھا مرا دل ❊ کس وقت مرے لب پہ ترا نام نہ آیا

سب رس

زورؔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری مرحوم

یوں تو کہنے کو یہاں سے گزر جائیں گے ۔ کیا بتائیں کہ آخر کدھر جائیں گے
میری آنکھیں ترستی رہیں گی مگر، ۔ وہ جو آئیں گے دل میں اتر جائیں گے
بوئے گل ہو کہ سیلابِ برقِ تپاں ۔ سعیٔ انسان سلامت سنور جائیں گے
زندگی سانس لیتی رہے گی یونہی ۔ زندہ دل ہنستے ہنستے گزر جائیں گے
موت سے بھی مر گئے نہیں زورؔ ہم ۔ زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

سراجؔ میر سراج الدین علیخاں

متاعِ زندگی تم پر لٹا دی ۔ تمھیں اب اعتبار آئے نہ آئے
چمن والو! نہ ہو نازاں چمن پر ۔ چمن میں پھر بہار آئے نہ آئے
سراجؔ اس رنگ سے جب عمر گزری ۔ لحد میں بھی قرار آئے نہ آئے

شورؔ مینائی

ہم سے مت پوچھ یہ مبہم سے سوالات کہ ہم
رہتے ہیں گردشِ دوراں کے پسِ منظر میں
تیرا میخانہ سلامت کہ یہاں آ کر ہم
ان سوالات کو چھوڑ آئے پسِ منظر میں
لڑکھڑاتا ہوا نکلا کوئی میخانے سے
جھوم کر نقشِ قدم اٹھتے پسِ منظر میں
آپ اگر شورؔ کو سنیے تو کریں گے محسوس
درد کی ٹیس، تغزل کے پسِ منظر میں

طاہرہ سعید، بانو

وہ قاتل ہیں، ظالم ہیں اور بے وفا ۔ مگر اُن سے بدلا لیا جائے نا
مگن ہیں غمِ زندگی میں بھی ہم ۔ یہ شکوہ شکایت کیا جائے نا
خجل جس سے ہو نامِ انسانیت ۔ کوئی کام ایسا کیا جائے نا

کلیمؔ انیس احمد

بدل گئے کہیں آئینِ زندگی تو نہیں ۔ لبوں پہ نالۂ غم کے سوا ہنسی تو نہیں

[illegible]

میں کر رہا ہوں پرستش تری نگاہوں کی ۔ چھپا ہوا یہ کوئی دامِ بندگی تو نہیں
بلا سبب نہیں صحنِ چمن میں خندۂ گل ۔ ہمارے چاکِ گریباں پہ یہ ہنسی تو نہیں
میں ڈھونڈتا ہوا پہنچا ہوں میکدہ میں کلیمؔ ۔ چھپی ہوئی کہیں ساغر میں زندگی تو نہیں

مظہرؔ کامل

رہ رہ کے یہ ہر وقت کھٹکتی ہے جو دل میں ۔ شاید کہ دبا ہو کہیں سوفارِ تمنا!
لاکھوں میں ہو دو چار کو شاید یہ سلیقہ ۔ آسان نہیں شیوۂ اظہارِ تمنا!
ہر حال میں ہو پیشِ نظر دوست کی مرضی ۔ مظہرؔ ہے یہی عشق کا معیارِ تمنا!

منظورؔ۔ محمد منظور احمد

ہر ذرہ میں انعام لئے بے بصری نے ۔ موتی ہی لٹائے ہیں یہاں دیدہ وری نے
ہر مرحلۂ غم سے جو ہنستے ہوئے گزرے ۔ اعجاز دکھایا ہے یہ صاحب نظری نے
الزام کسی پر نہیں بربادیٔ دل کا ۔ وارفتہ کیا تھا ہمیں وحشت اثری نے
اک سوزشِ پنہاں سے تڑپتے رہے منظورؔ ۔ سمجھا ہی نہیں اس کو کبھی چارہ گری نے

ندیمؔ خیرات ندیم

تمھاری محفل سے یوں چلا ہوں نہ جانے کیا چیز بھول آیا
کبھی تو محسوس یہ ہوا ہے کہ ساتھ ہی زندگی نہیں ہے

نیرؔ صلاح الدین نیرؔ

جلتی ہے یہاں سانس بھی گھبرائی ہوئی سی ۔ اے دو جہاں تو نے مجھے چھوڑ دیا ہے
کل تک بھی جسے دعویٔ ہمنفسی تھا ۔ دل اس نے بعنوانِ وفا توڑ دیا ہے
اے فطرتِ غم تیری ہی تسکین کی خاطر ۔ نیرؔ نے تمناؤں کا دل توڑ دیا ہے

وقارؔ خلیل

غم سے گزر گئے رسن و دار تک گئے ۔ ہم لوگ صبح بن کے شبِ تاریک گئے
پھولوں کے تذکرے ہوں کہ زخموں کے سلسلے ۔ دشتِ ستم سے کوچۂ دلدار تک گئے
یادوں کے چاند، درد کے تارے، وفا کے گیت ۔ میری شبِ فراق کے غمخوار تک گئے

سلسلہ باقی برصفحہ ۳۶

سل

یوم محمد قلی قطب شاہ کا آنکھوں دیکھا حال

ۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی جانب سے اردو زبان کے پہلے صاحب دیوان شاعر قطب شاہی خاندان کے جلیل القدر ارالسلطنت شہر حیدرآباد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی کی یاد گزشتہ سنین کی طرح اس سال بھی ۱۱ تا ۱۳ ار نئہ منائی گئی۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے ۱۹۵۸ء میں اس تقریب کا آغاز کیا تھا اور ہر سال یہ تقریب قومی اور تہذیبی لمرہ کے طور پر منائی جاتی ہے۔

قلی قطب شاہ کا عہد آخری سولھویں صدی اور ابتدائی سترھویں صدی عیسوی کا زمانہ تھا۔ عہد وسطیٰ کی تاریخ میں یہ زمانہ درجہ رکھتا ہے۔ اس وقت ایران، ترکی، برطانیہ اور ہندوستان میں زندگی اور معاشرہ کے نئے اور صحت مند تصورات ے۔ انگلستان میں ملکہ الیزبتھ کی حکومت تھی اور انگریزی کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نویس شکسپیر کی نغمہ سنجی ہو رہی تھی وی سلطنت کا ستارہ بام عروج پر تھا۔ ہندوستان میں اکبر بادشاہ سریرارائے سلطنت تھے اور جنوبی ہند میں قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنتیں علم و ادب اور فنون لطیفہ کی خدمت میں مصروف تھیں اور ان اکبر کے ہم عصر ابراہیم عادل شاہ اور محمد قلی قطب شاہ ایک مشترکہ ہندوستانی کلچر کی تعمیر کر رہے تھے۔

بوری ۱۹۶۴ء محمد قلی قطب شاہ کی ۳۵۲ ویں برسی کا دن تھا۔ اس روز شام کے پانچ بجے شہر سے ۵ میل دور قلعہ گولکنڈہ کے قلی قطب شاہ کے عظیم الشان گنبد کے چبوترے پر ادیبوں، شاعروں، پروفیسروں، طالبعلموں، مختلف سیاسی مکتبۂ خیال کے اور اردو دوستوں کے نمائندہ اور کثیر اجتماع میں اس بادشاہ کی یاد کا افتتاحی جلسہ شروع ہوا۔ اس بادشاہ نے ہندوستانی کلچر کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا دربار عالموں، شاعروں اور فنکاروں کا مرکز تھا۔ اس نے ولی سے پہلے ہماری زبان میں اور غزلیں لکھیں۔ پچاس ہزار سے زائد شعر اس کی یادگار ہیں اور یہ اشعار ہندوستانی تہذیب و تمدن کا جگمگاتا ہوا مرقع بہ میں شرکت کے لئے ریاستی حکومت کے احکام کی موجب سالہائے گزشتہ کی طرح اس سال بھی دفاتر و مدارس بند کر دیئے گئے تھے۔ اخبارات و رسائل نے اس موقع پر خصوصی اشاعتیں شائع کیں اور محمد قلی کے عہد اور دکنی ادب کو خراج کیا۔

ڈاکٹر رام کشن راؤ (ایم۔ پی) سابق گورنر کیرالا و اترپردیش کی صدارت میں افتتاحی اجلاس منعقد ہوا سوسائٹی کے

عابد علیخاں نے اپنے دل آویز ترنم میں ساز پر محمد قلی کی مناجات (مرا شہر لوگاں سوں معمور کر) سنائی۔ اس کے بعد ادارے کے معتمد ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ محمد قلی قطب شاہ نے اتحاد اور رواداری کی روایتیں قائم کی ہیں انھیں اہل حیدرآباد نے آجتک باقی رکھا ہے۔ اس زمانے میں علم و ادب اور تہذیب و تمدن کی جو شمعیں روشن ہوئی تھیں وہ آج بھی فروزاں ہیں"۔ محمد قلی نے فراخ دلانہ روایات کا جو پودا لگایا تھا اس میں آج بھی پھول کھل رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس بادشاہ کی یاد روز بروز تازہ اور شگفتہ ہوتی جا رہی ہے اور اس کے کارناموں کا جس طرح مطالعہ کیا جا رہا ہے اتنا ہی اس کے دور کی خوبیاں واضح ہو رہی ہیں۔ ہمارا شہر محمد قلی کی تہذیب، اس کی علمی و ادبی سرپرستی اور اس کی شاعری کا گہوارہ ہے۔ حیدرآباد شہر غزل ہے اس کا گنگا جمنی اور زندہ و پائندہ ادب صدیوں اہل ہند کے لئے مشعل راہ کا کام دیگا"۔ ڈاکٹر سکسینہ نے ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یوم محمد قلی قطب شاہ ڈاکٹر زور مرحوم کے الفاظ میں ادارے کی ایک سالانہ تقریب ہے اور یہ حیدرآباد کے ارتقائی ادب اور ثقافت کا سالانہ جائزہ ہے۔ گزشتہ یوم محمد قلی سے اتبک ادارے نے نصف درجن سے زیادہ علمی و ادبی تاریخی کتابیں شائع کیں۔ قطب شاہی ادب اور ثقافت کی ترتیب و اشاعت کا کام بھی جاری ہے۔ اس سلسلے کی چند کتابیں طباعت کے آخری مراحل طے کر رہی ہیں۔ ادارہ گزشتہ ایک سال سے حیدرآباد کی منظوم ادبی تاریخ کا کام بھی مکمل کر رہا ہے۔ اس کے آئندہ پروگرام میں دکن کی تاریخ اور تہذیب، شعر و ادب کی بہت سی کتابوں کی اشاعت بھی شامل ہے اس سلسلے میں پروفیسر سکسینہ نے سب رس کے دستاویزی زور نمبر، ظفر نمبر۔ اور ادارے کے اردو امتحانات اور اردو میوزیم نیز مطبوعات و مخطوطات شعبوں کی تفصیلات بتائیں اور آخر میں گلوگیر اور رقت آمیز آواز میں کہا کہ "ہم سبھوں نے اسی یادگار مقام پر ڈاکٹر زور کو یوم کے انتظامات کرتے۔ جلسے کی کارروائی کو چلاتے۔ خیر مقدمی تقریر کرتے۔ ہنستے اور مسکراتے دیکھا ہے آج وہ موہنی سجیلی پروقار اور عظیم المرتبت شخصیت جس کے دم سے نصف صدی تک دکن کی ادبی محفلیں آراستہ رہیں وہ چراغ علم و دانش بجھ گیا وہ میر کارواں تہذیب و تمدن اب ہم میں نہیں ہے تاہم آج بھی ہم اس کے عطا کردہ حوصلوں اور امنگوں کو مشعل راہ بنائے ہوئے ترقی کی طرف رواں دواں ہیں"۔

ڈاکٹر سکسینہ کی تقریر کے بعد صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر نے ڈاکٹر بی رام کرشن راؤ کی گل پوشی فرمائی۔ اس کے بعد یوم قطب شاہ کے جواں سال کنوینر جناب رمن راج سکسینہ (ایڈوکیٹ) نے مائیک پر اعلان کیا کہ اب حیدرآباد کی ممتاز مغنیہ قمر جہاں، محمد قلی کی غزل "ساقیا اب شراب ناب کہاں" سنائیں گی۔ قمر جہاں کے گیت اور ترنم سے محفل جھومنے لگی۔ اسی مہکتے ماحول میں صدر جلسہ ڈاکٹر بی رام کرشن راؤ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ :-

"سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جس شہر کی بنیاد رکھی تھی وہ شہر مختلف اقتصادی، سیاسی اور دوسری تبدیلیوں کے باوجود مشترکہ تہذیب، لسانی اور بین فرقہ جاتی اتحاد باہمی میل جول اور رواداری کی اعلیٰ روایات کو اپنے سینے سے لگائے اور سارے ملک کے لئے قابل فخر اور قابل تقلید مثال پیش کر رہا ہے۔ ہمیں انہی خصوصیات کو برقرار رکھنے کے لئے متحد ہو کر

اکٹر بی، رام کشن راؤ نے ادارۂ ادبیات اردو اور اس کے بانی ڈاکٹر زور مرحوم کی گراں قدر خدمات اور قطب شاہی تہذیب
ء واحیاء میں ان کے حصے کا ذکر کرتے ہوئے ان کی بے وقت رحلت پر گہرے رنج و الم کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر راؤ نے کہا کہ
انی سے زیادہ قابل قدر چیز ان کی انسانی دوستی اور ادب نوازی تھی۔ حیدرآباد پانچ زبانوں کا ایک خوبصورت سنگم ہے
رہٹی، کنڑی اور ہندی بولنے والوں کے مابین یہاں آپس میں روادارانہ برتاؤ رہا ہے اور یہاں کا قومی اتحاد اپنی مثال
رواداری اور اتحاد دراصل محمد قلی کی حیدرآبادیوں کو ایک دین ہے۔" تالیوں کی گونج میں غیر منقسم حیدرآباد کے سابق
ڑبی، رام کشن راؤ نے کہا کہ "آج کا آندھرا پردیش دراصل قطب شاہی ریاست کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ حیدرآباد کے
ں، موسم اور یہاں کے آپسی اتحاد اور رواداری برتاؤ کے سارے ہندوستان میں چرچے ہوتے ہیں۔"

راؤ کی صدارتی تقریر کے بعد پروفیسر سید علی اکبر نے یوم محمد قلی کے سلسلے میں آئے ہوئے پیامات سنائے۔ نواب مہدی نواز
ت کا پیام تھا "یوم محمد قلی کو ایک قومی، تاریخی اور تہذیبی اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور کے بعد آپ حضرات اس کام
میں خلوص اور سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں جو یقیناً قابل مبارکباد ہے۔"

ی بی گوپال ریڈی (سابق مرکزی وزیر حکومت ہند) نے تحریر فرمایا کہ "یوم محمد قلی میرے لئے خوشگوار یادوں کے اعادے کا
سے میں مسرت حاصل کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر زور ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ہمیں یوم محمد قلی کو ہمیشہ مناتے رہنا چاہیئے
ر کی آرزوں کا آئینہ دار ہے۔ سلطان قلی نہ صرف حیدرآباد کا بانی تھا بلکہ مختلف اقوام کے لوگوں کا مربی اور سرپرست بھی تھا
ت بڑی رنگین اور رومانی تھی۔

مورخ ڈاکٹر تاراچند نے اپنے پیام میں فرمایا کہ "محمد قلی کا شمار ان چند مدبروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں
۔ رنگ کرکے ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کے جذبے کو پروان چڑھایا۔ بادشاہ ہونے کے علاوہ کئی زبانوں کا شاعر اور علم و ادب کا
۔ اس عظیم بادشاہ کی خدمات اس امر کی متقاضی ہیں کہ اس کی یاد اہل ہند کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رکھی جائے۔"

۔ اے، ایس چھاگلا مرکزی وزیر تعلیم جناب بدرالدین طیب جی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، ڈاکٹر اعجاز حسین، پنڈت
اور ڈاکٹر گیان چند کے پیامات میں اس تقریب کی کامیابی کے لئے توقعات وابستہ کی گئی تھیں۔

بر سید علی اکبر صدر ادارہ نے صدر نشین مجلس قانون ساز مغربی بنگال ڈاکٹر سینتی کمار چٹرجی کا پیام سنایا جس میں کہا گیا ہے کہ
ت اردو نے یوم محمد قلی مناکر ایک ایسے بادشاہ کی یاد تازہ کی ہے جو اکبر اعظم کا معصر تھا اور اس نے دکن میں ہندو مسلم
دوسرے میں سموکر محبت اور صلح جوئی کی مضبوط بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ آندھرا کے لوگوں سے اس کی یکجہتی نے ہندوستانی
نئے باب کا آغاز کیا۔ محمد قلی کے نقش قدم پر چل کر آصفجاہی بادشاہوں کے زمانے میں بھی حیدرآباد ہندو مسلم تہذیب کا ایک ایسا
جس کو ہم شمال میں دلی اور لکھنو کا ہم پایہ قرار دیتے ہیں۔ آخر میں میری دعا ہے کہ حیدرآباد جو دکنی اور ہندوستانی ادب کا
رکز ہے ہمیشہ آباد رہے۔"

جناب اے آر کرپلانی سکریٹری نیشنل ساہتیہ اکاڈیمی دلی نے اپنے پیام میں لکھا ہے کہ میں ساہتیہ اکاڈیمی کی جانب سے اس تقریب کے انعقاد پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ادارہ یقیناً ایک ایسے بادشاہ کو خراج عقیدت پیش کر رہا ہے جو ایک بہت بڑی تہذیب کا بانی تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور کو بھی جو اس وقت ہم میں نہیں ہیں خراج تحسین ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس یوم کے منانے کی ابتدا کی مرحوم اکاڈیمی کے ایک گراں قدر دوست اور رکن تھے۔

ہماری زبان کے صاحب طرز انشاپرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی (علیگڑھ) نے اپنے گراں قدر پیام میں فرمایا کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ساتھ مجھے دلی کے آخری تاجدار ظفر اور دکن کے موجودہ گوشہ نشین حکمراں بھی یاد آرہے ہیں۔ دکن کو اس کا دوگونہ فخر ہو سکتا ہے کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان سلطان شاعر وہاں کا ہے اور غیر منقسم ہندوستان کی دیسی زبان کی تا این دم اولین دانش گاہ عثمانیہ یونیورسٹی کا بانی اور موسس بھی انہی کا فرماں روا ہے۔ اس موقع پر اس تقریب کے بانی اور میرے مربی ڈاکٹر زور بھی یاد آتے ہیں۔

مرکزی انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور اپنے پیام میں رقمطراز ہیں کہ "یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر زور نے اردو کے اس پہلے صاحب دیوان شاعر اور قومی اتحاد کے علمبردار کی یاد کے منانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ جاری ہے اس طرح ہم نہ صرف قدیم اردو سے اپنا ربط قائم رکھیں گے بلکہ اردو زبان اور ادب کے قومی اتحاد کو استوار کرنے میں جو درجہ ہے اسے بھی اجاگر کر سکیں گے اور یقین ہے کہ یوم محمد قلی کے ذریعہ دکن میں اردو کے سماجی اور قومی کردار کو اور واضح کیا جا سکے گا۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کا پیام ہے "نہ سلطان محمد قلی قطب شاہ ہیں اور نہ ڈاکٹر زور جو چیز رہنے والی ہے وہ ان کے کارنامے ہیں۔ قومی تہذیب میں ان کا حصہ خدا کرے۔ آج ۳۵۲ ویں برسی کے دن آپ لوگوں کے دل میں خیالات کی شمع روشن ہو جائے۔ جن کی بدولت محمد قلی سے زور صاحب تک ہمارے راستے کی ظلمتیں دور ہو سکیں اور ہم میں اور ساتھ رہنے کا سلیقہ پیدا ہو سکے۔"

پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی رقم طراز ہیں کہ "مجھے محمد قلی کی سلطانی نہیں بلکہ وہ درد اور لگن عزیز ہے جو اس کے ادبی اور تہذیبی کاموں میں جلوہ گر ہے۔ اس نے سچی ہندوستانی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور دوررس نظروں سے اس ہندوستان کو دیکھ رہا تھا جو آج وہ بننا چاہتا ہے۔ ایسے انسان کی یاد منانا خود اپنے کردار کا جائزہ لینا ہے۔ یہ تقریب نہ صرف دکن میں بلکہ سارے ہندوستان میں ایک قومی تہوار کی حیثیت سے منائی جانی چاہیئے۔

پیامات کے بعد نماز مغرب کا وقفہ ہوا اور پھر آقائی حسن طبسی نیر نے محمد قلی کو فارسی میں خراج عقیدت ادا کیا۔ آقائے سید شاہ عباس منصور خراسانی کے عالمانہ فارسی خطبے کے بعد محترمہ بانو طاہرہ سعید نے محمد قلی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ تالیوں کی گونج میں میر بلدۂ عظیم تر حیدرآباد جناب بنارسی لال گپتا نے شہر حیدرآباد کے بانی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ محمد قلی کے دور میں زبان اور ذات پات کا کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ قطب شاہ کے دور میں فرامین اردو کے علاوہ تلگو میں بھی جاری ہوا کرتے تھے اور آج بھی حیدرآباد میں قطب شاہ کے دور کی تہذیبی اور لسانی روایات برقرار ہیں۔ اس زمانے میں بھی دارالخلافہ پر دنیا

مرکز بنا ہوا تھا۔ اور آج بھی حیدرآباد ماضی کی روشنی سے معمور ہے محمد قلی کی شاعری تلنگانے کے لئے ایک تہذیبی سرمایہ ہے جس سے
الی نسلیں فائدہ اٹھاتی رہیں گی۔" میر بلدیہ مسٹر گپتا نے کہا کہ محمد قلی کی شخصیت میں فنکارانہ ذہن کارفرما تھا۔ اس نے دکنی زبان کے
سانچے بنائے تالیوں کی گونج میں میر بلدیہ نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر زور مرحوم کے علمی و تہذیبی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔
کے بعد صلاح الدین نیر نے محمد قلی کو منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

اردو کالج کے پرنسپل پروفیسر سید محمد نے محمد قلی کے عہد، شاعری، شہر حیدرآباد کی تعمیر اور دکنی ادب پر عالمانہ روشنی ڈالتے ہوئے
"محمد قلی جیسے محسن ملک و قوم بادشاہ کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ وہ بادشاہ جس نے دلوں پر حکومت کی۔ جس نے مخالف عناصر کو
نت عملی سے شیر و شکر بنا لیا۔ جس نے دیسیوں اور پردیسیوں کو مل جل کر زندگی بسر کرنے کا سبق پڑھایا۔ جس نے اس ملک کی ملکی
ں۔ تلگو اور اردو کی سرپرستی کی جس نے حیدرآباد فرخندہ بنیاد جیسا شہر بسایا۔ جس نے علم و حکمت اور شعر و ادب کی نہریں
یں۔ جس کی روایات نے اہل ملک کو جینا سکھایا۔ جس کا ہر فعل اور ہر عمل اس کی انسان دوستی اور رعیت پروری کا شاہد ہے
س کا نام اور اس کی یادگاریں صدیوں تک زندہ اور پائندہ رہیں گی۔" پروفیسر سید محمد کی تقریر کے بعد نواب میر یٰسین علیخاں اور فیض الحسن
نے محمد قلی پر اپنی نظمیں سنائیں۔ پروفیسر سید علی اکبر نے ادارے کی طرف سے محمد قلی کے مزار پر چادر گل چڑھائی۔ گنبد کے اندرونی
یں کیپٹن عباس عابدی نے محمد قلی کے مرثیے سنائے۔ قرات اور فاتحہ خوانی کے بعد آتشبازی کا رنگارنگ مظاہرہ ہوا جسے حاضرین نے
پسپی سے دیکھا۔ گنبد محمد قلی پر رنگ برنگی روشنی کی گئی تھی۔ اس تقریب کا اختتام عزیز احمد خاں وارثی کی قوالی پر ہوا۔ رات کے
بجے یہ تہذیبی اجلاس جناب رمن راج سکسینہ کے شکریے پر اختتام کو پہنچا جس کی ریڈیائی رپورٹ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے
ری کو نشر کی۔

دوسرے دن ۱۲ ر جنوری ۱۹۶۴ء کو ساڑھے دس بجے ایوان اردو میں صدر ادارہ سید علی اکبر کے ہاتھوں نمائش نوادر قطب
ہ افتتاح عمل میں آیا۔ معتمد نمائش کمیٹی میر سراج الدین علی خاں نے نمائش کی تفصیلات سے حاضرین کو واقف کرایا۔ اس
یں قطب شاہی ادب، فرامین، اسلحہ، سکہ جات، مخطوطات، تصاویر، کتب و رسائل اور آثار میرمومن کو سلیقے سے پیش
تھا۔ جس میں کئی ایک ایسے نوادر بھی شامل تھے جو پہلی بار اس نمائش میں دیکھے گئے۔

نمائش کے افتتاح کے فوری بعد جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی صدارت میں ادبی اجلاس منعقد ہوا
ل کی ممتاز افسانہ نگار محترمہ عصمت چغتائی نے تالیوں کی گونج میں کہا کہ اردو والوں بالخصوص بمبئی والوں کو جو نامرادی اور
احساس ہوتا ہے۔ وہ محمد قلی کے شہر حیدرآباد میں آکر ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم بھی بہت کچھ ہیں۔ حیدرآباد
دو کو نمایاں مقام حاصل ہے یہاں ایک صحت مند ادبی ماحول ہے۔ اپنائیت کی فضا ہے۔ حیدرآباد اور بالخصوص ایوان اردو
ناثر اور قوی ہو جاتا ہے۔ ایوان اردو تو خوبصورت عبادت خانہ ہے اور اس کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ ہمیں اپنے اسلاف
ناموں سے اکتساب فیض کرتے ہوئے ایک نئی زندگی اور صحت مند مستقبل کی تعمیر کرنی ہے اور حیدرآباد کے باہر کے ادیب اور شاعر

دراصل محمد قلی کے شہر حیدرآباد کو اپنا میکہ سمجھتی ہیں کیونکہ یہاں آکر انہیں وہ خلوص اور پیار میسر آتا ہے جو ممتا کا نشان امتیاز ہوتا ہے۔

محترمہ عصمت چغتائی کے بعد محترمہ صالحہ عابد حسین نے بھی اس تقریب میں حسن اتفاق سے شریک تھیں۔ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر زور اور ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات کو سراہا اور کہا کہ زبان اور ادب کا خادم مرجاتا ہے لیکن اس کی عظمت اور اس کا کام باقی رہتا ہے محمد قلی اردو کا پہلا خادم اور پہلا شاعر تھا اور زور صاحب اس کے عقیدت مند اور پرستار تھے۔ وہ ہماری زبان کے سرآوردہ رہنما تھے۔ ڈاکٹر زور کو اردو سے جو خلوص اور وابستگی تھی اس کی وجہ سے اردو دنیا اپنے اس محسن کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔ میں اپنی اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی طرف سے جو اس وقت یہاں موجود ہیں اس کامیاب تقریب کے انعقاد پر نیک توقعات کا اظہار کرتی ہوں۔

دکن کے مشہور مورخ پروفیسر عبدالمجید صدیقی نائب صدر ادارہ نے محمد قلی کی تعمیر کے زیر عنوان تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "سلطان محمد قلی ایک معمار قوم تھا اس نے ایک خوبصورت شہر تعمیر کیا اور دلوں پر حکمرانی کی قطب شاہی خاندان نے مقامی زبان، کلچر اور مقامی روایات کو اپنے اندر سمو دیا تھا۔ تلگو کے شاعروں نے بھی محمد قلی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کی حکومت سیاسی اعتبار سے مضبوط تھی اور اس کے حکومت میں تہذیب و تمدن، صنعت و تجارت، ادب و شاعری اور دیگر فنون لطیفہ نے زبردست ترقی کی۔ محمد قلی نے حاکم اور محکوم کے فرق مٹا دیا تھا۔ اس کی مذہبی رواداری مسلمہ تھی وہ عربی اور فارسی کے علاوہ تلگو سے بھی واقف تھا"

محترمہ بانو طاہرہ سعید نے محمد قلی کو منظوم خراج عقیدت ادا کیا اور پھر ممتاز ادیب اور محقق مولوی نصیرالدین ہاشمی نے "محمد قلی کے کارنامے" کے زیر عنوان اپنا مقالہ سنایا اور تفصیلی طور پر محمد قلی کے تہذیبی اور ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "محمد قلی کا دور مخلوط تمدن اور ملی جلی تہذیب کا دور تھا اور عوام ایک دوسرے سے قریب تھے"

مسٹر سری نیواسن لاہوٹی نے "قطب شاہی فن تعمیر" پر مقالہ پڑھا اور وضاحت سے محمد قلی کے عہد کی عمارتوں، محلات اور دیگر آثار پر ماہر فن تعمیر کی طرح شرح و بسط کے ساتھ تاریخی حوالوں کی روشنی میں بتایا کہ مکہ مسجد کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مکہ معظمہ سے مٹی منگوا کر اس سے بعض اینٹیں بنائی گئی تھیں جس کی بنا پر اس مسجد کا نام مکہ مسجد رکھا گیا۔ مسٹر لاہوٹی نے بتایا کہ چارمینار اس دور کی بہترین عمارت ہے۔ قلعۂ گولکنڈہ چار سو فیٹ بلند پہاڑی کو فصیل سے گھیر کر تیار کیا گیا اور قطب شاہی عہد کی عمارتیں ہندو مسلم کلچر اور ملی جلی تہذیب کی آئینہ دار اور رواداری کا بہترین نمونہ ہیں۔

وقار خلیل نے قطب اردو کے زیر عنوان نظم سنائی اور پھر پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی نے محمد قلی کی شاعری پر اپنا گراں قدر مقالہ سنایا اور بتایا کہ "بارہ موصفات پر مشتمل محمد قلی قطب شاہ معانی کے کلیات میں معنیٰ آفرینی بھی ہے اور ندرت خیال بھی، ریختہ بھی ہے اور ریختی بھی، شیرینی بھی ہے اور تیکھا پن بھی، سطوت شاہانہ بھی ہے اور جمال آفرینی بھی۔ مقامی رنگ بھی ہے اور نئے گُن بھی۔ غرض کلیات گنجینۂ سخن ہے اور چار سو سال پہلے کی زندگی کا جیتا جاگتا مرقع اور اس کے معاشرے کی ایک زندہ تاریخ ہے جس میں خالص ہندوستانی آہنگ اور جگہ جگہ ہندوستانی قومیت جاگتی جگمگاتی ہے۔

صدر جلسہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر زور اور محمد قلی کا تقابل کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر زور اور محمد قلی کی نسبت وہی ہے جو جانسن اور جاسرکی ہے۔ ڈاکٹر زور اگر کلیات محمد قلی سے روشناس نہ کراتے تو ولی سے قبل کے ادب سے ہم اردو والے واقف نہ

ماحب کی وجہ سے ادبی اور لسانی حیثیت سے ایک اہم بازیافت ہوئی۔" ماہر لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے محمد قلی کی زبان کے سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ سلطان محمد قلی کا شمار اردوئے قدیم کی ان بزرگ ہستیوں میں ہوگا۔ جنھوں نے اس زبان کو نہ صرف ایک ادبی لہجہ عطا پنی پرجوش شخصیت کی تمام گرمی اور توانائی بھی بخش دی۔ محمد قلی کی زبان دراصل حضرت امیر خسرو کی زبان دہلوی کی جنوبی ہند کی جانب توسیع شدہ ہے۔ جو علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق کے جلو میں چودھویں صدی کے آغاز میں دکن پہنچتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی زبان معیاری کلاسکی اردو ہے اس کا ب طریقے سے اردوئے قدیم دکنی لسانی ماحول میں ارتقاء کا آخری زینہ بھی ہے اس لئے کہ عبداللہ قطب شاہ کے وقت سے دکن کی سرحدوں تک ا ہند کی اردو کی دست اندازی پھر شروع ہو جاتی ہے اور اس جدید زبان کا خاکہ بننے لگتا ہے جس کی درمیانی کڑی ولی کی زبان ہے جو پیش خیمہ ہے لسانی بازگشت کا جو اہل دکن نے آصفیہ دور میں قدیم زبان دہلوی سے جدید زبان دہلوی کا سلسلہ کی ہے جس کا شاندار تکملہ اور خاتم مرحوم جامعہ ہے پر ہوگا۔"

جناب محمد منظور احمد معتمد ادبی اجلاس کے شکریے پر جلسہ برخاست ہوا۔

۱۲ر جنوری کو رات کے ساڑھے نو بجے یوم محمد قلی قطب شاہ کی تیسری نشست محفل شعر و سخن حیدر آباد کے ممتاز مورخ نواب عنایت جنگ بہادر کی رت میں منعقد ہوئی جس میں خورشید نذیر اور صادق نقوی نے محمد قلی کو منظوم خراج عقیدت ادا کیا اور راشد آذر، سلیمان خطیب، برق یوسفی بشیر النساء بیگم بشیر نے نظمیں سنائیں۔ تاج قریشی، انیس احمد کلیم، خیرات ندیم، میر یسین علیخاں، بانو طاہرہ سعید، وقار خلیل، محمد منظور احمد کاملی، شور مینائی، صلاح الدین نیر، نقی علی خاں ثاقب، شمس الدین تاباں، فیض الحسن خیال، میر سراج الدین علیخاں، سراج، ڈاکٹر اسد الانصاری لی امکان، اختر واجدی اور احمد اللہ قادری نے غزلیں سنائیں۔ محفل شعر و سخن کا اختتام ڈاکٹر زور کی غزل پر ہوا جسے نیر نے ترنم سے سنایا۔ وقار خلیل شاعرہ نے مشاعرہ کے آغاز سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کا پیام پڑھا جس میں یوم محمد قلی کی کامیابی کی توقع کا اظہار کیا گیا تھا۔ صدر رہ پروفیسر سید علی اکبر نے ابتداء میں صدر مشاعرہ کی گل پوشی کی

یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب کا کامیاب اختتام ۱۳ر جنوری کو ساڑھے پانچ بجے شام منعقدہ تلگو اجلاس پر ہوا جو آندھرا سارسوتہ سد میں جناب بی راما نجا راؤ معتمد آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تلگو داں حضرات کے کثیر اور نمایندہ اجتماع میں مسٹر کے بھوپال راؤ شریمتی ڈی، ایشودھا لکچرار ومنس کالج اور اس تقریب کے معتمد ڈاکٹر رام راجو ریڈر شعبۂ تلگو جامعہ عثمانیہ نے محمد قلی کے ادب تہذیب اور کی تلگو اردو شاعری پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی۔ اس تقریب کی ریڈیائی رپورٹ بھی آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے نشر کی گئی۔

نقد و نظر

تبصرے کیلئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

خانوادۂ قاضی بدرالدولہ جلد اول مصنف افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری ایم اے ریڈر مدراس یونیورسٹی

خانوادۂ قاضی بدرالدولہ ناشر دارالتصنیف مدراس۔

یہ قاضی بدرالدولہ کے خاندان کا تاریخی مرقع ہے۔ بڑی شخصیتوں کے سوانح حیات اور خاندانی حالات ایسے ہی اہم ہیں جیسے خود قومی تاریخیں خصوصاً ایسے گھرانوں کے حالات جن میں پشتہاپشت سے علم کی گرم بازاری چلی آرہی ہو تاریخ کا بڑا سرمایہ ہیں۔ قومی تاریخیں ایسے ہی مواد سے مزین ہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ایسی بہتر شخصیتیں اور خاندان پیدا ہوئے جن کے نام کے ساتھ علم و فضل کے زرین کارنامے وابستہ ہیں۔ اس فہرست میں قاضی بدرالدولہ کا خاندان بھی ہے۔ اس خاندان میں عطا احمد شافعی سے لیکر جو اس خاندان کے مورث اعلیٰ تھے تا زمانہ حال تک کوئی سترہ پشت ہوئے ہیں۔ قاضی بدرالدولہ کے اوپر قاضی محمود، مولانا حبیب اللہ، قاضی نظام الدین، محمد حسین امام المدرسین، مولوی محمد غوث، شرف الملک جیسی بڑی شخصیتیں گزری ہیں جو آسمان علم و فضل کے ستارے تھے۔ خود قاضی بدرالدولہ بھی بڑے پائے کے عالم تھے۔ ان کی بیشمار تصانیف ہیں جو اکثر عربی میں ہیں۔ قاضی صاحب کو عربی زبان و ادب میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ منجملہ ان کے اکثر کتابیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ان کے علم و فضل سے مدراس اور جنوب ہند میں جس قدر روشنی پھیلی وہ بے اندازہ ہے۔

دارالتصنیف مدراس نے اس کتاب کو شائع کرکے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کی۔ ایسے خانوادوں کے حالات جلد سے جلد شائع ہونا چاہیئے۔ یہ کتاب تقریباً ساڑھے پانچسو صفحات پر مشتمل بڑی وضاحت کے ساتھ لکھی گئی ہے اور اس میں بڑی کدوکاوش کے ساتھ مواد جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے نہ صرف اس خاندان کی علمی سرگرمیاں واضح ہو جاتی ہیں بلکہ مدراس اور جنوب کا علمی ماحول بھی روشنی میں آجاتا ہے۔ مولف محمد یوسف کوکن عمری صاحب کی محنت قابل تحسین ہے۔ ان اشاعتوں سے نہ صرف ملک کا علم و فضل معلوم ہوتا ہے بلکہ ملک کی ثقافتی بلندیاں روشنی میں آتی ہیں۔ (پروفیسر عبدالمجید صدیقی)

پیغمبر انسانیت مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی۔ ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان صفحات ۶۲۰ مجلد گرد پوش قیمت

سیرت نبوی صلعم پر ابتک دنیا کی تمام اہم زبانوں میں کتابیں لکھی جارہی ہیں اس سلسلے میں اردو بھی بے مایہ نہ نہ صرف نثر بلکہ نظم میں بھی شعراء نے اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ دکن میں محمد باقر آگاہ اپنی متعدد مثنویوں کی بنا پر اور نوازش علی خاں شیدا

احمدی نامی چار ضخیم جلدوں کی بنا پر بھلائے نہیں جا سکتے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی شعراء اور مصنفین ہیں جن کا یہ محبوب موضوع رہا ہے یوں نے اپنے انداز میں سیرت کو پیش کیا اور مسلم سیرت نگاروں نے ان کے جواب لکھے اور ان کے اعتراضات رفع کئے۔ ہر سیرت نگار کے کوئی نہ کوئی مقصد رہا۔

مولانا شاہ محمد جعفر صاحب قبلہ کا نام نامی محتاج تعارف نہیں مولانا نے اب تک متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں اجتہادی مسائل گلستان، تجدید نسل، تعدد ازدواج، کمرشیل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت۔ اسلام اور موسیقی، ریاض السنۃ وغیرہ ہیں۔ اب مولانا نے سیرت نبوی پر اس زاویہ نظر سے روشنی ڈالی ہے اور ہر واقعہ سیرت کو لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ نبی کریم صلعم نے کس طرح ہر موقع پر انسانی قدروں کو بلند کیا ہے لیکن مولانا موصوف نے مطالعہ سیرت کا جو پہلو پیش کیا ہے وہ نہایت مدلل اور مکمل ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی انا بشر مثلکم کی تفسیر ہو جاتی ہے۔ رسول اکرمؐ بشر تھے اور بشریت کے اقدار کو جس معراج کمال تک پہنچایا ہے یہ کام کسی اور نبی سے نہ ہو سکا۔ انداز بیان نہایت ...یز اور دلوں میں روشنی اور گرمی پیدا کرنے والا ہے۔ بلا تفریق مذہب و ملت . . . . ہر اردو داں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے مسلمان کیلئے ایمان افروز ثابت ہوگی۔ کیا اچھا ہو اس کا ترجمہ دیگر اہم زبانوں میں بھی ہو اور دنیا انسانی اقدار کا نمونہ دیکھ لے یہ کتاب لکھ کر مولانا شاہ صاحب قبلہ نے نہ صرف اپنی عاقبت کا سودا فراہم کر لیا ہے بلکہ کتنے ہی مسلمانوں کی عاقبت اس کے مطالعے اور اس پر عمل سے سدھر سکتی ہے۔ (ا ع)

نیشیا

شاہد حسین رزاقی۔ ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور۔ ڈیمی سائز صفحات ۲۴ + ۴۴۴ مجلد نیوز پرنٹ ۔۔ ۷ اور چکنا کاغذ ۔۔ ۔ ۱۰

ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے اپنی گراں قدر مطبوعات سے ملک میں ایک بلند اور ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے "انڈونیشیا" ایک ایسی قدر تصنیف ہے۔ فاضل مصنف نے ابتدا میں انڈونیشیا کا تعارف کرایا ہے کہ یہ ۸½ کروڑ کی آبادی رکھنے والا ملک چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل ہے اور ان تین ہزار جزیروں میں تقریباً دو سو زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں ملایائی اور جاوی بولنے والے بہت زیادہ ملایائی جس کو حصول آزادی کی جدوجہد کے آغاز کے بعد سے انڈونیشی کہا جانے لگا ہے مشترکہ زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اس کا ادب منتقل ہو چکا ہے۔ کتاب کو بیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا باب عہد قدیم اور ہندو دور سے متعلق ہے اور دوسرے باب سے دور کا آغاز ہو جاتا ہے مبلغین اسلام کی تبلیغی کوششوں کا ذکر بھی موجود ہے اور اسلام کی اشاعت کے بعد جو اثرات ملک پر مرتب ئے اس کی وضاحت بھی تیسرا باب فرنگی تاجروں کی آمد اور فتوحات کے لئے مختص ہے اور چوتھے باب سے ولندیزیوں کے اقتدار کی ا شروع ہوتی ہے۔ ولندیزیوں نے جو پالیسیاں قوموں کو کچلنے کیلئے بنائیں اس کے ردعمل کا تفصیلی ذکر ہے اور ان کی آمریت اور ۔ کے واقعات کا سلیقہ سے اظہار کیا گیا ہے۔ چھٹے سے نویں باب تک سیاسی بیداری کا آغاز اور حصول آزادی کی کوششوں کا اظہار ہے ویں باب میں بتلایا گیا ہے کہ ولندیزی اقتدار کے خاتمے کے بعد کس طرح انڈونیشیا جاپان کے زیر فرمان آیا اور اس کے بعد سولھویں باب ل آزادی کی جدوجہد کی وضاحت کی گئی ہے۔ سترھویں سے بیسویں باب تک آزاد مملکت انڈونیشیا کا قیام اور اصلاحات و ترقی کے ج د منازل کا تفصیلی ذکر ہے۔ اردو زبان میں انڈونیشیا پر ابھی تک اتنی مفصل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ فاضل مصنف اور ادارۂ

ثقافت اسلامیہ ہر دو قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کمی کو پورا کیا۔ (ا-ص)

سرسید اور اصلاح معاشرہ شاہد حسین رزاقی۔ ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ مجلد صفحات ۲۵۵۔ قیمت ۲۵ ر

ہمارے ادب میں سرسید پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لکھا جا رہا ہے اور نئے نئے زاویوں سے کارناموں اور ان کے دور پر روشنی ڈالی جاتی رہے گی۔ "سرسید اور اصلاح معاشرہ" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرسید نے کیسے معاشرہ میں آنکھیں کھولیں اس کو کتنا معیوب، نقائص سے بھرا ہوا اور کرم خوردہ پایا اور ایسے بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کے لئے انھوں نے ایسے قدم اٹھائے کہ ان کے نتائج بڑے دوررس رہے اور مستقبل پر اثر انداز ہوتے گئے۔ فاضل مصنف نے کتاب کو نو ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب دور سرسید میں مسلمانوں کی حالت پر ہے دوسرا معاشرہ کی اصلاح کا منصوبہ تیسرا تعلیم کی اصلاح و ترقی اور چوتھا دینی درستی پر پانچواں اخلاق و عادات کی اصلاح چھٹا رسوم و رواج میں مفید ترمیم۔ ساتواں تمدن اور طرز معاشرت میں تبدیلی جس کے یہ چند اہم عنوانات بھی آجاتے ہیں۔ غلامی کا انسداد۔ تعدد ازدواج، یتیم بچوں کا مسئلہ، وراثت کا مسئلہ اور بیواؤں کے نکاح کا مسئلہ وغیرہ

آٹھویں باب میں ملی اتحاد اور مذہبی رواداری کے تعلق سے بحث کی گئی ہے اور آخری باب میں عورتوں کے حقوق کا تحفظ تعلیم کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

غرض اس طرح سرسید نے اصلاح معاشرت کے لئے جو جو کارنامے انجام دیئے ان کا اس میں تفصیلی طور پر جائزہ لیا گیا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ہر پڑھا لکھا شخص کرے تاکہ سرسید جس قسم کا معاشرہ تیار کرنا چاہتے تھے اس کی تعمیر میں وہ اپنا حصہ ادا کرسکے۔ (

سیر افلاک حکیم احمد۔ ناشر انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) صفحات ۲۱۴ مع تصاویر مجلد مع گرد پوش قیمت یا

اردو میں سائنسی ادب کی بیحد کمی ہے۔ جب تک عثمانیہ یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ رہی سائنسی اصطلاحیں وضع ہوتی رہیں۔ کتابیں لکھی جاتی اور شائع ہوتی رہیں۔ جب سے جامعہ عثمانیہ مرحوم ہوچکی اور یہاں سے اردو کو خارج کردیا گیا اس کے بعد اصطلاحات کے وضع کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی نہ کسی قسم کا ادب شائع کرنے کی اور نہ اپنے طور پر کام کرنے والوں ہی کی کوئی حوصلہ افزائی ہو۔ مسرت ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند کے پروگرام میں سائنسی کتابوں کی اشاعت شامل ہے اور اسی کا ثبوت پیش نظر کتاب "سیر افلاک" ہے۔ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔ پہلا باب علم الافلاک کا تاریخی پہلو۔ دوسرا آفتاب۔ تیسرا چاند۔ چوتھا سیارے اس میں تیرہ فصلیں ہیں ہر سیارے کے لئے ایک فصل ہے اور دسویں فصل سیارہ ہائے کوچک پر ہے۔ گیارھویں دمدار ستارے، بارھویں شہاب ثاقب پر اور تیرھویں، نظام شمسی پر ہے۔ پانچویں باب میں ستاروں کا حال اور چھٹے میں فضائی فاصلوں، ساتویں میں کہکشاں کا اور آٹھویں میں کائناتی سحاب اور ستاروں کی تخلیق سے بحث ہے۔ نواں باب۔ عالم ہائے دیگر پر ہے دسواں نظام کائنات پر گیارھواں آئین اسٹائین کے نظریوں پر۔ بارھواں اجسام سماوی اور مسئلہ حیات پر اور تیرھواں ...

دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کے تراجم کے بعد ہمارے ادب میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جس میں اس قدر تفصیل کے ساتھ

ونے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب ماہرینِ فلکیات کے لئے نہیں بلکہ عام لوگوں کی دلچسپی کے لئے لکھی گئی ہے اور علم الافلاک کی
ادیات سے پوری طور پر آگاہی ہوجاتی ہے۔ اندازِ بیان نہایت دل نشین اور سلجھا ہوا ہے۔ اصطلاحات بھی اجنبی محسوس نہیں ہوتے
تے جہاں اجنبیت محسوس ہوئی کہ اس کی تشریح کردی گئی اس طرح یہ کتاب وقت کی بڑی ضرورت پوری کرتی ہے۔ فلکیات سے
سپی رکھنے والے تو یقیناً اس سے بہت کچھ استفادہ کرسکتے ہیں لیکن عام مطالعہ کرنے والے بھی اس کو دل نشین اور دلچسپ پائیں گے
یں امید ہے کہ یہ کتاب قبولیت عامہ حاصل کریگی۔ (ا۔ص)

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ صفحات ۲۳۸۔ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ۔ مجلد قیمت چھ روپے۔

اردو ادب کا ابتدائی دور مثنوی نگاری کا ہے۔ ہمارے شعرا نے نظم کرنے کے لئے اکثر و بیشتر ایسے قصوں کو پیش نظر رکھا ہے جو سنے
ے یا پڑھے ہوئے تھے اور یہ اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔ بعض مثنویاں ایسی بھی ہیں جنھیں گڈمڈ کردیا ہے کئی کہانیوں سے
یے لے کر اپنی کہانی کا پلاٹ تیار کیا ہے۔ اس امر کی تحقیق نہایت مشکل ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے قصوں کے ماخذ بتلانے ہیں۔ اپنی امکانی
ش کی ہے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب پورانک قصوں پر مشتمل ہے۔ جن میں نل دمن، شکنتلا اور سیتا و ساوتری
سرے باب میں قدیم لوک کہانیاں ہیں جن میں اکثر دکھنی مثنویاں شریک ہیں۔ مثنوی کدم راؤ، طوطی نامہ، مینا ستونتی، کنور منوہر اور
دھومالتا، لعل و گوہر کامروپ و کام کلا سنگھاسن بتیسی وغیرہ شریک ہیں۔ تیسرے باب میں نیم تاریخی قصے ہیں جن میں ہیر رانجھا، سسی پنوں
ماوت، چندر بدن، ستھو پاسنی اور طالب و موہنی وغیرہ شریک ہیں۔ چوتھا باب ہند ایرانی قصوں پر مشتمل ہے۔ جن میں پھول بن
البیان اور گل بکاؤلی کا ذکر ہے۔ دوسرا حصہ ضمیموں پر مشتمل ہے جن میں اضافے تصحیحات اور استدراکات شامل ہیں۔

ڈاکٹر نارنگ نے ان میں صرف وہی مثنویاں شامل کی ہیں جن کا پلاٹ ہندوستانی ہے یا ہندوستانی فضا اور ماحول سے متاثر ہے۔
مثنویوں کے بارے میں اس زاویہ نظر سے کبھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر نارنگ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا
ال الدین احمد جعفری اور پروفیسر سروری نے اپنی تصانیف میں مثنوی کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے لیکن یہ پہلو کہ قصوں میں ہندوستانیت
کہاں تک دخل ہے نظر سے اوجھل رہا۔ ڈاکٹر نارنگ نے اردو کی تقریباً تمام مثنویوں کا جائزہ لیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ہمارے شعرا نے
ستان عشق بیان کرتے ہوئے اپنے دور کی کتنی ہی سماجی تہذیبی اور معاشرتی کیفیات اور رسم و رواج اور روایات کو اپنے کلام کے
یعہ مثنویوں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا ہے۔

یہ ایک بہت بڑا کام تھا اور ڈاکٹر نارنگ نے اس کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے "اردو مثنویاں" تحقیق و تنقید کا ایک شاہکار
ر ادب میں حیات دوام پانے کی مستحق ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ کوئی کتب خانہ اس سے خالی نہ رہے گا۔ (ا۔ص)

شعرِ امین (پنڈت سروپ نارائن رازداں امین امرتسری کی غزلوں کا انتخاب)

مرتبہ:- منوم دہلوی صفحات۔ (۹۶) (کتابی سائز) قیمت:- ایک روپیہ آٹھ آنہ
ناشر:- دارالادب رونق ۹ ۱۲۳۹/۱۲ شورہ گلی، سوہن گنج، سبزی منڈی دہلی

شعرِ امین جناب بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی اور پنڈت تلوک چند محروم نے ..... امین صاحب کے کلا رائیں دی ہیں۔ منور صاحب لکھتے ہیں کہ "شعرِ امین میں بھی پایہ غزل کا ہے اور شرابِ معرفت اور حقیقت کی۔ تمام رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور روحانیت ہر شعر میں سموئی ہوئی ہے" منور صاحب کی ان چند سطروں سے ہم بھی متفق ہیں کہ اس مادی دور میں روحانی قدروں کا لاکھ فقدان ہو، یہ قدریں کبھی فنا نہیں ہو سکتیں اور اگر اردو میں میر کا خو غالب اور آتش کا صوفیانہ کلام صدیوں زندہ رہ سکتا ہے تو یقیناً امین صاحب کے اس کارنامے کو بھی بقائے مستحق ہونا چاہیئے۔

پنڈت تلوک چند محروم رقمطراز ہیں کہ "حضرت امین امرتسری مشاق سخنور ہیں۔ غالباً ان کی شاعری کی عمر کی عمر سے بھی زیادہ ہے۔ جہاں تک شاعرانہ محاسن کا تعلق ہے کلام امین تراکیب سے مستغنی ہے وہ کہنہ مشق صاحبِ فن ہیں۔ مختلف خفیف اور طویل بحروں میں وہ دلکش نمونے پیش کئے ہیں کہ پڑھ کر طبیعت پھڑک اٹھ
جناب امین کشمیری پنڈت گھرانے سے عبارت ہیں۔ اگست ۱۸۸۱ء میں بمقام گوالیار آپ کا جنم اور لاہور میں تحصیل علم سے آراستہ ہوئے اور بی۔ اے کامیاب کیا۔ فارسی اور اردو سے ابتدائی شغف، آزادی میں حصہ بھی لیا۔ جیل بھی گئے۔ جنگ کی شغفت کے ساتھ شاعری سے بھی شغف ہا۔ ڈرامے لکھے، ک کی ادارت بھی کی اور ساتھ ہی ساتھ ویدانت اور تصوف بھی سیکھا۔

امین صاحب کے کلام میں بقول ان کے ایک قطرے کے سمندر کی وسعت ملتی ہے۔

تنگ سی وسعتِ غزل کی اور ادھر — عشق و عرفان کے مضامین بلند
جمع کر کے شعرِ امین میں انھیں — کر دیا دریا کو اک کوزہ میں بند

چند حسبِ حسبتہ شعر ناظرین کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر صاحبِ فکر اور صوفی مزاج کو شعرِ امین کے روحانی رموز و نکات کو منکشف کرنے میں پوری طرح مدد و معاون ثابت ہوگا۔ کلام کے آخر میں اشعار کے بعض پہلوؤں کی تشریح بھی موجود ہے۔

چند شعر:-

نصیب ہوتے ہیں جلوے ہزار کاوش سے — اسی سے سینۂ مشرق لہو لہو دیکھا
جڑے نہ پھر اس دلِ برہم سے مانگی کس نے — پھر صدا شیشے کی آنے لگی کہساروں سے
تو بھی باقی، تیری رحمت بھی ہے باقی باقی — ہنس دیئے ہے مئے عصیاں کا بڑا سامنا مجھے
تیری نمازِ عشق نہ ہوگی کبھی قبول — امین جو پہلے دیدۂ تر سے وضو نہ ہو
بندہ سا نیاز مند ہو تجھ سا ہو بے نیاز — یارب اس آستاں کے مقابل کا سر تو ہو

(وقار خلیل)

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

سب رس کا زورؔ نمبر
معاصرین کی نظر میں

کتابی دنیا۔ کراچی یہ ۵۰۴ صفحات کا زورؔ نمبر ہے اس میں مرحوم کے دوستوں، عزیزوں اور مداحوں نے اپنے اپنے تاثرات تحریر کئے ہیں۔ لکھنے والوں میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، لیکن ان سب نے بہ حیثیت انسان کے اور اردو کے خادم کے مرحوم کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ مختلف مضامین پڑھنے کے بعد زورؔ کی عظمت کا نقش دل میں بیٹھ جاتا ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ اپنی ذات سے ایک ادارہ تھے۔ اس مختصر سی عمر میں ان کے گوناگوں کارناموں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ عثمانیہ یونیورسٹی کے معنوی فرزند تھے۔ ان کی وجہ سے عثمانیہ یونیورسٹی جیسی مادر علمی کی عزت دل میں جم جاتی ہے۔

اس نمبر کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں نثری مضامین، دوسرے میں نظمیں اور تیسرے میں خود زورؔ مرحوم کے کچھ مضامین وغیرہ ہیں۔ یہ نمبر جامع ہے اور زورؔ صاحب کی پوری شخصیت اس میں آگئی ہے۔ یہ نمبر متعدد تصاویر سے مزین ہے۔ سب رس نے یہ ضخیم نمبر شائع کرکے اپنا وہ حق ادا کیا ہے جسے صرف وہی ادا کرسکتا تھا۔

نگارش۔ کراچی۔ سب رس کا یہ زورؔ نمبر اکتوبر، نومبر، ڈسمبر کے شماروں کا مجموعہ ہے جو ۴۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ ادارہ کے اس ترجمان میں کم و بیش ۵۲ تصاویر ہیں اور نثر اور منظومات میں اس محسن اردو کے حالات بالتفصیل دئے گئے ہیں مرحوم کو ایک اچھے انسان محقق، عالم، شاعر، ادیب، استاذ، دوست، مورخ، اردو ادب، دکنی اردو ادب کے محقق، اردو لسانیات کے ابو الابا اور نقاد کی حیثیت سے متعارف کرانے میں کوئی پہلو فرو گزاشت نہیں کیا گیا۔ ایک عظیم شخصیت کیلئے جس معیار کے نامور اہل قلم کو خراج تحسین و عقیدت پیش کرنا چاہئے وہ سب اس شمارہ میں آتے ہیں۔

سب رس حیدرآباد دکن کا یہ زورؔ نمبر مرحوم کے حالات خدمات اور سرگرمیوں کو اجاگر کرنے میں کسی پہلو سے بھی تشنہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ مرحوم کے ان مٹ شاہکاروں کی طرح یہ بھی ایک شاہکار بن گیا ہے اور ادبیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس شمارے کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر زورؔ کے منتخب مضامین، خطبات، خطوط، غزلیں اور مقالے شامل کئے گئے ہیں جن کے

سب رس

مطالعے سے ان کے تحقیقی تجسس کے جذبہ بے پایاں کا پتہ چلتا ہے ان کی علمی ادبی کاوش ذہنی پرواز کی بلندی یہ تمام تنے مرحوم کو اپنے متعین میدان میں نشیب و فراز پر پورا پورا عبور حاصل تھا اور ادب کی خدمت کا کس قدر جذبہ ان کے میں جاگزیں تھا اس سلسلے میں ان کے معاصرین نے جو کچھ سپرد قلم کیا ہے وہ شمارہ میں درج ہے۔ مرحوم کی شدید ادبا، یہ روشن ثبوت ہے جس کا اعتراف ان عظیم قلمکاروں نے کیا ہے اس لحاظ سے اس پرچے کا معیار اور بلند نظر آتا ہے۔ ا ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے یہ نمبر شائع کرکے اردو ادب میں جان ڈال دی ہے اور ڈاکٹر مرحوم کی تخلیقات کو قدیم ا ادب کے درمیان ایک مضبوط کڑی ثابت کر دیا ہے۔ ڈاکٹر زور کی وفات سے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اردو ادب دور ختم ہو گیا اور یہ دور زور کی کاوشوں کے سبب بڑا زوردار رہا۔

سب رس زور نمبر کی کتابت، طباعت، سرورق اور تصاویر بلاشبہ قابل تحسین و ستایش ہیں اس ضخیم شمارہ قیمت چھ روپے ہے جو اتنے قابل قدر اور قابل مطالعہ نیز لائبریریوں میں رکھنے کے قابل پرچے کے لئے بہت اُردو سے محبت رکھنے والوں کے لئے یہ نایاب تحفہ ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا اُردو ادب میں جو مرتبہ ہے اور انہوں نے اردو زبان و اد

جامعہ ۔ دہلی جو بے لوث خدمت کی ہے وہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔ مرحوم کے قائم کردہ ادارہ ادبیات ا زور نمبر شائع کرکے ایسی خدمت انجام دی ہے جو تمام اردو دوستوں کے شکریہ کی مستحق ہے۔

ادارہ ایوان اُردو نے زور نمبر نکال کر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی یا

صبح اُمید ۔ بمبئی کر دی جنھوں نے اپنی ساری عمر اُردو ادب کی ترویج اس کی ترقی اور اس کے لئے ایسے کئے جو ہمیشہ اُردو کو نئی روح دیتے رہیں گے۔

آجکل لوگ خصوصاً ادبائے ملک اپنے نجی معاملات اور زمانہ کے سرد و گرم میں اس قدر منہمک نظر آرہے ہیں اس کام کے لئے وقت نکالنا اور کچھ لکھنا "کارے دارد" کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر جن حضرات نے زور نمبر کیا اشاعت کے لئے بھیجا ہے وہ قابل مبارکباد ہیں۔ کیونکہ انھوں نے نہ یہ کہ اردو کی خدمت انجام دی ہے بلکہ انسان عالم باعمل ہستی کو جس نے اپنی ساری عمر علم و ادب کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ اگرچہ اب ہماری جیتی جا موجود نہیں ہے۔ مگر اس کے کارناموں کو زور نمبر کی صورت میں حیات جاودانی بخشی ہے۔

کتابت، طباعت، ترتیب مضامین، تصاویر۔ ہر چیز جاذب نظر ہے اور اس میں وہ سارا مواد جو کبھی ایسے وقت ضرور کام آئے گا۔ جب کبھی اردو ادب کی بقا اور اس کے بے لوث خادموں کی کوئی السائ مرتب کی جاسکے گی۔

سیاست ۔ حیدرآباد۔

ترتیب کے لحاظ سے یہ یادگار مجلہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں زور صاحب کی شخصیت اور فن کے بارے میں تاثرا
قیدی مضامین خطبات اور شاعری کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام مشاہیر نے زور صاحب کی وفات پر جو
ت شائع کئے تھے یا رسالوں نے جو اداریے لکھے تھے ان کے اقتباسات جگہ جگہ دئے گئے ہیں۔ اس طرح اسی ایک ہی رسالہ
ور صاحب پر مکمل مواد فراہم کر دینے کی سعی کی گئی ہے۔

زیر نظر رسالہ میں جو اہل قلم شامل ہیں وہ سب کے سب زور صاحب سے خلوص رکھنے والے ہیں۔ اس لئے اکثر مضامین
تی ہیں۔ اور بہت عمدہ۔ ان میں ڈاکٹر زور بحیثیت استاد، رفیق کار، ادیب و ادیب گر نمایاں نظر آتے ہیں۔
آئندہ کوئی شخص ان کی سوانح عمری لکھنا چاہے تو ان سے بہترین مواد اخذ کیا جا سکتا ہے۔ تنقیدی مضامین میں زور
ب کے کارناموں کا جائزہ لینے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن یہ کام مستقبل کا نقاد ہی بہتر کر سکتا ہے۔

ان لکھنے والوں میں بعض ایسے پرانے رفیق اور شاگرد ہیں جو پچھلے چند برسوں میں حیدرآباد سے دور چلے گئے۔ جیسے
اہ حسین، بدر شکیب، نظر مرحوم بعض لکھنے والے ان کے روزمرہ ملنے والوں میں تھے جیسے محمود حسین، اکبر الدین صدیقی
یٰسین علی خاں نے زور صاحب کی کمی کو شدت سے محسوس کیا ہے اور کروایا ہے۔ ان میں جو شخصیت کا عنصر ہے وہ بہت
یر ہے۔ بعض لکھنے والے ایسے ہیں جو ملاقات گاہے گاہے رکھنے والے تھے ان میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر رحیم الدین
ے مضامین میں ندرت اور دلکشی بھی ہے اور چونکا دینے والی باتیں ہیں۔ پھر ان کے پرانے ساتھی ہیں مثلاً پروفیسر سید محمد
طرح شریک کار رہے۔ ایسے نیاز مند بھی موجود ہیں جنہیں آگے بڑھانے اور حوصلہ دلانے میں زور صاحب پیش پیش رہے۔
ب نے اپنے اپنے طور پر زور صاحب کو جیسا پایا اور آج جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں اس کا بے کم و کاست حال لکھا ہے۔
ات یہی ہے کہ اچھے لوگ وہی ہیں جو مرنے کے بعد بھی اسی خلوص اور محبت سے یاد کئے جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں "سب رس" جیسا ادبی رسالہ، ایوان اردو جیسی خوبصورت اور صوری، معنوی خوبیوں سے متصف
، ادارہ اور اس کی مطبوعات اور خود زور صاحب کی بیش بہا علمی خدمات ان کا نام روشن رکھنے کو کافی ہیں
ۓ جو ذمہ داری ادارہ کے کارکنوں اور ان کے جانشینوں پر عاید ہوتی ہے وہ یہ کہ جس مقصد کے پیش نظر وہ کام
تھے وہ پورا ہو جائے۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہونا ہی فن کار کی اصلی کامیابی ہے اور زور صاحب جیسے مجاہد کی فتح۔
زور صاحب نے زندگی بھر دکنی ادب اور اس کی تہذیب سے عشق کیا۔ بڑی لگن سے وہ یہی کام کرتے رہے۔ وہ
تھے کہ یہاں کے اہل قلم بیدار ہوں اور اردو کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کریں اور اپنی شخصیت منوائیں۔ ان کی
ے یہی سبق ملتا ہے کہ یہی جذبہ اب بھی برقرار رہے۔

ان کی جو کتابیں اب نہیں ملتیں ان کو دوبارہ چھاپنا۔ ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کو منظر عام پر لانا اور ان
مورے کاموں کو پورا کرنا ادارہ کے اولین مقاصد میں ہونا چاہئے۔ یہ ہمیں یقین ہے کہ یہ سب کام

سب رس

ادارہ کے کارکن بہت اچھی طرح کرسکتے ہیں۔

خاتون دکن۔ حیدرآباد۔

زیر نظر شمارہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں زور صاحب کی شخصیت اور فن کے بارے میں تاثراتی اور تنقیدی مضامین، خطبات، خطوط اور شاعری کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ زور صاحب کی وفات پر جو بیانات ملے تھے انھیں شائع کیا گیا ہے۔ مختلف پرچوں نے ان کی وفات پر جو اداریے لکھے ان کے اقتباسات جگہ جگہ دیئے گئے ہیں۔

زور نمبر میں ان کے دیرینہ رفیقوں اور احباب نے تصنع کے بغیر جس دیانت اور کاوش سے ان پر مضامین لکھے ہیں ان کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔

یہ نمبر ایک محسن ادیب کی خدمت میں ہدیہ عقیدت سے زیادہ گراں قدر ادبی دستاویز ہے۔

زور نمبر ایوان اردو کا موقر مجلہ ہے۔ کاغذ عمدہ صفحات ۴۰۳ چھپائی اور ترتیب میں سلیقہ برتا گیا ہے

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۶)

شعلۂ حیات" پندرہ روزہ

جہانگیر آباد۔ بھوپال ۔ ایڈیٹر: یم، عرفان زرسالانہ: ۴ روپے

"شعلۂ حیات" ایک سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔ بھوپال کی ادبی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے بارے میں اس رسالہ سے کافی اہم اور ٹھوس معلومات ملتی ہیں۔ مضامین کے تنوع کے سبب شعلۂ حیات کا شمار اردو کے دلچسپ اور معیاری رسائل پر کیا جاسکتا ہے۔ عرفان صاحب کو بھوپال کی صحافتی اور سیاسی زندگی میں خاص مقام حاصل ہے۔ اور موصوف اردو کے مستعد اور بے لوث کام کرنے والوں میں سے ایک ہیں۔ دیرینہ تجربہ رکھتے ہیں اس لئے یقین ہے کہ شعلۂ حیات کو بہتر سے بہتر بنائیں گے۔

دھندلکے (مجموعۂ کلام عامر شیبانی)

صفحات ۱۲۸ (مجلد) قیمت۔ دو روپیے (کتابت اور کاغذ معیاری) ملنے کا پتہ: عامر شیبانی، باقر منزل حیدرآباد دکن (اے پی)

عامر شیبانی کا نام اس مجموعے سے پہلی بار سامنے آتا ہے۔ اس سے پہلے ان کی کوئی چیز رسائل و جرائد میں نظر سے نہ گذری۔ دھندلکے" عامر کی ۶ نظموں، ۱۲ قطعات اور ۲۳ غزلوں پر مشتمل سرمایہ سخن ہے۔ فکر میں دھیما پن ملتا ہے۔ قطعات بعض ہیں مگر نظموں کے باب میں جہاں فکر کی بلندی اور رفعتِ خیال ملتی ہے۔ وہیں "شکیب ایک رات کا" جیسی پست نظم بھی آتی ہے۔ غزلوں میں فکر اور شعور کی وہ آنچ نہیں ملتی جس سے فن عبارت ہے۔ مجموعی طور پر عامر صاحب کے دھندلے دامن میں فکر کی دھیمی دھیمی روشنی رکھتے ہیں۔

برق موسوی صاحب نے "مقدمہ نگاری" کا فرض انجام دیا ہے اور اپنے عزیز و خاکسار عامر کے بارے میں تو کچھ کم ہی کہا مگر چند ایک سخن گسترانہ پہلوں کی طرف توجہ مرکوز کراتے ہوئے ادب، ترقی پسندی، غزل کی تعریف اور اس کے ترقی کے رجحان، اشتراکیت و مذہب کے مسائل بھی زیر بحث لائے ہیں۔

روقار خلیل

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء   فون نمبر (۳۵۲۰۹)

جلد (۲۷) شمارہ (۴)   اپریل سنہ ۱۹۶۴ء

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

نگران:- (پروفیسر) عبدالمجید صدیقی

مجلس مشاورت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، نصیرالدین ہاشمی

[illegible] مسکینہ، منظور احمد، وقار خلیل

معتمد:

محمد اکبرالدین صدیقی

زرِ سالانہ ۶ روپے ششماہی ۳ روپے

غیر ممالک سے ۱۰ شلنگ

فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیاتِ اردو کے اہتمام سے

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر دفتر ایوانِ اردو

خیریت آباد، حیدرآباد دکن ۴ سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

یو پی کی حکومت نے حصول آزادی کے بعد سے آج تک اردو زبان کے حقوق کو نہ صرف یہ کہ پس پشت ڈ
بلکہ انھیں پامال کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ یو پی کے اردو بولنے والے عوام نے ہر جائز اور قانونی کوششیں کیں ا
آواز ارباب مقتدرہ تک پہنچائی۔ لاکھوں دستخط کر کے صدر کے حضور میں پیش کئے۔ لکھنؤ میں ۱۹۶۲ میں سالا
کنونشن کا انعقاد عمل میں آیا اور پنڈت آنند نرائن ملا نے اس میں اپنا بصیرت افروز اور حقیقت سے مملو خطبہ د
جس میں سہ لسانی پالیسی پر اس طرح تنقید کی کہ ہماری ریاستی حکومت کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی سیاسی
کی بنا پر یہ چاہتی ہے کہ ہمارے اسکولوں میں ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس میں اردو کیلئے ترقی کرنا تو بڑی بات
رہنا بھی مشکل ہو جائے اور یہ سخت جان پھر بھی جئے تو سسک سسک کر جئے۔"

پنڈت ملا جج رہ چکے ہیں انھوں نے اپنے خطبے میں ایک اور جج کی رائے بھی اردو کے بارے میں پیش ک
۔ بتلایا ہے کہ ریاستی حکومت اردو کے قاتل کا روپ دھار رہی ہے۔ یہ رائیں اس لئے بھی وزنی ہیں کہ ان کے
والوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عدل کی میزان کو تولتے ہوئے گذارا۔ قانون ان کا اوڑھنا بچھونا رہا اور وہ بات کے
زندگی بھر اس قدر محتاط رہے کہ کبھی قانونی حدود دائرہ حق سے گذرنے نہ پائے زندگی بھر کبھی حکومت پر نکتہ چی
اور جب عدالت کی کرسی سے ہٹے تو اردو کی مظلومیت کو شدت سے محسوس کیا اس کو بے کس و بے بس پایا اور خو
سہارا بن گئے۔

ابھی ابھی لکھنؤ والوں نے پھر ایک اردو کنونشن منعقد کیا۔ اس میں الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک سابق رکن جسٹس مسٹر ایس پی
اپنے خطبے میں واضح طور پر یہ کہا کہ جب تک اس زبان کو اس کا جائز مقام نہ دیا جائے قومی اتحاد و یک جہتی کا حصول
یہ بات صرف جسٹس موصوف ہی نے نہیں کہی بلکہ اور بھی ذی علم اہل الرائے حضرات نے کہی ہے اس سلسلے میں پچاسوں اخبارات اور
اداریے لکھے اور واضح طور پر بتلایا کہ قومی یک جہتی اور اردو سے اختلاف کے تصورات متوازی خطوط پر چل رہے ہیں بالفاظ
اردو کی تائید و حمایت قومی یک جہتی کی مرادف ہوگی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ارباب اقتدار کیا کرتے ہیں اور اس کنونشن سے کہاں تک اثر قبول
کو اس کا حق دینے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں اور بانیان کنونشن کس طرح انھیں معترف کرا سکتے ہیں امید تو نہیں کہ وہ کوئی اثر قبو
لیکن مطالبہ کو تو آگے رکھنا ضروری ہے۔ آج نہ سہی کل تو عوام کی آواز کو سننا پڑے گا ورنہ نتیجہ دیکھنے کیلئے
ہوگا کہ انتخابات بہت قریب آگئے ہیں۔

قاضی عبدالودود

جہان غالب

۱) نوائے وطن۔ شاد عظیم آبادی بقول خود ۱۸۴۶ء میں متولد ہوئے اور ان کا سال وفات ۱۹۲۷ء ہے۔ ان کی کتاب نوائے وطن ۱۸۸۴ء میں چھپی تھی اور اس پر ان کے وطن میں بڑی لے دے ہوئی تھی اس میں چند شعرا کے حالات و کلام اور اور چند شعرا سودا، میر مصحفی جرأت، ناسخ و آتش وغیرہ کے صرف اشعار ہیں۔ غالب کا نہ حال ہے نہ کلام لیکن ان کی نثر سے متعلق عبارات ذیل مرقوم ہیں۔

۱۸۶۰ء کے بعد کا زمانہ مبارک زمانہ ہے نثر اردو کا پتلا بیجان تھا۔ دفعتہً ایسی جان بخش نسیم چلی کہ اس سو برس کے غنچہ پژمردہ میں یکایک طراوت آگئی زبان نے اپنا پیرایہ بدلا اور ایشیائی مضامین نے یورپ کا لباس پہنا۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ سب سے پہلے کس عالی خیال نے اس طرز تحریر کے میدان میں سمند ہمت کو جولان کیا اور اس عمدہ انداز کا بانی مبانی ٹھہرا، مگر ظاہرا اسد اللہ خاں غالب نے اردو میں دوستوں کو خط لکھنے شروع کئے۔ اس کی شوخی تحریر متانت الفاظ سادے سادے محاوروں کے ساتھ نہایت اثر انگیز ہیں بعض خط پتا بتاتے ہیں کہ میری پیدائش کا زمانہ ۱۸۵۰ء تھا ان کے اردو رقعوں کا کلیات اردوئے معلیٰ ہر جگہ مل سکتا ہے۔ ص ۱۵

اس کتاب میں شعرا کے حالات و کلام اور نثر اردو کے ذکر کے علاوہ اور مباحث بھی ہیں۔

۲) مکتوبات شاد عظیم آبادی (طبع ۱۹۳۹ء) میں کل خطوط یا باستثنائے بعض شاد کے استاد فریاد کے بیٹے ہمایوں مرزا مرحوم کے نام ہیں۔ اس کتاب میں غالب کا ذکر کئی خطوط میں ہے اور یہ سب اس زمانے کے ہیں جب "حیات فریاد" لکھی جا رہی تھی۔

(الف) غالب کی لائف۔ ۔ ابھی سن ہیں۔ ۔ حالی نے لکھی ۔ ۔ ۔ انھوں نے بہت کچھ مجھ سے رائے لی تھی۔ دہلی میں اس وقت تک دس بارہ ذی علم غالب کے شاگرد مدد دینے والے اس پر نواب احمد سعید خاں ۔ نے ایک ہزار روپیہ صاف کرنے اور مسودے کی درستی کیلئے دیئے اور ایک ہزار کتاب کی چھپائی۔ حالی نے ایک خط میں مفصل لکھا تھا میری حالت اس کے بالکل برخلاف اور رسالہ دہلی و پنجاب وغیرہ کے نقادوں کا اگر کم سے کم ناخبر نہ ہوں تو مجھ پر حیف در اگر موازنہ کلام میں غالب سے ۱۹ بھی ہو تو مجھ پر لعنت اور میرے مر جانے کی جگہ ہے۔ حضرت میر جو کلام تلف ہو گئے اب اس کا رونا بیکار ہے۔ میری یہ کتاب قائم مقام انکی ہو جائیگی۔ خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں میری کیا مجال ہے

سب رس

والمعاصین کی روح مد دبیچار ہی ہے صرف دو اساتذہ کامل کی غزلوں کا موازنہ وہ بھی چوٹی کی جس پر۔ حالی نے میا کیا ہے اور غالب کو سمودار۔۔ من جملہ بہت سے موازنے کے بھیجتا ہوں۔ مجبور ہوں کہ روپیہ میرے پاس نہیں" ص ۱۸۳

غالب خانخانان نظیری وفریاد۔۔ کی دو دو غزلیں۔ روانہ کرتا ہوں ان کے نقادان فارسی کو دکھائیں۔ ص ۱۸۵

(ب) حالی۔۔ نے غالب کیلئے بقول انھیں کے ۱۸ برس تک کانٹ چھانٹ کی اور لوہارو (د) والے نواب سعید احمد نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، وکوشش کا ٹھکانہ رکھا باتیں بہت بنائیں مگر جوے کی وجہ سے قید میں جانا اور محض بیقید ہو نسکے۔ دوسرا تکلف سنئے کہ خود غالب کا خط نقل کرتے ہیں کہ میں دیگر صحابہ کو کچھ نہیں سمجھتا۔ میرا اعتقاد یہ ہے کہ بعد خلیفہ بلافصل علی ثم الحسن ثم الحسین الیٰ آخرہ اور پھر آخر میں تفضیلی سنی بتاتے ہیں۔۔ غالب کی سوانح عمری سے ا تو باطل" ص ۱۹۹

(ج) فارسی والی موازنے کی غزلیں جو میں بھیج چکا ہوں اور جن پر مجھ کو دعویٰ ہے کہ بلاشبہ غالب سے تو ہیں اور شاید نظیری۔ وظہوری سے بہتر نہ ہوں تو کم بھی نہیں" ص ۲۳۱

(د) فریاد اکثر فرماتے تھے کہ میں حیران ہوں کہ غالب ایسے توڑ مروڑ کر شعر کیوں کہتا ہے کہ سیدھی سی بات گردیتا درانحالیکہ فلسفہ الہیات کے رموز سے کلام اس کا خالی ہے۔ صرف سن لیا کہ تصوف وحدت وجود کا نام ہے و

۱ احمد سعید خاں کے متعلق مکتوبات میں جو کچھ ہے وہ ایسی صورت میں قبول ہو سکتا ہے کہ ثبوت میں حالی کا ہو ۲ شاد نے اپنا کچھ کلام حیات فریاد میں فریاد کی طرف منسوب کر دیا تھا، یہ مکتوبات سے قطعاً ثابت ہے اور اس گنجائش نہیں، شاد جن اشعار کو غالب کے اشعار پر ترجیح دیتے ہیں وہ ہی اشعار ہیں ۳ غالب نے کہیں وہ بات ان کی طرف منسوب کی ہی نہیں لکھی اور نہ یہ یادگار غالب میں ہے غالب نے حضرت علیؑ کو دوسرے صحابہ پر تر دی ہے۔ یادگار غالب اس وقت سامنے نہیں مگر جہاں تک مجھے یاد ہے حالی غالب کو تفضیلی سنی نہیں شیعی کہتے ہیں ذہن میں غالب کی جو عبارت ہے وہ یہ ہے مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ اور امام "بعدہم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود" (خط بنام علائی) غالب کا ایک فارسی خط بنام ؟ گلیس مطبوعہ مجموعہ ں پر مشعر ہے کہ وہ خلافت و امامت میں فرق کرتے تھے، اور ان کی رائے میں خلفائے ثلاثہ صرف خلیفہ تھے امام نہ تھے حضرت علیؑ کی ذات میں امامت و خلافت جمع ہوئی۔ یہ اصلی عقیدہ غالب کا تھا یا نہیں، یہ وہ جانیں۔

۴) حیات فریاد کا ذکر آچکا ہے۔ یہ شاد کے زمانہ آخر کی تالیف ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

(۱۱) "چند سال پہلے۔ غالب کلکتہ گئے تو۔ بعض بے دخلیاں بھی وقوع میں آچکی تھیں۔ اس نے زبا نے ذہنیت گمان ہند کی طرف سے نظر توجہ پھیر لی تھی مرزا صاحب پر کثرت سے اعتراضات زباندان و شعراء عجم تہ قتیل و واقف۔ ۔ ۔ بہار بڑے پائے کے لوگ تھے۔۔ بعد۔ خسرو کے اگر ہند کے شعراء فارسی گو میں سے کم

تک پہنچا ہے تو واقف . . . وقتیل کا . . واقف . . . نے . . . حزیں . . کو . . . دالہ و شیدا بنا لیا تھا ۔ قتیل تنا بڑا فاضل و زبان فارسی کا محقق ہے کہ ملا گل محمد مکرانی نے بہ قتیل کو میرزا ئے اصفہانی کا لقب دیا تھا اور ان کی فارسی دانی کے قائل تھے ۔ کلکتہ میں . . . غالب تو بداخلاقی کا کوئی جملہ (کذا) ایسا نہ تھا کہ ان باکمالوں کے حق میں اپنی زبان سے نہ نکالا ہو ۔ حتیٰ کہ فیضی . . . کی شان میں بھی جس کو اساتذہ عجم نے سرتاج مانا ہے ۔ مرزا صاحب نے ایک لفظ کو یہ فقط زبان ہی سے نہیں کہا بلکہ چھپوایا بھی یعنی فارسی زبان میں کہیں کہیں میاں فیضی کی بھی ٹھیک نکل جاتی ۔ ٹھیک نکل جانا ایک قسم کی گالی ہے غالب نے یہ خیال کیا ہوگا کہ . لوگ یہ خیال کریں گے کہ جب یہ شخص قتیل و واقف و فیضی کو اپنی نظروں میں نہیں لگاتا تو ضرور بڑے پائے کا محقق ہوگا مگر نتیجہ برعکس نکلا ۔ اکثر قتیل کے بالواسطہ و بلاواسطہ تلامذہ اور واقف کے معتقدین موجود تھے اس کے علاوہ فیضی ایسے باکمال کو جس کو سارا ہندوستان بلکہ ایران مان رہا ہے کتاب بہار عجم پر کلکتہ والوں کا دار و مدار تھا اس نے غالب کی کثرت سے غلطیاں نکال نکال کر . موجودہ کملائے ایران سے استشہاد کرنا شروع کر دیا مرزا . . پراگندہ خاطر ہوئے اور علی اکبر خاں . . . کے پاس . . گئے سب قصہ سن کر فرمایا کہ آپ کو اس کی ضرورت کیا تھی کہ قتیل و واقف و صاحب بہار عجم کے پیچھے پڑ گئے اور سخت و سست کلمات سے ان کملائے فن کو برا بھلا کہا آپ نے بھیڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے اور بعض اعتراضوں کا جواب ہو نہیں سکتا اس واقعے کے لکھنے سے میری غرض یہ ہے کہ برخلاف مرزا ہمارے حضرت (فریاد) جب کلکتہ تشریف لے گئے ۔ کبھی کسی باکمال کی نسبت ایک لفظ خلاف اخلاق یا اعتراضاً اپنے منہ سے نہ نکالا ص۹

۱؎ یہ مطلقاً ثابت نہیں کہ مخالفین غالب نے کسی ایرانی سے استشہاد کیا بلکہ غالب کا قول ہے کہ مرزا کامران (ایرانی) نے غالب کا ساتھ دیا تھا ۔ ۲؎ فیضی کے متعلق ٹھیک نکل جانے والا جملہ ایک اردو خط میں ہے جو واقعہ کلکتہ کے بہت بعد کا ہے ۔ یہ مطلقاً ثابت نہیں کہ غالب نے اس زمانے میں کوئی بات فیضی کے خلاف کہی تھی ۔ بعد کو ایک جگہ انھوں نے فیضی کے مستند ہونے کا بھی اقرار کیا ہے ۳؎ یہ بھی ثابت نہیں کہ غالب نے اس زمانے میں بہار کے خلاف کچھ کہا تھا ۔ علی اکبر خاں کی طرف جو قول منسوب ہے اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ۴؎ یہ بالکل غلط ہے کہ کثرت سے اعتراض ہوئے تھے دو چار اعتراض ہوئے تھے اور کوئی بجا نہ تھا (اول فارسی سے بحث نہیں) ۶؎ گل محمد خاں شاید ہی زمانہ قتیل میں لکھنؤ گئے ہوں اس کا ثبوت موجود نہیں کہ میرزائے اصفہانی کا لقب دیا تھا ۔

(ب) گل محمد مکرانی آصف الدولہ کے زمانہ سلطنت (کذا) میں لکھنؤ آ کر مقیم ہو گئے میں یہ نقل ایک ایسے شخص سے سنی جو جانتا تھا اس صحبت میں شریک تھے جس کو . . حالی . . . نے . . حیات غالب (کذا) میں تحریر کیا ہے . . غالب . . لکھنؤ میں اپنی فارسی مثنوی پڑھ رہے تھے کسی گوشے میں گل محمد . . بھی . . تھے . . مرزا . . . نے ایک شعر کہا تھا جس کا پہلا مصرع یہ ہے ۔ ذرک مشو بچہ زدن ساز کرد "ظاہر ہے کہ مرد کو بچہ نہیں ہوتا . . ملا . . . نے فوراً تو کا کہ اسے واہ اچھا تاویہ سیئے غولک بچہ نزار دبگو جز من شد بچہ زدن ساز کرد ص۹

ملا کے حالات جہاں تک معلوم ہیں وہ اس کے منافی ہیں کہ زمانہ آصف الدولہ میں لکھنؤ آ کر مقیم ہوئے ہوں اس زمانے میں تو شاید پیدا بھی نہ ہوئے ہوں یا ہوئے ہوں تو ان کی طفولیت کا دور ہو۔ بہر حال لکھنؤ میں قیام تیرھویں صدی کے ربع ثالث کا واقعہ ہے نہ ملا اور غالب کا معاملہ نہ لکھنؤ میں پیش آیا اور نہ دونوں میں اس بارے میں بالمشافہ ملاقات ہوئی۔ ملا نے غالب کے مصرع پر اصلاح بھی نہیں دی اور یہ اصلاح غلط بھی ہے۔

ایک صورت امکان سے دور ہو گئی تھی کسی کے غصہ ہونے کی بات ہی نہیں۔ ملا دہلی میں رہ چکے تھے۔ غالب سے ان کے تعلقات تھے لکھنؤ جانے کے بعد انھوں نے غالب کی مثنوی دیکھی اور دوستانہ طور پر ایک خط میں ان کی اس مصرع کی طرف متعطف کرائی ان کا خط ان کے کلیات مطبوعہ میں موجود ہے اور غالب کا جواب بھی آہنگ میں ہے۔

(ج) خلاصہ: ایرانیوں کا خیال ہے کہ اہل ہند کی فارسی میں ہندی پن رہ جاتا ہے البتہ امیر خسرو کو اہل زبان کہتے ہیں بیدل کی زبان کو اجنبی بتاتے ہیں واقف و فقیر و قتیل وغیرہ کے بارے میں بالاتفاق یہ کہتے سنائی دیتے ہیں "فارسی را از دیا دگرفتہ بودند" صاحب برہان قاطع کو مسلم الثبوت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک مدت تک ایران میں رہا محاورہ ایران میں متداول ہے اور ایرانی کہتے ہیں کہ اس کے "مانند" میں کلام نہیں۔ ۲۵ سال قبل میں کلکتہ گیا تو انجمن شہزادہ اور میں ایک دن شمس العلماء شیخ محمود جیلانی سے ملنے گئے اس دن ان کے یہاں سفیر ایران وارد کلکتہ تھے اور کل "اعیان ایران" ساکن کلکتہ موجود تھے اس مجمع میں مرزا محمد باقر شیرازی بھی تھے۔ میں نے اپنی مثنوی دلکش کا ایک نسخہ شیخ صاحب کو دیا مرزا محمد باقر نے کہا کہ ہندیوں کا تعلی ہے امیر خسرو کے بعد مثنوی لکھتا جائے میں نے کچھ اشعار یہاں کی زبان چلوا کے سنائے تو بڑی تعریف کی میں نے معاً مفتی عباس کی مثنوی من و سلوی کے کچھ اشعار کا جوڑ لگایا ساری صحبت مدح سرائی کرنے لگی۔ پھر اسی بحر میں استاد کے کچھ پڑھے۔ ساری صحبت متاثر ہوئی۔ صاحب بولے "حق اینست کہ بایں سلاست و عذوبت بجز اہل ایران دیگران کلام کردن نمی توانند" میں نے مرزا سے دریافت کیا کہ یہ اشعار کیسے تھے جواب دیا کہ اینجا سخنی یا نے فارسی اہل ہند نیدا شتند اب میں "شیر" ہوا اور کہا مفتی عباس ہندی اور فریاد عظیم آبادی کے ہیں۔ بات تیر از کمان جستہ تھی کہنے لگے۔ بے من کہ اہل ہند بعض اشعار خیلے مثل ما با سلاست و رنگینی زبان دارند" اس صحبت میں بعض متعصب لکھنوی موجود تھے اس کا ذکر کیا مرزا نے کہا "کلاش بزرگی اہل ہند خوبست دیوانش دیدہ ام و ناپسند بودہ ام لکھنوی نے تو غضب کر دیا مجھ کو تو ایک شعر بھی مطابق قاعدہ نہ معلوم ہوا۔ دوسرے صاحب بولے کہ غالب نے اردو پر تو چھوڑ مجھے برا معلوم ہوا مجھ سے رہا نہ گیا میں نے مرزا کے بعض فارسی سیس شعر پڑھ کر سنائے اس کے جواب میں نے چار پانچ شعر اس کے بر خلاف پڑھے پھر ان کے اردو کے . . . اشعار پڑھے۔ سفیر صاحب کہنے لگے مرزا

اینکہ نہ فارسیت نہ اردو "موقع گفتگو نہ رہا۔ میں رخصت ہوا" فریاد کے فارسی اشعار جب بھی نام بتائے بغیر ایرانیوں کو سنائے کسی کو یقین نہ آیا کہ کسی ہندی کے ہیں" اور قسمیہ کہا 'حاشا ایں حال ہندی نیست' ص ۹۹

شاد صد درجہ غیر معتبر راوی ہیں' اور یہ سب ان کے اختراعات سے ہے۔ جن اصحاب کو اس میں شبہہ ہو وہ ان کی کتاب "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" پر میرا تبصرہ "صبح" دہلی میں دیکھیں۔

(د) حیات فریاد میں غالب کی جو دو غزلوں کا غزلہائے شاد منسوب بہ فریاد سے موازنہ ہوا ہے ان کے پہلے مصرع یہ ہیں "چو صبح من ز سیاہی بشام مانند است" بود ار بیکہ دران خضر راہ صاخفت است" اس مصرع کے متعلق لکھا ہے "صاخفتن نامردی کے معنی میں اہل زبان بولتے ہیں' اس لفظ پر اعتراض بھی ہوا تھا مگر یہ فروگذاشت قابل التفات نہیں ص ۲۳۲ عموماً صرف غالب اور مقابلے کے اشعار کے ترجمے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ غالب کے اشعار ذیل کا "موازنہ" بھی کیا گیا ہے۔ پہلے غالب اور اس کے بعد فریاد کا شعر درج ہوگا۔

خستگاں را دل بہ سرشبہای پنہاں بردہ	بادرستان کہ نوازستہای پیدا کردہ
ماندایم اگر نعمت ظاہر محسم نیست	ہرچہ پوشیدہ بما دادہ آں ہم کم نیست
چشمۂ نوسفتہ از زہر عنایت نوشجاں	تلخی بادہ مذاق ناگوارا کردہ
اگر بد گفتم تلقی ندارد دیکہ احسانت	کہ می تلخست اما در مذاق جان عسل آمد
چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود	پیش ازیں کیں دردہا آنہا جدا کردہ

اس شعر میں عبارت کا سخت الجھاؤ ہے ص ۲۷۷

آنکہ در دم را دو بے پیش آفریدار دردہا	میتواں کردن جدا بہر من ساقی شراب
دربغل دشنہ نہاں داشتہ غالب امروز	نگذارید کہ ماتم زدہ پنہان (تنہا) ماند
صحبت موعظ و کار دہ بدست فریاد	نگذارید کہ ہم مست و ہم آشفتہ سراست
شعلہ چکد غم کرا گل شگفد مرد کو	شمع شبستانیم باد سحرگاہیم
زندہ کردم نفس غنچہ در فتم چو صبا	کس نپرسید کہ در باغ چرا آمدہ

(ا) لالہ چھجمل کے نام کے ۶ خط پنج آہنگ کی کل اشاعتوں میں ہیں' ان میں سے ایک فیروزپور سے لکھا گیا ہے جہاں غالب احمد بخش خاں کی واپسی کے منتظر تھے' اور یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ وہاں کب پہنچیں گے لالہ چھجمل کے متعلق یہ الفاظ اس خط میں ہیں "دوستانیکہ در رکاب نواب۔۔ (احمد بخش) اندو ازان جملہ آں مہربان اسد نوازی و غالب پروری بیشتر از بیشتر متصف اند" دوسرے خط میں لالہ کے خط آنے اور عنقریب اس کے مطالب کا جواب دینے کا وعدہ کرنے کے بعد حامل رقعہ مرزا امجد علی خاں کی سفارش کی ہے۔ تیسرے خط میں جو کانپور سے لکھا گیا

تھا۔ آغا میرا دو عزم باندھ کا ذکر ہے۔ چوتھا خط جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے "رای صاحب شفیق مشفق عمزادہ دیادآورہ آوارگان سلامت" بنارس کا ہے۔ اس کے ساتھ ۳ خط دوسروں کے نام کے بھیجے گئے تھے اور درخواست کی تھی کہ ان لوگوں کو بھجوا دیں۔ خط (از کلکتہ) کے القاب میں یہ الفاظ بھی ہیں "مظہر التفات نہایی فراوان" اس کے کچھ یہ ہیں "ہر گاہ . . . سگالش کردہ میشود کہ آیا شفیق من از ادبار وطن کیست بمجرد تامل حضرت بضمیر می آیند مستقیل بجناب کار ہا۔ ہست اول ساغر و دردی چہ معنی دارد" "ہر گاہ کہ در مبادی صرف تحریر تغافل میفرمایند سر انجام کارہای سترگ کجا خواہند کشید" مطلب۔ خط بتوسط راجہ سوہن لعل بھیجا تھا" ملا ہوگا" لیکن گلدستہ طاق ہوا۔ فخر الدولہ (احمد بخش) کی موت کے بعد جو حالات اس سرکار میں ظہور میں آئے یوں لکھے۔ "اور حال در بارہ واساطی اہلکاران جدید و قدیم وضع و ارتباط حاکم جدید با تازہ مسند نشین ریاست (شمس الدین احمد) بھی لکھئے۔ ایک ضروری سوال یہ ہے کہ اگر مجھے استغاثے کے سلسلے میں دہلی کے لئے وکیل کی ضرورت پڑے تو آپ اس لئے آمادہ ہیں یا نہیں جواب صاف دیجئے۔ چھٹے خط میں علاقہ سفارت زیب النسا بیگم" (بیگم سمرو سردھنا) پیدا ہونے پر مبارکباد دیکر یہ امید ظاہر کی ہے کہ ترقیات آیندہ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ لالہ کے بیٹے اور غالب کے شاگرد جوا کی شادی غالب کی غیبت میں ہوئی تھی، غالب مبارکباد کے بعد یہ لکھتے ہیں کہ میری دعوت باقی رہی کچھ روپے نئے الگ رکھ دیجئے اگر واپس پہنچا ہوا تو "عشرت از ماست و رنہ نذر از ماست" لالہ نے اپنے خط میں غالب کو نواب لکھا تھا غالب لکھتے ہیں کہ یہ ٹھیک نہیں۔ اپنے خط میں لالہ نے کسی امیر کی نسبت لکھا تھا کہ "وہ دشمن چلیمانہ" رکھتا ہے، غالب نے اس کی تردید کی ہے۔

غالب کے کلیات نظم فارسی کا قدیم ترین نسخہ موجود ہے اور جس کے حاشیے میں غالب کے قلم کی تحریریں ہیں، چھجمل کا ہے، یقین ہے کہ یہی ہوں۔ اس کے حاشیے میں ایک مثنوی (مصرع "وفا جو ہر از تو غم دور باد") جواہر سنگھ کے نام بطور مکتوب اس میں چھجمل کی طرف سے بھی پیام ہے۔ یہ آثر غالب اور باغ دودر دونوں میں شامل ہے۔ موخر الذکر میں ایک چھجمل کے نام کا ہے جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: "بہار اج یا چومنی کہ خبر محبت کیش دیگر ندارم عتاب چیرا و خشم اند" اس میں ان کی وفات کا قطعہ تاریخ بھی ہے

گویند لالہ چھجمل شیریں کلام مرد ۔۔ دیرینہ دوست رفت ازیں تنگنا دریغ
گفتم کسے ز سال وفاتش نشان دہد ۔۔ غالب شنید و گفت چہ گویم بہا دریغ

بہادریغ = ۱۲۷۷ ۔

پروفیسر سید یحییٰ احمد ہاشمی
سندھ یونیورسٹی

مولانا شبلی کیساتھ ایک ماہ

جون ۱۹۱۴ء

مولانا گرمی کی شدت اور لو کی حدت سے اتنا تنگ تھے کہ جلد بمبئی پہنچنا چاہتے تھے مگر دہلی میں ندوۃ العلماء کے سلسلے میں اصلاحی جلسوں کی وجہ سے اور صحت کی بحالی کے خیال سے قیام کرنا پڑا[1]۔ اصلاحی جلسوں کا نتیجہ نہ نکلتے دیکھ کر مولانا بمبئی چلے آئے[2] اور اکبر بلڈنگ بھائی لا میں قیام کیا۔ ندوہ والوں کی مخالفت جاری رہی۔

مولانا بھی آئینی کارروائیوں کے ذریعہ اصلاح کے حامی تھے اور مقابلہ پر ڈٹے ہوئے تھے مگر اس کو فوری اور معمولی خیال نہ کرتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ اگر اسٹرائک نہ ہوتی تب بھی اصلاحی اسکیم کی ضرورت تھی اور ندوہ کی اصلاح وہ مسودہ دار العلوم، رپورٹ سہ سالہ دار العلوم ندوہ کی ابتدائی رپورٹیں قیام سے چند سال تک، مضامین اربعہ کی روشنی میں کرنا چاہتے تھے، جن میں صاف صاف دو مقصد نظر آتے تھے یک یہ کہ ہر فن کے اہل کمال پیدا کئے جائیں جو درجہ تکمیل کے ذریعہ ممکن تھا دوسرے جدید ضرورتوں سے باخبر علماء کا پیدا کرنا جس کیلئے انگریزی دانی اور جدید علوم کی تعلیم ضروری تھی۔ اگر ان دو مقاصد کی تکمیل نہیں ہوتی تھی، تو پھر مولانا کے نزدیک ندوہ کی کیا ضرورت تھی اسلئے کہ صرف قدیم تعلیم کے لئے مدارس کافی تھے ایک مقصد اور بھی تھا یعنی علماء کے آپس کے اختلافات کو دور کرنا اور مشترک مقاصد پر تمام فرقوں کو متحد اور متفق کرنا مثلاً اشاعت اسلام وغیرہ۔ مولانا چاہتے تھے کہ مطبوعات مذکورہ کو سکریٹری اصلاحی کمیٹی (نواب علی حسن خاں) پڑھیں اور ان کے مطابق اصلاحی عمل کریں۔ اصلاحی اسکیم کا دوسرا مرحلہ مولانا کے خیال میں دستور العمل کی درستی تھی یعنی ممبروں کا صحیح طریقہ انتخاب اور سب کمیٹی کا تقرر جیسا کہ علی گڑھ کالج میں سنڈیکیٹ تھی مولانا کا خیال تھا کہ یادداشت اور دستور العمل کی ایک ایک کاپی اہل الرائے حضرات کو بھیجی جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ اصلاحی اسکیم کے متعلق اپنی اپنی رائے لکھیں مولانا اصلاح کے سلسلہ میں خود بھی مطبوعات مذکورہ بالا کو ندوہ سے حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ اپنی رائے کا اظہار اسکی روشنی میں کریں۔ سیرت کے کام میں انتشار واقع ہونے کی وجہ سے مولانا استبدادی (بعض اساتذہ کا ندوہ سے نکالا جانا) اور سازشی کارروائیوں (مولانا انکے حامیوں اور اصلاحی اسکیم کے خلاف) کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتے تھے۔

اب مخالفین نے یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ مولانا نے جو نصاب مدرسۃ العلوم ندوۃ العلماء کے لئے مرتب کیا تھا وہ ملحدانہ تھا یہ بڑی دلچسپ عجیب بات تھی۔ اسلئے کہ اگر نصاب ملحدانہ تھا تو نصاب کی کمیٹی نے کیسے آنکھ بند کرکے پاس کر دیا تھا۔ اس نے اپنے فرض سے

---

[1] مکاتیب دوم صفحہ ۶۲، ۱۱ جون بمبئی سے [2] مکاتیب دوم صفحہ ۱۷۸، ۱۹ اپریل بمبئی سے۔

کیوں نہ ہوا۔ دوسرے یہ کہ مولانا کو استعفیٰ دئے ہوئے عرصہ[1] ہوگیا تھا۔ استعفیٰ دینے کے بعد سے اب تک (جون ۱۹۱۴ء) ملحدانہ ا
جاری رکھنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی تھی۔ لیکن پروپیگنڈا اور وہ بھی غلط پروپیگنڈے کے وقت دیانت اور صداقت کا کون
مولانا نے انکار دیا۔ یہ سوچا کہ ندوہ سے مطبوعہ نصاب منگا کر زمیندار لاہور اور وکیل امرتسر کو بھیج دیا جائے اور عربی کتابوں کے
کردئے جائیں اور مخالفین سے پوچھا جائے کہ ان میں کون سی کتاب ملحدانہ ہے۔ مولانا مسعود علی ندوی کے متعلق بھی جاننا چاہتے تھے
دنوں کہاں رہتے تھے۔ مولانا اپنے مسودات غالباً سیرت النبیؐ کے ڈاک کے ذریعہ لکھنؤ سے بمبئی طلب کر رہے تھے ندوۃ والوں کی یہ
تھی کہ کسی طرح مولانا کا وظیفہ بھوپال سے بند ہو جائے۔ اسلئے مولانا اور مولانا کی تصنیف سیرت النبیؐ کے متعلق بے سر و پا باتیں لکھتے
چنانچہ ایک مولوی صاحب نے جوش میں آکر سیرت[2] کے مطبوعہ مقدمہ پر ایک رسالہ کی شکل میں اعتراضات شائع کئے اور دربار بھوپال پر
مولوی محمد امین[3] زبیری صاحب کی رائے تھی کہ ان اعتراضات کے جوابات دئے جائیں اس لئے کہ بیگم بھوپال بھی یہ محسوس کر رہی
مولانا کی یہ تصنیف اگر جمہور علماء کے خلاف ہوئی تو بھوپال کے دربار کی بھی بدنامی ہوگی کہ ایسے کی سرپرستی کی کہ جس نے دین کو نقـ
گویا دین کو نقصان پہونچانے میں بیگم صاحبہ کا ہاتھ ہوا۔ مولانا ان اعتراضات کے جوابات تو دے چکے تھے لیکن ان کو اپنے نام سے
حق میں نہ تھے کیونکہ وہ ان الجھنوں سے دور ہی رہنا چاہتے تھے لیکن کسی دوسرے کے نام سے چھپوانے میں حرج بھی نہیں سمجھتے
بھی رسالہ کی شکل میں چھپوانے کے حق میں تھے۔ یا الہلال میں بھجوانے کا ارادہ رکھتے تھے مولوی محمد امین زبیری کو بھوپال بلا رہے۔
بارش سے قبل بمبئی سے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ پھر بھی اس پر تیار تھے کہ بہت ضرورت ہو تو ایک دو دن کے لئے بھوپال
مولانا نے یہ بھی چاہا کہ ہندوستان کے مشہور عالم مولوی محمود الحسنؒ (شیخ الہند) سیرت کے مسودے کو دیکھ کر اپنی رائے دیں لیکن سوا
کے اتنے کان بھرے گئے کہ ان کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ مسودے کو پڑھ کر اپنی رائے دے سکیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی تیار ہو
مسودے کو پڑھیں اور رائے دیں لیکن مولانا شبلی کو بھی مولوی محمود الحسنؒ پر اعتماد تھا اور وہ جانتے تھے کہ مولوی صاحب کی رائے
صداقت پر مبنی ہوگی لیکن مولوی محمود الحسنؒ کے تیار نہ ہونے پر مولانا نے مولانا سندھی کو بھی غنیمت جانا وہ دربار بھوپال کی دارو گ
پریشان ہو گئے تھے اور ارادہ کر رہے تھے کہ بھوپال کی اعانت سے مستعفی ہو جائیں۔

انھیں دنوں علم الاخلاق پر سید کرامت حسین نے کتاب لکھی تھی مولانا عبدالماجد دریابادی نے چاہا کہ مولانا شبلی کے مقد
وہ شائع ہو۔ مگر مولوی ابوالکلام ریویو کے لئے مولانا شبلی سے اسکو مانگ لے گئے۔ مولانا شبلی اصل میں یہ سمجھے تھے کہ ریویو کے لئے
اس لئے مولوی ابوالکلام کو ریویو کے دینے میں عذر نہ کیا حالانکہ وہ اس لئے آئی تھی کہ اسکے نئے ایڈیشن کے لئے مولانا مقدمہ[6]
دریابادی چاہتے تھے کہ مولانا شبلی اور مولانا حالی مقدمہ لکھیں یا پھر بغیر مقدمہ کے شائع ہو۔ اسی زمانے میں مولانا دریابا

ح ۱ مولانا شبلی کا ۹ جولائی ۱۹۱۳ء کو استعفا منظور ہوا ۔ ح ۲ مکاتیب اول برحاشیہ صفحہ ۲۵۶ ح ۳
صفحہ ۲۵۶-۲۵۷ ح ۴ جون ۱۹۱۲ء ح ۵ مکاتیب اول صفحہ ۳۰۰-۳۰۱ ۱۱ جون ۱۹۱۲ء ح ۶ مکاتیب اول صفحہ ۳۰۲

کتاب (غالباً فلسفۂ جذبات) مولوی سید حسن بلگرامی کو بھیجی تھی اور خیال تھا کہ بلگرامی صاحب نے وہ پڑھی ہوگی اور فیلوشپ کیلئے میدان ہموار ہوگا اس کے متعلق مولانا نے لکھا کہ مولوی صاحب موصوف نے مشاہیر مصنفین کے دو ہی ایک صفحے پڑھے ہونگے (مصروفیت اور حیدرآباد کی سیاسی چپقلش کی بنا پر انکو اتنی فرصت ہوتی تھی) دوسری چیز یہ بھی تھی کہ مولانا دریا بادی کی شہرت کی طرف ابھی پہلا قدم تھا۔ اور نظام کے دربار میں اس وقت رسائی مشکل تھی جب تک کہ عام شہرت نہ ہو اور اسی وقت لوگ سفارش بھی کرتے ورنہ تامل کرتے تھے مولانا نے تسلی کی خاطر اپنی مثال دی کہ خود ان کے لئے مولوی سید حسن بلگرامی صاحب نے سفارش کی تو نظام نے خوشی کا اظہار کیا کہ ایک قابل شخص کی سفارش کی گئی اور مولانا کی تمام تصانیف کو اپنے پاس رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ فلسفہ کے باب میں اپنی سفارش کو بے وقعت سمجھتے تھے لیکن مولوی عبدالحق کی تعریف پر کام بننے کا امکان ضرور تھا۔ مولانا دریابادی نے مذہب پر کچھ لکھکر بھیجا تھا اس کی رسید دیتے ہوئے لکھا کہ نولدیکی کے قرآن مجید کے مضمون کا ترجمہ باقی ہے اسکو پورا کرنا چاہئیے کچھ اور عنوانات بھی مولانا نے لکھے تھے انکو پورا کرنے کی یاددہانی بھی کی مولویوں کا آخری تیر کفر کا فتویٰ ابھی مولانا کے خلاف باقی تھا وہ بھی پورا ہو کر رہا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگار کے خلاف مخالفین نے کفر کے سرٹیفکٹ تیار کرکے بھوپال بھیجے ندوہ کے سفیر جنکا کام ندوہ خاص و عام میں متعارف کرانا تھا مولانا کے کفر کی تشہیر میں لگ گئے۔ علی گڈھ کی وہ پارٹی[1] جو مولانا کی شروع سے مخالف تھی اسکو بھی موقع ملا اور وہ بھی خم ٹھونک کر اکھاڑے میں آگئی۔ ادھر ایک مولانا جو جسمانی طور پر کمزور ایک پیر سے معذور اور ہاتھ سیرت کے کام میں مصروف۔ کتنا دل دکھا ہوگا ایسے میں کیا کچھ مخالفین کے خلاف کہنے کا خیال نہ آیا ہوگا مگر لکھا تو صرف اتنا۔ "زمانہ[2] گو حقیقت شناس نہیں ہے تاہم سچ ہمیشہ نقاب میں نہیں رہے گا"

مولانا کو اب فکر تھی کہ درجہ تکمیل (ندوہ کے طلباء کے آخری امتحان[3]) کے بعد بعض قابل طلبہ کو اپنے ساتھ رکھ کر کسی ایک فن میں ماہر کر دیں اور جن میں تصنیف کا مادہ ہو انکو تصنیف کیلئے تیار کریں اس طرح مصنفین کی ایک جماعت تیار کریں گویا دارالمصنفین و دارالعلوم کیلئے انتظام اور کوشش کا آغاز کر رہے تھے۔ غیر مستطیع طلبہ کے مصارف کا بندوبست بھی پیش نظر تھا اس لئے ایسے طلبہ کی (اگر ہوں اور پسند کریں) ایک فہرست چاہتے تھے تاکہ اسکا مناسبت سے انتظام کریں۔

۱۔ ارکین ندوہ کے علاوہ کچھ اور اصحاب بھی موقع کے منتظر تھے یہ علی گڈھ کی ایک مخصوص جماعت تھی جو ندوہ کی ترقی کو باوجود سرسید علیہ الرحمۃ سید محمود مرحوم، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحوم کی تائید کے رقیبانہ نظروں سے دیکھتی تھی ایک غضب یہ ہوگیا کہ اس زمانہ انتشار و ہیجان میں سیاسیات اور یونیورسٹی کے بعض مسائل کے متعلق مولانا نے جو نظم و نثر میں اپنے خیالات ظاہر کئے تھے اور بعض نظموں میں دکھتی ہوئی رگوں کو چھیڑ دیا تھا جس نے اس جماعت کو تلملا دیا اس لئے یہ بھی اس موقع پر حمایت ندوہ یا مخالف منتظمین کی تائید کے پردہ میں مولانا کے خلاف حرکت میں آگئی"
(مولانا محمد شبلی نعمانی مرحوم [illegible])

۲۔ مکاتیب اول۔ مولانا دریا بادی کے نام صفحہ (۳۰۱) ۱۱ر جون ۱۹۱۲ء بمبئی سے

۳۔ مکاتیب دوم صفحہ ۱۲۴ ۱۵ر جون ۱۹۱۴ء

نولدیکی کے قرآن مجید کے متعلق مضمون مولانا دریا بادی نے نامکمل چھوڑ دیا تھا مولانا اس کو پورا کرنا چاہتے تھے تو
تاریخی ترتیب پر ایک کتاب تھی اس کا یا اس کے اقتباسات کا ترجمہ بھی مولانا دریا بادی کرنا چاہتے تھے۔ مولانا کا بمبئی میں جو
قیام کا اس وقت تک ارادہ تھا جب تک کہ ایک جلد (سیرت النبیؐ) کی مکمل ہوکر نہ نکل جائے گذشتہ مہینوں میں ندوہ کی مخالفت
سے جو فضول وقت ضائع ہوا تھا اس پر متاسف تھے چونکہ سیرتؐ کو مکمل کرنے کی جلدی تھی اس لئے مترجم کو ساتھ رکھنا چاہتے
زیادہ وقت ضائع نہو لیکن کوئی مترجم نہیں مل رہا تھا جو بمبئی میں قیام کرتا اگر ملتا تھا تو مترجم کی حیثیت سے معیار پر پورا نہ اترتا تھا
سے مولانا کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور وہاں کی خرابی سے بے چین ہو جاتے تھے جدید ناظم نے ندوہ کو جو بنانا چاہا اور مولانا کے
ہٹ جانے جو طوفان اٹھا اس سے مولانا ندوہ کے متعلق ناامید سے تھے لیکن مولانا کو اس مخالفت میں بھی ندوہ کیلئے بہتری نظر آتی
ندوہ کے کاموں میں سرگرم ہو گئے لہٰذا امید ہو چلی کہ عمارت جو نامکمل پڑی تھی اسکے بننے کا شاید بندوبست ہو جائے نصاب تعلیم اگر
کی مرضی کے مطابق رائج نہ ہو سکا مگر مولانا نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ زمانہ خود ہی درست کرے گا وہ ندوہ میں دیوبند کے طرز کی تعلیم نہیں
ان کا خیال تھا کہ ندوہ سے ایسے علماء نکلیں جو حالات حاضرہ سے کما حقہ واقف ہوں اور جدید علوم و فنون سے ناواقف نہ ہوں لہ
التحصیل طلبہ مسائل حاضرہ کو دین کی روشنی میں دیکھ کر فیصلہ کر سکیں گے اور ان کا فیصلہ صحیح ہوگا کیونکہ دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ا
کی تعلیم بھی ملی ہوگی۔ اس لئے مولانا نے اظہار خیال کیا کہ "ندوہ[2] دیوبند نہیں بن سکتا اور خود دیوبند کب تک دیوبند رہ سکتا۔
ایسے ہو رہے تھے کہ دیوبند بھی بدلتا جا رہا تھا اور وہاں انگریزی پڑھے لکھے طبقہ سے دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی مولانا کا اشارہ ہم
طرف معلوم ہوتا ہے۔

مولانا نے ان دنوں کچھ تاریخی نظموں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور البلال ان نظموں کی زینت تھا مولانا دہلی سے ندوہ کے
بلکہ جھجک جھجک سے جان چھڑا کر بمبئی آئے تھے اور یہاں اکو بڑا سکون تھا اور خاموشی سے اپنا کام کر رہے تھے۔

مولوی عبدالشکور صاحب مدیر "النجم" نے سیرتؐ پر جو اعتراضات کئے تھے وہ اور کفر کے فتوے بھی دربار بھوپال میں
ان پر دربار بھوپال سے سرکاری مراسلہ مولانا کو ملا[3] مولانا نے اس کا جواب لکھا اور یہ چاہا کہ ایک مستند عالم تجویز کیا جائے کہ مولانا لکھا ہوا مسو
کر دیا اور وہ تصدیق کرے تب مستند سمجھا جائے مگر اس میں ایک دقت تھی کہ بمبئی میں کتابیں نہیں علماء یا تھا اور لکھنو سے کوئی آنے کو تیار نہ تھا مولا
شرافت کا ایک اور ثبوت دیا کہ دیباچہ کو اعتراضات کی زد سے باہر کر دیا۔ اگرچہ اعتراضات میں مولانا کی جو عبارت نقل کی گئی تھی اس ک
تک بدل دیے گئے تھے اور بعض اعتراضات غلط تعبیر پر مبنی تھے ان سب کے باوجود مولانا اب خود یہ چاہنے لگے تھے کہ کوئی عالم نظر ثانی
تاکہ ملک کے لوگ اعتماد کر سکیں ایسے موقع پر مولانا نے مولوی محمود الحسنؒ دیوبندی کی تعریف فرمائی اور اعتماد کا اظہار کیا کہ وہ چاہے
کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے ہوں مگر اپنی رائے دیانت کے خلاف نہ دیں گے اور مولوی محمود الحسنؒ کو سیرتؐ پر نظر ثانی کرنے کیلئے آمادہ

۱؎ مکاتیب اول صفحہ ۳۰۱-۳۰۲ - ۱۶ رجون ۱۹۱۴ء ۲؎ مکاتیب اول صفحہ ۳۰۲ ۳؎ مکاتیب اول صفحہ ۱۵۸-۱۵۹ - ۸ رجون ۱۹۱۴ء

اپریل ۹۶

حبیب ریحن

مولوی عبیداللہ سندھی کو ذریعہ بنانا چاہیے مولانا نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ بمبئی سے اس وقت تک نہ جائیں گے جب تک کتاب کی تکمیل نہ ہو جائے کیونکہ دوسری جگہوں پر ملنے والے وقت ضائع کریں گے۔ انہیں دنوں مولوی حمیدالدین فراہی کا دارالعلوم (عثمانیہ یونیورسٹی) حیدرآباد (دکن) کے پرنسپل کی حیثیت سے تقرر ہوگیا مولانا اس سے بہت مسرور ہوئے اور امید ظاہر کی کہ مولوی صاحب سے یونیورسٹی کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

مولانا بمبئی کے خوشگوار موسم سے خوش تھے اور جم کر کام کر رہے تھے کفریہ فتوے جب بھوپال بھیجے گئے تو پھر دلی جو ہندوستان کا صدر مقام تھا وہ اس سعادت سے کیوں محروم رہتا۔ جبکہ ایک فتوی[2] ساز بھی دلی کے تھے اور عجیب اتفاق ہے کہ یہ مولوی صاحب مولانا شبلی کی دینداری سے خوب واقف تھے اور برسوں ساتھ کام کیا تھا لیکن یہ کھٹک[3] انکے دل سے نہیں جاتی تھی کہ مولانا شبلی علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے اور سرسید کے ہمنوا تھے۔ دلی میں اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں چار فتوے الگ الگ تقسیم کئے گئے تھے اور تقسیم سے پہلے ہی اطلاع دے دی گئی تھی کہ جلسہ موقوف کیا جائے ورنہ کفر کے فتوے تقسیم کئے جائیں گے جلسے کے علاوہ وہ فتوے سفرائے ندوہ کے ذریعہ مختلف شہروں میں تقسیم کئے گئے اور دیواروں پر لگائے گئے چنانچہ رائے بریلی (اودھ) کے دیوار سے ایک صاحب نے اکھاڑ کر مولانا کو بھیجا تھا۔ بھوپال میں یہ کوشش جاری رہی کہ سیرت[4] کی اعانت بند ہو جائے مولانا دریابادی نے مولانا کو بقیہ ترجمہ زیدیکی بھیجدیا جس کی مولانا کو بڑی ضرورت تھی مولانا[5] کو سید سلیمان ندوی کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ پونا[6] پہنچ گئے اسی زمانہ میں مولانا کو بہت سی باتیں تحقیق ہوئیں یعنی خیبر کے متعلق قطعی طور پر ثابت ہوا کہ یہودیوں نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ اور تیاریاں کرلی تھیں اور امدادی قبائل خیبر میں پہنچ چکے تھے۔ کتاب (سیرتؐ) کی ترتیب بھی مولانا نے اب آخری طور پر طے کرلی تھی۔

مولانا ندوہ سے مایوس ہو گئے تھے کہ وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نہ انکو ملیں گے اور نہ وہ انکو کسی فن میں ماہر بنا سکیں گے۔ اس لئے مولانا آزاد (ابوالکلام) سے مشورہ کیا اور یہ طے ہوا کہ اصل غرض قابل اشخاص کا تیار کرنا ہے لہذا کیوں نہ چند قابل طلبہ کو پاس رکھکر انکو کسی فن میں تیار کیا جائے اور ان میں صحیح مذاق پیدا کیا جائے۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مولانا ایک وظیفہ فنڈ قائم کرنا چاہتے تھے اور اس میں ماہانہ چندہ اپنے اعزا احباب اور شاگردوں سے لینا چاہتے تھے اور اس فنڈ سے ضرورت مند طلبا کی کفالت کرنا چاہتے تھے اس اسکیم کو باقاعدہ صورت دینے کیلئے سید صاحب کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کیلئے آپس میں کام تقسیم کرلیا جائے۔ مولوی حمیدالدین فراہی کے ذمہ بھی کام لگانا چاہتے تھے۔ حمیدالدین فراہی الہ آباد جا رہے تھے اس کی اطلاع بھی مولانا کو تھی بات اصل یہ ہے کہ مولانا اپنے اعزا احباب اور شاگردوں سے باخبر رہتے تھے کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اگر انکو براہ راست اطلاع نہیں ہوتی تھی تو دوسروں سے دریافت کرتے تھے۔

انہی دنوں مولوی سید علی زینبی اور مولوی شبلی متکلم پر ندوہ والوں کا عتاب تھا اور انکو ندوہ سے نکالنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مولوی شبلی متکلم مولانا کے مخصوص شاگرد تھے اور ندوہ میں استاد تھے لیکن مولانا شبلی نے اپنی معتمدی کے زمانے میں بھی انکے ساتھ خصوصی

ع۱ مکاتیب اول صفحہ ۲۱۰-۲۱۱-۲۵ رجون ۱۹۱۲ء ع۲ مولوی عبدالحق مفسر تفسیر حقانی ع۳ مولوی عبدالحق نے تفسیر حقانی سرسید کے جواب میں لکھی تھی
ع۴ مکاتیب اول صفحہ ۲۰۲-۲۰۳-۲ رجون ۱۹۱۲ء ع۵ مکاتیب دوم صفحہ ۱۰۸-۱۰۹-۲۱ رجون ۱۹۱۲ء ع۶ پونا کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے

رعایت نہ کی تھی اور قاعدہ کی پابندی کا خیال رکھا تھا۔ اس کا ثبوت حکیم مولوی عبدالحئی مولف گل رعنا اور مولانا کی خط و کتابت

"جناب مولانا - کاغذات سب پہنچے۔ اضافہ شدہ تنخواہ کی یادداشت دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ اید
پر جبکہ جدید اشاف مقرر ہوا اور تنخواہیں لوگوں کی خاطر خواہ رکھی گئیں سابق مدرسوں کے آنسو نہ پونچھنا اچھا نہیں تھا۔ بہر حال
ہوا مگر اس میں اتنی کسر ہے کہ مولوی شبلی صاحب کی تنخواہ میں اضافہ آپ نے نہیں کیا۔ ان کی تنخواہ ان کے کام کے اعتبار سے کم ہے۔
مخلص آدمی ہیں ان کی تنخواہ میں بھی پانچ روپے کا اضافہ کرنا مناسب ہے اگر فرمائیے تو یادداشت میں واپس بھیجوں اور آپ خو
فرمائیں۔ . . . . کہاں سے ہو اسکو بجٹ بنانے والے طے کر دیں گے۔ عبدالحئی"

مکرمی۔ مولوی شبلی (متکلم) کا مجھسے بڑھکر کوئی قدردان نہیں ہے لیکن انکا اضافہ ابھی ہو چکا ہے اور مولوی سید علی وغ
مطلق نہیں ہوا اس لئے ان لوگوں کو شکایت ہوگی تاہم اگر آپ کی رائے ہو تو میں کردوں لیکن اور لوگ ہم وطنی پر محمول کریں گے۔[1]

اب مولانا کو جلدی تھی کہ "قرآن کی تاریخی ترتیب" کا ترجمہ ہو کر جلد آجائے ادھر مولانا دریابادی سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ وہ کونسی کتاب
جس کا ترجمہ مولانا چاہ رہے ہیں چنانچہ مولانا نے مولانا دریابادی کو توجہ دلائی کہ مولانا کی کتب انگریزی کی فہرست انھوں نے ہی تو تیار کی تھ
کتاب تھی جس کا اردو نام "قرآن کی تاریخی ترتیب" لکھا تھا اس کے ترجمے یا اقتباس کی ضرورت تھی۔ کتابیں الگ صندوق میں تھیں لکھنؤ
ہوئی تھیں اور بنانیا نواب علی حسن خاں کے یہاں تھیں لہذا نواب صاحب کی مدد سے اسکو صندوق سے نکلوانا اور ترجمہ کروانا چاہا اسی[2]
کرنل عبیداللہ خاں سیرت النبیؐ کا انگریزی ترجمہ کرنا چاہ رہے تھے اس سلسلے میں مختلف لوگوں سے خط و کتابت کر رہے تھے آخر سیرتؐ
ترجمے کا ذمہ مسٹر محمد علی نے لیا۔

مولاناؒ کو فکر بڑھتی جا رہی تھی کہ چند قابل طلبا ملیں تو انکو کسی فن میں ماہر کیا جائے اور انکو تصنیفی کام کا سلیقہ آئے مولوی مسعود علی
مشورہ کیا تھا انہوں نے لکھا کہ درجہ تکمیل میں کوئی اس قابل نہیں مولانا کا حسن کے متعلق خیال تھا مگر مولوی مسعود علی ندوی نے انکو بھی اسے
اب مولانا کا خیال تھا کہ خلیلؒ بھی مولانا کے پاس چلے آئیں مولوی عبدالسلام کو البلال میں بلایا جا رہا تھا اور ان کا ارادہ جانے ہی کا
تھا مولانا نے سوچا کہ اگر مولوی عبدالسلام البلال میں نہ جائیں تو کوئی بندوبست کیا جائے شبلی متکلم ندوہ سے الگ ہونے والے تھے نگران
یا تقریر کا مادہ نہ تھا ورنہ مولانا اپنے یہاں بلا لیتے پھر بھی انکے لئے مولانا کے نزدیک بہت ٹھکانے تھے۔ مولوی عبدالرحمن نگرامی کو
تربیت سمجھا اور سید صاحب کو مطلع کیا۔ لیکن مولانا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مولوی سید علی زینبی کیلئے کہاں جگہ نکالیں مجبوراً
کے ارکان ندوہ کو لکھا کہ انکو ندوہ کی علیحدگی سے بچائیں۔

اسی زمانہ میں مولانا کا ارادہ تھا کہ سید صاحب کا رسالہ جو قبل اسلام عرب سے متعلق تھا اسکو سیرتؐ میں سید صاحب
شامل کر دیں کیونکہ اس عنوان پر مولانا نے اجمالاً لکھا تھا مگر پھر طول اور ضخامت کیوجہ سے سیرتؐ میں شامل نہ ہو سکا اور رسالہ

---

[1] غیر مطبوعہ خط مملوکہ مولوی ابوالحسن علی ندوی مظلہ و محمد میاں [2] مکاتیب اول صفحہ ۲۴۰، ۲۲ جون ۱۹۱۲ء [3] مکاتیب ۲ صفحہ ۲۳۱، ۱۰ جون ۱۹۱۲ء [4] شیخ فضل عرب ندوی

کے نام سے الگ شائع ہوا۔

ان[1] دونوں مولوی مسعود علی جیسے منتظم کے پاس کوئی کام نہ تھا اس پر مولانا نے انکو توجہ دلائی کہ اصلاح ندوہ سے بڑھکر کیا کام ہو سکتا تھا اور نواب علی حسن خاں کو اس کام میں مدد دینے کی ضرورت تھی۔ اسی کام کو اگر پھیلایا جاتا تو بہت پھیل سکتا تھا اصلاحی مسودہ دہلی سے آچکا تھا لکھنؤ میں جلسہ کرکے ترمیم واضافہ کرنا اسکو شائع کرنا اور پھر تمام ملک سے آراء طلب کرنا اسلامی کمیٹی کے ممبروں کے دائرے کو وسیع کرنا محضر انگریزی ریورٹیں تیار کرانا یہ سب کام ہی کام تھے اور ان کے بغیر ندوہ درست ہونے کا خیال خیال خام تھا بعین الیقا خود نے مولانا کو حسرت آمیز خط لکھا تھا یہ بھی ندوہ کی حالت سے پریشان تھے مگر ابھی اس قابل نہ ہوئے تھے کہ مولانا سے ساتھ علمی کام کرسکتے سید صاحب کی رائے محسن کے متعلق اچھی تھی کہ وہ قابل تربیت تھے اس لئے مولانا نے مسعود علی ندوی کو لکھا تھا مگر ان کی رائے نہیں ہوئی۔

خلیل[2] کو مولانا وظیفہ دے کر بلانا چاہتے تھے مگر انکے رہنے کا انتظام نہ تھا اس لئے مولانا چاہتے تھے کہ خلیل صاحب بمبئی کے سیٹھ سلیمان عبدالواحد سے قیام کا وقتی بندوبست کرلیں پھر جب کئی طلبہ ہو جائیں تو ایک کمرہ لے لیا جائے۔

مولانا[3] وحیا بادی نے مولانا کو لکھا کہ "قرآن کی تاریخی ترتیب" نہایت ہی ادنی درجہ کی کتاب ہے اور اس کے ساتھ ہی کچھ اقتباسات بھی دئے اس پر مولانا نے فوراً جواب لکھا کہ اس کا ترجمہ ہرگز نہ کیا جائے ایسی کم رتبہ چیزوں کا ترجمہ مقصود نہیں

مولانا[4] اب بہت عدیم الفرصت ہو گئے تھے اور ضعف کی وجہ سے روزمرہ کے ضروری مشاغل کے علاوہ کوئی کام نہ کر سکتے تھے اس کے باوجود مولانا نے سید نظیر الحسن رضوی کی کتاب "المیزان" جو موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں تھی اسی روز ۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو بڑی دلچسپی سے پڑھی اور اسکے پڑھنے میں خاصہ وقت صرف کیا پھر جس طرح سے اس کتاب کی تعریف کی ہے وہ مولانا کی عالی حوصلگی اور مخالف کی جائز تعریف کی بین دلیل ہے۔ لکھتے ہیں "آپ[5] نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے جواب لکھا ہے جو اس زمانے میں نہایت غنیمت ہے آج مجھ کو موازنہ کی قدر ہوئی کیونکہ اسی بہانہ اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا اور ایک باکمال (مرزا دبیر مرحوم) کے جوہر اچھی طرح کھلے آپ کی عنایت کا مشکور اور طرز تحریر کا مداح ہوں۔

مولانا[6] نے مسودہ کی نقل کے لئے لکھنؤ سے خوشنویس کو بلایا ایک بمبئی میں پہلے سے موجود بھی تھے۔ مولوی محمود الحسن (حضرت شیخ الہند) اور مولوی عبیداللہ سندھی کو سیرت پر نظر ثانی کے لئے مولانا نے خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ سید صاحب سیرۃ عائشہؓ کے لئے عرصہ سے مواد جمع کر رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے صحابہؓ کی روایتوں پر جو تنقیدات کی تھیں انکو علامہ سیوطی نے یکجا کردیا تھا سید صاحب کو اس کتاب کی تلاش تھی تاکہ سیرت عائشہؓ مکمل کرلی جائے چنانچہ مولانا نے حیدرآباد (دکن) سے منگوادی۔ تاکہ کتاب جلد مکمل ہو جائے۔ بقیہ ازواج مطہراتؓ کو مولانا نے سیرت النبیؐ میں لے لیا تھا مگر زیادہ پھیلا کر نہیں۔ اور اس حصہ کو اپنی نگرانی میں مولوی عبدالسلام سے تیار کرایا تھا مگر ابھی تک اس پر نظر ثانی

ع۱ مکاتیب دوم صفحہ ۱۲۵ - ۲۳ جون ۱۹۱۴ء　ع۲ شیخ خلیل عرب　ع۳ مکاتیب اول صفحہ ۳۰۳، ۲۰ جون ۱۹۱۵ء　ع۴ مکاتیب اول صفحہ ۲۳۹، ۹ جون ۱۹۱۴ء

ع۵ مکاتیب اول صفحہ ۲۷۳، ۲۹ جون ۱۹۱۴ء　ع۶ مکاتیب اول صفحہ ۲۵۸ - ۲۵۹، ۳۰ جون ۱۹۱۴ء

متبیں کی تھی ۔ چونکہ یقیناً ازواج مطہراتؓ کے زیادہ حالات نہ تھے اس لئے الگ الگ رسالوں کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ ان سب کو ملا کر ایک رسالہ کرنے کا ارادہ کر لیا تاکہ ایک کتاب ہو جائے ۔

مولوی عبدالسلام تنخواہ و بیرہ پر الہلال کلکتہ میں جولائی سے جانے والے اور سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے والے تھے اس لئے یہ امید نہ تھی کہ سیرتؐ اور الہلال دونوں کے کام بیک وقت کر سکیں چنانچہ مولانا کو فکر ہوئی کہ سیرتؐ کے کام میں کوئی اور مدد دینے والا مل جائے بیگم صاحبہ جنجیرہ اس زمانے میں بمبئی میں مقیم تھیں اور مولانا سے ملتی رہتی تھیں اور ملاقات میں اکثر بیگم بھوپال کی تعریف کرتی تھیں ۔

مولانا کے نام بھوپال سے سید صاحب کی کتاب سیرت عائشہؓ کے متعلق تقاضا آیا کہ جلد تیار کریں معقول معاوضہ کی پیش کش بھی کی گئی سید صاحب کو استدراکات علی الصحابہ از سیوطی کا انتظار تھا وہ مولانا منگوا کر بھیج ہی چکے تھے اس لئے چاہتے تھے کہ جلد تیار ہو جائے مگر سیرت عائشہؓ کے متعلق اپنی خاص معلومات کی بنا پر سید صاحب کا لکھا مسودہ دیکھنا چاہتے تھے ۔ تاکہ اس میں اگر ضرورت ہو تو اضافہ کر دیں ۔ سید صاحب کو لکھا کہ کتاب مذکورہ مولوی شیر علی کو حیدرآباد دکن واپس بھیجدیں ۔ بیگم بھوپال یہ بھی چاہتی تھیں کہ دیگر ازواج مطہراتؓ کی سوانح بھی لکھی جائیں مگر چونکہ موصوفہ کو عجلت تھی ---- ۔ اس لئے مولانا کسی اور انتظام کی فکر میں تھے ماسٹر دین محمد سے الگ ہو کر بمبئی پہنچنے والے تھے مولانا کو فکر تھی کہ انکو کسی کام سے لگا دیا جائے ۔ اسی زمانے میں عبید جابلی کا دیوان لندن میں چھپا تو مولانا نے اسکو خرید لیا معجم الادبا کے چھپنے کی بھی مولانا کو اطلاع ملی جس میں جاحظ کا حال بھی درج تھا اسی کی ایک کتاب دلائل النبوتؐ جس کے تو نسخے کسی زمانے میں موجود تھے مگر اب سب نایاب تھے مولانا کو انکی سیرت کے سلسلے میں تلاش تھی ۔

بیگم بھوپال[2] کی خواہش کے مطابق مولانا بھی چاہتے تھے کہ ازواج مطہراتؓ کے حالات پر ایک کتاب تیار کی جائے مگر سوال یہ تھا کہ کون تیار کرے " مولوی عبدالسلام سیرت کے ضمن میں مولانا کی زیر نگرانی کچھ حالات لکھ چکے تھے جس میں تحقیق کے ساتھ تفصیل کی تھی اس لئے مولانا چاہتے تھے کہ اگر ابوالکلام آزاد اجازت دیں تو مولوی عبدالسلام مولانا کے پاس چھ ماہ قیام کریں اور کتاب مکمل کر لیں مولوی عبدالسلام کی سیرتؐ کے کام سے علیحدگی کی وجہ سے مولانا کو سیرتؐ کے دفتر کے لئے ایک شخص کی بڑی ضرورت تھی چاہتے تھے کہ طلبہ میں سے اگر کوئی اس قابل ہو تو اسکو لے لیں یا پھر خلیل صاحب تکمیل کیلئے آئیں تو انکو ہی سیرتؐ کا کچھ کام دیں تاکہ انکو تحقیق کا طریقہ معلوم ہو اور مولانا کو بھی کچھ مدد ملے ۔

انہیں حالات میں مولانا نے جون ۱۹۱۴ء کو ختم کیا اور جولائی میں قدم رکھا جولائی کے کاموں کی تفصیل آئندہ پیش کی جائے گی ۔ انشاءاللہ

ع[1] مکاتیب اول صفحہ ۲۵۸ ۔ ۲۵۹ ۔ ۳۰ر جون ۱۹۱۴ء ع[2] مکاتیب دوم صفحہ ۱۲۲ ۔ ۳۰ر جون ۱۹۱۴ء

محمد اکبر الدین صدیقی

دکن کا ایک گمنام صوفی شاعر

علیم اللہ شاہ

فارسی ادب میں صوفیانہ خیالات منظم کرنے والے شعرا بہت زیادہ ہیں۔ ان کا اثر اردو پر بھی پڑا اور اردو جاننے والے صوفیوں نے اپنے خیالات اردو میں نظم کئے۔ ان میں اکثریت ایسے شعرا کی ہے کہ ان کا کلام مجازی اور حقیقی دونوں مفہوم ادا کرتا ہے۔ ولی سراج، میر اور درد اور ان کے بعد کے دیگر شعرا میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے اور ان سب میں درد صوفیانہ شاعری میں ممتاز مقام کے حامل ہیں لیکن ان کے کلام میں بھی ہمیں ایسے بہت سے اشعار ملیں گے جن کا تعلق عشق حقیقی کی نمائندگی کرتا ہے۔

علیم اللہ شاہ کا ذکر کسی تذکرہ میں موجود نہیں، نہ بحیثیت شاعر کہیں ملتا ہے اور نہ بحیثیت صوفی کے البتہ ایک حلیم اللہ کے بارے میں روایت ملتی ہے کہ یہ شمالی ہند کے رہنے والے تھے اور بیجاپور گئے اور حضرت شاہ علیم اللہ رائے بریلی کے ہیں جن کے سوانح حیات عبدالحی مصنف تذکرہ گل رعنا کے والد سید فخرالدین نے سیرت علمیہ کے عنوان سے لکھے ہیں لیکن علیم اللہ شاہ زیر تبصرہ والا ان کے دیوان کی داخلی شہادتوں اور کچھ تاریخی واقعات کو پیش نظر رکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ دیوان میں تین شعر ایسے ہیں جن میں انھوں نے اپنے مرشد کا نام لیا ہے۔ کہتے ہیں۔

علیم اللہ ترا ساقی سچا ہے — کہتے ہیں جس کو محی الدین قادر
محی الدین سا ہادی رہبر ہو تو کیا ڈر ہے — چھتر جس کے سر کا ہے سرپر افسر ہو تو کیا ڈر ہے
جگت کے جب منگاں مل کر کریں گے تو نما اگر ہم پر — محی الدین سا پشتی بخشندہ ہو تو کیا ڈر ہے

دیوان کے اختتام کی تاریخ ایک شعر میں لکھی ہے۔

تب ہوا دیوان علیم اللہ تمام — سن ہزار یک سو پچتر بات ہے

اس طرح انھوں نے اپنا دیوان ۱۱۷۵ میں مرتب کیا۔ ان کے مرشد محی الدین قادری ہیں۔ یہ بزرگ سید محی الدین عرف قادر بادشاہ کے ایک صاحبزادے حضرت ... قادری کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔ سید محی الدین عرف قادر بادشاہ کے متعلق صاحب ... اولیائے دکن لکھتے ہیں کہ۔

آپ حضرت شاہ درویش کے دوسرے فرزند ہیں۔ سترہ سال کی عمر میں مسند سجادگی پر بیٹھے آپ مادرزاد
شاعر بھی تھے انتقال سے دس دن پہلے مریدوں سے کہا کہ وقت دس روز باقی ہیں ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۷۱ھ کو وصال فرمایا آپ
شاہ موسیٰ قادری ہیں اور دوسرے شاہ غلام درویش عرف دستگیر صاحب شاہ موسیٰ قادری کی ولادت ۱۱۵۰ھ
۱۱۶۹ھ میں والد کے مرید و خلیفہ ہوئے اور ۱۱۷۱ھ میں اکیس سال کی عمر میں والد کے سجادہ نشین ہوئے سجادہ نشینی
سال والد ماجد کی خدمت میں رہے۔ ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۱۵ھ کو رحلت کی۔ صاحب تذکرہ کے بیان میں اختلاف ہے پہلے
کا سنہ وفات بتلاتے ہیں اور میاں ۱۱۸۰ھ میں سجادہ نشینی کے بعد چودہ سال والد ماجد کی خدمت میں رہنے کا اظہار کرتے
ہے ایسا ۱۱۷۱ھ میں حضرت قادر بادشاہ کا وصال ہوا۔ یہی قادر بادشاہ علیم اللہ شاہ کے مرشد تھے۔

شاہ تجلی کی تاریخ گلزار آصفیہ میں صاحب کمالان علم ہیئت و ہندسہ و نجوم و رمل کے ذیل میں صفدر علی خاں بہادر
ہیں کہ صفدر علی خاں ساکن مچھلی بندر حیدرآباد آئے اور دربار سلطنت جاہ کے دربار میں باریاب ہوئے اور جب انھیں اسی اثنا میں علم تو
اور فقیری کا خیال ہوا تو مرشد کامل کی تلاش میں لگ گئے۔

"در دائرہ یبوسن صاحب علیم اللہ شاہ نامی درویش صاحب کمال و حال را کہ عالم و فاضل متبحر و متشرع بود
در قبر کہنہ گشتند و شب از نماز مغرب بیرون برآمدہ بالائے قبری نشستند پیدا کردہ مرید ایشاں شدند و مدتے در خدمت
تمام شب نشستہ فواید علوم عقلی و نقلی و علم حقیقت و معرفت حاصل نمودند و بعد رحلت آنحضرت ترک لباس دنیا
در خانۂ خود می ماندند" شاہ تجلی لکھا ہے کہ صفدر علی خاں نے ۱۲۳۶ھ میں انتقال کیا۔

حیدرآباد کے کسی کتب خانہ میں علیم اللہ شاہ کا کوئی دیوان نہیں ملا البتہ کتب خانہ آصفیہ میں فارسی کلام
ہے۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے کتب خانے میں ایک بیاض ہے جس میں علیم اللہ شاہ قادری کے اردو دیوان،
وجواب مرید و پیر یعنے ولایت خاں و شاہ علیم اللہ قادری اور فارسی کلام کا انتخاب ہے کتب خانہ آصفیہ میں
حضرت شاہ شرف بو علی قلندر کی مثنوی شمع دل افروز کا ترجمہ ہے۔ اس فارسی مثنوی کے دو نسخے ادارہ ادبیات
موجود ہیں۔ اور ایک نسخہ زیر تبصرہ اردو دیوان کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ دیوان ناقص الاول بعد خلیفہ
ایک دو اوراق نہیں۔

دیوان کے ختم پر مثنوی شمع دل افروز ہے اور اس کے بعد ایک فارسی رسالہ محرم اسرار ہے جو ناقص العمل ہے
کہیں ذکر نہیں یہ تینوں یعنے دیوان مثنوی اور رسالہ ایک کاتب کے لکھے ہوئے ہیں اور اس کے آخر میں حضرت
کے سلسلے کے ایک بزرگ سید اکبر علی شاہ نے اپنا شجرہ بیعت لکھا ہے جو مونس اللہ سید صادق علی شاہ کے مرید تھے
شاہ محب اللہ قادری کے جو حضرت کلیم اللہ جہان آبادی کے خلیفہ تھے۔

دیوان کا مطالعہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ دکنی شعرا کی تمام لسانی خصوصیات علیم اللہ کے کلام میں

ب ضرورت متحرک لفظوں کو ساکن اور ساکن کو متحرک کرتے ہیں۔ عربی آیات کا بلاتکلف استعمال کرتے ہیں۔ مرکبی محاوروں
ستعمال پر بھی قادر ہیں۔ انھیں شاعری کی تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل ہے۔ انھیں فن عروض پر بھی دستگاہ ہے اور اس
مرے دیوان میں انھوں نے چھ رکنی آٹھ رکنی اور سولہ رکنی بحریں بھی استعمال کی ہیں۔ ود ایک غزل بحر طویل میں بھی ہے ایک
متزاد ہے ایک ترجیع بند ہے اور دو مخمس لیکن یہ مخمس بہ شکل تضمین نہیں۔

غزل عشق و محبت اور رنگینی کی طلب گار ہے لیکن علیم اللہ زاہد خشک ہیں ان۔ ہاں رنگ دیوار دنیاوی عشق و
ت فقا ہے ہر شعر بلکہ ہر مصرع تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور اس طرح ان کی ہر غزل صوفیانہ مضامین کی ایک
مل غزل معلوم ہوتی ہے۔

دیوان کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

اول ہے فرض حمد و ثنا رب قدیم کا
واجب ہے نعت بعد نبی الکریم کا

اس غزل کا مقطع ہے۔

کیونکر تیرا ادا ئے ثنا ہو سکے کریم
نین کام کس عقیل و فہیم و علیم کا

یہاں جس طرح کریم کا لفظ استعمال کیا ہے اسی طرح اور کئی مقطعوں میں علیم کے ساتھ کریم کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے
چار مقطعے ملاحظہ ہوں۔

مولی کریم بر حق ہو جیا ہوں جان و دل سوں
بیشک علیم کا اب ایمان قرار آیا

عشق کو بخشش کے جب احوال میں آیا کریم
اے علیم اللہ کرم کا دو جہاں میں غل ہوا

دونوں جہاں سے کام نہیں مجکو اے علیم
بس ہے مجھے کریم دیا سو صیا صیا

کریم کے فضل ہو کر رم سوں علیم کے پاس جا پی
صدق سوں آب حیات پی کبھی تو مجکو نا مرنگے

اس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ کریم اور کریم اللہ جیسا کہ ایک اور مقطع میں لکھا ہے ضرور کوئی نام ہے لیکن علیم تخلص کی جو شکل مقطع میں ہے
اس کی کہیں بھی نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تخلص کے ہم قافیہ ہونے کے سبب اس کا زیادہ استعمال ہوا ہے۔

محاوروں کا استعمال بھی بعض مقامات پہ برجستہ کیا ہے شاہد دو شعر ہیں

عشق بازی اور خالا ماں کا در
دوئی کو جا گا نیر یاں اے حق طلب

نفس کا غلبہ ہوا جس حال میں
ہو گیا جوں سوت کا نتیا سب کپاس

پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ عشق بازی خالا کا گھر نہیں عشق بازی آسان نہیں عشق ہو تو پھر دوئی کا سوال پیدا نہیں ہوتا خالا کا گھر عام طور
ں ہے لیکن یہ نہیں کہ علیم نے در استعمال کیا یا کاتب نے گھر کی بجائے در لکھا ہے۔

دوسرے شعر کا مفہوم ہے اگر زہد و ریاضت کے درمیان نفس غلبہ پا جائے تو ساری ریاضت اکارت ہوگی گویا جتنا سوت

محنت و مشقت کے ساتھ کاتا گیا ہو پھر کپاس بن جائے گا دکنی میں یہ محاورہ کہ کالا آتا سو سوت کپاس ہو جاتی تھا بنتے تھے خود
مندرجہ بالا شعر میں وہ وحدانیت کا درس دیتے ہیں اور لاموجود الا اللہ پر ایقان رکھتے ہیں اس مفہوم کے کئی شعر کہے ہیں چند

ہے تجھ میں عرش اور کرسی زمین و آسماں سدا   کیا نیں سیر تو اپنا ہوا بیدار کیا باعث
تو دیکھ دل کے بیچ نہ ہو سٹی جھن پکار   کوہ طور کیوں جلیا جائے بے سمجھ سمج
دونوں جہاں جس کی تجلی سوں تابدار   او حسن آفتاب نین میں بجھائیں چل
شش جہت کو جید کیا ہے جمال یار   دستا ہے اے علیم نظر کو جدھر کروں

آخری شعر کی جو منزل ہے اس میں اپنی سرفرازی اور خاکساری کا نقشہ بڑے دلکش انداز میں کھینچا ہے کہتے ہیں

چاہوں کہ سیر عالم بالا اگر کروں   تا لے تلک پلک میں فلک کو گزند کروں
جب آوں عاجزی کے محل میں ہو خاکسار   یتیم کی گرد راہ کو کحل البصر کروں

خودی اور انانیت کو مٹانے کا درس اس طرح دیتے ہیں۔

جیوں جلا دے تیوں تو جل یں پن آ کو چھوڑ   صاف ہو آتش ہو جوں جلتا ہے عود
جاں لگا دے وھاں تجہ لگ تصویر ہو   دیکھ مت اپنی طرف ہو بے کس حدود

اسی غزل میں ذات اور صفت کی تشریح اس طرح کی ہے۔

ذات سو دریا و قطرہ سو صفت   دل کو دو ہوتے ہیں دیکھ یک مقصود
ذات سو اللہ صفت اس کی بشر   یک پنا ہونے کا بولیا سو قعود

اور انجام کار یہ ہوتا ہے کہ

جب کیا بندہ صفت اپنی فنا   تب ہوا اللہ پنا اس پہ ورود

اس طرح ہر غزل میں بلکہ غزل کے ہر شعر میں تصوف کا کوئی نہ کوئی مفہوم پیش کرنے کی کوشش کی ہے مثال ایک
کی جاتی ہے جس سے یہ صورت مندرجہ قول کی تصدیق ہو سکے گی۔

یتیم کے دیکھنے کے تماشے کو جائیں چل   اپنے پیا کے عشق کو اپنے میں پائیں چل
دونوں جہاں جس کی تجلی سے تابدار   او حسن آفتاب نین میں بجھائیں چل
یتیم کے حسن پر سو اپس کو نثار کر   اپنے فدا پنے کا تماشا دکھائیں چل
دل کا سرود کر کے اداسی کے تار بند   سرتی سند کا سور بجا کر سنائیں چل
پروا نہیں صنم کو کسی کے خیال سو   اس کے ہنر سو اس کو اپس میں رجھائیں چل
مجلس کیا ہے یار محل میں تجلی کے آج   خلوت سے شوق کر کے پیا کو بلائیں چل

"تابوت شود از اسکا راس ہے تیغی علیم   تا ہوت کے معنی میں سرا فعل پچانیں

اسی طرح تمام دیوان کا یہی رنگ ہے اور اردو میں تصوف کے مسلسل مضامین باندھنے والا علیم اللہ کے مقابل کا اردو کوئی شاعر نہیں۔

علیم اللہ نے حضرت شاہ شرف بو علی قلندر کی مثنوی شمع دل افروز کا بھی ترجمہ کیا یہ مثنوی بھی تصوف کے مضامین کی حامل ہے اس کے ترجمے کے تعلق سے کہتے ہیں۔

ناگہاں خاطر میں آیا ایک روز ۔۔۔ مثنوی ہے یہ جو شمع دل افروز
شاہ شرف الدین قلندر بو علی ۔۔۔ فارسی فرمائے ہیں حق کے ولی
فرس داں ہوتے ہیں اکثر بہریاب ۔۔۔ عالم بے علم ہیں اندر حجاب
ترجمہ کر اس کا در ہندی کلام ۔۔۔ تا کہ پاویں فیض اس تے خاص و عام
معتبر ہے گرچہ کلام فارسی ۔۔۔ لیک ہندی ہے سخن جوں آرسی

کہتے ہیں کہ چونکہ فارسی مثنوی سے غیر فارسی داں واقف نہیں ہو سکتے اس لئے ہندی میں ترجمہ کر دینے سے اس کا فیض عام ہو جاتا ہے اسی لئے ترجمہ کرنا شروع کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بارھویں صدی ہجری کے آخر تک میں بھی اردو کو ہندی ہی سے موسوم کیا جاتا تھا۔

ترجمہ تقریباً لفظی ہے لیکن نہایت واضح شستہ اور سلیس ہے اپنی سلامت اور روانی کے باعث اس کو مقبول عام ہونا چاہیے تھا مگر اس کے مخطوطے بہت کم ملتے ہیں ممکن ہے کہ بالکلیہ تصوف کے مضامین کی وجہ سے اس کی طرف توجہ نہ ہوئی یا حضرت علیم اللہ شاہ جس قسم کی زندگی گذارتے تھے اس وجہ سے اس کو شائع ہونے کا موقع نہ ملا ہو۔ یہاں عشق کی تعریف میں چند شعر اصل مثنوی کے مع ترجمہ پیش کئے جاتے ہیں جس سے حضرت علیم اللہ کی قادر الکلامی اور فارسی دانی کا اندازہ ہو سکے گا۔

اصل	ترجمہ
حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندر	حضرت علیم اللہ شاہ
عشق کو تا ہر دو عالم را برد	عشق بے شک دوئی عالم سے لے جاوے
عشق کو تا جامہ ہستی در درد	جامہ ہستی کوں کیتا تار تار
عشق کو بے بال و پر طیران کند	پھر عشق بے بال و پر پروانہ ہے
عشق کو در لامکاں جولاں کند	در ہوائے لامکاں و سانتے
عشق کو تاج سلطانی نہد	عشق سر پہ تاج سلطانی رکھا
عشق کو ملک سلیمانی دہد	عشق تخت سلیماں پہ بٹھائے

عشق کو تا چشم دل بینا کند — عشق تیری چشم دل بینا کرے
عشق کو تا سینہ پر سودا کند — عشق بے شک آئینہ سینہ کرے
عشق کو تا عقل را زایل کند — عشق تیری عقل کو زایل کرے
عشق کو تا عقل کل حاصل کند — عشق تجھ کو معرفت حاصل کرے
عشق کو تا جام مدہوشی دہد — عشق تجھ کو جام عرفاں دیوے بھر
عشق باید تا فراموشی دہد — عشق دیوے تجکو اور بہوش دگر
بادہ دہ تا بے خبر سازد مرا — ساقیا دے مجکو یک جام شراب
عشق کو بے پا و سر سازد مرا — دل کو میرے گرم کر جوں آفتاب

مے کی مستی سے مجھے مستانہ کر
بے خود و بے پا و بے سر دیوانہ کر

جن صوفیائے کرام نے اپنے مریدوں اور معتقدین کے لئے کتابیں اور رسائل لکھے اور اپنے شعر و سخن کی مدد سے عوام کے قلوب کو مسخر کیا ان میں علیم اللہ شاہ بھی ہیں جن کا کلام اس قابل ہے کہ منظر عام پر لایا جائے۔

سلسلہ صفحہ ۱۳ بقیہ - اُردو اَدب میں خطوط نگاری

ہوتے جا رہے ہیں لیکن اگر ان کھنڈروں کی سیر دل جمعی سے کی جائے تو آج کی زندگی کے لئے بھی بہت کچھ مل سکتا ہے الہلال میں بھی گمنام خط چھپے تھے یہ سوال بہت تیز رہا ہے کہ ابو الکلام کے خلاف یہ خطوط کس نے لکھے تھے آیا خود انھوں نے آپ کو لکھ کر اپنی اپوزیشن کے محفوظ کرنے کے لئے استعمال کیا ہو یہ ایسا سوال ہے جو تحقیق چاہتا ہے تاہم اسلوب اور انداز بیان سے سرسری اندازہ قائم ہو جاتا ہے۔

خطوط کی فنی اہمیت اور اس کی راست اپیل سے فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے خاص کر صحافت تنقید اور ادب کے دوسرے شعبوں میں اس صنف کا اثر بہت گہرا ہوگا۔

رزاق فاروقی

اُردو ادب میں خطوط نگاری

اردو میں خطوط نگاری کی اتنی عمر نہیں جتنی کہ اردو شاعری کی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اُردو میں بھی خطوط اس وقت سے لکھے جاتے جب سے یہ زبان علم و ادب کے لئے استعمال ہونے لگی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ ہندوستان کا طبقاتی نظام زندگی تھا۔ اس کے علاوہ اردو اور فارسی کا چلن مدتوں ساتھ ساتھ رہا اس لئے اونچے طبقے کے لوگ بولتے تو اردو تھے لیکن خطوط فارسی میں لکھا کرتے تھے اب رہا نچلا طبقہ اس کی تو کوئی تاریخ متعین نہ ہو سکی۔ ہمیں فارسی ادب میں بھی اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط مل جاتے ہیں[1] لیکن اب تک کسی سپاہی کا خط دریافت نہ ہو سکا۔

خطوط نگاری کو فنون لطیفہ کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ خطوط نگاری کی فنی اہمیت یہ ہے کہ اسلوب بیان اور اظہار کے سارے فن استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اس میں شعر کی طرح ایمائیت سے بھی کام لیا جا سکتا ہے اور وضاحت بیان سے بھی چونکہ خطوط کی کوئی فنی دھوپ چھاؤں نہیں ہوتی اس لئے سادگی اور بے تکلفی ہی خطوط کی جان سمجھی جاتی ہے۔ خطوط کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ بغیر کسی موضوع اور خیال کے ظہور پذیر ہو جاتے ہیں صحیح نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہم بغیر کسی مقصد کے ایک دوسرے سے کبھی کبھی بات کر لیتے ہوں لیکن خطوط کی بنیادی دفعہ یہ ہے کہ یا تو مکتوب الیہ کا کچھ کام ہو یا مکتوب نگار کے کام کے علاوہ جذبات اور احساسات کا اظہار بھی مقصد ہی کی زد میں آتا ہے اس طرح خطوط کا وجود کسی نہ کسی کام جذبہ یا موضوع کے اظہار کے لئے ہوا کرتا ہے۔

جب کبھی اُردو خطوط نگاری کا ذکر آتا ہے تو ہم غالبؔ کو خطوط نگاری کی تاریخ کے ابتدائیہ کے طور پر پیش کرتے ہیں غالبؔ سے اب تک ایک صدی کا زمانہ گذر چکا اس مدت میں ان گنت خطوط ضبط تحریر میں آئے لیکن بحث صرف ادبی خطوط سے ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادبی خطوط کیا ہیں جن کو ہم فنون لطیفہ میں شامل کرتے ہیں۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ خط مضمون نہ ہو فلسفہ کا کوئی مقالہ نہ ہو نصیحتے شوپنہار اور سعدی وغیرہ جیسے مشاہیر پر محاکمہ نہ ہو بلکہ مکتوب الیہ اور مکتوب نگار دونوں کے ذہنی اور جذباتی تعلقات کا ادبی اظہار ہو۔ اس صنف کی ترقی کا تعلق اُردو زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کے ادبی معیار سے وابستہ ہے جیسے جیسے لوگوں میں ادبی ذوق اور لطافت و رنگینی پیدا ہوگی غالبؔ ابوالکلام اور شبلی کی طرح اظہار کی رنگارنگی اور دل آویزی

---

[1] اورنگ زیب عالمگیر سے پہلے سلاطین قطب شاہی کے مکاتیب جو شاہان ایران کے موسوم ہیں وہ دریافت ہو چکے ہیں اور ایسے فارسی مکاتیب کا مجموعہ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو رہا ہے جسے نواب عباس حسین خاں خلف نواب ثابت جنگ بہادر نے مرتب کیا ہے (ادارہ)

کا تنوع اردو کو مالا مال کر سکے گا۔

خطوط کی اہمیت کئی طرح سے ہوتی ہے بعض خطوط کی ادبی اہمیت ہوتی ہے اور بعض کی سوانحی بھی خطوط بعض وقت اس
کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں جس دور میں لکھے گئے تھے۔ خطوط صاحب خط کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں صاحب خط جتنا واضح ا
اپنے خط میں نظر آتا ہے وہ اپنی کسی دوسری تحریروں میں نظر نہیں آتا۔ خطوط مکتوب نگار کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں اس کی شخ
سمجھنے کے لئے خط سے زیادہ کوئی دوسری چیز اہم نہیں فن کار کو سمجھنے کے لئے فنکار کی تخلیقات سے بھی استفادہ کر سکتے ہ
اس کے لکھے ہوئے خطوط کی روشنی میں جو شخصیت ابھرتی ہے وہ کسی دوسری صنف ادب سے نہیں ہوتی حالی نے غالب کو حیوان ناط
تھا ان کی ظرافت ہمیں ان کے اشعار   اور ان کے خطوط میں ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن غالب کی نجی زندگی کو سمجھنے کے لئے ان
ہمیں مغالطہ میں ڈال سکتے ہیں لیکن ان کے خطوط ان کی شخصیت کو سمجھنے میں سب سے زیادہ اہم ہیں چنانچہ غالب کو سمجھنے میں
سے زیادہ غالب کے خطوط اہم ہیں۔ خود صاحب یادگار غالب نے خود خطوط سے استفادہ کیا ہے۔

غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ وہ اُردو نثر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ف
ولیم کالج اور دہلی کالج نے اردو نثر کے لئے بہت کچھ کیا تھا اور میر امن اور رجب علی بیگ سرور نے جدتیں پیدا کی تھیں
میں ابھی تک وہ بات پیدا نہ ہو سکی تھی جو زندگی کے عام استعمال کے لئے ضروری ہے۔ ان لوگوں نے اردو نثر کو سنگھار تو
لیکن زندگی کی گرمی عطا نہیں کی تھی۔ غالب نے اپنی زندگی کو خطوط میں ڈھال کر اُردو نثر کو زندگی بخشی۔ اس طرح غالب نے
عمومی قدروں کو مضبوط بنانے میں نمایاں کام انجام دیا۔ جہاں ان کے خطوط ان کی نجی زندگی اور شخصیت کا آئینہ ہیں وہ
ہمیں یہ بھی بتلاتے ہیں کہ غالب کے دور کے عمرانی اور سیاسی مسایل کیا تھے ہم غالب کے خطوط کو محض اس لئے پسند کرتے ہیں کہ ا
تحریر کے بے شمار جلوے ہیں حالاں کہ اور کئی مفید باتیں ان سے معلوم ہو سکتی ہیں ۱۸۵۷ء کے وہ واقعات جن میں ہماری جد
کے بارے میں معلومات ہیں جہاں سے ہماری سیاسی اور تمدنی تاریخ کا ایک اہم باب شروع ہوتا ہے یہ خطوط بہت کچھ روشنی
اسی طرح غالب کے خطوط نہ صرف ان کے دل کی تفریح بلکہ اس زمانے کی دلی کے دل کی دھڑکنیں بھی سنی جا سکتی ہیں ان خطوط
کے غدر کی بربادی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ تاریخی دستاویز سے کم نہیں۔ اس بارے میں دلچسپ اور ساتھ ساتھ اہم بات
انسانی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں یہ ان کی شخصیت کا مقام عروج ہے۔ انہیں صرف مسلمانوں کے مارے جانے کا غم نہیں بعض ا
قتل کا بھی بہت افسوس ہے۔ خطوط میں بھی وہ زندگی کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھتے رہے۔ وہ کبھی شاکی ہیں اور کبھی واقعات کے
وہ کبھی طنز سے اپنے مسایل کا جائزہ لیتے ہیں تو کبھی فلسفیانہ موشگافیوں سے اسی چیز کو اظہار کے
ڈھالتے ہیں اس طرح ان کی شخصیت فولاد کی طرح سخت نہیں بلکہ حالات سے متاثر ہے اور حا
اپنے سے مطابق کرنے کے لئے کوشاں ہے اور مفاہمت کے لئے ہمیشہ ہاتھ بڑھاتی ہے۔

غالب کے خطوط کے بعد اردو ادب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط مشہور ہوئے۔ ان خطوط کے تین مجموعے ہمیں ملتے ہیں۔ غبار خاطر، کاروان خیال اور نقش آزاد۔ ان میں پہلے دو مولانا کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔ لیکن نقش آزاد کو مولانا غلام رسول مہر نے مولانا ابوالکلام کی وفات کے بعد شائع کیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ تینوں خطوط کے مجموعے مولانا کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے یکساں معاون نہیں۔ "غبار خاطر" اور کاروان خیال، اسلوب بیان، مواد، ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے "نقش آزاد" سے بالکلیہ مختلف ہیں۔ ان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ خطوط غالب اور دیوان غالب میں۔ غبار خاطر اور کاروان خیال کے خطوط میں مولانا نے نثر میں شاعری اور جدت فکر و وسعت تخیل کی رنگ آمیزی کی ہے اس کے برخلاف "نقش آزاد" کے خطوط غالب کے خطوط کی طرح سیدھے سادے ہیں۔ ان میں کوئی داعیانہ پیام نہیں بلکہ عام زندگی کی باتیں ہیں۔

"دیوان غالب" کی طرح "غبار خاطر" بھی مصنف کے محشر خیال ہونے کی ضمانت ہے۔ "غبار خاطر" اور "کاروان خیال" کے خطوط مولانا نے اُس دور میں لکھے تھے۔ جب وہ احمد نگر جیل میں محبوس تھے چنانچہ قید و بند کی زندگی میں انھوں نے اپنی پسند کا مشغلہ ڈھونڈا ہندوستان کے رہنماؤں نے جیل میں رہ کر یا تو بیوی کو خط لکھے یا بیٹی کو، ابوالکلام نے خود کو خط لکھے ہیں۔ ان کا خیالی محبوب یا مکتوب الیہ صدر یار جنگ کی شخصیت تھی۔ اگر ہم صدیق مکرم کے الفاظ نکال دیں اور وہ روایتی جملے جو خطوط میں لکھے جاتے ہیں حذف کر دیں تو ہمیں "غبار خاطر" کے تمام خطوط اُردو کے اچھے انشائیے نظر آئیں گے۔ اس میں نہ تو ابوالکلام کی شخصی زندگی نظر آتی ہے اور نہ ان کی طبیعت کا سراغ لگتا ہے۔ جذ کا ہے کہ یہ ابوالکلام کی انانیت کا ادبی اظہار ہیں یہ خطوط جیل کی زندگی کی فرصت اور جیل میں بھی ابوالکلام کی ذہنی آزادی کے ترجمان ہیں۔ نہ صرف ابوالکلام بلکہ اکثر مشاہیر کو ان "فرصت کے لمحات" سے سابقہ پڑا تھا۔ حسرت موہانی نے قید و بند کی مصیبتوں اور اپنی شاعرانہ طبیعت کا ذکر اس طرح کیا تھا۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

سید حسن نے اردو اور ہندی کے ان ادبی شہ پاروں کا انتخاب "چمن بولت ہے زنجیر" کے نام سے شائع کیا تھا جو قید کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں لکھے گئے تھے اس میں مولانا ابوالکلام، ظفر علی خاں اور حسرت موہانی کے علاوہ بہت سے ترقی پسند ادیبوں کے نگارشات قلم بھی شامل تھے۔ ان سب تحریروں میں ہر ایک کی اپنی انفرادیت نظر آتی ہے۔

ابوالکلام کے خطوط کے بعد شبلی کے خطوط پسندگی کی نظر سے دیکھے گئے۔ شبلی کے خطوط کے بارے میں خورشید الاسلام کا خیال ہے کہ ان میں آبشار کی تمکنت اور چاندنی کا حسن ملتا ہے۔ خطوط میں مزاج کی چاشنی، زندگی کی سادگی، دوستی کی بے تکلفی، مقصد کی تکمیل کے لئے بعض اوقات چاپلوسی جیسی نہ جانے کتنی باتیں ہمیں خطوط کی سطروں میں ملتی ہیں۔ یہ سب مکتوب نگار کی شخصیت سے متعلق ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خطوط کا تعلق صرف مکتوب نگار ہی سے نہیں ہوتا بلکہ مکتوب الیہ کے متعلق بھی خطوط میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ خطوط کی تخلیق کی تہہ کی اثر انگیزی اور واقعات کا بیان مکتوب الیہ کی شخصیت ہی سے متعلق ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر غالب جب ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں تو اس نگارش میں اور مفتی صدرالدین آزردہ کے نام کی نگارش میں اہم بنیادی فرق محسوس کرتے ہیں۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ جہاں پر خطوط مکتوب نگار کی شخصیت کو سمجھنے دیتے ہیں وہیں مکتوب الیہ کی شخصیت، اس کا سماجی مقام اس کا علمی و ادبی مذاق اور معیار مکتوب نگار کے ساتھ اس سبھی کچھ اس پر اثر انداز ہوتے ہیں غبار خاطر میں علمی اور ادبی مباحث اس لئے ہیں کہ وہ نواب صدر یار جنگ کے مزاج کی چیز ہیں۔ شاید ابوالکلام الہلال کے کسی کاتب کو مخاطب کرتے وقت یہ بحثیں نہ چھیڑتے کیونکہ مکتوب نگار مکتوب الیہ کی شخصیت کو ذہن میں رکھ کر ہی خط لکھتا ہے۔ یہی حال شبلی کے خطوط کا ہے۔ شبلی کے تمام خطوط میں چاندنی کے حسن کا بیان کرنا اور آبشار کی نغمگی کو سننے کی کوشش کرنا غلط ہے۔ شبلی کے وہ خطوط جو عطیہ فیضی کے نام ہیں یقیناً اپنی تمام رعنائی کے ساتھ ایک خاص کی چیز ہیں لیکن شبلی کے وہ خطوط جو سلیمان ندوی کے نام ہیں یا دیگر مشاہیر کے نام ہیں اس سے ہٹے ہوئے ہیں۔

شبلی کے وہ خطوط جو عطیہ فیضی اور زہرہ فیضی کے نام ہیں اردو ادب میں اس لئے اہم ہیں کہ ایک بڑے مورخ شاعر نے لکھے ہیں۔ اس میں انسانی دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں اور وہ عقیدت کا پردہ جو "سیرت النبی" کے مورخ سے ہمارے ذہنوں پر پڑا ہے اٹھ جاتا ہے اور ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ انسان کی وارفتگی ایک قدر مشترک ہے جو کے ساتھ ساتھ فطرت نے خواص کو بھی عطا کی ہے۔ شبلی کے ان خطوط میں انتہائی سپردگی کا عالم ہے سپردگی ہے اور رعنائی کی کوشش ہے وہ جو شبلی کو ہمیشہ مورخ ہی دیکھنا چاہتے ہیں یا وہ جو شبلی کے ریاض سے ہمیشہ ادق سے ادق عربی حوالے سننے کے مشتاق ہیں وہ ضرور مایوس ہونگے۔ یہ مایوسی دراصل اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ شبلی کو علمی حیثیت اور ایسا شخص نہیں سمجھتے جس کے پاس جلال و جمال، جذبات و خواہشات اور ایک مکمل انسان جیتا جاگتا ہے۔ وہ ہمیں کبھی یہ محسوس ہونے نہیں دیتے کہ وہ اردو ادب اور شاعری کے قصر کے اہم ستون ہیں ان کو اپنے اس مقام کا احساس نہیں رہتا۔ نجی زندگی کی سب سے بڑی اچھائی یہی ہے کہ یہ احساس ہونے نہ دیا جائے۔

آج اردو کے نئے ادب میں خطوط دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں ان کی اہمیت اور افادیت کا احساس ہے۔ صفیہ اختر اور سجاد ظہیر کے خطوط نہایت دلچسپی سے پڑھے گئے۔ خطوط کے اسلوب کی افادیت اور سہل کے مدنظر اس فن کو دوسرے ادب کے شعبوں میں بھی برتا گیا۔ قاضی عبدالغفار کا ناول "لیلیٰ کے خطوط" اپنے افادیت سے قطع نظر اظہار بیان کی سادگی اور راست انگریزی کی وجہ سے بھی مقبول ہوا۔ اس ناول میں خطوط کو اظہار خیال کے لئے راہ نکالی گئی ہے۔ اس طرح ایم اسلم نے "بیتی باتیں" ناول میں یہی تکنیک برتی تھی۔ اس کے علاوہ خطوط کی تکنیک سے کئی لکھنے والوں نے فائدہ اٹھایا۔ صحافت میں کھلے خط اظہار خیال کا راست اور موثر ذریعہ سمجھے جاتے ہیں لیکن آزادی کے بعد اس پر بہت کم توجہ دی گئی۔ اودھ پنچ کے کھلے خط اور منظومہ مضامین آ

پروفیسر شیخ فرید

کہو گھر مانگیا سوز غم حب وطن آخر
مجاہد چل پڑے باندھے ہوئے سر سے کفن آخر

گلوں کے ساتھ کانٹوں نے بھی بدلا پیرہن آخر
چمن کے کام تو آیا جنوں کا بانکپن آخر

ہماری سادگی تھی پردہ دار دوستی لیکن
بھلا کب تک چھپا رہتا کسی کا مکر وفن آخر

ہم اس کے واسطے موج فنا میں ڈوب جائیں گے
ہماری زندگی ہے عظمت گنگ و جمن آخر

یہاں کے ذرہ ذرہ میں ہمارا نقش ہستی ہے
تجھے ہم چھوڑ کر جائیں کہاں اے انجمن آخر

بہت ہی سخت تھا لیکن طلسم بے خودی ٹوٹا
ہوا بیدار ذوق خدمت دار و رسن آخر

فرید اس دور پر آشوب میں کیوں یہ گہر پاشی
برابر ہے خزف کے قیمت دُر عدن آخر

ڈاکٹر سلام سندیلوی

اب جام ہاتھ میں ہے کہ جب تشنگی نہیں
مجھ سا بھی بد نصیب کوئی آدمی نہیں
دولت پہ منحصر کبھی دل کی خوشی نہیں
گل ہیں اداس گو زر گل کی کمی نہیں
وہ دل اسیر غم ہے نہیں جس میں تیری یاد
ظلمت اسی جگہ ہے جہاں چاندنی نہیں
ذرات خاک لے کے گئے فصل خزاں میں بھی
صحن چمن میں نکہت گل عارضی نہیں
شبنم مزدور تجھ سے ہوئی ہے کوئی خطا
یوں ہی سزائے گریہ کسی کو ملی نہیں
اہل وفا کا بعد فنا بھی رہا ہے نام
گل ہو گیا چراغ مگر تیرگی نہیں
ہو گردش زمانہ پہ کس طرح اختیار
روکے سے اپنی عمر رواں جب رکی نہیں
حالانکہ اختلاف ہے پھر بھی ہیں ساتھ ساتھ
دھوپ اور چھاؤں میں کوئی بیگانگی نہیں
اس دور میں بدل گئے سارے تصورات
کوئی بھی شے حدود کے اندر رہی نہیں
وہ دل جو عشق میں نہیں مدعا کا اے سلام
اک پھول ہے کہ جس میں کوئی پنکھڑی نہیں

دلیپ باڈل

ہمیں بھولو یقین اس کا نہیں ہے
جہاں تم ہو ہمارا دل وہیں ہے
ہوا سیراب یہ جن کے لہو سے
انہیں کا حق گلستاں پر نہیں ہے
مقدر آزمائی کر رہا ہوں
در محبوب ہے میری جبیں ہے
مصیبت میں جو کام آئے کسی کے
کہیں ایسا کوئی انساں نہیں ہے
مرا دل بھی ہے کاشانہ تمہارا
تمہاری یاد بھی اس میں مکیں ہے
بجز سیل حوادث زندگی میں
نہیں ہے کچھ نہیں ہے کچھ نہیں ہے
مآل کار سے وحشت ہے کتنی
کلی جو بھی ہے وہ اندوہگیں ہے
ہے سر زانو پہ ان کے آنکھ پُرنم
ہماری موت بھی کتنی حسین ہے
خلش اس کی رہے جاری ہمیشہ
نگاہ ناز کتنی دل نشیں ہے
کہاں دہلی سے جائیں اٹھ کے باڈل
نزہ کشمیر کا حاصل یہیں ہے

ریونڈ ہنسن ریحانی

پیاپے انقلاب آئے زمیں بدلی زما
مگر اب تک نہ کردار امیر کا زوال
بدل جاتی ہیں بیشک بدکی قدریں حضرت
بشر کی منزل مقصد کا ہے سنگ نشار
نظر میں اہل بینش کی خزاں رنگ بہا
یہ کیا سوجھی کہ مرغان چمن نے آشیا
تماشائے جمال دوست کا دعوی بجا
نظر آتا ہے ہر اہل تماشا کا بیمار
وہی جوش تلاطم ہے محیط زندگا
دل طوفاں بہ کش اپنا حقیقت میں
نہیں کرتا حیات انساں احترام آئین
تو قدرت ایک دن لیتی ہے اس کا
خدا معلوم کتنوں نے پکارا دار پر چ
نہ بیداری سے اہل دہر کا خواب گرا
گلوں کی سرگرانی کا نہیں احساس
بہار آئے ہے اس درجہ شعبدہ باز

علہ اگرچہ ردیف میں تغیر ناجائز ہے مگر ایک اچھے شعر کی تخلیق میں اسے مانع نہ ہونا چاہیے (ریحانی) لازمی طبع خیرہ شوخ گل ہو گیا ہے

انوارِ ظہوری

مری حاجت ہے دنیا کو غمِ جاناں یہ بتلا دوں
نہیں ممکن تجھے دل میں بساؤں اور دھوکا دوں

نہ دولت ہے نہ سرمایہ مرا دامن تو خالی ہے
اگر منظور ہو تجھ کو تو میں غزلوں کا تحفہ دوں

محبت اک محبت ہے یہ ظاہر ہو کے رہتی ہے
یہی جی میں ہے اب اس بے خبر دنیا کو سمجھا دوں

جسے دیکھو وہی شاکی ہے اخلاصِ محبت کا
جو بس میں ہو تو سینہ چیر کر ان سب کو دکھلا دوں

یہی دس پانچ مجموعے مری ہستی کا حاصل ہیں
مرے دامن میں کیا رکھا ہے کہئے آپ خود کیا دوں

یہ دنیا ہے اسی دنیا میں رہنا بھی ہے جینا بھی
ستارے توڑ کر میں آسماں سے آپ کو لا دوں

یہی دو دن تمہارے بعد ارمانوں کو ڈستے ہیں
تمہارے ساتھ گذرے تھے یہی ساون یہی بھادوں

نہ ہوگا اب مرے ویران سینے میں گذران کا
یہی بہتر ہے دل کے پاس ارمانوں کو پہنچا دوں

کسی کے ساتھ میں نے خود انہیں جاتے ہوئے دیکھا
تجھے کس چیز کی تعبیر اے خوابِ تمنا دوں!

الٰہی، خوب تو نے لاج رکھی ہے دعاؤں کی!
کسی کے ہو چکے وہ اب تو قصر آرزو ڈھا دوں

ظہوری ہوں سرِ مو فرق اسمیں ہو نہیں سکتا
غزل میں ہو بہو تصویر تیری یوں دکھا دوں!

سید واجد علی خاں واجد

آپ نے رخ کیا کیا نہ کیا
عمر نے دم لیا لیا نہ لیا

مدتوں زندگی نے تیرے بغیر
یوں جلایا جیا جیا نہ جیا

وہ مقام آگیا تمنا نے
اب سہارا دیا دیا نہ دیا

راہِ الفت میں حسن کی منزل
یاں کبھی دم لیا لیا نہ لیا

آنکھوں آنکھوں میں بھی حیا نے
یوں پلایا پیا پیا نہ پیا

الفت لو کی وہ گھڑی نہ پھری
اب ملا کیا کیا نہ کیا

آدمیت نہ مٹ سکے واجد
آدمی کیا جیا جیا نہ جیا

سید سراج الدین علیخاں ورڈسورتھ

نرگسِ زریں نگار

مثلِ بادل گھومتا پھرتا تھا میں بیگانہ وار ‏ وادیوں کے دوش پر ہوتے فرازِ کوہسار
یک بیک میری نظر جیسے اٹھ گئی بے اختیار ‏ دیکھتا کیا ہوں ہجومِ نرگسِ زریں نگار
جھیل کے دامن میں پیڑوں کے تلے کھلتے ہوئے
نرم جھونکوں سے صبا کے جھومتے ہلتے ہوئے
اک مسلسل روشنی جیسے ستاروں کی ضیاء ‏ جھلملا کر دھندھلا سا بنائے نور کا
کچھ اسی انداز سے پھیلے ہوئے بے انتہا ‏ دامنِ ساحل پہ خیزاں سلسلہ در سلسلہ
اک اچٹتی سی نظر میں دیکھتا ہوں بے شمار
لہلہاتے سرخوشی میں ناچتے مستانہ وار
ان کے پہلو میں کبھی لہراتی ہے گرچہ موجِ آب ‏ پست کر دیتی ہے اس کو ان کی موجِ آب و تاب
اور کیا ہو ایک شاعر کی مسرت کا نصاب ‏ اس نشاط انگیز صحبت سے فزوں تر انتخاب
غرقِ نظارہ رہا جانچا نہ غور و فکر سے
کیا متاعِ بے بہا منظر نے بخشا ہے مجھے
تخت پر آسودگی سے لیٹتا ہوں جب کبھی ‏ ہو مخلع طبع یا کچھ سوچ ہو آئی ہوئی
کوند جاتے ہیں وہ اس چشمِ تخیل پر مری ‏ فرحت افزا جن کی ضو سے تیرہ تنہائی ہوئی
دیکھتے ہی دل مرا مسرور و شاداں ہو گیا
اور ہنستی نرگسوں کے ساتھ رقصاں ہو گیا

قمر ساحری

شہرِ خاک

لرز رہا ہے ابھی دستِ جرأتِ بے باک
کہاں کیا ہے کسی نے قبائے جہل کو چاک

خرابِ جام کو اس کی خبر کہاں ہے ابھی
کچھ اور بھی ہے پسِ نشۂ فشردۂ تاک

ابھی زمیں پہ ذروں کی ہو رہی ہے تلاش
ابھی کہاں نظر آیا ہے عالمِ افلاک

دکھائی دیتا ہے سورج میں اک اندھیرا سا
کسے خبر کہ ابھی نور خود ہے ظلمت ناک

یہ شہرِ خاک ہے اک دشتِ بے نشانِ قدم
ہنوز خواب ہے میلادِ آدمِ افلاک

چمک رہے ہیں مسلسل سرابِ ماہ و نجوم
ٹھہر نہ جائیں کہیں تشنگانِ خطۂ خاک

صدیق نظر

ناگزیر

میں نے محسوس کیا ہے مری ہستی کا وجود
سایۂ غم ہے دھندلکا ہے تمناؤں کا
نامرادی کا فسوں جاگ رہا ہو جیسے
یہ بھی تقدیرِ محبت کا لکھا ہو جیسے

ہر طرف دھند ہے ناکامی و مجبوری کی
کوئی آہٹ بھی نہیں دل کے دھڑکنے کے سوا
کوئی نغمہ بھی نہیں زخم چٹکنے کے سوا
کیا خبر حد ہے کہاں اب مری محرومی کی

ہاں مگر میرے مقدر کے سیہ خانے میں
تیری چاہت کی کرن رقص کیا کرتی ہے
یوں اجالا ہے ترے غم سے سرِ شامِ الم
جیسے مرقد پہ کوئی شمعِ وفا جلتی ہے

سرخوش ہے دلِ برباد جیے جاتا ہے
سانس لینے کا حسیں جرم کئے جاتا ہے
میں بھی خوش ہوں کہ چلو زیست بہل جاتی ہے
یہ بھی تقدیرِ محبت کا لکھا ہو جیسے ! !

ایک چیخ

تاج مہجور

مجھ کو ناگن کہنے والو
میرے سینے میں بھی دل ہے
جسکی دھڑکن
شام الم کی تاریکی میں
پیار کا نغمہ روپ کی شبنم بن جاتی ہے
پیسر ڈالے جلتے ہونٹوں میں جیون کا رس برساتی ہے
عیاشی کی کوکھ نے یوں تو
جیون کے ہر دور میں لاکھوں کرشن کیلئے جنم دیے ہیں
ناری روپ کی کومتا کو
لاکھوں رستے زخم دیے ہیں
حسن کی کلیاں
پیار کی شبنم جرم و ہوس کے بازاروں میں
صدیوں سے بکتی آئی ہے۔
محلوں کی رنگین فضا یا تہہ خانوں کی تاریکی میں
جو فولادی ہاتھ بڑھا ہے
اسکا لوہا رفتہ رفتہ
پاؤں کی زنجیر بنا ہے
عورت کی تقدیر بنا ہے

مجھ کو ناگن کہنے والو
آؤ اپنا ہاتھ بڑھاؤ
میں نرمل ہوں
میں کومل ہوں
اپنی باہوں کے لوہے کو پیار کی بھٹی میں پگھلاؤ
فولادی زنجیر کے بدلے میرے لئے اک ڈھال بناؤ
میں سیتا ہوں
میں مریم ہوں
عیسٰی میرا ہی بیٹا تھا

محمد مظفر حسین خاں

"پہلی تاریخ"

صبح سے سوچ رہی ہوں کہ وہ آئے گا ضرور آئے گا گو کمبخت جب بھی آتا ہے شرارت سے بھرپور نازل ہوتا ہے چھیڑتا ہے ستاتا ہے جلاتا ہے طنز کرتا ہے اور پھر مجھے رُلا کر ہی جاتا ہے۔ اس کے سوا اُسے آتا بھی کیا ہے۔ کبھی جھوٹے منہ مجھ سے محبت سے بات بھی نہ کی جب کوئی چیز مجھے بھاتی ہے اور میں اس کو خریدنے کا ارادہ کرتی ہوں تو نکتہ چینی کرتا ہے اور چن چن کر نقص نکالتا ہے کچھ دن پہلے کی بات ہے میں نئی شرٹ شلوار پہنے سینما دیکھنے جا رہی تھی تب ناوقت ٹپک پڑا اور ناک بھوں چڑھا کر کہنے لگا "ارے بھئی یہ لباس ہے یا پھرتا کارٹون لوگ تعجب سے دیکھیں گے کہ یہ کون سے فلم کا اشتہار ہے۔ چلو تو نزاکت سے معلوم ایسے ہوتا ہے کہ گڑیا کو چابی دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ ٹھمک ٹھمک چلنے لگی ہے۔ بیٹھو تو ادب اور تکلیف سے۔ جیسے بھری محفل میں کھل کر بیٹھیں تو ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے میری نانی اماں کہتی تھیں ان کے زمانے میں شرٹ شلوار کو غلاظت سے بچانے کے لئے مہترانی ایسا لباس پہنتی تھی شلوار کے پائنچے تنگ کرتی اور موٹے سے کپڑے بھی پہنا کرتی تھی اب یہ زمانہ بھی آگیا ہے کہ شریف گھر کی لڑکیاں یہ لباس پہن کر فخر محسوس کرتی ہیں۔ بے حیا۔ لعنت ہے سب پر۔

اس بکواس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ او مہترانی جی تھوڑا فنائل یہاں بھی چھڑک جاؤ۔ یہاں بھی گندگی ہے۔ یہ سن کر غصہ تو بے حد آیا میں نے تہیہ کر لی کہ نہ ایسا لباس پہنوں گی اور نہ ایسی باتیں سنوں گی۔ امی سے آج آنے کا وعدہ کر گیا تھا۔ مگر پھر بھی جھوٹ کہا آنے کا وعدہ کب ...... مجھے کیا وہ آئے یا نہ آئے میری بلا سے! وہ مجھے جلاتا ہے تو میں بھی اُسے جلانے کی کوشش کرتی ہوں مگر کمبخت جیسے چکنا گھڑا ہے واٹر پروف ہے۔ اس پر کسی قسم کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

آج کا دن بھی گذرا جا رہا ہے مگر وہ نہیں آیا نہ جانے میں کیوں اس کا انتظار کرتی ہوں۔ اس کی راہ تکا کرتی ہوں وہ نہیں آتا تو بے چین ہو جاتی ہوں کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔ جب وہ آ جاتا ہے تو میرے دل میں سکون سا محسوس ہوتا ہے مگر اس کی حرکات سے مجھے چڑ سی ہو پھر بھی انتظار رہتا ہے۔ کہیں میں .... توبہ میں یہ کیا سوچنے لگی کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے میں اور بے وقوف سے محبت کروں۔ مجھے تو اس کی صورت سے بھی نفرت ہے۔

دل نے کہا "پھر یہ بے چینی کیوں؟ اور یہ انتظار کس لئے؟ جب وہ سامنے ہوتا ہے تو یہ بیزاری اور یہ نفرت کیوں؟

مگر کیوں کہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں۔ رات بھی ہو گئی مگر وہ نہیں آیا۔

وہ مذاق کا چھپانا ظاہر ہے صبح کا آلارم تھا۔

ناشتہ کر کے اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ نجمہ دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی آتے ہی گلے شکوے کرنے لگی میت مجھ سے خفا ہی ہوئی پھر کالج کی باتیں ہوئیں ادھر ادھر کی گپ شپ میں قریباً گیارہ بج گئے۔ میڈیکل کالج میں آج کرکٹ میچ تھا۔ بھیا نے دو دن پہلے ہی ہمیں میچ دیکھنے کے لئے خاص طور پر دعوت دی تھی۔

نجمہ کے کہنے پر مجھے یاد آیا کہ انہوں نے ہمیں اصرار کر کے آنے کی تاکید کی تھی۔ میں پس و پیش میں پڑ گئی کہ جاؤں یا نہ جا
میڈیکل کالج میں وہ بھی تو موجود ہوگا۔ اگر وہاں گئی تو وہ میرا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ سب کے سامنے مجھے ستائے گا تنگ کرے گا میں ا
میں غرق تھی۔ نجمہ نے ٹہوکا مارتے ہوئے کہا۔ اب چلو بھی سوچ کیا رہی ہو۔

نجمہ اور میں میڈیکل کالج گئے۔ میچ شروع ہو چکا تھا کھیل عروج پر تھا۔ میڈیکل کالج کے دونوں بیٹسمین ہر ایک باری پر چوکا مار رہے تھے۔ جس پر کالج کے سب لڑکے چلا چلا کر تالیاں بجا رہے تھے۔ ہم دونوں کے کرسیوں پہ بیٹھنے تک تین تین چوکے ہو چکے تھے کھیل جاری رہا۔ لنچ کا وقت ہوا۔ میدان سے سب کھلاڑی واپس آ رہے تھے میری نظر کلیم پر جو پڑی تو
ہو گئی۔ وہ سفید لباس میں کتنا شاندار لگ رہا تھا دھوپ کی تمازت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ مگر یہ کیا۔ میرے تو چھکے چ
کمبخت میری ہی جانب بڑھ رہا تھا۔ خدا خیر کرے جس کا ڈر تھا وہی ہوا۔ قریب آنے پر ہیلو کہہ کر جو زوردار ہاتھ مارا ہے تو دو تین
اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میں کتنی آرزو سے یہ چوڑیاں خریدی تھی۔ چوڑیوں کے ٹوٹنے پر ڈھیٹ بن کر کہنے لگا۔ ارے یہ تو
طرح نازک ہیں۔ دو تین لڑکے جو قریب سے گذر رہے تھے یہ سن کر ہنسنے لگے۔ سب کے سامنے میرا مذاق اڑانے لگا۔ مجھے کوفت ہو رہی
خواہ مخواہ یہاں آئی۔ نجمہ اپنے بھیا سے ذرا دور پہ باتوں میں لگی ہوئی تھی نجمہ اور اس کے بھیا کلیم دونوں کو آتے دیکھ کر میں اٹھ
سکی۔ ارے ریاض تم یہاں کھڑے ہو چلو کینٹین چلیں۔ نجمہ نے قریب آکر ہیلو ریاض بھیا کہا جواب میں اس نے ہیلو نجمہ کہا۔ نجمہ نے میرا تعا
آپ ہیں میری کلاس میٹ اور اچھی سہیلی مس ر ی۔ ....

ریاض نے نجمہ کی بات اچک لی اور کہا مس ریحانہ مسٹر جمال الدین کی صاحبزادی۔ لیکچرر مسی۔ ریاض نے لیکچرر مسی اتنا آ
کہا کہ صرف ریحانہ ہی قریب ہونے کے باعث سن سکی۔ سنتے ہی اس نے غصہ سے برا سا منہ بنایا اور ریاض پر بگڑنے لگی۔ نجمہ اور ریحانہ کو خاموش کرایا۔

کینٹین میں نجمہ اور ریحانہ ساتھ ساتھ بیٹھے تھے ان کے مقابل ریاض اور کلیم بیٹھے تھے۔ ریاض خاموش تھا اس نے کھانا سے نہ کھایا۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلا گیا۔ کلیم آواز دیتا ہی رہ گیا۔

لنچ کے بعد کھیل شروع ہوا ریاض بیٹنگ کر رہا تھا اس نے دو تین بال بلاک کیئے۔ اور چوتھے بال پہ ہلکا سا ہٹ مخالف ٹیم کے کھلاڑی نے کیچ لے لیا۔ ریاض سر جھکائے کلیم کے قریب بیٹھ گیا۔ کلیم نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ ایسے بال پہ تم بنانا چاہیئے تھا۔ تم نے جان بوجھ کر کیچ دیا گویا تم خود آؤٹ ہونا چاہتے تھے۔ گفتگو اتنا زور سے ہو رہی تھی کہ ریحانہ نجمہ متوجہ تھیں۔

کھیل کے اختتام پر میں نے دیکھا ریاض کا پتہ نہیں تھا۔ میری نظریں اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ سکوٹر کی آواز پر میں نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ ریاض کی اسکوٹر گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ شام وہ گھر نہ آنا تھا نہ آیا۔ میں پچھتا رہی تھی کہ میں نے اسے برا بھلا کیوں کہا۔ خیر جو بھی ہوگا بھگتوں گی۔ آج پہلی تاریخ ہے سوچ رہی ہوں کہ کیا پروگرام بناؤں۔ کہیں جانے کے لئے بھی دل نہیں چاہتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ آج آ ہی جائے۔ بس۔ آج گھر ہی میں رہوں گی۔ ابا اپنے دوست سے ملنے چلے گئے تھے۔ امی اور دوسری بہن کسی عزیز کے یہاں ملنے گئی ہوئی ہیں۔ ریاض کی بہن سلمیٰ روتی ہوئی آئی اور میرے گلے سے لپٹ کر رونے لگی۔ اتنے میں کلیم کے آنے کی اطلاع ملی۔ کلیم کے ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے ہی سلمیٰ نے سوال کیا۔ کیسے ہیں میرے بھیا؟

کلیم رندھے ہوئے گلے سے کہنے لگے۔ افسوس اب وہ نہیں رہے۔ سلمیٰ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ میں نے کلیم سے پوچھا۔ کیا مطلب نہیں ہے کیا ہوا انھیں۔!

کلیم نے کہا۔ ریاض صبح اسکوٹر پر کہیں جا رہے تھے چورنگی سے آگے ناظم آباد روڈ کے موڑ پر لاری سے ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ اور وہ ۔۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی ایسا ہوگا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔۔۔ میں اور سلمیٰ جلد ہسپتال پہنچے ہسپتال کے ایک روم کے قریب ریاض اور کلیم کے چند دوست کھڑے تھے۔ سلمیٰ روم میں داخل ہوئی اور میرے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر چادر سے لپٹی لاش پر "بھیا" کہہ کر گر پڑی۔ سلمیٰ کی چیخ سے میرا دل بھی دہل اٹھا اور میں دیوار میں منہ چھپائے "رو" کہہ کر رو پڑی میں ظاہراً طور پر ریاض سے نفرت کرتی تھی۔ ریاض کو کیا معلوم کہ میں اس کمبخت کو اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ میری زندگی کی خوشیاں یکایک مجھ سے روٹھ جائیں گی۔ میں منہ چھپائے سسک کر رو رہی تھی۔ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مت رو میری اروی" روتے میں بھی پلٹ کر میں نے دیکھا۔ ریاض کھڑا تھا۔ بے اختیار میرا سر اس کے سینے سے جا لگا میری آنکھیں روتے میں بھی مسکرا اٹھیں۔ ریاض بھی مسکرا رہے تھے۔ مجھے کچھ خیال آیا تب میں پلنگ پر پڑی لاش کی طرف کی بڑھی۔ یہاں چند لمحے پہلے سلمیٰ آنسو بہا رہی تھی۔ سلمیٰ تو دو گیارہ ہو چکی تھی۔

لاش پر سے چادر کھینچ پھینکی۔ جہاں گاؤ تکیہ پر "اپریل فول" لکھا تھا۔ تب مجھے خیال آیا آج تو اپریل کی پہلی تاریخ ہے۔ میں واپس ریاض کی طرف بڑھی دروازہ سے سلمیٰ داخل ہو رہی تھی مجھے اور ریاض کو دیکھ کر کہنے لگی۔ بھیا کنگرا چولیشن اور بھابی آپ کو بھی۔ میں شرم سے سرخ ہو کر سلمیٰ کی طرف بڑھی مگر تو بھاید معاش۔

بقیہ سلسلہ نقد و نظر صفحہ ۔۔

قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے بہت سوچا سمجھا مختصر اور شاندار مواد پیش کیا میرکی آپ بیتی اور تیر تقی میر کی اشاعت کے بعد میر تیر کی اشاعت کسی طرح کم اہم نہیں ہے بلکہ میر کے بارے میں تمام تحقیقی اور نگران قدر مواد کہیں ایک جگہ مل سکیگا۔ (ا۔ص)

نقد و نظر

اجالوں کے گیت

سائز کراؤن قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ حلقہ ترویج ادب ۸۔ ساگر دن سید حرمت الاکرام کا تعلق مرزاپور سے ہے چونکہ گیتوں کے انتخاب کے وقت تاریخ کو قائم رکھا گیا ہے اس لئے شاعر کے خیالات کا اندازہ لگانا آسان ہے ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۵ء تک مختلف مواقع اور متفرق وقت کے دیکھنے سے خود شاعر کے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ ہر نظم اپنے دور کی نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے اندرون کو ظاہر کرتی ہے۔

جدید زمانہ میں یہ کچھ رواج سا ہو گیا ہے کہ ہر جدید شاعر اپنے آپ کو ترقی پسند کہلانا ضروری سمجھتا ہے مگر حرمت ہے کہ انھیں ترقی پسند تحریک سے دیرینہ ذہنی وابستگی اور اس کے متعدد عملی اوصاف سے گہری شیفتگی کے باوجود ان کی شاعری مخصوص لیبل نہیں۔۔ وہ گرد و پیش کے حالات پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کو قلمبند کرتے ہیں کو بھی وہ پسند نہیں کرتے حرمت کے حسب ذیل اشعار سے ان کے تصورات اور خیالات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

میری عظمت کے حسیں نقش مٹانے کے لئے — روس کے اندھے مریدوں کی مہم جاری ہے
کچھ عجب حال ہے اس دور کے فنکاروں کا — ان کے سر پہ بھی یہی شورِ جنوں طاری ہے

عصمتیں جبر کی آغوش میں تھیں نوحہ کناں — اپنا گھر ہم جنہیں سمجھے تھے وہ بازار بنے
اور نیلام کا اندازہ الٰہی توبہ — جن کے ہاتھوں میں چھرے تھے وہ خریدار بنے

کچھ گلوں ہی کے لئے وقف نہیں خندہ لبی — مسکراتی ہوئی شبنم بھی نظر آئے گی
کچھ وہ عالم ہے کہ ہر سانس سے آنچ آتی ہے — زندگی خود ہی شرر بن کے رہی جاتی ہے

حرمت نے اپنی نظموں میں اظہار خیال اور کلام کی آراستگی میں بڑی جگر کاوی کی ہے جس کے شاہد خود ان کے اجالوں کے گیت ہیں۔ ان کے ہاں ندرت بھی ہے اور بے ساختہ پن بھی۔ نمونے ملاحظہ ہوں اپنی نظم "صبح نو" میں کہتے ہیں۔

مگر اب کوئی زباں پکڑے بھلا کس کس کی　　لوگ کہتے ہیں کہ کھیلا کئے ہم پھولوں سے
اور حالات تو بدلے ہیں مگر صرف اتنا　　پہلے غیروں سے شکایت تھی اور اب اپنوں سے

جس خلد کی تلاش تھی وہ تو نہ مل سکی　　جس سے گریز تھا وہ جہنم یہاں بھی ہے
حرمت فسون گردش دوراں کو کیا کہوں　　ہر لمحہ ایک حشر مجسم یہاں بھی ہے (سید رشید الحسن)

فانی کے مقطعے • مرتبہ حکیم مختار احمد سنبرواری بدایونی۔ ناشر بزم فانی بدایوں۔ صفحات ۵۵ قیمت ۱۲؍

ضیاء احمد بدایونی (مسلم یونیورسٹی) کے تعارف اور مرتب کے پیش لفظ کے بعد فانی کے متعدد مقطعے اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے۔ اس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ ۵۵ صفحوں کا ایک مقالہ فانی کی شاعری کے بارے میں شائع کیا جاتا جس سے فانی کو سمجھنے میں مدد ملتی۔ (ا۔ ص)

نظارہ و خیال مرتب اختر ناصح نصیب ناشر مکتبہ سہیل گیا۔ صفحات ۔ قیمت ۱.۵۰

کتاب کے نام سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اشعار یا افسانوں کا مجموعہ ہوگا لیکن اس میں بہار کے بائیس [۲۲] شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام کا نمونہ دیا گیا ہے۔ اس میں تقریباً تمام شعرا کی تصاویر بھی دی گئی ہیں اور اس طرح مرتب نے ہمیں شاعروں سے روشناس کرا دیا ہے۔ ہر شاعر کی ایک ایک غزل یا نظم دی گئی ہے اور اس کے بعد متفرق اشعار پیش کئے ہیں۔ یہ طریقہ مستحسن رہا ہے۔ اس سے شاعر کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ مرتب کی یہ کوشش لائق تحسین ہے۔ (ا۔ ص)

میر تقی • از محمد حسین حسان۔ ناشر۔ مکتبہ جامعہ دہلی صفحات ۶۴ قیمت ۱۲؍

زیر نظر کتاب ناشر نے اپنے منصوبہ کے تحت بچوں کے لئے تیار کرائی ہے تاکہ بچے اردو زبان کے مشہور شاعروں اور نثر لکھنے والوں کے حالات سے آگاہ ہوں۔

کتاب کی کتابت، طباعت اور پیش کشی بہت عمدہ اور جاذب نظر ہے۔ میر کے حالات بھی سلیس، سادہ اور دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ میر کی شاعری، ان کے رنگ تغزل اور ان کی نثر کی کتابوں کے بارے میں بھی جس انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے وہ قابل قدر ہے اور اس طرح مکتبہ جامعہ اپنے منصوبہ میں کامیاب ہے۔ اردو کے ہر پرستار کو چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کو اس قسم کی اردو کتابوں کے پڑھنے کا عادی بنائے اور مدارس کے کتب خانے کبھی ایسی کتابوں سے خالی نہ رہیں۔ (سید خلیل)

فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ — سید ضمیر حسن ایم۔ اے لیکچرار شعبۂ اردو دہلی کالج سائز ۳۰×۲۰/۱۶ کلاؤن صفحات [illegible] قیمت تین روپے۔ مکتبہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔

زیر نظر کتاب میں سید ضمیر حسن صاحب نے دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے معرکۃ الآرا اسلوب کو فسانۂ عجائب کے نئے تحقیقات کی روشنی میں لانے کی کوشش کی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے دلی اور لکھنؤ کے فرق کو دکھایا ہے پھر اردو کی قدیم داستانوں سے فسانۂ عجائب کا مقابلہ کیا ہے۔ فسانۂ عجائب کی کردار نگاری، مکالمے اور اس کی منظر نگاری پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

مصنف نے فسانۂ عجائب کی زبان کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے ان کا ایک استدلال یہ ہے کہ فسانۂ عجائب کا موازنہ باغ و بہار سے کرنا عبث ہے۔ دلی والوں کی بامحاورہ سلیس اور برجستہ گفتگو کے آگے فسانۂ عجائب کے پرتکلف انداز بیان کا چلنا ممکن ہی نہیں۔ دلی اور لکھنؤ دونوں اسکولوں کے رجحانات جدا ہیں۔ دونوں کے مزاج اور مذاق میں فرق ہے۔ دونوں کے عوامل الگ الگ ہیں۔ ایک اور جگہ ان کا قول ہے کہ "سرور کی زبان گو میر امن کی سلاست بیانی سے لگا نہیں کھاتی لیکن اس اپنے اصول اور اپنے دور کے تمام محاسن موجود ہیں۔ شوخ اور برجستہ محاوروں، شاعرانہ صنعتوں اور لفظی موسیقی آہنگ جا بجا اس کی عبارت کو لالہ زار بنا دیا ہے جس کی داد بقول کلیم الدین احمد آج کے پڑھے لکھے طبقے سے ملنا مشکل ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ سرور کی زبان خود ان کے دور میں بجز اہل لکھنؤ ہندوستان کے دیگر خطوں میں ناقابل فہم تھی۔ لوگ زبانوں اور وہاں کے علوم و فنون سے آگاہی کے باعث لوگ عام فہم زبان کے دلدادہ ہو گئے تھے اور یہ کوئی ناجائز بات نہ تھی۔ یہ رجحان زبان کی ترقی کا ضامن تھا۔ اگر سرور کا انداز بیان عام پسند اور قابل تقلید ہوتا تو آج اردو دلی یا لکھنؤ ہی میں اور بین الاقوامی درجہ حاصل کرنے سے محروم ہو جاتی۔

تہذیبی و معاشرتی پس منظر کے باب میں مصنف نے اپنا پورا زور بیان صرف کیا ہے اور سرور نے فسانۂ عجائب میں لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کی جو جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں ان کو سراہا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور یہ بھی فراموش کیا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ بھی دلی کی طرح ایک مخصوص تہذیبی اور ادبی مقام رکھتا ہے اور اس نے نظم و نثر میں کچھ نئے تجربے پیش کئے۔ انقلابات زمانہ نے دلی اور لکھنؤ کی مرکزیت ختم کر دی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کو ہمہ گیر بنانے کے لئے اردو کے تمام مراکز متحدہ کوشش کریں اور صوبہ واریت کو ذہن سے خارج کر دیں۔

ضمیر حسن صاحب کی یہ کوشش لائق ستائش ہے کہ انھوں نے فسانۂ عجائب کا ایک تنقیدی جائزہ لے کر تاریخ اردو کے گوشوں کو روشن کرنے کی سعی کی ہے۔ اردو ادب کے طالب علم کے لئے یہ ایک اچھا اضافہ ہے۔

کنگ لیئر — مترجم لے ماسیس۔ مجنوں گورکھپوری سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت۔ پانچ روپے۔ ساہتیہ اکاڈیمی۔ نئی دہلی۔

انگریزی زبان کے مشہور ڈرامہ نگار شیکسپیر کی عظمت کا کون معترف نہیں ہے۔ دنیا کی ہر بڑی زبان میں اس کے ڈراموں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اقوام عالم کا ہر بڑا مفکر شمس شیکسپیر کے اہم ڈراموں کا ترجمہ ہو چکا ہے

سب رس [illegible]
سے اچھی طرح واقف ہے۔

اردو میں انگریزی حکومت کے آغاز ہی سے شیکسپیر کے ڈرامے منتقل ہونے لگے تھے۔ تمام شاہکار ڈراموں کے صرف ترجمے ہوئے بلکہ ان میں سے اکثر اسٹیج بھی کئے گئے۔ ہندوستان کی کئی ڈرامٹک کمپنیوں نے شیکسپیر کے متعدد ڈراموں کو کئی کئی مرتبہ پیش کیا مگر افسوس کہ شیکسپیر کے ڈراموں کے یہ ترجمے بحیثیت ناقص ہی رہے کیونکہ ان کے پیش کرنے والے اکثر کاروباری طرز کے لوگ تھے جنھوں نے پیش کش کی سہولت اور ضرورت کے موافق تبدیلی پیدا کرلی۔ بعض اچھے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی جیسے مولوی عنایت اللہ دہلوی سر فہرست ہیں ان ڈراموں کا ترجمہ کیا۔ مگر وہ مقبول عام نہ ہو سکے۔

زیر نظر ترجمہ کنگ لیئر پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی کاوش کا نتیجہ ہے

(سید رشید الحسن)

دیوان قایم

مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ صفحات ۲۴۷ مجلد قیمت سات روپے

قیام الدین قایم چاندپوری اردو ادب میں اپنی شاعری سے زیادہ اپنے تذکرہ "مخزن نکات" کی وجہ سے یاد کئے جاتے ہیں۔ لیکن بلحاظ شاعر بھی وہ کم اہمیت کے حامل نہیں رہے بلکہ اس دور کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر عقیدت اور محبت سے کیا ہے اور یہ عقیدت اور محبت محض ان کے کلام کی گرمی نے پیدا کی میر حسن اور میر تقی میر جیسے شعرا بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں لیکن ابھی تک نہ تو ان کا دیوان ہی شائع ہوا تھا اور نہ دیگر اصناف سخن میں کوئی چیز۔ بابائے اردو نے ان کے تذکرہ "مخزن نکات" کو شائع کرکے ان کے نام کو حیات دوام عطا کردی۔ اب ڈاکٹر خورشید الاسلام کی دلچسپی کی بنا پر ان کا دیوان تیار ہوا اور مکتبہ جامعہ نے اس کو شائع کرکے ایک بڑی کمی پوری کی۔

حیدرآباد میں ان کے دیوان کا کوئی مخطوط نظر سے نہیں گزرا البتہ بہت سی بیاضیں اور کشکول ہیں جن میں قایم کی غزلیں اور مثنویاں مل جاتی ہیں۔ لیکن اس کا امکان ہے کہ یہ غزلیں دیوان میں شامل ہوں گی۔ اس لئے کہ فاضل مرتب نے اس دیوان کو متعدد مخطوطوں کی مدد سے تیار کیا ہے۔ ابتدا میں چند صفحات کا مقدمہ ہے جس میں قایم کی شاعری کی اہمیت ان کے دیوان کے مخطوطوں کا ذکر اور جن تذکروں میں قایم کا ذکر اور اشعار کا انتخاب ہے ان کا بھی حال لکھا ہے لیکن خود قایم کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ شاید اس لئے کہ "مخزن نکات" کے مقدمہ کو جو بابائے اردو نے لکھا ہے حرف آخر سمجھا ہے اور اس سے زیادہ کوئی بات قایم کے متعلق کہنی نہ تھی۔

قایم ہدایت، درد اور سودا کے شاگرد رہے لیکن کسی کی تقلید نہ کی بلکہ غزل میں اپنی انفرادیت کو قایم رکھا۔ نہ تو میر کی طرح "آہ" ہے اور نہ سودا کی طرح "واہ"۔ انھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثنویاں اس پایہ کی لکھیں کہ لوگوں نے ان کی بعض مثنویوں کو سودا کی اور سودا کی بعض مثنویوں کو ان کے نام سے منسوب کردیا اور تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک مشکل پیدا کردی۔ رباعیات اور قطعات کا بھی یہی حال ہے۔ البتہ غزلوں میں جو کیفیت چند

نہ ہو سکی غزلوں میں ایسی کئی غزلیں ملیں گی جو میر و مرزا کی زمینوں میں ہیں۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ وہ ایک ہی شاعرہ کی ہوں۔

موجودہ دور میں قدیم شعرائے دواوین سے تعلیم یافتہ طبقہ کی دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے۔ اس کا لحاظ کرتے مکتبہ جامعہ نے اس کو شائع کرکے جراءت آزما اقدام کیا ہے۔ اس لئے ہر طرح قابل مبارکباد ہے۔ کتابت طباعت کی نفاست کے لئے مکتبہ جامعہ کا نام ہی کافی ہے۔ توقع ہے کہ اردو کی کوئی لائبریری اس سے خالی نہ رہے گی۔ اس لئے بھی کہ تذکرہ نگاروں نے متقدمین میں میر و مرزا کے بعد قائم ہی کو مسند پر بٹھایا ہے۔　　　(ا۔ص)

دلی کالج میگزین ایڈیٹر نثار احمد فاروقی۔ شعبہ اردو دلی کالج (ایوننگ کلاسسز) دلی ضخامت ۲۷۰ صفحات قیمت دس روپے۔

میر نمبر　　نثار احمد فاروقی ملک کے ان نوجوان اور ہونہار ادیبوں میں ہیں جنھوں نے اپنی دقت نظر، دلکش اسلوب اور متانت و سُلجھاؤ کی وجہ سے اپنے لئے ادب میں بہت جلد نمایاں مقام حاصل کرلیا ہے۔ وہ اپنے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کی وجہ سے بھی کافی شہرت حاصل کرچکے ہیں اور میر کی آپ بیتی "ذکر میر کے ترجمے نے بھی انھیں میر سے قریب کردیا ہے۔ غالباً اسی تعلق سے انھوں نے ممتاز ادیبوں سے میر کے بارے میں کئی مضامین لکھوائے اور اس کو دلی کالج میگزین کے میر نمبر کی شکل میں پیش کیا۔ اس شمارہ کے چار باب ہیں پہلے باب میں حیات میر پر نو مضامین ہیں جن میں قاضی عبدالودود اور کلب علی خاں فائق نے حیات میر پر لکھا ہے اور سفر لکھنؤ پر ڈاکٹر عبدالحق کا مضمون شامل ہے میر سے متعلقہ شخصیتوں میں آرزو پر ڈاکٹر منوہر سہائے انور نے سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔ سید سعادت علی پر خود نثار صاحب نے لکھا ہے۔ تجلی دہلوی، میر کلو عرش اور تلامذۂ میر پر ڈاکٹر آرزو، حبیب خاں صاحب اور فاضل زیدی کے مضامین ہیں اور آخر میں میر کا مدفن پر نادم سیتاپوری نے تحقیقی مواد پیش کیا ہے اور بتلایا ہے کہ قبر کا نشان تک باقی نہیں رہا۔

دوسرے باب میں میر کے فن سے بحث کی گئی ہے اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا حصہ عمومی مطالعہ کیلئے مختص ہے۔ دوسرا مثنویات میر کے بارے میں ہے۔ تیسرا میر کی فارسی شاعری پر اور چوتھا لسانیاتی مطالعہ ہے میر کی فارسی شاعری پر ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی نے میر کا سبک فارسی پر لکھا ہے۔ اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا مضمون جو اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔ شامل ہے۔ یہ حصہ تشنہ ہے اور اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر کے فارسی دیوان کو شائع ہونے کا آج تک بھی موقع نہ مل سکا۔ تیسرا باب تصانیف میر پر ہے جس میں کلیات میر کے تعلق سے امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، نصیرالدین ہاشمی اور مبارزالدین رفعت کے مضامین شامل ہیں۔ چوتھے باب میں منظوم خراج عقیدت ہے اور آخر میں مقالہ نگاروں اور شعراء کا تعارف ہے۔

میر پر یہ شمارہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادارہ دلی کالج میگزین اور بطور خاص نثار احمد فاروقی صاحب
(بقیہ صفحہ ۳۵ پر)

دگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء فون نمبر ۳۵۲۶۹

۲۷ شمارہ ۳ مارچ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

ران: پروفیسر عبدالمجید صدیقی

ں مشاورت:

گوپی چند نارنگ رمن راج سکسینہ

الدین ہاشمی منظور احمد۔ وقار خلیل

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

لانہ ہندوپاک سے چھ روپے

ششماہی تین روپے

مالک سے دس روپے

پچ ۵۰ نئے پیسے

ہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے

نیشنل پرنٹنگ پریس میں چھپ کر

یوانِ اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شایع ہوا

ترتیب

اپنی بات

مارچ کے پہلے عشرہ میں انجمن تحفظ اردو نے بہت بڑے پیمانہ پر ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں کے تقریباً دو سو مندوبین نے اس میں حصہ لیا۔ اس کا افتتاحی اجلاس گاندھی بھون کے وسیع و عریض آڈیٹوریم میں منعقد ہوا جس کا افتتاح شری نیلم سنجیوا ریڈی نے کیا اور اپنی تقریر میں اردو کی تعاون کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون کا وعدہ فرمایا۔ دوسرے دن نمائش کلب میں صبح میں مندوبین کا بند اور میں کھلا ہوا اجلاس ہوا۔ جس میں قرار دادیں پیش اور منظور ہوئیں۔ کھلے اجلاس کا افتتاح کاسو برہمانند ریڈی چیف منسٹر آندھرا پردیش نے کیا۔ اور اردو کے حقوق کو جن اضلاع و… میں نظر انداز کیا جارہا ہے حکومت کے علم میں آنے پر اس کے سدِ باب کا یقین دلایا۔

اس کانفرنس میں شرکت کے لئے ملک کے مشہور ناول نگار عادل رشید اور افسانہ نگار … تشریف لائے تھے۔ ان حضرات نے اپنی خیرسگالی تقریریں کیں۔ دونوں ادیبوں نے ایوانِ … میں بھی تین گھنٹے گزارے۔ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کے کارناموں کو سراہا اور توقع ظاہر کی کہ یہ کام اسی طرح بڑھتا رہے گا۔

حضرت تبسم نظامی تین ماہ قبل حیدرآباد آئے تھے کہ حضرت جگرؔ مراد آبادی کی حیدرآباد میں مختلف زمانوں میں مصروفیات کے بارے میں مواد حاصل کریں۔ انھوں نے حیدرآباد کے ایک ایسے ہوٹل میں قیام کیا جو دکنی ادب کے … جناب نصیر الدین ہاشمی کے دولت خانہ سے قریب بلکہ متصل واقع ہے۔ دن بھر وہ حیدرآباد کے مختلف ادیبوں سے ملاقات کرتے اور حضرت جگرؔ کے بارے میں جو بات بھی اثنائے گفتگو میں نئی ملتی قلمبند کرتے جاتے۔ جو تصاویر فرا… انھیں فوٹوگرافر کے پاس لے جاتے ان کی نقل لیتے۔ ان کے بلاک بنوا لیتے۔ بارہا وہ ادارہ تشریف لائے اور مہر… پر بھی زحمت فرمائی۔ فرماتے تھے کہ تمکین سرمست صاحب روزنامچہ لکھتے رہے ہیں۔ ان میں حضرت جگرؔ کے بار… جگہ ذکر آیا ہے۔ برسوں کی یادداشتیں پڑھنا اور مواد حاصل کرنا ہے۔ یہ کام کوہ کندن و کاہ برآوردن سے کم… اس دوران قیام میں کافی مواد جمع کرلیا تھا اور واپسی کا زمانہ قریب آرہا تھا کہ ۲ مارچ کو رات کے دس بجے قلب… اور کوئی طبی امداد پہنچنے سے پہلے چلے کہ صرف آدھے گھنٹہ بعد اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پولیس نے نعش کو پوسٹ مارٹم کے لئے دواخانہ پہنچا دیا لیکن معتمد صاحب انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے دواخانہ … کی اور دارالسلام سے قریب دھوبن کی مسجد کے قبرستان میں … تبسم نظامی مرحوم کا پیشہ ہی لکھنا لکھانا تھا وہ بہت تیز لکھنے والے ادیب اور شاعر تھے اور ہر موضوع پر بآسانی قلم … اگر ان کے منشا کے مطابق ان کی کتاب "جگرؔ کی منازلِ حیات" تیار ہو جاتی تو … ادب میں خاصے کی چیز ہوتی۔ اے بسا آرزو …

سید دلدار حسین رکن منصوبہ بندی کمیشن
ترجمہ: سید ضیاء الحق

(انگریزی سے)

آبپاشی کا بادشاہ

ابراہیم قطب شاہ

ہد ماضی پر ایک نظر اس مضمون کا عنوان عجیب و غریب معلوم ہو رہا ہوگا۔ لیکن تاریخ ہند کے طویل ادوار پر نظر ڈالئے۔ بمشکل چند بادشاہ ایسے ملینگے جنہوں نے ملک
شی ترقی کے ضمن میں کوئی کارنمایاں انجام دیا ہو یا کوئی ایسی یادگار اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہوں جو
۔۔ سائینس یا انجینیرنگ میں کسی ترقی کی نشاندہی کرتی ہو۔ ان چند بادشاہوں میں مندرجہ ذیل حکمران
، ذکر ہیں۔

جہاں جس نے عالمگیر شہرت کا حامل مقبرہ۔ تاج محل بنایا۔

ب الدین ایبک (دہلی کا پہلا سلطان) جس نے مشہور مینار۔ قطب مینار۔ تعمیر کرایا۔

ن بادشاہان مالوہ جنہوں نے چند قابل تعریف محلات اور تفریحی مراکز بنائے: بمقام مانڈو موقوعہ وسط ہند۔

شاہ اکبر۔ کے بھی کچھ کارہائے آب پاشی لائق تعریف ہیں۔ اس نے ایک نہر کی تعمیر کی جس کو اب مغربی نہر جمنا
۔ اس کی ایک شاخ نہر جسلی کے نام سے مشہور ہے ان نہروں کی تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ شہنشاہ کے باغات
کارگاہ جو پنجاب میں حصار کے قریب واقع تھے ان کی آب رسانی ہو۔ جنوبی ہندوستان میں کاکتیا خاندان
شاہوں نے کچھ کارہائے آب پاشی کی تعمیر کی تھی۔ اس کے مابعد زمانہ میں خاندان قطب شاہی کا ایک بادشاہ
ن ابراہیم قطب شاہ (۱۵۵۰ء۔۔۱۵۸۰ء) اس میدان میں یکتا نظر آتا ہے۔ تلنگانہ میں بڑے بڑے ذخائر
ں نے بنوائے۔ ان میں سے چند یہ ہیں: تالاب حسین ساگر جس سے شہر حیدرآباد کو پانی سربراہ کیا گیا ہے (۲) ذخیرہ
ابراہیم پٹن جو شہر حیدرآباد سے (۲۰) میل دور اسی نام کے موضع پر واقع ہے (۳) تالاب پانگل موقوعہ نلگنڈہ
ریائے علیی دمونی پر ایک کٹ جس سے تالاب حسین ساگر میں پانی کی آمد میں اضافہ کیا گیا۔ ان کے علاوہ چھوٹے

ہیں
چھوٹے ذخائر آب بھی بنوائے گئے مثلاً ذخیرہ آب کانکور۔ ذخیرہ آب کوئیلکنڈہ (ضلع محبوب نگر) پہلے پنجال ریلا
میں اس پر کوئل ساگر بند تعمیر ہوا۔ ذخیرہ آب پنڈلی لکالا تعلقہ دیورکنڈہ اور کچھ چھوٹے چھوٹے تالاب بھی تعلقہ دیورکنڈہ
میں بنوائے۔ تعلقہ دیورکنڈہ ضلع نلگنڈہ میں واقع ہے جو قحط سالی کے لئے مشہور ہے۔

شاہان تلگو اور آب پاشی

شاہان تلگو کی حکومت مغرب میں دریائے بھیما اور مشرق میں خلیج بنگال تک پھیلی ہوئی تھی
ان میں سے اکثروں نے کچھ تالاب اور ذخائر آب بنوائے تھے۔ جانشین حکومتوں کے دو
میں آب پاشی کے کاموں میں بہت کم اضافہ ہوا۔ توسیع سلطنت کے لئے جنگیں ہوتی رہیں سیاسی اختلافات بھی ا
مخرب بھی کام کر رہے تھے۔ ان وجوہات نے باقاعدہ اقتصادی ترقی کا کوئی موقع نہیں دیا۔ تالاب اور بند کی تعمیر چھو
چھوٹے سرداروں۔ دیسکھوں اور بڑے جاگیرداروں کی مرضی اور رحم و کرم پر رہ گئی۔ چنانچہ تلنگانہ میں آب پاشی
کے ذخائر جن کو "چرو" "یا کنٹہ" کہا جاتا تھا اسی رحم و کرم کی یادگار ہیں۔ ان ذخایر کے نام ان کی وسعت، تعدا
یا کسی موضع کی قربت کی بناء پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً بلحاظ وسعت پدا چرو (بڑا تالاب)، چنا چرو (چھوٹا تالاب
بلحاظ قدامت کوتا چرو (نیا تالاب) پاتا چرو (قدیم تالاب) بلحاظ نام موضع میڑچل چرو (تالاب میڑچل)،

بہمنی دور میں دکن میں کسی بڑے آب پاشی کے کام کا پتہ نہیں چلا۔ سلاطین وقت نے اس طرف زیادہ تو
نہیں کی اور نہ امراء کی سرپرستی اس قسم کے رفاہی کاموں کو حاصل ہوتی تھی۔ سلاطین بہمنی کے جانشین بادشاہا
قطب شاہی نے بھی ابتدائی زمانہ میں نئے قلعہ جات کی تعمیر اور قدیم قلعہ جات کی درستگی اور ترمیم پر اپنی زیا
توجہ دی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان بادشاہوں نے اتنا کام ضرور کیا کہ ہندو دور کے تعمیر شدہ کار ہائے آب
کو اچھی حالت میں برقرار رکھا اور ان میں وقتاً فوقتاً توسیع اور ترمیم بھی کی۔

سلاطین قطب شاہی میں ابراہیم قطب شاہ کا نام یادگار رہے گا۔ اپنے پیشرو سلاطین کے برعکس اس
آب پاشی کی کافی سرپرستی کی اور اس لئے اس کو "آب پاشی کا بادشاہ" کہا جاسکتا ہے۔

ابراہیم کو اپنی رعایا بہت عزیز تھی۔ اور اسکی فلاح و بہبودی کے لئے وہ آب پاشی کے ذخائر زیا
زیادہ تعداد میں تعمیر کرنے کا خواہشمند تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ذخائر آب موجودہ ترقی یافتہ دور کے معیار پر پورے
اترتے ہوں لیکن تقریباً ۴۰۰ سال سے یہ زمانہ گرم و سرد کا مقابلہ کرتے ہوئے آج بھی اپنی جگہ موجود ہیں اور ان کی
میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ کس قدر عمدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ان کاموں کی تکمیل کی گئی ہے

حسین ساگر

۱۵۶۲ء میں عہد ابراہیم قلی قطب شاہ میں تالاب حسین ساگر تعمیر ہوا۔ اس پر ڈھائی لاکھ
رائج الوقت خرچ ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ بند اور اس کے متعلقہ کام کی تکمیل حسین شاہ برادر نسبتی
ابراہیم قلی قطب شاہ کی نگرانی میں کی گئی۔ موصوف ایک صوفی منش بزرگ تھے اور وفات کے بعد حسین شاہ ولی

ب درس　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　مارچ ۱۹۶۴ء

شہور ہوئے ماں کا مقبرہ شہر حیدرآباد کے قریب و جوار میں گولکنڈہ سے تھوڑی دور بمبئی جانے والی سڑک پر واقع
۔ حضرت امام حسین کی یاد میں تالاب کا نام حسین ساگر رکھا گیا ہے۔

موسٰی ندی کی ایک شاخ نہر کل موالیر پر بند تعمیر کیا گیا۔ اس بند کا رقبہ (۳ء۹) مربع میل ہے ۔ اس کی لمبائی
ا: 2 میل ہے اور چوڑائی (۳۰ تا ۵۰) فٹ ۔ یہ سکندرآباد اور حیدرآباد کی سڑکوں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے
، اور دائیں جانب زاید پانی کے اخراج کے لئے دروازے رکھے گئے ہیں۔ پانی کی نکاسی اور سربراہی کے لئے چار دروازے
۔ اس کا غیر فلٹر شدہ پانی حیدرآباد کے بعض حصے ۔ کپڑے کی ملز اور بجلی گھر کو پہنچایا گیا ہے۔ زمانہ سابق میں اس
ی باغات ۔ ایران سے جو آمد کردہ گلاب کے پھول ۔ موتیا اور چنبیلی کی کیاریوں میں پہونچایا جاتا تھا۔ شاہی
ر ۔ امرار کے محلات اور عام استعمال میں بھی یہ پانی کام میں آتا ہے۔

اس تالاب کی تاریخ ۔ بند کی جانچ اور دروازوں کو دیکھئے ۔ سخت طغیانیاں آئیں اور گئیں ۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء
ت ترین طغیانی یادگار رہے گی لیکن اس کے چار صد سالہ قیام کے دوران میں اب تک کسی وقت بھی نہ تو
بند میں کوئی رخنہ پڑا اور نہ اس میں شکستگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کے معمار انجینئروں
۔ ایسے تالاب میں جو قطب پایہ تخت میں طغیانی کے متاثرہ رقبہ میں واقع ہوا ہے ۔ طغیانی کی روک تھام کے کام
آگہیت حاصل تھی۔

سنتے ہیں کہ تالاب کی تعمیر کے بعد مسلسل چار سال تک اس میں پانی نہیں آیا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ بڑا مایوس
اپنے ایک امیر ۔ خواجہ نیک نام خاں کو ابراہیم نے دریائے موسٰی سے حسین ساگر تک ایک نہر کھودنے کا حکم دیا۔
نام خاں ایک سپہ سالار ہونے کے علاوہ ایک ماہر فوجی انجینئر بھی تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی نہر بجانب شمال
یدرآباد سے (۲۰) میل دور بمقام جینراٹرہ دریائے موسٰی سے نکالی۔ یہ نہر اس وقت ملکاپور نہر کے نام سے
رہے جو اس کے راستے میں ایک بڑا موضع ہے ۔ کہتے ہیں کہ سپہ سالار نے اس نہر کے اخراجات اپنی ذات سے ادا کئے
یائے موسٰی سے تالاب میں پانی پہونچانے میں کامیاب رہا۔ سپہ سالار کا ارادہ تھا کہ اس نہر کو وسیع کیا جائے
وت نے اسکو اس کا موقع نہیں دیا۔

ان خدمات کے صلے میں ذریعہ فرمان سلطان نے بعض مواضعات نزد گولکنڈہ کی زر مالگزاری سپہ سالار
ن کے مقبرہ کی نگہداشت اور فاتحہ خوانی کے لئے دوامًا عطا فرمائی ۔ اس ماہر فوجی انجینئر کی ہر دلعزیزی کا
نام سے چلتا ہے کہ آج تک اس کے نام سے ایک موضع موجود ہے۔ موضع نیک نام پورم ۔ جو قلعہ گولکنڈہ کے
یں واقع ہے۔

یہ دن سلطان ابراہیم سیر و تفریح کرتے ہوئے تالاب حسین ساگر جا پہونچا۔ اور لوگوں سے تالاب کا نام دریافت کیا۔

لوگوں نے جواب دیا کہ اس کا نام "حسین صاحب جیرو" ہے۔ سلطان ناراض ہوا کہ تالاب مذکور اس کے نام موسوم نہیں تھا۔ اس نے تہیہ کیا کہ اپنے نام سے ایک دوسرا تالاب بنوائیگا۔ چنانچہ وہاں سے وہ سیدھا ابراہیم پہونچا۔ اس شہر کو اس نے خود آباد کیا تھا۔ یہاں اس نے تالاب کا نقشہ کھینچا اور اس کو اپنا نام دیا۔ یہ اب تک ابراہیم پٹن کے نام سے مشہور ہے۔

تالاب ابراہیم پٹن

یہ تالاب حیدرآباد سے (۲۰) میل دور جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اور حسین ساگر کے نمونہ ایک بڑا بند بنایا گیا ہے۔ یہ تقریباً (۴۰۰) سو سال قدیم ہے۔ اور اپنے بانی کے جوش کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا رقبہ (۳۰) میل ہے۔ اس کا بند (۱۰۵۰۰) فٹ طویل ہے۔ انتہائی گہرائی (۷۰) فٹ ہے بند (۱۸) تا (۲۴) فٹ چوڑا ہے۔ پانی کے نکاسی کے چار دروازے ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں دریائے عیسیٰ (معاون د موسیٰ) پر بمقام چندرہ ولی ایک انی کٹ بناکر اس تالاب میں اس کے ذریعے پانی پہونچایا گیا ہے۔ اس نہر کی لمبائی کلومیٹر ہے۔ اور (۱۱۰۰۰۵) روپیہ لاگت ہوئی ہے۔ ۱۹۰۸ء کی طغیانی میں اس انی کٹ کو شدید نقصان پہونچا مرمت کے لئے کثیر اخراجات کی ضرورت پائی گئی۔ اور بنا بریں مرمت نہیں کیجا سکی۔

تالاب پانگل

یہ تالاب موضع پانگل کے قریب واقع ہے۔ اور نلگنڈہ کے شمال میں تعلقہ نلگنڈہ سے تقریباً میل دور ہے۔ ابتداً اُودے سمدرم کے نام سے مشہور تھا۔ راجا اُودے راج ۱۱۲۴ء یہاں حکمران تھا۔ چنانچہ یہ تالاب اُسی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس تالاب میں پانی کم رہتا ہے اور ٹوٹی حالت میں ہے۔ تالاب کے بند پر ایک کتبہ تلگو میں موجود ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بند ٹوٹ گیا تھا اور کا پانی دریائے کرشنا سے جاملتا تھا۔ اور نتیجتاً موضع پانگل طغیانی کی زد میں آگیا۔

اس کے قرب و جوار میں فوجی مہمات کے دوران ابراہیم نے اس تالاب کی شکستہ حالت کو دیکھا۔ افواج کے سپہ سالار سید شاہ تقی المعروف سید شاہ میر ابن سید احمد طباطبائی اصفہانی کو سلطان نے تالاب از سر نو تعمیر کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ سپہ سالار موصوف کو اخراجات کا صلہ خدا وند تعالیٰ آخرت میں دے یہ بند (۶۰۰) فیٹ طویل ہے۔ اور تالاب کی انتہائی گہرائی (۴۵) فٹ ہے۔ اتنے عظیم الشان کی تعمیر کے لئے خزانہ شاہی پر کافی بار پڑا ہوگا۔ بند کے قریب تلگو اور فارسی زبان میں کندہ عبارت سے یہ چلتا ہے کہ تالاب سے کافی دور ایک انی کٹ ۱۵۵۰ء میں تعمیر کیا گیا۔ اور وہاں سے ایک نہر نکالی گئی جو کو پانی پہونچاتی تھی۔

اس تالاب کی درستگی اور نہر کی تعمیر ۱۵۵۰ء میں ہوئی ہے۔ یعنے حسین ساگر کی تعمیر سے تقریباً (۶) سال تلگو میں کندہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کام کے لئے نگرانکار عہدہ دار کا نام رحمت اللہ ابن عبد الک

بیدر سا
تھا۔ اس تالاب کی مرمت میں ابراہیم کی جمہوریت پسند طبیعت کا ثبوت ملتا ہے۔ پتھر کے کتبے سے جو
کندہ ہے (فارسی عبارت مٹ گئی ہے) یہہ واضح ہوتا ہے کہ سلطان نے آبپاشی کے محاصل کی
(۱/۴ م) حصوں پر بموجب صراحت ذیل کی ہے۔
ایک حصہ سلطان کو، ڈیڑھ حصہ رعایا کو دو حصے فوج کو جو مسلمان اور برہمن دونوں مشتمل تھی - اور مزید یہ بھی کندہ ہے
کہ یہ احکام تا قیام شمس و قمر نافذ العمل ہونگے"
بطور علامت دوام سورج اور چاند کے نقوش پتھروں کے ناصیہ پر کھینچے گئے ہیں جن پر فارسی اور تلگو عبارت
ہے اور یہ پتھر مندر کے قریب اور تالاب کے بازو ہیں۔
سلطان کے جانشین بھی جمہوریت کے دلدادہ تھے اور کار رفاہ آبپاشی سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ
ب ماں صاحب بھی اس کا ایک بین ثبوت ہے۔
یہ تالاب اس وقت خشک پڑا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر ایک شاہی خاندان کی بیگم نے کی تھی۔ بمرور زمانہ بعد
یہ تالاب حیات بخش بیگم جو سلطان ابراہیم کی بہو تھی کے نام پر معنون ہو گیا۔ بیگم موصوفہ سلطان
یم کے پوتے محمد قطب شاہ چہارم کے زمانۂ کمسنی میں گولکنڈہ کی حکمران تھیں۔
اس تالاب کے مناری دروازہ پر عبارت ذیل کندہ ہے۔
" رفاہیت جمہور عوام از طبقہ خاص و طائفہ عام"
اس سے یہہ ثابت ہوتا کہ قطب شاہ اور اس کے جانشین جمہوری طرز حکومت سے وابستہ تھے۔ اور عوام
رفاہیت گزاری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ابراہیم دکن کا ایک عظیم الشان سلطان تھا اور عوام کی فلاح و بہبودی
اسنے جو کام انجام دیئے تھے وہ اس کی یاد کو دواماً تازہ رکھینگے

جلالی، شاہجہانپوری

موسیقی کی عام اثر انگیزیاں

رقص موسیقی کی تعریف: — اصوات کی سرگمی موزونیت کا نام موسیقی ہے اور اعضائے بدنیہ کی سرگمی حرکات اور چشم وابرو کے محاکاتی اشارات کا نام رقص۔ موسیقی اصواتی زیر و بم پر مکمل اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے اور رقص میں اعضائے جسمیہ کے پیچ وخم کو سرگمی اصول کے تحت رکھنا پڑتا ہے۔ اصوات اور ”لے“ کے فطری تقاضوں سے عدم واقفیت اور اعضائی پیچ وخم میں بے اصولی رقص و موسیقی میں صورت خرابی پیدا کر دیتی ہے یعنی مغنی کا بے سُرا نغمہ جس طرح پردۂ گوش پر ناگوار اثر مرتب کرتا ہے اسی طرح حرکات و اشارات کی بے راہ روی بھی نظروں کی دعوت نظارگی میں حائل ہو جاتی ہے۔

عام اثر انگیزی کی بنا پر عربوں نے اپنی موسیقی کا نام غنا رکھا تھا اور اس کو غذائے روح سے تعبیر کیا تھا۔ ”الغناء غذاء الارواح“ کی مست نغمہ اور آشنائے لحن نے فارسی میں اس کی تشریح بڑے غنائیہ انداز میں کی ہے ”روح مرغیست کہ غذائے او زمزمۂ آوازاست“ عرف عام میں غنا کی تعریف میں کہا گیا ہے۔ ”الغناء من الصوت ما طرب“ یعنی غنا اس آواز کا نام ہے جو طرب انگیز ہو۔ اور بعض کے نزدیک غنا راگوں کی ایک خاص ترتیب کا نام ہے جس کو ہندی میں دھن اور عجم و عرب میں بالترتیب علم پردہ اور تالیف الالحان کہتے ہیں اور یحیی برکی کا قول ہے کہ جس راگ سے طبائع میں سرور یا رقت طاری ہو وہ موسیقی ہے۔ باقی مصیبت اور درد سر۔

موسیقی کے آغاز کے متعلق مختلف نظریات — موسیقی کے آغاز کے متعلق کئی روایتیں مشہور ہیں، ایرانی روایت کے مطابق موسیقی کا ماخذ ققنس یا موسیقار نام کا پرندہ ہے جس کی چونچ میں سات بڑے سوراخ تھے اور ہر سوراخ سے سُر راگ نکلتے ہیں، انسائکلوپیڈیا برٹینکا کے فاضل مقالہ نگار نے موسیقی کے ماخذ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ

”یونانی دیوتا زیوس کی نو بیٹیاں تھیں جو میوزس Muses کہلاتی تھیں اور ادب و شعر اور نغمہ و سرود کی موجد تھیں، اسی بنا پر نغمہ کی عام نسبت میوزس کی طرف ہوئی آخر میں یہ لفظ مختصر ہو کر موس رہ گیا بعد کو یونانیوں نے اس پر حرف ”ق“ کا اضافہ کر کے موسِق بنالیا یہی لفظ انگلستان پہونچ میوزک، فرانس میں موسیق، اٹلی میں میوسیکا، جرمن میں میوزیکا، اور عرب میں موسیقی کہلایا“ اور اسی مادہ سے لغات عرب میں موسی خوز اور موسیقار

مطرب و مغنی کے معنی میں ہنوز مستعمل ہے۔

چونکہ طائران نغمہ زن کی خوش نوائیوں سے روح انسانی کو تلذذ حاصل ہوتا ہے اس لئے بعض محققین کی رائے میں انسان
نے نوا سنجیوں اور رقصانہ انداز کے مشاہدے پر رقص و موسیقی کا فن سیکھا، وقت سحر خنک فضاؤں میں فطرت کے ان مطربوں
ہی سے جو تلذذ روحی حاصل ہوتا ہے وہ انسانی نغمہ سرائی سے ممکن نہیں، مرغان چمن اور طائران فضائی کے چہچہے حقیقت میں
خداوند کی اصواتی لے ہیں لیکن

نہ ہمہ مستمعان فہم کنند این اسرار

اسی بنا پر مرغان فضائی کو فطرت کے اصل رقاص و نغمہ زن کہا گیا ہے اور انسان نے ان کی تبعیت سے بہت کچھ حاصل
ایک دوسرے نظریہ کے مطابق رقص ان اشارات کی ایک ارتقائی شکل ہے جب انسان اپنا مافی الضمیر اشاروں میں ظاہر کیا کرتا تھا۔
رقص و موسیقی کی عام اثر انگیزی ——— موسیقی کی عام اثر انگیزی کا تعلق صوتیاتی زیر و بم کیفیات میں مضمر ہے اور رقص کی
رہی اعضا کی سرگرمی حرکات اور جسم و ابرو کی اشاروں میں پوشیدہ ہے، ستار کے منہ سے نکلے ہوئے پر زور تاثیر الفاظ کا زیر و بم جس طرح
پر سامانیاں پیدا کرتا ہے اسی طرح رقاص کے اعضائی حرکات کی مصوری بھی ناظر تماشہ کو صورت صد اضطراب بنا دیتی ہے
ستار کے زیر و بم کی جھنکار ہوا کے تموج کے ساتھ پردۂ گوش میں داخل ہو کر صورت تواجد پیدا کر دیتی ہے اور رقص کی سحور
کن منظر کے راستہ دل و دماغ کی وسعتوں میں پہونچ کر ایک عجیب عالم اضطراب پیدا کر دیتی ہے۔ اگر سحر الفاظ کی حسن
اور بندش کی چستی سے قلب و جگر کے لئے تیر و نشتر بن سکتا ہے اور تصویر مختلف رنگوں کی متناسب آمیزش سے
دلربا ہو سکتی ہے تو رقص و موسیقی کی اثر انگیزی بھی بھری محفل کو بیگانۂ ہوش بنا سکتی ہے۔

انسان کا دل جذبات و حسیات کا ایک مواج سمندر ہے چاند کے گھٹنے بڑھنے سے جس طرح سمندر میں مد و جزر کی کیفیت
ہوتی ہے اسی طرح دل کے سمندر میں بھی سرا در "لے" کے اجتماعی تلذذ سے بھی صورت تلاطم پیدا ہو جاتی ہے "قدرت نے
انسان میں چند ایسی قوتیں ودیعت کی ہیں جو سرور و غم کے خارجی اثرات قبول کرتی رہتی ہیں، موسم کے حسین و پر کیف اعتدال،
فطرت کے حسین و دلکش مناظر، شعر کی اثری رنگینی، اور تصویر کے جمالیاتی انداز سے جس طرح قلب انسانی متاثر ہوتا ہے اسی طرح
موسیقی اور اعضائی اشارات اگر قانون غنائیہ اور رقصیہ دائرے میں ہوں تو ودیعت کردہ قوتیں ان کا اثر بھی اسی تیزی
سے قبول کرتی ہیں۔

موسیقی کو سحر اور جادو سے تعبیر کیا گیا ہے، سامعہ نوازی کے ساتھ تلذذ روحی بھی اس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے یہ رلاتی
اور ہنساتی بھی۔ اگرچہ حسن مصوری اور لطافت شعری بھی جذبات لطیفہ مؤثر انگیخت پیدا کرتی ہے لیکن جو تاثیر
اور اثر پذیریت رقص و موسیقی کو حاصل ہے وہ مصوری اور شاعری کو نہیں۔ ایک مغنی اپنے فن کا مانہ زیر و بم اور دل کش
(دھن) سے سامع کے جذبات لطیفہ میں جو ابھار اور انگیخت پیدا کرتا ہے وہ شاعر اور مصور کی موشگافیوں اور

رنگ آمیزیوں سے یکسر عاری ہے۔ ایک رسیلی غزل اپنی معنوی گہرائی اور ترتیب و بیان کی لطافت کی بنا پر سامع کے دل میں جھلکیاں
لے سکتی ہے لیکن نشید و انشاد کی آمیزش اس کے اثر کو سہ آتشہ بنا دیتی ہے اسی بنا پر لحن و نغمہ کو غذائے روح سے تعبیر کیا گیا۔

مشہور ہے کہ حضرت آدم کے جسد خاکی میں روح کو داخل ہونے کا جب حکم ملا تو وہ امتثال امر کے طور پر جسم میں دا
تو ہو گئی لیکن تاریکی سے گھبرا کر فوراً باہر نکل آئی پھر حکم الٰہی سے جسد خاکی سے کچھ ایسی ترنم آمیز آواز نکلی کہ روح پر ا
وجدانی کیفیت طاری ہو گئی اور اسی عالم بے خودی میں وہ بخوشی جسد آدم میں داخل ہو گئی۔

ماؤں اور کھلائیوں کی ترنم آمیز لوریوں کے اثر سے روتا ہوا شیر خوار بچہ نہ صرف سکوت بر لب ہو جاتا ہے بلکہ آثا
اس کے معصوم چہرہ پر عیاں ہونے لگتے ہیں۔ افلاس و غربت کی ستائی پنہاریوں کی پچھلی راتوں کی غیر معمولی مشقت راگ
راگنیوں کی حلاوت کی بدولت خوش گوار اثرات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سینوں کو چیرتے وقت کسان کے خوش آہنگ ز
ہی اس کے لبوں کو خشک نہیں ہونے دیتے بلکہ شہد کی میٹھی بوندیں بن کر اس کے حلق کو تازہ رکھتے ہیں۔

رحم مادر میں بھی بچوں کی ساخت و صحت پر موسیقی خوش گوار اثر مرتب کرتی ہے چنانچہ برطانیہ کے بعض ڈاکٹر
تجربات سے رحم مادر میں بچوں پر موسیقی کا یہ ردِ عمل ظاہر ہوا کہ ان کی ٹانگوں کی حرکات اور ضربات قلب میں سرعت
ان ڈاکٹروں کو یہ توقع بھی ہے کہ ان تجربات کی روشنی میں اُن بچوں کے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد ملے گی جن کی پیدا
طبعی نہیں ہوتی۔ جریدۂ لان سنٹ میں جو تحقیقاتی تفصیلات شائع ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بچہ پیدائش
چودہ ہفتے پہلے موسیقی سے تلذذ حاصل کرنے لگتا ہے رحم مادر پر لاؤڈ اسپیکر رکھ کر جن تین سو بچوں کو گانے سنائے گ
میں سے صرف چھ بچوں پر موسیقی کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا۔ ان کی رائے میں جو بچے موسیقی سے لذت اندوز نہ ہ
ممکن ہے کہ وہ نقص تغذیہ کا شکار رہوں۔

شاعری اور مصوری صرف انسانی جذبات میں حرکت پیدا کرتی ہے لیکن موسیقی کی طرب انگیزی وحوش و طیور کو بھی م
ہے بدویوں کی حدی خوانی سے جس طرح اشتران سست رفتار جھوم جھوم کر چلنے لگتے ہیں اسی طرح منہدی گوالوں کے
گیت بھی گایوں پر صورت تواجد پیدا کر دیتے ہیں شیخ سعدی کا یہ جملہ "اشتر بہ شعر عرب در حالتست و طرب" اس
کی ترجمانی کرتا ہے۔ سپیرے کی بین کے سحر آمیز نغمے ناگ کے دل پر جو وجدانی کیفیت مرتب کرتے ہیں اس سے بھی واقف
آہوان دشتی کا بھی مست نغمہ ہونا مشہور ہے۔ خرگوش کے لئے لحن و غنا کا تلذذ ایسی خیالی کیفیت ہے جس سے
ہو کر وہ حالت رقص میں آ جاتا ہے۔ ہاتھی جیسے گراں جثہ جانور کے متعلق بھی ابو الفضل نے بڑی تحقیق سے لکھا۔
نغماتی اثر قبول کر کے تال سُر سے ناچنے لگتا ہے اور سمجھنے والے اس کے تال سُر کو سمجھ بھی لیتے ہیں۔ پانڈو خان
راجہ اُدین کے متعلق مشہور رہے کہ وہ اپنی راگ راگنیوں سے ہاتھیوں کو مست کر کے جنگل سے پکڑ لاتا تھا۔ مکڑی ستا
پر دیوانہ وار مضطربانہ دوڑنے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ بحالت مستی ستار نواز کے قریب تر آ کر ستار کی دھنوں سے تلذذ حاصل کر

ںدوں میں گھڑیال بھی موسیقی سے لذت اندوز ہوتا ہے۔ مثنوی سحر البیان کے مصنف نے جانوروں پر بین کے نغماتی اثر کا جو
کھینچا ہے اس سے نغمہ کی سحر انگیزی مجسم ہو کر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

جہاں بیٹھ کر وہ بجاتی تھی بین ۔ تو سننے کو آتے تھے آہوئے چین

ہوا بند ہو گئی اس گھڑی اس اصول

بسرا گئے جانور اپنا بھول

یہ بسرا بھول جانا نغماتی فعالیت سے بے خود ہو جانے کا اظہار ہے۔

درندوں پر سارنگی کے سُروں کی اثریت سے متعلق ایک دلچسپ حکایت مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک
ں نواز کا رات کے وقت ایک ایسے گاؤں میں گذر ہوا جہاں بھیڑیے گھوما کرتے تھے اس کو ایک بھیڑیا اپنی طرف
اتی دیا تو وہ ایک شکستہ دیوار پر چڑھ گیا اور نغمہ کی فعالیت سے واقف ہونے کی بنا پر سارنگی پر ایک نغمہ چھیڑ دیا۔
سے نکلتے ہوئے نغمات سن کر تمام بھیڑیے محو نغمہ ہو گئے اور سارنگی نواز کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔ ممکن ہے
ایت معتبر نہ ہو لیکن ریچھ اور بندر کو ڈگڈگی کی تال پر رقص کرتے لاکھوں نے دیکھا ہوگا۔

ز حوش و طیور اور انسان سے ہٹ کر نباتات کی حسین و دلفریب مگر خاموش دنیا بھی نغمہ کی فعالیت سے
تی ہے۔ پودوں پر اس کے پرکیف اثر سے شادابی خوش رنگی کے علاوہ روئیدگی، نشو و نما اور قوت پیداوار
اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ابھی حال میں پانڈیچری اور جنوبی ہند میں ایک آدھ جگہ دھان کی پیڑی اُگتے
اس کے قریب روزانہ بیس منٹ تک موسیقی کے ریکارڈ لگا دیئے گئے۔ جن پودوں کے قریب راگ راگنیاں
ئیں ان کی بالیدگی اور نشو و نما زیادہ سرعت سے ہوئی۔ کیلے کا درخت بھی موسیقی کا بڑا رسیا معلوم
، ئیے تو یہ درخت بہرہ ہے لیکن سنگیت سننے کے لئے اس کے کان موجود ہیں۔ وہ نہ صرف موسیقی کو پسند
بلکہ اس کے نشو و نما اور پھلوں کے رسیلے پن میں بھی اس سے مدد ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں جنوبی ہند
تنجور کے ایک گاؤں میں دسمبر ۱۹۷۲ء میں جو تجربات کئے گئے یہ انکشاف انہی تجربات کا نتیجہ ہے۔ کھجور
سیقی کا اثر قبول کرتا ہے چنانچہ ابھی جنوری ۱۹۷۳ء میں گجرات کے ایک مقام پر بینر دارہ ریسرچ کمیٹی کی طرف
ے درختوں کی نشو و نما پر موسیقی کا تجربہ کیا گیا۔ دوران تجربہ جن پیڑوں کے پاس ساز وغیرہ بجائے گئے ان کی
یداوار میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ ان کے پھیلنے اور پھولنے کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔

وسیقی اور دخیعہ امراض ——— اگرچہ صرف غنا کے ذریعہ تمام امراض انسانیہ کا علاج بھی ممکن نہ ہو سکا لیکن اگر دو حکم
ن کے درمیان موسیقی کی اثر انگیزی اور نغمہ کی روح پروری سے بھی کام لیا جائے تو یقیناً دخیعہ امراض میں سرعت پیدا ہو سکتی ہے
نشتوائے داخلیہ اور اعصاب متاثر نہیں ہوتے بلکہ روح اس کی اثر انگیزی سے سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے جسم انسانی کا قصرہ

سب سے رقص و تواجد میں آجانا اثر پذیری کا نتیجہ ہے علاج بالادویہ صرف شعوری طور پر اپنا اثر دکھاتا ہے لیکن نغمہ کی معالجاتی نوعیت شعوری اور غیر شعوری دونوں حیثیتیں رکھتی ہے موسیقی کا خطاب چونکہ انسان کے ذہن اور اس کے جذبات و احساسات سے ہوتا ہے اس لئے یہ مریض کے پژمردہ جذبات اور کمزور احساسات میں ایسی تحریک و انگیخت پیدا کرتی ہے جس سے مرض کی شدت کا احساس کمزور ہونے لگتا ہے۔ اسی جذباتی اثر پذیری کی بنا پر امریکہ، یورپ اور جاپان وغیرہ میں موسیقی کی معالجاتی نوعیت کے تجربات کئے جا رہے ہیں اور مختلف یونیورسٹیوں کے تحت اسکی اثری قوت کی تحقیق کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ امریکہ اور انگلستان کے امراض دماغی کے چند ہسپتالوں میں بعض ڈاکٹروں نے انفرادی طور پر اس سلسلہ میں گراں قدر تحقیقی خدمات انجام دے کر امید افزا نتائج برآمد کئے ہیں

اسی صدی کے شروع میں ڈاکٹر رشڈنی میچل نے سب سے پہلے موسیقی کی معالجاتی نوعیت پر متعدد مضامین لکھے اور بعد کو ڈاکٹر زینکر نے اس کی تائید و تصدیق میں کئی قابل مطالعہ مقالات شائع کئے۔ اور حال ہی میں ڈاکٹر ڈی ملیر نے ذاتی تحقیق و تجربہ کی روشنی میں موسیقی کی معالجاتی نوعیت پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ اگرچہ یہ تمام کوششیں انفرادی نوعیت کی ہیں اور ان میں اجتماعی ربط و ترتیب کا کوئی سلسلہ قائم نہیں پھر بھی اس کی معالجاتی حیثیت اور طریقہ علاج میں دلچسپی برابر بڑھ رہی ہے۔

موسیقی کی اثری حیثیت صرف انفرادی اثر اندازی نہیں بلکہ اجتماعی اثریت بھی اس کی خصوصیات میں شامل ہے یعنی جس طرح فرد واحد پر یہ اثر انداز ہوتی ہے اسی طرح بھری محفل کو بھی متاثر کرتی ہے لیکن سامعین کی نفسیاتی کیفیت مزاج کے مطابق اس کے اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ایک موسیقار جس طرح خود اپنے گانوں کی لحن و نغمہ میں مست و محو ہو کر اپنے ذہن و دماغ کو دنیا کی تلخیوں سے تھوڑی دیر کے لئے آزاد کرا لیتا ہے اسی طرح ایک مریض بھی اپنی نفسیاتی کیفیت مزاج کے مطابق اس کے اثرات سے لذت اور عارضی صحت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اپاہج اور معذور کر دینے والے بعض امراض میں موسیقی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ چنانچہ دماغی فالج میں یہ ہیجانی کیفیت پیدا کر کے تسلسل حرکت کا سبب بنتی ہے یعنی اس کے ذریعہ ایک نوع کا حرکتی کنٹرول قائم کیا جاتا ہے۔

امراض دماغی کے علاوہ دوسرے امراض میں بھی اس کی معالجاتی اثریت سے مدد لی جاتی ہے۔ قوت گویائی کے فقدان میں گفتگو کی صلاحیت پیدا کرنے کا تجربہ بھی اس کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ احساس اور تصوری قوتوں کو بھی اس سے جلا حاصل ہوتی ہے چنانچہ جو بچے بے آہنگی اور عدم مطابقت کا شکار ہوتے ہیں یا جو نوجوان جذباتی خلل کے مریض ہوتے ہیں ان کو بھی موسیقی کی سحر اثری تھوڑی دیر کے لئے ایسی پرسکون منزل میں پہنچا دیتی ہے جہاں جذباتی ہم سازی اور احساساتی ہم آہنگی پورے طور پر پائی جاتی ہے۔

جراحی کے موقع پر بھی یہ اپنا اثر دکھاتی ہے چنانچہ جاپانی ڈاکٹروں کا دعویٰ ہے کہ پس منظر کی ہلکی موسیقی آپریشن کے دوران ڈاکٹر اور مریض دونوں کیلئے وجہ سکون ثابت ہوتی ہے ٹوکیو یونیورسٹی ہسپتال کے ایک سرجن نے بتایا کہ وہ گذشتہ چھ ماہ سے آپریشن کے موقع پر موسیقی کے دھیمے سروں سے کام لے رہا ہے جس سے نہ صرف وہ نازک ترین حصوں کو مہارت اور آہستگی سے چیرنے میں کامیاب رہا ہے بلکہ مریض کے اعصاب پر اس کا یہ خوشگوار اثر پڑا کہ وہ کچھ عرصہ کیلئے اپنی تکلیف کو بھول گیا۔ موسیقی کے معالجاتی طریقہ کار میں کامیابی کا زیادہ تر انحصار موسیقی کی اثر پذیری کی شدت پر منحصر ہے یعنی لحن و نغمہ کی اثریت چونکہ تحت الشعوری قوتوں کو متاثر کرتی ہے نغمہ کا مریض کی نفسیاتی کیفیت مزاج کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ ورنہ مریض پر اس کا اثر اسی طرح نہ ہوگا جس طرح غلط تشخیص کی بنا پر علاج بالادویہ غیر متاثر رہتا ہے

مرزا صفدر علی بیگ

مسئلہ خیر و شر اور جبر و قدر

مقصد تخلیق کائنات ایک رازِ سربستہ ہے جس کے انکشاف کے لئے فکر انسانی ہمیشہ سرگرداں رہی ہے اور
مدگی کے کیا تقاضے ہیں؟ جذبات، حسیات، علم، عقل، اصول، قواعد، مذہب، عقاید اور قول و فعل کی انسانی
گی میں کیا اہمیت ہے؟ ان کے حسن و قبیح کا تعین کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ خیر و شر کی حقیقت اور ان کو جانچنے کا
یار کیا ہے؟ کس عمل کے لئے انسان جواب دہ ہوسکتا ہے؟ وہ مجبور ہے یا مختار؟ ان معرکتہ الآرا مسائل کو حل کرنے
لئے انسانی شعور نے تحلیل و تجزیہ اور فکر و نظر کی منزلیں طے کر کے مختلف نتائج نکالے۔

مسائل خیر و شر قدیم زمانے ہی سے زیر بحث رہے ہیں اور یونان قدیم کے مفکرین نے بھی اس پر سیر حاصل بحث کی ہے
تہ جبر و اختیار کا مسئلہ بہت عرصہ بعد پیدا ہوا جبکہ عیسائی مذہب نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا باقاعدہ علم اہل
لکے سامنے پیش کیا۔ قدیم یونانی حکما میں ہیراکلیتس نے اعمال انسانی اور خیر و شر کے بارے میں کہا تھا کہ "خیر و شر ایک
ہیں۔ خدا کے نزدیک ساری چیزیں درست اور اچھی ہیں لیکن انسان چند چیزوں کو اچھی اور چند کو بُری سمجھتا ہے"
یینیز لیس نے سقراط کو نصیحت کی تھی کہ "بدترین شئے سے بھی نفرت نہ کرو" فلسفیوں کا ایک گروہ جو کلیہ دہ stoics)
ملے ہے یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ "شر کا دنیا میں وجود ہی نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو اس طرح ہے کہ اس سے خیر کا حسن دوبالا
ہاتا ہے کیونکہ شر کی وجہ سے ہی خیر کے حسن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ شر کو ناگزیر سمجھتے اور کہتے تھے کہ شر کے خلاف جہد کرنے ہی
یر کی قوت بڑھتی ہے۔ لہٰذا عالم ہستی میں ہر شئے اپنے مقام پر خوبصورت، مکمل اور ناگزیر ہے اور ہر شئے کے وجود کا
ان کوئی مقصد ہے۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں ایک گروہ جو سوفسطائی (Sophists) کہلاتا تھا اپنی تعلیمات کی وجہ سے
ت مشہور تھا۔ سوفسطائیوں کا خیال تھا کہ صداقت بجائے خود کوئی حقیقت یا حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ انسان
ا شئے یا کسی عمل کی حقیقت کا مکمل علم نہیں ہے اور اس بارے میں علما و حکما ہمیشہ مختلف اور متضاد خیالات ظاہر
رہے ہیں۔ جب تک پوشیدہ حقایق پوری طرح سامنے نہ آئیں خیر و شر کے بارے میں قطعیت کے ساتھ رائے نہیں

دی جا سکتی۔ لہذا کسی عمل کو اچھا یا بُرا نہیں ٹھیرایا جا سکتا البتہ عقل انسانی موقع اور وقت کے لحاظ سے غور و فکر کے بعد مناسب نتیجہ نکالے اور اسی کو عمل کا معیار قرار دے۔ بنے بنائے اصولوں اور رسم و رواج پر عمل کرنے سے وہ سختی کے ساتھ منع کرتے تھے۔ اس گروہ کے مفکرین میں فیثا غورس، گارجیاس، پولس اور ایوتھی ڈیمس وغیرہ ہیں۔ سوفسطائیوں کے خلاف سقراط نے شد و مد سے آواز بلند کی اور خیر و شر کا امتیاز واضح کیا۔ افلاطون کا خیال تھا کہ اگر انسان کے حسی ادراک (Sense - Perception) کے اعتبار سے مسئلہ خیر و شر پر بحث کی جائے تو سوفسطائی بالکل سچ کہتے ہیں کہ کسی شے کا مکمل علم نہیں ہے لیکن "تلاش" "صداقت" سے کسی شئے کا مکمل علم حاصل ہو سکتا ہے۔ عقلی دلائل و براہین سب سے زیادہ صداقت رکھتے ہیں اور انسان کو نیکی کی طرف لیجاتے ہیں۔ افلاطون کا یہ بھی خیال تھا کہ انسان ایک لامحدود "کل" کا بہت محدود اور غیر اہم جز ہے۔ لیکن ہر جز کی حیات کا مقصد کل کے مقصد کو پورا کرنا ہے۔ اس بات کا شعوری احساس انسان کو اعمال صالح کے لئے مجبور کرتا ہے۔ انسان نیک، پاکیزہ اور حکیم ہونے سے خدائے تعالیٰ کی مانند ہو جاتا ہے۔ کلبیہ گروہ بھی اس رائے سے متفق ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اعمال صالح اور نیکی دائمی مسرت کا باعث ہے۔ لیکن اگر انسان کسی عمل کے نیک و بد ہونے کا علم حاصل کرے اور نیکی کی طرف مائل ہو تو اس کی نیکی صحیح معنوں میں نیکی کہلائے گی یا بدی کی طرف مائل ہو تو وہ صحیح معنوں میں بدی کہلائے گی۔ اگر غیر شعوری طور پر کوئی حرکت سرزد ہو تو ایسی حرکت نیک و بد نہیں کہلاتی۔ فعل بد یا گناہ سرزد ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یا تو انسان صحیح رائے نہیں قائم کر سکتا یا غلط تصورات اور عقاید رکھتا ہے۔ مصر کا مشہور نو فلاطونی مفکر فلاطینوس وحدت الوجود پر عقیدہ رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک ساری کائنات خدائے تعالیٰ کا ایک ظاہری روپ تھی لہذا کوئی شئے بُری نہیں کہلائی جا سکتی۔ وہ کہتا تھا کہ کسی شئے کا عمل خود اس کا اپنا نہیں بلکہ خدا کا عمل ہے اور خدائے تعالیٰ کا عمل بُرا نہیں ہو سکتا۔

خیر و شر کے مسائل پر فلسفہ اسلام اور صوفیائے کرام نے بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔ قرآن حکیم نے اعمال نیک اور خیر و شر کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ "لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ" (اس نے اچھا کام کیا تو نفع کے لئے اور بُرا کام کیا تو اس کا وبال اسی پر پڑے گا ۔۔۔ ۲-۲۸۶) ایک اور آیت یہ ہے کہ "قُلْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ" (کہدو کہ خدا ہرگز بُرے کام کا حکم نہیں دیتا ۔۔۔ ۷-۲۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم خیر و شر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى" (کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس بات پر ایمان نہ لائے کہ خیر و شر کی تخلیق من اللہ ہے)

حضرت بایزید بسطامی نے مسئلہ خیر و شر پر اس طرح بحث کی ہے کہ "معرفت یہ ہے کہ بندے کو یہ معلوم ہو جائے کہ مخلوق کی تمام حرکات و سکنات خدا کی طرف سے ہے۔ ہر چیز کا اثر اس کے اثر سے ہے۔ ہر شئے کی صفت اس کی صفت ہے۔ متحرک اس سے متحرک اور ساکن اس سے ساکن ہے۔ بندے کا فعل مجازاً ہے ورنہ وہ فعل درحقیقت خداوند عالم

امام غزالی اپنی مشہور تصنیف "احیاء العلوم" جلد چہارم میں کہتے ہیں کہ "شر ایسی شئے ہے جو عاشق اور معشوق کے درمیان میں دیوار بن جاتی ہے اور عاشق کو معشوق حقیقی سے دور کر دیتی ہے جس کا تصور عاشق کو غمگین اور افسردہ کر دیتا ہے ...... خیر کی روشنی شر کے اندھیرے کو نیست و نابود کر دیتی ہے" ابوالحسن علی ہجویری کہتے ہیں کہ "نفس کی مخالفت تمام عبادتوں کا سرچشمہ ہے۔ نفس پر جبر کرنا یعنی نفسانی خواہشوں کو روکنا جہاد اکبر ہے۔ شیخ صدرالدین عارف کا خیال ہے کہ ایمان کی صحت یہ ہے کہ اگر بندہ نیک کام کرے تو اس کو خوشی محسوس ہو اور اس سے برائی سرزد ہو تو وہ رنجیدہ ہو۔

اُردو کے اساتذۂ سخن نے بھی مذکورۂ بالا مسائل پر بحث کی ہے۔ سراج کا خیال ہے کہ مسئلۂ وحدت الوجود خیر و شر کے مسئلہ کو حل کر دیتا ہے جو شخص مئے وحدت کا جام پی کر مست ہو جاتا ہے۔ اس کا ذہن نیک و بد کے تصور سے خالی ہو جاتا ہے۔ چشم حقیقت میں امتیاز نیک و بد نہیں ہوتا۔

سراج اب نیک و بد سیں ہیں مُبرّا — مئے وحدت کا پی کر جام اک بار
نہیں ہے امتیاز نیک و بد چشم حقیقت میں — مجھے یکساں ہوا ہے کفر اور اسلام اے واعظ
جو صلح کل کی راہ میں واقف ہیں اے سراج — نیں نیک و بد کا اسکی نظر میں اختلاف

زاہد کے نزدیک اعمال انسانی کا نیک و بد ہونا محض اتفاقی بات ہے اور خیر و شر کی حیثیت اضافی ہے۔ عمل بجائے خود خیر یا شر نہیں کہلا سکتا۔ اس کا تعلق وقت، حالات، کیفیات و جذبات سے ہے۔ وہ خیر و شر کو ایسے زہر سے تشبیہ دیتے ہیں جو ایک کے لئے سود مند اور دوسرے کے لئے مضر ہے۔ سانپ کا زہر خود اس کے لئے باعثِ نجات اور دوسرے کے لئے ہلاکت آفریں ہے۔ بسا اوقات نیکی نقصان دہ اور بدی فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ عمل کے نیک و بد ہونے کا انحصار حالات اور واقعات پر ہے۔ شر کی حقیقت واضح ہو جائے تو وہ صحیح معنوں میں شر نہیں معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات سراسر خیر معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا کہتے ہیں کہ مجھے ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔

خیر و شر کو سمجھ یہ کہ ہیں دو زہر — سانپ کی زیست ہے تجھے سم ہے
آتے ہیں مری نظر میں سب خو — جو عیب ہے پردۂ ہنر ہے

میر کہتے ہیں کہ

اب نیک و بد پہ عشق میں مجھکو نظر نہیں — اس میں مجھے بھلا کہو کوئی بُرا کہو

غالب کا خیال ہے کہ ہر شر میں ایک خیر کا پہلو ہوتا ہے۔ گناہوں اور بدکاری سے جو تجربہ حاصل ہوتا ہے نہ صرف انسان کے علم میں اضافہ اور یقین میں پختگی پیدا کرتا ہے بلکہ خیر کے محاسن اور شر کے معائب ظاہر کر کے ایمان میں بھی

پختگی پیدا کرتا ہے۔ ایمان و یقین کی ایسی پختگی سے عموماً اہل ورع اور پرہیز گار لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے ہم ۔ لیکن طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

جگر کہتے ہیں کہ عالم ہستی ایک آئینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا عکس نظر آتا ہے۔ اگر خیر ہے تو بھی اللہ ہی کا عکس ہے اور شر ہے تو بھی اسی کا عکس ہے۔ لہٰذا کسی شئے کو بُرا نہیں کہا جا سکتا۔

خیر اسکو نظر آیا شر اسکو نظر آیا ... آئینے میں خود عکسِ آئینہ نگر آیا

امجد خیر و شر کے تعلق کو جسم و جان کا تعلق سمجھتے ہیں۔ شر سے تفسیر خیر اور خیر سے تفسیر شر ہوتی ہے۔ شیطان کے بغیر یزدان کو پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا اور یزداں کے بغیر شیطان کو۔

اس جسم سے معلوم ہوا جان بھی ہے ... مشکل سے ہوا علم کہ آسان بھی ہے

شر سے تفسیر معنیٔ خیر ہوئی ... شیطاں نے کہا کوئی رحمان بھی ہے

مسئلہ جبر و قدر پر قدیم یونانی مفکرین نے اظہار خیال نہیں کیا البتہ کسی قدر کلبیہ گروہ نے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہر امر پہلے ہی سے طے شدہ اور مقرر کردہ ہے۔ انتہا یہ کہ انسان کا ارادہ بھی پہلے ہی سے متعین کیا جا چکا ہے۔ جہاں و مافیہا علت و معلول کا ایک سلسلہ ہے۔ کوئی بات اتفاقی طور پر نہیں ہوتی۔ انسان مختار اس بات میں ہے کہ وہ مقدر کے احکام کو قبول کرتا ہے۔ لیکن وہ قبول کرے یا نہ کرے اسکو تعمیل ضرور کرنا پڑتا ہے۔ انسان کا ارادہ خدا کے ارادے سے پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز خدا کے ارادے کے تابع ہے۔ مقصد یا قانون اصل میں خدا کا ارادہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقدیر سے متعلق ارشاد فرمایا تھا کہ "جب تقدیر کا مذکور ہو تو سکوت کرو" تقدیر کے راز فاش کرنے سے آپ منع فرماتے تھے۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ "فاعل سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ...... انسان فعل اس وقت کرتا ہے جب وہ چاہتا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ چاہنا اس کے اختیار میں ہو کہ چاہے تو چاہے اور نہ چاہے تو نہ چاہے۔ بندے کو یہ اختیار نہیں کہ وہ مشیت کو روک دے سب امور میں بندہ لاچار ہے! ...... اب اگر کوئی یہ کہے کہ اس تقریر سے محض جبر ثابت ہوتا ہے اور جب آدمی ہر طرح سے مجبور ہو تو مختار کیسے ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حقیقت حال کھول دی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان عین اختیار ہی میں مجبور ہے ...... اگر سوئی لیکر کسی کی آنکھوں میں دھنسانے کے لئے ہاتھ آنکھ کے قریب لے جاؤ تو خود بخود پلک جھپک جائیگی اگرچہ وہ شخص پلک جھپکانا چاہے یا نہ چاہے۔ اس مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ پلکوں کا بند کرنا اگرچہ فعل ارادی ہے لیکن تاہم یہ ہے کہ پلک غیر ارادی طور پر خود بخود جھپک جاتی ہے۔

شیخ محی الدین ابن العربی نے مسئلہ جبر و قدر کو اس طرح واضح کیا ہے کہ خدا کائنات کی ہر شئے کا منبع اور ہر فعل کا فاعل

ہے کہ انسان۔ وہی حاکم ہے اور وہی محکوم۔ انسان اپنے اعمال اور حرکات کی حد تک صرف اس قدر ذمہ دار ہے کہ اس کے اعمال اور حرکات بالراست اسی کے وجود سے ظاہر ہوتے ہیں۔ خود اس کی فطرت اور وہ قوانین جو اس کی فطرت کی رہبری کرتے ہیں اس کے عمل کا تعین کرتے ہیں۔ ہر چیز پہلے ہی سے طے شدہ ہے۔ جو کیفیت ہمارے اندر چھپی ہوئی ہے وہی ہم سے ظاہر ہوتی ہے اور یہی تقدیر کا ایک راز ہے۔ انسان کو اپنے لئے اعمال منتخب کرنے کا کوئی موقع نہیں۔ اس کی ماہیت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ صرف وہی کرتا ہے جو خدا اس سے کروانا چاہتا ہے۔ سارے ممکن اعمال میں سے وہ صرف اسی عمل کا انتخاب کرتا ہے جو خدا کے ارادے میں ہوتا ہے۔ جب ارادہ انسان کے بس میں نہ ہو تو نہ اس پر ذمہ داری عاید ہوتی ہے نہ اخلاقی پابندی۔ ابن العربی کے نزدیک حالات، ماحول اور قوانین فطرت بھی خدا ہی کے ارادے اور حکم سے ہیں۔ رب کا کام حکم دینا ہے اور عبد کا کام تعمیل کرنا۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ کوئی فعل ایسا نہیں ہے جو خدا کا نہ ہو۔ اگرچہ بعض افعال قابل ستایش اور بعض قابل مذمت ہیں۔

ابن قیم الجوزی کا خیال ہے کہ "فقیر کو چاہئے کہ اپنے افعال کو اپنے کسب اور اختیار سے صادر ہوتا ہوا دیکھے اور تسلیم کرے کہ امر اور نہی کا تعلق افعال کے ساتھ اسی حیثیت سے ہے (یعنی کسب اور اختیار کی حیثیت سے) اور اسی لئے ان پر شرعاً اور عقلاً مدح اور ذم مترتب ہوتے ہیں اور جزا و سزا کی بنا اسی پر ہے .... سالک کا قلب عقیدۂ جبر سے آلودہ نہ ہو کیونکہ اس کا دل جبر کے اعتقاد سے ملوث ہو جائے تو اس کا نظام عبودیت تحلیل ہو جاتا ہے اور اسلام کا طوق وہ اپنی گردن سے اتار پھینکتا ہے ...... اس مشرب کا آدمی خدا اور رسولوں کی تعلیم سے بیزار ہے۔ جامۂ شریعت کو اس نے اتار پھینکا ہے، وہ دشمن خدا اور ابلیس لعین کا سگا بھائی ہے۔"

شعرائے اردو نے بھی جبر و اختیار کے مسائل کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ اکثر جبر کے قایل ہیں۔ حکیم شعرا میں صرف علامہ اقبال انسان کو مجبور نہیں پاتے۔ سراج کہتے ہیں۔

نہ تھا بے اختیاری کے محل میں اختیار اپنا ۔ کروں کیا دل کے ہاتھوں آخر کوں سونپا اختیار اپنا

درد کہتے ہیں۔

تھا عالم جبر کیا بتائیں ۔ کس طور سے زیست کر گئے ہم

اس امر میں بھی بے اختیار ہے بندہ ۔ ملا ہے دردؔ اگر یاں کچھ اختیار مجھے

گر کہتے ہو کہ ہے وہی ہادی وہی مضل ۔ تو راہ پر ہیں سب کوئی گمراہ ہی نہیں

قایل نہیں اختیار کا میں ۔ بندہ ہے سمجھ میں اپنی مجبور

میر کا خیال ہے کہ

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی ۔ چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

منہ نہ ہم جبریوں کا کھلواؤ — کہنے کو اختیار سا ہے کچھ
آگاہ نہیں انساں اسے تیر نوشتے سے — کیا چاہیئے ہے پھر جو طالع کا لکھا جانے
اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے — جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتا

غالب کا خیال ہے کہ انسان غفلت کے سبب اپنے اعمال خیر پر نازاں ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا عمل عقل و تدبیر کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ گھاس کا ایک تنکا بھی ایسا نہیں جو بادِ صبا کا محتاج نہ ہو۔ موجیں لاکھ اپنے آزاد تصور کریں حقیقت میں پابہ زنجیر ہیں۔ انکی رسائی صرف ساحل تک ہے۔ وہ ابھر کر ساحل تک جاتی ہیں اور واپس ہو جاتی ہیں۔ مقدر کا جبر انہیں اپنی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ آزادی کے لیے انکی ہر کوشش رائگاں۔

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں — بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی — ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

اکبر کا خیال ہے کہ :-

چلتی نہیں کچھ اپنی کوئی ہزار چاہے — ہوتا ہے بس وہی جو پروردگار چاہے
ہر ارادے میں نظر آتی ہے اک صورت یاس — شغل اب کچھ بھی نہیں فسخ عزیمت کے سوا

علامہ اقبال نے اپنی کتاب " ریکنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام " (Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں مسئلۂ جبر و اختیار پر اس طرح بحث کی ہے کہ مقدر خارج سے متعین نہیں کیا گیا ہے کیونکہ ایسی صورت میں کائنات کو پابند کر دیتا ہے کہ وہ ایک بنے بنائے منصوبے یا ڈھانچے کو (جس میں ہر واقعہ فی نفسہ اپنے ایک معینہ مقام پر موجود ہے اور تاریخ کے مادی ارتقا میں وقت معینہ پر منکشف ہوتا ہے) مادی شکل دیتی رہے اس صورت میں کہ تقدیر ایک سخت خارجی ہے جس سے نہ صرف انسان بلکہ خدا کی آزادی بھی ختم ہو جاتی ہے اور اعمال انسانی کا بدلہ بے معنی ہو جاتا ہے و بد کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ آزادی ہی خیر و شر پیدا کر سکتی ہے۔ وہ انسان جسکے افعال مشین کی طرح سرانجام خیر پیدا نہیں کر سکتا " وہ مسئلہ تقدیر کو اس طرح واضح کرتے ہیں کہ " زمانے کو جب ایک عضوی کل کی حیثیت جائے تو قرآن کی زبان میں اسے " تقدیر " کہتے ہیں . . . . . تقدیر زمانے ہی کی ایک شکل ہے جبکہ اس کے کے ظہور سے قبل اس پر نظر ڈالی جائے۔ تقدیر وہ زمانہ ہے جو سلسلۂ اسباب کے پھندے سے آزاد ہو چکا ہے اس پر اپنے مخصوص اشکال عاید کر دیتی ہے۔ مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقدیر وہ زمانہ ہے جسے ہم محسوس نہ کریں جس کا ہم تفکر کرتے یا جس کے متعلق حساب لگاتے ہیں . . . . . . زمانے کو جب تقدیر خیال کیا جائے ماہیت اشیا بن جاتا ہے . . . . . . غرض کہ کسی شئے کی تقدیر نہ ٹلنے والی مقسوم نہیں جو خارج سے

عاید کی گئی ہو۔ بلکہ وہ خود شئے کی اندرونی رسائی اور اس کے قابل تحقق امکانات ہیں جو اس کی فطرت میں پوشیدہ تھے۔ ان امکانات کا ظہور تواتر طور پر بلا کسی خارجی جبر کے عمل میں آتا ہے" اقبال کے اکثر اشعار اسی زاویہ نگاہ کی ترجمانی کرتے ہیں

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں   ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں   تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی   یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

فانی بھی جبر کے قایل ہیں۔

مجبوری عریاں کو یہ خلعت مختاری   اللہ رے کرم ہم اور توفیق گنہگاری

چاہے سے بدلتی ہے مشیت بھی کہیں   چھپتی ہے چھپائے سے حقیقت بھی کہیں

لیکن یہ حجاب قدر آخر کب تک   پہچان لیا فسخ عزایم نے مجھے

نوشتۂ تدبیر تھا تقدیر کا ایک ایک حرف   خط پیشانی صف ماتم نظر آیا مجھے

جگر کا خیال ہے کہ:۔

کل ہستیٔ عالم پہ طاری ہیں صفات اسکی   سب کہنے کی باتیں ہیں مختاری و مجبوری

امجد نے مسئلۂ جبر و قدر پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

جس امر میں چاہا مجھے مامور کیا   مسرور کبھی اور کبھی رنجور کیا

میں قدرت کا کبھی نہ قایل ہوتا   لیکن مجبوریوں نے مجبور کیا

کوئی جبراً لئے جاتا ہے مجھکو   کدھر کی سمت میں جاتا نہیں ہوں

خیالوں سے بچاؤں جان کیونکر   خیال آتا ہے میں لاتا نہیں ہوں

محکوم میں اقتدار کیونکر آیا   موہوم پہ اعتبار کیونکر آیا

جبراً پیدا ہوا مروں گا جبراً   یہ بیچ میں اختیار کیونکر آیا

صوفیا، حکما اور شعرا کا تصور جبر بڑی حد تک قرآن حکیم کی چند آیات پر منحصر ہے۔ مثلاً ایک آیت یہ ہے کہ "وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ" (جب تک خدا نہ چاہے تم لوگ کچھ بھی نہیں چاہ سکتے ۔۷۶۔۳۰) اس آیت کا اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ انسان عمل اس وقت کرتا ہے جب وہ چاہتا ہے لیکن اس وقت تک نہیں چاہ سکتا جب تک کہ خدا نہ چاہے تو گویا اس کے عمل صالح یا فعل بد کا ارادہ محض اللہ تعالی کے ارادے کے تابع ہے۔ لہذا ہر عمل صالح اور فعل بد کا انحصار اللہ تعالی کے ارادے پر ہوگا تو پھر عمل کا ذمہ دار بھی انسان نہیں بلکہ اللہ تعالی ہوگا اس لئے کسی فعل کو نیک یا بد نہیں ٹھیرایا جا سکتا اور نہ انسان سزا و جزا کا مستحق رہتا ہے۔ اب غور طلب امر یہ ہے

کہ حق تعالیٰ عدل و انصاف کی صفات سے متصف ہے۔ اس کا کسی نیک نیت فرد بشر کے لئے خواہ مخواہ برا چاہنا
نہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ بدوں کے لئے بھی غفور و رحیم ہے۔ البتہ اپنے بندے کی بھلائی چاہنا اس کی رحمت ا
کے سبب ہے۔ دوسری آیتیں یہ ہیں کہ کَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (
چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے ـــ ٧٤-٣١) مَنْ يَهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ ا
وَمَنْ يُضْلِلْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ" (راہ پر وہی شخص ہے جس کی خدا ہدایت کرے اور جس کو
وہ گھاٹے میں ہے ـــ ٧ ـــ ١٧٨) ان آیتوں سے خدائے تعالیٰ کا ہادی و مضل ہونا ثابت ہے۔ اور ہدایت پانے
اور گمراہ کئے جانے والے کا تصور سمجھ میں نہیں آیا لیکن خدائے تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ " وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا
(خدا بدکاروں کو گمراہ کرتا ہے ـــ ٢ ـــ ٢٦) یہاں بھی غور طلب امر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا کسی نیک نیت
مخواہ گمراہ کرنا عدل و انصاف کے منافی ہے۔ وہ قلوب اور نیتوں پر نظر رکھتا ہے۔ البتہ ہدایت کرنا
کیونکہ وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے جیسے کہ قرآن حکیم نے اسکو " ودود " (چاہنے والا) ارشاد
لیکن اللہ تعالیٰ ظالموں اور کافروں کو بھی ہدایت نہیں دیتا " إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
(خدا ظالم لوگوں کو راہ راست پر نہیں لاتا۔ ٥ - ٥١) " إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَٰ
(خدا کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ٥ ـــ ٦٧) نیک نیتی، خلوص اور صداقت کے نہ ہونے یا بر
کی وجہ سے اس کا انسان کو گمراہ کرنا ممکن ہے کیونکہ انسان جس راہ پر نکل پڑتا ہے اللہ تعالیٰ اسکی مدد
ایک اور سوال یہ ہے کہ جب قلم قدرت ہر شئے کا مقدر اور اعمال و افعال پہلے ہی تحریر کر
انسان کا اس کے مطابق عمل نہ کرنا ممکن نہیں۔ لہذا عمل کی ذمہ داری انسان پر نہیں قلم قدرت پر۔
جواب یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ علم الہٰی کے مطابق ہے یعنی انسان کے کسی عمل کے امکانات
موجود ہیں لیکن یہ احکام الہٰی نہیں ہیں اور نہ انسان کو اس کا علم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے چاہنے ہدایت
کرنے کا انسان کو پہلے سے علم نہیں۔ کوئی شخص عمل سے پہلے یہ نہیں جانتا کہ حق تعالیٰ اس کے لئے کیا چ
اسے ہدایت دینا چاہتا ہے یا گمراہ کرنا اور نہ یہ جانتا ہے کہ قلم قدرت نے اس کے مقدر میں کیا لکھا ہے۔
مرتکب ہو کر وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے یہی چاہا تھا یا خود اس کو گمراہ کیا یا قلم قدرت نے اس کے لئے یہی لکھ
اپنے طور پر سوچ سمجھ کر عمل کرتا ہے اسلئے ذمہ داری اسی پر عاید ہوتی ہے اور اسی وجہ سے وہ سزا و
قرار پاتا ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ اگر انسان خلقتاً کمزور پیدا کیا گیا ہے جیسے کہ خدائے تعالیٰ قرآن حکیم
فرماتا ہے تو اسکو اپنے اعمال و حرکات پر، خود اپنی فطرت اور ناسازگار ماحول حیات پر کس طرح قدرت

سب درس
کر چاہے تو اسکو بدل دے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو پر اسرار اور غیر معمولی قوتیں اور صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں اور اگر وہ اپنی ان لامحدود ذہنی و روحانی قوتوں سے استفادہ کرے تو وہ نہ صرف احول حیات کو بدل سکتا اور ناسازگار حالات کو سازگار بنا سکتا بلکہ چاند سورج اور ستاروں کو بھی مسخر کر سکتا ہے۔ انبیاء، اولیا اور حکما کا عمل اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ جب انسان کائنات ہستی کو مسخر کرنے کے در پے ہے تو کیا اپنے نفس کی تسخیر نہیں کر سکتا؟ نفس کی تسخیر اسکی فطرت اور مقدر کو بدل دیتی ہے۔ لیکن نفس میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے علم حاصل کرنے اور احکام خداوندی سے آگاہ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ اور اسکی ذمہ داری سراسر انسان پر عاید ہوتی ہے۔ اس امر سے کوتاہی کرنا یا اپنی اندرونی کیفیات میں تبدیلی پیدا کرنے کی سعی نہ کرنا انسان کو ذمہ دار ٹھیراتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ" (جو لوگ خود اپنی نفسی حالت میں تبدیلی نہیں کرتے خدا انکی حالت میں ہرگز تبدیلی نہیں کرتا) ۱۳-۱۲ — اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنی اندرونی حالت میں تبدیلی پیدا کرلے تو اس کا مقدر بدل سکتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ:-

تری خودی میں اگر انقلاب ہو جائے — عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے
می کند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار
ہر کہ در آفاق گردد بوتراب — باز گرداند ز مغرب آفتاب

اقبال کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ایک تقدیر سے انسان کا دل بھر جائے تو وہ خدا سے دوسری تقدیر مانگ سکتا ہے کیونکہ تقدیر بدلنا اللہ تعالیٰ کے اختیار سے باہر نہیں ہے۔

گر ز یک تقدیر خون گردد جگر — خواہ از حق حکم تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست — زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست

بہ سلسلہ صفحہ (۳۹)

نرگس اور بیدل کی محبت جب کلام حرف تک پہنچی تو اب یہ دیکھنے کی ضرورت ہی کیا کہ لوگوں نے کیا دیکھا اور عشق نے کیا کیا — وہ دونوں ایک ہوگئے۔ خواہ اس منزل پر پہنچنے کے لئے انہیں کتنی ہی کٹھن منزلیں ذائی ہوں اور انہیں کیا کیا نہ آفتیں اور تکلیفیں اٹھانی پڑی ہوں۔

ڈاکٹر انجم کو نرگس نے خوب پہچانا۔ وہ نکلے زر کے عاشق اور اس عشق میں وہ ایسے اندھے ہو گئے کہ انہوں نے ایک اینگلو انڈین لیڈی ڈاکٹر سے شادی کرلی اور ہنی مون منانے کے لئے اپنی سسرال لندن چلے گئے۔ سچ کہا اقبال نے۔

عقل ہو دل ہو نگاہ کا مرشد اولیں ہو عشق

انوار ظہوری (راولپنڈی)

امجد حیدرآبادی

اے نیّرِ کمال و ہنر، خاورِ سخن — اے مطلعِ دکن کے درخشندہ آ
گلبانگ شاعری میں ادائے پیمبری — تیرا انصابِ ذہن، مشیّت کا آ
آگاہِ راز، واقفِ اسرارِ زندگی — تجھے نورِ آگہی سے فروزاں دل
پروردگارِ شعر، ولی کے دیار میں — تیرے چراغِ فکر سے جلتے رہے
بدرِ کمال تو، فلکِ روزگار کا — مہرِ منیر تو، افقِ پاک و ہن
عریاں، تری کتابِ خرد میں حقیقتیں — اسرار و معرفت سے گہربار شع
شاد[1] و شہید[2] و شاہد[3] و مخدوم[4] کی قسم — ہے زورؔ[5] کے وطن میں ترے نام
سکۂ رواں ہے مملکتِ شعر میں ترا — تجھ سے شرف نصیب ہوا،
نقشے کھنچے ہوئے تھے مکمل بہار کے — کیا رنگ تھا نگارِ سخن پرست
شہرہ تھا دور دور کہ امجد کے روپ میں — باغِ دکن میں پھول کھلا ہے گ
افکار لاجواب، مضامین بے بہا — تیرا کلام اہلِ تصوف کی جا
ہے توسنِ خیال میں بجلی بھری ہوئی — فکرِ بلند رشکِ دہِ آسمان
تاریخ صبح و شام ادب کا ورق ورق — اس امر کی دلیل ہے تو نیا
قابو میں دستِ فکر کے تھا ابلقِ سخن — اسپِ ہنر کو تیرے اشار
یہ معجزہ نہیں قلمِ حسن کار کا! — تیرے قدم لئے ہیں عروسِ کم
شیرینیٔ کلام کی تاثیرِ دل نشیں! — نغموں کا روپ دھار لیا۔

۱۔ کشن پرشاد شاد آنجہانی ۲۔ شہید یار جنگ مرحوم ۳۔ شاہد صدیقی مرحوم ۴۔ مخدوم محی الدین ۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادر

شوخی میں آ گئی جو کبھی لیلیٰ سخن
کتنے دلوں کو چھیڑ گئیں گدگداہٹیں

اسلوب منفرد ہے نظر حسن خیز ہے
ذہنوں میں کھُب گئی ہیں تخیل کی آہٹیں

آنکھوں میں بیقرار تبسم کی روشنی
سینے میں کائناتِ محبت لیے ہوئے

گذری تری حیات بصد شانِ بوذریؓ
رگ رگ میں بندگی کی حرارت لیے ہوئے

تخئیل، شرحِ عشق تفکر خدا نما
تیری نگاہ معتبر و حق شناس تھی

ہرگام۔ وہ۔ بڑھا جو رہِ مستقیم پر
ہر سانس۔ وہ، کہ جس کی عمل پر اساس تھی

خوددار، خوش صفات، خردمند صدقِ دل
اخلاص کیش، نیک، خدادوست، بے نظیر

رقصاں جبیں و رُخ پہ تبسم وقار کا
روشن دماغ و سینۂ مصفّا، دل و ضمیر

تھا باخبر جو فلسفۂ کائنات سے
"تشکیک" سے تجھے کوئی نسبت نہیں رہی

تھی لازوال فقر کی دولت نصیب میں
اصنام سیم و زر سے محبت نہیں رہی

تھی اصاف باطنی، تو مقدر کی بات ہے
سینہ تجلیات سے معمور مل گیا

اٹھا جو دل میں قلزمِ توحید کا خروش
دربارِ مصطفیٰؐ سے تجھے نور مل گیا

فطرت لطیف، نازِ طہارت نگاہ میں
گزری حیات شوق نہ مئے نوش کی طرح

انساں بنا دیا تھا محمدؐ کے عشق نے
دل میں غرور کفر نہ تھا جوشؔ[1] کی طرح

گنجینۂ مراد میں سرمایہ فقر کا
انفاس میں شمیم تقدس گھلی ہوئی

آنکھیں صفائے قلب کا شفاف آئینہ
پاکیزگی سے روح بدن میں ڈھلی ہوئی

شاہد ہے چشمِ ارض، دلِ آسماں گواہ
تھا منفردِ کمال، مثالی تھی زندگی

اہلِ نظر کو ذاتِ گرامی سے پیار تھا
بے اشتباہ دیکھنے والی تھی زندگی

تھی فکر آبِ کوثر و تسنیم سے دھلی
رشکِ عروسِ گل و چمن زندگی میں تھا

سارے سخنورانِ زمانہ ہیں معترف
پیغمبری کا رنگ تری شاعری میں تھا

---

[1] جوش ملیح آبادی

کیفیتیں سمو کے تشبیہِ خیال کی — دامانِ فکر و فن میں نئے رنگ بھر گیا
رقصاں ہے موجِ حسن، بساطِ شعور پر — ہندوستاں کو جلوہ گہہ طور کر گیا

تھے جب گلی گلی رخ و گیسو کے تذکرے — جب ہر زبان پہ عارض و لب کا فسانہ تھا
تھیں شہر شہر گلبدنوں کی حکایتیں — اس وقت بھی مزاج ترا عارفانہ تھا

کھنچے خطوط، نوکِ قلم سے حیات کے — تجھ کو خدا نے دی تھی وہ قدرت زبان پر
تجھ سا کوئی زمینِ دکن سے نہیں اٹھا — سکّہ بٹھا گیا دلِ ہندوستان پر

سینے ہیں بیشتر شعراء کے پھُکے ہوئے — تجھ سے حقیقتاً وہ عقیدت ہے جوش کو
اے مردِ باہنر، کشش و جذب اس قدر! — باوصفِ اختلاف محبت ہے جوش کو

شہرت کی آرزو میں نہ شام و سحر کٹے — تا زندگی رہا طلبِ نام سے الگ
تیرا بیان سترِ حقیقت سے متصف — منزل نما ہے تو روشِ عام سے الگ

رچ بس گیا ہے شعر میں جوہر شعور کا — جادو ہے کیا — ! ترے سخنِ تازہ کار میں
تجھ سے اُدھڑ گئے ہیں گریبان وقت کے — تو نقش ہو گیا ہے دلِ روزگار میں

حرفِ جلی ہے تو ورقِ کائنات پر — ارضِ دکن کو تو نے دیا رنگِ امتیاز
تو وجہ افتخار، دلِ زور کے لئے — اکبر کو تجھ سے عشق ظہوری کو تجھ پہ ناز

ذہنوں پہ چھا گیا کبھی دل میں اتر گیا
تیرا کلام ہے کہ وحی کا نزول ہے
ایمان لا چکے ہیں ادیبانِ محتشم
تو کائناتِ شعر و سخن کا رسول ہے

پروفیسر اکبرالدین صدیقی

تاج قریشی

زندگی لرزہ براندام ہے کیا عرض کروں
کانپتا ہاتھ ہے اور جام ہے کیا عرض کروں
خود نمائی تو فقط مضحکہ بن سکتی ہے
خود فریبی کا جو انجام ہے کیا عرض کروں
جن کے رُخ زہد سے تپتے ہیں دلوں میں اُن کے
کتنی سرد آتشِ اسلام ہے کیا عرض کروں
اب کہاں روشنیٔ انجمنِ رامش و رنگ
تیرہ سامانی ہے، کہرام ہے کیا عرض کروں
شیخ کے دل میں نہ اخلاص نہ الفت نہ گداز
صرف احرام ہی احرام ہے کیا عرض کروں
جانبِ منزلِ نو ہو کے ہر اک گامِ عمل
کتنا دور از روشِ عام ہے کیا عرض کروں

تبسم نظامی مرحوم

ہمیں بھی دیکھ، دلِ زار ہم بھی رکھتے ہیں
شکستہ ساز کی جھنکار ہم بھی رکھتے ہیں
ہمارا حال نہ پوچھا کسی نے ہم سے کبھی
اگرچہ دل میں غمِ یار ہم بھی رکھتے ہیں
ابھی تو اور بھی رُخ ہیں تری تجلّی کے
ابھی تو حسرتِ دیدار ہم بھی رکھتے ہیں
دماغِ نالہ کشی و مزاجِ شکوہ گری
بقدرِ لذتِ آزار ہم بھی رکھتے ہیں
ہمیں بھی کچھ تو تبسم گلوں سے نسبت ہے
شعورِ نکہتِ گلزار ہم بھی رکھتے ہیں

اختر حمیدی

جب میسر ہی نہیں جامِ درخشاں کوئی
کیا منائے گا یہاں جشنِ بہاراں کوئی

ہم کو لازم ہے شگوفوں کی حفاظت ورنہ
راکھ کا ڈھیر بنا دے گا گلستاں کوئی

آس کے پھول نہیں یاد کے ساغر بھی نہیں
کیا کرے آج علاجِ غمِ ہجراں کوئی

آگ میں ڈال دو احساس کی کلیوں کا لباس
جب بچاتا ہی نہیں دامنِ مژگاں کوئی

درد کی شام عجب رنگ دکھاتی ہے ہمیں
راس آتی ہی نہیں صبحِ بہاراں کوئی

چاند کی گود کسی وقت نہ خالی رہتی
کاش ہوتا نہ شکارِ غمِ دوراں کوئی

خوف کی آگ لہکتی ہے نظر میں اختر
جب بھی ہوتا ہے سرِ دار نمایاں کوئی

ممتاز راشد اجمیری

یہی ہے رسمِ شراب خانہ اسی کو د
جو داغ چمکے تو چاند کہیے جو زخم چھپا
جناب واعظ اگر کبھی آپ شہرِ خوبا
وہاں کی رنگین چلمنوں سے مری نظ
حسین ماتھے پہ زلفِ پرخم کی یہ لہکتی
سحر کی پرنور وادیوں میں عروس
جھکی نظر کانپتے ہوئے لب لرزتے
یہی تھا آغازِ عہدِ الفت اسی کو
طویل و تیرہ شبوں کی تنہائیوں
اگر کوئی غمگسار آئے تو اس کو
چمن میں صیاد کی روش پہ جو ہونٹ
مگر ستمگر کا حکم یہ ہے کہ اس کو

صلاح الدین نیّر

بازارِ مصر ہو کہ زلیخا کی انجمن
دشمن کو بھی عزیز تھا یوسفؑ کا بانکپن

انگڑائی لے کے اٹھی ہے اک رات کی دلہن
آنکھوں میں نیند ریشمی زلفوں میں ہے شکن

لہرائی کس نے زلف معطر ہے انجمن
پھیلی ہے بزمِ شوق میں خوشبوئے پیرہن

تم ہی کہو میں تازگیٔ گل کو کیا کروں
جب ساتھ ساتھ رہتے ہیں مہکے ہوئے بدن

یہ کیسا درد میرے حوالے کیا گیا
ہر وقت دل میں رہتی ہے کانٹے کی سی چبھن

پھولوں کی تازگی کو نہ اتنا سراہیے
کانٹے بھی ہیں محافظِ آرائشِ چمن

حیرت ہے جھوم جھوم کے گاتے ہیں عندلیب
حالانکہ چاک چاک ہیں پھولوں کے پیرہن

محرومیوں سے بڑھ کے انہیں اور کیا ملا
لیلیٰ کا قیس ہو کہ وہ شیریں کا کوہکن

یہ کونسے مقام پہ لے آئی ہے حیات
محسوس ہوتی ہے مجھے ہر سانس میں گھٹن

محلوں میں رہ کے بھی نہیں کچھ لوگ مطمئن
اور کچھ غریب لوگ ہیں کٹیا میں بھی مگن

گلشن کی پرورش پہ ہوا خونِ عندلیب
سبزہ کا ہے لہو میں نہایا ہوا کفن

جب بھی ہجومِ یاس میں آیا ترا خیال
آنکھوں میں آگئی ہے تری گرمیٔ بدن

تم جادۂ وفا میں مرا ساتھ دے چکے
آرام چاہتے ہو تو دیدو مجھے تھکن

ہستی و فنا کی بھاگ متی کا یہ شہر ہے
ٹپکے ہے ہر روش سے قطب شہ کا بانکپن

نیّر! وفا شناس زلیخا تھی خوش نصیب
دستِ وفا میں رہ گیا یوسفؑ کا پیرہن

واحد پریمی

ہم جو حق کے لئے باطل کے مقابل آئے
کتنے ہی مرحلۂ طوق و سلاسل آئے
سر بکف اس لئے بیٹھے ہیں نثارانِ وفا
شاید اب تیغ بکف پھر کوئی قاتل آئے
کوئی گردش ہو کوئی غم ہو کوئی مشکل ہو
جس کو آنا ہو ہمارے وہ مقابل آئے
ہم نے تو چھوڑ دی موجوں کے سہارے کشتی
اب کوئی غم نہیں طوفان کہ ساحل آئے
ہم وہ رہرو ہیں کہ چلنا ہی ہے مسلک جن کا
ہم تو ٹھکرا دیں اگر راہ میں منزل آئے
مقتلِ ہوش ہے وہ جلوہ گہِ ناز نہیں
اُن کی جو بزم سے آئے وہی بسمل آئے
دیکھ کے طنز سے بولے وہ بصد عشوہ و ناز
آپ کیوں حضرتِ واحد سرِ محفل آئے

ابو محمد سید علی سریر

چہرہ کسی کا آج جو اتنا اُتر گ
شاید ہمارا نالہ کوئی کام کر
بھٹکا رہی ہے گردشِ تقدیر
منزل میری کہاں تھی مگر میں ک
دیکھا جو التفات کی نظروں ـ
بگڑا ہوا نصیب کسی کا س
ممکن نہیں بیان کروں بے خو
جب میں خرد کی آخری حد سے
ہوش و حواس گم ہو
شیرازہ زندگی کا ؛

نصیر پرویز ایم اے

آخرش

شب کو احساسِ الم تھا نہ لہو روتے رہے
اپنی بے داغ جوانی کا بدن دھوتے رہے
درد و غم کے دلِ محزوں پہ کرم ہوتے رہے
اشک کی گود میں خوابوں کے نگر سوتے رہے

کاغذی پھولوں سے خوشبو کے خزانے لوٹے
دستِ احساس بناتا ہی رہا گل بوٹے
لڑکھڑانے کا وہ انداز کہ ساغر ٹوٹے
کوئی تکمیل کی خواہش کہ یہ قصّہ چھوٹے

چین پایا نہ علاجِ دلِ سوزاں پایا
ایک بے نام سی لذّت نے انھیں تڑپایا

کارواں راہِ محبت پہ روانہ ہی رہا
اک حقیقت نہ بنا راز فسانہ ہی رہا

از ازل تا بہ ابد زندگی اک راز رہی
اپنی خاموش تمناؤں کی آواز رہی
خاک کے فرش سے افلاک پہ پرواز رہی
نغمۂ عیش بنی درد کا اک ساز رہی

کتنی بوجھل تھی سسکتی ہوئی گمبھیر فضا
کام آئی نہ رہِ شوق میں زلفوں کی ردا
کوئی سنتا بھی کہاں دل کے دھڑکنے کی صدا
وہ نہ جینے کا سلیقہ تھا نہ مرنے کی ادا

یہ بھی ادراک کا دھوکا تھا حقیقت تو نہ تھی
زندگی صرفِ تبسّم کی حرارت تو نہ تھی

موت آئی نہ غمِ زیست نے آرام دیا
دل نے ہر درد پہ تقدیر کو الزام دیا

جشنِ آرائشِ احساس نہ ہنگامۂ شب
قربتِ درد کی حسرت تو نگاہوں کی طلب
شوق کی گود میں انگڑائیاں لیتا تھا طرب
آئی تنہائی بصد ناز تو رخصت ہوئے سب

جب گراں بارِ تبسم زندگی ہو جاتا ہے
آدمی صبر کے آغوش میں سو جاتا ہے

مظفر حنفی ہسوی

مشاہداتِ ارسطو

افسانچے

دھکّے — ارسطو نے چھوکرے کو بلا کر پوچھا۔

" اس جوتے میں تلا لگانے کے کتنے پیسے لوگے؟"

" آٹھ آنے حضور!"

" چل نکل' سور کہیں کا' لوٹنے آیا ہے!"

اس نے دھکّے مار کر چھوکرے کو باہر نکال دیا اور جوتوں کی ایجنسی میں پہنچا۔

" اس جوتے میں سول لگانے کا کیا لیجئے گا؟"

" ساڑھے تین روپے"

" کچھ کم نہ ہوگا۔؟"

" بورڈ پڑھ کر اندر آیا کرو۔"

اور ایجنٹ نے دھکّے مار کر ارسطو کو باہر نکال دیا۔!

اولاد — پروفیسر ڈاردن کا فلسفہ سمجھا رہا تھا۔

" انسان بندر کی اولاد ہے۔"

ارسطو بولا — " جی ہاں! آپ کے صاحبزادے بھی یہی فرماتے تھے"

پروفیسر جھلا کر اس کی طرف لپکا لیکن ارسطو بندر کی طرح اچھل کر نو دو گیارہ ہو گیا۔

دیا دھرم — تین فاقے ہو گئے تو ارسطو اپنا ہینڈ بیگ گروی رکھنے چلا۔ بنیا اس وقت

سب بس
کے کمشل مار رہا تھا ہینڈ بیگ دیکھ کر دوری سے چیں چیں کرنے لگا۔

"رام رام! اپن چمڑے کی چیز نہیں چھوتے' جیو ہتیا کے بھاگی ہو جائیں گے۔"

پڑوسی۔ آتنی رات گئے کون آیا ہے بھئی"

"جی میں ہوں آپ کی پڑوسن"

"اوہ! کہئے کیا خدمت کروں۔؟"

"میرا بچہ بھوکا ہے۔ تھوڑا سا دودھ۔ ہو تو دے دیجئے۔"

اس نے لوٹا بھر دیا۔

دوسرے دن کافی رات گئے اسے پڑوسن کے گھر میں بچے کے رونے کی آواز سنائی دی تو ارسطو دودھ لے کر اس کے گھر جا پہنچا۔

"یہ رات کے تین بجے کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟"

"جی میں ہوں آپ کا پڑوسی! دودھ لایا ہوں بچے کے لئے۔"

مکان سے تین موٹے تازے دوسرے پڑوسی نکلے اور ارسطو پر پل پڑے۔

"کمینے آوارہ! رات کو پرائی عورت کے گھر میں گھستا ہے۔"

شریف آدمی۔ اور ساتویں دن پارک میں جب وہ پھر اس کے سامنے سے مٹکتی ہوئی نکلی تو اس سے نہ رہا گیا اور اس نے ایک گلاب کا پھول حسینہ پر پھینک مارا۔ حسینہ نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جھوم جھوم کر گانے لگا۔

"آیا کرو ادھر بھی مری جاں کبھی کبھی ۔ ۔ ۔ ۔

"حسینہ نے قریب آکر پوچھا۔"

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔؟"

جی میں کہہ رہا تھا آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے اک ذرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حسینہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔

"صاف صاف بات کیجئے میں ایک کے پچیس (۲۵) روپے لیتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

اور اس نے چنک کر کہا۔

"معاف کر بائی! میں شریف آدمی ہوں۔!

چھچھوندا اُچکا۔ ایک اجنبی کا تھیلا لے بھاگا۔ لوگوں نے پکڑنا چاہا تو اجنبی نے منع کر دیا۔

"جانے دو بیچارہ کو ضرورتمند ہوگا۔"

لیکن اُچکا تھوڑی دیر بعد آکر اجنبی سے معافی مانگنے لگا۔

"بخدا مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ بھی میرے بھائی ہیں یہ لیجئے آپ کی جیب کترنے کی قینچی!"

اور اجنبی جوتوں سے اُچکے کی مرمت کرتے ہوئے بولا۔

"کمینے! اپنے ساتھ میری بھی پول کھولتا ہے۔"

یکسوئی۔ ایک طرف مندر تھا۔ دوسری طرف مسجد اور گھنٹہ گھر دونوں کے درمیان تھا۔ ارسطو گھنٹہ گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھا مشاہدات قلمبند کر رہا تھا۔ مسجد میں اذان ہوئی اور نمازی ایک صف میں کھڑے ہو گئے مندر میں پجاریوں نے ناقوس بجانے شروع کئے۔

"بند کرو۔ ناقوس۔"

"کیوں بند کریں؟"

"ہماری یکسوئی میں خلل پڑتا ہے۔"

"ہم تو بجائیں گے۔"

اور فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔

ارسطو نے کام سے فراغت پا کر سر اُٹھایا تو چند لاشیں اِدھر پڑی تھیں چند اس طرف، اس نے زخمی سے پوچھا۔ "یہ کیسے ہوا۔؟"

زخمی بولا۔ "اتنی دیر سے تو یہاں بیٹھے ہو تمہیں پتہ ہی نہیں؟"

"نہیں بھائی! میں اپنے کام میں محو تھا!"

پیمانے۔ مسافر خانے کے لئے چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔

سیٹھ الف نے پانچ سو روپے دئیے کیوں کہ انھیں سٹے میں پانچ ہزار روپے ملے تھے۔ سیٹھ ب نے ایک ہزار عطا فرمائیے انھیں بلیک مارکٹ سے دس ہزار کی بچت ہوئی تھی، ارسطو نے اٹھنی دینی چاہی وہ حقارت کے ساتھ واپس کر دی گئی ۔ ارسطو بیحد خوش تھا۔

"چلو اچھا ہوا ورنہ رات کو فاقہ کرنا پڑتا۔"

اپنے۔ "بیٹے! انہیں سلام کرو۔"
"یہ کون ہیں ابا؟"
"ارسطو صاحب! تمہارے اپنے چچا!"
بیٹے نے سلام کیا۔
"بیٹے انہیں اپنا سبق بتاؤ۔"
"کونسا ابا۔؟"
"بندر اور بلی والا۔"

بیٹے نے سبق سنایا، ارسطو بہت خوش ہوا اور جب اس نے اپنا سمجھ کر بیٹے کو اکنی دینی چاہی تو کہا۔
نہیں نہیں یہ کیا کرتے ہو بیٹے! دوسروں سے پیسے نہیں لیا کرتے!"

اُلو کی قدر۔ اپنے ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے اس نے کہا۔
"آپ ملک کے مشہور شاعر تیغ الکلام بہتر ہیں۔"
ارسطو منہ بچکا کر بولا۔" مجھے تو چغد نظر آتے ہیں۔"
اس نے ناک سکوڑ کر کہا۔" ہونہہ! ہماکو زاغ کب پہچانتا ہے!"
ارسطو مسکرا کر بولا۔" جی ہاں! قدر اُلو کی اُلو جانتا ہے۔!"

خلوص کار۔ ارسطو لپک کر اُس سے بغل گیر ہوا۔
"مزاج کیسے ہیں آپ کے؟"
"نوازش ہے آپ کی۔"
"بال بچے تو اچھے ہیں۔؟"
"اللہ کا کرم ہے۔"
"کہاں تشریف لے جائے گا؟"
"ذرا کاچی باؤس تک جانا ہے۔"

"اچھا تو پھر اجازت دیجیئے میں عجائب گھر تک جاؤنگا"

اور پھر رخصت ہوتے ہوئے ارسطو نے آواز دبا کر کہا

"معاف کیجئے گا آپ کے پیسے وقت پر ادا نہ کر سکا، کل ضرور پہنچا دونگا"

"اوہ! اوہ تو میں بھول بھی چکا، تین روپے پونے گیارہ آنے ہوتے ہی کتنے ہیں۔

اور ارسطو دن بھر بڑبڑاتا رہا۔

"خبیث ایک پیسہ بھی تو نہیں بھولا۔!"

ساختہ بے ساختہ۔ کون کہتا ہے کہ اردو جنتا کی بھاشا ہے؟ ایک مہاشے جی تو۔ یہ تو ایک جاتی کی بھاشا ہے جو بدیش سے لائی گئی ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔

تب تک ارسطو کا پیر اُن کے ٹخنے پر پڑ چکا تھا۔

"ٹھہر جا! حرامزادے، نالائق، کمینے!"

وہ اسکی طرف لپکے ارسطو بھاگنے کے بجائے وہیں کھڑے رہ کر تالیاں بجا کر کہنے لگا۔

"بولا ۔ اردو بولا!"

لوک لاج۔ ارسطو سیٹھ کے پاس چندہ مانگنے گیا اپنے لئے نہیں انجمن کے لئے۔

سیٹھ نے انکار کر دیا۔"

دوسری بار گیا سیٹھ نے بُری طرح جھڑک دیا۔

تیسری بار گیا سیٹھ نے دھکے دے کر نکلوا دیا۔

لیکن چوتھی بار گیا تو سیٹھ انکار نہ کر سکا۔ اس نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے منسٹر، ڈپٹی کمشنر کی طرف دیکھتے ہوئے تجوری کھولی اور دو سو روپے عنایت فرما دیئے!

علم و عمل۔ استاد بچوں کو پڑھا رہا تھا۔

"زندگی کی دوڑ میں کامیابی انہیں کو حاصل ہوتی ہے جو عزم مستحکم رکھتے ہیں اور منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل جد و جہد کرتے ہیں اس سلسلے میں ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ جب کام شروع کرو اسے ختم کر کے ہی دم لو۔ آج کا کام کل پر ٹالنے والے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چھٹی کی گھنٹی بجنے لگی۔ ماسٹر

ایک لڑکے نے کہا۔ "استاد صاحب! ابھی سبق پورا نہیں ہوا۔" بس بس

"باقی کل دیکھیں گے!"

انسان اور برہمن - ایک پنڈت جی ہندو مسلم اتحاد پر تقریر کر رہے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ مذہبی دیوانگی میں مبتلا ہو کر یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ انسان ہیں اور ہندو یا مسلمان بعد میں۔ آخر خون تو سب میں ایک ہی جیسا ہے۔ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں ...... ارے بھئی ذرا پانی لانا۔"

ارسطو نے لپک کر پانی کا گلاس پیش کرنا چاہا۔ پنڈت جی اس کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی دیکھ کر شش و پنج میں پڑ گئے۔

"ہندو ہو یا مسلمان؟"

"جی میں صرف انسان ہوں۔"

"پنڈت جی نے برہم ہو کر فرمایا۔

"ارے بھئی! کیا جلسے میں کوئی برہمن نہیں ہے؟"

مسب دیس :

سید رشید الحسن

عقل و دل و نگاہ

"نرگس! اگر تم کہو تو میں چار مینار سے کود پڑوں"

"انجم! اگر میں یہ کہوں کہ آسمان سے تارے توڑ کر لاؤ، تو تم لا دو گے، ایں!"

نرگس نے قہقہہ لگاتی ہے۔ انجم کھسیانا سا ہو کر رہ جاتا ہے اور اپنی خفت مٹانے کے لئے کہہ اٹھتا ہے، "نرگس! تم میرا مذاق اڑا رہی ہو"

نرگس نے زلف برہم پیشانی سے ہٹاتے ہوئے کہا، "یہ الزام مجھے نہ دیجئے گا۔ یہ آپ اپنا پوسٹ مارٹم آپ ہی خود کر رہے ہیں۔ کیوں نہ! جناب ڈاکٹر صاحب!" انجم نے پسیجتے ہوئے کہا، "اتنی ذلت تو نہ دینا نرگس! میں اتنا کم عقل نہیں ہوں" نرگس نے پہلو بدلا اور اچکتے ہوئے دوسرے صوفے پر بیٹھ کر کہا، "عقل تو آپ سراسر ہیں۔ لیکن کبھی کبھی جو اپنے آپ سے دشمنی کر جاتے ہیں۔" انجم نے آنکھوں میں روشنی پیدا کر کے شاعرانہ انداز میں یہ شعر پڑھا ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

نرگس نے تابڑ توڑ کہا۔ "یہ دل ہی کی تو بیماری نہیں ہے آپ میں۔ آج کل آپ مرض عقل میں مبتلا ہیں۔" انجم نے سوال کیا، "یعنی؟" نرگس نے جواب دیا، "مطلب یہ ہے کہ آپ کی نگاہ مجھ پر نہیں میری دولت پر ہے"۔ نرگس کا گویا یہ فیصلہ تھا۔ انجم نے بات کو رد کرتے ہوئے کہا، "اور گویا آپ کی یہ دولت حسن کوئی چیز ہی نہیں؟" اس نے جل کر کہا، "جی نہیں! یہ دولت تو ڈاکٹروں کی جیب میں ہوتی ہے، دوا خانوں میں، دولت خانوں میں، خلوت خانوں میں

ع جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

ڈاکٹر انجم نے قہقہہ لگاتے ہوئے پچکار کر کہا، "نرگس! تم کو بدگمانی ہوئی ہے۔ میں تو تمہارا سائل ہوں، آن بجھو چھوڑی

ری ہڈیوں کا نہیں۔" نرگس نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا، "بقول کسے ع

وہ گدا جس میں نہ ہو خوے سوال اچھا ہے

انجم نے زیرِ تبسم کہا۔ "نرگس! مجھے معلوم ہوا تھا کہ ایم۔ اے میں تم نے فلسفہ لے رکھا ہے۔ اب یہ یقین ہو چلا ہے
ہم نہ صرف ایک حسین شعر ہو بلکہ شاعرانہ نازک خیالی بھی رکھتی ہو" نرگس نے آنکھوں سے شعلے برساتے ہوئے کہا۔" انجم!
یہاں سے چلے جاؤ تو اچھا ہے، ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انجم نے بن کر کہا، نرگس! تم غصہ میں اور بھی حسین ہو جاتی ہو
ور یہ آنکھ!

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں"

انجم چلا گیا، لیکن نرگس کی آنکھ میں موتیوں کے قطرے نمودار ہوئے۔ اس نے اپنی گردن صوفے پر ڈال دی۔ وہ
ن باتوں سے تنگ آ چکی تھی۔ جدھر جاتی ہے یہی حسن و عشق کی باتیں ہوتی ہیں۔ فلسفہ کی تعلیم نے اس کے تفکر میں گہرائی پیدا
ر دی تھی۔ وہ منطق کے استقرائی اور استخراجی تمام پہلوؤں سے خوب واقف تھی۔ اگر کوئی اس کو باتوں میں اڑانا چاہے
وہ بھی ان کو چٹکیوں میں اڑا دینا اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اس کو علم کا ایسا چسکا لگ چکا تھا کہ وہ اپنی شادی کی بات
ب گوارا نہیں کرتی تھی۔ لوگ اُسے سونے کی چڑیا سمجھتے تھے لیکن وہ اپنے آپ کو زندگی کے چڑیا گھر میں بند کرنا نہیں
اہتی تھی۔ وہ آزادی کی متوالی تھی۔ نام کی مناسبت سے اس کی آنکھیں تو نرگسی تھیں ہی، اُس پر طرہ یہ کہ وہ سراپا دید
ا ہوئی تھی، یا پھر اس شعر کی مصداق کہ ؎

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

نرگس نے انجم کے چوٹ تو گہری لگائی تھی لیکن ڈاکٹر انجم کو اس کا علاج بھی معلوم تھا۔ نرگس اُس کے لئے انجانی
نہ تھی۔ اس کی خالہ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ بگڑ کر روٹھنا اور پھر گلے کا ہار بن جانا تو بچپن کا شیوہ تھا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا
لاؤ آج ہی اپنی خالہ سے مل کر میں خود اپنی شادی کا معاملہ کر لوں۔ اس زمانہ میں لڑکوں کا مل جانا کچھ آسان کام نہیں۔
علم بھی رکھتا ہوں، دولت بھی اور وجاہت بھی۔ غرض وہ اطاعت شعاری کی پوری کیفیت پیدا کر کے اپنی خالہ کے
گیا۔ بھانجا کس خالہ کو پیارا نہیں ہوتا۔ خالہ نے انجم کی بہت خاطر مدارات کی۔ حسن آرا کو اللہ نے دولت کے ساتھ حسن
بیر اور معاملہ فہمی کی نعمت سے سرفراز کیا تھا۔ وہ اب تک اپنی بیٹی ہی کے خیالوں پر چل رہی تھی کہ پہلے وہ اپنی اعلیٰ
علیم مکمل کر لے تو پھر اس کی شادی کی فکر کی جائے بیسیوں ہی اچھے اچھے پیام اُس کے پاندان میں دھرے تھے۔
ب کی دفعہ انجم نے اپنی وہ جھلک دکھائی کہ حسن آرا یہ سمجھ ہی گئیں اور سوچا کہ یہ دولت غیر کے ہاتھ کیوں لگے۔
ل نہ گھر ہی کی گھر میں رہے۔ اگر نرگس کو بہت پڑھنے کا شوق ہی ہے تو شادی کے بعد دلہا دلہن کو یورپ بھی بھیجا

جا سکتا ہے کہ دولت علم کے خزانے اٹھالائیں اور فخر روزگار بنیں، مگر اسے نرگس سے ڈر رہا تھا کہ یہ نازدنہ کی بچی کہیں ضد پر نہ آجائے۔ پھر تو اس کا منانا دشوار ہی ہو جائے گا۔ وہ کچھ اور تدبیریں بھی کرنے لگی

نرگس کی آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ انجم کا اُس کے گھر آنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اُدھر اس کی امی جان کا بار با مزے لے کر انجم کا ذکر کرنا اس کو چونکا دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ اتنی بدتمیز تو نہ تھی کہ اس عمر میں اپنی ماں کوئی بے ہودہ بات کرے۔ سر نیچے سوچتی وہ بھی زلف پُر خم کی طرح اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگی۔

" اللہ اللہ! آج نرگس آرا کو غریب خانہ یاد آیا۔ نرگس کی سہیلی سوسن نے نرگس کو دیکھ کر کہا۔ نرگس نے سوسن کی کاٹ کر کہا، " اری سوسن کی سہیلی! تو تو بوڑھی سی ہو گئی ہے۔" مگر سوسن نے بھی اپنی میٹھی نظر کا تیر لگاتے ہوئے جواب دیا " بدوور! یہ نرگس کی سی ہماری قسمت کہاں کہ دنیا کو بس دیکھنے ہی دیکھنے میں مگن و مست رہیں۔ یہاں تو زندگی سر پر پڑا ہے۔ ماشاءاللہ تین بچوں کی ماں بنی ہوں" نرگس نے چونکتے ہوئے کہا " میرے اللہ"! یہ میری ننھی منی سی پر پڑ گئی کیسی یہ افتاد نئی " دونوں سہیلیاں ہنستے ہنستے ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

سوسن نرگس کی بچپن کی ساتھی تھی۔ ابھی وہ میٹرک بھی کامیاب نہ کرنے پائی تھی کہ اس کی شادی ہو گئی اور اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہو گئیں۔ نرگس کو نہ جانے کیا خیال آگیا کہ وہ آج سوسن کو اپنا رازداں بنانے آگئی۔ سوسن نے نرگس کی داستان سنی مگر اُس بیچاری میں کہاں اتنا بل بوتہ کہ وہ نرگس کی ماں کو اس کے خیال سے باز رکھے۔ بہر صورت وہ سمجھانے بڑھانے پر راضی ہو گئی۔

" سوسن میں اندر آسکتا ہوں۔ " ارے بھیا! ذرا ٹھیرئیے۔" یہ کہتی ہوئی سوسن جلدی سے دروازے تک بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ نرگس نے پوچھا، " سوسن! یہ کون ہیں؟ سوسن نے جواب دیا، " ارے! تم یہ جانتی ہی؟ یہ میرے بڑے بھائی سرور ہیں۔" نرگس نے چونک کر کہا، " سرور! ارے سرور! وہ سرور بیدل صاحب ہمارے کالج میں تھے۔ مجھ سے دو تین سال سینئر ہونگے۔ اری سوسن! بھلا۔ ان سے پردہ کیا۔ بلالاؤ اندر۔" سوسن ہچکچاتی ہوئی گئی سرور بھی جھجکتا ہوا اندر آیا، " آداب عرض ہے۔ معاف کرنا مس نرگس! میں مخل ہوا۔" نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا آداب! مگر حضرت بیدل اس میں معافی کی کیا بات ہے جب کہ اس دخل در معقول کی اجازت پہلے ہی دی گئی تھی۔" سرور نے نظر نیچی کرتے ہوئے کہا، " جی! اسی اجازت نے یہ جسارت حاصل کر لی۔" سب ہنسنے لگے۔

سرور نے بھی فلسفہ سے ایم۔اے کیا تھا۔ وہ کچھ ریسرچ بھی کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب حرکتیں اُس کو پیشۂ لکچرار کی طرف کان پکڑ کر لا رہی تھیں اور فلسفی تھا۔ مجلسی گفتگو کا انداز خوب جانتا تھا۔ فلسفہ فلسفے سے ٹکرایا۔ نرگس باتوں باتوں میں لٹو ہو گئی اور چشم نرگسی ہر گس بیمار بن گئی۔ سرور صاحب تو بیدل ہی تھے، دل ہی دل میں غالب کا شعر پڑھنے

کہتے ہو، نہ دینگے ہم، دل اگر پڑا پایا　　　دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا

ساری باتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ نرگس کو عشق کا چسکا لگ گیا۔ سوسن کا گھر اب نرگس کے لئے درِ حبیب تھا۔ وہ اب کوچۂ یار کے چکر کاٹنے لگی۔ عشق نے ایک ہی جست میں طے کر دیا قصہ تمام ' والی بات تھی۔ یہاں چشم پُر آب ' نالۂ فراق یا جدائی کی جان لیوا گھڑیوں کا سوال ہی کہاں تھا۔ جذب و انجذاب کا عالم یہ تھا کہ نرگس گویا ایک مقناطیس کے گنبد میں بند ہو گئی ہے اوپر نیچے ' دائیں بائیں ہر طرف کشش ہی کشش ہے اور وہ مرکزِ ثقل بن گئی ہے۔

فلسفے پڑھے ہی عاشق و معشوق فلسفہ بگھارنے لگتے ہیں۔ یہاں تو یہ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ اب فلسفہ نرگس اور بیدل دونوں کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا۔ دل کے سارے بخارات فلسفہ ہی کی راہ سے نکلنے لگے۔ ایک دن عقل و دل و نگاہ موضوع بحث بن گئی۔ بیدل صاحب بری طرح دل کے موضوع پر چپک گئے۔ مس نرگس نگاہ کی طرفدار بن گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عقل بیچاری لنڈوری ہی رہ گئی۔ بیدل نے بڑے مفکرانہ انداز میں کہا ' " دل جامِ جہاں نما ہے۔ اس میں ہر چیز کا عکس پڑتا ہے۔ دل میں ایک نور ہوتا ہے جو آنکھ کے نور سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔" مس نرگس بولیں ' " آنکھ وہ آنکھ نہیں جو ظاہر میں کھو جائے۔ آنکھ کا نور باطن کی تاریکیوں میں پہنچ جاتا ہے۔" دیکھتے ہی دیکھتے۔ فکر نے شدت اختیار کر لی اور مکالموں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔

بیدل۔ عقل انسان کے لئے زحمت ہے تو دل ایک رحمتِ خداوندی۔
نرگس۔ آنکھ کا نور دل کا نور ہے۔ عین الیقین ہی حق الیقین بن جاتا ہے۔
بیدل۔ دل میں جلوے تو ہزاروں ہیں لیکن جلوہ گر ایک ہی ہے۔
نرگس۔ محبت کے تخت پر کوئی بے ہودہ اور کم عقل جلوہ گر نہیں ہو سکتا۔
بیدل۔ زلفِ مشکین کی خوشبو ہی رہبرِ محبت کو راستہ دکھاتی ہے اور پھر ؎

نیند اس کی ہے ' دماغ اس کا ہے ' راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر ' پریشاں ہو گئیں

نرگس۔ ع آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں۔
اور بقول رومی ' " آدمی دیداست و باقی پوست است "
بیدل۔ جسمانی عشق انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ نور کا عشق روشنی عطا کرتا ہے۔
نرگس۔ بینائی میں وہ طاقت ہے کہ اسے اللہ کا نور بھی نظر آتا ہے۔ نور نظر آنے کی چیز نہیں۔
بیدل۔ محبت دوئی سے شروع ہوتی ہے لیکن دوئی کے بعد وحدت ہے۔
نرگس۔ انسان حیوانِ ناطق ہے لیکن محبت کلام بے صوت۔
بیدل۔ اگر کسی کو کلام بے حرف نصیب ہو جائے تو نطق کی لاکھوں شیرینیاں اس پر قربان کر دی جا سکتی ہیں۔

نقد و نظر

واقعاتِ درّانی تالیف منشی عبدالکریم ترجمہ میر وارث علی سیفی پنجابی اکادمی لاہور۔

تاریخ ہند و افغانستان میں احمد شاہ درانی کی ایسی جلیل القدر شخصیت ہے کہ اس موضوع پر جس قدر لکھا جائے وہ کم ہے۔ ابھی دس بارہ سال ہوئے کہ خالصہ کالج کے پروفیسر گنڈہ سنگھ نے اس موضوع پر ایک سیر حاصل کتاب لکھی تھی جس میں احمد شاہ درانی کی زندگی کے تمام واقعات پوری شرح و بسط، صحت اور دیانت داری کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔ اس کتاب سے درّانی کی شخصیت کے تمام گوشے نہ صرف نمایاں ہوتے ہیں بلکہ بیان میں پوری دیانتداری اور صداقت سے کام لیا گیا اور اس طریقہ سے درانی کی شخصیت موثر انداز میں نمایاں ہوتی ہے۔

زیر نظر کتاب ایک فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے۔ فارسی تاریخ جس کا نام تاریخ احمد ہے منشی عبدالکریم کی تصنیف ہے منشی صاحب انیسویں صدی کے بڑے انشاء پرداز اور مورخ تھے۔ انھوں نے متعدد تاریخیں لکھیں اور ترجمے کئے مثال کے طور پر تاریخ الخلفا علامہ سیوطی اور تاریخ ابن خلکان کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور انکی تالیفات میں محاربہ کابل و قندھار تاریخ پنجاب اور تاریخ احمد ہے۔ یہی آخر الذکر تاریخ ہے جس کا میر وارث علی سیفی صاحب نے اردو میں ترجمہ کیا جو پنجابی ادبی اکادمی سے شایع ہوئی ہے۔ اس تاریخ کی اہمیت اس طرح ہے کہ منشی عبدالکریم نے جو واقعات اس کتاب میں درج کئے ہیں وہ تاریخی حقایق پر مبنی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولف نے بڑی جستجو اور تحقیق سے کام لیا ہے اور ہر واقعہ پوری تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ بایں ہمہ یہ جنگ و جدل کی داستان سے زیادہ نہیں ہے۔ اس تاریخ کا وہی رنگ ہے جو قرون وسطی کی تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ یعنی جنگ و جدل کا ایک مرقع ہے۔ ان میں سیاست و معاشرت کے ضروری پہلوؤں پر روشنی نہیں پڑتی۔ ایک آدھ صفحے میں احمد شاہ درانی کا نسب نامہ دیا گیا ہے اور وہ بھی تشنہ ہے اور باقی کتاب تمام لڑائیوں پر ہے اور یہ تمام لڑائیاں ۸۰ صفحات میں ختم ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد احمد شاہ کے جانشینوں کا حال درج ہے۔

اب رہا اردو ترجمہ وہ ایک پرانے مخطوطے کی اشاعت ہے جو اب تک شائع نہیں ہوا تھا۔ پنجابی ادبی اکادمی قابل تحسین ہے کہ ایک پرانے مخطوطے کو شائع کرکے اردو کی تاریخوں میں ایک بڑا اضافہ کر دیا۔ اگرچہ مترجم میر وارث علی سیفی بھی انیسویں صدی کے عالم ہیں اور انھوں نے اس زبان میں ترجمہ کیا ہے جو آج سے ایک صدی پہلے یوپی میں بولی جاتی تھی اور زمانہ حال کے اردو دانوں کو یہ زبان پسند نہ آئے تاہم اس مخطوطے کا شائع ہونا ہر حال میں ضروری تھا۔ اگرچہ رائج الوقت زبان نہیں۔ جدید ترجمہ کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن تاریخی اہمیت کے اعتبار سے یہ ترجمہ اور اس کی اشاعت بھی ضروری ہے اور اس سے اردو کی ایک ادبی کمی پوری ہو جاتی ہے۔

(پروفیسر عبدالمجید صدیقی)

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۰ء

۲۷، شمارہ (۵)

فون نمبر ۳۵۲۰۹

مئی سنہ ۱۹۶۴ء

FOR FAVOUR OF REVIEW.

ماہنامہ

(ادارہ نمبر)

سب رس

حیدرآباد دکن

نگران۔ (پروفیسر) عبدالمجید صدیقی

مجلسِ مشاورت۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، نصیرالدین ہاشمی، رمن راج سکسینہ، منظور احمد، وحاجلیل

معتمد۔ محمد اکبرالدین صدیقی

سالانہ ہندوپاک سے۔ چھ روپے .... غیر ممالک سے .... دس روپے

ششماہی .... تین روپے .... اس پرچہ کی قیمت .... ۵۰ نئے پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپکر دفتر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

١

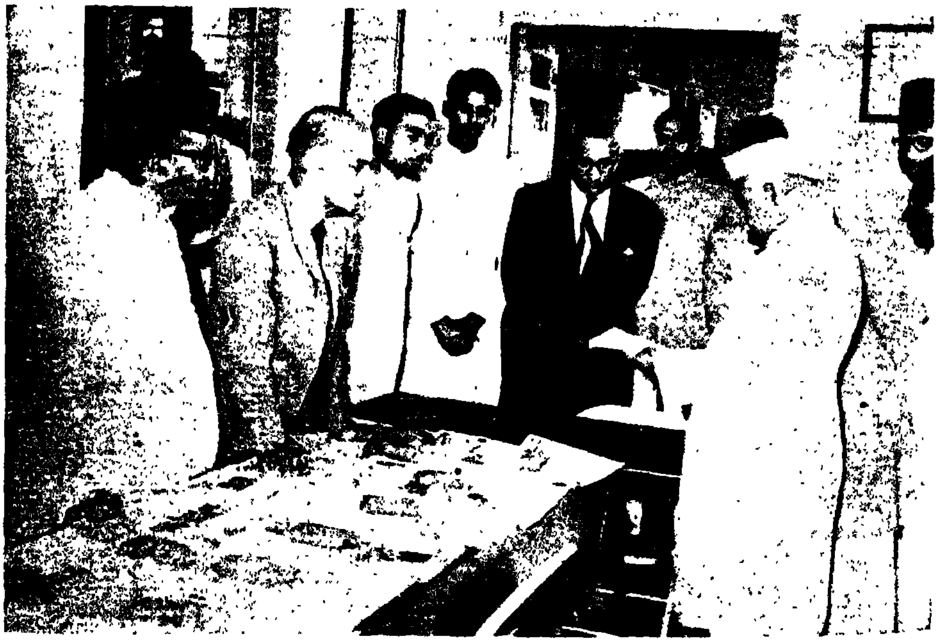
اپنی بات

مئی کا شمارہ ادارہ نہرے ... سے ادارہ کی سال نامہ کی ... آزادی پر روشنی پڑتی ہے۔ ادارہ ا
سید محی الدین قادری زور ... کی جدائی کو ... بھی شدت سے محسوس کرتا ہے اور ہر ... ادارہ کی کوشش کرتا
مرحوم نے حسن اساس پر ادارہ کو چلایا نئی نئی نوشتوں کی اشاعت ... دنیا پر وہ کام ... اردو کی خدمت کرتا اور آگے بڑھتا
ہم ... پر ... تھیں کہ ۲۷ مئی کو ملک کے ہر دل عزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر
نہرو کی رحلت کی اطلاع ملی ... پنڈت جی نے ہندوستان کو وہ سب کچھ دیا جو ایک سعادت مند
اپنی ماں کے چرنوں پر نچھاور کر سکتا تھا۔ انھوں نے غلام ملک کو آزادی دلائی اور سترہ سال کے
عرصے میں ... کو نہ صرف برقرار رکھنے کی جدوجہد کی بلکہ اپنے ملک کو ترقی یافتہ ممالک
ہم دوش ... اپنے پیشرو مہاتما گاندھی کے اصولوں کے سب سے بڑے پیرو تھے۔
... کو ... اور امن کے پیغمبر کہلائے۔ ان کا شمار دنیا کے بڑے بڑے سیاستدانوں
میں تھا ... حیثیت سے غیر ممالک میں بھی سفارتی قدروں کو بلند کیا۔ انھوں
اپنی خود نوشت سوانح میں آزادی ہند کی تاریخ سمو دی۔ مستقبل کا کوئی مورخ تاریخ لکھتے وقت
نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ان کے خطوط جو کتابی شکل میں منظر عام پر آچکے ہیں وہ ایک عالمگیر انسان کی
شہرت ہیں۔ ان کی تصانیف نے انگریزی ادب کو بھی اونچا کیا۔ وہ ہندوستان میں اتحاد
کے سب سے بڑے علمبردار تھے ... مسئلہ ... پر ان کے ناخن تدبیر نے عقدہ کشائی کا فرض انجام
ادارہ ادبیات اردو نے جب انسائکلوپیڈیا کا کام آغاز کیا تو پنڈت جی سے خواہش
وہ آزادی پر مقالہ لکھیں۔ انھوں نے خوشی اس کو قبول کیا لیکن شرط یہ لگائی کہ اسیری میں
رہائی کے بعد وہ یہ کام کر سکیں گے۔ ادارہ کی یہ کیا کم خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے اس کی
قبول کر لی تھی۔ مگر اس کا وقت نہ آیا اور کام ادھورا رہ گیا۔

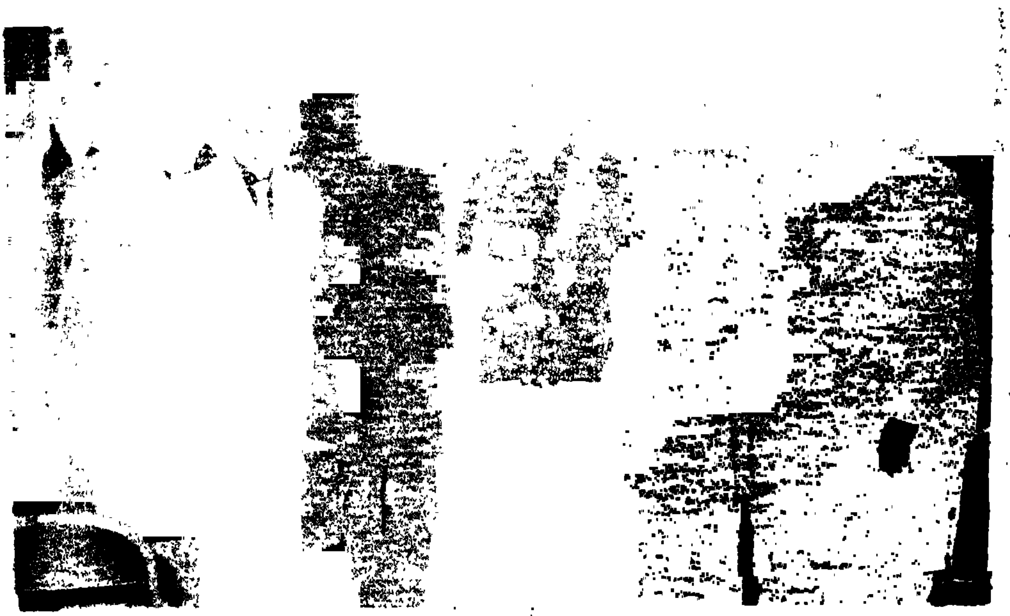
ہم ایک ایسے رہنما اور مدبر سے بچھڑ گئے ہیں کہ زمانہ بڑی گردشوں کے بعد ایسا
پیدا کرتا ہے۔ ان کے نظریات اور کارنامے ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی آتما کو شانتی
... ان کے ... اپنانا ہے۔



صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن «ایوان اُردو» میں



جناب حافظ محمد ابراہیم سابق وزیرآبپاشی و برقی حکومت ہند نے ۱۳۔ فبروری سنہ ۱۹۶۳ء
کو «ایوان اُردو» کا معائنہ کیا



ڈاکٹر کلابوس مقصود (نمائندہ آعلی عرب لیگ برائے ہند و جنوب مشرقی ایشیاء)
دہلی کا "ادارۂ ادبیات اُردو" میں خیر مقدم کیا گیا۔



سوویت یونین کے اُردو ریسرچ اسکالروں نے ۵ - جنوری سنہ ۱۹۶۳ع کو ایوان اُردو
کا معائنہ کیا۔ (وفد ادارے کے اُردو میوزیم میں)

فہرست

مصروفیاتِ ادارہ

علمی و ادبی اور ثقافتی

۱۹۶۳ء

ادارے کی ڈائری سے

جنوری ۱۹۶۳ء

ہفتہ، ۵؍جنوری، ۳ بجے، سویٹ یونین کے چھ ریسرچ اسکالرس کے وفد نے ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا جن میں رعنا تیوموا، مولودہ، مقصودوا، محبت سیر خیایوا، سوتیلا نازروبنکوہ، لیوا سبتوو، ولادیمیر نیکولا شامل تھے۔ یہ ریسرچ اسکالرس ہندوستان کی مختلف جامعات میں اردو زبان و ادب سے متعلق تحقیقاتی کاموں میں مصروف ہیں۔ ایوانِ اردو کا میوزیم، کتب خانے کے شعبۂ مخطوطات و مطبوعات کو کافی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

● ۵ بجے: کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد زبیر صدیقی صاحب نے ادارۂ ادبیات اردو کا معائنہ کیا۔ ایوانِ اردو میں نائب صدر ادارہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ قدیم رسائل و جرائد اور اردو میوزیم کے تاریخی آثار کو زبیر صاحب نے خاص دلچسپی اور توجہ سے دیکھا۔

جمعہ، ۱۱؍جنوری۔ ۵ بجے۔ گنبد محمد قلی قطب شاہ واقع گولکنڈہ پر اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر، شہر حیدرآباد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی کی ۳۵۱ ویں برسی کے موقع پر ادارہ کی جانب سے ایک نمائندہ اجتماع میں چادرِ گل چڑھائی گئی۔ قاری نذیر الدین نے قرأت پڑھی، کیپٹن عباس عابدی اور آغا حسن طیبی تیر نے محمد قلی کے مرثیے اور عقیدت کا کلام سنایا۔ گنبد پر چراغاں بھی کیے گئے، ملک میں ہنگامی حالات اور چین کے جارحانہ حملے کے سبب یوم محمد قلی کی تقاریب کو اس سال سادہ اور مختصر کیا گیا۔

ہفتہ، ۱۲؍جنوری۔ ½۵ بجے "ایوانِ اردو" میں یوم محمد قلی قطب شاہ کا ادبی اجلاس ریاستی وزیر تعمیرات و مسلم اوقاف نواب میر احمد علی خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ایوانِ اردو کا آڈیٹوریم ادب دوستوں سے پُر تھا۔ تاریخ گولکنڈہ کے مصنف پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی، جناب خواجہ محمد احمد صاحب سابق ناظم آثار قدیمہ، مولوی نصیر الدین ہاشمی نے محمد قلی کے عہد اور قطب شاہی دور کے ادبی رجحانات، محمد قلی کی شاعری کے زیر عنوان گراں قدر مقالے پڑھے۔ پروفیسر حکیم یوسف حسین خاں، پرنسپل نظامیہ طبی کالج، نواب میر یٰسین علی خاں، وقار خلیل اور روحی علی اصغر نے محمد قلی کو منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا۔ مسز مارٹنڈیل ٹیک مام ڈیوٹ نے انگریزی نظم کے ذریعہ محمد قلی کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ نے خطبۂ استقبالیہ

سب رس
ڈاکٹر بی. گوپال ریڈی صاحب مرکزی منسٹر اطلاعات و نشریات نے بھی اس تقریب میں شرکت فرمائی اور اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے یوم محمد قلی کے سالانہ انعقاد اور ڈاکٹر زورؔ کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا۔ نائب صدر ادارہ پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی کے شکریہ پر یہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔

● آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے یوم محمد قلی کے موقع پر شام کی نشریات میں محمد قلی کے تعلق سے پروفیسر سید محمد سابق ریڈر جامعہ عثمانیہ کی تقریر نشر ہوئی۔

● روزنامہ سیاست میں محمد قلی کے تعلق سے حکیم یوسف حسین خاں کی نظم شائع ہوئی اور دیگر اخبارات میں بھی مختلف مضامین نظم و نثر کی اشاعت عمل میں آئی۔

فروری ۱۹۶۳ء

منگل، ۵/ فروری۔ ۱۰ بجے صبح مجلس مشاورت اردو امتحانات ادارہ کا اجلاس صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جون میں امتحانات کے انعقاد اور نتائج کی اشاعت کے بارے میں تصفیے کیے گئے۔ اس کمیٹی میں مولوی عارف الدین حسن صاحب (معتمد شعبۂ امتحانات) پروفیسر سید محمد، مولوی غلام رسول، پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، شریک تھے۔

جمعہ، ۸/ فروری، ہفتہ وار ایشیا دہلی میں ادارہ کے زیر اہتمام منعقدہ بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ یادگاری تقریب کا آنکھوں دیکھا حال (مرتبہ:۔ رضا نقیل) شائع ہوا۔

ہفتہ، ۹/ فروری:۔ ادارے کے ترجمان ماہنامہ سب رس کا ظفر نمبر (جنوری، فروری) شائع ہوا۔

● ماہنامہ "پگڈنڈی" امرتسر (بابتہ جنوری، فروری) میں "یوم ظفر" کی تفصیلی رپورٹ اور مقالوں کے اقتباسات شائع ہوئے۔

منگل، ۱۲/ فروری:۔ ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" لاہور (بابتہ فروری) میں سب رس میں مطبوعہ مضمون "ابن الوقت" از یوسف سرمست ڈائجسٹ ہوا۔

چہارشنبہ، ۱۳/ فروری، ۵ بجے شام، مرکزی وزیر آبپاشی و برقی جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب نے ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ نائب صدر ادارہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے حافظ صاحب کا خیر مقدم کیا۔ ادارہ کی طرف سے حافظ صاحب کی گلپوشی کی گئی۔

جمعرات، ۱۴/ فروری:۔ ۱۲ بجے۔ شری جگدیش پرشاد چترویدی ہندی آفیسر محکمۂ تعلیمات آندھرا پردیش نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔

منگل، ۱۹/ فروری:۔ ماہنامہ "الشجاع" کراچی (بابتہ فروری) میں سب رس میں شائع شدہ تاج مہجور کی نظم "بارِ گراں" ڈائجسٹ ہوئی۔

جمعہ، ۲۲/ فروری:۔ ۴½ بجے۔ ادارہ کی مجلس انتظامی کا اجلاس صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اشاعتی اور دیگر انتظامی مسائل کمیٹی میں پیش ہو کر منظور ہوئے۔

مارچ ۱۹۶۳ء

جمعہ، یکم مارچ:۔ سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کے سانحۂ ارتحال کے سبب دفاترِ ایوانِ اردو ایک دن احتراماً بند رہے۔

اتوار، ۳/ مارچ:۔ ادارہ کے اردو امتحانات کے تعلق سے اخبارات میں پریس نوٹ شائع ہوا۔

پیر، ۴/ مارچ:۔ سب رس کے "بہادر شاہ ظفر نمبر" پر روزنامہ "سیاست" میں تبصرہ شائع ہوا۔

جمعہ، ۸/مارچ :- "سب رس" ماہ مارچ شائع ہوا
نہ، ۹/مارچ :- ادارہ کے شعبۂ امتحانات کی طرف سے
میں تین دن امتحان اردو عالم کی مفت تعلیم بمقام انوار العلوم
ریزہائی اسکول واقع نامپلی کا پریس نوٹ شائع کیا گیا جس
نایا گیا ہے کہ محمد اکبرالدین صدیقی اور غلام رسول صاحبان اور
مفرات۔ اعزازی طور پر طلبا کی سہولت کے لئے لکچر دیں گے

جمعہ، ۱۵/مارچ :- ماہنامہ "قلم کار" حیدرآباد (مارچ)
درہ روزہ "شعلۂ حیات" بھوپال (۱۵/مارچ) میں "سب رس"
فر نمبر پر تبصرے شائع ہوئے۔

اتوار، ۱۷/مارچ :- "ہفتہ وار دورِ حیات" بمبئی
ارچ) میں قاضی غلام محمد کی ادارہ کی طرف سے شائع شدہ
یہ نظموں کی کتاب "حرفِ شیریں" پر تبصرہ شائع ہوا۔

ہفتہ، ۲۳/مارچ :- ½ ۵ بجے شام :- ڈاکٹر مختارالدین
زد ریڈر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز مسلم یونی ورسٹی
زہ نے "ایوان اردو" کا معاینہ کیا۔ ڈاکٹر آرزو نے ادارہ کے
ردو میوزیم اور کتب خانے سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس
ڈاکٹر نظام الدین صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی اور مولوی نصیرالدین
صاحب بھی موجود تھے۔

● ہفتہ وار "ترجمان سرحد" پشاور پاکستان (۲۳/مارچ)
سب رس کے ظفر نمبر پر ریویو شائع ہوا۔

اپریل ۱۹۶۳ء

جمعہ، ۵/اپریل :- ½۱۱ بجے۔ ڈاکٹر ...ین، راہما
عبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ معتمد ادارہ پروفیسر مہندر راج سکسینہ کے
یوانِ اردو تشریف لائے اور ادارہ کا تفصیلی معاینہ کیا۔

ہفتہ، ۶/اپریل :- ۴ بجے۔ برطانیہ کے مستشرق
پروفیسر سائمن ڈیگبی نے حکیم یوسف حسین خاں پرنسپل نظامیہ طبی کالج
کے ہمراہ ایوانِ اردو کا معاینہ کیا۔ دوران گفتگو پروفیسر سائمن نے
وفا خلیل صاحب کے ایک سوال کے جواب میں صاف اور شستہ اردو میں
بتلایا کہ انھوں نے حال حال میں مغلیہ تمدن پر اپنا تحقیقاتی کام مکمل
کرایا ہے اور وہ ان دنوں ہندوستان کے مختلف مقالات، کتب
خانوں اور تہذیبی اداروں کے دورے پر نکلے ہیں۔

اتوار، ۷/اپریل :- پنجابی، ہندی اور اردو کے ناول
نویس جناب ہرنام داس صحرائی (پنجاب، جالندھر) اپنے زیر طبع
ناول "سہاگ منی" کے سلسلے میں ایوان اردو تشریف لائے اور مختلف
موضوعات رقعات اور نوادر دیکھے۔

پیر، ۸/اپریل :- ماہنامہ "کتاب نما" دہلی (اپریل)
میں بہادر شاہ ظفر کی شاعری پر جناب مبارزالدین رفعت کا
مطبوعہ مضمون "سب رس" (ظفر نمبر) ڈائجسٹ ہوا۔

چہارشنبہ، ۱۰/اپریل :- روزنامہ ملاپ حیدرآباد
کی ادبی اشاعت میں جناب بھارت چند کھنہ کی کتاب، مطبوعہ
ادارہ "ٹھنڈی بجلیاں" پر سیر حاصل تبصرہ شائع ہوا۔

اتوار، ۱۴/اپریل :- ۱۱ بجے جناب محی الدین صاحب
آڈیٹر دستگیر اینڈ کمپنی نے ایوان اردو کا معاینہ کیا۔

منگل، ۱۶/اپریل :- "سب رس" کے ظفر نمبر پر
ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" لاہور (اپریل) میں تبصرہ شائع ہوا۔

ہفتہ، ۲۰/اپریل :- ادارہ کی سالانہ باقاعدہ
"رپورٹ" ادارہ سن ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی اور ملک کے
ممتاز اداروں، رسائل اور مشاہیر کو بھجوائی گئی۔

● ماہنامہ "شہباز" گلبرگہ (۲۰-۴-۶۳ء) میں "سب رس" کے

ظفر نمبر میں مطبوعہ پروفیسر سید ؟ کا مضمون بحوالہ ڈائجسٹ ہوا۔

جمعرات، ۲۵ / اپریل :- ماہنامہ "ہندوستانی ادب" حیدرآباد (اپریل) میں تمکین کاظمی مرحوم پر یٰسین علیخاں کا مطبوعہ مضمون سب رس ڈائجسٹ ہوا۔

منگل، ۳۰ / اپریل :- ۱/۲ ۱۲ بجے۔ جناب عتیق احمد صدیقی لکچرار شعبۂ اردو دہلی کالج نے ایوان اردو کے تمام شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا۔ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی صاحب رکن مجلس انتظامی ادارہ نے موصوف کو ادارے کے شعبوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ رشید الحسن صاحب لکچرار (جامعہ عثمانیہ) بھی اس موقع پر موجود تھے۔

مئی ۱۹۶۳ء

یکم / مئی :- سب رس خاص نمبر مطبوعہ ۱۹۵۴ء میں جناب سید ابو الفضل کا مطبوعہ ناول "بچہ" ترقی اردو بورڈ پاکستان کے سہ ماہی ترجمان "اردو نامہ" کراچی (شمارہ ۱۲ / اپریل تا جون ۱۹۶۳ء) میں بعنوان "چڑھتا سورج" شائع ہوا۔ جس پر "P. E. N. پاکستان" نے ایک ہزار روپیہ کا انعام اول عطا کیا۔

جمعہ، ۳ / مئی :- جناب کے لکشمن شاستری اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات حیدرآباد نے ادارہ کا تفصیلی معائنہ کیا۔ پروفیسر ہندراج سکسینہ معتمد ادارہ نے موصوف کو ایوان اردو کا معائنہ کرایا۔

ہفتہ، ۴ / مئی :- سب رس کے ظفر نمبر پر ماہنامہ "کتابی دنیا" دہلی (مئی ۱۹۶۳ء) میں تبصرہ شائع ہوا۔

چہارشنبہ، ۸ / مئی :- جناب نعیم احمد صاحب ایم اے لکچرار ہندو کالج دہلی یونی ورسٹی (دہلی) بسلسلہ ریسرچ حیدرآباد پہنچے اور ادارہ کے مہمان خانہ میں تین روز تک مقیم رہے۔

● ۵ بجے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چڑجی اسپیکر لسانیات و صدر نشین لجسلیٹو کونسل مغربی بنگال (کلکتہ) نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

جمعہ، ۱۰ / مئی :- ۵ بجے، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی دہلی نے ایوان اردو کا معائنہ فرمایا۔ اس موقع پر دہلی یونی ورسٹی کے لکچرار عتیق احمد صدیقی اور نعیم احمد صاحبان بھی موجود تھے۔ ادارہ کی طرف سے پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی معتمد کتب خانہ اور میر سراج الدین علیخاں آفس سکریٹری ادارہ نے ڈاکٹر فاروقی کا خیر مقدم کیا۔

اتوار، ۱۲ / مئی :- "سب رس" ۱۰ مئی شائع ہوا۔

چہارشنبہ، ۱۵ / مئی :- ۳ بجے سید انوار اللہ حسینی صاحب قادری آرگنائزنگ سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ بودھن (شکر نگر) نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

جمعہ، ۱۷ / مئی :- جناب شرافت حسین مرزا (ایم اے) ریسرچ اسکالر دہلی یونی ورسٹی دہلی نے ادارہ ایوان اردو کے تمام شعبہ جات کا معائنہ کیا۔

● سب رس ۱۹۶۲ء میں مطبوعہ جاوید لطیفی صاحب کا افسانہ "کابلی پٹھانے" ماہنامہ انتخاب نو کراچی بابتہ مئی ۱۹۶۳ء میں ڈائجسٹ ہوا۔

ہفتہ ۱۸ / مئی :- ۶ بجے۔ اردو ادبی سمینار منعقدہ ہال والا پیلس حیدرآباد میں ادارہ کی طرف سے کیپٹن اللہ علیخاں اور رفیق احمد خلیل صاحب نے نمائندگی کی اور افتتاحی اجلاس میں خیر مقدمی تقریر بھی کی۔

● انجمن ترقی اردو شاخ بودھن (شکر نگر نظام آباد) زیر اہتمام بانی و معتمد ادارہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی علمی و ادبی خدمات "یوم زورؔ" میں زبردست خراج عقیدت ادا کیا گیا۔ رفیق احمد منصف

طالب رزاقی، اسد احسن جعفری، محمود علیخان صدر مدرس، اسماعیل عادل، اشرف الحق ایڈوکیٹ صاحبان نے مضامین اور نظموں میں ڈاکٹر زور کو خراج عقیدت ادا کیا۔

۲۰ مئی ۔ ماہنامہ کتابی دنیا کراچی (بابتہ مئی ۱۹۶۳ء) میں سب رس کا ادارہ نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

۲۱ مئی ۔ "شیرازہ" سری نگر کشمیر (بابتہ جنوری ۱۹۶۳ء) میں قاضی غلام محمد کے منتخب مزاحیہ مجموعہ کلام "حرف شیریں" پر تبصرہ شائع ہوا۔

جمعہ ۲۴ مئی ۔ ۴ بجے ۔ فاروق راہی صاحب مہتمم مرکز اردو امتحانات ادارہ محبوب نگر نے ایوان اردو کا معاینہ کیا اور محبوب نگر پر شعبۂ امتحان کے سنٹر کے قیام اور امتحانات اردو دانی، زبان دانی اور اردو عالم کے بارے میں کتب و دیگر تفصیلات حاصل کیں۔

ہفتہ ۲۵ مئی ۔ ۱۲½ بجے ۔ پروفیسر حکم چند نیر (شعبۂ اردو و فارسی) ہندو یونی ورسٹی بنارس نے ایوانِ اردو کے تمام شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا۔

اتوار ۲۶ مئی ۔ ادارہ کی نئی کتاب "فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو" جلد سوم مرتبہ جناب محمد اکبر الدین صدیقی (سلسلہ مطبوعات ۔ ۲۹) شائع ہوئی جس میں اردو، فارسی اور عربی کے (۵۰۰۰) کتب و رسائل شامل ہیں۔

جون ۱۹۶۳ء

سہ شنبہ ۴ جون ۔ ۱۱½ بجے مشہور افسانہ نگار جناب جاوید لطیفی نے ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

● فاروق راہی صاحب نگران اردو امتحانات ادارہ محبوب نگر نے ادارہ اردو کے معتمد امتحانات مولوی عارف الدین حسن صاحب سے ملاقات کی اور امتحانات کے تعلق سے تبادلہ خیال کیا۔

● دوماہی رسالہ "نیرنگِ خیال" لاہور (جلد ۴ ۔ نمبر ۱) میں سب رس میں شائع شدہ تمثال رضوی کی دو آزاد نظمیں ڈائجسٹ ہوئیں۔

جمعرات ۶ جون ۔ ۳ بجے کی ٹرین سے وقار خلیل صاحب ادارہ کے اردو امتحانات کے سنٹر محبوب نگر بہ حیثیت صدر نگران کار روانہ ہوئے۔

جمعہ ۷ جون ۔ ادارہ کے اردو امتحانات (اردو دانی، زبان دانی، اردو عالم اور اردو فاضل) بلدہ و اضلاع (محبوب نگر و نرمل) کے مختلف مرکزوں پر شروع ہوئے۔

● مرکز امتحانات محبوب نگر میں ادارہ کے امتحانات کا آغاز شری پی ہنمنت راؤ (ایم، پی) کے ہاتھوں ہوا۔ دوران امتحان شری سنتوش رنگیا ایڈوکیٹ و چیرمن بلدیہ، جناب عبد الرزاق خان صاحب ایڈوکیٹ و نائب صدر انجمن ترقی اردو، جناب علی احمد جلیلی (فرزند جلیل مانکپوری) لکچرار ملٹی پرپز ہائی اسکول و صدر بزم سخن، جناب نعیم القادری نائب صدر بزم سخن، جناب نصرت فاروقی وکیل و معتمد جمعیۃ العلماء، جناب عبد الرزاق آواز جرنلسٹ وغیرہ نے معاینہ کیا مسز قمر بیرامی، فاروق راہی نے صدر نگران کار مسٹر وقار خلیل کی اعانت فرمائی۔ محبوب نگر مرکز سے اردو عالم کے ۲۲ اور زباندانی میں (۱۴) طلبا نے شرکت کی۔

ہفتہ ۸ جون ۔ مسٹر وقار خلیل صدر نگران کار اردو امتحانات سنٹر محبوب نگر کے اعزاز میں بزم سخن کی طرف سے خیر مقدمی تقریب اور محفل شعر موصوف کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں سعید شہیدی۔ علی احمد جلیلی کے علاوہ مقامی شعراء نے کلام سنایا۔ مشاعرہ سے قبل مسٹر وقار خلیل نے ادارۂ ادبیات اردو اور اس کے

امتحانات کے بارے میں سیر حاصل تقریر کی۔

اتوار، ۹ر جون۔ مسٹر وقار خلیل چار روزہ دورے کے بعد محبوب نگر سے حیدرآباد واپس ہوئے۔

● ہفتہ وار طاہر کراچی (۹ر جون) میں سب رس میں تاج مہجور کی مطبوعہ نظم "آسیب" ڈائجسٹ ہوئی۔

۱۲ر جون۔ ماہنامہ جامعہ دہلی (سالنامہ مئی جون ۶۲ء) میں جناب عبداللطیف اعظمی مدیر جامعہ نے "۶۲ء کے اردو ادب کا جائزہ" کے زیر عنوان اپنے مضمون میں ادارہ کی چند مطبوعات پر اظہار رائے کرتے ہوئے ادارہ کا مختصر تعارف بھی تحریر فرمایا۔

اتوار، ۱۶ر جون۔ جناب امین چند شرما، صدر شعبۂ اردو فارسی مہاکوشل مہاودیالیہ جبل پور اور جناب شرافت حسین مرزا (ایم۔ اے) ریسرچ نیو دہلی یونی ورسٹی نے ادارہ کے مختلف شعبہ جات کا تفصیلی معاینہ کیا۔

● سب رس ماہ جون شائع ہوا۔

چہارشنبہ، ۱۹ر جون۔ ماہنامہ "معارف اعظم گڑھ" (بابتہ جون) میں مولوی غلام رسول صاحب کی کتاب "اردو املا" (مطبوعہ ادارہ) پر تبصرہ شائع ہوا۔

۲۱ر جون۔ ہفتہ وار "سرپنچ" لکھنؤ (بابتہ ۱۶ر جون) میں "سید تمکین کاظمی مرحوم" کے زیر عنوان میر یٰسین علیخاں صاحب کا مضمون مطبوعہ سب رس، اور ادارہ کی طرف سے قاضی غلام محمد کشمیری کے مزاحیہ شعری مجموعہ "حرف شیریں" سے ایک نظم "انٹرویو بورڈ کے سوالات" ڈائجسٹ ہوئی۔

اتوار، ۲۳ر جون۔ ۳ بجے۔ جناب قمر ابراہیمی محبوب نگری نے ادارۂ ایوان اردو کا معاینہ کیا۔ وقار خلیل صاحب نے موصوف کو ادارہ کے مختلف شعبہ جات کے با تفصیل سے واقف کرایا۔

جمعہ، ۲۸ر جون۔ پروفیسر مسیح الزماں الہ آباد یونی ورسٹی نے ایوان اردو کا معاینہ کے کتب خانے کے بارے میں محمد اکبرالدین صدیقی جامعہ عثمانیہ و معتمد کتب خانہ سے بات چیت کی۔

● ۴½ بجے۔ مجلس ادارت ماہنامہ سب رس کا مشاورتی اجلاس ایوان اردو میں منعقد ہوا جس میں زور مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر سب رس کے یادگار کی ترتیب و اشاعت کے باب میں پروگرام کو قطعی مولوی نصیرالدین ہاشمی، پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی احمد صاحب، تقی الدین قادری صاحب فرزند ڈاکٹر (خصوصی) اور وقار خلیل صاحب نے شرکت کی۔

ہفتہ، ۲۹ر جون۔ ۱۰ بجے مشاورت اردو امتحانات، ادارہ کا اجلاس صد سید علی اکبر کی صدارت میں بمقام انوارالعلوم کا جس میں امتحانات کے نتائج کی اشاعت اور دو کئے گئے۔ مولوی غلام رسول، مولوی محمد اکبرالدین عارف الدین حسن معتمد امتحانات نے شرکت کی۔

اتوار، ۲۹ر جون۔ ۳ حسرت سہروردی لکچرار جبال محمد کالج ترویچی ہمراہ ایوان اردو کا تفصیلی معاینہ کیا۔ موصوف سرکاری کیمپ میں اردو کی نمائندگی کر رہے تھے دو ہفتے حیدرآباد میں رہے۔ وقار خلیل صاحب نے کا معاینہ کرایا اور ادارہ کے علمی و ادبی اور تحقیقا

بارے میں استفسارات کا جواب دیا۔ میر سراج الدین عثمان معتمد (آفس سکریٹری) مولوی رحیم الدین انصاری صاحب کے علاوہ ایوان اُردو میں مسز پروفیسر حسینی شاہد اور بدیع حسینی صاحب ریسرچ اسکالر بھی اس وقت ایوانِ اُردو میں موجود تھے جن سے بہان ادیب نے ملاقات کی اور تبادلہ خیال کیا۔

اتوار، ۳۰ / جون ء۔ ادارہ کے اردو امتحانات کا نتیجہ مقامی اخبارات و رسائل میں اشاعت کے لیے جاری کیا گیا۔

● ادارہ کی طرف سے مشہور طنز و مزاح نگار ادیب جناب یوسف ناظم صاحب کے منتخب فکاہیات کا مجموعہ "کیف و کم" شائع ہوا۔

جولائی ۱۹۶۳ء

شنبہ، ۲ / جولائی ء۔ ۱۱ بجے۔ دہلی یونیورسٹی کے دو ریسرچ اسکالرس جناب شیام لال عابد پشاوری (ایم۔ اے) اور دلیپ بادل (ایم۔ اے) تحقیقاتی کاموں کے سلسلے میں حیدرآباد آئے اور ادارہ کے مہمان خانہ میں مقیم ہوئے۔

● نائب صدر ادارہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب دورۂ پاکستان سے واپس آئے اور حسبِ سابق ادارہ کے کام کی نگرانی فرمانی شروع کی۔

جمعرات، ۴ / جولائی ء۔ عابد پشاوری اور دلیپ بادل صاحبان نے ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

● ۶ بجے۔ ادارہ کی مجلسِ انتظامیہ کا اجلاس صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں ایوانِ اردو میں منعقد ہوا۔ مختلف انتظامی اور اشاعتی امور زیرِ بحث رہے۔ پروفیسر مجید صدیقی، جناب محمد علی عباسی معتمد فینانس، جناب بلا رینا گپتا (معتمد تعلیمات) مولوی محمد نصیر الدین ہاشمی، مولوی محمد اکبر الدین صدیقی اور پروفیسر مہندر راج سکسینہ (معتمد ادارہ) نے شرکت فرمائی۔

۸ / جولائی ء۔ ادارہ کی مطبوعہ کتاب "فہرست مطبوعات کتب خانہ جلد سوم مولفہ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی پر روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں تبصرہ شائع ہوا۔

چہارشنبہ، ۱۰ / جولائی ء۔ ۱۱ بجے۔ قیام حیدرآباد کے زمانے میں جناب خواجہ حسن ثانی نظامی مدیر ماہنامہ منادی دہلی ایوانِ اُردو تشریف لائے اور مختلف علمی و ادبی مسائل پر تبادلہ خیال فرمایا۔ اس موقع پر آپ کے ہمراہ مولانا شاہ فیاض عالم۔ ولی اللّٰہی (بہار شریف پٹنہ) بھی تھے جنھوں نے ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔

جمعہ، ۱۲ / جولائی ء۔ جناب دلیپ بادل ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی اپنے دس روزہ قیام مہمان خانہ ایوانِ اردو کے بعد دہلی روانہ ہوئے۔ ادارہ کی طرف سے جناب وقار خلیل نے موصوف کو وداع کیا۔

۱۴ / جولائی ء۔ ماہنامہ رفتارِ زمانہ حیدرآباد (دفاعی نمبر جون ۱۹۶۳ء) میں پروفیسر سید احتشام حسین کا "سب رس" میں مطبوعہ مضمون "چین کی زبوں حالی، حملہ کا سبب" دوبارہ شائع ہوا۔

● ہفتہ وار ایشیا دہلی (مورخہ ۱۴ / جولائی) میں "سب رس" میں ڈاکٹر گیان چند کا مطبوعہ مقالہ "اردو پر دوسری زبانوں کا اثر" دوبارہ شائع کیا گیا۔

● جناب ابوالخیر قتیبا معتمد انجمن ترقی اردو بودھن شکر نگر نے ایوان اردو کا تفصیلی معاینہ کیا۔

۱۷ / جولائی ء۔ "سب رس" کا جولائی شمارہ شائع ہوا۔

۲۳ / جولائی ء۔ معتمد اور بانی ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی یاد میں جمہوریت کشمیر کی طرف سے ایک

آرٹس اینڈ لینگویجز سری نگر کے دوماہی ترجمان مجلّہ "شیرازہ" کا شاندار باتصویر زور نمبر شائع ہوا۔

● دوماہی شیرازہ زور نمبر (بابتہ مئی ۶۳ء) میں ادارہ کے شعبہ مطبوعات سلسلہ کشمیری کتاب "نیل کنول مسکائے" (از محمود حسین بدخشی) پر تبصرہ شائع ہوا۔

۲۶ر جولائی :۔ ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ (بابتہ جولائی ۶۳ء) میں ادارہ کی مطبوعہ کتاب "تحفۃ الشعرائ تذکرۂ قاقشال" (مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب) پر تبصرہ شائع ہوا۔

ہفتہ، ۲۷ر جولائی :۔ ۵ بجے۔ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن کی آمد ایوان اردو کے سلسلے میں انتظامات کے لئے نواب مہدی نواز جنگ بہادر گورنر گجرات اور جناب ایل، بن، گپتا معتمد تعلیمات نے ایوان اردو کا معاینہ کیا۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ (معتمد اعزازی ادارہ) نے ان حضرات کا ادارہ میں خیر مقدم کیا۔ خانقاہ عنایت الٰہی واقع پل مسلم جنگ میں معتمد و بانی ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی سالانہ فاتحہ اور قرآن خوانی کا ادارہ کی طرف سے اہتمام کیا گیا۔ جس میں اردو دوستوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

اتوار، ۲۸ر جولائی :۔ ۱۲ بجے، پنجابی اور اردو کے ناول نگار جناب برنام داس صحرائی نے ایوان اردو میں مختلف علمی و ادبی مسائل پر دستار خلیل صاحب اور مسٹر عابد پیشاوری ریسرچ اسکالر دہلی یونی ورسٹی سے تبادلہ خیال کیا۔

سہ شنبہ، ۳۰ر جولائی :۔ ۵ بجے۔ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر سروے پلی رادھا کرشنن "ایوان اردو" میں تشریف لائے اور ادارہ میں ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کی شائع شدہ دو کتابوں کی اجرائی کی تقریب ایوانِ اردو میں منعقدہ اس جلسہ کی صدارت جناب پی، وی، جی راجو نے فرمائی۔ نواب مہدی گورنر گجرات، ڈاکٹر بی، رام کشن راؤ سابق گو جناب ایل، بن گپتا نے تقریریں کیں۔ انسٹی ٹیوٹ معتمد اعزازی پروفیسر مہندر راج سکسینہ نے خیر مقدم کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ اور ادارہ کے سنائی۔

اگسٹ ۱۹۶۳ء

۶ر اگسٹ :۔ ادارہ کی مطبوعہ مطبوعات کتب خانہ جلد سوم (مرتبہ پروفیسر پر روزنامہ "ملاپ" میں امیر حاصل تبصرہ شائع

۸ر اگسٹ :۔ جناب شیام ایوان اردو کے مہمان خانہ سے شہر میں منتقل

۱۴ر اگسٹ :۔ ماہنامہ تہذیب (بابتہ اگسٹ) میں ادارہ کی مطبوعہ کتاب "فہ جلد سوم" پر تبصرہ شائع ہوا۔

۱۹ر اگسٹ :۔ سب رس،

۲۰ر اگسٹ :۔ ماہنامہ جمال ستمبر) میں صابر شاہ آبادی کی سب رس میں ڈائجسٹ ہوئی۔

جمعرات، ۲۹ر اگسٹ :۔ ممتاز غز نظر حیدرآبادی (متوفی ۲۷ر اگسٹ ۶۳ کے سانحہ ارتحال پر ادارہ کی طرف سے پروفیسر نائب صدر کا تعزیتی بیان رسائل و جرائد میں شا

گیا ہے کہ "نظر اور ان کے بزرگوں نے اردو شاعری کا دامن بھر دیا۔ اگرچہ وہ پاکستان منتقل ہو گئے تھے لیکن ان کے دل و دماغ حیدرآباد کے لئے وقف تھے۔ مرحوم نے انتقال سے دو روز قبل سب رس کے زور نمبر کے لئے اپنا مضمون بھجوایا تھا اس طرح اس قادر الکلام شاعر نے بستر مرگ پر بھی اردو اور ادارہ کی خدمت سے دریغ نہیں کیا۔ اہل حیدرآباد نظر کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتے بلاشبہ نظر حیدرآبادی کی موت شعر و سخن کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے"۔

ستمبر ۱۹۶۴ء

یکم ستمبر:- ادارہ کے کتب خانہ اور مخطوطات کے اوقات مطالعہ ۳ تا ۵ ساعت کی بجائے ۱۱ تا ۵ ساعت کر دیے گئے

ہفتہ، ۷ ستمبر:- ۱۱ بجے۔ جناب محمد عطا کلیانوی نے ادارہ کا معائنہ کیا اور تاریخی ذخیرہ کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

۱۱ ستمبر:- ماہنامہ "انتخاب نو" (ڈائجسٹ) کراچی بابتہ اگسٹ میں سب رس کے ظفر نمبر میں "بستور میں چراغ" کے عنوان سے حکیم یوسف حسین خاں صاحب کا مطبوعہ مقالہ ڈائجسٹ ہوا۔

جمعرات، ۱۲ ستمبر:- علی گڑھ یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر محترمہ اسمار سعیدی صاحبہ نے قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم کی صاحبزادی محترمہ فاطمہ عالم علی کے ہمراہ ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

۲۱ ستمبر:- "سب رس" ماہ ستمبر شائع ہوا۔

اتوار، ۲۲ ستمبر:- ۳ بجے۔ ڈاکٹر محمد غوث صاحب وظیفہ یاب نگران شعبہ مخطوطات جامعہ عثمانیہ حال معتمد اعزازی دارالتصنیف مدراس نے ایوان اردو اور کتب خانہ ادارہ کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔

پیر، ۲۳ ستمبر:- ڈاکٹر خورشید حسن صاحب (ایم اے پی ایچ ڈی) نے پروفیسر مجید صدیقی نائب صدر ادارہ کے ہمراہ ایوان اردو ملاحظہ فرمایا۔

شنبہ، ۲۴ ستمبر:- ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (معتمد و بانی ادارہ) مرحوم کی پہلی برسی اور سالانہ فاتحہ ادارہ کی طرف سے بعد نماز عصر مسجد افضل گنج میں انجام پائی جس میں نواب عنایت جنگ بہادر، مولوی حبیب الرحمٰن معتمد انجمن ترقی اردو، پروفیسر مجید صدیقی، پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی، پروفیسر شور، علامہ حیرت بدایونی، جناب محمد اکبر الدین صدیقی، مولوی نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر مہاراج سکسینہ (معتمد ادارہ) کے علاوہ کئی حضرات نے شرکت فرمائی۔ بعد نماز مغرب ڈاکٹر زور کے والد حضرت زعم کے مزار واقع خانقاہ عنایت اللہی پر چادر گل چڑھائی گئی اور "ایوان اردو" مرحوم کی یاد میں احتراماً ایک دن بند رہا۔

● روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں "ڈاکٹر زور کے بعد ایوان اردو کا ایک سال" کے زیر عنوان محمد اکبر الدین صدیقی صاحب کا مضمون شائع ہوا۔

۲۵ ستمبر:- ماہنامہ "الشجاع" کراچی بابتہ ستمبر میں جناب مخدوم محی الدین کی نظم "خواب بیداری" مطبوعہ سب رس جولائی ڈائجسٹ ہوئی۔

ہفتہ، ۲۸ ستمبر:- جناب گروچرن سنگھ نے گولکنڈہ کے تعلق سے ڈاکومنٹری فلم بندی کے سلسلے میں تاریخ گولکنڈہ کے مصنف پروفیسر مجید صدیقی نائب صدر ادارہ سے ایوان اردو میں مشورہ کیا۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء

۵ اکتوبر:- ادارہ کی نئی کتاب "ادبی تحریریں" مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شائع ہوئی جس میں ڈاکٹر زور مرحوم کے مختلف علمی و ادبی مضامین شامل ہیں۔

پیر، ۷راکتوبر: ۔ ممتاز انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی ایڈیٹر ہفتہ وار "صدق جدید" لکھنؤ نے ایوانِ اردو کا معائنہ فرمایا۔ پروفیسر مجید صدیقی نائب صدر ادارہ نے ماجد صاحب کا خیر مقدم کیا۔ ادارہ کے کتب خانے میں ماجد صاحب کی موجود تصانیف معہ کتب خانہ جناب اکبرالدین صدیقی صاحب نے دستخط لیے۔ اس موقع پر ترتیب دیئے گئے عصرانہ میں جناب محمد علی عباسی معتمد فینانس، ڈاکٹر نظر یار جنگ، مولوی نصیرالدین ہاشمی، مولوی سید دلدار حسین رکن منصوبہ بندی حکومت ہند، ڈاکٹر تنویر نوشت (مدراس)، مولوی محمد اکبرالدین صدیقی، جناب ضیاء الدین احمد شکیب (ایم اے، علیگ)، میر سراج الدین علی خاں صاحب اور وقار خلیل نے شرکت کی۔

۸راکتوبر: ۔ روزنامہ "ملاپ" حیدرآباد میں ادارہ کی کتاب "کیف و کم" (یوسف ناظم) پر تبصرہ شائع ہوا۔

۹راکتوبر: ۔ ہفتہ وار "ایشیا" دہلی (۱۱ راکتوبر) میں "اخبار "مالوہ" اندور" پر محمد اکبرالدین صدیقی صاحب کا سب رس ستمبر میں مطبوعہ مضمون ڈائجسٹ ہوا۔

شنبہ، ۱۵راکتوبر: ۔ ۱/۲ ۴ بجے۔ ڈاکٹر کلوریس مقصود نمائندہ اعلیٰ متحدہ عرب لیگ برائے ہندو جنوب مشرقی ایشیا، (دہلی) نے جناب مہاراج کرن نائب ناظم اطلاعات آندھرا پردیش کے ہمراہ ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ پروفیسر مجید صدیقی صاحب نے ایوانِ اردو میں آپ کا خیر مقدم کرتے ہوئے گلپوشی فرمائی۔ اس موقع پر ترتیب دیئے گئے عصرانے میں مولوی سید دلدار حسین صاحب رکن منصوبہ بندی کمیشن حکومت ہند، مولوی خواجہ محمد احمد صاحب سابق ناظم آثار قدیمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وقار خلیل صاحب اور راجہ امین چند (دینعیال) موجود تھے۔

● ۵ بجے۔ آقائی ایرج نعیمی، ریڈر زایرین فرہنگی ایران (متعینہ ہند) و آفیسر انچارج آف سیکشن سفارت خانہ ایران دہلی نے آقائی حسین کے ہمراہ ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ فرمایا اور ادارہ کے اور قدیم قطب شاہی آثار و نوادر کی ستائش کی۔

۱۶راکتوبر: ۔ ماہنامہ نقش کراچی (۹) میں سب رس میں شیام کنول کا مطبوعہ مضمون ڈائجسٹ

۲۰راکتوبر: ۔ "سب رس" میں ہمامیر محمد کا مضمون "غالب کا سیاسی تدبر" ماہنامہ جمالستان نومبر ۱۹۶۳ء میں ڈائجسٹ ہوا۔

شنبہ، ۲۹راکتوبر: ۔ جناب لکچرار فارسی گلبرگہ کالج (میسور) نے ایوانِ اردو کا اور اردو میوزیم میں خواجہ بندہ نوازؒ کا شجرہ ملاحظہ

نومبر ۱۹۶۳ء

ہفتہ، ۲رنومبر: ۔ مولوی سخاوت حال مقیم کراچی پاکستان نے ایوانِ اردو کا معائنہ مختلف علمی و ادبی اور تحقیقاتی مسائل پر ادارہ صاحب سے تبادلۂ خیال کیا۔

۱۹رنومبر: ۔ روزنامہ "ملاپ" حیدرآباد ادارہ کی کتاب "ادبی تحریریں" پر تبصرہ شائع ہوا

ہفتہ، ۲۳رنومبر: ۔ ادارہ ماہنامہ "سب رس" کا دستاویزی اردو نمبر شائع

● اردو مجلس حیدرآباد کے زیر اہتمام

"یوم سرسید" کے موقع پر نمائش کے لئے ادارہ کے کتب خانے سے سرسید کی تصانیف اور سرسید سے متعلق مطبوعہ مضامین کے رسائل وجرائد اور کتابیں جن میں سرسید کے فکر وفن پر مضامین شامل ہیں۔ نمائش کے لئے دیئے گئے۔ اس نمائش کے کنوینر معتمد شعبۂ کتب خانہ ومعتمد ادارہ "سب رس" جناب محمد اکبرالدین صدیقی تھے۔

اتوار، ۲۴ر نومبر۔ ۱۱ بجے۔ جناب واجد علی شاہ واجد (بی۔ اے، عثمانیہ) (ساکن پشاور پاکستان) نے میر سراج الدین علی خان صاحب کے ہمراہ "ایوانِ اردو" کا معائنہ کیا۔

۲۵ر نومبر۔ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں ادارہ کی کتاب "ادبی تحریریں" پر تبصرہ شائع ہوا۔

۲۶ر نومبر۔ مجلس ترقی اردو ادب لاہور کے ترجمان سہ ماہی "صحیفہ" (اکتوبر) میں ادارہ کی کتاب "فہرست کتب خانہ ادارہ جلد سوم مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی صاحب" پر تبصرہ شائع ہوا۔

۲۸ر نومبر۔ ریاستی محکمۂ اطلاعات وتعلقات عامہ کے ماہنامہ "آندھرا پردیش" حیدرآباد کے سالنامہ نومبر ۱۹۶۳ء میں ادارہ کی کتاب "کیف وکم" (یوسف ناظم) پر تبصرہ اشاعت پذیر ہوا۔

دسمبر ۱۹۶۳ء

چہارشنبہ، ۴ر دسمبر۔ جناب تبسم نظامی مورخ لکھنوی نے ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ جگر مرادآبادی اور حیدرآباد کے بارے میں اپنی زیر ترتیب کتاب "جگر کی منازلِ حیات" کے سلسلے میں موصوف نے وقار خلیل صاحب سے گفتگو کی۔

اتوار۔ ۸ر دسمبر۔ جناب رائے محبوب نارائن صاحب معتمد اعزازی بھارت گن وردھک سنستھا شاہ علی بنڈہ۔ حیدرآباد نے ایوانِ اردو کا تفصیلی معائنہ فرمایا اور ادارے کے کتب خانہ اور اردو میوزیم کے نادرات کے علاوہ قرآن شریف کے مرہٹی ترجمے کے اوراق کو خاص دلچسپی سے ملاحظہ کیا۔

۱۲ر دسمبر۔ انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش کے ترجمان ماہنامہ "قومی زبان" حیدرآباد بابتہ نومبر میں ادارہ کی کتاب "ادبی تحریریں" پر تبصرہ شائع ہوا۔

۱۳ر دسمبر۔ ہفتہ وار ایشا دہلی (۱۳ر دسمبر) میں "سب رس" میں مطبوعہ پروفیسر مجید صدیقی کا مقالہ "وسطی دکن کی خارجی سیاست" وحید مرزا اور نصیر ترابی کی نظمیں، امیر عارفی اور شمس الدین تاباں کی غزلیں ڈائجسٹ ہوئیں۔

۱۴ر دسمبر۔ دو ماہی "ڈائجسٹ" نیرنگِ خیال لاہور (جلد ۴۔ شمارہ ۷) میں سب رس سے جگن ناتھ آزاد کی غزل بحوالہ شائع کی گئی۔

● ۵ بجے۔ "ایوانِ اردو" میں صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں مجلس "مشاہدات یوم محمد قلی قطب شاہ" کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں اعلیٰ پیمانے پر یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۱ر ۱۲ر جنوری ۱۹۶۴ء کے دو روزہ تقاریب کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا اور سہولت کار کے لئے مختلف کمیٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ متفقہ طور پر اس تقریب کے کنوینر اور معتمد اعلیٰ کی حیثیت سے جناب رمن راج سکسینہ ایڈوکیٹ کو منتخب کیا گیا۔ پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی نائب صدر ادارہ،

مولوی اکبر الدین صدیقی، مولوی خواجہ محمد احمد صاحب سابق ناظم آثار قدیمہ، مولوی عارف الدین حسن صاحب موظف تعلقدار، محترمہ منظور احمد صاحب معتمد ارکن مجلس، محترمہ زینت ساجدہ ریڈر ویمنس کالج عثمانیہ یونی ورسٹی، نواب میر حسین علیخان صاحب، آقائی حسین ضابطہ، ذوالفقار خلیل صاحب اور میر سراج الدین علیخاں صاحب نے شرکت کی۔

دوشنبہ، ۱۶ر ڈسمبر، جناب محمد عبد الغفار صاحب شکیل لکچرار شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۷ر ڈسمبر، ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی بابتہ ڈسمبر میں "سب رس کے زور نمبر" پر تبصرہ شائع ہوا۔

● ادارہ کی کتاب "کیف و کم" (یوسف ناظم) پر ماہنامہ "الشجاع" کراچی بابتہ ڈسمبر ۱۹۶۳ء میں تبصرہ شائع ہوا

چہارشنبہ، ۱۸ر ڈسمبر، ½ ۵ بجے، مجلس مشاورت یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس جناب خواجہ محمد احمد صاحب سابق ناظم آثار قدیمہ کی صدارت میں بمقام ایوان اردو منعقد ہوا

۲۰ر ڈسمبر، ادارہ کے بانی اور معتمد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کو اردو آرٹس کالج حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ "یوم زور" میں زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ جناب پی۔ این۔ گپتا معتمد تعلیمات نے فرمائی۔ اس موقع پر ایک شاندار نمائش کتب بھی ترتیب دی گئی تھی جس میں جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل قلمکاروں اور ڈاکٹر زور کی کمی تصانیف، تالیف وغیرہ سلیقے سے پیش کی گئی تھیں۔ پرنسپل حسینی شاہد کی کوششوں سے یہ تقریب بیحد کامیاب اور یادگاری نوعیت کی حامل رہی۔

۲۲ر ڈسمبر، روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں کتاب "سب رس کے زور نمبر" پر محترمہ زینت ساجدہ صاحبہ ریڈر ویمنس کالج جامعہ عثمانیہ کا تبصرہ شائع ہوا۔

● "ایوان اردو" میں مجلس انتظامی "یوم محمد قلی قطب شاہ" کا اجلاس ½ ۵ بجے جناب سید تقی الدین قادری (فرزند ڈاکٹر زور) سجادہ نشین درگاہ حضرت زعم کی صدارت میں منعقد ہوا اور مختلف انتظامات اور ادبی اجلاس کے بارے میں تصفیے ہوئے

۲۵ر ڈسمبر، ادارہ کی نئی کتاب "یادگار زور" مرتبہ ادارہ "سب رس" شائع ہوئی، جس میں ڈاکٹر زور کی حیات اور شخصیت کے تعلق سے دستاویزی مواد اور کئی درجن تصویریں بھی شامل ہیں۔

۲۸ر ڈسمبر، امیر عارفی صاحب (بی، اے) مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

۲۹ر ڈسمبر، ماہنامہ "قومی زبان" حیدرآباد (ڈسمبر) میں سب رس کے زور نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

پیر، ۳۰ر ڈسمبر، جناب حمید شطاری صاحب ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے مصطفٰے کمال صاحب ایم، اے مدیر "مجلہ عثمانیہ" کے ساتھ ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا

بنیں دکن کے زن و مرد ادب کے حلقہ بگوش
ادارۂ ادبیات کے ہوں دوش بدوش

—: بشیر النساء بیگم بشیر :—

یومِ محمد قلی قطب شاہ سنہ ۱۹۶۳ء

خیر مقدمی تقریر : پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارۂ ادبیات اُردو

خواتین وحضرات ۔ بہ حیثیت صدر ادارۂ ادبیات
یہ خوشگوار فرض ہے کہ میں ہمارے مہمان خصوصی جناب
یر احمد علی خاں وزیر تعمیرات آندھرا پردیش اور دیگر معزز
کا خیر مقدم کروں۔ ہم نواب صاحب کے بیحد مشکور ہیں
نے اپنی اہم سرکاری مصروفیات کے باوجود ہمارے جلسہ کی
ت قبول فرمائی۔ آپ کو اردو زبان اور ادب اور ادارہ
ۂ اردو سے جو دلچسپی ہے اس کا عملی ثبوت آپ کئی
ے چکے ہیں۔ ادارہ کی جانب سے یوم قلی قطب شاہ محض
نہیں منایا جاتا ہے کہ اس بادشاہ نے شہر حیدرآباد کی
نا۔ اور یہ اُردو کا محسن اور پہلا صاحب دیوان شاعر
اس لئے بھی کہ یہ دکھنی تہذیب اور کلچر کا معمار تھا یعنی
یب اور کلچر کا جس میں بقول اقبال۔
خوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی تھی۔ وہ کلچر جو
لی مروت۔ انسانی ہمدردی۔ شرافت۔ فیاضی۔
زی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر مشتمل تھا
ایک نمونہ ہم کو آج کے جلسے کے صدر کی شخصیت میں
واب میر احمد علی خاں صاحب سے جو کوئی بھی ملتا ہے
پ کے اخلاق خلوص وسیع النظری اور انکسار کا گہرا اثر
اس کے علاوہ آپ میں عوام کی خدمت کا جو جذبہ
موجود ہے اس سے آپ سب واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ
کو عوام کے ہر طبقہ میں ہر دلعزیزی حاصل ہے۔

افسوس ہے کہ آج اس محفل اتحاد و یگانگت میں وہ شخصیت موجود نہیں ہے جس نے قلی قطب شاہ کے نام نامی کو حیات نو عطا کی۔ گو ڈاکٹر زور مرحوم ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں۔ ان کے جوش عمل کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ ہے اور دائمی طور پر تازہ رہیگی مرحوم نے اردو زبان اور ادب کو ترقی دینے۔ دکھنی زبان اور تہذیب و تمدن کو منظر عام پر لانے اور دکھنی آثار کو محفوظ کرنے کے لئے جو بیش بہا خدمات انجام دیں انکی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ ادارہ ادبیات اردو اور اسکے قیمتی ذخیرہ کے علاوہ یوم محمد قلی قطب شاہ مرحوم کی یادگار ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس یادگار کو قائم رکھکر مرحوم کی روح کو خوش کریں۔

سنہ ۱۹۵۸ء سے ہر سال ادارۂ ادبیات اُردو کی جانب سے یوم محمد قلی قطب شاہ منایا جارہا ہے گذشتہ سال تک یہ تقریب گولکنڈہ میں محمد قلی قطب شاہ کی گنبد کے وسیع اور مرتفع چبوترے پر منعقد کی جاتی رہی لیکن اس سال ہنگامی حالات کے پیش نظر ادارہ کی انتظامی کمیٹی نے تصفیہ کیا کہ ۱۱ جنوری کو حسب معمول مقبرہ پر چادر گل چڑھادی جائے اور وہاں قرات فاتحہ خوانی اور سوز خوانی ہو۔

اور محفل ادب بجائے گولکنڈہ کے آج ایوان اردو میں ترتیب دی جائے۔

خواتین و حضرات! یہ امر باعث طمانیت ہے کہ ادارہ ادبیات اردو کا کام انہی خطوط پر انجام پا رہا ہے جن کی داغ بیل اس کے بانی ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے ڈالی تھی۔ کشمیر جانے سے پہلے مرحوم نے ڈاکٹر سیدہ راج سکینہ کا انتخاب بہ حیثیت شریک معتمد کیا تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر زورؔ کے انتقال کے بعد ادارہ کی مجلس انتظامی نے محسوس کیا کہ مرحوم کی جانشینی کے لئے ڈاکٹر سکینہ صاحبہ ہی موزوں ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر سیدہ راج سکینہ کو اردو زبان اور ادب سے خاص لگاؤ ہے۔ اور ادارہ ادبیات اردو کی ترقی میں ان کے خون جگر کی گلکاری بھی شامل ہے خوش قسمتی سے ان کو پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب کا پورا تعاون حاصل ہے جو ادارہ کے نائب صدر ہیں اور زورؔ صاحب مرحوم کے سرگرم ساتھی بھی۔ ادارہ کے ساتھ پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب کی ہمدردی اور اس کے لئے آپ کی بے لوث خدمات قابل ستائش ہیں۔ میر سراج الدین علی خاں صاحب بھی بڑی محنت اور ایثار کے ساتھ ادارہ کے کاموں میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

خواتین و حضرات ۔۔۔ اگر میں اس موقع پر ادارہ کی حالیہ علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مختصر ذکر کروں تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔ میر سراج الدین علی خاں صاحب کی کوششوں سے ادارہ کو مولوی محب حسین صاحب مرحوم کی تقریباً ایک سو مطبوعات اور مخطوطات کا ذخیرہ حاصل ہوا ہے۔ شعبۂ تاریخ و تمدن دکن کی جانب سے سال گذشتہ حدیقۃ السلاطین شائع ہوئی ہے۔ اب مکتوبات قطب شاہی کی کتابت نواب عنایت جنگ بہادر کی نگرانی میں جاری ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ شاہان قطب شاہی کا یہ قیمتی ذخیرہ جلد شائع ہو جائے۔ ادارہ کا ایک اور اہم شعبہ اس کا میوزیم ہے۔ نواب عنایت جنگ بہادر کی توجہ اور دریا دلی کی بدولت میوزیم کی نادر اشیاء مثلاً قدیم اسلحہ۔ فرامین۔ دستاویزی کاغذات۔ قلمی تصاویر اور خطاطی کے نایاب ذخیرہ میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے۔ میوزیم کے اشیاء کی تفصیلی فہرست تذکرہ نوادر جلد اول میں شائع ہو چکی ہے۔ جلد دوم کا مسودہ بھی تیار ہو چکا ہے اور توقع ہے کہ اس کی اشاعت جلد عمل میں آئیگی۔

ڈاکٹر زورؔ صاحب مرحوم نے سنہ ۱۹۶۲ء میں شعبۂ مطبوعات کشمیر قائم کیا تھا۔ اس شعبہ کی جانب سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ یہ ہیں۔

نیل کنول سرکائے از محمود حسین بدخشی۔ بینوں کی کہانیاں۔ از حبیب ابراہیم۔ حرف شیریں۔ از پروفیسر قاضی غلام محمد۔

زیر طبع کتابوں میں علاوہ تذکرۂ نوادر جلد دوم و فہرست مطبوعات جلد سوم کے یہ کتابیں بھی شامل ہیں۔ کیف و کم از یوسف ناظم۔ داغ گیں پھول پروفیسر حامد علی کاشمیری کے افسانوں کا مجموعہ۔

گذشتہ جنوری میں ادارہ کے زیر اہتمام یوم ظفر بڑے پیمانہ پر منایا گیا۔ اس کے انتظام کے لئے ایک خاص کمیٹی بنائی گئی تھی جس کے صدر سید نثار حسین صاحب اور معتمد میر سراج الدین علی خاں صاحب تھے۔ اس تقریب کا

دلدار حسین صاحب کی انتظامی صلاحیت اور میر سراج الدین علی خاں صاحب کی گہری دلچسپی کی رہین منت ہے۔

میں نے ادارہ کی سرگرمیوں کی جو اجمالی کیفیت بیان کی ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ ادارہ کے مخلص رفقاء نہ صرف اسکو قائم رکھنے بلکہ اسکو ترقی دینے کے لئے ہر طرح کوشاں ہیں۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ ادارہ کو اس کے معمار ڈاکٹر زور صاحب مرحوم کے نقش قدم پر چلائیں۔ اور اسکی بقا اور ترقی کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ اُمید ہے کہ ادارہ کی مجلس انتظامی سے وہ سب حضرات تعاون فرمائینگے۔ جو ڈاکٹر زور صاحب مرحوم کے کارناموں کی قدر کرتے ہیں اور اردو زبان اور ادب کی بقا اور ترقی اور دکنی آثار کے تحفظ کے متمنی ہیں۔

اب میں ہمارے مہمان خصوصی اور دوسرے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

رپورٹ یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۰ اور ۱۲ جنوری ۱۹۶۳ء

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطنت قطب شاہیہ کے پانچویں فرمانروا شہر حیدرآباد دکن کے بانی اور قومی یکجہتی کے سب سے پہلے علمبردار محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۶ء - ۱۶۱۱ء) کی یاد میں گذشتہ چھ سال کی طرح ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام اس شاعر بادشاہ کی ۳۵۰ ویں برسی یوم قلی قطب شاہ کی صورت میں سادہ و پُر اثر طریقہ پر ۱۰ اور ۱۲ جنوری ۱۹۶۳ء کو منائی گئی۔ اس تقریب کے بانی ڈاکٹر زور کے انتقال اور ... کے "یوم محمد قلی" کو سال حال محدود پیمانہ پر منانے کا تصفیہ کیا گیا۔

۱۰ جنوری ۱۹۶۳ء کو گولکنڈہ میں گنبد محمد قلی قطب شاہ کے وسیع و عریض چبوترے پر اردو دوستوں کے نمائندہ اجتماع میں قاری نذیر الدین کی قرأت سے ½ ۵ بجے شام یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقریب کا آغاز ہوا۔ گنبد کے اندر اور باہر چراغاں کئے گئے تھے اور مزار محمد قلی پر پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے پروفیسر عبدالمجید صدیقی نائب صدر اور ڈاکٹر حبیب رراج سکینہ معتمد ادارہ نے محمد قلی کے مزار پر چادر گل چڑھائی۔ کیپٹن عباس عابدی نے محمد قلی کا مرثیہ پُرسوز آواز میں پڑھا۔ آغا حسن جعفری نے محمد قلی کی فارسی نظم دلنشین ترنم میں سنائی اور فاتحہ خوانی کے بعد افتتاحی تقریب اختتام کو پہنچی۔

شنبہ ۱۲ جنوری ۱۹۶۳ء کو ادارہ ادبیات اردو کے دفتر ایوان اردو میں شام کے ½ ۵ بجے یوم محمد قلی قطب شاہ کا دوسرا اور آخری ادبی اجلاس ریاستی وزیر تعمیرات نواب میر احمد علی خاں کی صدارت میں شروع ہوا۔ محمد قلی کی غزل سے جلسہ کا افتتاح ہوا جسے ... الحسن خیال نے ترنم کے ساتھ سنایا۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج اک تل جیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند
دوانے کوں کچھ پند دیا جائے نا

صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے خطبہ استقبالیہ پڑھتے ہوئے صدر جلسہ کا خیر مقدم کیا اور یوم محمد قلی کے انعقاد کی تفصیلات سے واقف کراتے ہوئے کہا کہ "ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے یوم محمد قلی قطب شاہ محض

اس لئے بھی منایا جاتا ہے کہ اس بادشاہ نے شہر حیدرآباد کی بنیاد ڈالی اور یہ اردو کا محسن اور پہلا صاحب دیوان شاعر تھا بلکہ اس لئے بھی کہ یہ دکنی تہذیب اور کلچر کا معمار تھا۔ یہی وہ کلچر ہے جو کشادہ دلی، مروت، انسانی ہمدردی، شرافت، فیاضی، مہمان نوازی، رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر مشتمل تھا۔ اس تقریب کے بانی ڈاکٹر زور مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر علی اکبر نے کہا کہ افسوس ہے کہ آج کی اس محفل اتحاد و یگانگت میں وہ شخصیت موجود نہیں ہے جس نے محمد قلی قطب شاہ کے نام نامی کو حیات نو عطا کی۔ گو ڈاکٹر زور ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں لیکن ان کے جوش عمل کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ ہے اور دوامی طور پر تازہ رہے گی۔ دکنی زبان اور تہذیب و تمدن کو منظر عام پر لانے اور دکنی آثار کو محفوظ کرنے کے لئے مرحوم نے جو بیش بہا خدمات انجام دیں ان کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ ادارہ اور اس کے قیمتی ذخیرہ کے علاوہ یوم محمد قلی بھی مرحوم کی یادگار ہے اور ہم سب کا فرض ہے کہ اس یادگار کو قائم رکھ کر مرحوم کی روح کو خوش کریں۔

ادارہ کے ادبی و اشاعتی کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے صدر ادارہ نے کہا کہ یہ امر باعث طمانیت ہے کہ ادارہ ادبیات اردو کا کام ان ہی خطوط پر انجام پا رہا ہے جن کی داغ بیل اس کے بانی ڈاکٹر زور نے ڈالی تھی۔ ادارہ کی طرف سے سال حال کئی کتابیں ادبی اور تاریخی نوعیت کی شائع ہو رہی ہیں جن میں مکتوبات قطب شاہی بھی شامل ہے جس کی اشاعت کی نگرانی نواب منظور جنگ [?] کر رہے ہیں۔"

پروفیسر سید علی اکبر کے خطبۂ استقبالیہ کے بعد جناب خواجہ محمد احمد سابق ناظم آثار قدیمہ نے عالمانہ تقریر کی اور محمد قلی کی حیات، شاعری اور دور سلطنت کے مختلف گوشوں پر اجمالی طور پر نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ محمد قلی نے اردو زبان و ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے۔ اس کے دور سلطنت میں رعایا خوش و خرم تھی۔ نہ صرف اس کے کلام میں بلکہ اس کے زمانۂ حکمرانی میں بھی قدم قدم پر یک جہتی، اتحاد اور محبت کی شیرینی ملتی ہے۔ محمد قلی نے ایک ایسی مستحکم زبان میں محبت کے پیام کو پھیلایا ہے کہ جو آج برّ اعظم ایشیا میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ وہ نہ صرف اردو کا بلکہ فارسی اور تلگو کا بھی قادر الکلام شاعر تھا۔

خواجہ محمد احمد صاحب کی سیر حاصل تقریر کے بعد محترمہ روح [?] علی اصغر نے دلنشین ترنم میں محمد قلی قطب شاہ کو منظوم خراج عقیدت ادا کیا۔

تاریخ گولکنڈہ کے مصنف، سابق صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ قطب شاہی دور سلطنت اور آندھرائی تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت پر تحقیقی روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر صدیقی نے کہا کہ محمد قلی قطب شاہ نے بیس سالہ عہد حکومت میں نہ صرف اجداد کی روایات کو اجاگر کیا بلکہ تہذیب و تمدن کے خزانے لٹائے [?]۔ دکن کی تاریخ میں ایسی بہت کم شخصیتیں ملیں گی جن کی تمام زندگی رعایا کی فلاح اور خوشحالی کے لئے وقف رہی ہو۔ محمد قلی تہذیب کا بڑا معمار تھا اور اس کے دور حکومت میں کوئی خرابہ نہیں ہوا۔ ملک میں ہر طرح کا امن و چین اور شادابی تھی۔ محمد قلی کی زندگی کیا ہے آرائش تمدن کی ایک دلکش داستان ہے۔ اس کے عظیم کارناموں میں شہر حیدرآباد کی تعمیر اور
دار ... اور اساتذہ شاعروں میں نواب میر یٰسین علی خاں [?]

تالیوں کی گونج میں اپنی دلکش نظم گنگنا کر سنائی۔ اس نظم کے بعد وقار خلیل صاحب نے ایک قطعہ میں بانی ادارہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کو خراج عقیدت ادا کیا اور پھر "قطب اُردو" کے زیر عنوان اپنی نظم پیش کی۔

دکن میں اردو کے مولف مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "سلطان محمد قلی کے دور حکومت کی قومی تقریبات" کے زیر عنوان اپنا مضمون سناتے ہوئے دکنی کلچر اور دور محمد قلی کی مروجہ تقاریب نوروز بسنت موسم بارش کا آغاز مرگ سالگرہ محمد قلی عید مولود اور محرم جیسی قومی تقاریب کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "محمد قلی کے دور سلطنت میں ماہ محرم کا چاند نظر آتے ہی نوبت نوازی بند ہو جاتی، گانا بجانا اور عیش وغیرہ یکلخت موقوف کر دئے جاتے اور تمام شہر میں نقارہ اور چیزوں کی خرید و فروخت بند کر دی جاتی۔ شاہی باورچی خانہ کے علاوہ رعایا میں بھی گوشت کا استعمال نہیں ہوتا اور عمائدین امراء سے لیکر رعایا تک سیاہ پوش ہو جاتی عاشور خانوں کو اہتمام سے سجایا جاتا اور مراسم عزاداری ہندو مسلمان سبھی یکساں احترام و خلوص کے ساتھ ادا کرتے۔"

مولوی نصیر الدین ہاشمی نے کہا کہ محمد قلی نے اپنے ملک اور اپنی رعایا کے لئے قومی تقاریب رائج کر کے آندھرا دیس میں قومی یکجہتی اور قومی اتحاد کی بنا ڈالی تھی۔

پروفیسر حکیم یوسف حسین خاں پرنسپل نظامیہ طبی کالج نے محمد قلی کو آزاد نظم میں خراج عقیدت ادا کیا جسے حاضرین نے نہایت دلچسپی سے سنا۔ مسٹر مارتھنڈ نیک رام ڈیوڈ نے "BIRTH OF CITY" کے زیر عنوان انگریزی نظم سنائی جس میں حیدرآباد کے بانی اس بادشاہ شاعر کے دور حکومت کو نظم کیا گیا۔ آغا حسن طیبی نے محمد قلی کی فارسی نظم مخصوص لب و لہجہ اور ترنم سے سنائی اور آخر میں آغا شاہ عباس منصور خراسانی نے حسب سالہائے گزشتہ فارسی تقریر کی اور محمد قلی قطب شاہ کے دور حکومت اور شعری و ادبی خدمات کا ذکر کیا۔

نواب میر احمد علی خاں وزیر عمارات و شوارع آندھرا پردیش نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ قطب شاہی سلاطین نے جو روایات قائم کی تھیں ان ہی کی وجہ سے آندھرا پردیش کے علاقے میں شاملی بھائی چارہ میل ملاپ اور رواداری پائی جاتی ہے سینکڑوں سال قبل جب مسلمان دکن میں آئے تو انھوں نے یہاں کی تہذیبی روایات کو نہ صرف اپنایا بلکہ مشترکہ تہذیب اور نئی روایات کو جنم دیا۔" نواب صاحب نے کہا کہ تین سو سال قبل بھی تلگو بولنے والوں کی شاملی ریاست قائم تھی اور پانچ سال قبل دوبارہ اس ریاست کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر زورؔ نے قیام آندھرا پردیش کے موقع پر قدیم کڑی کو جدید کڑی سے ملانے اور پرانی روایات کو زندہ کرنے کے لئے یوم قلی قطب شاہ منانا شروع کیا۔ محمد قلی نے اردو اور تلگو کی یکساں سرپرستی کی اور ان زبانوں کی ترقی کے لئے جو کارنامے انجام دئے اس کی بڑی اہمیت ہے اور آج بھی وہ قابل تقلید ہیں۔

ریاستی وزیر نواب میر احمد علی خاں کی صدارتی تقریر کے دوران جب مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات ڈاکٹر بی گوپال ریڈی ایوان اردو میں تشریف لائے تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ نواب صاحب نے ڈاکٹر ریڈی کی اس تقریب میں شرکت پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ دہلی میں

ہمارے تہذیبی سفیر ہیں۔"

ڈاکٹر بی گوپال ریڈی نے اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے ایک عاشق کی حیثیت سے میں یہاں حاضر ہوا ہوں اور اپنے دوست زورؔ مرحوم کی زبردست خدمات کو خراج عقیدت ادا کرتا ہوں ہر سال یوم محمد قلی کی تقاریب منا کر نہ صرف شاہ کی یاد کو خراج عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے بلکہ اس طرح ڈاکٹر زورؔ کی یاد کو بھی تازہ کیا جا سکتا ہے ان تقاریب کو ڈاکٹر زورؔ کی یادگاری تقاریب کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کی سرگرمیاں قابل قدر ہیں۔ ایوان اردو، ادارۂ ادبیات اردو کی شکل میں انھوں نے ہمیشہ قائم رہنے والی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ کی وجہ سے حیدرآباد اور اردو کو ہندوستان بھر میں ڈاکٹر بی گوپال ریڈی کی تقریر کے بعد نائب صدر ادارہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی کے شکریہ پر یہ سالانہ تقریب سوا آٹھ بجے کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر مقامی اخبارات و رسائل نے خصوصی مضامین نظم و نثر شائع کئے اور آل انڈیا ریڈیو نے ریڈیائی رپورٹ کے نشریہ کا انتظام کیا۔

پاکستان میں یوم محمد قلی قطب شاہ

گذشتہ دو سال سے بہادر یار جنگ اکیڈیمی کراچی کے زیر اہتمام پاکستان میں بھی یوم محمد قلی قطب شاہ منایا جا رہا ہے۔ جمعہ ۱۲ جنوری ۱۹۶۳ء کو اسی اکیڈیمی کی طرف سے محمد قلی قطب شاہ کی یاد منائی گئی۔ اس تقریب کے کنوینر اور داعی جناب خواجہ حمید الدین شاہد رکن ترقی اردو بورڈ کراچی ہیں۔ جناب جمیل نقوی اور جناب حمید الدین شاہد صاحبان نے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں تمدن کی جھلک اور محمد قلی بہ حیثیت فنکار" کے زیر عنوان مقالے سنائے عظیم الدین محبت اور جمیل نقوی نے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کو منظوم خراج عقیدت ادا کیا۔

محفل شعر و سخن کے بعد یہ دلچسپ تقریب خواجہ حمید الدین شاہد کے شکریہ پر کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچی معززین میں پروفیسر ممتاز حسین، ابراہیم جلیس، تحسین سروری، مسلم ضیائی، فضل گلبرگوی، ہمدانی نقوی، نیاز گلبرگوی، خواجہ معین الدین اور یوسف الدین غالی صاحبان شریک تھے۔

حیدرآباد سے متعلق ادارہ کی مطبوعات

		صفحے	قیمت
۱۔ حیدرآباد	ڈاکٹر رضیہ سلطانہ	۸۸	۔۶۲
۲۔ نال والوں کی تاریخ	سید مراد علی طالع	۷۰	۱۔۲۸
۳۔ مختار الملک	فیض محمد صدیقی	۴۸	۔۵۰
۴۔ عماد الملک	" " "	۴۰	۔۵۰
۵۔ ارسطو جاہ	پروفیسر مجید صدیقی	دوسرا ایڈیشن زیر طبع	
۶۔ تاریخ گولکنڈہ	" "	"	"
۷۔ سروجنی دیوی	وزیر حسن دہلوی	۱۰۵	۔۲۵
۸۔ مقدمہ تاریخ دکن	پروفیسر مجید صدیقی	۱۴۴	۔۷۵
۹۔ ریاض مختاریہ	میر لائق علی دانش	۴۰۲	۔۰۰
۱۰۔ حیات بخشی بیگم	نصیر الدین ہاشمی	۴۰	۔۷۵
۱۱۔ بہمنی سلطنت	پروفیسر مجید صدیقی	۱۹۲	۔۵۰

تاثرات

دوران سال ۱۹۶۳ء میں "ادارۂ ادبیات اردو" کے بارے میں
جن اصحاب نے اپنے تاثرات تقریر یا تحریر میں ظاہر کئے یا شائع فرمائے
ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں (ادارہ)

سوویت یونین کے ریسرچ اسکالرس

رعنا قیوموا، مس لودہ مقصودوا،
محترمہ بسیر خواجایوا، سوتیلانا زوئینکوہ،
لیڈا یستوو، ولادیمیر نیکولایو

ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ اس عظیم الشان عمارت کے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہمیں اردو زبان اس کی تاریخ اور ادب سے بڑی دلچسپی ہے اسی لئے ہم "ایوان اردو" کے کتب خانے سے بہت متاثر ہوئے۔ "ایوان اردو" کی میوزیم کی قدیمی کتابیں اور دوسری چیزیں بھی بہت دلچسپ ہیں ہم اس ادارہ کے کام تمام اردو زبان کی ترقی کے لئے بہت مدد دیتی ہے، کامیابیوں کی خواہشات کا اظہار کر رہے ہیں (۵ جنوری ۱۹۶۳ء)

پروفیسر محمد زبیر صدیقی (کلکتہ یونیورسٹی)

پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب کی عنایت اور محبت کے

باعث "ادارۂ ادبیات اردو" اور "ایوان اردو" کے دیکھنے کا موقع ملا مختصر وقت میں جو کچھ میں دیکھ سکا اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ادارہ قابل صد آفرین ہے کہ اس میں ہر طرح کے اہم مواد ادب اردو کے متعلق کثیر تعداد میں جمع کر لئے گئے ہیں اور اسکے ترقی اور مفید بنانے میں ڈاکٹر زور مرحوم کی کوشش قابل صد شکر ہیں (۵ جنوری ۱۹۶۳ء)

ڈاکٹر مختار الدین احمد (پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

اردو زبان کے مشہور محقق جناب نصیر الدین ہاشمی کی عنایت سے آج مجھے "ادارۂ ادبیات اردو" کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ادارے کے کارناموں کا ذکر ایک زمانے سے سنتا آیا تھا اور یہاں کے مطبوعات سے بھی فائدہ اٹھایا تھا حیدرآباد کے اس مرکز کو دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ یہ بڑا مفید کام کر رہا ہے۔
خدا ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کو جزائے خیر دے، جن کی توجہات سے یہ ادارہ ترقی کی منزل کو پہنچا۔ کارکنان کی میں

قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ کتابیں تحریریں وصلیاں تصویریں اسلحہ سازی وغیرہ بڑی خوبصورتی سے مرتب کرکے سلیقے سے چُنی گئی ہیں مجھے یقین ہے ادارہ روز بروز ترقی کرے گا۔ (۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء)

پروفیسر سائمن ڈیگبی (لندن یونیورسٹی)

مجھے بڑی خوشی ہے کہ حیدرآباد آکے میں نے ایوانِ اُردو کے شاندار مجموعے دیکھنے کا موقع پایا۔ مجھے امید ہے کہ اس دوران کئی مشکلات کے باوجود ایوان اُردو کی حمایت سے اور حفاظت سے اُردو کی میٹھی زبان بلاد دکھن میں بے حد ترقی کرے گی۔ (۲۶ اپریل سنہ ۱۹۶۳ء)

جناب عتیق احمد صدیقی لکچرار شعبۂ اُردو دہلی کالج

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو کو دیکھنا یقیناً خوش قسمتی سے کم نہیں ہے۔ اس ادارے کے بارے میں جو تاثرات پہلے سے موجود تھے۔ اس کو دیکھنے کے بعد وہ اور گہرے ہو گئے۔ زورؔ صاحب (مرحوم) اور انکے ساتھیوں کی مساعی پوری اُردو دنیا کے لئے نیک فال ہیں (۳۰ اپریل سنہ ۱۹۶۳ء)

جناب حکم چند نیّر لکچرار شعبۂ اُردو و فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی

اِدارۂ ادبیاتِ اردو میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ کتب خانہ اور دیگر نوادرات کو دیکھکر جو روحانی مسرت حاصل ہوئی ہے وہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ زورؔ مرحوم کی مساعی قابلِ رشک ہیں۔ اُردو کے ہر طالبِ علم کے لئے اس زیارت ضروری ہے۔ خدا کرے کہ ادارہ پھلے پھولے (۱۵ مئی ۱۹۶۳ء)

جناب حسرت سہروردی لکچرار (ترچناپلی)

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے اس ادارہ کا دیکھنا ہوا آج ایک دیرینہ آرزو بر آئی جس پر میں نازاں ہوں زورؔ صاحب کے انتقال کے بعد اس ادارے کی ذمہ داری احباب پر ہے جو انکے شریک کار رہ چکے ہیں مجھے امید ہے ادارہ جو سارے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا تنہا ہے اردو کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوگا۔ (۱۲ جون)

پروفیسر مسیح الزماں شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی

"ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی عمارت ایوانِ اُردو زورؔ مرحوم کے وہ مشفقانہ خطوط اور ان کا وہ اصرار جو مرحوم کرتے رہتے تھے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ کئی بار اصرار کے باوجود ان کے سامنے یہاں نہیں آسکا لیکن اب ان کی سعی و عمل کے اس نمونے کو دیکھکر غم زدہ ہونے کے ساتھ سرگرمی انکے جوش و ولولے کے اس حسین مرقع سے انکی خدمات کی یاد گار سے متاثر ہوا"

"ادارہ ادبیاتِ اُردو اور ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ جس سلیقے اور حسن کے ساتھ چل رہے ہیں آپ مثال ہے مجھے تو اس کے گوشے گوشے میں اس ہمت اور عالی حوصلہ کے نقوش نظر آتے ہیں جو

سالہ زندگی میں اُردو کی خدمت کے لئے ایسا ادارہ
ردیا دکنی ادب کے ایسے عاشق اور خدمت گزار کی یہ
مناسب نشانی ہے۔ خدا کرے یہ ادارہ مرحوم کا نام اس شعر
مداق ہمیشہ زندہ رکھ سکے اور تشنگان ادب کو سیراب
رہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما
(۵۔ جولائی ۱۹۶۳ء).

کیا زور مرحوم کی یاد تو ہمیشہ ستاتی رہے گی لیکن ان کی یہ
زندہ یادگار دکن کے خادمانِ اُردو کے لئے ہمیشہ ہمت افزائی
کا موجب ہے اخباروں اور رسالوں میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے
اس سے سوگنا بہتر دیکھنے پر ظاہر ہوا۔
بڑی خوشی اس بات سے ہوئی کہ زور مرحوم کے انتقال کے
بعد انکے جانشین دل سوزی، ایثار اور پورے انہماک سے
کام کئے جا رہے ہیں۔ (۲۲۔ ستمبر ۱۹۶۳ء)

[illegible]ن ثانی نظامی دہلوی ایڈیٹر ماہنامہ منادی دہلی

ڈاکٹر زور صاحب کے بعد آج پہلی دفعہ ادارے میں
ہوئی ہے کام سب اسی طرح ہو رہے ہیں۔ اللہ کارکنوں
محنت کو کامیاب فرمائے لیکن ڈاکٹر صاحب کے بغیر
سنسان ہے خم و ساغر اداس ہے۔ ۱۰۔ جولائی ۱۹۶۳ء

شاہ فیاض عالم ولی اللّٰہی پٹنہ (بہار)

یہ ادارہ اُردو کی آبرو ہے۔ خدا اس کو نظرِ بد سے
(۱۰۔ جولائی ۱۹۶۳ء)

محمد غوث ناظم دار التصنیف مدارس

ارہ ادبیاتِ اُردو" میں پہلے بھی حاضر ہونے کا
مل تھا۔ لیکن آج کی حاضری نے مجھے بہت مسرور

مولانا عبدالماجد دریابادی ایڈیٹر صدق جدید لکھنو

زور مرحوم کی اُردو دوستی، خوش ذوقی، تن دہی سے میں
واقف تھا لیکن انکے قائم کئے ہوئے "ایوان اُردو" کو دیکھکر تو
آنکھیں کھل گئیں اور جتنا وقت اس وسیع و شاندار عمارت کے اندر
گذرا یہ یاد ہی نہ آنے پایا کہ اُردو بھی اس وقت کوئی مظلوم زبان
اور ہر طرح کے جور و ستم کی شکار ہے۔
اور تو اور اس طلسم زار میں قدم رکھکر یہ بھی پتہ چلنے نہیں
پاتا کہ اُردو دنیا کی کسی بھی متمدن اور ممتول زبان سے ہیٹی یا
کسی سے کچھ قدم پیچھے ہے!
اس چار دیواری کے اندر اُردو کلچر کی ایک پوری دنیا
آباد ہے۔ اللہ اکبر! بابائے اُردو کا لقب مولوی ڈاکٹر عبدالحق
مرحوم کے لئے مختص ہو چکا۔ ورنہ زور مرحوم ہی اپنے کرامات کے
لحاظ سے اس لقب کے کچھ کم مستحق نہیں۔
ادارہ کی وسعت اور بوقلمونی دونوں کا اندازہ دیکھنے ہی
سے ہو سکتا ہے سننے سے نہیں۔
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لئے (۵۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء)

ڈاکٹر کلوویس مقصود

(نمائندہ اعلیٰ عرب لیگ برائے ہند و جنوب مشرقی ایشیاء)

مجھے ادارہ ادبیات اردو کے معائنے سے بے حد مسرت حاصل ہوئی اردو اور عربی زبانوں میں اصولی اور قومی رابطہ رہا ہے اس ادارہ نے نئے نئے طریقوں پر علمی تحقیقاتی، تنقیدی اور اشاعتی کاموں کو سرانجام دیا ہے میری تمنا ہے کہ اس کے کام میں زیادہ حسن پیدا ہو اور یہ ہمیشہ اعلیٰ تحقیقاتی سلسلے کو آگے بڑھاتا رہے (عربی سے ترجمہ) (۱۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

آقائی ایرج نصیبی (دہلی)

رئیس دفتر رایزنی فرہنگی ایران در ہند

بغیر کسی تردید کے یہ کہا جاسکتا ہے ایوان اردو کی زیارت فخر و غرور کا احساس پیدا کرتی ہے کیونکہ ہمارے ہندوستانی بھائی اپنے اور فارسی ادب کے گراں قدر سرمایہ کی انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ نگہداشت کرتے ہیں۔ میں نے بھی توفیق ایزدی سے جب اس کی زیارت کی تو یہی احساس پیدا ہوا۔ میں ہندوستانی بھائیوں کا ممنون ہوں کہ اس طرح ہمارے اسلاف کے تمدن کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں۔ میں متمنی ہوں کہ وہ اپنے اعلیٰ مقاصد میں ہمیشہ کامیاب و کامراں رہیں

ایرج نصیبی

رئیس دفتر رایزنی فرہنگی ایران در ہند

۱۵/۱۰/۶۳

رائے محبوب نارائن معتمد بھارت گن دردمند

"ایوان اردو دیکھا۔ زور رہتے تھے کب سے میں آر
کہ اس میں آکر کچھ پڑھوں اس ادارہ کا سلیقہ حیرت
نقشہ ہے میوزیم کے ہر ڈسک کے پاس گویا مجھے
رہے تھے کہو محبوب اب کیا ارادہ ہے؟ میں دم
کارکنان ادارہ کو میری مبارکباد دیں"

ڈاکٹر عبد الغفار شکیل

لکچرار شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

ادارہ ادبیات اردو اور ایوان اردو
زور صاحب کے زندۂ جاوید ہونے کی ایک روشن
ساتھ ساتھ اردو زبان کی زندگی کا ثبوت ہے
بھی اس ادارے کا ایک ناچیز خدمت گار ہ
حاصل ہوتا (۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء)

جامعہ (دہلی)

حیدرآباد دکن کسی زمانے میں اردو کے بہت
سے تھا اور وہاں ترجمہ اور تصنیف تالیف ا
کرتا تھا۔ مگر انقلاب زمانہ نے اس کی مرکزیت کو
کر دیا ہے۔ اب جو ادارے وہاں کام کر رہے ہیں
ادبیات اردو کو سب سے زیادہ شہرت حا
اپنی تیس سالہ مختصر عمر میں چھوٹی بڑی (...
شائع کی ہیں۔ اردو میں ایک انسائکلوپیڈیا

علمی و ادبی و کلچرل تعاون

۱۹۶۳ء

ادارے کی ڈائری سے

جناب فتح چند نسیم (68 1 9۔ بہری والا باغ۔ پل بنگش، دلی) کو جونپور اور رائے بریلی کے تاریخی حالات کے بارے میں مختلف کتابوں کے حوالوں سے رہبری کی گئی۔

جناب فضیل جعفری استاد چیلی پورہ ہائی اسکول راجہ بازار اورنگ آباد کو جامعہ عثمانیہ کے مسلمہ اردو امتحانات کے لیے [illegible] بھجوائی گئیں۔

جناب شاکر پرشاد تمی (ایم۔ اے) جگراؤں ضلع لدھیانہ (پنجاب) کو ڈاکٹر زور پر ہندی مقالہ کے سلسلے میں استفسارات کا جواب دیا گیا۔

جناب رام پرتھی پال مصرا (نبروبائی اسکول ساگر ایم۔ پی) کو املائی منصوفانہ مثنویوں کے بارے میں مشورے دیئے گئے۔

جناب یوسف الدین ایڈیٹر "رنگ زمانہ" ہفتہ وار نظام آباد کو الاسلامی معیاری رسائل و جرائد کے بارے میں تفصیلات روانہ کی گئیں۔

جناب عبدالاحد پنڈت (بادشاہ مسجد، بٹہ پورہ، سوپور کشمیر) کو ملا وجہی، برہان الدین جانم، غواصی، محمد علی سامانی اور ہاشمی بیجاپوری کے علاوہ حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصانیف اور اردو کے لسانیاتی اثاثے کے تعلق سے رہنمائی کی گئی۔

محترمہ نیمیدہ بیگم (میسور یونی ورسٹی) کو پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ "ریاست میسور میں اردو مثنوی کا ارتقاء" کے بارے میں معلومات روانہ کی گئیں۔

جناب عثمان علی صاحب احسان (معتمد بزم ادب سنگاریڈی) کو چینی جارحیت کے خلاف زیر ترتیب کتاب "اردو شعراء کی نظمیں" کے بارے میں رہبری کی گئی اور مختلف شعراء کے پتے بھجوائے گئے۔

جناب شرافت حسین مرزا (ریسرچ اسکالر دہلی یونی ورسٹی) کو علی الترتیب علامہ اقبال کی تصویر مطبوعہ سب رس ۱۹۳۷ء اور سب رس کے اقبال نمبر اور ۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۷ء کے دلی کے اردو اخبارات کے بارے میں مواد ادارہ کے کتب خانہ اور اردو میوزیم کے ریکارڈ سے بھجوایا گیا۔

جناب رزاق فاروقی صاحب ایم۔ اے عثمانیہ (ریسرچ اسکالر علی گڑھ یونی ورسٹی) کو "اودھ پنچ" کے قدیم فائیلوں کے بارے میں استفسار پر تفصیلات بھیجی گئیں۔

جناب سید انوار اللہ حسینی صاحب آرگنائزنگ سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ بودھن (نظام آباد) کو ۱۸ مئی کو بودھن میں منعقد شدہ "یوم زورؔ" کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے ڈاکٹر زورؔ کی حیات اور ادبی کارناموں کے تعلق سے معلومات اور مواد فراہم کیا گیا اور اس تقریب کی کامیابی کے لئے نائب صدر ادارہ کا پیام بھجوایا گیا۔

جناب سید انیس (بمبئی) کو شاہجہاں اور تاج محل کے بارے میں تاریخی کتابوں اور مورخین کے بارے میں علمی استفسارات کا جواب دیا گیا۔

محترمہ تحریم اختر ایم۔ اے، پنجاب یونی ورسٹی (لاہور) کو ایم۔ اے کے مقالہ "ڈاکٹر زورؔ کی علمی و ادبی خدمات" کے موضوع پر ادارہ کی طرف سے کئی حوالجات اور کتب و رسائل اور تصانیف کی فہرست روانہ کی گئی۔

جناب خواجہ سید شاہ عبداللہ محمد محمد الحسینی چشتی القادری (آستانۂ مخدوم عالیہ) امیر پیر، ووڈ کرنہ (کرنول) کو سلسلۂ چشتیہ کے بارے میں علمی استفسار کا جواب دیا گیا۔

جناب محمد مسعود احمد صاحب صدر شعبۂ اردو، کالج میر پور خاص (پاکستان) کو علامہ اقبال کے مکاتیب بنام مہاراجہ کشن پرشاد کے بارے میں استفسار کا جواب دیا گیا۔

منسٹری آف سائنٹفک ریسرچ اینڈ کلچرل حکومت ہند دہلی کو جنوری ۱۹۶۴ء میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کی نمائش مطبوعات کے سلسلے میں اور تعاون عمل کے بارے میں مطلع کیا گیا۔

جناب رشید احمد صاحب لکچرار شعبۂ اردو، کالج (اروِن روڈ) نئی دہلی کو "وہابی تحریک کا اثر" زیر عنوان تحقیقاتی کام کے سلسلہ میں مختلف حوالہ تواریخ کے بارے میں معلومات بھجوائی گئیں۔

عزیز عطار صاحب صدر بزم سخن گلبرگہ (میسور اسٹیٹ) کو حیدرآباد کے مشہور شعراء کے بارے ارسال کی گئیں۔

ہفتہ وار "بلٹز" بمبئی کو جناب اختر حسن مدیر "پیام" کی خواہش پر محمد قلی قطب شاہ مضامین کے تراشے اور چند تصویریں روانہ کی گئیں۔

ادارے کے شعبۂ ادبیات سے مختلف علمی، ادبی اور تحقیقاتی مسائل کے بارے میں استفسارات کا بھرپور جواب دیا جاتا ہے۔

امداد و اعانت

(۱۹۶۳ء میں حسب ذیل اصحاب نے ادارہ کے کتب خانہ کو اپنے عطایا سے نوازا۔ جس کے لئے ادارہ ان کا شکر گزار ہے)

○

نواب عنایت جنگ بہادر نے ادارہ کے "اردو یم" کے لئے ایک منقش تلوار عباسی اور کٹار تحفتہً مرحمت فرمائی۔

پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی صاحب نے ادارہ کے کتب خانہ کے لئے مجلہ نقوش لاہور کا سالنامہ جنوری ۶۳ء عنایت کیا۔

جناب منوہر پرشاد ماتھر (ایڈوکیٹ) نے کشمیری مرگ شاعرہ شہزادی کلثوم کا مجموعہ کلام "یادگار کلثوم" کا نسخہ ادارہ کے کتب خانہ کو تحفتہً دیا۔

جناب قمر بہرامی (محبوب نگر) نے اپنی منظوم تصنیف ت حق" ادارہ کے کتب خانہ کے لئے تحفتہً دی۔

جناب صالح بن عبید معتمد بزم "شباب" حیدرآباد نے ہ بزم شباب منعقدہ ۱۹۶۱ء کا مجلد گلدستہ "فضیلت خیال" ادارہ کے کتب خانہ کے لئے عنایت کیا۔

○

جناب پرنام داس صحرائی (بستی نو۔ جالندھر) نے اپنا ناول "سفید پوش" (مطبوعہ اردو، ہندی و پنجابی) ادارہ کے کتب خانہ کے لئے عنایت فرمایا۔

پروفیسر مسیح الزماں صاحب لکچرار الہ آباد یونی ورسٹی نے ادارہ کے کتب خانہ کے لئے اپنی مطبوعات ۔ اردو تنقید کی تاریخ (جلد اول) (۲) تعبیر و تشریح تنقید۔ تحفتہً روانہ فرمائیں۔

نواب فطرت جنگ خلف نواب معین جنگ نے ایک ہزار سے زاید حیدرآبادی تقریبات کے رقعات ادارہ کے اردو میوزیم میں ریکارڈ کے لئے تحفتہً عطا کئے۔

نواب عنایت جنگ بہادر نے ۱۱ مختلف قطعات

جناب میر سعادت علی خاں رضوی نے ۳۳۵ رقعات الم چار مکاتیب، مہاراجہ کشن پرشاد بنام ناظم الدولہ اور میر یٰسین علی خاں صاحب نے میر نوازش علیخاں شیدا کے دو مخطوطے "اعجاز احمدی" ادارہ کو مرحمت فرمائے۔

استفادۂ کتب خانہ

(ادارہ کے وسیع کتب خانہ (شعبۂ مطبوعات ومخطوطات) اور دارالمطالعہ سے ریسرچ
اسکالرس صاحبان استفادہ کی غرض سے دور ونزدیک کے مقامات سے آتے رہتے ہیں۔ چند محققین کے
نام حسب ذیل ہیں :-)

۱۔ محمود منشار الرحمٰن خاں منشار (۱۱۔ اسٹارکی ٹاؤن
ناگپور)۔ ۲۔ مغنی تبسم صاحب لکچرار سکندرآباد کالج ۔
۳۔ محترمہ یاقوت بیگم صاحبہ یم، اے، ریسرچ اسکالر
ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ ۴۔ دلدار حسین صاحب
رکن منصوبہ بندی کمیشن ۵۔ نصیر الدین ہاشمی۔ ۶۔
ضیاء الدین احمد شکیب (ایم، اے، علیگ) ۷۔ جناب
یوسف رحمت اللہ (تعمیرات)۸ جناب قیوم عادل صاحب
(رکن) جناب کریم رضا، (آفس سکریٹری) ۱۰۔ ہرنام داس
صحرائی (جالندھر پنجاب) ۱۱۔ ڈاکٹر خالد یوسف لکچرار انوارالعلوم
کالج ۔ ۱۲ حسینی شاہد پرنسپل اردو کالج ۱۳ سید یٰسین صاحب
بیابانی (یم،اے رعثمانیہ) ۱۴۔ نسیم احمد صاحب ایم،اے
لکچرار ہندو کالج دہلی یونی ورسٹی دہلی۔ ۱۵۔ محمد منظور احمد
(یم، اے) ۱۶۔ جناب شرافت حسین مرزا (یم،اے) ریسرچ
اسکالر دہلی یونی ورسٹی دہلی، ۱۷۔ پروفیسر حکم چند نیر (شعبۂ
اردو وفارسی ہندو یونی ورسٹی)(بنارس)
۔ ۱۸۔ جاوید لطیفی صاحب، ۱۹۔ جناب
امین چند شرما ۔ صدر شعبۂ اردو وفارسی مہاکوشل مہاودیالیہ جبلپور
۲۰۔ بدیع حسینی آرزو لکچرار اردو کالج ۔ ۲۱۔ پروفیسر مسیح الزماں
(خیاباں، سبزی منڈی) شعبۂ اردو الہ آباد۔ ۲۲۔
احمد علیخاں صاحب صدر مدرس پنجہ گٹہ ہائی اسکول ۲۳۔ فہ
مندور صاحب ۲۴۔ شیام لال عابد پشاوری یم اے ریسرچ
اسکالر دہلی یونیورسٹی۔ ۲۵۔ جناب دلیپ بادل یم،اے
۲۶۔ قاضی عیاذ انصاری، ۲۷۔ مولوی غلام رسول صاحب
مصنف اردو املا ۲۸۔ میر یٰسین علیخاں صاحب، ۲۹۔
مصطفےٰ علی اکبر جرنلسٹ، ۳۰۔ مولوی احمد تقی استاد
الانام ہائی اسکول، ۳۱۔ ہاشم حسن سعید (ایم، اے)، ۳۲
پروفیسر سائمن ڈگبی (برطانوی مستشرق وارد ہند) ۳۳۔ رشید
۳۴۔ جناب محمد عطاء اللہ صاحب عطا کلیانوی، ۳۵۔ رؤف
(مدیر پیکر) ۳۶۔ محترمہ مس اسماء سعیدی (یم،اے) ریسرچ
اسکالر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ۳۷۔ ڈاکٹر محمد غوث (م
اعزازی دارالتصنیف) مدراس، ۳۸۔ محترمہ مہرالنساء (
۳۹۔ گروچرن سنگھ صاحب، ۴۰۔ محی الدین احمد صاحب
۴۱۔ رحمت علی صاحب جرنلسٹ، ۴۲۔ قمر ساحری صاحب
معتمد بزم سعدی، ۴۳ میر اسد علی صاحب (ایڈوکیٹ)
معین الدین عرفی، ۴۵۔ مصلح الدین سعدی ۔ ہاشم علی صاحب
گلبرگہ کالج، ۴۶۔ سخاوت مرزا صاحب ادارۂ ترقی ار
بورڈ کراچی (پاکستان)، ۴۷۔ مس فہمیدہ بیگم (یم اے) ریسرچ

...یونی ورسٹی میسور، ۴۸۔ ڈاکٹر رشید موسوی لکچرار
...ے راما ریڈی ویمنس کالج، ۴۹۔ محترمہ زینت ساجدہ
...شعبۂ اردو ویمنس کالج عثمانیہ، ۵۰۔ سید عباس حسین صاحب
...مقبول احمد صاحب (ایم، اے) ریسرچ اسکالر دائرۃ المعارف
...ورنمنٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۵۲۔ جناب تبسم نظامی لکھنوی
...کمال شریف صاحب ریسرچ اسکالر مسلم یونی ورسٹی علیگڑھ
...یعقوب صاحب (استاد چادر گھاٹ ہائی اسکول)
...جناب امیر عارفی (بی، اے) مسلم یونی ورسٹی علیگڑھ،
...سید شطاری صاحب ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی
...مصطفےٰ کمال صاحب (ایم، اے) ایڈیٹر مجلہ عثمانیہ
...۔

اردو آرٹس کالج حیدر آباد کے زیر اہتمام دو روزہ "یوم زور" کے موقع پر کتب و رسائل کی نمائش کے سلسلے پر ادارہ کے کتب خانے سے ڈاکٹر زور کے مضامین اور تصانیف کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے مصنفوں اور قلمکاروں کی کتابیں نمائش کے لئے حوالہ کی گئیں اور بعد نمائش واپس لی گئیں۔

سال تمام میں دار المطالعہ اور کتب خانے سے استفادہ کرنے والے حضرات کی تعداد بہ تفصیل ذیل رہی۔

۱۔ جنوری ۲۵۵	۵۔ مئی ۳۳۱	۹۔ ستمبر ۲۵۳
۲۔ فروری ۳۳۰	۶۔ جون ۴۰۰	۱۰۔ اکتوبر ۳۳۰
۳۔ مارچ ۳۲۰	۷۔ جولائی ۴۵۱	۱۱۔ نومبر ۳۸۴
۴۔ اپریل ۳۴۴	۸۔ اگسٹ ۲۷۵	۱۲۔ دسمبر ۴۴۷

(بقیہ صفحہ ۵۱)

...النساء بیگم سوم
...یدالنساء بیگم دوم
...فضل عظیم دوم
...د صابرہ سوم
...مسعود الحسن سوم
...حمیدہ صغریٰ دوم
...یمن بتول دوم
...ماجدہ دوم
...ریحانہ دوم
...ر انوار اللہ دوم
...زین الدین حیدر علوی سوم

۴۳۔ محمد فاروق علی سوم
۳۵۔ عائشہ سعید سوم
۳۶۔ محمد عبدالعزیز دوم
۵۰۔ سید حسن الدین سوم
۵۱۔ شاہدہ بیگم سوم
۵۲۔ صبیحہ بیگم سوم
۵۳۔ محمد عبدالوحید ضمیر سوم
۵۷۔ پورن چند اول
مرکز محبوب نگر ــــ
۳۹۔ حیدر یوسف علی دوم
۶۱۔ بی جانکی رام دوم

۴۵۔ عبدالحسین سوم
۴۶۔ سید عبدالقدیر سوم
۴۷۔ محمد اکبر علی سوم
۴۹۔ محمد عبدالوہاب خان قیصر سوم

امتحان اردو فاضل مرکز نرمل
۱۔ محمد نیاز حسین مرکز نرمل اول
۲۔ حافظ سید معظم علی محبوب نگر دوم
۵۔ محمد بشیر الدین سوم
بلحاظ سہولت نمبر مرکز نرمل
۱۔ نیاز حسین دوم

مرکز محبوب نگر ــــ
۲۔ حافظ سید معظم علی دوم
۴۔ عبدالغنی سوم
۶۔ محمد صدیق سوم
۵۔ محمد بشیر الدین دوم
سعتی۔

اردو امتحانات
ادارہ ادبیات
اردو
حیدر آباد
اے۔ پی

مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن

ادارہ ادبیات اردو نہ صرف اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے بلکہ دکنی آثار اور تاریخی ذخائر کی نگہداشت و اشاعت میں اہم حصہ لے رہا ہے۔ چنانچہ مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن کا قیام اسی غرض سے عمل میں آیا ہے کہ وہ تاریخی نادر مخطوطات شائع کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ اہل ذوق اصحاب اس سے استفادہ کر سکیں۔ چنانچہ اس مجلس کی جانب سے اب تک دو کتابیں یعنی "حدیقۃ السلاطین" (فارسی) مرتبہ مولوی سید علی اصغر بلگرامی مرحوم اور "قطب شاہوں کی خدمات اور آندھرا تمدن" (تلنگو) مرتبہ ڈاکٹر رام راجو صدر شعبۂ تلنگی جامعۂ عثمانیہ شائع ہو چکی ہیں۔ ایک اور کتاب "مکتوبات قطب شاہیہ بنام شاہان مغلیہ و ایران" نواب سید عباس حسین خاں خلف نواب عنایت جنگ بہادر اپنے والد صاحب قبلہ کی نگرانی میں مرتب فرما چکے ہیں جو اشاعت کے مراحل طے کر رہی ہے توقع ہے کہ یہ بہت جلد شائع ہو جائیگی آصف جاہ اول کے عہد کی ایک اہم تاریخ "مآثر نظامی" مرتبہ منشی رام کی اشاعت بھی مجلس کے لائحۂ عمل میں داخل ہے مولوی سید محی الدین صاحب ایم۔ اے نے اس اہم اور نادر مخطوطے کو مرتب کیا ہے توقع ہے کہ حکومت ہند کی اعانت سے اس کی اشاعت بھی بہت جلد عمل میں آئیگی یہ مخطوطہ آصف جاہ اول کے عہد کی مستند تاریخ ہے۔

اُردو میوزیم

اُردو میوزیم ایوان اُردو دکن کے تاریخی تہذیبی اور ثقافتی آثار کا بیش بہا خزانہ ہے۔ یہ ذخیرہ قطب شاہی و آصفیہ فرامین و اسناد قلمی و عکسی تصاویر، تاریخی نقشہ جات، کتبات، اسلحہ، قدیم بیدری ظروف، مشاہیر دکن کے اصل مکتوبات اور خطاطی کے نمونوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ میوزیم کے ذخیرے میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس سال اردو میوزیم میں سکہ جات کے ایک اہم شعبے کا قیام عمل میں آیا ہے جس کی کمی ایک عرصہ دراز سے محسوس کی جا رہی تھی۔

اُردو میوزیم کے محسن نواب عنایت جنگ بہادر نے (۹) قطب شاہی نادر سکے (۱۱) خطاطی کے نمونے اور (۲) قدیم تلواریں عطا فرمائیں۔ نواب فطرت جنگ نے تقریباً ایک ہزار اسنادی اور دیگر تقاریب کے قدیم رقعے مولوی محمد اشرف صاحب انجینئر نے (۹) قطب شاہی نادر سکے اور مولوی سعادت علی صاحب رضوی نے (۲۵۰) قدیم رقعے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے (۴) اصل مکتوبات عنایت فرمائے ہیں۔ میوزیم کے نوادر کی تشریحی فہرست "تذکرہ نوادر" جلد اول شائع ہو چکی ہے اور جلد دوم زیر ترتیب ہے اور توقع ہے کہ یہ بھی بہت جلد شائع ہو جائیگی۔ اُمید ہے کہ علم دوست اصحاب کے عملی تعاون اور مدد سے اُردو میوزیم کے نوادر میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

سید سراج الدین علی خاں، انچارج اُردو میوزیم و مجلس اشاعت تاریخ و تمدن

ادارے کا ترجمان ماہنامہ "سب رس"

ادارہ ادبیات اُردو کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" جنوری ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں "سب رس" کا پچیسواں سال ختم ہوا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ چھبیسویں سال کا پہلا شمارہ شاندار اور دستاویزی "سلور جوبلی نمبر" کی صورت میں اشاعت پذیر ہو مگر اچانک ادارہ کے بانی، روحِ رواں اور معتمد، رسالہ "سب رس" کے نگراں اور مدیرِ اعلیٰ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے سانحۂ ارتحال نے ہماری دلی آرزوؤں کو پورا نہ ہونے دیا اور "سلور جوبلی نمبر" کے بجائے ہم نے ۱۹۶۳ء میں اپنے محسن اور امیرِ کارواں ڈاکٹر زورؔ کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر گرانقدر دستاویزی "زور نمبر" شائع کیا۔

ڈاکٹر زورؔ گو آج جسمانی طور پر ہم میں نہیں ہیں لیکن مرحوم کے عزائم اور کارنامے اراکین و کارکنانِ ادارہ کے لئے ہمیشہ مشعلِ راہ بنے رہیں گے۔ ادارہ کے تمام امور مرحوم کے بعد بھی (بشمول رسالہ "سب رس") انھیں خطوط پر چل رہے ہیں جن کی ڈاکٹر زورؔ نے بنیاد رکھی تھی۔

ڈاکٹر زورؔ کی نگرانی میں "سب رس" کی ایک مجلسِ مشاورت ترتیب دی گئی تھی جس میں جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب مولوی نصیر الدین ہاشمی، جناب رس راج سکسینہ، جناب محمد منظور احمد صاحب اور جناب وقار خلیل صاحب اراکین ہیں۔ نائب صدر ادارہ جناب پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی صاحب کی نگرانی "سب رس" کو حاصل ہے۔ محمد اکبر الدین صدیقی لکچرار اورینٹل کالج جامعہ عثمانیہ نے معتمد مجلسِ مشاورت "سب رس" کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۶۳ء میں "سب رس" کے نو ۹ شمارے شائع ہوئے۔ جن میں میاد رشاہ ظفر نمبر (جنوری، فروری)، ادارہ نمبر (اپریل) کے علاوہ چار سو صفحات پر مشتمل اور جنوں تصویروں کے ساتھ "زور نمبر" (اکتوبر تا ڈسمبر) شامل ہے۔ سال بھر میں "سب رس" کے جملہ صفحات کی تعداد (۸۰۰) رہی اور کل (۶۱) تصویریں شائع ہوئیں۔ تحریروں میں مضامین، مکاتیب، نظمیں، غزلیں، قطعات، گیت، افسانے، ڈرامے، رپورتاژ، فکاہیات، انشائیے اور تبصرے بھی شامل ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں "سب رس" نے (۱۰۰) مضامین شائع کئے جو مختلف علمی، ادبی، تاریخی اور ثقافتی موضوعات پر مشتمل تھے۔ جن میں سب سے زیادہ حصہ "زور نمبر" کے مضامین کا ہے۔ مضامین کے عنوان اور مضمون نگاروں کے نام مہینوں کی صراحت کے ساتھ مندرج کیا تاکہ حسبِ ضرورت تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے استفادہ کا باعث ہوں۔

(مضامین مطبوعہ سب رس سنہ ۱۹۶۲ء)

نمبر	عنوان	مضمون نگار	ماہ اشاعت سنہ ۱۹۶۲ء	نمبر	عنوان	مضمون نگار	ماہ اشاعت
۱	ظفر خزاں اور بہار	وزیر حسن دہلوی	سنہ ۱۹۶۲ء فروری جنوری	۲۲	چین کی زبانوں سے متعلق ایک کتاب	پروفیسر احتشام حسین	،
۲	بہادر شاہ ظفر	پروفیسر سید محمد	″	۲۳	بچوں کا ادب (نظمیں)	احمد تقی	،
۳	ظفر اور انکی شاعری	محمد اکبرالدین صدیقی	″	۲۴	میر تقی میر کا کلیات فارسی	محمد اکبرالدین صدیقی	
۴	ظفر کی شاعری	سید مبارز الدین رفعت	″	۲۵	ہند قدیم کے انادی فلسفہ کی	جلالی شاہجہاں پوری	،
۵	ظفر اور جنگ آزادی	محمد اطہر الحق (ریسرچ)	″	۲۶	شبلی کی شخصیت ایک شارح کی حیثیت سے غیر مطبوعہ خطوط کی روشنی میں	ڈاکٹر سید ابو الفضل مرحوم	؟
۶	ظفر اور ذوق	محمد منور (ایم اے)	″	۲۷	رشید الدین عالی	سعید الدین	
۷	بہادر شاہ ظفر	ڈاکٹر حفیظ قتیل	″	۲۸	قند بخط شکر لبان کرد پو	قادر جاوید	
۸	ظفر کی غزل گوئی	ڈاکٹر سیدہ جعفر	″	۲۹	نصرتی اور حسن و عشق	طیب انصاری	
۹	بجنور میں چراغ	حکیم یوسف حسین خاں	″	۳۰	کیف دکھا دلکے مصنف یوسف ناظم	کرشن چندر	؟
۱۰	ظفر کی غزل	سعادت نظیر	″	۳۱	نیاز فتحپوری	یوسف ناظم	
۱۱	ظفر کی کتاب زندگی	ابراہیم شفیق	″	۳۲	ہند قدیم کے انادی فلسفہ کی شاخیں	جلالی شاہجہاں پوری	
۱۲	قلی قطب شاہ کے دور کے تعمیری نقوش	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	″	۳۳	شاعر انسانیت اسمٰعیل میرٹھی	سیفی پریمی	
۱۳	محمد قلی کے دور کی قومی تقریبیں	نصیر الدین ہاشمی	″	۳۴	شاہد صدیقی ادبی ماحول کے آئینے میں	میر یٰسین علیخاں	
۱۴	محمد قلی ایک ترقی پسند کی نظر میں	کشن پرشاد	″	۳۵	شاہد صدیقی	رضی الدین معظم	
۱۵	کتابوں کی باتیں	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	مارچ	۳۶	غالب کا سیاسی تدبر	ہما میرٹھی	
۱۶	دلستان دہلی کے اہم رحجانات	سید شاہ مصباح الدین شکیل	″	۳۷	آزاد و حافظ کی ایک غیر معروف شخصیت	ڈاکٹر مرتضیٰ صدیقی	
۱۷	سید تمکین کاظمی مرحوم	میر یٰسین علی خاں	″	۳۸	وسطی دکن کی خانہ بدوش بستیاں	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	،
۱۸	ظفر کی معرفتی خلاقیت	امین احمد ایم اے	″	۳۹	علم الاعداد اور فن سیاحی کے ارتقاء میں ہندوستان کا حصہ	جلالی شاہجہاں پوری	
۱۹	ادارہ ادبیات اردو	صلاح الدین حبیب	اپریل	۴۰	مالوہ اخبار	محمد اکبرالدین صدیقی	،
۲۰	خیر مقدمی تقریر بیوم محمد قلی	ڈاکٹر زور مرحوم	″	۴۱	زور صاحب	نبد عزیز جنگ	اکتوبر
۲۱	اردو شاعری پر دو تنقیدی مقالے	ڈاکٹر گیان چند	مئی				

نمبر	عنوان	مضمون نگار	صفحہ صراحت
۴۲	ایسا کہاں سے لاؤں	حیرت بدایونی	اکتوبر تا دسمبر زور نمبر
۴۳	خدا رحمت کنند	پروفیسر رشید احمد صدیقی	؍؍
۴۴	زور ایک اونچا انسان اور مخلص عالم	ڈاکٹر محمد باقر	؍؍
۴۵	ایک تاثر	حسن ثانی نظامی	؍؍
۴۶	زور مشاعروں میں	محمود عبدالقدیر	؍؍
۴۷	ڈاکٹر زور سے میری آخری ملاقاتیں	سید بادشاہ حسین	؍؍
۴۸	چند تاثرات	بدر شکیب	؍؍
۴۹	ڈاکٹر زور مرحوم	پروفیسر محمود حسین	؍؍
۵۰	ڈاکٹر زور صاحب	محمد اکبر الدین صدیقی	؍؍
۵۱	ڈاکٹر زور کی شخصیت	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	؍؍
۵۲	استاد محترم	سید مبارز الدین رفعت	؍؍
۵۳	ڈاکٹر زور چند تاثرات	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	؍؍
۵۴	ڈاکٹر زور مرحوم	سید محمد مورخ بیدری	؍؍
۵۵	ڈاکٹر زور مرحوم	ڈاکٹر سیدہ جعفر	؍؍
۵۶	ڈاکٹر زور سے ایک ابتدائی ملاقات	قاضی عبدالودود انصاری	؍؍
۵۷	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	احمد جمال پاشا	؍؍
۵۸	ڈاکٹر زور صاحب	یوسف ناظم	؍؍
۵۹	ڈاکٹر زور مرحوم (چند تاثرات)	پروفیسر احتشام حسین	؍؍
۶۰	اردو کا فدائی دکنی ادیب	پروفیسر محمد خاں	؍؍
۶۱	ڈاکٹر زور کی شخصیت	سید محمد اکبر وفاقانی	؍؍

نمبر	عنوان	مضمون نگار	صفحہ صراحت
۶۲	شاہ گنج سے ایوان اردو تک	پروفیسر سید محمد	اکتوبر تا دسمبر زور نمبر
۶۳	آسمان اردو ادب کا ایک درخشاں ستارہ	احمد الدین احمد	؍؍
۶۴	ڈاکٹر زور حیدرآباد سے کشمیر تک	حبیب ابراہیم	؍؍
۶۵	ڈاکٹر زور مرحوم	جہاں بانو نقوی	؍؍
۶۶	زور صاحب	نظر حیدرآبادی مرحوم	؍؍
۶۷	ڈاکٹر زور۔ ایک دوست	پنڈت دتاتریہ کیفی و ہردیال سنگھ	؍؍
۶۸	حسب قاعدہ	احمد جلیس	؍؍
۶۹	ڈاکٹر زور سے چار ملاقاتیں	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	؍؍
۷۰	چند یادیں چند آنسو	میر یٰسین علی خاں	؍؍
۷۱	ڈاکٹر زور کشمیر میں	محمد یوسف ٹینگ	؍؍
۷۲	ڈاکٹر زور کی شخصیت	وقار خلیل	؍؍
۷۳	بابائے تلنگانہ کے آخری تین دن	سید رفیع الدین قادری	؍؍
۷۴	تاریخ دکن پر ڈاکٹر زور کا حصہ	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	؍؍
۷۵	میرے عزیز دوست ڈاکٹر زور مرحوم	نصیر الدین ہاشمی	؍؍
۷۶	ڈاکٹر زور کی شخصی اور		
	ادبی زندگی	سید رحمت الاکرام	؍؍
۷۷	دکنی اردو کا ایک محقق	ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ	؍؍
۷۸	اردو لسانیت کا ابو الآبا	ڈاکٹر گیان چند	؍؍
۷۹	لسانیاتی ادب میں ڈاکٹر زور کا حصہ	مولوی غلام رسول	؍؍

نظمیں

سب رس جنوری تا دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء میں جلد (۲۶) نظمیں شائع ہوئیں جس میں سب سے بڑی تعداد زور نمبر کے نظموں ذیل میں نظموں کے عنوانات اور شعراء صاحبان کے نام سند درج ہیں۔

مدد ظفر (برق یوسفی) شمع حریت (رئیس اختر) ظفر۔ وقت کا مظلوم ضعیف (تاج قریشی) گولکنڈے کا آئینہ خانہ یہ محبت ما ترکمان دکن (جمیل نقوی) نعرۂ آزادی۔ روش صدیقی) بہادر شاہ ظفر (فضل الرحمٰن) پہلی کرن (صلاح ر) بہادر شاہ ظفر (حکیم یوسف حسین خاں) بہادر شاہ ظفر (وقار خلیل) عشق (وحید مرزا) دیوار (رانا استیانہ) (تاج مہجور) شب درود (صفی تبسم) آرزو (رؤف خلش) خواب بیداری (مخدوم محی الدین) طوق محمل (سامنے۔] ین احمد شکیب) اسپرٹ دہلی (سروجنی نائیڈو / احمد حسین خاں) مرجھائے ہوئے پتے (حکیم یوسف حسین خاں) دو نظمیں ارضیاء الدین شکیب) اسپٹولا (تاج مہجور) ایک نظم (عابد پشاوری) سکوت سخن (وقار خلیل) دبے پاؤں (وحید مرزا) یا میرے (ڈاکٹر عزیز تمنائی) مسافر کھو گیا آخر نظر مرحوم (خورشید احمد جامی) بیکراں (وحید مرزا) نقوش (نصیر پرواز) صادق مولا) چاندنی (ڈاکٹر زور) آسمان کی زبان سے (ڈاکٹر زور) افسانۂ محبت (ڈاکٹر زور) رہبر منزل کی ڈاکٹر زور) جامعہ عثمانیہ اور نونہالان دکن (ڈاکٹر زور) خیر مقدم شاہ ایران بزبان فارسی (ڈاکٹر زور) رستہ رستے میں کھو گیا جی بزبان دکنی (سلیمان خطیب) زور دکن (پروفیسر بیگم ثریا سلیم) فخر تہذیب دکن (روحی جان دکن (خورشید نذیر) ڈاکٹر زور (جگن ناتھ آزاد) ڈاکٹر زور (پروفیسر شیخ فرید) ڈاکٹر زور کی رحلت پر بانی) اردو کے قافلہ سالار (واحق بدایونی) گوہر ارض دکن (حمید رونق) ناخدائے اردو (احسان علی عرشی) آخری را ابو سعد سید اسماعیل) ڈاکٹر زور (خورشید احمد جامی) ایوان اردو کے چراغ (سعادت نظیر) بیاد ڈاکٹر زور (بادا مخدوم) آخری آنسو (صلاح الدین نیر) حیف زور (صائب کو ہیری) آہ ڈاکٹر زور (وقار خلیل) ڈاکٹر زور نیا ویہ) یاد زور (وحید مرزا) ماتم زور (اسد احسن جعفری) نقش فریادی (حکیم یوسف حسین خاں) ہائے وہ کیسی کہاں ہے (میر لیئیق علی خاں) خلوص کا سلام (جمیل نقوی) اے زور (مجیب خیرآبادی) آہ ڈاکٹر زور (نصیر ب مشرق (انوار جہوری) تاریخی نظم (منظر کامل) آہ ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر زور کی یاد میں (محمد اکبر الدین صدیقی) نیما تو نہیں (ڈاکٹر عزیز تمنائی) سیر آمد واں (سید احمد اللہ قادری بی۔ اے)

غزلیں

اس سال جملہ ۹۰، غزلیں اور چند رباعیات و قطعات اور مادہ ہائے تاریخ شائع ہوئے جن میں یوم ظفر کی طرحی غزلیں اور زور نمبر کے قطعات بھی شامل ہیں شعراء صاحبان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

ڈاکٹر سید اختر احمد دیورنڈ، جینن ریحانی، منظر کامل، یوسف ناظم، ڈاکٹر طاہر علی خاں، مسلم خورشید احمد جامی، رشید انجم، اوج یعقوبی، حامدی کاشمیری، فیض الحسن خیال، الطاف شاہد، جذب عالمپوری، خیرات ندیم، کاوش بدری، پیام سعیدی، روشن بنارسی، محسن بھوپالی، عادل منصوری، عارف حجازی، اختر رضوانی، لطیف انور، اصابرشاہ آبادی، حامد ہیکادی، تمنا یوسفی، افتخار عدائی، بشیر بدر، انور ظہوری، جگن ناتھ آزاد، مجید منظور احمد، خورد فوشیپوری، سید حرمت، تکرام، اختر مظہری، عطاء الرحمن ارشاد، منظفر حنفی، ہسوی، ابوالخیر ابراہیم حسینی صبا، مرزا صغیر علی بیگ، علی احمد جلیلی، منشاء الرحمن منشاء، عظمت عبدالقیوم، اختر سلطانہ اختر، خاور نوری، اعجاز قریشی، دلیپ بادل، صلاح الدین نیر، افتخار حسین شاہ، اثر غوری، امیر عارفی، شمس الدین تاباں، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، تلوک چند محروم، ابوسعد سید اسماعیل سعید، اختر رضوانی، پروفیسر نخشی، اختر امرتسری، فضل گلبرگوی، سلیمان خطیب، ڈاکٹر ثامن علی عیاں، مغیث الدین فریدی، شبیر انصاری، بشیر احمد خاں، احمد اللہ قادری، انجم آفندی، سید اکرم علی، عظیم الدین نجیب، عبدالجبار برق، الطاف شاہد اور مہدی حسن قادری۔

افسانے

جملہ ۷ افسانے شائع ہوئے جن میں ۷ ترجمے تھے۔ تفصیل مندرج ہے۔ کہتے ہیں جس کو عشق (منظفر حنفی ہسوی) تمنا دشیام کنول) ادھوری تصویر (دلایت جعفری) ایک کہانی (ٹیگور/ قاضی عبدالغفار مرحوم) ممتا (درسکان دکلا پد کاش/ ممتاز راشد اجمیری) زمین کیسے ٹھنڈی ہوئی (ڈی ایس کھانڈسے کر/ ممتاز راشد اجمیری) مول سنگھ (خوش ونت سنگھ/ ممتاز راشد اجمیری)

مکاتیب

سب رس زور نمبر میں ڈاکٹر زور مرحوم کے مندرج ذیل اصحاب کے نام موسومہ ۹۲ مکاتیب شائع ہوئے ۲۷ خطوط بنام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ایک خط بنام پروفیسر ہارون خاں شروانی، ۳ خطوط بنام عارف الدین حسن، ایک خط بنام ممتاز حسن احسن، ۱ خطوط بنام پروفیسر مبارز الدین رفعت، ۱۶ خطوط بنام پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد، ۱ خطوط بنام سید محمد مورخ بیدری، تین خطوط بنام محترمہ جہاں بانو نقوی، ۵ خطوط بنام ڈاکٹر خلیق انجم اور ایک خط بنام ڈاکٹر اسلم پرویز دہلی

رپورتاژ

سب رس (جنوری فروری) بہادر شاہ ظفر نمبر میں یوم ظفر پر وقار خلیل صاحب کا محررہ رپورتاژ شائع ہوا۔

مقالہ نما

سب رس زور نمبر میں ڈاکٹر زور مرحوم کے ۲۲۳ مختلف علمی و ادبی مضامین (مطبوعہ) اور دستاویز و تالیف پر مشتمل وقار خلیل صاحب کا مقالہ نما شائع ہوا۔

تبصرے

"سب رس" نے ہمیشہ سے سیر حاصل اور معیاری تبصروں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں جملہ ۳۵ تبصرے شائع ہوئے جن میں ۲۹ مختلف موضوعات پر مشتمل کتابیں اور چھ رسائل شامل ہیں۔ تبصرہ کرنے والوں میں مولوی غلام رسول، حکیم یوسف حسین خاں، محمد اکبرالدین صدیقی، محمد منظور احمد، ضیاءالدین احمد شکیب، مجتبیٰ حسین، وقار خلیل، رشید الدین، نذیر محمد خاں اور دانمی برنی صاحبان شامل ہیں۔

مندرجہ ذیل کتب و رسائل پر تبصرے شائع ہوئے۔

فرہنگ شاہ دریشنے (منظر الحق علوی) ولایتی بھوت (ریم کوکب) برہمن کی بیٹی (شرت چندر چٹرجی/مائل ملیح آبادی) شرہ وفا (مجاہد لکھنوی) فضائل الصلوٰۃ (عینی اسا ولی) قبر بوسی (عینی شاہ نظامی) مسلمانوں کے فرقے (غلام محمد) سالنامہ بانو دہلی، ماہنامہ خاتون دکن حیدرآباد، سالنامہ آندھرا پردیش حیدرآباد، قرآن پاک اور آسمانی پروازیں (معین الدین رہبر فاروقی) ترانے (مرزا شکور بیگ) تذکرہ حضرات مخدوم جہانیاں جہاں گشت (سخاوت مرزا) مولوی عبدالقادر (نصیرالدین ہاشمی) ایک بوند لہو کی (جوگیندر پال) شکست شب (محسن بھوپالی) ماسٹر آف نیکسز (دھرم پال گھتہ) دو شہروں کی کہانی (فضل الرحمٰن) نیا کارواں (وقار اعظمی) انتخاب نو، کراچی، رکت وان (ماہنامے دہلی) المہدی حیدرآباد، قومی زبان حیدرآباد، آہنگ حیات (منشاء الرحمٰن منشاء) گلدستہ نفیسلت خیال (بزم شاب) پٹنہ۔ مختصر حالات (آزاد کتاب گھر دہلی) تین کتابیں (انتخاب کلام محبوب خزاں، محب عارفی اور قمر جمیل) ماہنامہ کتاب لکھنؤ (شوکت تھانوی نمبر) برگ نو خیز (ڈاکٹر عزیز تمنائی) اشرف المخلوقات (ڈاکٹر اختر احمد) قومی کتابیات (سید جمیل احمد) بچوں کے ادب کی خصوصیات (مشیر فاطمہ) احباب قاعدہ (پروفیسر احتشام حسین) رنگ و بو (خرد غوث پوری) کیفی چریا کوٹی اور الم مظفر نگری کے انتخاب کلام (انجمن ترقی اردو علی گڈھ) ماہنامہ قلم کار حیدرآباد، سہ ماہی شیرازہ سری نگر (نذر نمبر) صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات (محمد عتیق صدیقی)

بسلسلہ صفحہ (۲۶)

جو دس جلدوں پر مشتمل ہوگی، اس کے پاس ایک قیمتی کتب خانہ بھی ہے جس سے تصنیف و تالیف اور تحقیق و تفتیش کا کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملتی ہے۔ ایوان اردو کے قیام سے مصنفین اور محققین کے لئے مزید آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی یادگار میں انکے نام پر ایک انسٹی ٹیوٹ بھی ۱۹۵۹ء میں قائم کیا گیا ہے جس میں ان تمام مشرقی علوم و فنون پر اعلیٰ تحقیقاتی کام کیا جائے گا جن سے مولانا کو دلچسپی تھی۔

اس ادارہ کی تمام چہل پہل ہماہمی اور علمی ترقیاں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی مساعی کی مرہون منت ہیں جو ہم میں نہیں رہے مگر امید ہے کہ انکے رفقائے کار اور شاگرد جنھیں مرحوم سے گہری اور پائدار محبت ہے۔ انکی اس یادگار کو نہ صرف باقی رکھیں گے۔ بلکہ اس کو اور ترقی دیں گے۔

(اقتباس "ہندوستان کے تصنیفی ادارے" (عبداللطیف اعظمی) مطبوعہ ماہنامہ "جامعہ" دہلی (سالنامہ مئی و جون ۱۹۶۳ء)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

ایک شخصیت ○ ایک عہد ○ ایک دستاویز

یادگارِ زورؔ

"ادارۂ ادبیات اردو" حیدرآباد دکن کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" نے ادارہ کے بانی اور معتمد ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر دستاویزی زورؔ نمبر شائع کیا تھا۔ اس خصوصی اشاعت کی مقبولیت کے سبب ادارہ نے یہ تمام مضامین نظم و نثر ادبی حلقوں اور ادب دوستوں کی مانگ کے پیش نظر علحدہ کتابی صورت میں شایع کیے ہیں۔ چار سو سے زائد صفحوں کی اس ضخیم کتاب میں درجنوں تصویروں کے علاوہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی حیات، شخصیت اور فن پر ممتاز مشاہیر اہل قلم ادیبوں، شاعروں اور انشا پردازوں نے گرانقدر مضامین نظم و نثر سپرد قلم کیے ہیں۔ اس خصوصی اشاعت میں ڈاکٹر زورؔ مرحوم کے کئی مطبوعہ مضامین اور تمام تصانیف و تالیفات کا مقالہ نما اور مرحوم کا مکمل کلام اور چند غیر مطبوعہ و غیر نشریہ مضامین کے علاوہ خطبات و مکاتیب بھی شامل ہیں:

یادگارِ زورؔ کے چند اہم لکھنے والے

نواب مہدی نواز جنگ بہادر	ڈاکٹر محمد باقر	پروفیسر رشید احمد صدیقی	پروفیسر سید احتشام حسین	ڈاکٹر گیان چند
ڈاکٹر رحیم الدین کمال	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	ڈاکٹر خلیق انجم	علامہ حیرت بدایونی	پروفیسر سید محمد
پروفیسر مجید صدیقی	ڈاکٹر سیدہ جعفر	پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی	ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ	تلوک چند محروم
جگن ناتھ آزاد	جہاں بانو نقوی	خورشید احمد جامی	پروفیسر مبارزالدین رفعت	میر یسین علی خاں
نظر حیدرآبادی مرحوم	نصیرالدین ہاشمی	بدر شکیب	اکبر وفاقانی	سید بادشاہ حسین
محمد یوسف ٹینگ	انوار ظہوری	حسن ثانی نظامی	وقار خلیل	یوسف ناظم
احمد جلال پاشا	قاضی عیاذ انصاری	حکیم یوسف حسین خاں	سید حرمت الاکرام	غلام رسول
ڈاکٹر عزیز تمنائی	مجیب خیرآبادی	پروفیسر ثریا سلیم	پروفیسر انور علی اختر	پنڈت ونشی دھر ودیالنکار
کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	جمیل نقوی	پروفیسر محمود حسین	محمود عبدالقدیر	سید محمد مورخ

سلیمان خطیب - حبیب ابراہیم - رشیدالدین - رفیع الدین قاسمی - احمد جلیس - پروفیسر محمد خاں - اسحاق ایو - روحی علی اصغر - پروفیسر شیخ زید - کرشن گوپال مغموم - سلیمان اطہر جاوید - اختر رضوانی - نجم آفندی - پروفیسر بخشی اختر بعا

قیمت صرف ۶ روپیے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر۔ ایوان اردو۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن ۴ (آندھرا پردیش)

سب رس کے تبادلے میں آنے والے رسائل و جرائد کی تفصیلات

مندرجۂ ذیل رسائل و جرائد "ایوانِ اردو" کے دارالمطالعۂ عام میں قارئین کے مطالعہ کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ان سے چند ایک رسائل و جرائد کو چھوڑ کر باقی "سب رس" کے تبادلے میں آتے ہیں۔ ہم ان تمام ہند، پاک اور بیرونِ ہند ن جرائد کے ممنون ہیں جو پابندی کے ساتھ "سب رس" کے تبادلے میں اپنے رسائل و جرائد ارسال فرماتے ہیں۔ امید ہے نہ مستقلاً برقرار رہے گا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ختم سال پر ایسے تمام رسائل و جرائد کی اچھی اور پائدار بنوائی جاتی ہیں اور انھیں ادارہ کے کتب خانہ میں درج رجسٹر کر کے استفادہ کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے اور ہر دو سے سال ادارے کے کتب خانہ کی کتابوں اور رسالوں کی ایک باضابطہ ضخیم فن واری فہرست اشاریہ کے ساتھ شائع ہے۔ اس سلسلے میں اب تک "فہرست کتب خانہ ادارہ" کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور اب چوتھی جلد زیرِ ترتیب ارہ کے کتب خانے میں بے شمار اہم اور نادر قلمی کتب اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ کئی اہم رسائل و جرائد کی فائلیں بھی یں۔ ۱۸۵۰ء سے پہلے اور اب تک کے نادر علمی و ادبی ذخیرہ کے حامل اس کتب خانہ سے آئے دن ادب دوست اور ریسرچ اسکالرس صاحبان ہر روز الآماہ ساعت استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

اس افادی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے قارئین اور دیگر اردو دوستوں کے ساتھ ساتھ مدیرانِ رسائل سے خواہش کریں گے کہ وہ اس قسم کے ریکارڈ کی فراہمی اور یکجائی میں ہم سے بھرپور تعاون فرمائیں اور جب کبھی اپنا اپنا ادبی یم و جدید کتب و رسائل، چھانٹنا یا نکالنا چاہیں تو براہِ کرم تحفتہً مرحمت فرمائیں جو معطی کے تشکریہ کے ساتھ کتب خانہ میں ریکارڈ ے گا اور فہرست کتب خانہ میں معطی کے اسم گرامی کے ساتھ درج بھی ہوگا۔

مید ہے کہ معاصرین اور دیگر ادب دوست اصحاب اور مختلف علمی و ادبی تنظیموں کے سربراہ ہم سے تعاون عمل فرما کر ہمیں تشکریہ یں گے۔ (ادارہ)

نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	ضخامت عمومی	زرِ رسالہ
	سالانہ			
ہدوئے معلی	شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی۔ دہلی	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۲۰۰	
انوار	انوار العلوم کالج۔ ملے پلی۔ حیدرآباد دکن	پروفیسر سید علی اکبر	۴۰	

۳	دہلی کالج میگزین	دہلی کالج۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی	نثار احمد فاروقی	۰۰
۴	شب تاب	شعبۂ اردو۔ ایوننگ کالج، توپ کا سانچہ حیدرآباد	محمد اکبر الدین صدیقی	۰
۵	صبح	انجمن ترقی اردو، علی منزل کوچۂ پنڈت۔ دہلی	حمیدہ سلطان	۴
۶	مجلۂ عثمانیہ	شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد ۷	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۰
		سہ ماہی		
۷	ادبی دنیا	مال روڈ۔ لاہور (پاکستان)	صلاح الدین احمد	۵۰
۸	اردو نامہ	ترقی اردو بورڈ۔ جمشید روڈ۔ کراچی۔ ۵	شان الحق حقی	۰
۹	الوعی	پاکستان پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی	عطا حسین	۸
۱۰	صحیفہ	مجلس ترقی ادب۔ کلب روڈ۔ لاہور	عابد علی عابد	۱۰
۱۱	صدف	دار الکتابت۔ کریم گنج۔ گیا (بہار)	طیب عثمانی	۶
۱۲	نوائے ادب	۸۔ شیفرڈ روڈ۔ بمبئی ۸	نجیب اشرف ندوی	۲
۱۳	نیا دور	پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی ۵	محمد ثناء اللہ	۰
		دو ماہی		
۱۴	شیرازہ	جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹس اینڈ کلچر، سرینگر کشمیر	محمد یوسف ٹینگ	۶
۱۵	محور	۲/۱۲ اے۔ ویسٹرن ایکس ٹینشن ایریا۔ دہلی ۵	نریندر نشچل	۸
۱۶	نیرنگ خیال	فلمینگ روڈ۔ لاہور	حکیم یوسف حسن	۰
		ماہ نامے		
۱۷	آندھرا پردیش	محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ۔ نکرم جاہی روڈ حیدرآباد	کنول پرشاد کنول	۰
۱۸	اباسین	محکمۂ اطلاعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۰۴۳ کراچی	ناظم اطلاعات	
۱۹	ادبی گزٹ	پوسٹ بکس ۲۱۸، صدر، کراچی نمبر ۳	شمس الاسلام	
۲۰	ادیب	جامعۂ اردو۔ علی گڑھ	ابن فرید	۸

۲	اردو ڈائجسٹ	۵، مین روڈ، سمن آباد، لاہور	الطاف حسین قریشی	۱۶۰	پندرہ روپے
آ	ارشاد	مغل پورہ۔ حیدرآباد (آندھرا پردیش)	جاوید قادری	۶۴	۵ روپے
۲	استقلال	محکمۂ اطلاعات۔ ۲۱۔ ایبٹ روڈ۔ لاہور	میر عبدالصمد خاں	۴۸	۳ روپے
	اسرار حکمت	۱۰-۸۔ پیر کی شریف لاہور	حکیم نور محمد چوہان	۴۰	۴.۵۰
۲	افکار	رابسن روڈ۔ کراچی	صہبا لکھنوی	۸۰	بارہ روپے
۲	الشجاع	ٹائمز پریس۔ صدر۔ کراچی	سلمان الارشد	۷۲	پانچ روپے
	المہدی	۴، ۷، ۳۔ ۲۰۔ جلال کوچہ۔ حیدرآباد۔ ۲	جہاں بانو نقوی	۴۰	۸ روپے
	التقدیر	"صاف منظر" چھاؤنی ناد علی بیگ۔ حیدرآباد	احمد المنبر قدیری	۴۰	۶ روپے
	انتخاب نو	۱۲۔ وزیر گلشن۔ نکل روڈ۔ کراچی۔ ۲	اختر رحمانی	۱۰۸	بارہ روپے
	بانو	آصف علی روڈ۔ اجمیری گیٹ، نئی دہلی	بیگم زینت کوثر	۶۴	۸ روپے
	برہان	جامع مسجد اردو بازار۔ دہلی	سعید احمد اکبرآبادی	۶۰	۶ روپے
	بیسویں صدی	انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی ۶	خوشتر گرامی	۹۶	۱۰ روپے
آ	پاسبان	محکمۂ اطلاعات پنجاب۔ چنڈی گڑھ	ناظم اطلاعات	۴۸	۲ روپے
آ	پگڈنڈی	ادارۂ ادبستان اردو۔ ہال بازار امرتسر	امریک آنند	۴۸	۶ روپے
	پونم	۳۰۱-۷-۱۶۔ محلہ اعظم پورہ۔ حیدرآباد	ناصر کرنولی	۶۴	۶ روپے
	پیغام صحت	سلامت محلہ، موہنی روڈ۔ لاہور	حکیم اقبال حسن	۴۰	۳ روپے
	پیکر	پوسٹ بکس ۲۳۳ حیدرآباد ۱ اے پی	اعظم راہی	۶۴	۳ روپے
	تبسم	دارالشفاء۔ حیدرآباد	سجاد رضوی	۱۲	دو روپے
	تجلی	دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔ پی)	عامر عثمانی	۶۴	۷ روپے
	تشکیل	گھنٹہ گھر۔ پشاور	تاج سعید	۶۴	چار روپے
	تحریک	۹۔ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج، دہلی	گوپال متل	۴۸	۴ روپے
	تخلیق	۴/۳ آصف علی روڈ۔ نئی دہلی	دت بھارتی	۶۴	۵.۵۰
	تلاش	پوسٹ بکس ۲۵۶۸ نئی دہلی ۵	وشوا ناتھ درد	۸۲	۷ روپے
۱	تعمیر انسانیت	موچی دروازہ۔ لاہور (پاکستان)	عبدالحمید	۴۸	۵ روپے

۴۵	تہذیب الاخلاق	۲- ریس کورس روڈ- لاہور	ہاشمی فرید آبادی	۰
۴۶	ثقافت	ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ- لاہور	پروفیسر ایم ایم شریف	۲
۴۷	جامعہ	جامعۂ ملیۂ اسلامیہ- جامعۂ نگر، نئی دہلی ۲۵	عبداللطیف اعظمی	۲
۴۸	جائزہ	۶- حجاز ہوٹل- گرانٹ روڈ- کراچی	محمد یعقوب خاں	۴
۴۹	جستجو	یوسف بازار- حیدرآباد- ۲	محمد عبداللہ	۵
۵۰	جمالستان	۳۶۴- بازار مٹیا محل- جامع مسجد- دہلی ۶	نجم صدیقی	۴
۵۱	جوار بھاٹا	ای/۴۴- کملا نگر- دہلی ۷	تاجور سامری	۲
۵۲	حریم	نسیم بک ڈپو- لاٹوش روڈ- لکھنؤ	نسیم انہونوی	
۵۳	خاتون پاکستان	پوسٹ بکس ۱۹۹، صدر- کراچی ۳	شفیق بریلوی	
۵۴	خاتون دکن	گن باؤلی- حیدرآباد- ۲	صالحہ الطاف	۰
۵۵	دی ایشین بلیٹن (انگریزی)	ایشیا پبلشنگ ہاؤس- بمبئی	پی، ایس، جے سنگھ	
۵۶	دبیدار	بوئن پلی- سکندرآباد- حیدرآباد	محمد افضل شریف	۲
۵۷	راوی	پٹنہ- ۴	انیس جاوید	
۵۸	رکت دان	۳/۱۵۵ اے- ویسٹرن ریکس ٹینٹشن ایریا، نئی دہلی ۵	ایس، ایم، شاہنواز	
۵۹	رفتار زمانہ	کلاک ٹاور- فتح میدان- حیدرآباد ۱	قمر خلیل اعظمی	۸
۶۰	زاویے	۳۱- ۷- ۱۶- عثمان پورہ- حیدرآباد	سلام شفیق	
۶۱	زعیم	۱۸۴- ۷- ۲۰- حیان روڈ- ،،	شمس الدین حسن	
۶۲	زنجیر	نور محل روڈ- بھوپال (ایم پی)	وکیل بھوپالی	
۶۳	ساقی	پی، آئی، بی- کالونی- کراچی- ۵	شاہد احمد دہلوی	
۶۴	ساہتیہ اکیڈمی متعلق جرنل (انگریزی)	رابندر بھون- نئی دہلی ۱	پی، ماچوے	
۶۵	سروج	قصاب پورہ پوسٹ بکس ۱۰۵۴ دہلی ۶	حکیم حمید صدیقی	
۶۶	سوویت لٹریچر (انگریزی)	۹/۱۱ دوبرو لوو اسٹریٹ- ماسکو (سوویت روس)	واسلی ازہیو	
۶۷	سہیل	باری روڈ- گیا (بہار)	ادریس بہاری	

۶۸	شاعر	مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس ۲۶۴۵ بمبئی ۸	اعجاز صدیقی	۶۴	۷ روپے
۶۹	شانِ ہند	مکتبہ شانِ ہند۔ ۱۱۔ ریلو ہوٹل دریا گنج دہلی	سرور تونسوی	۴۰	۵ روپے
۷۰	شاہکار	ممتاز باغ۔ لوکر گنج۔ الہ آباد۔ ۱	محمود احمد ہنر	۱۴۱	۱۰ روپے
۷۱	شمع	آصف علی روڈ۔ اجمیری گیٹ۔ نئی دہلی ۱	یوسف دہلوی	۹۸	۸ روپے
۷۲	شہباز	روضۂ بندہ نواز۔ گلبرگہ شریف (میسور)	مبارز الدین رفعت	۴۰	۶ روپے
۷۳	صبا	۱۷۔ مجرد گاہ۔ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد ۱	سلیمان اریب	۸۰	دس روپے
۷۴	صبح امید	بلاسس روڈ۔ بمبئی ۸	عبدالحمید بوبیرے	۵۰	چھ روپے
۷۵	عارف	مل روڈ۔ لاہور۔ ۷	عبدالرحمٰن شوقؔ	۴۸	تین روپے
۷۶	عصمت	بندر روڈ۔ کراچی۔ ۳	رازق الخیری	۴۰	چھ روپے
۷۷	فاران	کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱	ماہر القادری	۶۴	۷ روپے
۷۸	فروغ اردو	۳۷۔ امین آباد پارک لکھنؤ (یو، پی)	ڈاکٹر نورالحسن	۸۰	۲-۲۵
۷۹	فکر و خیال	پی، ای، سی، ایچ، ایس۔ کراچی ۲۹	شمیم جاوید	۸۸	چھ روپے
۸۰	قلم کار	مہندی محبوب۔ حیدرآباد ۲	احمدی بیگم	۸۰	۷ روپے
۸۱	قومی زبان	انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی	شفق خواجہ	۹۲	۸ روپے
۸۲	قومی زبان	کاچی گوڑہ۔ حیدرآباد دکن ۲۷ (اے پی)	چندر سری واستوا	۴۸	۵ روپے
۸۳	کتاب	حجوک، لکھنؤ ۳	جمیل احمد	۷۲	۶ روپے
۸۴	کتابی دنیا	گیدومل لیکھراج روڈ۔ کراچی۔ ۱	ضیاء الدین احمد برنی	۱۸	دو روپے
۸۵	کتاب نما	مکتبہ جامعہ ملیہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵	غلام ربانی تاباں	۲۳	ایک روپیہ
۸۶	کلیاں	نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔ (یو، پی)	شمیم انہونوی	۵۰	۴ روپے
۸۷	گگن	۳۹/۴۰۔ بومبل بازار۔ کلیان (مہاراشٹرا)	شمس کنول	۵۰	۵ روپے
۸۸	گلِ خنداں	کشمیری بازار۔ لاہور۔ ۸	عبدالرؤف ملک	۴۸	۴ روپے
۸۹	گھریلو علاج	سدی عنبر بازار۔ حیدرآباد ۱۲	ڈاکٹر جیٹھا نند	۲۴	۳ روپے
۹۰	ماڈرن ریویو (انگریزی)	ابچاریہ پرفلا چندر روڈ۔ کلکتہ ۹	کیدار ناتھ چیٹرجی	۱۳۲	۱۵ روپے
۹۱	ماہِ نو	ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی	رفیق خاور	۱۳۲	۵=۵۰

۹۲	مجلس	ریلوے روڈ۔ لاہور	رضوی خیرآبادی	۶۴
۹۳	محفل	رائل پارک۔ لاہور	طفیل ہوشیارپوری	۴۴
۹۴	معارف	دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ (یو۔پی)	معین الدین ندوی	۶۴
۹۵	منادی	درگاہ حضرت نظام الدین۔ نئی دہلی ۱۳	حسن ثانی نظامی	۴۸
۹۶	نفسیات	اردو بازار۔ موہن روڈ۔ کراچی ۱	معراج رسول	۴۸
۹۷	نقاش	۵۰۔ نظام پورہ۔ بھیونڈی ضلع تھانہ (مہاراشٹرا)	فیضی نظام پوری	۶۴
۹۸	نگار	گھیر سخی۔ رام پور (یو۔پی)	اکبر علی خاں	۴۸
۹۹	نگارش	لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹	ناصر محمود	۷۲
۱۰۰	نوری کرن	بازار صندل خاں۔ بریلی (یو۔پی)	امید رضوی	۴۰
۱۰۱	نیا دور	محکمۂ اطلاعات اترپردیش۔ لکھنؤ	صباح الدین عمر	۸۰
۱۰۲	ہمدرد صحت	ہمدرد منزل۔ لال کنواں۔ دہلی	حکیم عبدالحمید دہلوی	۵۲
۱۰۳	ہم قلم	پاکستان رائٹرس گلڈ۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی	جمیل الدین عالی	۶۴
۱۰۴	ہندوستانی ادب	۹۹/اے اعظم پورہ شرقی۔ حیدرآباد ۲۴	جی۔ایم خاں	۳۲
۱۰۵	یونسکو کوریئر (انگریزی)	یونسکو ہاؤس۔ پیرس ۔۷	ناظم یونسکو	۴۴

پندرہ روزہ

۱۰۶	العرب (انگریزی)	۱۶/۱۳ جانگپورہ۔ نئی دہلی	کلووس مقصود	۱۶
۱۰۷	تعمیر حیات	دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ (یو۔پی)	سید محمد الحسنی	۲۰
۱۰۸	تنظیم	اکبر روڈ۔ میسور	رکن الدین سالک	۴
۱۰۹	سرپنچ	نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ	شمیم انہونوی	۴
۱۱۰	سوویت دیس	۲۵، بارہ کھمبا روڈ۔ نئی دہلی	جمیل اختر	۴۰
۱۱۱	شعلۂ حیات	جہانگیرآباد۔ بھوپال (ایم۔پی)	ایم۔ عرفان	۱۶
۱۱۲	صراط (انگریزی)	۱۴۲، ساؤتھ ایونیو۔ نئی دہلی	محمد غالب فدائی	۱۰
۱۱۳	عبرت	۳۰۔ پرنسپ اسٹریٹ۔ کلکتہ ۱۳	جوہر غازی پوری	۱۶
۱۱۴	فلمی دنیا	نامپلی روڈ۔ حیدرآباد (اے۔پی)	عثمان شیدا	۱۲

۱۱	کاکل	۲۷۔ عامرہ گیاریج۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد	محمود انصاری	۸	دو روپے
۱۱	موج	روبرو مسجد ٹیک۔ نام پلی۔ حیدرآباد	ساجد اعظم	۸	"
۱۱	محور (بالتصویر)	۴۳۔ الف، ایچ، ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۲۹	طلیبہ محسن	۳۰	دس روپے
۱۱	ہمدرد	"ہمدرد منزل" لال کنواں، دہلی	حکیم عبدالحمید دہلوی	۸	۲=۵۰
۱۱	ہمدرد بلیٹن (اردو، ہندی)	ہمدرد دواخانہ، لال کنواں، دہلی	" عبدالمعید دہلوی	۸	" "
		دہ روزہ			
۱۲	دورِ حیات	پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۳	قیصر، مظہر حسین	۲۴	دس روپے
		ہفت روزہ			
۱	آندھرا پنچ	اوپل کلاں۔ حیدرآباد ۱۳	ملک محمد علی خاں	۴	۔
۱	الکرار	اندرون دبیرپورہ۔ حیدرآباد ۲۴	نجم آفندی	۸	۔
۱۱	امریکن رپورٹر (انگریزی)	بہاولپور ہاؤس۔ سکندر روڈ۔ نئی دہلی	ڈونالڈ آر، بنومن	۸	ایک روپیہ
۱	امریکن رپورٹر (تلگو)	" "	۔	۸	" "
۱	ایشیا	اردو بازار، دہلی	میر مشتاق احمد	۱۲	نو روپے
۱	پاک جمہوریت	پاکستان پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۳۴۵ لاہور	حبیب اللہ اوج	۱۲	۳ روپے
۱	پرچم ہند	جامع مسجد، دہلی	انیس الرحمٰن	۲۴	۱۲ روپے
۱	پیام اسلام	فیض آباد، لکھنؤ (یو، پی)	مرزا حیدر حسن	۸	۶ روپے
۱	ترجمانِ سرحد	پشاور (مشرقی پاکستان)	امیر عالم اعوان	۸	۶ روپے
۱	خبرنامہ (اردو)	پریس بیورو، عرب ری پبلک۔ سفارت گھر، نئی دہلی	۔	۸	۔
۔	ذوالقرنین	نظامی پریس۔ بدایون (یو، پی)	احمد الدین نظامی	۴	۴ روپے
۱	سرکار	۴۔ حاجی شیخ حسین اسٹریٹ، رائی پیٹھ مدراس ۱۴	بیگم خورشید حسن	۴	۹ روپے
۱	صادق	۵-۱۳۔ اسپیشل بی کلاس۔ آغا پورہ حیدرآباد	ابو سعید فاضل	۴	۹ روپے
۱	طاہر	بنگل روڈ۔ کراچی (پاکستان)	طاہر حسین	۲۴	۹ روپے

۱۳۵	محبوب حق	جامعۂ رضویہ۔ لائل پور (پاکستان)	احسان الحق قادری	۱۴	۸ رو
۱۳۶	مورچہ	بیراگی۔ گیا (بہار)	کلام حیدری	۱۲	۷ رو.
۱۳۷	نیا یگ	قرول باغ۔ نئی دہلی	سودیش کمار	۱۲	۶ ر
۱۳۸	ہماری زبان	انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڈھ (یو، پی)	پروفیسر آل احمد سرور	۱۲	۳ ر
		دو روزہ			
۱۳۹	آج کا امریکہ	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس سکندرا روڈ نئی دہلی	.	۸	بلاقیمت
۱۴۰	خبریں اور سائنس	پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند۔ دہلی	ناظم اطلاعات	۱۲	ر
۱۴۱	پریس ریلیز اردو	روسی سفارت خانہ پوسٹ بکس ۲۴۱ نئی دہلی	.	۸	۴ ر
۱۴۲	سائنس امن کے میدان میں	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس سکندرا روڈ نئی دہلی	.	۶	
۱۴۳	سوویت یونین کی خبریں	۲۵۔ بارہ کھمبا روڈ۔ پوسٹ بکس ۲۴۱ نئی دہلی	.	۸	
		روزنامے			
۱۴۴	اسٹیٹس مین (انگریزی)	کناٹ سرکس، نئی دہلی	الفرڈ ایون چارلٹن	۱۲	چونی
۱۴۵	خدمت	دی بنڈ۔ سری نگر (کشمیر)	یل، ین، وتل	۴	
۱۴۶	رہنمائے دکن	افضل گنج۔ حیدرآباد دکن (اے، پی)	محمد منظور حسن	۸	چھپنہ
۱۴۷	سندیش	ریذیڈنسی روڈ۔ جموں (کشمیر)	نذیر حسن سمنانی	۴	
۱۴۸	سیاست	جواہر لال روڈ۔ حیدرآباد دکن (اے، پی)	میر عابد علی خاں	۱۰	چھپنہ
۱۴۹	ملاپ	مکرم جاہی روڈ۔ حیدرآباد دکن (اے، پی)	یدھ ویر	۸	چھپنہ

اُردو امتحانات ۱۹۶۳ء میں

بابتہ ماہِ جون

حسب سال گذشتہ ۱۹۶۳ء میں دو مرتبہ اردو امتحانات لئے گئے۔ اس سال بلدہ کے علاوہ اضلاع کے مراکز میں صرف محبوب نگر کو امتحانات کا مرکز قرار دیا گیا۔

محبوب نگر پر وقار خلیل صاحب اہلکار ادارہ سنٹرل جیل پر محمد جمال الدین صاحب منتظم ادارہ جونیر سرٹیفائیڈ اسکول جناب محمد منظور احمد صاحب اور مرکز بلدہ پر خود معتمد شعبۂ امتحانات نے صدر نگران کے فرائض انجام دیئے۔ زنانہ مرکز بلدہ کی صدر نگران امت الرشید صاحبہ تھیں۔

اس مرتبہ حسب تفصیل ذیل امیدوار شریک امتحان ہوئے اور کامیابی حاصل کی۔

زباندانی مرکز بلدہ اُردو دانی (۳) شریک (۱) کامیاب
" " " محبوب نگر (۵) " (۳) "
اردو عالم " " مرکز بلدہ (۱۳) " (۶) "
" " محبوب نگر (۲۵) " (۱۸) کامیاب

نتائج اردو امتحانات ادارہ ادبیات اردو منعقدہ جون سنہ ۱۹۶۳ء

حافظ اول نمبر ۴۔ سید عبدالقدیر سوم ۱۔ سید شاہ شجاع الدین حسینی قادری دوم مرکز محبوب نگر
مرکز بلدہ ۵۔ عطار سید سلطان سوم ۲۔ میر یوسف علی دوم ۱۱۔ محمد انعام اللہ سوم
امتحان اردو زباندانی ———— ۳۔ محمودہ فاطمہ دوم ۱۲۔ محمد اکرام اللہ دوم
نیر اقبال کامیاب بدرجہ اول امتحان اردو عالم ۴۔ محمد حسین سوم ۱۳۔ محمد عبدالرحیم دوم
مرکز محبوب نگر مرکز بلدہ ذکور و اناث ۵۔ رحمت جہاں دوم ۱۴۔ خواجہ معین الدین سوم
محمد جہانگیر سوم بلحاظ اول نمبر ۳۷۔ محمد ظفر احمد سوم ۱۵۔ محمد بشیر الدین دوم

سب کمیٹی — ۵۰ — سکریٹری

۱۸- محمد [illegible] الدین مرزا دوم	۲۳- محمد عبدالرحیم سوم	۲۹- محمد مسعود احمد سوم	۳۶- سید یوسف الدین
۱۹- حافظ [illegible] علی دوم	۲۵- عبد الغنی سوم	۳۰- چاند عبدالقادر سوم	معتمد
۲۱- محمد صدیق دوم	۲۶- سید بدیع الدین قادری دوم	۳۳- محمد مشتاق حسین خان مشتاق سوم	شعبۂ اردو امتحانات
۲۲- محمد حسین سوم	۲۸- محمد سلیمان دوم	۳۴- اسد المصطفیٰ سوم	

امتحانات بابتہ ڈسمبر ۱۹۶۳ء

شعبۂ اردو امتحانات کی مساعی گذشتہ کی بہ نسبت اس مرتبہ زیادہ امید افزا ثابت ہوئیں بلدہ کے علاوہ، جیل آندھرا پردیش جونیر سرٹیفکیٹ اسکول چنچل گوڑہ اور اضلاع میں نیرمل و محبوب نگر بھی امتحانات کے مرکز محبوب نگر پر جناب ابراہیم صاحب بی اے بی ٹی نیرمل پر مولوی ابو سعد صاحب سید چنچل گوڑہ پر محمد منظور احمد صاحب ایم اے معتمد اردو مجلس حیدرآباد سنٹرل جیل پر محمد جمال الدین صاحب منتظم ادارۂ ادبیات اردو مرکز پر خود معتمد شعبۂ امتحانات نے اور زنانہ مرکز بلدہ پر امت الرشید قدس النساء دختر محمد جمال الدین صاحب نے صدر نگراں کے فرائض انجام دیئے۔ عالیجناب پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب نائب صدر ادارہ نے از راہ علم نوازی سنٹرل اسکول کے مراکز کے علاوہ مرکز بلدہ کا بھی معاینہ فرمایا۔ سنٹرل اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب گنیش پرشاد صاحب نے قیدیوں کو اچھی تربیت دینے کے تعلق سے نائب صدر صاحب کو واقف کرایا۔ اسی طرح زیر تربیت قیدی بچوں کو تعلیم جو فنی تربیت دی جارہی ہے اس کی اسکول کے صدر مدرس شری ونکٹیشم صاحب نے تفصیلات بتائیں نیز ہر دو اسکے صاحبان نے بھی ملاقات کی۔ اور ادارہ اردو پڑھنے والے قیدیوں کو سہولت جو رعایت و تعلیمی سہولت شکریہ ادا کیا۔

توقع ہے کہ آئندہ سال کافی تعداد میں لوگ اردو امتحانات میں شرکت کریں گے۔

ڈسمبر ۱۹۶۳ء کے نتائج حسب ذیل ہیں۔

امتحان	شریک	کامیاب
اردو دانی	۶۳	۳۵
اردو زباندانی	۳۵	۲۵
" عالم	۵۷	۲۸
" فاضل	۷	۵

نتائج امتحانات اردو ادارۂ ادبیات اردو منعقدہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء

تحان اردو دانی
ل نمبر
محمد اقبال حسین مرکز محبوب نگر اول
الو حسین مرکز نہرل دوم
یت علی مرکز نہرل سوم
یاب بہ امتیاز ——
سنٹرل جیل
رسا ریڈی مرکز نہرل
محی الدین
جونیئر سرٹیفکیٹ اسکول
محمد احمد
میر امتیاز علی
محبوب نگر ——
محمد اقبال حسین
میاب ——
سنٹرل جیل
ایریا
پٹی رالو
کرشنا ریڈی
ویریا
مرکز نہرل ——
زین العابدین القادری
فریدہ بیگم

۱۲- نور جہاں بیگم
مرکز جونیئر سرٹیفکیٹ اسکول
۱۴- سراج احمد
۱۵- چاند خاں
۱۶- حبیب اللہ
۱۸- سید معین
۲۰- سید شرف الدین
۲۲- پاشا
۲۵- اصغر علی
۲۶- فقیر محمد
۲۷- محمد یوسف
۲۹- ملک محمد
۳۱- محمد اسمٰعیل
مرکز محبوب نگر ——
۳۲- سید جہانگیر
۳۳- عبدالنعیم
۳۴- محمد عمر
۳۵- سیدہ نعیم النساء
۳۶- عابد حسین
۳۸- محمد یوسف
۴۰- محمد افضل حسین
۴۱- محمد عبدالقادر
۴۲- محمد عبدالرزاق

۳۵- میر رحمت علی

امتحان اردو زباندانی
۱۸- تہنیت شہزادی مرکز نہرل اول
۱۷- نرسنگا ریڈی مرکز سنٹرل جیل دوم
۱۵- فتح محمد خاں مرکز سنٹرل جیل سوم
بلحاظ رول نمبر
مرکز سنٹرل جیل
۱- شیخ محمد سوم
۲- محمد یوسف سوم
۳- سید مسعود حسین سوم
۵- ملک احمد علی خاں سوم
۶- حسن بن مبارک سوم
۸- محمد جہانگیر دوم
۱۰- محمد الیاس سوم
۱۳- شیخ عمر دوم
۱۴- محمد معین الدین دوم
۱۵- فتح محمد خاں دوم
۱۶- احمد بن سعید سوم
۱۷- نرسنگا ریڈی دوم
مرکز نہرل ——
۱۸- تہنیت شہزادی دوم
۱۹- عائشہ شہزادی دوم

مرکز جونیئر سرٹیفکیٹ اسکول
۲۰- احمد جانی دوم
۲۲- محمد میراں سوم
۲۳- سید اکبر سوم
۲۴- شیخ حسین دوم
۲۷- محمد عبدالحفیظ دوم
۳۱- محمد نصیر الدین دوم
مرکز محبوب نگر ——
۳۲- محمد عبدالحسین سوم
۳۳- محمد واحد علی سوم
۳۵- سید فیاض الدین سوم
۳۶- سیدہ نعیم النساء دوم
۳۷- سید یوسف سوم

امتحان اردو عالم مرکز بیدر
۵- [illegible] مرکز بیدر اول
۸- عبدالرزاق مرکز بیدر دوم
۳۴- سعیدالنساء بیگم سوم
بلحاظ رول نمبر
مرکز بیدر ——
۱- عائشہ بیگم سوم
۵- سید محمد پاشا قادری دوم
۸- محمد عبدالرزاق صدیقی اول

بقیہ بر صفحہ ۳۱

تنقیح شدہ حسابات آمد و خرچ سالانہ ادارۂ ادبیات اردو

آمد	روپے	پیسے	روپے	پیسے
سلک افتتاحی اور بنک کی رقمیں				
۱۔ نقد	۴۱۹	۶۷		
۲۔ کرنٹ اکونٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد	۸۲۳	۹۱		
۳۔ اسپیشل سیونگ بنک کنرا بنک لمیٹیڈ				
۱۔ اکونٹ ادارہ ۱۳۶-۹۱				
۲۔ " سب رس ۸۷۲-۴۶	۱,۰۰۹	۵۵	۲,۲۷۳	۱۳
گلگشن اکونٹ (یہ جی رگھو ناتھ مل بنک جو کنرا بنک لمیٹیڈ میں ضم ہوگئی۔ (ادارہ اس رقم کو حاصل نہیں کر سکتا			۲۲۶	۹۷
فکسڈ ڈپازٹ در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد			۵,۰۰۰	-
آمد از مطبوعات			۳,۲۵۸	۸۸
آمد سب رس (ماہنامہ)			۷۰۴	۰۷
آمد کار باغ			۱۰۷	۱۴
امداد ہائے سرکاری				
حکومت ہند	۵,۰۰۰	۰۰		
حکومت آندھرا پردیش	۶,۰۰۰	۰۰		
حکومت جموں اینڈ کشمیر	۵,۰۰۰	۰۰	۱۶,۰۰۰	۰۰
عطیات و چندے				
۱۔ حکومت آندھرا پردیش برائے یوم محمد قلی قطب شاہ	۵۰۰	۰۰		
۲۔ دیگر عطیے اور چندے	۲,۰۱۵	۶۵		
۳۔ برائے ظفر ڈے	۲۷۲	۵۰	۲,۸۸۸	۲۵
قرضے جو عملے سے وصول کیے گئے۔	...	..	۱۱۴	۹۲
جرمانے جو عملہ پر عائد کیے گئے	...	..	۴۳	۶۲
منافع بابتہ سیونگ بنک اکونٹ کنرا بنک	...	..	۲۴	۶۲
" فکسڈ ڈپازٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد	...	..	۲۰۰	۰۰
اڈوانس رقوم جو اسٹاف سے وصول کی گئیں۔	...	...	۳۷	۰۰
متفرق	...	..	۷۶	۶۵
آمد فیس اردو امتحانات	...	..	۱۵۳	۶۸
آمد بابتہ قرضہ جات	...	..	۸۸۰	۷۳
	صدر میزان		۳۱,۹۸۷	۲۳

شرح دستخط
۹,

ایس، جی، دستگیر اینڈ کو
چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس (آڈیٹرز)

[illegible] ۱۹۷۲ء

خرچ	روپے	پیسے	روپے	[illegible]
خرچ مطبوعات	...	..	۱,۹۹۳	۶
معاوضہ مصنفین			۸,۳۵۰	۰
اخراجات ماہ نامہ سب رس			۱,۶۶۵	۳
کارب باغ			۶۹	۰
کتب خانہ				
خریدی کتب	۲۸۵	۱۲		
جلد بندی کتب ورسائل	۱۲۱	۵۰		
صادر و متفرق اخراجات	۱۲۴	۷۱		
تنخواہ والونس عملہ کتب خانہ	۸۲۰	۰۰	۱,۳۵۱	۱
حفاظت آثار قدیمہ	...	..	۳۰	
اخراجات میوزیم	...	..	۶۰	
تعمیر و ترمیم عمارت	...	..	۶۲۴	
کلچرل مصروفیات				
علمی و ادبی پروگرام	۱۰۴	۸۳		
اخراجات "یوم محمد قلی قطب شاہ"	۱۹۵	۹۷		
" "ظفر ڈے"	۱۳۹	۱۵	۴۳۹	
اخراجات دفتر				
تنخواہ عملۂ دفتر	۳,۹۱۸	۲۸		
ٹیلیفون، بجلی، پانی	۸۲۴	۸۶		
صادر و طباعت	۹۷	۱۶		
اخراجات ڈاک	۱۴۲	۳۱		
اخراجات آمد و رفت برائے شریک معتمد ادارہ	۹۰۰	۰۰		
سفر خرچ معتمد صاحب عمومی ادارہ	۲۷۶	۱۰	۶,۱۵۸	
اخراجات اردو امتحانات ادارہ	...	..	۱۵۹	
معاوضہ تنقیح حسابات ادارہ	...	..	۱۰۰	
متفرق اخراجات	...	..	۳۸	
بنک کمیشن			۷	
جرمانے جو معاف کئے گئے۔			۹	
کھاتہ قرضہ جات			۱,۱۸۰	
قرضے جو عملہ کو دیئے گئے			۷۵	
اڈوانس رقوم جو وصول ہوئے۔			۳۷	
فکسڈ ڈپازٹ جو حیدرآباد اسٹیٹ بنک میں جمع کیا گیا۔			۵,۲۰۰	
کلکشن اکونٹ (دی رگھوناتھ دل بنک) جو کنرا بنک میں ضم ہو گئی۔ (ادارہ اس رقم کو حاصل نہیں کر سکتا)			۲۰۴	
سلک اختتامی نقد اور بنک کی رقمیں				
نقد	۸۴۷	۹۳		
اسپیشل سیونگس بنک اکونٹ کنرا بنک لمیٹیڈ	۹,۳۲۸	۵۰		
۱- ادارہ اکونٹ ۱۴۴۰۵۳		.	۲۲ [illegible]	

ادارۂ ادبیات اردو کے صدر، نائب صدر، کارکن مجلسیں و شعبے

—: (ایوانِ اردو بیک نظر) :—

۱۵ ؍ جنوری ۱۹۳۱ء ادارۂ ادبیات اردو قائم ہوا
۸ ؍ جنوری ۱۹۴۱ء فراہمی زمین و عمارت کیلئے جدوجہد شروع کی گئی۔ ۳۰ ؍ جنوری ۱۹۴۲ء حضرت خواجہ حسن نظامی نے عمارت کا نام "ایوانِ اردو" تجویز فرمایا۔
۲۷ ؍ جنوری ۱۹۵۵ء ادارہ کی سلور جوبلی منائی گئی۔
۱۵ ؍ اپریل ۱۹۵۵ء مجلس انتظامی نے محترمہ تہنیت بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور سے عمارت کیلئے زمین عطا کرنے کی خواہش کی
۴ ؍ اکتوبر ۱۹۵۵ء بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور نے اس قطعہ زمین کی ادارہ کے نام بطور عطیہ رجسٹری کرادی۔
۲۵ ؍ اکتوبر ۱۹۵۵ء بہزاد دکن فیاض الدین نظامی۔ چیف ٹاؤن پلانرز نے نقشہ مکمل کیا۔

۶ ؍ نومبر ۱۹۵۵ء حیدرآباد کے چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے سنگ بنیاد رکھا۔ حکومتہائے ہند، کشمیر، آندھرا پردیش کے علاوہ حضور نظام کے چیریٹی ٹرسٹ، سالار جنگ اسٹیٹ، نظام شوگر فیکٹری، سنگارینی کالیریز اور عوامی عطیوں اور چندوں سے تقریباً پانچ سال کی مدت میں سوا لاکھ روپیوں کے صرفے سے اسکی تعمیر مکمل ہوئی۔ ۱۲ ؍ مارچ ۱۹۶۰ء جناب بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر نے اس ایوان کا افتتاح فرمایا اور جناب بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش نے افتتاحی جلسہ کی صدارت فرمائی۔

۱۔ ادارے کے صد[ر]

نواب سر مہدی یار جنگ بہادر ۱۹۳[...]
نواب لیاقت جنگ بہادر ۔ ۱۹۴۷ء تا [...]
نواب زین یار جنگ بہادر ۔ ۱۹۵۸ء [...]
پروفیسر سید علی اکبر ۱۹۶۱ء

۲۔ ادارے کے معتمد

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۱۹۳۱ [...]
ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ ۱۲ [...]

۳۔ نائب صدور

نواب لیاقت جنگ بہادر
۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء
نواب زین یار جنگ بہادر
۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء
پروفیسر سید علی اکبر
۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۱ء
پروفیسر عبدالمجید صدیقی ۱۹۵۸ء
جناب سید دلدار حسین صاحب ۱۹۶۱ء
رائے جانکی پرشاد صاحب ۱۹۶۲ء

۴۔ مجلس انتظامی

صدر :- پروفیسر سید علی اکبر
نائب صدر :- پروفیسر عبدالمجید صدیقی
" " رائے جانکی پرشاد صاحب
اراکین ۔ شری ایل ، این گپتا (آئی اے ایس)
جناب حامد علی عباسی صاحب " "
" سید دلدار حسین صاحب انجنیئر
" محمد اکبر الدین صدیقی
" نصیر الدین ہاشمی صاحب
معتمد - ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ

۵۔ مجلس اشاعت تاریخ و تمدن

صدر :- پروفیسر عبدالمجید صد[یقی]
اراکین :- نواب عنایت جنگ
ڈاکٹر مہندر راج سک[سینہ]
جناب آغا حیدر حسن صاحب [...]
" نصیر الدین ہاشمی
" نواب عباس حسین
" چراغ علی
معتمد :- میر سراج [الدین] علی خاں۔

...س تعلیم بالغان و اردو امتحانات	۷۔ مجلس انتظامی سب رس	۸۔ مجلس نشر و اشاعت
۔۔ پروفیسر سید علی اکبر	نگران۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب	صدر۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔
...نہ۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب	اراکین۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی
مولوی غلام رسول صاحب	مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب	پروفیسر ایم، اے، رحمن
جناب سرنیواس لاہوتی صاحب	" محمد منظور احمد صاحب	جناب میر عابد علیخاں صاحب ایڈیٹر سیاست
جناب کنول پرشاد کنول	جناب رمن راج سکسینہ صاحب	" میر سراج الدین علیخاں صاحب
جناب محمد منظور احمد صاحب	" وقار خلیل صاحب	" وقار خلیل صاحب
" محمد اکبر الدین صاحب صدیقی	معتمد۔ محمد اکبر الدین صدیقی۔	" محمد منظور احمد صاحب
...۔ جناب عارف الدین حسن صاحب		معتمد۔ پروفیسر محمد محمود حسین
مجلس انتظامی کتب خانہ	**۱۰۔ مجلس ادب اطفال**	**۱۱۔ مجلس انتظامی اردو انسائیکلوپیڈیا**
...ن۔ نواب عنایت جنگ بہادر	صدر۔ شری پی ہنمنت راؤ (ایم، پی)	صدر۔ پروفیسر سید علی اکبر
پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی	ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی	" " عبدالمجید صدیقی
ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ	جناب دھریندر پرشاد صاحب	ڈاکٹر محمد محسن محشر عابدی صاحب
جناب خواجہ محمد احمد صاحب	" مرزا سرفراز علی بیگ صاحب	جناب خواجہ یوسف الدین صاحب
" نصیر الدین صاحب ہاشمی	" مراد علی صاحب طالع	رائے جانکی پرشاد صاحب
" مولوی غلام رسول صاحب	" وقار خلیل صاحب	جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب
...ستمد۔ محمد اکبر الدین صدیقی	" محمد منظور احمد صاحب	ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب
	معتمد۔ ڈاکٹر محمد مصلح الدین صدیقی	معتمد۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ
عملہ	جناب محمد جمال الدین صاحب منتظم ادارہ	جناب میر زاہد علیخاں صاحب مہتمم گودام
...ت ادارۂ ادبیات اردو	" رئیس الدین انصاری صاحب لائبریرین	" محمد عبداللہ صاحب کارپرداز
	" وقار خلیل صاحب اہلکار	" محمد نذیر الدین صاحب چوکیدار

سنہ ۱۹۶۳ء میں ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات

نمبر	نام کتاب	مرتب یا مصنف	موضوع	صفحات	سائز	قـ
۱	ادارہ سنہ ۶۲ء میں	کارکنانِ ادارہ	تذکرہ	۸۰	½ کراؤن	۵
۲	کیف و کم	یوسف ناظم	طنز و مزاح		1/16 کراؤن	دو
۳	ادبی تحریریں	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	ادب و تحقیق	"	"	"
۴	ڈاکٹر زورؔ کے مضامین کا کلام فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارہ جلد سوم	محمد اکبر الدین صدیقی	تذکرہ	۱۸۲	⅛	" ... دو
۵	ظفر نمبر	ادارہ سب رس	"		"	" ۳
۶	یادگار زورؔ	"	"		"	" چ
۷	مرقع زورؔ	"	مرقع	۱۶	"	" ا
۸	سب رس زورؔ نمبر	"	تذکرہ		"	" ؟
۹	سب رس ادارہ نمبر	"		۸۰	"	" ۵
۱۰	قواعد اردو امتحانات ادارہ	مجلس امتحانات	نصاب	۱۶	"	" ۱۰

—:(زیر طبع کتابیں):—

نمبر	نام کتاب	مرتب یا مصنف	موضوع	صفحات	سائز	قـ
۱	تاریخ گولکنڈہ طبع دوم	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	تاریخ	۴۵۰	1/16 کراؤن	ز
۲	یاد معانی (محمد قلی قطب شاہ)	ادارۂ سب رس	تذکرہ	۹۴	⅛ کراؤن	ا
۳	مآثر نظامی (لالہ منسا رام)	سید محی الدین	تاریخ	-	-	
۴	مکتوب سلاطین قطب شاہیہ بنام شاہان صفویہ ایران	سید عباس حسین خاں	"	-	⅛ رائل	زیر
۵	تذکرہ نوادر ایوان اردو (جلد دوم)	میر سراج الدین علیخاں	تذکرہ	-	-	
۶	برف میں آگ	حامدی کاشمیری	افسانے	-	-	

فہرست کتب اور دیگر معلومات کے لیے لکھیے:۔ سب رس کتاب گھر ایوان اردو خیریت آباد۔ حیدرآباد۔ ۴

ایجنسٹ:۔

۱۔ رائٹرس ایمپوریم پرائیویٹ لمیٹڈ۔ ۳ فیروز شاہ مہتا روڈ بمبئی ۱

دہلی ــــ لکھنؤ ــــ سری نگر ــــ الہ آباد ــــ کلکتہ اور حیدرآ[باد]

تاجرانِ کتب سے بھی ادارہ کی تمام مطبوعات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

اِدارے کی مطبوعات

معاصرین کی نظر میں

۱۹۶۳ء میں ادارہ کی مختلف تازہ مطبوعات پر ہند و پاکستان کے رسائل و جرائد میں جو تبصرے شائع ہوئے ان کے اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے پتہ چلے گا کہ ادارہ کی مطبوعات اردو دنیا میں کس نظر سے دیکھی جارہی ہیں۔ ابتک ادارۂ ادبیات اردو مختلف علمی، ادبی اور تحقیقی موضوعات پر مشتمل (۲۹۴) کتابیں شائع کرچکا ہے۔ (ادارہ)

تحفۃ الشعراء

مرتبہ:۔ (ڈاکٹر حفیظ قتیل)

"تحفۃ الشعراء" بارہویں صدی کے نصف آخر کے ابتدار کی تصنیف ہے جو اپنی قدامت کے سبب سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں ہندوستان کے شعرا کا ذکر ہے جن میں بعض فارسی کے شاعر ہیں اور بعض اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ کتاب کا م مرزا مظہر جان جاناں کے تذکرے پر ہوا ہے۔ ادارۂ ادبیات قابل تحسین ہے کہ اس کے ذریعہ ایک نادر ادبی تحفہ اہل علم تک پہنچ میں شعرا کے بارے میں بعض نئی معلومات اور رائیں ملتی ہیں جس سے افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے (ماہنامہ معارف اعظم گڈھ بابتہ ۱۹۶۳ء)

رسم الخط

(از:۔ غلام رسول)

اردو زبان کا رسم الخط اعراب سے معرا ہے اس کے تحفظ اور لکھاوٹ میں قدرے دقت پیش آتی ہے، لئے اس میں کچھ اصلاحات کی ضرورت ہے تاکہ اجنبی سے اجنبی آدمی سے آسانی سے پڑھ لکھ سکے اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے گئے ہیں انہی میں مولوی غلام رسول صاحب کا مضمون بھی ہے جو پہلے "ہماری زبان" میں شائع ہوا تھا اور اب ادارۂ ادبیات اردو نے کتابی شکل میں شائع کردیا ہے اس میں بڑی مفید اصلاحات کی طرف راہنمائی کی گئی ہے (ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ بابتہ جون ۱۹۶۳ء)

نیل کنول مسکائے

(از محمود حسین بدخشی)

ڈاکٹر زور مرحوم نے کشمیر میں اپنے مختصر قیام کے دوران یہاں کے نوجوان اردو مصنفین کی کتابوں کو چھپانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ زیر نظر مجموعہ ان ہی کے اہتمام سے ادارے کے "شعبۂ مطبوعات کشمیر" کے سلسلے کی پہلی کڑی کے طور پر شائع ہوا اور اس طرح سے یہ محمود حسین بدخشی صاحب کے افسانوں کا پہلا مطبوعہ مجموعہ ہے۔

محمود منظر نگاری کا فن جانتے ہیں اور ان کے قلم میں روانی بھی ہے ان افسانوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس شخص میں افسانہ نگاری کی خصوصیات موجود ہیں (اقتباس)

(دو ماہی "شیرازہ" سری نگر بابتہ مئی ۱۹۶۳ء)

ٹھنڈی بجلیاں

(از بھارت چند کھنہ) ٹھنڈی بجلیاں ممتاز مزاح نگار بھارت چند کھنہ کے

…یہ اور طنزیہ مضامین پر مشتمل ہے ۔ ان مضامین میں تحریر کی سادگی اور پرکاری ، انداز بیاں کی دل کشی اور طنز و مزاح کی شگفتگی قدم قدم پر متاثر کرتی اور قاری کو مضمون نگار کی دانشورانہ صلاحیتوں کا معترف بناتی ہیں ۔ مضامین کے موضوعات عام طور پر وہی ہیں جو ہماری روزمرہ زندگی کا لوازمہ ہوتے ہیں لیکن مضمون نگار کی بے پناہ قوتِ مشاہدہ اور اپنے مشاہدات و تجربات کو ضبط تحریر میں لانے کے منفرد انداز بیاں نے انہیں ایک نئی دلکشی اور رعنائی عطا کی ہے اس کتاب پر ڈاکٹر زورؔ نے پیش لفظ لکھا ہے اور کھنہ صاحب کی ادبی صلاحیتوں پر اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے ۔

(روزنامہ "ملاپ" حیدرآباد ۹ اپریل ۱۹۶۳ء)

ادبی تحریریں

مرتبہ :۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

"ادبی تحریریں" ڈاکٹر زورؔ مرحوم کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے انتقال سے ڈیڑھ سال پہلے لکھے تھے جیسا کہ سب جانتے ہیں ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری ایام بڑی مصروفیت میں گزارے تھے ، ان کی توجہ بھی بڑی حد تک حیدرآباد اور کشمیر کے درمیان بٹ چکی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب نے کشمیری زبان و ادب کے بارے میں ابتدائی تحقیقی کام آغاز کر دیا تھا اور اس سلسلے میں ان کے دو ایک مضامین بھی شائع ہوئے تھے لیکن افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی اور یہ آغاز کسی فیصلہ کن انجام تک نہیں پہنچ سکا ۔ اس پس منظر میں اس مجموعہ کا جائزہ لیجئے ۔ تو اس میں دو مضامین "کشمیری اور اُردو" اور "اُردو ، سندی اور پنجابی" ایسے نظر آئیں گے جنھیں ڈاکٹر صاحب نے بڑی تحقیقی کاوش اور محنت سے لکھا تھا ۔ خصوصاً "اردو ، ہندی اور پنجابی" کے موضوع پر ان کا مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے جس میں کئی نزاعی امور پر ڈاکٹر صاحب نے کافی سیر حاصل بحث کی ہے

اور ان تینوں زبانوں کے باہمی تعلق کو سمجھانے … نہایت ٹھوس دلیلیں پیش کی ہیں ۔

دکنی ادب میں ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے … وہ خود تاریخ ادب اُردو کے لئے ایک مستقل … رکھتا ہے ۔ اس مجموعہ میں دو مضامین "ہندوستان کی نظر میں" "گلے برفت" کے عنوان سے اس مجموعہ … گوپی چند نارنگ نے ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت پر … لکھا ہے ۔ جسے پڑھ کر ڈاکٹر صاحب کی شخصیت … مددملتی ہے ۔ ڈاکٹر نارنگ کا مقدمہ ڈاکٹر زورؔ … میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے ۔ (…

(روزنامہ "سیاست" حیدرآباد …

ادبی تحریریں

"ادبی تحریریں" ڈاکٹر زورؔ مرحوم … مشتمل ہے ان میں زیادہ تر تحریریں وہی ہیں … زندگی کے آخری سال ، ڈیڑھ سال میں لکھی تھیں … ان مضامین کی اہمیت محتاج وضاحت نہیں … تین مختصر مگر جامع دیباچے بھی شامل ہیں … کھنہ ، بانو طاہرہ سعید اور مخمور حسین بدخشی کی … ہیں ۔ "کشمیری اُردو" اور "اُردو ، ہندی اور پنجابی" … دوگراں قدر مضامین ہیں ۔

"ادبی تحریریں" کا پیش لفظ جو ا… ماہر لسانیات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے لکھا … اس مجموعہ کی ترتیب و اشاعت کا کام نارنگ … تھا اور انھوں نے نہ صرف اس کام کی بحسن و …

پیش لفظ میں زور صاحب کی علمی، ادبی، سماجی اور
ان کے مختلف پہلوؤں کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے
آخر میں ڈاکٹر زور کی ۵۸ تصانیف اور تالیفات کی
فہرست بھی دی گئی ہے۔ جو ریسرچ اسکالروں کے لئے
نما کا کام انجام دے سکتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر
صاحب کی آخری تحریروں کے اس گراں مایہ مجموعہ کو علمی و ادبی
حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا اور پڑھا جائے گا
(روزنامہ "ملاپ" حیدرآباد ۱۹ نومبر ۱۹۶۳ء)

باتحریر

پروفیسر محی الدین قادری زور مرحوم کے مضامین کا مجموعہ
... مضامین پر مشتمل ہے جس میں پانچ کشمیر کے متعلق مضامین بھی
... زور صاحب کے انتقال کے بعد ان کی یہ پہلی تصنیف ہے
مرتب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے خود مقدمہ میں اعتراف کیا
مضامین تحقیقی و تنقیدی شاہکار نہیں۔ اردو کے ایک اہم
... اور ایک ادیب کی آخری یادگار تحریریں ہیں۔
زور صاحب نے اپنی زندگی اردو زبان اور ادب کو سنوارنے
صحرا نوردی میں گزار دی۔ جب وہ کشمیر تشریف لے گئے
... نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے
... نہ کچھ مصروفیتیں نکال لیں اور تحقیق و تجسس کی پیاس
... ہے۔ ماحول کی مناسبت سے آپ نے کشمیری زبان اور
... کشمیر میں اردو کا موقف اور ایسے ہی تمام مسائل
... جائزہ لیا۔ کشمیر پہنچتے ہی آپ نے وہاں کے علمی و
... سے قرب حاصل کر لیا۔ اور حسب عادت کئی ادبی
... بالخصوص نوجوانوں کی سرپرستی فرمانے لگے۔ ان کی یہی

اردو کے لئے فضا ساز گار کرنے اور کل ہند سطح پر اردو کی
ترقی و ترویج کے لئے اپنا پورا پورا رسوخ استعمال کیا۔
دو سال کے مختصر قیام کے دوران میں ہی کشمیر سے
گھل مل جانے کا ثبوت مجموعہ میں شائع شدہ تعارفی مضامین رسا
جاودانی اور محمد حسین بدخشی ہیں۔ "کشمیری اور اردو" میں ڈاکٹر صاحب نے
کشمیر میں اردو کے ماخذ اور موقف کا جائزہ لیا ہے۔ مضمون "اردو، ہندی
اور پنجابی" لسانی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ زور
صاحب نے اس مضمون میں لسانیات کے نئے نظریوں اور کتابوں کا
جائزہ لینے کے بعد ان پر بعض اعتراضات کئے ہیں۔ زور صاحب نے
اردو کا ماخذ ہندی، پنجابی اور دوسری زبانوں سے اس کے رشتوں
تعلقات پر بحث کرنے کا ایک قیمتی مشورہ دیا ہے جو غور طلب ہے۔
(ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد بابتہ نومبر ۱۹۶۳ء)

حرف شیریں

قاضی غلام محمد کی مزاحیہ اور سنجیدہ شاعری کا مختصر
مجموعہ مطبوعہ ادارہ ادبیات اردو جس میں قاضی صاحب کی شاعری
کے متعلق دو مقالے بھی شامل ہیں۔ پہلا مقالہ کشمیر یونیورسٹی میں
انگریزی کے پروفیسر ڈاکٹر ایس بی سوناتھ کا ہے اور دوسرا ڈاکٹر
زور مرحوم کا۔

"حرف شیریں" میں قاضی صاحب نے خیال سے خیال
اور بات سے بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بہت
کامیاب ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کے بعد سے اردو
شاعری میں صحیح معنوں میں مزاحیہ شاعر آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔
کچھ شاعر ضرور ہوئے ہیں لیکن انہیں اردو کا شاعر نہیں کہا جا سکتا
بلکہ یہ اردو کی مختلف بولیوں کے شاعر ہیں اور ان کا حلقہ مقامی

بہت ... کم ہے۔ قاضی غلام محمد اردو کے بہترین مزاحیہ
شاعروں میں ... شاعری میں اکبر الہ آبادی کے بعد سب سے زیادہ اہل
محسوس ہوتے ہیں ... کے ہاں طنز کا عنصر زیادہ تھا مگر قاضی صاحب کے ہاں
طنز اور مزاح دونوں عروج پر ہیں۔

نظموں میں "جہانِ عزیز"، "انٹرویو بورڈ"، "مفلسوں کا قومی ترانہ"
"پیرو مرید" اور "پلیس سے آنے والا بتا!" اور "موت" بڑی عمدہ ہیں۔ ان سے
اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کو اپنے موضوعات پر کس قدر بھرپور دسترس ہے

قاضی صاحب کی مزاحیہ شاعری اگر ہمیں بے ساختہ ہنسنے پر
مجبور کرتی ہے تو سنجیدہ شاعری رونے پر مجبور کرتی ہے۔ قاضی صاحب کی
سنجیدہ شاعری ویسی ہی ہے جیسے میر و غالب کی مزاحیہ شاعری
ہو سکتی تھی۔ میرے خیال میں قاضی صاحب کو اپنی تمام تر صلاحیتیں طنز و
مزاح کے لئے وقف کر دینی چاہئیں۔ اگر وہ سنجیدگی کی طرف مائل
ہوتے ہیں تو ہمیں ایک دوسرے اکبر الہ آبادی سے محروم ہو جانا پڑیگا۔

(قیصر منظر حسین)

(ہفت روزہ "دورِ حیات" بمبئی ۱۴ اپریل ۱۹۶۳ء)

حرفِ شیریں

قاضی غلام محمد کا "حرفِ شیریں" مزاحیہ ادب کا تنہا گراں قدر
خزینہ ہے۔ غلام محمد صاحب ریاضیات کے پروفیسر ہیں لیکن مذاقِ
سلیم کے مالک اور بیحد زندہ دل ہیں۔ ان کا مزاج متانت و سنجیدگی
کے باوجود بیحد شگفتہ ہے۔ ہمارے مزاحیہ ادب کی محفل
میں غلام محمد کی آمد "خوش آمدید" کی مستحق ہے۔

(اقتباس مضمون "۶۳ء کے شعری ادب پر ایک نظر" (علی جواد زیدی)

(مطبوعہ سالنامہ جامعہ دہلی)

(مئی، جون ۱۹۶۳ء)

حرفِ شیریں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کا قیام
مختصر رہا۔ مجھ سے پوچھا جائے کہ ان کے اس مختصر قیام
بڑا کارنامہ کیا ہے تو میں بلا کم و کاست کہدوں گا کہ "حرف
اشاعت جس سے اردو کو ایک بڑا مزاحیہ شاعر ملا ہے
تابناک ہے۔ زور صاحب کا یہ حسنِ انتخاب ان کی گو
دال ہے اور اردو کے لئے ان کا تحفۂ شیریں بھی۔ ارد
ان دنوں جس "خشکی" کا دور چھا گیا ہے اس میں اس م
گوہرِ فیساں" کی حیثیت رکھتی ہے۔

قاضی غلام محمد کا کلام بڑا مختصر ہے مگر اس
آخر تک ایک ایسی روانی چھائی ہوئی ہے جو کاوش
کا سراغ نہیں دیتی۔ شعر، ادب، محبت، سیا
زندگی کے ہر ایک شعبے پر نظر ڈالی کہ اس کے یہاں قہ
جنم لیتی ہیں۔ مگر ایک بلند پایہ شاعر کی طرح صرف م
اس کا مقصد نہیں۔ اس کے قہقہوں کے پیچھے ہمار
ناہمواریوں اور ہمارے دور کی ناانصافیوں کی
ہے مگر شاعر کی فنی سرخروئی یہ ہے کہ کہیں پر اس
تبلیغ، غیض یا خشونت کا انداز پیدا نہیں ہوا
بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑی آسانی کے ساتھ قہقہ
بڑی لاابالی سے واقعات کے مضحک پہلوؤں کو

اس مجموعے میں غزلیات کے علاوہ
ملتی ہیں اور سچ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک نظم خاصے کی
یہ مجموعہ ایک مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے ان کے مستقبل
توقعات وابستہ کرنے پر مجبور کرتا ہے گو مقدار کے لحا

ہوتا ہے لیکن معیار کے لحاظ سے یقیناً ایک اہم مجموعہ ہے
ظم بڑی پاکیزہ اور ستھری ہوئی زبان استعمال کرتے ہیں اور ان کی
اح نگاری میں کہیں ابتذال اور عجزِ بیان کے نشانات نہیں ملتے۔
(محمد یوسف ٹینگ " شیرازہ " سری نگر جنوری ۱۹۶۳ء)

کیف و کم

" کیف و کم " یوسف ناظم کے مضامین کا مجموعہ ہے اس
وعہ میں ان کے ستّرہ ۱۷ طنزیہ مزاحیہ مضامین ہیں۔ ہر مضمون
نہ موضوع اور طرزِ تحریر کے اعتبار سے منفرد ہے اور ان کے
العہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی طنز و مزاح نگار کا
اع نہیں کیا بلکہ ان کا اپنا ایک جدا اسلوب ہے۔ البتہ بقول
ش چندر اختصار کے فن میں وہ پطرس کے قریب ہیں اور اپنے
ب کے مزاح کے اعتبار سے رشید احمد صدیقی کے طرفدار نظر آتے
۔ یوسف ناظم نے حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ ان کے کسی مضمون
ئی پیراگراف ایسا نہ ہو جو قاری کو بور ہونے کا موقع دے۔
ہ وہ اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں
قاری کے ذہن کو طنز و مزاح کی چاشنی کچھ اس انداز میں فراہم
ہے جاتے ہیں کہ وہ کہیں اکتانے نہیں پاتا۔

زیرِ نظر مجموعہ کو ترتیب دیتے وقت مصنف نے اس
بھی خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ اس میں ہر ذوق کا مواد موجود ہو
ہ جہاں انھوں نے مرزا غالب کی صحت جسمانی کو ان ہی کے
رستے " تنومندی " بخشی ہے۔ وہاں ضرب الامثال اور محاروں
شتہ " قالب " میں ڈھالا ہے۔ مصنف کے تقریباً ہر مضمون
نز و مزاح کی چاشنی موجود ہے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ طنزیہ
احیہ ادب میں پھکّڑ پن اور طراری ہونے کی عام شکایت پائی جاتی

یوسف ناظم کے مجموعہ " کیف و کم " کی اشاعت ایک خوش آیند
قدم ہے اور توقع ہے یہ مجموعہ ادبی حلقوں اور طنز و مزاح کا اعلیٰ
ذوق رکھنے والوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔
(ماہنامہ " الشجاع " کراچی بابتہ دسمبر ۶۳ء)

——— " کیف و کم " یوسف ناظم کے مزاحیہ مضامین کا
پہلا مجموعہ ہے۔ جو مرزا غالب " کی صحت جسمانی " سے شروع ہوتا ہے
اور " علم شہریت " کی توضیح و تشریح پر ختم ہوتا ہے۔ سولہ ۱۶ مضامین کا
یہ دلچسپ اور متنوع مجموعہ شروع سے آخر تک پڑھنے والے
کی دلچسپی اور توجہ کو اپنی طرف منعطف رکھتا ہے۔ بقول کرشن چندر
" یوسف ناظم کی تحریر میں آپ کو ریت کم ملے گی۔ نخلستان
زیادہ ملیں گے۔ "

یوسف ناظم ایک ذہین فنکار ہیں، وہ چھوٹی
چھوٹی باتوں سے بڑی بات پیدا کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور کبھی
کبھی بڑی سے بڑی بات کو ایسا چھوٹا بنا کر پیش کرنا اور اس طرح
پیش کرنا کہ قاری کا ذہن بھی تھوڑی دیر کے لئے سہی ایک ایسی
بھول بھلیاں بن جائے جس سے نکلنے کا راستہ معلوم ہو پھر بھی
نہ نکل سکے۔ لکھنے والے کے کمال فن پر دلالت کرتا ہے خصوصاً
مزاحیہ نگاری کے میدان میں ایسے کرتب اور تماشے ناگزیر ہو جاتے ہیں
ایسا پیش پا افتادہ اور ناقابلِ توجہ مواد کو ایسا آب و رنگ عطا کرنا
کہ وہ بے نہایت اور لائق التفات معلوم ہونے لگے۔ مزاح نگاری کے
ذوقِ سلیم اور ذوقِ انتخاب کا سرمایہ ہوتا ہے اور یوسف ناظم کا قلم
اس دولت سے معمور ہے۔

اچھے مضمون نگار کے لئے اچھے قارئین کی بھی
ضرورت ہوتی ہے۔ یوسف ناظم ایک اچھے مزاحیہ نگار ادیب ہیں اس لئے
ہم اپنے تمام اچھے قارئین سے ان کی کتاب خرید کر پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں
(ماہنامہ آندھرا پردیش نومبر ۶۳ء)

گزشتہ چند برسوں سے اردو میں طنز و مزاح کا ادب جیسے جامد سا ہے۔ پرانے لکھنے والوں کی دلچسپی یا تو ختم ہوگئی ہے یا پھر وہ لکھنے لکھانے سے عاجز آچکے ہیں۔ جہاں تک نئے لکھنے والوں کا تعلق ہے وہ ادب کی اس صنف کی جانب کم ہی توجہ کرنے لگے ہیں۔ یوں بھی اردو میں مزاح نگاروں کی تعداد اتنی کم ہے کہ انھیں انگلیوں پر گن جا سکتا ہے۔ اب اگر ایسے میں اردو کے طنز و مزاح کے ادب میں کوئی قابل قدر اضافہ ہوتا ہے تو یقیناً یہ ایک خوش آیند بات ہے لیکن یوسف ناظم کے مزاحیہ مضامین کے مجموعہ "کیف و کم" کو صرف اس لیے اہمیت حاصل نہیں ہو جاتی کہ یہ مزاحیہ ادب کی قلت کے دور کی پیداوار ہے بلکہ فنی اعتبار سے بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا چنانچہ کرشن چندر نے اس مجموعہ پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے کہ "کیف و کم" اردو کے طنز و مزاح کے ادب میں ایک اعلیٰ درجہ کے جوہر کا اضافہ ہے۔

یوسف ناظم بحیثیت مزاح نگار کسی خاص تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ طویل عرصے سے لکھ رہے ہیں اور انھوں نے اپنے پڑھنے والوں سے خوب داد تحسین بھی حاصل کی۔ "کیف و کم" میں جملہ ۱۷ مضامین شامل ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ بحیثیت مزاح نگار یوسف ناظم ایک منفرد اسٹائل کے مالک ہیں۔ ان کی مزاح نگاری میں ایک اچھوتا پن اور انفرادیت موجود ہے یوسف ناظم کے مضامین کو پڑھ کر قاری زیر لب مسکرا سکتا ہے لیکن اس زیر لب مسکراہٹ کا سلسلہ قہقہہ تک نہیں پہونچتا۔ وہ پڑھنے والے کی حس مزاح کو اچانک بلندی پر لیجاتے اور پھر دوسرے ہی لمحہ اسے پستی کی طرف لیجانے کے قائل نہیں ہیں

بلکہ وہ بڑی ہوشیاری اور چابکدستی سے پڑھنے والے کے مزاح کو بیدار کرتے ہیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس احساس میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح احساس کی یہ کیفیت ایک تسلسل کا روپ دھار لیتی ہے۔ مزاح نگار اپنی تحریر میں اچانک کوئی ایسی مزیدار بات کہہ جاتا ہے جس سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے لیکن اکثر مزاح نگار اس دلکشی کو دیر تک برقرار نہیں رکھ سکتے۔ برخلاف اس کے یوسف ناظم کے مزاح میں یہ خوبی موجود ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ان کے فن کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ جہاں تک مزاح پیدا کرنے کی تکنیک کا سوال ہے یوسف ناظم مزاحیہ واقعات کے اظہار کے ذریعہ مزاح پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ اس معاملے میں زبان و بیان کی بازیگری پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ نہایت شستہ اور رواں دواں زبان لکھتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے جملوں کی مدد سے وہ مزاح کی امکانی حدود کو چھو لیتے ہیں۔

یوسف ناظم بنیادی طور پر خالص مزاح کے نمائندے معلوم ہوتے ہیں اور اگر کہیں طنز بھی کر جاتے ہیں تو اس میں ظرافت کا پہلو نکل آتا ہے لیکن یہ طنز خود اس قدر لطیف ہوتا ہے کہ ان کا نشانہ تمسخر بھی اس سے لطف اندوز ہو۔

ان باتوں سے ہٹ کر جہاں تک یوسف ناظم کے مزاح کا تعلق ہے وہ ایک مہذب اور شائستہ مجلسی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ اس مجموعہ کے مضامین "مرزا غالب کی صحت" "قواعد اردو" "نثر میں ایک نوحہ" اور "ہوا خطا یوسف ناظم" کو اردو مزاح نگاری کے اعلیٰ نمونے قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ مضامین یوسف ناظم کے مخصوص مزاح کے نمایندہ ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں کرشن چندر نے یوسف ناظم کا تعا

در یہ بڑا اچھا پُر تعارف ہے۔ انھوں نے اس میں یوسف ناظم
مزاح نگاری کے فن کے تعلق سے بعض پتہ کی باتیں کہی ہیں۔
اس طرح اس تعارف کو صرف رسمی حیثیت حاصل نہیں ہو گئی
ہے بلکہ مزاح نگاری کے فن پر یہ ایک اچھا خاصا مضمون نظر آتا
ہے اس کتاب کے بارے میں انفرادی طور پر کسی رائے کا اظہار کرنے کے بجائے
تر یہی ہے کہ کرشن چندر کے ان جملوں کو دہرا دیا جائے جو انھوں نے
کیف و کم کے بارے میں لکھے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"کیف و کم" کی اشاعت سے اردو کے طنزیہ مزاحیہ
ادب میں ایک اعلیٰ درجہ کے جوہر کا اضافہ ہوا ہے۔ خدا کرے
یہ جوہر پھیلے، پروان چڑھے اور ترقی کی بلند منزلوں کی طرف
رواں ہو۔" ("سیاست" حیدرآباد۔ ۲۳-۹-۱۹۶۳ء)

"کیف و کم" یوسف ناظم کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا اولین
مجموعہ ہے لیکن اس مجموعہ میں شامل ہر ایک مضمون اپنی زبانِ حال سے
اس امر کا شاہد ہے کہ اسے لکھنے والا نہایت منجھا ہوا اور پختہ کار
ادیب ہے۔ یوسف ناظم کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت
یہ ہے کہ ان میں روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ اس مجموعہ
میں خاص طور پر غالب کی صحت جسمانی نثر میں ایک نوحہ "رقو ولدیت"
بڑی دلچسپ مضامین ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو اس گرانقدر
کتاب کی خوش سلیقگی کے ساتھ اشاعت پر مبارکباد کی مستحق ہے
("ملاپ" حیدرآباد ۶۴ء) یہ رسالہ کتب خانہ

فہرست مطبوعات کتب خانہ جلد سوم

ادارۂ ادبیات اردو کے
مطبوعات کی تیسری جلد ہے جس میں اردو، فارسی اور
مطبوعات کے بارے میں توضیحی تشریحات دی گئی ہیں اور
طریقہ برتا گیا ہے کہ کتاب کے نام کے ساتھ ہی کتاب کے مصنف
کا نام، مقام و مطبع، سن اور ضخامت کا علم بھی ہو جاتا ہے

اس رسالے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے ادارہ کے
کتب خانے کے علمی ذخائر کا پتا چلتا ہے اور بسا اوقات ایسی
کتابوں کا بھی علم ہوتا ہے جن کی غیر موجودگی ریسرچ اسکالروں کو
اکثر پریشان رکھتی ہے۔

زیرِ نظر رسالہ میں اردو، فارسی اور عربی زبان کے
علوم کو مختلف عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ فلسفہ و
مذہب، ایوانِ قرآن، علوم طبعی، فنون، اجتماعیات، لسانیات،
ادبیات، تاریخ و تذکرہ اور محولات کے ماتحت مطبوعات کے
ایک بہت بڑے ذخیرے کو اکٹھا کر کے جس خوش اسلوبی سے پیش
کیا گیا ہے وہ بے حد قابلِ تعریف ہے۔

یہ رسالہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے نہایت
مفید ہے۔ (جیلانی کامران)

(دو ماہی "صحیفہ" لاہور بابتہ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

— فہرست کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو۔ مرتب محمد اکبر الدین صدیقی
ایم۔ اے۔ لکچرر جامعہ عثمانیہ:-

ادارۂ ادبیات اردو ہمارے ملک کا ایک ممتاز علمی
ادارہ ہے۔ اردو کے ممتاز نقاد و ادبی مورخ، شاعر، سوانح نگار
اور انشاپرداز ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی پرخلوص رہنمائی
میں اس ادارہ نے تدریجی ترقی، شہرت اور نیک نامی کے کئی مراحل
طے کئے اور ان کے انتقال پر ملال کے بعد بھی ڈاکٹر زور مرحوم کے قابل
اعتماد رفقائے کار اس ادارے کی روایات کو برقرار رکھنے کی امکانی
کوشش کر رہے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو نے نہ صرف اردو کی کئی
کتابیں شائع کیں بلکہ اردو کے نادر مخطوطات و مطبوعات کا ایک
بہت بڑا ذخیرہ اس ادارے کے شاندار کتب خانہ میں محفوظ ہے
ڈاکٹر زور مرحوم نے اس کتب خانے کے مخطوطات کی پانچ توضیحی

فہرستوں کی وجہ سے بھی علمی و ادبی حلقوں میں اس کتب خانہ کی مقبولیت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر زورؔ کی زندگی ہی میں کتب خانہ میں شامل مطبوعات کی دو فہرستیں شائع ہوئی تھیں۔ اب ان کی رحلت کے بعد اس سلسلے کی تیسری جلد ان کے شاگرد رشید پروفیسر اکبرالدین صدیقی صاحب نے مرتب کرکے شائع کی ہے صدیقی صاحب اس کتب خانے کے معتمد اعزازی اور ماہنامہ سب رس کے ایڈیٹر بھی ہیں ان کی ترتیب دی ہوئی یہ فہر[ست] مطبوعات اردو زبان و ادب کے علمی خزانوں سے دلچسپی رکھنے والوں اور خاص طور پر ریسرچ سکالرز کے لئے ایک گراں قدر علمی تحفے سے کم نہیں۔ اس فہرست میں بعض ایسی کتابوں کا بھی تذکرہ شامل ہے جنھیں طبع ہوکر ایک سو برس سے زیادہ عرصہ ہوچکا ہے اس فہرست میں نہ صرف اردو مطبوعات بلکہ ان فارسی اور عربی مطبوعات کی تفصیل بھی درج ہے۔ جنھوں نے کتب خانہ ادارۂ ادبیات کی علمی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ اور اسے ایک اہم مقام عطا کیا ہے۔

مرتب نے فہرست کی ترتیب میں مطبوعات کو مختلف عنوانوں مثلاً فلسفہ و مذہب علوم طبعی۔ اجتماعیات، ادبیات تاریخ و تذکرہ۔ معمولات وغیرہ کے تحت درج کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت مشکل کام تھا تاہم مرتب کے اعلیٰ علمی ذوق اور زبان و ادب کی خدمت کے جذبے نے اسے آسان کردکھایا ہے۔

فہرست مطبوعات کی کتابت و طباعت میں بھی خوش سلیقگی کارفرما نظر آتی ہے۔ (ملاپ حیدرآباد ۲ اگست ۱۹۶۳ء)

—— کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو کی تیسری جلد مطبوعہ کتابوں اور رسالوں وغیرہ کی کیفیت سناتی ہے۔ مختلف علوم و فنون کی مطبوعات ذیل میں عنوانات کے تحت درج کی گئی ہیں۔ پوری فہرست بڑی محنت اور سلیقے سے مرتب کی گئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادارے کے کتب خانے میں فارسی، عربی کتا چھوڑ کر اردو کی پانچ سات ہزار مطبوعات فراہم ہوگئی ہیں ا میں بعض بہت قدیم چھپی ہوئی نادر و نایاب ہیں۔ (جیسے بائبل ترجمہ۔ طبع سری رام پور مشن ۱۸۱۴ء) ادارے کو اب تک سرکاری سرپرستی حاصل نہیں، نہ کوئی مالی امداد جس سے کتابیں جائیں۔ سارا ذخیرہ علم دوست حضرات کے کتابی عطیات ہے۔ ادارے کے مخلص کارپردازوں نے اس احتیاط سے خدا انھیں استقامت اور جزائے خیر دے۔ اردو زبان کی حالات میں یہ بے غرض خدمت انھیں وہ دردمند اسٹر درما مستحق بناتی ہے۔ (ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور اگست)

—— کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو کی فہرست کی جلد سوم مسٹر محمد اکبرالدین صدیقی لکچرار اردو نے مرتب کی۔ بھی تقسیم فنون کے اسی خاکے کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے جس اس سے پہلے دو جلدیں تیار کی جاچکی ہیں۔ تقسیم فنون کا یہ کتب خانہ کی کمیٹی نے تیار کیا تھا۔ اسی کی بنیاد پر فہرست کی وجہ سے زیرنظر فہرست بھی بڑی جامع اور مکمل ہوگئی ہے کتاب کے فن، مصنف، صفحات، تاریخ اشاعت وغیرہ کے مکمل معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔ فہرست مطبوعات مرتب آزما اور دشوار کام ہے اور مرتب کی ذمہ داری بہت بڑی مسٹر اکبرالدین صدیقی نے اس ذمہ داری کو پوری طرح نبھایا۔ دو سو صفحات کی اس کتاب میں تقریباً ۵ ہزار کتابوں، ر اخبارات کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کی گئی ہیں اور فن انھیں ترتیب دیا گیا ہے۔ کیفیت کے کالم میں کتاب کے متع مفید معلومات بھی دی گئی ہیں۔ ایک سو سال سے زیادہ قدیم

حت بھی کردی گئی ہے ۔ کتاب کے آخر میں فارسی مطبوعات
ت کے علاوہ رپورٹوں، پمفلٹوں اور یادداشتوں وغیرہ کی
ت بھی دی گئی ہے جو طلبہ کے لئے فائدہ مند بھی ہو سکتی ہے
ہ الفاظ میں مرتب نے بعض قدیم کتابوں کا سرسری طور پر تذکرہ
بیا ہے جس سے ادارۂ ادبیات اردو کے اس وسیع کتب خانے
یت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے (مہدی عابدی)

(روزنامہ "سیاست" حیدرآباد مورخہ ۸ جولائی ۱۹۶۳ء)

اپریل ۱۹۶۳ء کا پرچہ ادارۂ

سب رس ادارہ نمبر

ادبیاتِ اردو کا خصوصی
ہے جس میں ادارے کے سال بھر کے کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے
ی مطبوعات، خاص تقریبات، اردو کے امتحانات وغیرہ بیتیں
ں شامل ہیں ۔ بانیٔ ادارہ پروفیسر زور کا صدمہ اٹھانے کے باوجود
کے اردو شناسوں کا ادارے کو حسبِ سابق سرگرم عمل رکھنا
قدر و ستائش کا مستحق ہے (ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" لاہور
۱۹۶۳ء)

—— سب رس حیدرآباد دکن ۔ اپریل کا پرچہ ادارہ
اس میں ادارۂ ادبیات اردو کی مختلف سرگرمیوں کا تفصیلی
، شروع میں ڈاکٹر زور (متوفی ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء) کی
رج ہے ۔ یہ نمبر اہل علم کے مطالعہ کے قابل ہے ۔
(ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی بابتہ مئی ۱۹۶۳ء)

سب رس محمد قلی قطب شاہ نمبر اور ظفر نمبر

ادارۂ ادبیات اردو نے گزشتہ برسوں کی طرح ۱۹۶۲ء
کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی سالگرہ
اور ۱۹۶۳ء میں ظفر کی سے منایا تھا ان دونوں نمبروں میں
دونوں شاعروں اور ان کی شاعری کے متعلق دکنی ادیبوں کے
مختصر اور اچھے مضامین اکٹھا کر دیئے گئے ہیں نظموں کی چاشنی بھی
مجموعی اعتبار سے دونوں نمبر بہتر ہیں (معارف اعظم گڑھ ، اکتوبر ۶۳ء)

—— سب رس کا شمارہ بابتہ جنوری ، فروری ۱۹۶۳ء
"ظفر نمبر" کی حیثیت سے شائع کیا گیا ہے ۔ اردو رسائل و جرائد کی کس
مپرسی کے اس دور میں کسی علمی و ادبی جریدہ کا تحسین ناشناسی اور سکوتِ
قدر شناس کی پرواہ کئے بغیر اپنی عمر کے پچیس منازل طے کر لینا ہر آئینہ
لائق تحسین و ستائش ہے ۔ زیرنظر شمارہ میں ظفر ۔ خزاں اور بہار
ظفر کی شاعری ، بہادر شاہ اور استاد ذوق ، ظفر کی غزل گوئی کے
عنوان پر لکھے گئے مضامین اپنی جگہ خوب ہیں لیکن بہتر ہوتا کہ ان کو
لکھنے میں اور بھی محنت کی جاتی ۔
حصہ نظم میں برق یوسفی ، رئیس اختر ، تاج قریشی
ڈاکٹر اختر احمد ، ریحانی ، منظر کامل اور یوسف ناظم صاحبان نے
ظفر کو خراج تحسین و عقیدت پیش کیا ہے ۔ (ماہنامہ "فلک" حیدرآباد)

—— سب رس کا ملا جلا جنوری ، فروری ۶۳ء کا
شمارہ "ظفر نمبر" کی شکل میں ایک دستاویزی جریدہ بنکر ہندوستان
کے آخری ذی علم ادب دوست تاجدار اور ہندوستان کی پہلی جنگ
آزادی کے مجاہد بہادر شاہ ظفر کی یادگار میں منظر عام پر آیا ہے جس میں
وزیر حسن دہلوی کا مضمون "ظفر ۔ خزاں اور بہار" اس نمبر کا
تاریخی حاصل ہے ۔ اس شمارہ میں ظفر کے ساتھ ساتھ محمد قلی قطب شاہ کے
دور کے تمدنی نقوش بھی شامل ہیں ۔ غرض سب رس کا یہ نمبر جس
میں ممتاز اہل قلم حضرات کی تحریریں شامل ہیں ، کتب خانوں کی اہم
ضرورت کو پورا کرتا ہے ۔
(پندرہ روزہ "شعلۂ حیات" بھوپال ۱۵ مارچ ۶۳ء)

—— "سب رس" ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے

سب رس

گزشتہ (۲۶) سال سے شائع کیا جا رہا ہے کسی بھی رسالے کیلئے یہ مدت کافی طویل ہے اور جیسا کہ اکثر پڑھنے والے جانتے ہیں اس عرصے میں سب رس کے کئی قابل قدر اور اچھے نمبر بھی شائع ہوئے اب "ظفر نمبر" اس میں ایک اضافہ ہے دہلی کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی [illegible] سالگرہ گزشتہ دنوں سارے ملک میں منائی گئی اس موقع پر مختلف رسالوں نے اپنے نمبر نکالے اور اخبارات نے خصوصی مضامین شائع کئے اس طرح بہادر شاہ ظفر کی زندگی اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ سب رس کے ظفر نمبر میں زیادہ تر مضامین ان کی زندگی سے زیادہ ان کی شاعری کے بارے میں ہیں اس سلسلے میں اکبر الدین صدیقی کا مضمون کافی اہم ہے جس میں انہوں نے ظفر کی شاعری پر اس دور کے سماجی حالات کا مختصراً جائزہ لیا ہے اور ان کی شاعری کے بعض دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ذوق اور ظفر کے متعلق محمود منور کا مضمون ہو سکتا ہے کہ ذوق کے بہت سے پرستاروں کو ناراض کر دے مگر اس مفروضہ کی تردید کی ایک اچھی کوشش ہے کہ ظفر کی غزلیں ذوق لکھ کر دیا کرتے تھے۔ یہ مضمون کافی فکر انگیز ہے اور ایک نئی بحث کا نقطہ آغاز بن سکتا ہے۔ ظفر کی غزل گوئی پر ڈاکٹر سیدہ جعفر کا مضمون بھی گرانقدر اور اپنے موضوع پر مکمل و سیر حاصل ہے "بغاوت میں چراغ" میں حکیم یوسف حسین خاں نے ایک نیا نقطہ نظر پیش کیا ہے بہادر شاہ ظفر نے ہندوستان کو ڈبویا یا حالات نے بہادر شاہ ظفر کو ڈبویا ایک طویل بحث ہے۔ جنگ آزادی میں ظفر کے کردار کے متعلق شدید اختلاف رائے ہے آیا ظفر صرف شطرنج کے مہرے تھے یا انہوں نے واقعی آزادی کی لڑائی میں اہم حصہ لیا تھا اس مسئلہ پر حکیم یوسف حسین خاں کے مضمون میں ان کی مدافعت کرتے ہوئے اس دور کے حالات اور پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے۔
(روزنامہ "سیاست" حیدرآباد - ۴ مارچ ۱۹۷۶ء)

— حیدرآباد دکن کے بلند پایہ ماہنامہ "سب رس" نے اپنا فروری ۱۹۷۶ء کا شمارہ دہلی کے آخری مسلم تاجدار بہادر شاہ ظفر کی نسبت سے "ظفر نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ "سب رس" جو طباعت و کاغذ کے اعتبار سے معمولی ہونے کے باوجود طور پر بھارت کے جلیل القدر ماہناموں میں شمار ہوتا ہے پیشکش خاص طور پر کامیاب اور قابل فخر ہے۔

بہادر شاہ ظفر گو محض نام کا بادشاہ تھا اور اسے قطعاً کوئی اقتدار حاصل نہ تھا۔ مغلوں اور مسلمانوں کا آخری نشان تھا جس نے شاہی وقار اور شان کو برقرار ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی قیادت سنبھال کر برصغیر کی آ استخلاص ہندوستان کی تاریخی کوشش کی جو ناکام رہنے کے باو فخر سے یاد رکھی جائے گی۔ اس پر آپ کو رنگون جیسی بستی شکر و صبر سے بسر کر کے مرنے کے بعد بے نام ہو جانا پڑا! ظفر کا مقام ارفع ہے۔ آپ شاعر کے طور پر بھی خاص م مالک ہیں جن کے کلام کا اپنا رنگ اور درد و سوز منفرد حیثیت بہادر شاہ کی زندگی ان مختلف پہلوؤں پر "ظفر نمبر" میں ممتاز اہل قلم نے اپنے اپنے طور پر قابل تعریف روشنی ڈا ان کی زندگی کے مختلف زاویوں کو روشن کیا گیا ہے اس نظمیں بھی ظفر نمبر میں درج ہیں۔ یہ نمبر بحیثیت مجموعی ایک مختصر سی مستند تاریخ کے برابر ہے جس پر ہم "سب رس" کے ادارت کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اس نمبر کے ذریعہ اور اسلامی روایات کی ایک اچھی خدمت کی ہے جیسے بھی بہادر شاہ ظفر اور دوسرے اکابر برصغیر کے متعلق جلد

"ظفر نمبر" (۲۰۸ صفحے) کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ ادارۂ "سب رس" جو حیدرآباد دکن نمبر ۲ سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ "سب رس" کا چندہ بارہ روپیہ سالانہ۔ (ہفت روزہ ۲۳/۳/۹۳)

—— ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ماہنامہ سب رس "ظفر نمبر" میں بہادر شاہ ظفر ان کی زندگی، ان کی شاعری اور ان کی حب الوطنی پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے "سب رس" اپنی عمر کے ۲۵ سال اردو ادب کی خدمت میں گزار چکا ہے اور امید ہے کہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کا یہ یادگار جریدہ آئندہ بھی اسی طرح اردو ادب کی خدمت کرتا رہے گا۔

(کتاب نما دہلی، مئی ۱۹۶۳ء)

—— حیدرآباد دکن نے اردو کو دنیا ئے تمدن کی ترقی پذیر زبان بنانے میں وہ درخشاں کام کیا ہے جسے اہلِ اردو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے لیکن موجودہ حالات میں وہاں اردو کا باقی رہ جانا ہی دشوار ہو گیا ہے۔ ان کی حفظ و اشاعت کی جدوجہد دوسری جگہ کی کوشش سے زیادہ قدر و منزلت رکھتی ہیں وہاں کا ادارۂ ادبیاتِ اردو خاص طور پر ستائش کا حق دار ہے جو پوری جانفشانی سے یہ خدمت انجام دے رہا ہے اپنے بانی ناظم پروفیسر زورؔ کے انتقال پر ملال کے بعد بھی اس کی سرگرمیاں خدا کے فضل سے جاری ہیں ادارہ کے ترجمان "رسالہ سب رس" کی مجلس ادارت میں دو جید دیوں کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی کم از کم دکن میں ادبی تعاون کی روایات باقی ہیں۔ جنوری، فروری کا شمارہ یکجا ظفر نمبر کے نام سے شائع کیا گیا ہے جس میں بہادر شاہ ظفر کی شاعری اور سوانح پر کئی بہت اچھے مضمون (پروفیسر رحمت اللہ منور وغیرہ نے لکھے ہیں۔ رزیر حسن دہلوی اور حکیم یوسف حسین صاحب کے شاعرانہ مقالات اور اسی موضوع پر چند نظمیں شمارے کی زینت ہیں لیکن شاید سب سے اچھی یادگار مرحوم بہادر شاہ کی صد سالہ برسی کی کیفیت ہے جو بڑے اہتمام سے سال گزشتہ کے نومبر کے ہفتے میں ادارہ کے زیرِ اہتمام اہلِ حیدرآباد نے منائی۔ ڈاکٹر رام کرشن راؤ، مجلس استقبالیہ کے صدر ہمایوں کبیر صاحب اس یادگار جلسے کے صدر تھے۔ ہندوستان کے اکثر صوبوں کے گورنر صاحبان اور دیگر عمائد (بشمول پنڈت نہرو) نے تحریری پیام ارسال کیے تھے جن میں مرحوم و مظلوم بہادر شاہ کی روح کے روبرو عقیدت و تحسین کی نذریں پیش کی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ خاص، نہایت کامیاب اور اہلِ ذوق و طلبا کے مطالعہ کے قابل ہے

(ماہنامہ تہذیب الاخلاق لاہور اپریل ۶۳ء)

سب رس زورؔ نمبر زورؔ صاحب کی اچانک وفات کا المیہ ابھی کل کی بات ہے لیکن دیکھیے تو سال بھر سے زیادہ ہو گیا۔ وقت کس تیزی سے گزر جاتا ہے اور دنیا اس عرصہ میں اور بھی حوادث سے دوچار ہوئی۔ اب بھی زورؔ صاحب کا غم اہلِ اردو کے لیے تازہ ہے جہاں جہاں اردو بولنے والے بستے ہیں جلسے کیے گئے۔ اظہارِ تعزیت و عقیدت کے ساتھ ان کے فن اور شخصیت کے بارے میں مضامین پڑھے گئے۔ نظمیں سنائی گئیں قراردادیں منظور ہوئیں۔ ہندوستان و پاکستان کے اکثر مشہور رسالوں نے ان کے بارے میں مضامین شائع کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کیا اب ان کے اپنے رسالے سب رس کا تعزیتی نمبر ہمارے سامنے موجود ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے یہ یادگار نمبر دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں زورؔ صاحب کی شخصیت اور فن کے بارے میں تاثراتی اور تنقیدی مضامین خطبات، خطوط اور شاعری کے نمونے پیش کیے گئے ہیں ان کے علاوہ تمام مشاہیر نے زورؔ صاحب کی وفات پر جو بیانات شائع کیے تھے یا رسالوں نے جو اداریے لکھے تھے ان کے اقتباسات جگہ جگہ دیے گئے ہیں اس طرح اس ایک ہی رسالہ میں زورؔ صاحب پر ممکنہ مواد فراہم کر دینے کی سعی کی گئی ہے۔

زیرِ نظر رسالہ میں جو اہلِ قلم شامل ہیں وہ سب کے سب زورؔ صاحب سے خلوص رکھنے والے ہیں۔ اس لیے اکثر مضامین تاثراتی ہیں اور بہت خوب، ان میں ڈاکٹر زورؔ بحیثیت استاد، رفیق کار، ادیب و ادیب گر نمایاں نظر آسکتے ہیں۔

آیندہ کوئی شخص ان کی سوانح عمری لکھنا چاہے تو ان سے بہترین
مواد اخذ کیا جا سکتا ہے۔ تنقیدی مضامین میں زور صاحب کے کارناموں
کا جائزہ لینے کی اچھی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ کام مستقبل کا نقاد
ہی بہتر کر سکتا ہے۔

ان لکھنے والوں میں بعض ایسے پرانے رفیق اور شاگرد ہیں
جو پچھلے چند برسوں میں حیدرآباد سے دور چلے گئے۔ جیسے بادشاہ حسین
تمکین، نظر مرحوم۔ بعض لکھنے والے ان کے روز مرہ ملنے والوں میں سے
جیسے محمود حسن، اکبر الدین صدیقی اور میر حسین علی خاں نے زور صاحب
کی کمی کو شدت سے محسوس کیا ہے اور کرایا ہے۔ ان میں جو شخصیت کا
عنصر ہے وہ بہت دل پذیر ہے۔ بعض لکھنے والے ایسے ہیں جو
ملاقات کا بے تکلف رشتہ رکھنے والے تھے ان میں ڈاکٹر گوپی چند
نارنگ اور ڈاکٹر رحیم الدین کمال کے مضامین میں ندرت اور دلکشی
بھی ہے اور چونکا دینے والی ادا بھی۔ پھر ان کے پرانے ساتھی ہیں
مثلاً پروفیسر سید محمد جو ہر طرح ان کے شریک کار رہے۔ ایسے نیاز مند
بھی موجود ہیں جنھیں آگے بڑھانے اور حوصلہ دلانے میں زور صاحب
پیش پیش رہے ان سب نے اپنے اپنے طور پر زور صاحب کو جیسا
پایا اور آج جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں اسی کا بے کم و کاست حال لکھا ہے
سچی بات یہی ہے کہ اچھے لوگ وہی ہیں جو مرنے کے بعد بھی اس خلوص
اور محبت سے یاد کئے جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں "سب رس" جیسا ادبی رسالہ، ایوان
اردو جیسی خوبصورت اور صوری و معنوی خوبیوں سے متصف عمارت،
ادارہ اور اس کی مطبوعات اور خود زور صاحب کی بیش بہا علمی
خدمات ان کا نام روشن رکھنے کو کافی ہیں مگر آج جو ذمہ داری ادارہ
کے کارکنوں اور ان کے جانشینوں پر عاید ہوتی ہے وہ یہ کہ جس مقصد کے
پیش نظر وہ کام کر رہے تھے وہ پورا ہو جائے۔ اپنے مقصد میں
کامیاب ہونا ہی ان کارکنوں کی اصلی کامیابی ہے اور زور صاحب
مجاہد کی فتح۔

زور صاحب نے زندگی بھر دکن، دکنی ادب ا
عشق کیا۔ بڑی لگن سے وہ یہی کام کرتے رہے۔ وہ
کہ یہاں کے اہل قلم بیدار ہوں اور اردو کی ترقی میں اپنا
اور اپنی شخصیت منوائیں ان کی زندگی سے یہی سب
جذبہ اب بھی برقرار ہے۔

ان کی جو کتابیں اب نہیں ملتیں ان کو دو
ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کو منظر عام پر لانا اور ان
کاموں کو پورا کرنا ادارے کے اولین مقاصد میں ہو
ہمیں یقین ہے کہ یہ سب کام ادارہ کے کارکن بہت ا

(روزنامہ سیاست حیدرآباد مورخہ

—— "سب رس" کے ضخیم اور خوبصورت زور نمبر
سے پہلا جو تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ابھرتا ہے
ادارۂ ادبیات اردو کے کارکنوں نے اس تعلق خاطر
محبت کے بل بوتے پر جو انھیں ڈاکٹر زور کی ذات
نمبر کے ۴۹۳ صفحات میں زور صاحب کی شخصیت
ادبی سرگرمیوں اور اردو کے لئے ان کی انتھک
ہر پہلو کو محیط کرلینے کے لئے دن رات محنت کی ہے
نہیں ہے کہ "سب رس" کے اس خاص نمبر کو ایک
کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر احتشام
ڈاکٹر رحیم الدین کمال، پروفیسر مبارز الدین رفعت
عباد انصاری، نظر حیدرآبادی، ڈاکٹر گوپی چند
گیان چند وغیرہ کے مضامین اپنے طور پر ڈاکٹر زور کی شخصیت کو

(ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد دسمبر

—— سب رس کا زور نمبر چار سو صفحات پر مشتمل ہے اس میں زور مرحوم کے دوستوں، عزیزوں اور مداحوں نے اپنے اپنے تاثرات تحریر کئے ہیں۔ لکھنے والوں میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ لیکن ان سب نے بہ حیثیت انسان کے اور اردو کے خادم کے مرحوم کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ مختلف مضامین پڑھنے کے بعد زور کی عظمت کا نقش دل میں بیٹھ جاتا ہے اس میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ اپنی ذات سے ایک ادارہ تھے اس مختصر سی عمر میں ان کے گوناگوں کارناموں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ عثمانیہ یونیورسٹی کے معنوی فرزند تھے ان کی وجہ سے عثمانیہ یونیورسٹی جیسی مادر علمی کی عزت دلوں میں جم جاتی ہے

اس نمبر کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں نثری مضامین، دوسرے میں نظمیں اور تیسرے میں خود زور مرحوم کے کچھ مضامین وغیرہ ہیں۔ یہ نمبر جامع ہے اور زور صاحب کی پوری شخصیت اس میں آگئی ہے یہ نمبر متعدد تصاویر سے مزین ہے۔ سب رس نے یہ نمبر شائع کر کے اپنا حق ادا کیا ہے جسے صرف وہی ادا کر سکتا تھا۔

(ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی دسمبر ۱۹۶۳ء)

ادارے کا مہمان خانہ

ادارے کی اپنی تعمیر شدہ عمارت "ایوان اردو" میں دو کمروں اور ایک درانڈے پر مشتمل ایک مہمان خانہ ہے جس میں دستور کی مسلمہ چودہ زبانوں میں تحقیقاتی کام کرنے والے ریسرچ اسکالر، ادیب، شاعر اور صحافی ایک ہفتہ قبل معتمد ادارہ کو مطلع کر کے اور اجازت ملنے پر آمد کی صحیح تاریخ اور وقت سے مطلع کر کے قیام کر سکتے ہیں۔ ریسرچ اسکالروں کے لئے یہ شرط ضروری ہے کہ وہ اپنے شعبے کے صدر کی توثیقی تحریر کے ساتھ قیام کے لئے درخواست بھجوائیں۔ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے لئے تعارفی مکتوب کا درخواست کے ساتھ منسلک ضروری ہے۔ مہمان خانہ میں صرف چار روز قیام کیا جا سکتا ہے اور اگر مزید ضرورت ہو تو صرف تین روز کی اجازت دی جا سکے گی مہمانوں سے یومیہ مقررہ شرح پر کرایہ لیا جاتا ہے جس کے بارے میں مراسلت ضروری ہے۔ ایوان اردو کا مہمان خانہ ہند و پاک کی ادبی اور تہذیبی اداروں کی تاریخ میں اپنے وجود کے صحت مند پس منظر کے تعلق سے اولیت اور اہمیت کا حامل ہے یہاں قیام کی سہولتیں مہیا ہیں۔ مہمان خانہ ایوان اردو سے ملحقہ عقبی حصہ میں واقع ہے۔

جولائی ۱۹۶۴ء میں . . . . دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر جناب شیام لال عابد پشاوری (دہلی یونیورسٹی) جناب دلیپ بادل ایم اے (ریسرچ اسکالر دہلی) نے ایوان اردو کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات کی تفصیلی فہرست

تاریخ سیاست

سلسلہ	نام کتاب	مضمون نگار	قیمت	سلسلہ	نام کتاب	مضمون نگار	قیمت
۱	دکن کی تاریخ	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	1=75	۱۹	حیدرآباد فرخندہ بنیاد	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ	دو رو...
۲	میر محمد مومن	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ	5=00	۲۰	حیات بخشی بیگم	نصیر الدین ہاشمی	۷۵
۳	ال و الرِ قطب شاہ	مولوی سید مراد علی طالعؔ	1=25	۲۱	تاریخ گولکنڈہ	منشی فیض الدین	دو رو
۴	حیدرآباد	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	0=62	۲۲	پن چکی	پروفیسر سید عبداللطیف رفعتؔ	ایک
۵	سلسلۂ سوانح	مولوی سید مراد علی طالعؔ	فی کتاب	۲۳	ارمغان لیم قلی	مرتبہ ادارہ	۵۰
	سلاطین آصفیہ باتصویر	طالع	0=37	۲۴	حیدرآباد کے بڑے لوگ	سید غلام پنجتن صاحب	دو
۶	مختار الملک	مولوی فیض محمد صدیقی صاحب مرحوم	0=50	۲۵	سروجنی نائیڈو	سید وزیر حسن دہلوی	دو
	سالار جنگ اعظم			۲۶	گاندھی جی	خورشید احمد جامی	۵
۷	عماد الملک	مولوی فیض محمد صدیقی صاحب مرحوم	0=50	۲۷	تاریخ ادب اردو	مرتبہ ادارہ	۲
۸	ہندوستانی قومیت کا مسئلہ	ڈاکٹر ایشورا ٹوپا	ایک روپیہ ۲۵ پیسے	۲۸	مدراس میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	۲
۹	اشوک اعظم	سیدہ عبدی جعفری صاحبہ	۵۰ نئے پیسے	۲۹	مغربی تصانیف کے اردو تراجم	مولوی میر حسن صاحب ایم اے	/
۱۰	ٹیپو سلطان	پروفیسر ہارون خان شیروانی	تین روپے ۵۰ پیسے				
۱۱	تاریخ سیاست	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے	۳۰	آریائی زبانیں	ڈاکٹر سید حشمت ...	ایک
۱۲	اسلامی عدل گستری	محمد عبدالحفیظ صدیقی	ایک روپیہ ۲۵	۳۱	اردو املا	مولوی غلام رسول صاحب	
۱۳	سلاطین شاہی خاندان	محمد عبدالرحمن خان مرحوم	پانچ روپیہ	۳۲	سرگزشت حاتم	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ	۲
۱۴	دادا بھائی نوروجی	ظہیر الدین احمد مرحوم	۲۵ نئے پیسے	۳۳	سرگزشت غالب	" " "	ا
۱۵	ریاض مختاریہ	دلاور علی دانش	پانچ روپیہ	۳۴	گارساں دتاسی	" " "	ا
۱۶	بلقان	محمد عبدالحفیظ صدیقی	۷۵ نئے پیسے	۳۵	محمد حسین آزاد	جہاں بانو بیگم نقوی صاحبہ ایم اے	د
۱۷	سیر گولکنڈہ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم	ایک روپیہ		تذکرۂ اردو مخطوطات		
۱۸	بہمنی سلطنت	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	چھ روپے ۵۰ پیسے	۳۶	جلد اول	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم	

سلسلہ	نام کتاب	مضمون نگار	قیمت
۳۷	جلد دوم	ڈاکٹر زور صاحب مرحوم	Rs nP 5=00
۳۸	" سوم	" " "	7=00
۳۹	" چہارم	" " "	7=00
۴۰	" پنجم	" " "	7=00
۴۱	تذکرہ نوادر ایوان اردو جلد اول	" " "	7=00
۴۲	داستان ادب حیدرآباد	" " "	2=50
۴۳	اردو مثنوی کا ارتقاء	پروفیسر عبدالقادر سروری	2=00
۴۴	یاد امجد	مرتبہ ادارہ	2=00
	تاریخ، تذکرہ و تنقید		
۴	مرقع سخن جلد دوم	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم	7=00
۴	شعرائے عثمانیہ	سید معین الدین قریشی و حبیب عبدالقیوم خان باقی	5=00
۴	مشاہیر قندھار دکن	محمد اکبر الدین صدیقی	1=50
۴	گلشن الحقائق	" " "	2=00
۴	نذر ولی	جہاں بانو بیگم، لطیف النساء بیگم، نعیم النساء بیگم، مہر النساء بیگم	5=50
۵	سرسید احمد خاں	ظہیر الدین احمد	0=25
۵	راہرو اور کارواں	ڈاکٹر حفیظ قتیل	2=00
۵	دارالعلوم کے پچاس سال	حافظ محمد مظہر	1=00
۵	یادگار جشن سیمیں	مرتبہ ادارہ	1=00
۵	میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام	ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی	2=00

سلسلہ	نام کتاب	مضمون نگار	قیمت
۵۵	دکنی ہندو اور اردو	نصیر الدین ہاشمی	Rs nP 3=50
۵۶	تحفۃ الشعراء	ڈاکٹر حفیظ قتیل	3=00
۵۷	جیتوں کی کہانیاں	حبیب ابراہیم ایم بیگ	0=75
۵۸	نذر محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر زور مرحوم	5=00
۵۹	یادگار محمد قلی قطب شاہ	" " "	0=15
۶۰	نذر معانی	مرتبہ وقار خلیل	1=00
۶۱	محمد قلی قطب شاہ کی جیون کہانی	" "	0=50
۶۲	مولانا ابوالکلام آزاد	" "	0=50
۶۳	مقام غالب	پروفیسر سید مبارز الدین رفعت	2=00
۶۴	تاریخ ناندیڑ دکن	مرتبہ مرزا احمد علی بیگ	2=00
۶۵	قطب شاہی سلاطین اور آندھرا سنسکرتی بزبان انگریزی	مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب مرحوم	1=25
۶۶	قطب شاہی سلاطین اور آندھرا سنسکرتی بزبان تلگو	مرتبہ ڈاکٹر طیبا مالا راجو	2=00
۶۷	حدیقۃ السلاطین (فارسی)	مؤلفہ مرزا نظام الدین احمد بن عبداللہ صاعدی شیرازی	10=00
۶۸	ارمغان امجد	مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد	1=50
	مجموعۂ کلام		
۶۹	انوار	حضرت علی اختر حیدرآبادی	2=00
۷۰	نمود زندگی	سید علی منظور حیدرآبادی مرحوم	2=00
۷۱	ترجمان زندگی	علی منظور مرحوم	2=50
۷۲	ارمغان جذب	پنڈت راگھویندر راؤ جذب	1=00

سلسلہ	نام کتاب	مضمون نگار	قیمت Rs NP
۷۳	رباعیات آلہام	ڈاکٹر رگھوتندن راج سکسینہ	2=00
۷۴	مجموعہ نظم حالی	خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم	0=75
۷۵	ماہ لقا اور دوسری نظمیں	پروفیسر عزیز احمد	1=50
۷۶	تنویر تخیل	سید نجم الدین آلمعی مرحوم	3=50
۷۷	آبگینۂ شعر	محترمہ بشیر النسا بیگم بشیر	6=00
۷۸	گنج طلسم	ڈاکٹر حفیظ سید مرحوم	1=00
۷۹	طالب و موہنی	مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب مرحوم	1=50
۸۰	دیوان ہاشمی	ہاشمی بیجاپوری	6=00
۸۱	حرف شیریں	قاضی غلام محمد	1=50
۸۲	کلیات غواصی	پروفیسر محمد بن عمر مرحوم مرتب	4=00
۸۳	سراج سخن	پروفیسر عبدالقادر سروری مرتب	1=00
۸۴	رمز سخن	بہاری لال رمز	1=00

افسانے، ڈرامے اور ناول

سلسلہ	نام کتاب	مضمون نگار	قیمت
۸۵	من کی دنیا	رشید قریشی	1=00
۸۶	محبت کی چھاؤں	مرزا ظفر الحسن	1=50
۸۷	رم جھم	سری کرشن سنہا	1=50
۸۸	کاغذ کی ناؤ	صاحبزادہ میکش مرحوم	1=50
۸۹	سلک گوہرین	جلال الدین اشک	0=50
۹۰	سچ کا جادو	عبدالمجیب الحضرمی صاحب	0=50
۹۱	یلی	محترمہ عظیم النسا بیگم صاحبہ	1=50
۹۲	سادھا اور رنگ محل	مولوی وزیر حسن صاحب دہلوی	1=50

سلسلہ	نام کتاب	مضمون نگار
۹۳	بیلینا	فضل الرحمٰن صاحب
۹۴	وہمی	جناب وزیر حسن صاحب دہلوی
۹۵	تماشائے اہل ہنر	سید رشید الحسن ایم اے
۹۶	نیل کنول مسکائے	محمود حسین یدخشی

خطوط اور مجموعۂ مضامین

سلسلہ	نام کتاب	مضمون نگار
۹۷	روح غالب	مرتبہ ڈاکٹر زور صاحب
۹۸	شاد اقبال	" " "
۹۹	مکتوبات شاد عظیم آبادی	ڈاکٹر زور صاحب
۱۰۰	رسائل طیبہ	محترمہ طیبہ بیگم مرحومہ
۱۰۱	نذر دکن	محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ
۱۰۲	مکاتیب سلاطین قطب شاہی	مرتبہ نواب عباس علی
۱۰۳	ٹھنڈی بجلیاں	بھارت چند کھنہ
۱۰۴	کیف و کم	یوسف ناظم
۱۰۵	ادبی تحریریں	ڈاکٹر زور صاحب

سب رس کے خاص شمارے

سلسلہ	نام کتاب	مضمون نگار
۱۰۶	ظفر نمبر	ادارہ
۱۰۷	امجد نمبر	"
۱۰۸	دلی نمبر	"
	ٹیگور نمبر	"

ادارۂ ادبیات اردو۔ ایوانِ اردو۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ — فون نمبر ۳۵۲۰۹
جلد (۲۷) شمارہ ۶ — جون ۱۹۶۴ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

نگران :- پروفیسر عبدالمجید صدیقی

مجلس مشاورت :-

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۔ رمن راج سکسینہ
نصیرالدین ہاشمی منظور احمد ۔ وقار خلیل

معتمد :-

محمد اکبرالدین صدیقی

زر سالانہ ہند و پاک سے	چھ روپے
ششماہی	تین روپے
غیر ممالک سے	دس روپے
فی پرچہ	۵۰ پیسے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے اہتمام سے
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر
دفتر ایوان اردو خیریت آباد دکن سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

پنڈت جواہر لال نہرو کی رحلت پر ادارہ ادبیات اردو اور مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ
جانب سے ۹ جون کو ایوان اردو میں نواب میر احمد علی خاں وزیر داخلہ کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد
صاحب موصوف نے فرمایا کہ پنڈت جی نے بعض ریاستوں کو ہدایات جاری کی تھیں کہ وہ اردو کو علاقائی
تسلیم کرلیں لیکن افسوس ہے کہ ان ریاستوں نے ہدایات پر عمل نہ کیا۔ پنڈت جی نے ہمیشہ اس امر کی امکا
اردو کو اس کا مستحقہ مقام ملے محض اس لئے کہ اس سے قومی یکجہتی میں مدد ملے گی۔ وہ ہمیشہ آندھرا پر
کی ستایش کرتے تھے کہ اس نے اردو کو علاقائی زبان قرار دیا۔ وہ دوسری ریاستوں میں اس کے اتبا
رہے۔ چونکہ یہ ان کی خواہش تھی اس لئے ہندوستان کی تمام ریاستوں کو ان کی اس تمنا کا احترام کرنا
ملک ہی کی نہیں بلکہ ساری دنیا کی ایک عظیم شخصیت تھے انھوں نے صرف ہندوستان ہی کو آزادی نہیں،
کوششوں اور ان کی تائید نے کئی ممالک کو آزادی کا پروانہ عطا کیا۔ انھوں نے اپنی قوم کے سامنے کامل آزادی
نمونہ پیش کیا۔

پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارہ ادبیات اردو نے اپنی تقریر میں واضح کیا کہ پنڈت جی کو رائے عامہ
وہ ہندوستانی کو قومی زبان کی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ لیکن رائے عامہ کے ساتھ انھیں ہندی کی تائید کرنی پڑ
یہ کہ پنڈت جی جامعہ عثمانیہ کو مرکز کے تحت لینا چاہتے تھے تاکہ یہ شمال اور جنوب کے درمیان، کڑی کا کام د
اراکین کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجہ میں ان کے شگفتہ اور سرخ و سفید چہرہ پر برہمی کے آثار نما
انھوں نے کہا کہ میں جامعہ عثمانیہ کو ایک بلند مقام دینا چاہتا تھا لیکن آپ لوگ راضی نہ ہوں تو آپ کی مر

پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارہ کے بعد ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی ادارۂ ادبیات اردو و مولانا
اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے بتایا کہ پنڈت جی ایک عالمی شہری تھے ان کا مذہب انسانیت تھا۔ انھوں نے
کے تخیل مساوات و یگانگت کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی فرقہ واریت کا کوئی تصور ان کے ذہن میں نہ تھا
کرتے رہے۔ خواجہ محمد احمد صاحب ڈائرکٹر آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے بھی تقریر کی۔ علامہ حیرت بدایونی سراگھو
میر حسین علی خاں، وقار خلیل اور فیض الحسن خیال صاحبان نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ قرار داد تعزیت کے بعد وہ

سر حامد علی خاں شروانی

"جواہر لال نہرو"

کیسے یقین آئے کہ انسانیت کا یہ علمبردار ہندستان کی آزادی کا یہ سورما عالمی بھائی چارے کا یہ زعیم ہندستان کا یہ انیتا اب اس دنیا میں نہیں۔ ہندستان کی آزادی سے پہلے وہ نوجوانوں کا قائم مقام تھا۔ اور آزادی کے بعد وہ ندستان کے ۴۴ کروڑ باشندوں ہی کا نہیں۔ بلکہ عالمی امن کا شاید سب سے سرگرم مؤید بن گیا۔ آج اس کی وفات دنیا سوگوار ہے اور اس کے لئے صرف ان ہی ملکوں میں صفِ ماتم نہیں بچھی ہوئی ہے جو ہمارے ملک کی دوستی کا دم بھرتے ں بلکہ ان ملکوں میں بھی رنج و غم کی لہر دوڑ رہی ہے جنھیں ہندستان کی حکمتِ عملی سے اختلاف ہے۔ جن امور سے ہندستان مفاد وابستہ تھا جن میں ہندستان کا سر اونچا رکھنا تھا جن میں اس بات کی ضرورت تھی کہ ہندستان کی داخلی یا خارجی یسی کو ایک خاص شکل دیجائے ان میں جواہر لال نہرو کی شخصیت کارفرما تھی۔ آج وہ شخصیت ہم سے چھین لی گئی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم مشکل میں ں تو کس سے صلاح لیں کس سے مشورہ کریں کس کی دوراندیشی اور فراست سے فائدہ اٹھائیں کس کی بے داغ وطن دوستی بلکہ انسانیت دوستی پر انحصار کریں۔

بدھ کے دن دو بجے کے قریب اپنے مکان کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہا تھا کہ میری نواسی یاسمین نے بڑی ہوئی آواز میں مجھے یہ خبر وحشت اثر پہونچائی کہ جواہر لال نہرو کا انتقال ہوگیا۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ پنڈت جی سے برے تعلقات اس زمانے سے تھے جب ہم دونوں انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہ کیمبرج میں تھے میں آکسفورڈ میں۔ ہم دونوں اُرڈ لنکن لسدن آئے تو ربط و ضبط بڑھی۔ اور ہم دونوں ہندستان کی آزادی کے خطوط پر کام کرنے لگے۔ ہندستان واپس آنے پر میرا ور پنڈت جی کا تعلق برابر قائم رہا۔ اور مجھے اس تعلق پر ہمیشہ فخر رہے گا۔

ایک دن پہلے ہی میں نے انھیں خیریت طلبی کے لئے ایک خط لکھا تھا اور مجھے یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ وہ خط انھیں کبھی نہ لے گا۔ اسی روز اخبار میں دیکھا تھا کہ پنڈت جی اپنی مختصر سی چھٹی کے بعد ڈیرہ دون سے دہلی واپس ہوئے اور ہشاش بشاش ترے۔ چند ہی دن پہلے پنڈت جی نے کانگریس کمیٹی کے بمبئی والے اجلاس میں شرکت کی تھی اور تقریر کی تھی۔ اور ۲۲ مئی کو یک بڑی پریس کانفرنس کو مخاطب کیا تھا پھر یہ یکایک کیا ہوگیا۔ میں نے گھبرا کر اپنی نواسی سے صورتِ حال دریافت کی تو معلوم ہوا ریڈیو میں خبر آئی ہے کہ پنڈت جی دو بجے سرگباش ہوگئے۔ دہلی والوں کو تو پنڈت جی کی دم بدم خرابیٔ صحت کا حال صبح ہی سے معلوم ہو رہا تھا۔ مگر حیدرآباد میں تو بس موت ہی کی خبر آئی۔

مگر جواہر لال نہرو مرے نہیں۔ ان کا فانی جسم ضرور ختم ہوگیا ہے۔ جواہر لال نہرو کا کام ان کا آدرش ان کا انسانیت

ہمیشہ اپنے نیک مقاصد پر اپنے کو نچھاور کرنے کا عزم یہ وہ چیزیں ہیں جو ان کے نام کی نسبت کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ اور ہم آج بھی جب ان کا جسدِ خاکی بھسم ہو چکا ہے نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ۔

"جواہر لال نہرو زندہ باد"

انسان کا جسم فانی ہے لیکن اس کے نیک کام خصوصاً ایسے کام جنھوں نے تاریخ عالم پر اثر ڈالا ہوا اور جن سے بہترین نتیجے نکلنے کی توقع ہو یہی زندۂ جاوید ہوتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کوئی فوجی سپہ سالار نہ تھے وہ کسی ملک کے بادشاہ یا آمر یا صدر جمہوریہ تھے۔ وہ کوئی افسانہ نویس نہ تھے انھوں نے اپنی ذاتی عظمت کا اظہار نہیں کیا۔ مگر ان کا نام رہتی دنیا تک برابر رہے گا اور ہندستان کی حالیہ تاریخ میں ان کا رتبہ مہاتما گاندھی سے کچھ کم ہی سمجھا جائے گا۔ گاندھی جی نے ہماری آزادی کی بنیاد رکھی ہمیں نڈر بنایا۔ ہم نہتوں کو دنیا کی سب سے زبردست سلطنت کا مقابلہ کرنا سکھایا اور ہمیں آزادی کے صدر دروازے پر کھڑا کیا۔ مگر یہ جواہر لال ہی تھے جنھوں نے مہاتما جی کی رکھی ہوئی بنیاد پر ایک ایسا ایوان تعمیر کیا جس کی چھت کے تلے ۴۴ کروڑ ہندستانی آرام و آسایش سے رہتے سہتے ہیں۔ اگر مہاتما جی ہمارے ملک کے بنا کار ہیں تو جواہر لال اس کے تعمیر کار ہیں۔ راستے کی نشاندہی مہاتما جی نے کی اس راستے کو تیار کرنے اور اسے عبور کے قابل بنانے کا سہرا جواہر لال کے سر ہے۔ جواہر لال حقیقی معنے میں گاندھی جی کے والی وارث تھے۔ یہ سوال کہ جواہر لال نہرو کا وارث کون ہوگا۔ اس کا جواب خود بخود انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں دیدیا تھا۔ جب پنڈت جی کی تندرستی کثرتِ کار کی وجہ سے جواب دینے لگی تو کسی نامہ نگار نے ان سے یہی سوال کیا۔ پنڈت جی نے جواب دیا کہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے وارث چالیس کروڑ سے زیادہ میرے ہم وطن ہیں وہ جسے چاہیں اپنا نیتا بنادیں گے۔ غور کیجئے کہ اگر پنڈت جی میں ذرا بھی انانیت ہوتی تو وہ ضرور اشارتاً یا کنایتاً کسی کو اپنا جانشین بنانے کا عندیہ ظاہر کرتے۔ مگر ان میں تو عمومیت کی روح کارفرما تھی۔ ان کا کہنا تو یہ تھا کہ جو کچھ بھی وہ ہیں اس کی پشت پناہی ۴۴ کروڑ انسانوں کی خواہش کر رہی ہے۔ اور جب وہ نہیں رہیں گے تو یہی ۴۴ کروڑ جس کسی کو چاہے اپنا بنالیں گے۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ گو جواہر لال بظاہر ایک مخصوص سیاسی فریق کے رہنما تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کی شخصیت ہندستان کے تمام سیاسی فریقوں پر چھا گئی اور دایاں بازو اور بایاں بازو سب ان کی عظمت کا لوہا مان گئے۔ سوتنترا پارٹی کے موسس راجہ جی جواہر لال نہرو کی وفات کی خبر سن کر رو پڑے اور حیدر آباد کے ممتاز کمیونسٹ نیتا مخدوم محی الدین نے جو پیام اخباروں کو روانہ کیا ہے اس کا ایک ایک لفظ ان کے دل سے نکلا ہے۔ اسی طرح اپنے مخصوص مسلک کے حامل جے پرکاش نرائن کا پیام بھی ایسا ہے کہ جب وہ اسے لکھنے لگے ہوں گے تو خود آبدیدہ ہو گئے ہوں گے۔ پنڈت جی اپنے ساتھ والوں اور اپنے مخالفوں دونوں سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ اور جو ان سے ملتا تھا اس کے دل کو لبھا لیتے تھے۔

جواہر لال نہرو نے بین اقوامی سیاست میں جو مقام پیدا کیا تھا وہ بہت سے اعتباروں سے لاثانی تھا۔ ہندستان کے آزاد ہوتے ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ عالمی سیاست میں ہندستان کا کیا رتبہ ہوگا۔ ہمارے ملک کو بیرونی سیاست کاری کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ مہاتما گاندھی کا اہنسا والا آدرش ابھی تک سب کو یاد تھا۔ دوسری سنساری جنگ کے بعد آہستہ آہستہ امریکہ اور روس کا ایک دوسرے کے خلاف محاذ قائم ہوگیا تھا۔ اور ہر ملک ہر دوسرے ملک کا یا تو دوست تھا یا دشمن غیر جانبداری کا سوال ہی نہ تھا۔ ایسی حالت میں نوخیز ہندستان کا اعلان کرنا کہ وہ کسی سیاسی جتھے میں شریک نہ ہوگا۔ اس وقت بہت سوں کو مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ کوریا کی جنگ کی ابتدا ہی میں پنڈت جی نے امریکہ اور روس کو جو خط لکھے اس وقت انکی اہمیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا مگر وہی بنیاد تھے ہندستان کی غیر جانبداری اور پنچ شیل کے اصول کی۔ ہندستان کی آزادی سے پہلے ہی جواہر لال کی قیادت اور سروجنی نائیڈو کی صدارت میں جو عظیم الشان ایشیائی کانفرنس دہلی میں ۲۳ر مارچ ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوئی اس میں ہندستان نے ایشیا کو آزادی اور حریت کا گویا راستہ دکھایا۔ چنانچہ اس کو آٹھ برس بعد کی بانڈونگ کانفرنس کا پیش خیمہ قرار دینا چاہئیے۔ یہ دنیا جانتی ہے کہ خواہ دہلی کانفرنس ہو یا بانڈونگ کانفرنس یا پھر غیر جانبدار ملکوں کی بلگریڈ کانفرنس ان سب میں شاید سب سے اہم شخصیت جواہر لال نہرو ہی کی تھی۔ ارل ایٹلی سابق وزیر اعظم انگلستان نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ " اگر مشرق اور مغرب یعنی روس، امریکہ کے درمیان ہندوستان غیر جانبدار کڑی نہ ہوتی تو بین قومی معاملات کو سلجھانے میں بڑی دقتیں پیش آتیں"۔ ہندوستان اور چین کے حالیہ تعلقات میں بھی پنڈت جی کی انسانیت دوستی کا دم بھرتے ہوئے گویا پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کرے اور دوسرا ملک اس پر بھی اور ملک سے سفارتی تعلقات ہی نہیں بلکہ رسل و رسائل کا سلسلہ قائم رکھے۔ یہ پالیسی بین قومی تعلقات کی تاریخ میں ایک اعتبار سے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی خارجی پالیسی کے معمارِ اعظم کس حد تک بین اقوامی امن اور شانتی کے خواہاں تھے۔ پنڈت جی ہمارے دوسرے ہمسایہ ملک پاکستان سے گہری دوستی چاہتے تھے۔ اور ایک اعتبار سے ان ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ دونوں ملکوں کے اقلیتوں کے بارے میں نہرو لیاقت معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پنجاب کے دریائی پانی کا جھگڑا طے ہوگیا اور عہدنامہ پر دستخط کرنے کے لئے جواہر لال نہرو خود پاکستان گئے۔ ان ہی کی کوشش کہ سردار سورن سنگھ اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان پانچ ملاقاتیں کشمیر کے سلسلے میں ہوئیں۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ اس کوشش کا ثمر پنڈت جی کی زندگی ہی میں پیدا ہو جائے۔

پنڈت جی سورگ باشی ہوگئے اور پورے ملک کیا پوری دنیا کو سوگوار کر گئے۔ ہمارے زمانہ میں امن کا ایسا پیغامبر شانتی کا ایسا پجاری انسانیت پر اتنا اعتقاد رکھنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔ بقول شاعر مشرق۔ ع

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کسی نیتا، کسی عالم، کسی عظیم المرتبت انسان کی تعریف کرنا آسان ہے اس کے آدرش کو اپنا آدرش بنانا مشکل ہے۔ جواہر لال نہرو کی جیون کہانی پر بہت سی تقریریں ہوں گی کتابیں لکھی جائیں گی مضامین شائع ہوں گے لیکن یہ سب چیزیں بیکار رہیں اگر ہم ان کے آدرشوں کو اپنا آدرش نہ بنائیں اپنے معاملات میں اہنسا کو اولیت نہ دیں ان لوگوں کو جو ہمارے مذہب کے نہیں، ہماری نسل سے نہیں، ہماری زبان نہیں بولتے ہماری ذات سے باہر ہیں، ان سب کو اپنا بھائی نہ سمجھیں اگر یہ نہ ہو تو جواہر لال نہرو کی تعریف و توصیف بے سود ہے۔ پنڈت جی نے اپنے آرام کو کبھی آرام نہ سمجھا اپنی مشکلوں اور تکلیفوں کو ملک کے سامنے ہیچ تصور کیا۔ مرنے سے چند گھنٹے پہلے تک رات میں سرکاری کام کیا کئے۔ انھیں اپنے ملکی بھائی خواہ ان کا کوئی مذہب، کوئی ذات، کوئی صوبہ، کوئی زبان ہو، مساوی طور پر عزیز تھے۔ آئیے آج ہم خدا کے سامنے ایشور کے سامنے یہ حلف اٹھائیں کہ وہ ہمیں اسی راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے شکریہ کے ساتھ)

"جب میں دکھن جاتا ہوں، جہاں کی زبانیں نہیں جانتا اور لوگوں کے سامنے ہندی یا انگریزی میں بولتا ہوں تو دل میں ایسا خیال ہوتا ہے جیسے میں ان کی بولی سمجھ رہا ہوں اور وہ میری۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک دوسرے کی زبان کے بیشتر لفظ سمجھتے ہیں لیکن ان کے دل کی بولی مجھے صاف سنائی دیتی ہے ..... لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا ہے جیسے میرے اور آج کل کے نوجوانوں کے بیچ میں ایک دیوار سی اٹھتی جا رہی ہے۔ جیسے مجھ میں اور ان میں کچھ فاصلہ پیدا ہو چلا ہو۔ وہ میری بات پوری طرح سمجھ نہیں پاتے اور میں ان کی بات ...... یہ ٹھیک ہے کہ میں انیسویں صدی میں پیدا ہوا اور تم بیسویں صدی کی پیدائش ہو۔ مگر یہ کوئی ایسی وجہ نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے وچاروں اور بھاؤناؤں کو نہ سمجھ سکیں۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان دیواروں کو جو شاید ہمارے بیچ میں پیدا ہو گئی ہیں، گرا دوں، کچھ اپنی کہوں، کچھ آپ کی سنوں ..... بہت سے کام سامنے ہیں ..... لیکن وہ کام کس طرح ہو سکتے ہیں، جب تک آپ لوگ ساتھ نہ دیں جب تک یہ اطمینان نہ ہو کہ جس ہندوستان کو بنانے کا خواب ہم دیکھ رہے ہیں اس میں آپ بھی شریک ہیں اور ہمارا ہاتھ بٹائیں گے اور ہمارے بعد اس کام کو آگے بڑھائیں گے ......"

(جواہر لال نہرو)

سید دلدار حسین (رکن منصوبہ بندی کمیشن)

علی مَردان خاں

تاج محل کا آرکیٹکٹ

قندھار (افغانستان) کے سربلند قلعہ کو جو کسی زمانہ میں سلطنت ایران کی سرحدی چوکی کا درجہ رکھتا تھا۔ فتح کرنے کیلئے مغل شاہنشاہوں کی کوششیں بارہا ناکام ہوگئیں۔ حالانکہ مغل حکمران اس قلعہ کو فتح کرکے اپنی سلطنت کے حدود وسطی ایشیا ر میں منگولیا تک پھیلانا چاہتے تھے۔ جب دہلی میں شاہجہاں نے عنان حکومت سنبھالی تو قندھار کا گورنر علی مردان خان تھا۔ جو ایک نوجوان جنرل تھا اور نہ صرف فن سپہ گری میں مہارت رکھتا تھا بلکہ انجنیرنگ کے فن پر بھی عبور رکھتا تھا۔ شاہجہاں نے اس سے پہلے بھی اس دور افتادہ علاقے پر بارہا حملے کئے تھے۔ اور بھاری نقصان اٹھا کر نامراد و ناکام واپس لوٹ آیا تھا اس لئے اس نے دانشمندی اسی میں سمجھی کہ بجائے مسلح افواج کے تدبر و سیاست سے کام لیا جائے۔ اس غرض سے اس نے اپنے نمائندوں کو خفیہ طور پر علی مردان خاں کے پاس روانہ کیا تاکہ وہ شاہانہ وعدوں اور پرکشش ترغیبات کے ذریعہ علی مردان خاں کو جیت لیں۔ لیکن علی مردان خاں کو ان وعدوں اور ترغیبات کی کشش متاثر نہ کرسکی چونکہ وہ جانتا تھا کہ مغل حکمران کی نگاہیں اس کے ناقابل تسخیر قلعہ پر لگی ہیں اس لئے اس نے اپنے قلعہ کو مزید مستحکم بنانا شروع کردیا۔ علی مردان خاں کی تعمیری صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے قلعہ کی فصیل اور مورچوں کو مستحکم بنانے کا کام صرف ۴۰ دن میں مکمل کرلیا لیکن اس کے اس اقدام کا ایران کے دربار شاہی میں غلط مطلب لیا گیا۔ اس وقت ایران کے قدیم حکمران شاہ عباس صفوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ اور اس کی جگہ اس کے ناتجربہ کار و ناعاقبت اندیش نواسے شاہ صفی نے لی تھی۔ دربار شاہی میں علی مردان خان کے خلاف سازشیں کچھ اس انداز سے شروع ہوگئیں کہ اپنی جان بچانے کی خاطر اس نے ہندوستان کو منتقل ہوجانے اور مغل بادشاہوں کی مہمان نوازی و فیاضی سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

علی مردان خاں ۱۶۳۸ء میں شہنشاہ کے روبرو اس وقت حاضر ہوا جب وہ لاہور میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ شاہجہاں اس سے اتنا خوش ہوا کہ اس پر تحفے تحائف اور داد و دہش کی بارش کردی اسے چھ سو گھوڑوں کا سالار مقرر کیا گیا۔ اس کے قیام

سب بوس

کے لئے (نور جہاں کے باپ اعتماد الدولہ کا عالیشان محل دیا گیا اور اسے ایک پرچم و نوبت عطا کی گئی۔ علی مردان خاں
کا اور بعد میں کشمیر کا گورنر مقرر کیا گیا تاکہ وہ موسم گرما کشمیر اور سال کے دوسرے حصہ پنجاب میں گذار سکے۔ علی مردان
منتقل ہونے کا فیصلہ کر کے بڑی دانشمندی سے کام لیا تھا۔ کیونکہ یہیں کر اس کی تعمیری صلاحیتوں کے اظہار کا پورا
سب سے پہلے اس نے ہی کشمیر کے خوبصورت باغات لگائے۔ اور وہاں کے قدرتی چشموں و جھرنوں کو فوارو
پانی کی چادروں میں تبدیل کر کے ان باغات کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے۔ ان سب سے زیادہ اہم یہ کہ علی مر
سب سے پہلے دریائے جہلم پر پتھر کا ایک پل بنایا۔ جسے آج بھی علی مردان خاں کے نام پر " علی کدل " (کشمیری زبان
کہتے ہیں) کہا جاتا ہے علی مردان خاں نے وسیع علاقوں میں سرو چنار اور دیگر طویل قامت سایہ دار درخت لگوائے
لاہور تک جانے والے بارہ مولا کے درے میں مسافروں کے لئے سرائیں تعمیر کرائیں۔ اس سرائے کے گرد بعد میں جو آبادی
گئی اسے بھی اب علی آباد کا نام دیا جاتا ہے۔ اپنے ان اقدامات اور ظالم و جابر عہدداروں کے خلاف اپنی سخت تر
باعث، علی مردان خاں ریاستی باشندوں اور رعایا میں بے حد مقبول ہو گیا تھا۔

علی مردان خاں نے جو اہم تعمیری کام انجام دے ان میں سرینگر کے باغات شاہی کو سیراب کرنے کے لئے جہلم
ایک نہر کے ذریعہ منتقل بھی شامل ہے یہ نہر پہاڑی علاقوں سے گذرتی تھی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد شاہجہاں کے
لاہور کے موقعہ پر بھی علی مردان خاں نے " شب برات " کو چراغاں کا ایسا اہتمام کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے
جھرنوں آبشاروں اور فواروں نے شاہی باغ کو " پرستان " بنا دیا تھا۔ شاہجہاں جس کی آنکھ فن، صلاحیت
چانتی تھی علی مردان خاں کے اس کارنامہ سے اتنا مسرور ہوا کہ اس کو ہیروں کے جڑاؤ ہتھیار اور دیگر بے شمار
اسی موقع پر علی مردان خاں نے شاہ کی خدمت میں تجویز پیش کر اس کے پاس بعض بیرونی ایسے کاریگر جو
علاقوں میں نہریں کھودنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ اگر شاہ کی اجازت ہو تو لاہور اور گرد و نواح کے باغات کو
راوی سے ایک نہر نکالی جا سکتی ہے۔ شاہجہاں نے اس تجویز پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کے
ایک لاکھ روپے کی منظوری دیدی علی مردان خاں نے فوراً اپنی نگرانی میں اس کام کا آغاز کروا دیا اور
کے بعد ایک سال کے اندر یہ نہر مکمل ہو گئی۔ " اعتماد الدولہ " مصنف کے مطابق بہت جلد اس نہر کے کنارے
ایک خوبصورت باغ لگایا گیا۔ فواروں چھوٹی موٹی جھیلوں اور رنگ برنگ کے پھولوں سے سجے
" شالیمار " کا نام دیا گیا۔ تقریباً ۸ لاکھ روپے کے صرفے سے یہ باغ ۱۶۴۲ء میں مکمل ہوا یہ اتنا دل
ہے کہ ہندوستان میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔

یہی نہر بالائی باری دوآب نہر کا پیش خیمہ تھی جسے ۱۸۵۹ء میں نئی شکل دی گئی اور اسی نہر کی ایک شاخ
سکھ عبادت گاہ سنہرے گردوارے کو پانی پہنچایا جاتا ہے۔ جب شاہجہاں نے اپنا دارالحکومت د

قلعہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو آبرسانی کا انتظام علی مردان خاں کے حوالے کیا گیا۔ تاج محل جہاں آجکل مغربی جمنا کی نہر
واقع ہے کے اردگرد کے علاقے میں ایک بار پھر تعمیری سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ "ہندوستان کے فوجی انجینئر" نامی کتاب
لفٹننٹ کرنل ای ڈبلیو منڈ نے کے مطابق شاہجہاں کو نہر کی تعمیر کے کام سے گہری دلچسپی ہو گئی تھی اس کے پاس ایک
انجینئر علی مردان خاں تھا۔ اس نے فیروز شاہ نہر سے ایک ذیلی نہر نکالی جو ہانسی تک جاتی تھی۔ اور جس سے شہنشاہ
باغات کو پانی سربراہ کیا جاتا تھا۔ یہ کام ۱۶۲۶ء میں انجام دیا گیا اور غیر منقسم پنجاب کے آبپاشی ریکارڈ کے مطابق
تعمیر کی گئی تاکہ قصر شاہی کے فواروں کیلئے پانی سربراہ کیا جائے اور شہنشاہ دہلی میں جو نیا شہر بسا رہے تھے اس کے
مہیا کیا جا سکے۔ یہ نہر ایک ڈھلوان چٹان سے گزرنے کے بعد کابل کے دروازے سے دہلی میں داخل ہوا کرتی تھی Ways
and Works کے مصنف ملک جارج کے مطابق .... میں نہر کے دائیں بازو سے پانی خارج کیا جاتا
چھوٹی سی نہر کے ذریعہ چاندنی چوک کے وسط سے بہتا تھا۔ یہ چھوٹی سی نہر آدھی کھلی ہوئی اور آدھی ڈھکی ہوئی
یہ نہر شہر کی کئی سڑکوں سے گزرتی تھی اور محل کے غسل خانوں و باغات تک پانی کی کثیر مقدار پہونچاتی تھی۔

علی مردان خاں نے جمنا کے بائیں کنارے پر بھی ایک نہر تعمیر کی تھی۔ یہ نہر جمنا و ہنڈن دریاؤں کے درمیان کی گھاٹی کے بیچ
میں سے گزرتی تھی اور اس طرح اس شہر کے مغربی حصے پر دونوں جانب اس سے آبپاشی ہو سکتی تھی۔ اس طرح علی مردان خاں
آبپاشی نظام کا جو پنجاب میں رائج ہے بانی سمجھا جا سکتا ہے۔ سنٹرل ریکارڈ آفس حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد میں ایک
نقشہ موجود ہے جس میں مغربی جمنا کی نہر کرنال سے دہلی تک دکھائی گئی ہے۔ اسی نہر کے کنارے شہر دہلی میں علی مردان خاں کے محل
محلات واقع تھے۔ یہ بھی ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ جس مقام پر علی مردان خاں کا محل یا حویلی واقع تھی اسی مقام پر
جمنا کی نہر کے سپرنٹنڈنٹ انجینئر کے دفاتر واقع ہیں۔ ۱۶۳۸ء میں شاہجہاں آگرہ میں تھا اس نے علی مردان خاں کو دربار
اس موقع پر شاہ نے علی مردان خاں کو امیر الامراء کا خطاب عطا کیا۔ اس کے علاوہ ایک کروڑ درم د سرکاری سکہ اور اعتقاد خانی
آگرہ بھی علی مردان خاں کو دیدیا۔ بادشاہ نے یہ تحفے کیوں دیئے اس کی کوئی وضاحت تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتی
مردان خاں کو دیا گیا وہ جمنا پر امراء کے تعمیر کردہ مکانوں میں سب سے عالیشان سمجھا جاتا تھا اور شاہ کی درخواست پر
نذر پیشکش یا تحفے کے طور پر پیش کیا تھا۔ وہ کونسا غیر معمولی کارنامہ ہو سکتا ہے جس کی بنا پر شاہ نے اپنی اسی
کو علی مردان خاں پر بار فرض کردی؟ غالباً اسکی وجہ یہی تھی کہ علی مردان خاں نے شہرہ آفاق عظیم مقبرہ تاج کے مرکزی گنبد
دشوار ترین مسئلہ حل کر دیا تھا۔ شاہ جہاں کی چہیتی بیوی ممتاز محل کا انتقال ۱۶۳۱ء میں برہانپور میں ہوا۔ جہاں سے
کے مکمل ہونے پر یہاں منتقل کر دیا گیا۔ وسنٹ اسمتھ اور راس کے مطابق تاج جو ۱۶۳۲ء میں تعمیر ہونا شروع
ہوا خوبصورتی کے ساتھ ۱۶۵۴ء میں یعنی ۲۲ سال بعد مکمل ہوا۔ لیکن مرکزی مقبرہ ۱۶۴۳ء میں ہی مکمل ہو گیا تھا۔ تاج
کی اسکیم کا سب سے اہم اور آخری حصہ تھا اور اس پر غالباً شاہ اور تاج کے معماروں نے ۱۶۳۲ء سے بہت پہلے توجہ دی تھی۔

علی مردان خاں نے ان مسائل کو حل کیا اس کی بنیادوں کا انداز نیز اس کے تعمیری ڈھانچے کے استحکام کا سب ایسی باتیں ہیں جن کو حل کرنے کیلئے کسی ماہر انجینئر کی ہی ضرورت تھی۔

ایک ایسے موقع پر جبکہ علی مردان خاں کو دربار شاہی میں کوئی عہدہ حاصل نہ تھا اس کو شہنشاہ کی جانب اعتقاد خاں کا محل عطا کئے جانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً شاہ کی خواہش یہ تھی کہ وہ آگرے ہی میں قیام کر پسندیدہ منصوبہ کو روبعمل لائے۔ علاوہ ازیں انجینئرنگ کے معاملات میں شاہی مشیر کے درجہ اور مرتبے کو کسی دربار سے کم نہ رکھنے کی غرض سے شاہ نے علی مردان خاں کو دیگر کئی اعزازات بھی عطا کئے شاہجہاں اس عظیم سے اتنا خوش تھا کہ اس نے اسے آخر وقت تک تحفے تحائف اور اعزازات عطا کئے اور یار وفادار کا خطاب وزیر یا امیر کو نہیں دیا گیا تھا۔

بعض برطانوی مورخین کے اس دعوے کو کہ تاج محل کا معمار اعظم ایک اطالوی باشندہ گیرو میمو ہیر ملی نے اپنی کتاب میں باطل ثابت کر دیا ہے۔ اس نے تاج کے طرز تعمیر کی مکمل ہندوستانی نوعیت کو نہ صرف کر دیا ہے بلکہ یہ بھی بتایا کہ اس کا معمار قندھار کا رہنے والا تھا۔ یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ قندھار کا وطن تھا اور اس کے ساتھ وہاں کے کئی صناع و معمار ہندوستان چلے آئے تھے۔

اگر سترھویں صدی کے ہندوستان کے اس عظیم اور ذہین انجینئر کی یاد میں مغربی جمنا نہر کے تاج والا ہیڈ یادگاری ستون نصب کر کے پارک بنایا جائے تو یہ علی مردان خاں کی صلاحیتوں کیلئے موزوں خراج عقید

ترجمہ فاطمہ عالم علی

"ایک یادگار محفل مشاعرہ"

کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کو اپنا ماضی پیارا نہیں، کبھی کبھی تو عہد ماضی کی تلخیاں بھی حال کی دلکشی سے زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہیں۔ ماضی کے ایک رنگین لمحے پر حال کی ہزاروں رنگینیوں کو قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ بھلا سوچئے تو حسین یادوں کے ہجوم سے کسی ایک واقعہ کا بیان کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ ایک آدھ ادبی محفل ہو تو لکھوں، یہاں تو یادوں کے خزانے میں سینکڑوں محفلیں کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ ایک محفل کو اس میں سے علیحدہ کرنا ایک مرحلہ ہے۔ بہر حال ایک محفل کا ذکر کرتی ہوں لیکن یہ وعدہ نہیں کرتی کہ اس محفل شعر میں جو حضرات آپ سے ملیں گے وہ سب ایک ہی نشست سے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں دو ایک ایسے بھی ہوں جو خیالوں ہی خیالوں میں مختلف محفلوں سے یہاں لائے گئے ہوں کیونکہ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہو جو گھر پر ادبی بیٹھک نہ جمتی ہو اور ایسی صورت میں قطعی طور پر یہ کہنا کہ کونسا شاعر کس محفل میں تھا اور کس میں نہیں ناممکن سی بات ہے۔

اب سے کوئی سترہ، اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے، جب ہم لوگ بنجارہ ہل پر ایک مکان پر رہتے تھے۔ شہر میں اردو کانفرنس کا تھا۔ ہندوستان کے ہر حصے سے شعراء یہاں جمع ہوئے تھے۔ کانفرنس کا ہنگامہ ختم ہوتے ہی گھر پر ایک مشاعرہ منعقد کرنے کا ارادہ کیا۔ اور دن مقرر ہونے کے بعد تیاریاں شروع ہوئیں۔ کھانے پر کیا کیا لوازمات ہونے چاہئیں، اس پر ابا (قاضی عبدالغفار مرحوم) سے بحث رہی۔ ان کا بس چلتا تو خدا جانے کیا کیا پکوا ڈالتے، وہ تو کہئے، ہم لوگوں نے ان کی زیادہ چلنے نہ دی۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا کیونکہ جب تک کھانا تیار ہو کر میز پہ نہ آ گیا۔ ابا مختلف سوالات سے ہم لوگوں کو بوکھلائے رہے۔ کھانا لذیذ ہوا اور افراط سے ہو کی دو ترلیں ہوا کرتی تھیں۔

یہ مشاعرہ کسی نواب یا راجہ کے محل میں نہیں بلکہ ایک مزدور کے گھر پر تھا، آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ صحافی مزدور نہیں تو پھر کیا ہے! یہی وجہ ہے کہ یہاں وہ لوازمات ناممکن تھے جو مشاعرے کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً فرش تو تھا مسند اور شمع نہ تھی، شعرائے مرعو نہ تھا۔ کسی قسم کی کوئی سجاوٹ نہ تھی، نہ شامیانے تھے نہ قالین تھیں، البتہ آسمان پر تاروں نے جھلملاتا شامیانہ ضرور تان رکھا تھا، ہماری محفل کی سجاوٹ میں فطرت دل کھول کر حصہ لے رہی تھی۔ چھت پر ایک طرف میز جڑ دی گئی تھی۔ لوٹے کا انتظام تھا۔ مگر ان پر کوئی خاص توجہ نہ تھی اور یہ طریقہ گویا نہایت غیر شاعرانہ مذاق کی گواہی دے رہا تھا۔ فرش پر ادھر ادھر گاؤ تکیے اور

کشن رکھ دیے گئے تھے۔ سگریٹ اور پان کی گوریاں خاصدانوں میں خوبصورتی سے سجا دی گئی تھیں اور شاید یہ محفل
کی قائم مقامی کر رہی تھیں۔ غرض وقت مقررہ پر مہمان آنا شروع ہوئے ہیں جو کہ اس دور سے گزر رہی تھی جبکہ مشہور لوگو
فخر اور پھر اپنے ساتھیوں میں فخر کے ساتھ اس کا چرچا کرنا مقصدِ حیات ہوتا ہے اور اس محفل میں تو بعض ایسی ہستیاں بھی
ملنے والی تھیں۔ پڑھنے اور سننے والوں کی فہرست کافی طویل تھی، جو نام اب تک ذہن میں ہیں وہ عرض کرتی ہوں، اس میں
جگر مرادآبادی، فضل الرحمٰن، سکندر علی وجد، اسرار الحق مجاز، مجروح سلطان پوری، پریم دھون، ہوش بلگرامی
غلام ربانی تاباں، مخدوم محی الدین اور ساحر لدھیانوی شریک تھے۔

ادیب اور شاعر جب ایک جگہ ہو جائیں تو اس محفل کا رنگ ہی جدا ہوتا ہے ان کی آپس کی گفتگو سننے پر
اظہار الفاظ میں ناممکن ہے ان کی معمولی سی گفتگو بھی ادب پارے کہلانے کے قابل ہوتے ہیں جو بات ان کے منہ سے نکلے
یہ بات صرف وہی کہہ سکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ شاعر کی زندگی ناکامیوں میں بسر ہوتی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ جیسے
مذاق اڑانا جاتا ہے، جب ہی تو اس کے منہ سے نکلا ہوا لفظ زندہ دلی کا اعلان کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

دیکھیے سب مہمان آ چکے ہیں۔ آیئے کھانے کی طرف چلیں، یہاں مہمان اور میزبان میں تمیز کرنا مشکل
کی خاطر بھی کرتے جاتے ہیں اور باتیں بھی۔ اتنے میں میری نظر آغا چچا کی طرف گئی تو دیکھتی ہوں تنہا کرسی پر بیٹھے گود
میں مصروف ہیں۔ میں نے قریب جا کر پوچھا۔ آپ سب سے الگ کیوں آ کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے "بیٹا، قاضی کی محبت
معلوم ہوتا کہ ہاتھ پر روٹی رکھیں گے تو ہرگز نہ آتا۔" آغا چچا کو دو چیزوں سے سخت نفرت ہے ایک تو کھڑے
مائیکروفون منھ کے سامنے رکھ کر بات کرنا۔ خیر صاحب کھانا تو جیسا کچھ تھا البتہ دلچسپ گفتگو نے کھانے کی لذت کو
کہ کھانا کم اور باتیں زیادہ رہیں۔

پان اور سگریٹ کا دور شروع ہوا۔ سب اپنی اپنی جگہ فرش پر آ بیٹھے۔ اب مشاعرے کا آغاز ہونے
یہ تو لکھنؤ کی "پہلے آپ" ہو گئی، ہر شاعر دوسرے سے اصرار کر رہا ہے کہ پہلے آپ سنائیے، خدا کا شکر ہے آغا
مجروح تم شروع کرو۔" دیکھا آپ نے یہ میانے قد کے دبلے پتلے سے انسان مجروح سلطان پوری ہیں۔ جگر صاحب کے
عاشقوں میں ہیں۔ دیکھیے تو مجروح کو دیکھ کر جگر صاحب کی آنکھوں سے کیا پیار چھلک رہا ہے۔ مجروح ایک
شاعر ہوا کرتے تھے اب تو خالص فلمی شاعر ہو کر رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف تخلص مجروح ہے بلکہ ش
خیر اب وہ کچھ بھی ہوں ہماری یادوں میں اب بھی غزل کے شاعر ہیں۔ مجروح نے پڑھنے کا انداز
پڑھتے ہیں لیکن ہلکے ہلکے کہتے ہیں ؎

یہ رُکے رُکے سے آنسو، یہ گھٹی گھٹی سی آہیں   ہے   یوں ہی کب تلک خدایا غ
کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ   ہے   تری آرزو نے ہنس کر دیں

واہ واہ کے ساتھ دوسری غزل کی فرمائش ہوئی اس کا بھی ایک شعر یاد ہے سنئے ؎

شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی ؏ کبھی اک چراغ جلا دیا کبھی اک چراغ بجھا دیا

شعر کی اس بے قراری نے ساری محفل کو جھنجھوڑ دیا، دیر تک تعریف ہوتی رہی مجروح صاحب اپنی جگہ پر پہنچ چکے تھے منٹ میں سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آپ نے غلام ربانی تاباں کو اشارہ کیا۔ تاباں ڈیل ڈول اور رنگ و روغن سے پورے پٹھان لیکن اشعار کا مزاج پٹھانی نہیں۔ تاباں تحت اللفظ پڑھتے ہیں، کہتے ہیں ؎

بجرم رسم راہِ دنیا کی پابندی بھی ہے ؏ غالباً کچھ شیخ کو زعم خردمندی بھی ہے

بجلیوں سے سازشیں بھی کر رہا ہے آسماں ؏ ہم چمن والوں کو حکم آشیاں بندی بھی ہے

تعریفوں کے شور میں کئی بار اشعار دہرائے اور اپنی جگہ جا بیٹھے۔

دبلا پتلا میانہ قد، سلونا رنگ، نازک ناک نقشہ اور بیحد شرمائے ہوئے جو صاحب سامنے آئے ہیں، آپ پہچانتے ہیں؟ یہ اسرار الحق مجاز ہیں۔ یہ کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتے بشرطیکہ "پی" نہ ہو۔ آج یہ کچھ جھینپے ہوئے بھی ہیں۔ کل جب آپ نے ان کو بلایا تھا کیفی اعظمی سے کہا کہ قاضی صاحب کچھ اچھے آدمی نہیں، نہ پیتے ہیں نہ پلاتے ہیں، جانے سے کیا فائدہ" آپ نے انکار کر دیا تھا۔ مجاز ایسی بات "پی" کر ہی کرتا ہے۔ مجاز کے سامنے آتے ہی فرمائشیں شروع ہو گئیں۔ کوئی کہتا ہے "اعتراف" سناؤ، کسی طرف سے آواز آئی "تعارف ہونا چاہیئے۔ ان کے دوستوں نے کہا "مجاز آوارہ سناؤ" اور مجاز سنانے لگے، ہر طرف سے داد دی جا رہی تھی لیکن مجاز اس طرح سناتے تھے جیسے وہ خود نہیں ان کا ریکارڈ لگا ہو۔ جب اس موڑ پر پہنچے کہ ؎

راستے میں رک کے دم لوں یہ میری عادت نہیں ؏ لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں

اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں ؏ اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

تو ساری محفل جھوم اٹھی، آہ آج مجاز ہم میں نہیں رہے۔ اس کی وحشت دل نے اس کو زیادہ دن جینے نہ دیا اگر "وحشت" کچھ صبر سے کام لیتی تو خدا جانے آج مجاز شعر کی کن بلندیوں پر پہونچ جاتا اس محفل میں ایک غزل بھی سنائی اس کا ایک شعر تھا ؎

یہ رنگ بہار عالم ہے کیوں تجھکو فکر ہے اے ساقی ؏ محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

کاش مجاز کو اس کا اندازہ ہوتا کہ اس کے جانے سے محفلیں کتنی سونی ہو گئی ہیں۔ آئے تو بہت، لیکن اس کی جگہ کوئی پر نہ کر سکا۔

ان کے بعد قرعہ سکندر جعفری کے نام پر پڑا۔ دبلے پتلے، اپنے حلیے سے قطعی بے نیاز یہ اور کیفی صاحب ہمارے یہاں مقیم تھے۔ ہر وقت بیگم کہتی تھیں کہ خدا کے لئے دونوں کا منھ آپ اپنے سامنے دھلوایئے، عادتوں کے لحاظ سے اس وقت تو سکندر صاحب کیفی جڑواں بھائی معلوم ہوتے تھے، ابھی خبر نہیں۔ یہ جدید شاعری کے رسیا ہیں، عجیب اتفاق ہے کہ ان کی کوئی چیز مجھے یاد نہیں اتنا ضرور کہوں گا کہ تحت اللفظ پڑھتے ہیں اور بہت اونچے ڈھنگ سے الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں۔

ان کے بعد کیفی اعظمی آگے کھسک آئے۔ "کھسک" کا لفظ خاص انہیں پر جچتا ہے!! جی چاہتا ہے ان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیجیے

ہاتھ پیر ہلانا دو بھر ہو، جب دیکھو نیند کی کیفیت طاری ہے، بال ہیں کہ آنکھوں میں گھسے جاتے ہیں مگر ان کو پیشانی سے ہٹا ہلتا مزہ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں کیفی پیتے نہیں تھے۔ لیکن پہلی بار دیکھنے سے یہ گمان ہوتا تھا کہ نہ صرف پئے ہوئے ہیں بلکہ چڑھ اب جو یہ سامنے آئے تو خیال آیا کہ اس قدر مجہول انسان خدا جانے آواز نکالنے کی زحمت بھی گوارا کرے گا یا نہیں۔ نہیں صاحب سنانے پر آئے تو ایسا معلوم ہوا کہ ساری چستی اشعار سنانے ہی کے لئے محفوظ کر رکھی تھی۔ ان کی نظم کا عنوان تھا "نئی جنت" چند کہتے ہیں ؎

الٹ کر ایک ٹھوکر میں ستم کا راج رکھ دیں گے ✽ اٹھا کر اپنی پستی کو سرِ معراج رکھ دیں گے

وہ اک گل کی حکومت تھی کہ گلشن لٹ گیا سارا ✽ ہم اب کی غنچہ غنچہ کی جبیں پر تاج رکھ دیں

ہم اب کی تنکے تنکے کو چمن بندی سکھائیں گے ✽ نئے ہندوستان میں ہم نئی جنت بنائیں۔

عزم و ارادے کو پُرجوش اندازِ بیان نے چار چاند لگا دیے۔ ان کے بعد پریم دھون نے گیت سنائے۔ افسوس بول بھی یاد نہیں لیکن بڑے سُریلے اور سجیلے بول تھے۔ اب تو پریم دھون کے گیت فلموں کے ذریعے سننے کو ملجاتے ہیں زبانی سننے کا لطف کچھ اور ہی تھا۔

ان کے بعد ساحر لدھیانوی آگے بڑھے۔ اس وقت اتنے مشہور تو نہ تھے شہرت کے آثار ضرور نمایاں انھوں نے کئی چیزیں سنائیں۔ ایک بند آجکل تو بہت عام ہے، کہتے ہیں ؎

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ✽ ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ ـــــ سے

بھئی کوئی بُرا مانے یا بھلا، میں نے یہ سنا تو ایک دم خیال آیا کہ عجیب جل ککڑا شاعر ہے۔ محبت سے کیا سروکار، اس کا ٹھکانہ دونوں جگہ ہے۔ ہندوستان کے ایک عظیم شاہکار پر اتنا بڑا بہتان شاعر کرے، دولت کے سہارے اگر تاج محل تعمیر ہوا تو اس تعمیر کے سہارے کتنے گھروں کے چراغ روشن ہوئے۔ شاعر یہ بات گیا۔ خیر اپنا اپنا خیال ہے۔

ان کے بعد سکندر علی وجد تشریف لائے، یہ لطیفے سنانے میں اپنی مثال آپ ہیں اپنی وضع قطع اور لحاظ سے دوسرے شاعروں سے ذرا الگ جدید شاعری سے ان کے ستارے نہیں ملتے۔ نظم اور غزل ان کا میدان دیکھنے میں بڑے نازک ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ آواز بھی اسی مناسبت سے ہوگی۔ لیکن جب سنانے پہ آئے تو اِدھر اُدھر دیکھا کہ یہ گرجدار آواز کہاں سے آئی لیکن یہ وجد صاحب ہی پڑھ رہے تھے۔ ترنم سے پڑھتے ہیں ؎

ہمت کے چراغوں سے روشن ہر راہ گزر ہو جاتی ہے ✽ جب عزم نگاہ راہ رواں سامانِ سفر ہو جا

دل رنگ بدلتا ہے پیہم، چھٹتا ہے غبارِ شادی و غم ✽ ہو وصل کی شب یا ہجر کی شب، ہر شب کی

ے وجد جہانِ الفت میں آرام کی صورت کیا ہوگی ✤ دل اور پریشان ہوتا ہے تسکین اگر ہو جاتی ہے

رنگِ تغزل اور وجد کا اندازِ ترنم دونوں نے مل کر محفل پر عجیب کیفیت طاری کردی۔ ان کے بعد مخدوم محی الدین حیدرا

باد آئے، یہ بھی حلیئے کے لحاظ سے اللہ کے فضل سے اپنے ساتھیوں سے الگ نہیں۔ مخدوم محی الدین عوامی شاعر ہیں ان پر ترنم

کا ایسا اختیار ہے، شاید ان کو خود پر بھی نہ ہوگا۔ اس زمانے میں جواں سال شعراء میں شمار تھا۔ ان کی شخصیت بڑی پرکشش ہے

انہوں نے کئی چیزیں سنائیں مگر وقت کے اعتبار سے چند شعر سن لیجئے۔ دیکھئے مخدوم سوال کر رہے ہیں بن پڑے تو جواب دیجئے

گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا ✤ تری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا

جنوں کی لغزشیں خود پردہ دارِ رازِ الفت ہیں ✤ جو کہتے ہو سنبھل جاؤ، سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا

مخدوم کا اندازِ ترنم بڑا دلفریب ہے جب بھی ان سے سنانے کی فرمائش ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ ترنم کی شرط بھی لگائی

جاتی ہے۔ دیکھئے یہ چھوٹے قد کا، بال بکھرائے، پان منہ میں دبائے ضرورت سے زیادہ سعادت مند نظر آنے والا کوئی جانا

پہچانا تو نہیں، یہ ہیں شاہد صدیقی، جو اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ اس زمانے میں یہ ترنم سے سناتے تھے اور جگر کے ترنم سے متاثر

معلوم ہوتے تھے۔ آخر زمانے میں ترنم بالکل ترک کر دیا تھا۔ ان کے دو شعر سنیئے ؎

کبھی دل نے راہِ غم میں بہت اشکِ خوں بہائے ✤ کبھی وہ مقام آیا کہ حیات مسکرا دی۔

یہ غرورِ بے حقیقت، یہ سرورِ بے لطافت ✤ مجھے آج تو نے ساقی کوئی اور شے پلا دی۔

ترنم اور انداز نے غزل کو بالکل غزل بنا دیا۔ شاہد صدیقی کی موت اردو ادب میں ایک ایسا حادثہ ہے جس کی تلافی موجودہ

دور میں ناممکن ہے جب یہ خیال آتا ہے کہ شاہد صدیقی اب کبھی ہماری محفلوں میں نہ آسکے گا تو غصہ سا آتا ہے کہ اس نے جانے میں کیوں جلدی

کی لیکن شاید قدرت کے نزدیک دنیا میں اس کا مقصدِ حیات پورا ہو گیا۔ جب ہی تو بلا لیا گیا، افسوس۔

ان کے بعد فضل الرحمٰن صاحب کی باری آئی۔ یہ کسی طرف سے شاعر نظر نہیں آتے۔ جب سنانے کے لئے سامنے آئے تو مجھے

یقین نہ آیا لیکن جب سنانے لگے تو ماننا پڑا کہ شاعر اس طرح بھی رہ سکتے ہیں۔ اس دن موڈ میں تھے اور نہ بھی ہوتے تو فضا کچھ ایسی

تھی کہ خود بخود موڈ آجاتا، کئی چیزیں سنائیں "ذروں کا ناچ" کے چند شعر سنیئے ؎

یہ شگوفے حسینوں کی جن میں ادا ✤ یہ نسیم کا رقص، یہ موجِ صبا

یہ پرندے یہ پیت کے مارے ہوئے ✤ نہیں بجھتی پریم کی جن سے اگن!

یہ سہانے نظارے یہ پیاری زمیں ✤ وہ فضائیں فلک کی وہ چرخِ بریں

یہ ہے برق کے ذروں کا ناچ پیا ✤ وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن

فضل الرحمٰن صاحب تحت اللفظ پڑھ رہے تھے لیکن الفاظ میں غضب کا لوچ، اور آواز میں ترنم جیسی لچک نے

عجیب ڈھنگ پیدا کر دیا تھا جس کو نہ ترنم کہہ سکتے تھے نہ تحت اللفظ بہر حال دونوں کے درمیان جو بات بھی تھی بہت

خوب تھی۔ جب یہ سنا کہ اور دل واہ کا شعر کچھ کم ہوا تو ایک آواز آئی " واہ میاں واہ، لطف آگیا، مجھے ایسا معلوم ہوا مشاعرہ ہو گیا ہے۔ سمجھے آپ؟ یہ آغا جانی کی آواز تھی جس سے ساری محفل قہقہہ زار بن گئی۔

" اب جگر تمام کے مشہور ری باری آئی " یہ دیکھئے پسینہ پونچھتے ہوئے جگر مرادآبادی سامنے آگئے، ان کا پہلا شاعرانہ ہے۔ ٹوپی سے باہر نکلی ہوئی کٹ، یہ بھی اک ادا ہے، یہ لٹ دوسرے بالوں کے مقابلے میں سفید ہو چلی ہے، یا دھوپ سے سفید ہو گئی ہو، یہ نہایت سنجیدہ انسان ہیں۔ خصوصاً جس محفل میں خواتین ہوں ان کی متانت حدوں سے گزر کر بوجھ معلوم ہوتی ہے۔ ان کے سامنے آتے ہی ساری فضاء جیسے ساکت سی ہو گئی جیسے جگر کو سننے سبھی ہمہ تن گوش ہوں۔ جگر صاحب پہلے گنگنائے، پھر کچھ منہ ہی منہ میں الفاظ ترنم کے ساتھ دھرائے، لیجئے وہ ترنم سے پڑھنے لگے۔ ان کے ترنم کو اپنانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے، افسوس جگر کا ترنم بھی انھیں کے ساتھ گیا۔ دیکھئے کیا کہتے ہیں ؎

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا ٭ دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا

ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو ٭ میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

ایک سماں سا بندھ گیا۔ شاہد اور مجروح کا بس نہ چلتا تھا کہ جگر صاحب کی بلائیں لے لیں۔ اس کے بعد دوسری اور پھر تیسری چھڑتی رہی ایک غزل کا ایک شعر تو سنئے ؎

اے محتسب نہ پھینک، میرے محتسب نہ پھینک ٭ ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

کس قدر بے ساختہ شعر ہے۔ ایک شعر میں بہ یک وقت دو کیفیتوں کو سمو دینا جگر ہی کا کام ہے۔ ایک طرف محبت۔ التجا اور خوشامد، دوسری طرف ظالم کہکر جھنجھلاہٹ اور کوفت کا اظہار۔ سبحان اللہ!!

جگر صاحب کے کلام پر مشاعرہ ختم ہوا۔ سوچتی ہوں اس محفل کے کتنے پھول مرجھا گئے۔ جو صرف اب یادوں کے خزانوں اور خیالوں کے پردوں پر محفوظ رہیں گے۔ مجاز، شاہد اور جگر مرادآبادی اب کبھی جیتی جاگتی محفلوں میں شریک نہ ہوسکیں گے۔ تکلیف دہ خیال ہے، لیکن اس خیال کی تسلی کو یادیں کیا کچھ کم ہیں!!! (آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے شکریہ کے ساتھ)

پروفیسر ڈاکٹر غلام عمر خان

نٹشے کا تصورِ خیر و شر

نٹشے وہ پہلا مفکر ہے جس نے خیر و شر کے روایتی تصور پر ضرب لگائی۔ نٹشے کے نزدیک خیر و شر کی قدریں شخصیت انسانی سے آزاد کوئی مجرد حیثیت نہیں رکھتیں، وہ اضافی ہیں اور ذات کی سود و بہبود اور اس کی وسیع و استحکام کی اضافت سے متعین ہوتی ہیں۔ "دزاسپیک زرداتسترا" میں زندگانی زرتشت سے یوں مخاطب ہوتی ہے :

" ہم دونوں نہ نکو کار ہیں اور نہ بدکار ---- ہمیں اپنا جزیرہ اور سبزہ زار نیک و بد کے پار ملا ہے، ہم دو اکیلوں کو۔ اس لئے ہمیں باہم مل جل کر رہنا چاہیئے" [1]

نٹشے کی نظر میں خیر و شر اور حسن و قبح اشیا کی مختلف تعبیریں ہیں جن کی غایت بتانی علم اخلاق کے موضوع سے باہر ہے۔ خیر و شر کا مسئلہ حیاتیاتی (BIOLOGICAL) مسئلہ ہے۔ فرد یا جماعت اپنی تحفظِ ذات (Self Preservation) کے نقطۂ نظر سے اشیا کے اچھے یا برے ہونے پر حکم لگاتی ہے۔ اس طرح کسی قوم یا جماعت کے نزدیک خیر و شر کا تعین ان کے مخصوص جغرافیائی اور تاریخی حالات کے تحت ہوتا ہے۔ خیر و شر کی اضافیت کی تشریح کرتے ہوئے نٹشے ایک دلچسپ مثال پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے "بھیڑوں کا درندوں سے کدورت رکھنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ مگر ہم درندوں کو بھی مجرم نہیں ٹھہرا سکتے۔ اگر بھیڑیں آپس میں کہیں کہ درندے بہت برے ہیں۔ اور وہ جانور جو ہم سے بہت دور رہتے ہیں اچھے ہیں۔ تو اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ہو سکتا۔ لیکن درندے اس گفتگو کا مذاق اڑائیں گے اور شاید آپس میں کہیں کہ ہم کو ان غریب بھیڑوں سے عداوت کیسی۔ بلکہ ہم تو ان سے محبت کرتے ہیں ہمیں ان کے گوشت سے بڑھ کر کوئی غذا لذیذ اور لذیذ نہیں معلوم ہوتی۔"

تاریخی نقطۂ نظر سے خیر و شر کی تبدیلیوں کو واضح کرتے ہوئے نٹشے نے بتایا ہے کہ ابتدا میں کسی فعل کا اچھا یا برا ہونا اس کے نتائج پر موقوف ہوتا تھا اس کے بعد خیر و شر کے الفاظ ان اعمال کیلئے استعمال ہونے لگے جن سے اچھے یا برے نتائج

---

[1] نٹشے دزاسپیک زرداتسترا ص ۲۲۱

پیدا ہوتے تھے۔ پھر ارادوں اور نیتوں کے لئے یہ اصطلاحات استعمال ہونے لگیں بالآخر انسان نیک و بد شمار ہونے لگے۔[1] جو اب عہد جاہلیت سے مروجہ اخلاق کو نطشے "غول پسند اخلاق" (gregarious morality) سے موسوم کرتا ہے۔
اس اخلاق کا تجزیہ کرتے ہوئے نطشے کہتا ہے کہ انسان ہمیشہ سے گروہوں میں زندگی بسر کرتا چلا آیا ہے۔ خاندان، قبیلہ، فرقہ، مملکتیں کسی نہ کسی گروہی یا جماعتی زندگی سے اس کا سابقہ رہا ہے۔ گروہ یا جماعت میں فرمانبرداروں کی تعداد ہمیشہ حکومت کرنے والوں کی تعداد کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے فرمانبرداری حکومت کرنے کے ہنر کے مقابلے میں، انسان میں بہت زیادہ پرورش پاتی رہی ہے۔ اور انسان غیر مشروط اقدام کے ایسے معیار کو قبول کر لینے کا عادی رہا ہے، جو اس کے ذاتی اور اندرونی اقتضا سے متضاد ہوتا ہے۔ ایک "اسمی ضمیر" اس کے اندر پرورش پاتا رہا۔ جو اس کے فطری اور اندرونی اقتضا سے مختلف تھا۔ جیسے یہ وہ کسی فعل کو اچھا یا برا اس لئے نہیں قرار دیتا کہ وہ فعل حقیقت میں ایسا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اس کو برا کہتا آیا ہے۔ ضمیر ماحول سے پیدا ہونے والی ایک قوت ہے، جو ماحول کے مخصوص حالات کے تحت غرض فرمانبرداری اور غلامی کی ذہنیت، اطاعت، خاکساری، غم خواری، رحم دلی، مساوات اور اعتدال جیسی اخلاقیات کی تخلیق کرتی ہے۔ اور گروہ یا جماعت ہمیشہ ایسے انسانوں کا خیر مقدم کرتی ہے۔ کیونکہ یہ اس کے حق میں بے ضرر، قابل برداشت اور مفید ثابت ہوتے ہیں۔ جو شخص جماعت میں رہ کر مساوات، اعتدال وغیرہ برقرار رکھے وہ لائق تحسین ہے، اچھا ہے، نیک ہے، اور ایسے "گوسفند صفت" انسان کے برعکس قوت و طاقت اور بڑی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ، ہمیشہ جماعت کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا باعث ہوتا ہے۔[2] ہر وہ شئی جو کسی شخص کو جماعتی سطح سے آگے بڑھاوے، اور ہر وہ چیز جو پڑوسیوں میں خوف پیدا کرے قبیح و معیوب سمجھی جاتی ہے۔

شریفانہ اخلاق

لیکن نطشے کے نزدیک خود اپنی ذات سے نہیں بلکہ پڑوسیوں سے محبت حقیقت میں پڑوسیوں سے خوف پر مبنی ہوتی ہے۔[3] وہ کہتا ہے غول پسندانہ اخلاق میں جو فطرت کے حیاتیاتی اصولوں کی نفی کرتے ہیں اور بقائے اصلح (survival of the fittest) کے اصول کو کچلتے اور اعلیٰ تہذیب کی نشوونما میں سد راہ ہوتے ہیں۔ نطشے کے نزدیک ایک صحت مند اصول یہ ہے کہ خواص یا شرفا کی جماعت عوام کے طبقے پر حکومت کرے اور اس کے لئے لازمی ہے کہ شرفا خیر و شر کے ایک اعلیٰ معیار کو اپنا دستور العمل قرار دیں۔ اور غلامانہ اخلاق (slave morality)

---

۱ نطشے ہیومن آل ٹو ہیومن حصہ اول ص ۵۹۔ ۲ نطشے بیانڈ گڈ اینڈ ایول ص ۱۳۱ ۳ نطشے بیانڈ گڈ

اخلاق میں انحراف کرے، اور ہمسایہ کی محبت کو نہیں بلکہ اپنی ذات کے احترام یا حب ذات (Self Love) کو تمام اخلاق کا سنگ بنیاد قرار دے۔ نطشے کہتا ہے۔

"انسان کو خود اپنے آپ سے محبت کرنی سیکھنا چاہیئے۔ یہ ہے میری تعلیم، ایک صحیح و سالم اور تندرست محبت کے ساتھ تاکہ انسان خود اپنے آپ سے اکتا نہ جائے اور ادھر اُدھر بھٹکتا نہ پھرے۔

"اس طرح سے بھٹکتے پھرنے کا نام "محبت ہمسایہ" ہے۔ اس لفظ کے ذریعہ سے لوگوں نے اب تک بہترین دروغ گوئی کی ہے۔ خاص کر ان لوگوں نے جو ساری دنیا پر بوجھل ہیں۔ اور واقعی اپنے آپ سے محبت کرنی سیکھنا کچھ آج یا کل کے لئے فرض نہیں ہے۔ بلکہ ساری لطیف ترین، زیرک ترین، اور متحمل ترین صنعت ہے"[1]

نطشے کہتا ہے کہ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ شرفا کی ایک نئی جماعت تیار کی جائے جو عوام اور خواص کے موجودہ طرز عمل کا قلع قمع کر دے۔ اور جو "شریف" کا لفظ کسی نئے معنی میں استعمال کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ شرافت کیا ہے، نطشے کے نزدیک شرافت کی علامتیں یہ ہیں۔ اپنے فرائض کو عوام کے فرائض کے برابر نہ کرنا، اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے یا ان میں کمی کرنے پر راضی نہ ہونا، اپنے اختیارات خصوصی کا برقرار رکھنا اور ان سے کام لینا۔[2]

نطشے کے شریفانہ اخلاق کا بنیادی معیار یہ ہے "وہ تمام چیزیں جو قوت و اقتدار کے احساس کو بڑھاتی ہوں، عزم اقتدار (Will-To-power) کو بڑھانے کا باعث ہوں، اور بہ حیثیت مجموعی انسان میں قوت و اقتدار کا اضافہ کرتی ہوں، خیر ہیں۔ اس کے برعکس وہ تمام چیزیں جو کمزوری کی زائیدہ ہوں، شر ہیں"[3] — جرأت، اعلیٰ عزائم، صداقت کی جستجو، زندگی کو سود و زیاں اور لذت و الم کے نکمے اصولوں سے نہ جانچنا، محض زندگی کو نہیں، بلکہ قوت اور با اقتدار زندگی کو اپنا مقصود بنائے رکھنا، غرض حیات کا اثبات کرنے والی اور حیات افزا فعلیت شریفانہ اخلاق میں داخل ہے اس کے برعکس بزدلی، کم حوصلگی، رسوم و قیود کی پابندی، عجز، قناعت، خیرات، رحم، غرض ہر قسم کی انفعالی مزاجی غلامانہ اخلاق میں شامل ہیں۔

جنگ اور تصادم کا جذبہ نطشے کے نزدیک شریفانہ اخلاق کا ایک اہم مظہر ہے۔ آنے والی نسلیں جو نطشے کے نظام اخلاق پر عمل پیرا ہوں گی۔ ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ انتہائی جری اور بے باک ہوں گی۔ "یہ وہ لوگ ہوں گے جو انسانوں، دیوتاؤں اور ستاروں سے مقابلہ کریں گے۔ نطشے کہتا ہے، جنت تلوار کے سائے میں ہوتی ہے اور یہ ایک رمز اور کسوٹی ہے جس کے ذریعہ جنگ پسند اور شریف روحیں اپنے آپ کو پہچانتی ہیں"[4] — نطشے کے نزدیک ہماری دنیا سے

---

[1] نطشے، بقول زردشت، ص ۲۷۵ — [2] نطشے، بیانڈ گڈ اینڈ ایول، ص ۲۱۹، ۲۲۰

[3] نطشے، اینٹی کرائیسٹ، ص ۱۸۸ — [4] ول ٹو پاور، جلد دوم، ص ۳۶۹

یونانی دنیا کو جو امتیاز حاصل تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ جنگ سے محبت تھی۔ یونانی طبعاً غیور ہوتے تھے۔ اور جنگ جوئی کو بدنما داغ نہیں بلکہ اپنے دیوتا کا فضل وکرم سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر قدرتی نعمت کا ظہور جنگ اور تصادم پر موقوف تھا۔ نیٹشے کہتا ہے۔

"ان اقوام کے لئے جو روز بروز کمزور اور ذلیل و خوار ہوتی جاتی ہیں۔ جنگ اکسیرِ اعظم ہے۔ اگر واقعی انھیں دنیا میں زندگی کرنا ہے۔ انفرادی ہو یا اجتماعی ہر قسم کی تباہی کا علاج تشدد آمیز ذرائع سے ہونا چاہئیے۔ ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا کرنا اور موت سے گریز کرنا درحقیقت جذبات و حسیات کے بوسیدہ ہوجانے کی نشانی ہے۔ اگر ہم عزت اور ناموری کے ساتھ دنیا میں رہنا چاہتے ہوں۔ تو ہمیں ایک ایک مسرت اور کامرانی کے بدلے جان قربان کر دینے پر تیار رہنا چاہئیے۔ جو لوگ اس قسم کے جذبات رکھتے ہیں ان کو پھر جنگ کی ضرورت نہیں ہوتی"۔

بسلسلہ صفحہ (۳۷) حافظ شیرازی کے اشعار سے فال نکالنے کی جدول

خیز تا از درِ میخانہ کشادی طلبیم   در رہِ دوست نشینیم و مرادے طلبیم

اختر صاحب کے مذکورہ مضمون میں پانچ روپے گیارہ پیسے کی مٹھائی پر جس نیاز کا ذکر ہے۔ وہ کتب خانہ آصفیہ کے نسخے میں ندارد ہے۔ مفت میں فال نکالنے والوں کے لئے یہ خوشخبری ہے۔ تاہم جو لوگ مٹھائی کھلانے پر تلے ہوئے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ خرچ کریں اور ہمیں نہ بھولیں۔

جلالی شاہجہاں پوری

ہند قدیم میں فن طب کا ارتقا

طب کی ایجادی قدامت طب کی قدامت اور اس کا زمانہ تدوین مختلف فیہ ہے لیکن جدید تحقیق کی رو سے چھ ہزار قبل مسیح طب کا تدوینی وجود متفق علیہ ہے۔ دنیا کی کئی قدیم اور مہذب قوموں نے اس کی ایجاد کا دعویٰ کیا ہے۔ کلدانیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس فن کے موجد اول ہیں۔ حکمائے ہند نے اس کی ایجاد کا سہرا دیوتاؤں کے سر باندھا ہے اور مصری قدیم طب کو ہندی طب کی ایک شاخ بتایا ہے لیکن ان دعاوی پر جب نقد و تحقیق کی نظر ڈالی جاتی ہے۔ تو منطقی عقل کا یہ فیصلہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم ضرورت کے مطابق اپنی طب کی خود موجد ہے۔ صحت بدنی کے قیام کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت پڑی وہ ہر قوم نے اپنے ہی ملک سے فراہم کئے۔ ہوش و خرد سے عاری ہونے کے باوصف جانور بھی اصلاً ایسی بوٹیوں کے اثرات سے فطری طور پر واقف ہیں اور ان کے استعمال سے وقتی تکلیف کا دفعیہ کر لیتے ہیں۔

انسان ارتقائے ذہنی کے ساتھ اپنی آرام و آسائش اور قیام صحت کے وسائل و ذرائع کی تلاش سے کبھی خالی الذہن نہیں رہا اور حقیقت میں انہی ذرائع کی تلاش و جستجو کا دوسرا مختصر نام طب ہے۔ اب رہا ان اسباب و علل کی علمی اور فنی حیثیت سے تدوین، اس میں دنیا کی مہذب اقوام کی ساعی کم و بیش مشترک رہی ہیں اور تمام تہذیبوں نے مل کر اس کے قدم آگے بڑھائے ہیں۔ اگر ایک طرف کلدانیوں اور ہندیوں نے اس کی سرپرستی کی تو دوسری طرف مصریوں نے بھی اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ان سب اقوام کی انفرادی ساعی کا اجتماعی نتیجہ اس کی ہمہ گیر ترقی کی صورت میں برآمد ہوا۔

تدوین طب میں ہند کی سابقت ـــــــــ طب کی موجودہ ارتقائی صورت یقیناً متمدن اقوام کی مشترک ساعی کا نتیجہ ہے لیکن بحث طلب مسئلہ اس کی فنی حیثیت سے ابتدائی تدوین کا ہے ویدک عہد کے علمی اور فنی ارتقا کے حالات ہم تک جن ذرائع سے پہونچے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں یہ فن تدوینی صورت اختیار کر چکا تھا چنانچہ ویدوں کا گہرا مطالعہ علم طب ان کے اصول و ضوابط کی مکمل نشاندہی کرتا ہے اتھر وید میں تفصیلی طور پر امراض کے نام و علامات اور اعضائے بدنیہ کی تشریحات موجود ہیں اور اس عہد کا نظام تعلیم خود اس حقیقت کا گواہ ہے کہ سائنس و حساب اور طبعیات و کیمیا کے ساتھ فن طب کو نمایاں حیثیت حاصل تھی بلکہ علم طب کے جداگانہ مدارس قائم تھے جہاں اس کی نظری اور عملی تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا۔

اور عہد ثانی عہد میں اس فن کو خصوصی حیثیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اشوک اعظم کے بہت سے کتبوں میں انسانی علاج کے علاوہ حیوانوں کے معالجے کے طریقے اور ادویات کے نام مع خواص و اثرات کے ملتے ہیں۔[1]

فن جراحی اور آلات سازی

فن جراحی بھی ہندوستان کا قدیم ترین فن سمجھا جاتا ہے۔ رگ وید کے اوراق تین مشہور عالم جراحوں کی نشاندہی کرتے ہیں دوو داس، بھاردواج اور اشونی کمار۔ اس کے علاوہ بھیشم کے زخموں کو عمل جراحی سے درست کرنے کے لئے دریودھن کا جراحوں کو بلانا مہابھارت میں صاف طور پر مذکور ہے۔[2] پھوڑے پھنسی، اور زخموں کی چیر پھاڑ کے علاوہ فتق اور بواسیر کا بھی تیر بہدف علاج بذریعہ عمل جراحی ہوا کرتا تھا۔ خصوصاً پتھری اور مردہ بچہ کو بطن مادر سے نکالنے میں ہندی اطبا اور جراحوں کو بڑی شہرت حاصل رہ چکی ہے۔ علم الابدان کے ساتھ عمل جراحی کی تعلیم بہت ضروری سمجھی جاتی تھی چنانچہ طبی درسگاہوں میں اس کی عملی تعلیم کا خاص اہتمام رہتا تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سیل کی وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ طلباء کے مشاہدہ اور ان کی عملی تعلیم کے لئے لاشوں کی قطع برید کی جاتی تھی۔ ہند کے قدیم فن جراحی پر مسٹر ہیور کا تبصرہ خاص طور سے قابل مطالعہ ہے چنانچہ موصوف کی رائے میں آج بھی مغربی علمائے علم جراحی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اور اہل مغرب نے بریدہ ناک جوڑنے کی ترکیب انہیں سے سیکھی تھی اس لحاظ سے مغرب علم صحت بلا تامل و قال ہندی طب کا ممنون ہے۔

فن جراحی کے ساتھ آلات سازی میں اہل ہند نے خاص نام پیدا کیا تھا۔ آلات جراحی کی ساخت دھار کی نوعیت اور ان کی گرفت کی مناسب وسعت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ آلات کی تعداد کا تعین قدرے مشکل ہے، عمل جراحی کی نوعیت پر ہی ان کی تعداد متعین کی جاسکتی ہے لیکن پھر بھی بعض ہندی ویدوں نے ان کو کسی نہ کسی تعداد میں محدود کیا ہے۔ سشرت کے نزدیک ان کی کل تعداد ۱۰۱ تھی اور باگ بھٹ کی رائے میں ۱۱۵ سے کم نہ تھی۔ جراحوں اور ویدوں کے لئے آلات سازی میں ماہر ہونا بھی بسا ضروری تھا چنانچہ خود ہی موقع عمل کے لحاظ سے وقتی آلات بنا لیا کرتے تھے۔ فتق۔ بواسیر، رحم، پیدائش اور بول و براز کے امراض میں مختلف النوع آلات استعمال ہوتے تھے جن میں سے برق دستی نشتر، پلہ چپن شنکو، گرجھ شنکو، دنت شنکو اور سرپ مکھ نام کے آلات کا ذکر تاریخی اوراق میں ملتا ہے۔ ناسور، جزام اور برص کے امراض میں ٹیکہ بھی لگایا جاتا تھا۔ دانت اکھاڑنے اور موتیا بند نکالنے کے آلات بھی موجود تھے، کمل نام کا ایک ایسا آلہ ایجاد کیا گیا تھا جس سے شیر خوار بچوں کو دودھ بھی آسانی سے پلایا جاسکتا تھا۔ اور ضرورت پڑنے پر مریض کو اس کے ذریعہ قے بھی کرائی جاسکتی تھی۔[3]

سمیات کی تحقیق اور مار گزیدہ کا علاج

سمیات کی تحقیق کے سلسلہ میں ہندی ویدوں نے اپنے ذہن و فکر کی ابـ قوتوں کو جس قدر صرف کیا ہے۔ اس کی مثال طبی تاریخ میں ہند

---

[1] عہد قدیم مشرق و مغرب [2] قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب [3] اینشینٹ سرجیکل انسٹرومنٹس جلد اول۔

رہوں کے نزدیک سمیات کی تحقیق میں ہندی ویدوں کا درجہ بہت بلند ہے خصوصاً سانپ کے زہر کے مختلف اثرات
ن کا بڑا حصہ ہے۔ اگرچہ دنیائے قدیم میں مارگزیدہ کا علاج عموماً جھاڑ پھونک اور منتروں کے ذریعہ کیا جاتا تھا
بعض ایسی تیر بہدف ادویہ سے بھی واقف تھے کہ مارگزیدہ کو اچھا ہی کر کے چھوڑتے تھے، ہسٹری آف مڈیسن
سکندر اعظم کے سپہ سالار نیارکس کا وہ بیان سامنے آجاتا ہے جس میں اس نے یونانی اطباء کے مارگزیدہ کے علاج
ور ہندی ویدوں کے ماہر ہونے کا اقرار کیا ہے کیوں کہ ہندوستان پر حملہ کے دوران جن یونانی سپاہیوں کو
تھا وہ ہندی ویدوں ہی کے علاج سے شفایاب ہوئے تھے۔

نے ہندوستانی سانپوں کی قسمیں، جھاڑ پھونک کی کیفیت اور اس کے علاج معالجہ کے بارے میں بڑی تفصیل
ں نے سانپوں کے علم کا نام "سروپ ودیا" بتایا ہے اور ایک پنڈت کی کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جو اسی موضوع

وانات

اطبائے ہند صرف انسانی علاج معالجہ میں نامور اور صاحب کمال نہ تھے بلکہ فن بیطاری میں
بھی ان کو کمل دسترس حاصل تھی۔ اس فن میں تصنیفی سلسلہ کا پتہ قرون وسطیٰ سے پہلے بھی ملتا ہے۔
نک ویدوں نے علاج حیوانات کے سلسلہ میں اپنی فنی حذاقت کے ایسے نمونے پیش کئے جن سے ان کی شہرت عرب
تک پہونچی سنسکرت اور ہند کی دوسری بھاشاؤں میں اس سلسلہ میں بہت سی ایسی مستند کتابیں بھی تصنیف
راجم سے عرب وعجم نے بھی کثیر فوائد حاصل کئے اور ہند کا فن بیطاری ان کی نظروں میں بہت مقبول ہوا۔

ت

علاج حیوانات کے ساتھ علم حیوانات کے تبحر میں بھی ہندی اطباء کسی سے پیچھے نہ تھے اس کی چھان بین میں
ذہن وفکر کی قوتوں کو انھوں نے جس طرح استعمال کیا حقیقت میں اس وقت کے محدود ذرائع کو دیکھتے
ائد ممکن بھی نہ تھا۔ حیوان وحشرات کی مفصل تحقیق ان کا دلچسپ مشغلہ تھی ان کا تصنیفی سلسلہ چرندوں پرندوں
کے تفصیلی جائزے سے مالا مال ہے۔ جس میں ان کی قسمیں، نسل، جوانی، زمانۂ تولید، مدت حمل، فطرت وعادت
مسکن وغیرہ سے متعلق سیر حاصل بحثیں ہیں، گھوڑوں کی نسل، ان کے معائب ومحاسن، علاج معالجہ اور دیگر امور
تفیت یقیناً تاریخی شہرت رکھتی ہے لیکن یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ ہندی ویدوں نے اس کو فنی حیثیت سے
یا۔ اس سلسلہ میں کئی ایسی مستند تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں گھوڑوں، سانپوں اور دیگر جانوروں سے متعلق
موجود ہیں۔ خصوصاً قرون وسطیٰ میں یہ تصنیفی سلسلہ کافی ترقی کر گیا تھا۔ چنانچہ تیرھویں صدی عیسوی کی ابتدا
ان میں ایک ایسی مستند کتاب اس عنوان پر لکھی گئی جو اس وقت کے علمی اور طبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی حتیٰ کہ
حدود ہند سے نکل کر ایرانی سرحدوں تک پہونچی اور عام افادیت کی بنا پر فارسی میں اس کا ترجمہ بھی ہوا۔
درج ذیل مشتق عنوانات کا پتہ چلتا ہے۔

وڑوں کی نسل، پیدائش، رنگ اور ذات، محاسن و معائب، اجزا و اعضا، بیماری اور علاج، خوراک، صحت مند رکھنے طریقے دانتوں سے عمر پہچاننے کے قاعدے، رنگ کے اعتبار سے ان کی فطرت، فصد کھولنے کا طریقہ اصطبل کا انتظام سانپوں سے متعلق ہندی اطبا نے جو کچھ تحقیق کی ہے اس کا ذکر روئے کمار سرکار نے اپنی مشہور تصنیف "ہندو اچیومنٹس ان اگزیکٹ سائنس" صفحہ تیرہ پر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سانپ موسم برسات سے قبل جوڑا کھاتا ہے۔ مادہ ہر ششماہی پر تقریباً دو سو چالیس انڈے دیتی ہے۔ دونوں کی خوراک سے جو تھوڑے بہت انڈے بچ جاتے ہیں ان میں سے دو ماہ کے اندر بچے نکل آتے ہیں ساتویں دن ان میں کالا پن پیدا ہوتی ہے اور تقریباً دو ہفتہ میں دانت نمودار ہو جاتے ہیں اور تیسرے ہفتہ دانتوں میں مادۂ زہر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی کھال میں تقریباً دو سو چالیس جوڑ ہوتے ہیں اور چھ ماہ میں کینچلی اتر جاتی ہے

موجودہ طبی سائنس ہی نے جانوروں کی عادات و خصائل، زمانہ تولید، مدت حمل، عمر اور خوراک وغیرہ کی صحیح نشاندہی نہیں کی بلکہ ہندی اطبا کا فکری ذہن اور تحقیقی دماغ آج سے صدہا سال پہلے اس سلسلہ کی مفصل تحقیق کر چکا تھا، شیروں کی قسمیں، رنگ، رفتار، مسکن، بھوک، جنسی خواہش، درندگی اور مستی کی کیفیت، زمانہ تولید، مدت حمل کے علاوہ بھالو، گینڈا، گدھا، گائے، بیل، بھینس، بکری، ہرن، بندر، چوہا، گدھ، باز، سارس، کوا، طوطا اور الو وغیرہ تک کے مفصل اور جامع حالات کا ذکر بھی تصانیف میں ملتا ہے[1]

طب متفرقات عقاقیر یعنی جڑی بوٹیوں کے خواص و اثرات سے بھی اطبائے ہند مکمل واقفیت رکھتے تھے ان کی طبی تصانیف میں جڑی بوٹیوں کی اصل شکلیں کثرت سے ملتی ہیں جن میں پتیوں کا طول و عرض اور رنگ و ذائقہ بڑی تحقیق سے درج کیا گیا ہے۔ آماس کے مرض میں نمک کا استعمال یونانی طب میں قطعاً ممنوع ہے لیکن ہندی وید دں نے اس کے استعمال کی اس وقت ممانعت کر دی تھی جب فن طب کے تدوین کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ خلاصہ یہ کہ ہندی ویدوں نے تشخیص امراض، نبض اور اصول نبض، جڑی بوٹیوں اور سمیات کی تحقیق میں جن ذہنی کاوشوں سے کام لیا ہے ان کے احسانات کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ہندی ویدوں کی مسلسل تحقیقی کاوشوں ہی کا یہ مبارک نتیجہ ہے کہ ہندی طب کے اثرات عجم کے راستہ سرزمین عرب پہونچے اور وہاں اپنا عمل دخل قائم کر کے مغرب کی دور دراز سرزمین تک جا پہونچے اور یہ پہونچ ہندی کی جامعیت کی واضح اور روشن دلیل ہے۔

طب ہندی کا عرب و عجم پر اثر، تراجم کا سلسلہ طب ہندی کی شہرت فارسی کے واسطے سے عربوں کے کانوں تک جب پہونچی تو وہ اس کی فضیلت سے واقف ہونے لگے اور ان کی تصانیف میں ہندی

---

[1] قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۱۵

طریقہ علاج کا ذکر شروع ہو گیا۔ جس کی تصدیق ابن سینا کے قانون، ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطبا ابن عبد ربہ کی عقد الفرید اور جاحظ کی کتاب البیان سے ہوتی ہے۔ عربی زبان میں طب ہندی کا جو علمی ذخیرہ منتقل ہوا وہ اپنی کیفیت و کمیت کے لحاظ سے ایک قیمتی ذخیرہ کہا جانے کا مستحق ہے۔ طب ہندی کی افادیت جس قدر مسلم ہوتی گئی اسی نسبت سے ہندی تصانیف عربی تراجم کا لباس پہننے لگیں یہاں تک کہ اپنی افادیت کی طاقت سے عباسی دربار میں مکمل اثر و رسوخ حاصل کر لیا حکمائے عرب کا ادویات اور جڑی بوٹیوں کی تحقیق کے سلسلہ میں ہند آنا۔ اور ہندی اطبا کا عباسی خلفا اور برامکہ کی دعوت پر بغداد پہونچنا کوئی راز کی بات نہیں۔ ہارون رشید کے علم پرور عہد میں یحییٰ برمکی کا اپنے ایک مخصوص حکیم کو ہندی جڑی بوٹیوں کی تحقیق اور ان کو عرب میں درآمد کرنے کے لئے ہند روانہ کرنا، اور تیسری صدی ہجری میں خلیفہ موفق باللہ اور معتضد باللہ کا طبی تحقیق کے سلسلہ میں عربی اطبا کا ایک وفد ہندوستان روانہ کرنا تاریخی تذکروں میں مذکور ہے عربی طب کی بہت سی ادویہ کے نام ہندی الاصل ہیں جن کو عربی تلفظ نے ایک دوسری چیز بنا دیا ہے۔ جیسے جائفل، جائے پھل، قرنفل کنگ پھل، زنجبیل، زریجا بیر، کافور کپور، حلیلج ہلیلہ، ہیڑا بہیڑا، اطریفل، تری پھل[1] بعض ادویہ کے ناموں کے آگے لفظ ہندی کا اضافہ کر کے عربی بنایا گیا ہے۔ جیسے قسط ہندی، تمر ہندی، ساذج ہندی، عود ہندی[2]۔

ہند کے ماہر فن وید شسرت یا سسرت نے تشخیص و معالجہ میں شسرت سنگھتا کے نام سے دس بابوں میں ایک مستند کتاب تصنیف کی تھی جس کو بو علی سینا کے قانون کے ہم پلہ بتایا جاتا ہے۔ عربوں کو یہ کتاب فن تشخیص و معالجہ میں اتنی پسند آئی کہ انھوں نے مصنف کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے اس کے ترجمہ کا نام سسرد فی الطب رکھا برامکہ کے شفاخانہ کے لئے یہ کتاب ایک دستور العمل کا کام دیتی تھی۔ تراجم کے سلسلہ میں اس کتاب کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔ مہاراجہ کنشک کے درباری طبیب چرک کی مشہور طبی تصنیف چرک سنگھتا کو فارسی کی وساطت سے عبداللہ بن علی نے عربی قالب میں منتقل کیا، روسا نام کی ایک طبیبہ کا ذکر بھی ہند کے قدیم تذکروں میں ملتا ہے۔ اس نے امراض نسواں اور ان کے طریقہ علاج پر دو مبسوط کتابیں لکھی تھیں جن کے ترجمہ کا فخر عبداللہ بن علی ہی کو حاصل ہے سمیات کے بیان میں سدھ یوگ کی عالمانہ تصنیف بھوشیہ پران اور اسی عنوان پر چانک وید کی ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ کتاب السموم کے نام ابو حاتم بلخی نے منکہ وید کی مدد سے کیا تھا۔ نوکش وید کی دو تصانیف کا بھی عربی میں منتقل ہونے کا ذکر تاریخی اوراق میں ملتا ہے جن میں سے ایک میں سو امراض کی تشخیص اور انہی امراض کے سو مجرب نسخوں کا ذکر ہے اور دوسری میں امراض کے اسباب و علل پر بحث کی گئی ہے۔ بارھویں صدی عیسوی کے مشہور وید شارنگ دھر کی ایک تصنیف شارنگ دھر سنگھتا بھی عربی قالب میں منتقل ہوئی۔ وید موصوف نے اپنی اس تصنیف میں فن نبض افیون اور سپارہ کے چند در چند خواص اور ان کے مواقع استعمال پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ مذکورہ تصانیف کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابوں کے نام تاریخی صفحات پر

---

[1] برامکہ جلد اول از مولانا عبدالرزاق کانپوری۔ [2] عرب و ہند کے تعلقات از علامہ سید سلیمان ندوی۔

ملتے ہیں جن کا عام افادیت کی بنا پر عربی میں ترجمہ کیا گیا۔

حقیقت میں سلاطین عباسیہ اور برامکہ کی علمی سرپرستیوں کا طب ہندی پر کوئی احسان عظیم نہ تھا بلکہ یہ سارا توجہ خود اس کی افادیت کی بنا پر تھی اگرچہ دربار عباسی اور دوسروں کے دل میں گھر کرنے کی صلاحیت سے عاری تو کوئی بھی منھ نہ لگاتا، نکلتے سورج کو سب سلام کرتے ہیں، طب ہندی بھی نکلتے سورج کی طرح تھی بظاہر برامکہ وساطت دربار رسی کا سبب معلوم ہوتی ہے لیکن یہ وساطت کوئی علمی سازش نہ تھی بلکہ بقول سید سلیمان صاحب ہندی علوم وفنون کی ہمہ گیریت ہی اس کی شہرت ومقبولیت کا سبب بنی اور اسی جامعیت کی بنا پر مورخین عالم اس کی کرنے پر مجبور ہوئے چنانچہ سرولیم ہنٹر طب ہندی کی جامعیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

طب ہندی مکمل طور پر جامع ہے۔ اس میں جسم انسانی کی ساخت اور ترکیب اندرونی اعضاء رگ پٹھوں اور شریانوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے (اور ہندی کتاش (قرابادین) میں معدنی اور نباتاتی ادویات کا تفصیلی جائزہ بڑی سلیقہ مندی سے کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ ہند کا فن دواسازی بھی مکمل ہے جس میں ادویہ کی بڑی خوبی سے تشریح کی گئی ہے۔ صفائی اور پرہیز کے متعلق بھی وضاحت سے ہدایت کی گئی ہے"

عرب مشہور مورخ وخلاسفر نے ہندی علوم وفنون اور خصوصاً ہندی کی معجزانہ قوت اثری کے بیان میں لکھا ہے کہ

علمائے ہند ہر فن میں یکتائے روزگار اور خصوصاً فن طب میں خلاصہ روزگار ہیں اور ان کے دماغ طب کے عجیب وغریب رازوں سے آشنا ہیں سخت اور مہلک امراض کی ادویہ کا ان کو خصوصی علم ہے طب اور فلسفہ کے ذخائر ان کے پاس موجود ہیں۔ طب میں غور وفکر کا ملکہ انہیں کے ذریعہ دنیا میں پہونچا اور دیہ کے علاوہ منتروں کے ذریعہ بھی امراض کا دفعیہ کر لیتے ہیں۔

مشہور عرب مورخ۔ طب ہندی کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

حکمائے ہند عقل وخرد کے بہت بڑے سرمایہ دار ہیں ان کی عالمانہ تصانیف سے عرب وعجم کے علاوہ حکمائے یونانی بھی مستفید ہوئے ہیں۔ فن طب میں ان کا درجہ بہت بلند ہے اس فن میں چرک اور ان کی عالمانہ تصانیف علاوہ اور بھی بہت سی طبی تصانیف ان کے پاس موجود ہیں۔

سلسلہ صفحہ ۲۸۔ پلنے نہیں پڑتیں اور بظاہر اکڑی اکڑی، بے جوڑ اور بے تکی دکھائی دیتی ہیں۔

سب رس

رزاق فاروقی

فسانۂ آزاد میں تعلیمی تصورات

فسانۂ آزاد کو محض ظرافت اور مزاح کا شاہ کار سمجھنا درست نہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور ان کے دور کے دوسرے طنز و مزاح نگاروں نے جن میں خاص کر "اودھ پنچ" کے لکھنے والے تھے طنز و مزاح کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا یہ ان کا مقصد نہیں تھا وسیلہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ طنز و مزاح ان کا اسلوب تھا۔ اس لئے ان کے افکار کے متعلق رائے قائم کرتے وقت احتیاط برتنی ضروری ہے۔ "فسانۂ آزاد" اپنے دور کے دوسرے ادبی کارناموں کی طرح زندگی کا ترجمان بھی ہے اور زندگی کا نقاد بھی۔ اس میں ادب برائے ادب کا کہیں بھی پرتو نہیں ہے۔ یہی اس کی اصل خوبی اور خوبصورتی کا راز ہے۔

پنڈت کشن پرشاد کول نے "فسانۂ آزاد" کو اردو کا پہلا ناول قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ انھیں نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ انھوں نے "فسانۂ آزاد" کا نذیر احمد کے ناولوں سے تقابلی مطالعہ کر کے اور علی عباس حسینی کے افکار کو اپنے خیال کی تائید میں دلایل کے طور پر پیش کرتے ہوئے اس کے محاسن بتلائے ہیں۔ظاہر ہے کہ "فسانۂ آزاد" کو ناول قرار دیتے وقت اس دور کے اردو ناولوں کے معیار ہی سے جانچا جانا چاہیے اس ناول کا ہیرو یہاں آزاد ہے اسی کردار کے گرد یہ پورا ناول گردش کرتا ہے۔ اس گردش میں فنی غلطیوں سے قطع نظر جو اہم چیز ہمیں ملتی ہے وہ ناول نگار کا مطالعہ ہے۔ یہ مطالعہ کتابی مطالعہ نہیں بلکہ زندگی کا مطالعہ ہے سرشار نے لکھنؤ کا ماحول، معتقدات اور اس دور کی تہذیبی قدروں کو اسی کردار کی مدد سے پیش کیا ہے اس دلچسپ کردار کے ذریعہ لکھنؤ کے بانکوں وہاں کے میلوں، امراء کی محفلوں، ہوٹلوں، شفاخانوں اور اسی طرح کے بیسیوں مقامات کی سیر کا موقع ملتا ہے۔ فسانۂ آزاد کا یہ ہیرو اپنے وطن کے باہر بھی جاتا ہے اور پڑھنے والے کے لئے کئی معلومات بہم کرتا ہے۔ ایک طرح سے "فسانۂ آزاد" میاں آزاد کا سفر نامہ ہے۔ یہ جہاں بھی جاتے ہیں۔ زندگی سے مقابلہ کرتے ہیں یہی ظرافت سرشار کی بڑائی بھی ہے اور برائی بھی۔ بڑائی اس لئے کہ وہ اپنے قاری کو ہنسائے بغیر نہیں رہتے ان کے مزاح کے ہتھیار کبھی خالی نہیں جاتے۔ برائی ان معنوں میں کہ ظرافت اور مزاح کی چادر کچھ

- "سرشار اور ان کا شاہ کار" از کشن پرشاد کول بحوالہ "ادبی و قومی تذکرے" جلد دوم

اتنی دبیز ہے کہ ان کا مقصد نظر ہی نہیں آتا۔ پڑھنے والا اکثر مزاح اور ظرافت ہی کے چٹخاروں میں ایسا
اس کی نظر دوسری خوبیوں پر نہیں پڑتی۔

فسانۂ آزاد کا مقصد صحافتی کالم نگاری تھا۔ اس لئے زندگی کے عام مسائل اور موضوعات پر کھل کر لکھا
اس دور کی سماجی زندگی کے بہترین ترجمان ہیں ان کے ذریعہ ہمیں اس دور کے کئی تمدنی واقعات، رہن سہن
کے انداز اور بیسیوں تہذیبی امور کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

"فسانۂ آزاد" میں اکثر مقامات پر اس دور کے تعلیمی تصورات اور موضوعات ہمارے سامنے آتے ہیں جن کی،
انحطاط کے تعلیمی نظام، پڑھانے کے فرسودہ طریقوں، نصاب تعلیم اور علم حاصل کرنے کے عام مزاج اور مذاق۔
قائم کر سکتے ہیں۔ ان موضوعات کی مدد سے خود سرشار کی شخصیت ان کا زندگی سے خلوص اور سوچنے کے رویہ
انگریزوں کی عملداری کے زمانے میں نظم و نسق کا قدیم ڈھانچہ سرے سے بدل گیا تھا۔ ملکی انتظام کی چھوٹی
ہو رہی تھیں اور تدریجی طور پر مرکزی نظم و نسق قائم ہوتا جا رہا تھا۔ مغربی تہذیب کے تحت دفتروں، عدالتوں
روش بھی بدل گئی تھی۔ دولت کی پیدائش کے قدیم ذرائع ٹوٹ رہے تھے۔ اس کا اثر نئی نسل پر بھی پڑا۔
کی وجہ انگریزی نظم و نسق کے ظاہری دکھ رکھاؤ سے متاثر ہونا ضروری تھا۔ انگریزی تعلیم اس وقت بھی
بنانے سے زیادہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ تعلیم پائے ہوئے نوجوان کلرک بن جانے کو اپنی معراج سمجھتے تھے۔
عملداری میں نوکری کرنا تھا۔ گویہ کیفیت بہت دنوں تک نہیں رہی لیکن ابتدا میں ایک نسل ضرور اس کا شکار رہی
طبقہ اگر تعلیم حاصل نہ کر سکے اور مجبوراً تعلیم کی کمی کی وجہ کلرکی پر مجبور ہو جائے تو ایک حد تک گوارا ہے لیکن
بے فکری اور محض کلرکی کے شوق میں اپنی تعلیم کو برباد کرنے کا رجحان ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت ہے۔ سرشار
پر اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ "فسانۂ آزاد" میں ایک مستقل عنوان "امیر زادوں کو
کی تلاش" کے تحت لکھتے ہیں کہ میاں آزاد ایک دن صبح سویرے سیر کو نکلے۔ جہاں میلہ سا لگا ہوا تھا۔
متصدی چٹائیوں پر بیٹھے عرضیاں لکھ رہے تھے۔ میاں آزاد کی ڈپٹی عدالت کے ایک نوجوان امیدوار
دونوں کی گفتگو ملاحظہ ہو۔

آزاد۔ کیوں میاں صاحبزادے تمہارے والد کہاں نوکر ہیں؟

امیدوار۔ نوکر توبہ توبہ کیجئے وہ دس گاؤں کے زمیندار ہیں۔

آزاد۔ کیا تم کو گھر سے نکال دیا یا عاق کر دیا یا کچھ کھٹ پھٹ ہے؟

امیدوار۔ ہم ہونہار لڑکے ہیں اس سن میں نوکری کی فکر ہوئی۔

آزاد۔ حضرت جسے کھانے کو روٹیاں نہ ہوں وہ ستو باندھ کر نوکری کے پیچھے پڑے تو مضائقہ نہیں۔

مزے حال فارغ البال۔ زمیندار روپیہ والے ہو تم کو یہ کیا سوجھی کہ دس پانچ کی نوکری کے لئے ایڑیاں رگڑتے ہو۔ اسی سے تو ہندوستان خراب ہے۔ اس سے ہندوستان خراب ہے۔ واہ رے ادبار جسے دیکھو نوکری پر ہزار جان سے عاشق۔ میاں صاحبزادے کہا مانو اپنے گھر جاؤ اپنا کام دیکھو اس پھیر میں نہ پڑو۔ عمامہ باندھا اور کچہری میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ محرری پر لوٹے۔ اہا پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور گھر میں سونے کی اینٹیں بھری ہیں۔ لاحول ولا قوۃ" [1]

ہندوستان کے سیاسی زوال کا اثر زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم پر بھی پڑا اور سب سے زیادہ پڑا۔ نئی حکومت کو اپنے قدم جمانے سے فرصت نہیں تھی۔ یہاں کے علوم و فنون ان کے لئے بے کار قسم کے تھے۔ اب رہی انگریزی تعلیم تو اس کے مقبول ہونے میں ہی برسوں بیت گئے۔ اس طرح اس رواداری کی فضا نے ہندوستانیوں کی تعلیم کو بری طرح مجروح کیا۔ چھوٹے موٹے جو مکتب اور مدرسے تھے وہاں کوئی نظریہ حیات نہیں تھا اور ہر مکتب کو اچھے معلم اور اساتذہ نہیں مل سکتے تھے۔ ان کی خاطر خواہ سرپرستی نہ ہونے کے سبب یہ مدرسے اچھے خاصے تفریح گاہ بنے ہوئے تھے۔ جہاں بچوں کی تربیت کی بجائے الٹے استادوں کی بدتہذیبی کا اثر ان کی زندگی پر پڑنے لگتا۔ ایسے مدرسوں اور مکتبوں سے کیونکر اصلاح کی امید کی جا سکتی تھی۔ سرشار نے اس موضوع پر شدید تنقید کی ہے لیکن یہاں بھی ان کا وہی انداز بیان ہے جو ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔

میاں آزاد کو ایک مرتبہ مکتب خانے کی سیر کا موقع ملا۔ وہاں کی حالت ملاحظہ فرمائیے۔

"ایک دن بازار کی طرف جا نکلے تو ایک مکتب خانہ نظر سے گزرا۔ ٹوٹا پھوٹا مکان۔ پرانا دھرانا دالان۔ دیواریں بابا آدم کے وقت کی۔ ایک مولوی صاحب دقیانوس کے ہم عصر بیٹھے ہل ہل کر پڑھا رہے ہیں اور بیس پچیس کم سن لڑکے زٹل قافیہ اڑا رہے ہیں۔ ایک لڑکے نے دوسرے کی چاند پر تڑ سے دھپ جمائی کسی نے چپت گاہ پر زناٹے سے دھول لگائی۔ مولوی صاحب پوچھتے ہیں ابے یہ کیا ہوا۔ جی کچھ نہیں۔ مولوی صاحب تختی گر پڑی تھی۔ ابے یہ تختی کی آواز تھی۔ جی ہاں اور نہیں تو کیا"

سرشار نے مندرجۂ بالا سطور میں مکتب کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اس دور کے تعلیمی نظام کا ہلکا سا خاکہ ہے۔ اس تعلیمی دور میں تعلیمی امور کے پیچھے جو سیاسی اور سماجی عوامل کام کر رہے تھے اس پر سرشار نے اظہار خیال نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے موضوع سے ان مسائل کا براہ راست کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ وہ چلتے چلتے مکتب کی سیر کراتے جاتے ہیں اور ان کا پورا غصہ مدرس کی شخصیت پر ہے۔ اس کے کردار کو وہ انتہائی گھٹیا اور پیشہ تدریس کے لئے نااہل بتلاتے ہیں۔

"فسانۂ آزاد" میں ایک اور مقام پر "مکتب خانہ" کی تفصیل سے سیر کرواتے ہیں۔ یہاں سرشار کے افکار نسبتاً زیادہ [2] واضح اور معنی خیز ہیں۔

ایک مکتب خانہ یہاں بھی نظر آیا۔ مولوی صاحب بڑے معمر و سن رسیدہ دروغ گو جہاں دیدہ گھٹیا پر دو زانو بیٹھے پڑھا رہے ہیں۔ ریش مخضب تا بہ ناف سر مبارک۔ کوہ قاف گول گول دیدے کھوپڑی گھٹی گھٹائی اس پہ کلاہ تتری

عہ۱ فسانۂ آزاد جلد اول صفحہ ۳۷، ۳۸ طبع ہشتم مطبع نول کشور لکھنؤ۔ عہ۲ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے فسانۂ آزاد جلد اول صفحہ ۵۰-۵۱ طبع ہشتم مطبوعہ ۱۹۱۶ء۔

خوب ہی جاتی ہاتھوں تسبیح لئے گھمٹ کھٹاتے ہیں۔ لونڈے اردگرد غل مچاتے ہیں۔ لاحق کی آواز بلند۔ غل غپاڑہ وہ چند۔ تہذیب منزلوں دور۔ اس کے بعد میاں آزاد نے ایک طویل چودہ نکاتی اشتہار دیا ہے۔

یہ اشتہار جلی قلم سے لکھکر میاں آزاد راتوں رات مکتب کے دروازے پر چپکا آئے اور جھٹ سے تین چار مقامات پر بھی چپکا دیا اور سرا میں لمبی تان کر سو رہے[1]

مکتب خانہ کے خلاف میاں آزاد نے جو اشتہار دیا ہے وہ دراصل پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ان نظام کیخلاف احتجاج ہے۔ اشتہار میں جن ۱۴ امور کا ذکر کیا گیا ہے ان کو پڑھنے سے ہمیں نہ صرف پنڈت کی تعلیمی امور سے دلچسپی کا انداز ہوتا ہے بلکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے عین بعد ہمارے کیا حالت تھی۔ استادوں کا کیا معیار تھا۔ فارسی کی تعلیم کا اثر بچوں کی ذہنی استعداد پر کس طرح عمل کر رہا تھا۔ ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کو ہر دور میں غیر ملکی زبانوں کا بوجھ برداشت کرنا پڑا اور ان کے قوائے وجہ سے وہ جولانیاں نہ دکھا سکے کہ جس کے وہ اہل تھے۔ اس کے علاوہ ادب اور انشا پردازی کی تعلیم کو سب وجہ ہم اس دور میں سائنسی اور عمرانی علوم سے بڑی حد تک بے بہرہ رہے۔ اس طرح "فسانہ آزاد" جہا دور کی تمدنی حالت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے وہیں اس کے ذریعہ ان حقیقتوں کو جاننے میں مدد ملتی ہے۔ زندگی میں ابتری اور زوال پیدا ہوا تھا۔ سرشار کا یہ کارنامہ اپنے ماحول کی ترجمانی کرتے ہوئے اس بات کہ اردو کا ادب ہر دور میں کم و بیش زندگی کا ترجمان رہا۔

[1] "فسانہ آزاد" ص ۵۹ تا ۶۲ جلد اول طبع ہشتم مطبع نول کشور لکھنو۔

محمد عبداللطیف خاں

ڈاکٹر زور مرحوم کی ایک نظم

آج سے تقریباً پینتیس ۳۵ سال پہلے کی بات ہے جب کہ پروفیسر محمد عبدالرحمٰن خانصاحب نے جامعہ عثمانیہ کی صدارت کا جائزہ حاصل کیا تھا۔ اس وقت زور صاحب ایم اے (فائنل) کے طالب علم تھے۔ شاعری کا نیا نیا شوق تھا۔ طبیعت میں جوش اور عمر کا تقاضا اور پھر ایک ایسے شخص کا جامعہ کی صدارت پر تقرر جو عوام اور خواص میں اپنی غیر معمولی قابلیت اور روشن دستی کی وجہ سے کافی ہر دلعزیز تھا۔ اس وقت انھوں نے ایک خیر مقدمی نظم ایک جلسہ میں پڑھا۔ یہ نظم خانصاحب کے مکان میں ایک خوبصورت فریم میں آویزاں تھی۔ میں اس زمانہ میں طبقہ وسطانیہ کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پاتا تھا۔ تعطیلات میں میرا قیام اکثر خانصاحب کے ہاں ہوا کرتا تھا۔ یہ نظم مجھے اتنی پسند آئی کہ تقریباً اس کے تمام اشعار مجھے یاد ہوگئے تھے لیکن زمانے کے ہاتھوں حافظہ بھی متاثر ہوا۔ اور یہ نایاب نظم بھی حافظہ سے اتر گئی۔ دو ۲ بند شروع اور آخر کے دماغ میں محفوظ رہ گئے۔ اس لئے روانہ کر رہا ہوں تاکہ یہ آپ کے رسالہ سب رس میں محفوظ ہو جائیں۔ پوری نظم حاصل کرنے کی کوشش میں رہا ہوں مگر غالباً وہ کاغذ جس پر یہ نظم لکھی گئی تھی دیمک کی نذر ہوگیا۔

اگر یہ نظم کسی صاحب کے ہاں محفوظ ہو تو میری یہ گذارش ہے کہ آپ اس نظم کو اپنے رسالہ میں شائع فرمایئے تاکہ ایک خوبصورت نظم ضائع ہونے سے بچ جائے۔ نظم کا پہلا بند یہ ہے۔

واہ! وا! کتنا ہے دلکش آج گلزار جہاں — خرمن کلفت پہ گرتی ہیں عیش کی ہیں بجلیاں
لپٹی جاتی ہیں خوشی میں ڈالیوں سے ڈالیاں — اور بجاتے ہیں کے سب برگ و شجر ہیں تالیاں

قدسیاں خوشنوا ہیں شادیانے گا رہے
عبدالرحمٰن خانصاحب صدر کالج ہوگئے

آخری بند کے دو ۲ شعر یہ ہیں۔

نشۂ مے کی طرح اٹھیں اگر دشمن ذرا — مفلسی شکل خمار اس سرکشی کی دے سزا
آپ کی تدبیر کو تقدیر سے الفت رہے — آپ کی تقدیر سے تدبیر کو الفت رہے

غلام رسول

پروفیسر وحید الدین سلیم

آپ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش ٹھیک طور پر معلوم نہیں۔ آپ کے والد حاجی فرید!
سادات کے خاندان سے تعلق تھا۔ آپ کے دادا ملتان سے آکر پانی پت میں بس گئے تھے۔ حاجی فرید الدین
قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے متولی تھے۔ ان کو کوئی معاش مقرر نہ تھی، حضرت کے معتقدین اور زائرین کے
اسی پر گزر بسر تھی۔

سلیم صاحب کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ آپ کو شمس النساء نامی ایک شریف استانی نے قرآن نا-
حفظ کرایا۔ باپ کے مرنے کے بعد ایک بزرگ سید غوث علی شاہ آپ کی تعلیم و تربیت کی کفیل ہوئے۔ انھوں
مدرسے میں داخل کرایا۔ جہاں آپ نے مڈل تک تعلیم پائی۔ اوائل عمر ہی سے فارسی کا شوق تھا۔ نجی طور پر
کتابیں ان کی شرحوں کی مدد سے پڑھ کر فارسی زبان میں مہارت حاصل کی اور چودہ برس کی عمر میں عرفی
کے جواب میں حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ کی مدح میں زبردست قصیدہ لکھا، جن کو تعلیم یافتہ لوگ سن کر
کے شوق میں اپنے وطن مالوف پانی پت کو چھوڑ کر لاہور کی راہ لی۔ اس زمانے میں لاہور مدینۃ العلم تھ
طالبان علم وارد ہوتے اور حصول علوم میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارتے تھے۔ چنانچہ آپ نے بھی لاہور میں
استادوں کے سامنے زانوے ادب تہہ کیا۔ آپ نے عربی ادب اور تفسیر کی تعلیم مولانا فیض الحسن سہارنپوری
منطق اور فلسفہ مولانا عبداللہ ٹونکی سے پڑھا اور جدید فلسفہ، طبیعیات، کیمیا اور ریاضی کی تعلیم مختلف ا
لیکن سرکاری طور پر انٹرنس، اور منشی فاضل کے سوا یونیورسٹی کا کوئی امتحان کامیاب نہ کیا۔ قانون کی بھی تعلیم شر
معاشی پریشانیوں کے سبب اس کو ترک کرنا پڑا۔

ابتدا میں بہاول پور میں ایجرٹن کالج میں نوکر ہوئے۔ اس کے چھ برس بعد ریاست رامپور میں کسی
مقرر ہوئے یہاں چھ مہینے سے زیادہ نہ رہے، پھر طب سیکھنے کا شوق ہوا۔ ایک مشہور طبیب سے یو
ہی ساتھ ڈاکٹری سے بھی واقفیت پیدا کی۔ پانی پت میں گیارہ سال تک کامیابی کے ساتھ مطب کرتے،

معاش بنایا۔

مولانا حالی سے آپ کے دوستانہ اور مربیانہ تعلقات تھے۔ مولانا کے ایما سے سلیم صاحب علی گڑھ چلے گئے اور موصوف کے ہاں ٹھیرے۔ مولانا حالی نے سلیم صاحب کو سر سید سے ملایا۔ انھیں اپنے علمی کام کے لئے ایک قابل آدمی کی ضرورت تھی۔ چونکہ سر سید بڑے مردم شناس آدمی تھے۔ لہذا ان کی نظر انتخاب فوراً سلیم صاحب پر پڑی اور وہ پسند کر لیے گئے۔ وہ ڈھائی مہینے تک ان کی کارکردگی اور صلاحیت کا امتحان کرنے کے بعد ۱۸۹۴ء میں سر سید نے پچاس روپے ماہوار پر تفسیر کے کام کے لئے ان کو اپنا مددگار بنا لیا۔ اس طرح تین سال تک سلیم صاحب سر سید کے ساتھ علمی کام کرتے رہے۔ بعد میں سر سید کالج کی جھنجھٹوں اور خود اپنی بیماری کے باعث انھیں چھ مہینے تک علمی کام کو موقوف رکھنا پڑا۔ اس پر موہوم امید میں گزارنا سلیم صاحب کو گوارا نہ ہوا۔ آپ نے اپنی آزاد منشی کے تحت علی گڑھ میں رسالہ معارف کی ادارت قبول کی اور ڈھائی سال تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن لوٹ گئے۔ ۱۹۰۰ء میں نواب محسن الملک نے مولوی سلیم کو علی گڑھ بلوا کر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی (جو سر سید مرحوم کا جاری کیا ہوا اخبار تھا) سب ایڈیٹری پر سو روپے تنخواہ پر مامور کیا۔ آپ نے اپنی تن دہی، علمی قابلیت اور اعلیٰ صلاحیت سے اس مردہ اخبار میں جان ڈال دی، جس کی بدولت اخبار مذکور خوب چمک اٹھا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ سخت بیمار پڑے اور اپنے وطن چلے گئے۔ وہاں سے اپنی خدمت کا استعفا پیش کر دیا۔

ریاست حیدرآباد کے سابق دور میں جب ۱۹۱۹ء میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تجویز ہوئی اور اس کے تحت ابتداءً "یہ عثمانیہ" آغا منزل میں، جہاں آج کل حیدرآباد اسٹیٹ بنک ہے قائم ہوا۔ اس کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لئے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تھا۔ پہلے ہی سے اردو میں اعلیٰ تعلیم کے نصاب کی معیاری کتابیں موجود نہ تھیں۔ اس لئے تعلیمی نصاب کی خاطر انگریزی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے لئے ۱۹۱۷ء میں ایک نیا محکمہ کھولا گیا، جو سر رشتہ تالیف و ترجمہ (دارالترجمہ) کے نام سے موسوم تھا۔ اس محکمے میں شمالی ہند کے مشہور اور قابل افراد کا انتخاب کر کے انھیں مقرر کیا گیا۔ اس کے ذیل میں علمی اصطلاحات کو جدید طریقے پر وضع کرنے اور ان کو تدریس و تعلیم میں استعمال کی نوبت آئی۔ ایسے موقع پر مولوی سلیم کو اصطلاح سازی کی غرض سے حیدرآباد بلوایا گیا اور دارالترجمہ میں ان کا تقرر ہوا۔ وہ شروع میں دارالترجمہ میں کام کرتے رہے بعد میں جب کالج قائم ہوا، تو وہ اساتذہ کے زمرے میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے اس میں منتقل ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ دارالترجمہ کی مجلس وضع اصطلاحات کے رکن بھی رہے۔

یہ حیدرآباد میں کوچۂ چراغ علی میں مقیم تھے۔ انھیں حیدرآباد آنے کے بعد اطمینان اور فراغت حاصل ہوئی۔ یہاں آپ نے اپنا زیادہ تر وقت علمی اور تعلیمی کاموں میں گزارا۔ اسی زمانے میں دارالترجمہ کے تعلق سے علمی اصطلاحوں پر غور کرنے

اور وضع کرنے کا کافی موقع ملا۔ آپ نے اپنے تجربے، فطری لگاؤ، علمی تبحر سے "وضع اصطلاحات
میری دانست میں ایشیا میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں، شاید یورپ میں ہو تو ہو۔ مولوی
علمی کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک اردو میں یادگار رہے گا۔ اس کتاب میں مصنف نے علمی مطالب
اصطلاح کی ضرورت بتلائی ہے۔ اصطلاح سازی کے حامی دو گروہ تھے۔ ایک کی رائے یہ
لحاظ سے اس کے قواعد کے مطابق علمی اصطلاحیں بنائی جائیں، تاکہ وہ دنیائے اسلام میں مقبول
سے ہماری زبان تمام بلاد اسلامیہ میں ایک بین قومی کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ دوسرے گ
زبان، جن قدرتی عناصر یعنی عربی، فارسی اور ہندی سے بنی ہے۔ اصطلاحیں وضع کرنے میں انہی تا
لیا جائے اور الفاظ کی ترکیب دیتے وقت اردو زبان کی گرامر کا لحاظ رکھا جائے تاکہ تعلیم میں
مجلس وضع اصطلاحات میں اجتماعی طور پر دوسرے گروہ ہی کو تائید حاصل ہوئی۔ سابقہ جامعہ
دوسرے گروہ کی رائے کے مطابق تیار کی گئی تھیں اس کے علاوہ اردو زبان السنہ کے لحاظ سے کس
رکھتی ہے، اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اصطلاح سازی کے لئے آریائی زبانوں کے چار
بتلاتے ہوئے پہلے انگریزی بعد میں اردو مثالوں کے ذریعے ان کی توضیح کی ہے۔ آخر میں
لاحقوں کی لمبی چوڑی فہرستیں بھی دی ہیں۔ اردو مصادر کی قسمیں بتلا کر ہر ایک قسم کے تحت
پیش کی گئی ہے۔ مفرد اور مرکب اصطلاحوں کے ضمن میں ان کے اصول اور بنانے کے طریقے
فرہنگ آصفیہ سے عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی اور مختلف السنہ کے الفاظ کے اعداد
کیا ہے کہ اردو زبان ہند آریائی ہے نہ کہ سامی۔ رسمی اصطلاحات اور فعلی اصطلاحات کی
انگریزی پھر اردو مثالوں کے ذریعے تشریح کر کے آخر میں ہر دو کی فہرستیں دی ہیں۔ اردو
مشتقات پر روشنی ڈالی ہے اور بتلایا ہے کہ سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے کتنے الفاظ ایک ن
ان کی فہرست بھی شامل کی ہے۔ ترکیب الفاظ کے جتنے طریقے ہماری زبان میں رائج ہیں
ہوئے ہر ایک طریقے کو مثالوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ آخر میں نیم سابقوں اور نیم لاحقو
دی گئی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف نے کس قدر ذہن رسا ا
اس میں اصطلاح سازی کا غیر معمولی ملکہ تھا۔ اس کے علم و فن کا دائرہ وسیع تھا۔

مولوی سلیم نے متعدد مقالے اور مضامین بھی لکھے تھے، جو وقتاً فوقتاً رسالوں اور اخبا
اس کے علاوہ وہ عربی سے اردو ترجمہ کرنے میں بھی بڑے ماہر تھے۔ سب سے پہلے محمد

آپ کے مضامین کا انتخاب "افاداتِ سلیم" کے نام سے حیدرآباد میں شائع کیا۔ ان مضامین کا تعلق اردو ادب و شاعری سے ہے۔ یہ وہ مضامین تھے جو اردو کے بلند پایہ رسالۂ اردو میں چھپ چکے تھے۔ یہ انتخاب آج کل جامعہ عثمانیہ بی اے کے اردو کورس میں داخل ہے۔ بعد میں پاکستان سے آپ کے متفرق مضامین کا مجموعہ "مضامین سلیم" کے عنوان سے تین جلدوں میں طبع ہوا، جو رسالہ معارف، مسلم گزٹ، اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔ اس کو مولوی شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے بڑی تلاش اور محنت سے مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا۔ مولوی سلیم جامع حیثیات شخص اور عربی، فارسی کے جید عالم تھے۔ اعلیٰ درجہ کے نثر نگار اور شاعر تھے۔ اردو ادب پر ان کی نظر وسیع تھی، ان کی تحریر میں زور، معلومات میں وسعت اور زبان میں سادگی اور پرکاری تھی۔

مولوی سلیم کو تصنیف و تالیف کے علاوہ تدریس و تعلیم میں بھی کافی ملکہ تھا۔ ان کے پڑھانے کا خاص طرز، وہ اپنی حاضر جوابی، بذلہ سنجی، مضمون پر عبور اور تفہیم کے خاص طریقے کی بنا پر جماعت پر چھا جاتے تھے۔ درس کے وقت خاموشی و محویت طاری ہوتی تھی۔ طلبا پر ان کی تعلیم کا خاصا اثر ہوتا تھا۔ ان کے تبحر علمی، ادبی افادیت اور مشفقانہ برتاؤ کے سبب شاگرد گرویدہ بن جاتے اور ہر وقت ان سے استفادے کی کوشش کرتے تھے۔ یوں تو ان کے تلامذہ کی تعداد سینکڑوں ہے، لیکن اردو دنیا میں علم کے مختلف میدانوں میں جنھوں نے نام پیدا کیا، ان میں قابل ذکر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر سید محمد، سید معین الدین قریشی، سید وقار احمد، میر حسن الدین، اکبر وفاقانی، حبیب اللہ رشدی، بدرالدین خاں شکیب، جلال الدین اشک، محمد امیر اور عبدالستار وغیرہ ہیں، جن کی قلمکاریوں سے اردو علم و فن میں اضافہ ہوا۔

مولوی سلیم کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف ایک لڑکی تھی۔ جن کو باپ کے ترکے میں بھاری رقم ملی۔ سلیم صاحب مزاج کے بڑے تیکھے تھے۔ ذرا سی ناگواری پر نوکری کو ٹھکراتے تھے۔ طبیعت میں قناعت و آزاد پسندی تھی۔ غریب الطبع، سادگی پسند اور جزرس تھے۔ خود پس اندازی کرتے اور دوسروں کو بھی رغبت دیتے تھے۔ کبھی کبھار رقمی امداد بھی کرتے تھے۔ فارغ البالی میں اس سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا، کیونکہ کھانے پینے میں جو سابقہ سادگی رہی وہ ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ پان کے لتی تھے۔ بٹوہ ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ چائے کے عادی تھے، خود پیتے اور دوسروں کو پلاتے تھے۔ مزاج میں بدپرہیزی تھی، جس کے سبب بیماری کا شکار ہو جایا کرتے تھے۔

مولوی سلیم حیدرآباد میں ۱۹۲۷ء یا ۲۸ء کے اواخر تک اردو پروفیسر رہے، پھر مرض سرطان میں مبتلا ہو کر علاج کے لیے پانی پت چلے گئے اور اپنے دوست ڈاکٹر عبدالکریم پانی پتی کے (جن کی حذاقت کے قائل تھے) زیر علاج رہے۔ آخر کار اس مرض موذی کے ہاتھوں ملیح آباد میں ۱۹۲۹ء میں انتقال کر گئے۔

پروفیسر سید رشید الحسن

حافظ شیرازی کے اشعار سے

فال نکالنے کی جدول

ماہنامہ پونم، مئی ۱۹۷۲ء میں اختر حسن صاحب کا مضمون "لسان الغیب" حافظ شیرازی کے دیوان فال نکالنے کا ایک انوکھا طریقہ" نظر سے گزرا۔ یہ جدول حافظ شیرازی کے مطبوعہ دیوان میں بھی شائع کیا گیا چونکہ متذکرہ مضمون میں اس جدول سے فال نکالنے کی صراحت نہیں ملتی۔ اس لئے وضاحت کے لئے چند سطور ناظرین کے پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ وضاحت ہمیں کتب خانہ آصفیہ کے ایک قدیم قلمی نسخہ سے دستیاب ہوئی ہے۔

یہ جدول دراصل پانزدہ در پانزدہ بنائی گئی ہے۔ اس کے جملہ حروف دو سو پچیس (۲۲۵) ہیں۔ اگر ان کو نو (۹) سے تقسیم کیا جائے تو آخری نویں حرف ہی پر ختم ہوگا۔ خوبی یہ ہے کہ اس حسابی جدول کے لئے حافظ شیرازی کے دیوان سے نو مطلعے ایسے نکالے گئے ہیں جن کا پہلا مصرعہ انھیں پچیس (۲۵) حروف میں سے بنتا ہے۔ گویا ۲۲۵ کو نو (۹) سے تقسیم کریں تو جواب پچیس ہی نکلتا ہے۔ غرض مندرجہ ذیل نو (۹) مصرعوں کے جملہ حروف کو اس جدول میں اس طرح درج کیا ہے کہ دو اور دو چار کے نظریے کے تحت کسی نہ کسی مصرعہ کا نکل آنا ضروری ہے۔ مطلعے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ خیز تا از در میخانہ کشادے طلبیم	بمدر دوست نشینیم و مرادے طلبیم
۲۔ ما آزمودہ ایم درین شہر بخت خویش	باید برون کشید ازین ورطہ رخت خویش
۳۔ مرحبا طائر فرخ رخ و فرخندہ پیام	خیر مقدم چہ خبر راہ کجا یار کدام
۴۔ زاین سفر گر بسلامت بوطن بازرسم	نذر کردم کہ ہمین راہ بہ میخانہ روم
۵۔ طالع اگر مدد دہد دامنش آورم بہ کف	گر بہ کشم زہے طرب ور بہ کشد زہے شرف
۶۔ روئے بنما و وجود خودم از یاد ببر	خرمن سوختگان را ہمہ گو باد ببر
۷۔ گفتم غم تو دارم گفتا غمت سر آید	گفتم کہ ماہ من شو گفتا اگر برآید
۸۔ یاد باد آن کہ نگارم بسر وقت منش	می بیارم بتوان چشم حسود دچمنش
۹۔ بر نیامد از تمنائے لبت کامم ہنوز	بر امید جام لعلت دردی آشامم ہنوز

ان کی جدول یہ ہے

جدول

م	م	ک	ط	ر	ک	ی	ب	خ	ا	ر	د	ا	و	ف
ا	ر	ی	ا	ح	ا	ل	ی	ت	ر	ن	ز	ز	ب	ز
ع	ب	م	ب	ی	ت	م	ا	ی	ا	ن	غ	ا	ا	ا
و	ط	ن	ک	م	م	ن	ی	ا	ز	ا	م	ر	ا	ت
ن	د	ر	ہ	ی	ن	م	ی	د	و	ا	د	ا	ر	ز
د	و	و	ک	ر	ز	ی	ف	ل	د	و	ا	ل	ت	م
م	ر	غ	ک	ج	ر	خ	م	ی	و	خ	ر	ن	و	م
ن	ن	خ	ر	پ	ب	د	د	ک	و	ا	ا	ی	ی	ت
د	خ	ف	ا	ی	ن	ن	و	پ	ا	و	ت	ن	ل	ہ
ش	ف	س	م	ر	ا	ک	ب	ک	ہ	ر	و	ن	م	غ
س	ت	ش	ر	خ	ی	ش	ا	م	پ	ک	ا	ب	ن	خ
ا	ز	ت	ر	ا	ر	خ	ر	ا	و	ی	س	ر	م	ی
ت	ہ	ن	ر	ا	ر	ی	م	ط	خ	پ	ہ	م	د	ا
ب	ہ	ل	و	ی	ر	ب	پ	ا	م	ن	ب	ی	ا	و
ک	ب	ی	ن	و	ی	ش	م	م	ف	ر	و	ش	ز	م

اس جدول سے فال نکالنے کا یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ پہلے حافظ شیرازی اور ان کی محبوبہ شاخ نبات پر فاتحہ پڑھ کر مقصد کی نیت کر لی جائے پھر انجان طور پر کسی خانہ پر انگلی رکھیں اور اس حرف کو لکھ لیں۔ بعد کے خانے سے نو خانے گن کر نویں خانے والا حرف لکھ لیں۔ اسی طرح گنتے جائیں۔ اور ہر نویں خانے کا حرف سلسلہ سے لکھتے جائیں یہاں تک کہ جس لفظ سے چلے تھے وہیں پہنچ جائیں۔ آخر میں تمام حروف کو ملا کر مندرجہ بالا اشعار کے پہلے مصرعہ میں سے کسی مصرعہ کے الفاظ جوڑ کر ایک مصرعہ موزوں کر لیں۔ مثلاً میں نے ایک فال نکالی اور حسب ذیل مصرعہ دستیاب ہوا۔

ت ا	ا ز	د ر	م ی خ ا ن ہ	ک ش ا د ی	ط ل ب ی م	خ ی ز
تا	از	در	میخانہ	کشادی	طلبیم	خیز

حضرت جذب عالم پوری

آہ! آہ! نہرو

آیا تھا لیڈروں میں نادر بن کر ۔۔۔ آیا تھا سیاست میں بھی قادر بن کر
بھارت والوں کی رہنمائی کے لئے ۔۔۔ موتی سے جو نکلا تھا جواہر بن کر

کی جس نے ملک و قوم کی وہ خدمت ۔۔۔ سیکھی دُنیا نے جس سے انسانیت
دونوں میں مناسبت ہوئی تھی ایسی ۔۔۔ بھارت نہرو تھا اور نہرو بھارت

مانا کہ ہے سوگوار سارا عالم ۔۔۔ لیکن سب سے فزوں ہے اُردو کا غم
اُردو کی تقویت کا تھا ایک سبب ۔۔۔ تھا اپنی زبان کا وزیرِ اعظم

نام بھارت کا بڑھانے والا نہ رہا ۔۔۔ سیدھا رستہ دکھانے والا نہ رہا
اعلیٰ ظرفی سے، نیک آدرشوں سے ۔۔۔ دُنیا بھر کو رلانے والا نہ رہا

بدبخت ہے انمول جواہر کھو کر ۔۔۔ بھارت بیٹھا ہوا ہے بے بس ہو کر
بے چینی کے باعث کوئی چارہ نہ رہا ۔۔۔ دن رات گزارتے ہیں سب رو رو کر

یہ آرزو تھی دیش میں غربت نہ رہے ۔۔۔ کھانے پینے کی بھی مصیبت نہ رہے
اب اس کی تمنا ہو الٰہی پوری ۔۔۔ روحِ نہرو کو تاکہ کلفت نہ رہے

آزادی کے فرشتے باپو کو سلام ۔۔۔ ثانیٔ فلاطوں و ارسطو کو سلام
آزادی کے دن سے تھا نگہباں اپنا ۔۔۔ نہرو کو سلام، روحِ نہرو کو سلام

میر یٰسین علی خاں

نہرو کا پیام

ﮨﺮ شعلہ فشاں آج ہے جمنا کا کنارا   دل جلتے، نظر جلتی ہے، جلتا ہے نظارا
ے ہوئے چندن پہ ہے اک چاند ہمارا   یہ تن کسی عاشق کا ہے یا آگ پہ پارا
بے تابیِ خاموش کا اب یہی ہے اشارا
برباد نہ کر اس کو جسے میں نے سنوارا

دسِ نظر، باغِ ارم میرا وطن ہے   گنجینۂ اربابِ کرم میرا وطن ہے
انش گہہ اشرافِ اُمم میرا وطن ہے   شیرازۂ صد دیر و حرم میرا وطن ہے
اے قوم سنبھل راج ہے اب تیرے حوالے
ہاں بوجھ پڑا ہے اسے مِل جُل کے اٹھالے

یقِ مذاہب کی کدورت کو مٹا دے   محنت کش و بے لوث محبت کا صلا دے
چہرۂ مغموم کو اک پھول بنا دے   ہر ذرۂ ناچیز کو سورج کی ضیا دے
پرچم ترا اونچا رہے ہر عہد و زماں میں
بھارت کا بڑا نام ہو اقوامِ جہاں میں

م نگراں کھول اِدھر دیکھ، ادھر دیکھ   مشرق کی نگہہ دیکھ لے، مغرب کی نظر دیکھ
یارنہ ڈالیں تری جھولی میں شرر دیکھ   اے جنسِ محبت کے خریدار مگر دیکھ
آباد کر اک تازہ جہاں اپنے ہنر سے
جنت تری پیدا ہو ترے خونِ جگر سے

کاوش بدری

نذرِ جواہر لال نہرو

(۱)

لیتا ہوں جس کا نام بہت احترام سے
کرتا ہوں جس کا ذکر بڑے اہتمام سے
اک ربطِ خاص جس کو رہا ہے عوام سے
روئے سخن ہے آج اسی لالہ فام سے
شہرہ کہاں کہاں نہ رہا اس کے نام کا
اس کو لقب ملا ہے رسول السلام کا

(۲)

پیغمبرِ خلوص، محبت کا دیوتا
تمہیدِ صبحِ نو، سرِ آغازِ مدعا
نرگس ہزار آنکھ سے روئے گی سالہا
کب ایسا دیدہ ور تجھے اے گلستاں ملا
اس رام، اس رحیم کو مشکل کشا کو رو
اے ہند جبرئیلِ سوادِ وفا کو رو

(۳)

پہنائیِ خیال میں حسنِ نظر کہاں
دامانِ اشتیاق میں وہ برگِ تر کہاں
منہ میں زباں سہی مگر اتنا اثر کہاں
وہ اہمیت حیات کو اب خاص کر کہاں
سارے ملول چہرے دل داغدار ہیں
انسان تمام وقفِ غمِ روزگار ہیں

(۴)

مشکل سے ہاتھ آیا تھا اک دامنِ امید
ہر شب شبِ برات تھی ہر روز روزِ عید
اب کے مجالِ دید ہی باقی نہ ذوقِ دید
صد حیف اِس شب گزیدہ سحر نے یہ دی نوید
کس کی نگاہ کلبۂ احزاں میں گم نہیں
وہ میکدہ وہ جام وہ ساقی وہ خم نہیں

(۵)

سر خیلِ کاروانِ بہاراں، رگِ چمن
وہ ضامنِ وقارِ وکن، امنِ وطن
تہذیبِ شرق و غرب کا پیکر، کمالِ فن
منزل کا نور، وادیِ گنگ و جمن کا من
خوں رو رہی ہے ساری خدائی حیات کی
ہے تاب کس میں دیکھئے اس واردات کی

(۶)

وہ چل پڑے تو ساتھ چلے ساری کائنات
ٹھہرے کہیں تو سانس کو خود روک لے حیات
کتنے حسیں ہیں اس کی نظر کے مطالبات
بگڑے ہوئے ہوں لاکھ کسی سے تعلقات
صحرا بھی اس کے دم سے گلستاں شناس ہو
گم اس کے دم سے زہر کے ہوش و حواس ہوں

(۷)

ـــس متاعِ دل وجاں، فروغِ غم
رحریفِ تماشائے بیش وکم
صلابت آہن رہا، بہم
ا حیات میں کتنے ہی پیچ و خم
اک اس کی ذات کتنی عجیب و غریب تھی
ہر فکر کو نیابتِ موسیٰ نصیب تھی

(۸)

اِسی مہ کامل کی ہے تلاش
یو اسی منزل کی ہے تلاش
یو بس اسی ساحل کی ہے تلاش
ـــر نظر کو اسی دل کی ہے تلاش
محرومِ ذوقِ دید ہیں نرگس کے ساتھ ہم
دستِ اجل کے ساتھ ملاتے ہیں ہاتھ ہم

(۹)

ہے ہمالہ کے اوج پر
اہے روزنِ زنداں کی آنکھ تر
لی سی، خمیدہ چمن کا سر
دل کفِ افسوس عمر بھر
جنتا کا اور تاج محل بن کے رہ گیا
ہر عقدۂ حیات کا حل بن کے رہ گیا

(۱۰)

پہچان اس کی مذہب و ملت سے ماورا
تاریخ کی نگاہ کی لو، چشم سرمہ سا
فانوس طاق گردش ایام کی ضیا
کیا یاد آئے کوئی غم انتہا بھلا
اس زندہ دل کا کیا کوئی نعم البدل بھی ہے
سچ پوچھیے تو زود پشیماں اجل بھی ہے

(۱۱)

سچائیوں سے اہلِ سیاست کو کام کیا
کس کو خبر کہ امن و اماں کا مقام کیا
مفہوم حسن و عشق علیہ السلام کیا
صبحِ امید کیا، خلشِ غم کی شام کیا
وہ صلح جو وہ راہنما اُٹھ کے کھو گیا
صد شکر تخمِ امن تو گیتی میں بو گیا

(۱۲)

بھارت میں اس کے حسن کا جلوہ کہاں نہیں
کس شعبۂ حیات میں آگے نشاں نہیں
کس رہگذر میں پیار کی آہٹ جواں نہیں
کس کس چمن میں اس کی نظر گل فشاں نہیں
وہ جس جگہ بھی ہے وہ مقام بہار ہے
تاریخ کا وہ صفحۂ نقش و نگار ہے

رضا نقوی واہی

وفاتی

شاعروں میں چند ایسے بھی ہیں اصحابِ کمال قطعۂ تاریخ لکھنے میں نہیں جن کی مثال
کون کب مرتا ہے، رہتے ہیں اسی کی تاک میں چھائی رہتی ہے سدا کافور کی بو ناک میں
شہر کے ہر گورکن سے دوستی ہے آپ کی تاکہ مرحومین کی تعداد سے ہو آگہی
اُس طرف کوئی عدم آباد کی جانب گیا جھٹ اِدھر اگلا قلم نے مادۂ تاریخ کا
جس قدر آبادیاں بڑھتی ہیں قبرستان کی بڑھتی جاتی ہے ضخامت آپ کے دیوان کی
کوئی دلی میں مرے یا فوت ہو بنگال میں چند قطعے آپ لکھیں گے مگر ہر حال میں

صاف آتی ہے صدا یہ مادہ کے ساز سے
کتنا ہم آہنگ ہوں میں روح کی پرواز سے

فصل میں برسات کی جب پھیلتا ہے کالرا آپ کی مشقِ سخن پر اور ہوتی ہے جلا
جب کبھی دیکھو ابجد ہوز کیا کرتے ہیں آپ درجنوں قطعات روزانہ لکھا کرتے ہیں آپ
گر کبھی بہرِ عیادت آپ جاتے ہیں کہیں دیکھ کر دم توڑتے بیمار کا حالِ حزیں
سورۂ یٰسین پڑھنے کے عوض ۔ با شد و مد جوڑنے لگتے ہیں بس تاریخِ رحلت کے عدد
تخرجہ اور تعمیہ کا مسئلہ ہوتا ہے حل مادۂ تاریخ کا فی الفور آتا ہے نکل
گھر میں اک کہرام ہے، سب لوگ ہیں غم سے نڈھال پر خوشی ہے آپ کو تاریخ نکلی بے مثال

فی زمانہ کس کو ہوگا اس قدر فن سے لگاؤ
آپ ہی تک بس ہے اس صنفِ سخن کا رکھ رکھاؤ

علی جواد زیدی

غزل

ن تیز گام تو منزل پہ جا ملے
ہم سوچتے ہیں پھیر چھٹے، راستہ ملے

بو بکتے پھولوں کی پھیلی ہے چارسو
شاید صبا سے محفلِ شب کا پتا چلے

گانِ شوق ہیں اے دشت ہم بھی ہیں
دو اک گھڑی ہمیں بھی ٹھہرنے کی جا ملے

ہیں خطاب، مگر اے نگاہِ شوق
کچھ دوست ایسے بھی تھے جو دشمن سے جا ملے

ے اس اچٹتے ہوئے تیر کا مزا
اے اوّلیں نگاہ تجھے پھر سزا ملے

ن سے کشمکشِ انقلاب تک
ہر راستے میں مجھ کو ترے نقشِ پا ملے

رہانِ منزلِ آوارگانِ عشق
دو گام تا بہ دار چلو تب مزا ملے

ل ہجومِ تمنا ہے اور دل
ایسے میں یادِ یار کوئی تجھ سے کیا ملے

ہیں ہم پر ایسے بھی روٹھے نہیں ہیں کچھ
جب اُس کے جی میں آئے محبت سے آ ملے

ے ابتدائے سفر میں جنوں نصیب
جب چل پڑے تو راہ میں سو آشنا ملے

ی کا نام ہے اے اہلِ کارواں
ہر راستے کے بعد نیا راستا ملے

زیدی خدا کے واسطے یہ کُفر تو نہ بول
موسیٰؑ کو طور پر بھی فقط نقشِ پا ملے

رونق دکنی سیمابی

ارادے

تیرہ و تار ہوئے جاتے ہیں ایوانِ حیات
طاقِ غم میں یہ سسکتے ہوئے ارماں کے چراغ
عزمِ ناکام کے شاہد ہیں یہ قدموں کے نقوش
زندگی کو نہ مِلا آج بھی منزل کا سُراغ
نا اُمیدی کا جبینوں پہ مُسلّط ہے غبار

آج بھی ذہن ہے مفلوج معطل ہے دماغ
آج بھی میکدۂ شوق ہے ویراں ویراں
خونِ اِمروز سے فردا کے چھلکتے ہیں ایاغ
حُرمتِ جُبّہ و دستار مُسلّم، لیکن
دامنِ قلب و نظر آج ہے کس کا بے داغ
پھُول کھلتے ہیں تو کافور کی بُو آتی ہے
نذرِ طوفان و حوادث ہیں وہ ہوں باغ کہ راغ
برہمن نیتِ زاہد سے نہیں ہے آگاہ
آج مومن کو نہیں خطرتِ ہندو سے فراغ
دُھول اُڑتی ہے جو چلتی ہے گلستاں میں نسیم
نغمے خاموش ہیں اور شور مچاتے ہیں زاغ
تا بکے شورشِ اوہام کے بڑھتے سائے
تا بکے چشمِ حقیقت کے دِیئے کجلائے

دعوتِ سجدۂ تکریم جبیں کو دے کر
رفعتِ چرخ کو قدموں میں جھکانا ہوگا
دُورِ تاریکیٔ اخلاص بھی ہو جائے گی!
پہلے صحنوں سے جبینوں کو سجانا ہوگا
رکھکے اخلاص پہ انسان کی عظمت کی اساس
تفرقوں کی جو حدیں ہیں انھیں ڈھانا ہوگا
دلِ صد چاک کو پھر دیجئے مسرت کی نوید
پھر سے کھنڈرات پہ محلوں کو بنانا ہوگا
کذب و باطل کے اندھیروں سے گذرنے کیلئے
خونِ دل کا ہمیں دیپوں میں جلانا ہوگا
نہ مروت نہ صداقت نہ ادب کا ہے لحاظ
آدمی کو ابھی انسان بنانا ہوگا!
وقت نے ہم کو پکارا ہے باندازِ نقیب
وقت کے ساتھ قدم ہم کو مِلانا ہوگا!
زندگی ظلمتِ اوہام میں کیوں ہو محبوس
دعوتِ جہدِ عمل دے کے جگانا ہوگا
خونِ دل سے یونہی روشن جو کریں شمعِ
جگمگا اُٹھیں گے اِک روز ارادوں کے

قیصر قلندر

سرگوشیاں

بے کراں رات، فلک پر ستاروں کا ہجوم
یاد کی ماہ لقا، طلعتِ معصوم سے نجوم،
دیکھ کر ڈوب گئے حسن کی سرگوشی میں،
وقت زادے کہیں مصروف ہیں مے نوشی میں
روغنِ اشک سے روشن ہیں شبستاں کے چراغ
یا کسی حجلۂ تمکیں میں مہکتے ہیں ایاغ
دھیان کے تپتے ہوئے دشت میں دھوپ
گرم لمحوں میں ہے ضو پاش وہ نیرنگِ خیال
قصرِ الفاظ میں افکار کا جوشِ رنگ وجود
پردۂ ساز میں مستور ہیں — نغماتِ سرود
نغمگی نور کے سانچوں میں جو ڈھل جاتی ہے
آرزو، روح کے معبد میں مچل جاتی ہے
مطلعِ دل سے نکلتی ہے محبت کی کرن
جیسے برہم خوردہ ہو نغماتِ مسلسل کا ہرن
میرے آنگن میں کھلی رات کی رانی کی کلی
نیند پھر آج مری آنکھوں میں اک بار جلی
پھر منور ہوئی یک بارگی یہ راہِ خیال
کہکشاں رنگ تبسم میں ہے شامل وہ جمال

قمر و نور کی تنویر ہے تا حدِّ نظر
ہجر کی رات ہے سا امیکا شب تاب قمر
آگ، تنہائی میں بھڑکا لے خنک پیڑ کا ہے
سانس چلنے لگی بے طرح سے اور تیزی سے
اک زمانے سے ہے افسردہ خیابانِ نظر
اشک کے تاروں سے سیتا رہا دامانِ نظر
وسعتِ وقت میں کھو سا گیا آہوئے طرب
ساحرِ شعر کا پھر ٹوٹا ہے افسونِ طرب
کامنی لپٹ لپٹا، روپ کی ہی تال کوئی
دھیان پر چھا گئی جس طرح سے جھلمل کوئی
جس کے چھنا کے سے جاگ اٹھتا ہے نغموں کا چمن
پھر دہکتا ہے جواں روپ کے لمحوں کا چمن
رات پھر بھیگ گئی بکھرے گیسو کھولے
طائرِ شب نے بمجبوری مگر پر تولے
کس طرف قافلہ نغموں کا ستاروں کا چلا
(آنکھوں ہی آنکھوں میں) شب تاب بہاروں کا چلا

نقد و نظر

مثنوی سرالاسرار ڈاکٹر خواجہ معین الدین جمیل ایم، اے (عثمانیہ) ایم اے (لندن) ڈی لٹ (پیرس) صدر شعبہ فلسفہ جامعہ راج شاہی، مشرقی پاکستان کی تصنیف ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ آٹھ روپے قیمت رکھی ہے۔ یوسف ولا، ۶۱ بی آئی بی کالونی، کراچی - ۵ سے مل سکتی ہے۔

مثنوی سرالاسرار اصل میں علامہ اقبال کے شہرۂ آفاق نظریۂ خودی کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ علامہ اقبال کی کتابوں کی سائز یعنی بانگ درا، بال جبرئیل یا اسرار خودی کی سائز کی (۱۸۱) صفحات کی اردو مثنوی ہے۔ ٹائیٹل پیج کے بعد دوسرے صفحے پر تبدیہ ہے۔ کتاب حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحؒ کے نام معنون کی گئی ہے صفحہ ۵ اور ۶ پر کتاب کے مطالب کی مفصل فہرست دی گئی ہے صفحہ ۹ سے مصنف کا دیباچہ شروع ہوتا ہے جو (۲۳) صفحات تک چلا گیا ہے۔ یہ دیباچہ کافی جلی قلم سے لکھوایا گیا ہے، اور ہر صفحہ میں کل دس سطریں آئی ہیں۔ اس کے بعد پھر صفحہ ا سے صفحہ (۹) تک مصنف ہی کا لکھا ہوا مقدمہ ہے۔ مقدمہ کی کتابت نسبتاً خفی قلم سے کرائی گئی ہے اور ہر صفحہ میں (۹) سطریں ہیں۔ دیباچے اور مقدمے کے بعد اصل مثنوی شروع ہوتی ہے جو (۱۸۱) صفحات پر مشتمل ہے۔ مثنوی کی کتابت کا قلم بھی کافی جلی ہے اور صفحہ میں زیادہ سے زیادہ چار شعر آئے ہیں۔

مثنوی سرالاسرار میں کل (۵۳) عنوان ہیں جن کے تحت جمیل صاحب نے علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی تردید پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عنوان یہ ہیں۔

(۱) تمہید تعلیم فساد (۲) حقیقت خودی (۳) خودی اور عالم خارجی (۴) اعمال شر (۵) کار خیر (۶) خیر بر تر ہیں (۷) عالم عشق اور سیاست مومن (۸) مرد بے خودی (۹) حیات لافانی اور انسان کامل (۱۰) حقیقت روح (۱۱) عمر اور اسرار (۱۲) کاوش ایام اور شراب نام (۱۳) من و تو (۱۴) اسرار علم اور خودی (۱۵) موت اور حیات مستعار (۱۶) نظام کائنات اور خودی (۱۷) راز انا الحق (۱۸) نیطشے اور تعلیم خودی (۱۹) اسلام اور خودی (۲۰) درس لا الٰہ (۲۱) درس الا اللہ (۲۲) اطاعت اور تربیت خودی (۲۳) ضبط نفس (۲۴) قوائے انسانی (۲۵) شریعت اور تربیت (۲۶) طریقت اور تربیت (۲۷) جہاد اکبر (۲۸) شخصیت اور عالم بقا (۲۹) حقیقت اور انسان (۳۰) نیابت الٰہی اور خودی (۳۱) مفہوم نیابت (۳۲) خود الٰہی اور خودی (۳۳)

عقدۂ مشکل (۲) شعور ذات حق (۳) عالم ظاہر اور عالم باطن۔

جمیل صاحب پہلے بزرگ نہیں ہیں جنھوں نے علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی تردید کی کوشش کی ہے۔ ان سے پہلے پیرزادہ مظفر احمد فضلی نے "مثنوی رازِ بے خودی" اور جامعۂ علی گڑھ کے استاد فلسفہ ڈاکٹر عشرت انور نے "سرودِ بے خودی" کے نام سے مثنویاں لکھی ہیں۔ جن میں علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی تردید کی گئی ہے ان مثنویوں کی اشاعت کے بعد ان پر کافی تنقیدیں ہو چکی ہیں۔ جمیل صاحب کی زیرِ نظر کتاب اسی سلسلہ کی تیسری کڑی بن گئی ہے۔ چونکہ علامہ اقبال نے اپنا فلسفۂ خودی وضاحت کے ساتھ اپنی فارسی مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی میں پیش کیا تھا اس لئے مظفر احمد فضلی اور ڈاکٹر عشرت انور نے اپنی تردیدی مثنویاں بھی فارسی میں لکھی تھیں۔ جمیل صاحب نے علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کے سلسلہ میں ان کی صرف اسی مثنوی کو پیشِ نظر نہیں رکھا ہے بلکہ بہ حیثیت مجموعی علامہ اقبال کی ایسی تمام منظومات پر خیال آرائی کی ہے جن میں علامہ اقبال نے کسی نہ کسی صورت میں فلسفۂ خودی کا ذکر کیا تھا اس کے سوا جمیل صاحب نے اپنی یہ مثنوی فارسی کی بجائے اردو میں لکھی ہے۔

علامہ اقبال کا کلام کوئی الہامی مقدس کلام نہیں۔ اگر بعض اہلِ نظر اس میں خامیاں پاتے ہیں۔ تو انہیں اس پر تنقید کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کے اسی فلسفۂ خودی نے جس میں جمیل صاحب جیسے لوگوں کو نقائص نظر آ رہے ہیں۔ برصغیر ہند و پاک کی غلام آباد قوم میں قوتِ عمل کو بیدار کرنے میں بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ اس نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے اور اپنی قسمت آپ بنانے کی امنگ پیدا کرنے میں اپنا اثر دکھایا ہے۔ چاہے جمیل صاحب کے خیال کے مطابق علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی "کسی غلط فہمی کی پیداوار" ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے علامہ اقبال "بے پیرے" ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس مردِ قلندر کی غلط صدائے دردناک نے وہ اثر پیدا کیا کہ ان کے مقابلے میں جمیل صاحب جیسے "دانایانِ راز" کی صدائیں صدا بہ صحرا ہی رہیں۔ علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ دورِ انحطاط و زوال میں تصوف نے جو بے عملی اور کاہلی رہبانیت اور بے حمیتی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس سے مسلمانوں کو چھٹکارا دلانے کی کوشش کی اور بڑی حد تک وہ نئی نسل میں بے عمل تصوف سے بیزاری پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔

علامہ اقبال کے فلسفہ یا ان کے خیالات کا منظوم جواب دینے والے یا ان کی منظوم تردید لکھنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ علامہ اقبال ایک فلسفی ہی نہیں ہیں بلکہ نہایت اعلیٰ درجے کے شاعر اور بہت اونچے پائے کے فن کار بھی ہیں۔ ایسے فن کار اور ایسے شاعر کو زمانہ صدیوں میں جا کر پیدا کرتا ہے۔ ایک فطری شاعر اور بہت اونچے درجے کے شاعر کی بات اور اس کے کلام میں جو اثر ہوتا ہے وہ ہر موزوں طبع یا عروض یا الفاظ کو ایک خاص وزن میں پیش کرنے والے کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔ قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است

علامہ اقبال نے بخیال جمیل صاحب بات کتنی ہی غلط بلکہ غلط در غلط کیوں نہ کہی ہو۔ لیکن ایک فطری شاعر ہونے کی وجہ سے انداز بیان، ان کی طرز ادا، ان کے الفاظ کی بندش، ان کے کلام کا زور، جذبے کی شدت، اتنی پراثر ہے کہ ان کی غلط در غلط بات بھی دل نشیں ہو جاتی ہے۔ لیکن جمیل صاحب جیسے لوگوں کی منظومات چاہے وہ کتنی ہی صداقت پر مبنی کیوں نہ ہوں بے سرو پا پھسپھسی، بے اثر، اور بے کیف ہی رہ جاتی ہیں۔ علامہ اقبال کے خیالات کا منظوم جواب دینے کا حق علامہ اقبال سے بھی اونچے درجے کے فطری شاعر کو ہی پہنچتا ہے اور مستقبل قریب کیا، مستقبل بعید میں بھی اس درجے کے شاعر کے پیدا ہونے کی بظاہر توقع نظر نہیں آتی۔

مثال کے طور پر جمیل صاحب کے کلام معجز نظام کے دو ایک نمونے بھی دیکھتے چلئے۔

تو سمجھتا ہے خودی کی ہے نمود ۔۔۔ سوچ تو ان میں کہاں اپنا وجود
بے خودی کے بعد پھر کیسی خودی ۔۔۔ اب تو الّا اللہ کی ہے روشنی
مرد مومن ہے خدا انسان میں ۔۔۔ لا تو کچھ گرمی ذرا ایمان میں
عالم وحدت میں کثرت کا گماں ۔۔۔ شرک سے کرنے لگا اٹکھیلیاں
آپ اپنے سے اگر لپٹا رہا ۔۔۔ زندگانی سے اگر چمٹا رہا
تجھ کو ہو جائے گی خود سے محویت ۔۔۔ موت کو ہوتی ہے اس سے تقویت
موت سے ڈرتا رہے گا تو سدا ۔۔۔ زیست میں مرتا رہے گا تو سدا

"لا تو کچھ گرمی ذرا ایمان میں ۔۔۔ شرک سے کرنے لگا اٹکھیلیاں
تجھ کو ہو جائے گی خود سے محویت" یہ اس محشفیہ شاعری کے مشتے نمونہ از خروارے ہیں جو بزعم جمیل صاحب ان ایسی کتابوں میں سے ایک کتاب (ہے)۔۔۔ جو برس ہا برس میں لکھی جاتی ہیں، اور جسے قادر الکلام زود نویس شاعر کی اطلاع کے مطابق اس کے لکھنے میں "زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی مہلت درکار ہوئی ہوگی"!

جمیل صاحب علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کو غلط سمجھتے ہیں تو علمی انداز میں اس کی تردید نثر میں لکھ دیتے۔ جو کچھ انہوں نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے وہی کافی تھا لیکن انہوں نے جو دیباچہ اور منظوم تردید بھی اس میں شامل کی ہے اس نے اس اثر کو بڑی حد تک زائل کر دیا جو اس کے مقدمہ کے پڑھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ دیباچہ میں ان کا انداز بیان غیر عالمانہ ہی نہیں سوقیانہ ہو گیا ہے۔ "ہم" "ہم" کی تکرار پڑھنے والے کو بہت گراں گزرتی ہے۔ اور یہ کہنا کہ علامہ اقبال نہ تو مغربی فلسفہ کو سمجھ سکے اور نہ ہی مشرقی فلسفہ کو، اور پیر رومی کو بھی انہوں نے اپنا مرشد روحانی قرار دیا بھی تو ترک تعلق کر کے، یہ ایسی باتیں ہیں جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس مقام پر فائز ہیں جس پر جمیل صاحب تشریف رکھتے ہیں باقی عامیوں کے یہ باتیں بالکل ہی بیلنگا

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ فون ۳۵۲۰۹

جلد ۲۷ شمارہ ۷ جولائی ۱۹۶۴ء

ماہنامہ سب رس

حیدرآباد دکن

مدیران۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی

مجلسِ مشاورت۔ نصیرالدین ہاشمی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔
زہن راج سکسینہ۔ منظور احمد۔ وقار خلیل۔

مہتمم

محمد اکبرالدین صدیقی

سالانہ ہندوپاک سے	چھ روپے
ششماہی	تین روپے
بیرونِ ممالک سے	دس روپے
فی پرچہ	۵۰ پیسے

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر
ایوانِ اردو۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن ۴
سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

حیدرآباد کے قدیم گھرانوں کے افراد جو علم و فضل سے آراستہ تھے اپنے کتب خانے بھی رکھتے تھے اور ان میں مطبوعات کے علاوہ ایک مخطوطات کی بھی ہوتی۔ ان گھرانوں سے علم و فضل اٹھ گیا اور ان کے اخلاف نے اپنے ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھا اور جب یہ محسوس کیا کہ وہ ان کی صحیح محافظ نہ بن سکیں گے تو انھوں نے بعض کتب خانوں کو اپنی کتابیں تحفتاً دیدیں۔ بعض ایسے حضرات بھی ہیں جنھوں نے اپنی کتابیں فروخت کر کے اصحاب کے سامنے پیش کیں لیکن آج حالات بدل گئے۔ قدیم علم و ادب کا وہ چرچا باقی نہیں رہا اس لئے وہ منہ مانگے دام دینے کے موقف میں نہیں۔ سیکولر حکومت نے گشتی جاری کر دی ہے کہ مسلم ثقافت کی کتب اور اشیا کتب خانے اور عجائب خانے نہ خریدیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عربی، فارسی اور اردو مخطوطے ایسے اشخاص کے ہاتھوں فروخت ہونے لگے جن کا ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں اور ہندوستان کی یہ گراں بہا متاع غیر ممالک میں جا رہی ہے۔

ابھی حال ہی میں ایک خبر آئی ہے کہ نیویارک کے عجائب خانہ نے سنہرے حروف میں لکھا ہوا ایک فارسی مخطوطہ ڈھائی لاکھ روپے میں خریدا۔ بات بہ وثوق کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کے کسی کتب خانہ یا عجائب خانے نے ایک مخطوطہ کے لئے اتنی خطیر رقم صرف نہیں کی۔ یہ نسخہ ۱۵۸۳ء میں اس پر ایران کے مشہور مصور اور کاتب علی شاہ مشہدی کے دستخط ہیں اس میں آٹھ تصاویر ہیں۔ یہ نسخہ ڈاکٹر فرید برقانی نے نیویارک کے عجائب خانے کو بیچا ہے۔ اس طرح ایک نادر نسخہ ایران کے ہاتھ سے نکل گیا اور ایسے کئی نوادر ہندوستان سے بھی غیر ممالک تک پہنچ رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ارباب اپنے جاری کردہ حکم پر نظر ثانی کریں۔ خصوصاً صوبوں کے وزرائے تعلیم اور بطور خاص مرکزی وزیر تعلیم کو اپنی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو کا ایک اور محقق چل بسا۔ مولانا حامد حسن قادری نے ۹ جون کو کراچی میں انتقال کیا۔ "شرح انتخاب مومن" اور "داستان تاریخ اردو" کے مصنف کی حیثیت سے مولانا نے بڑی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ سینٹ جانسن کالج آگرہ میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے گذارا اور ملازمت سے ہٹنے کے بعد بچوں کے پاس کراچی گئے۔ وہ تاریخ گوئی میں خوب ملکہ رکھتے تھے۔ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں پر انھیں کامل دستگاہ تھی۔ اساتذۂ سخن کی غزلوں پر تضمین کرنے میں بڑی مہارت تھی۔ ایسے خاموش کام کرنے والے ادیب کا اٹھ جانا اردو والوں کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے۔ ہم بھی ان کے افرادِ خاندان کے غم میں شریک ہیں۔

ادبی دنیا کے ایڈیٹر صلاح الدین احمد نے بھی ۶۲ سال کی عمر میں بعارضہ فالج منٹگمری میں رحلت کی۔ گذشتہ دسمبر میں خبر آئی تھی کہ صلاح الدین احمد نے اپنی تمام غیر منقولہ املاک فروخت کر کے کل رقم اردو فاؤنڈیشن کو دیدی اور یہ کہا کہ اس رقم سے ایسے ادیبوں کی کتابیں شائع کی جائیں گی جنھیں کوئی پبلشر شائع کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اردو فاؤنڈیشن دار المصنفین بھی قائم کرے گی۔ صلاح الدین احمد نے اپنی ساری زندگی صحافی کی حیثیت سے گذاری وہ ادبی دنیا کے ایڈیٹر منصور احمد مرحوم کے ساتھ کام کرتے رہے اور ان کے انتقال کے بعد میراجی کو اپنا شریک کار بنا لیا۔ انھیں اردو سے عشق تھا اور ساری زندگی اسی عشق میں گذاری اور مر کر بھی اپنی جائداد اس کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہماری مجلس ادارت کے ایک رکن ہیں اور آج کل وس کانسن یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر ہیں ان کی کتاب اردو غزل کو حکومت اترپردیش نے غالب پر ایوارڈ رقمی ڈیڑھ ہزار روپے کا مستحق قرار دیا ہے ہم اس جواں سال ادیب کی خدمت میں اس اعزاز پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

جواہرلال نہرو کی امانت

ہوگیا۔ روشنی بجھ گئی۔ قوت و لطافت کا بہتا ہوا دریا خشک ہوگیا۔ آرزو اور جستجو کی کمندیں ٹوٹ گئیں۔ حوصلے
ہم سرنگوں ہوگئے۔

دنیا کی سانس رک گئی ، ناموسِ محبت کی پیشانی جھک گئی

انسانیت کا ایک عظیم پاسباں اٹھ گیا۔ تہذیب و تمدن کے کارواں کا ایک بلند قامت کارواں سالار ہم سے جدا
ختم ہوگیا۔ ایک پورے عہد کے قدم رک گئے۔ ایک تحریک ساکت ہوگئی۔ ایک پوری تاریخ کی نبض ڈوب گئی۔
وقت سوگوار ہے۔ زمانہ سوگوار ہے راستے دم بخود ہیں۔ منزلیں چپ ہیں مسافر سوگوار ہیں۔

آرزو پابگل جستجو مضمحل راستے منفعل شوق منزل خجل

صدی تک انسانی فکر و ذہن کو حرارت و گرمی عطا کی۔
ی کی ناہموار راہوں کو اپنی حکمت و بصیرت سے ہموار بنایا۔

وہ جواہرلال، وہ ہندوستان کے دل کی دھڑکن وہ ایشیا کے ضمیر کی آواز وہ ساری دنیا کے انسانیت کی صدائے
ہے۔ چپ ہے ساکت و صامت ہے۔ لیکن اس کے قلم کا سروش اور اس کے لبوں کا خروش آج بھی ساری فضا
ن کی لہریں پیدا کر رہا ہے۔

تمنا اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے آج وہ آفاق کی وسعتوں میں بہت دور نکل گیا ہے۔ لیکن روشنی کی ایک جگمگاتی ہوئی
پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ ایسی گہری اور تابناک لکیر جو کبھی مٹ نہیں سکتی۔ جس کے نقش کبھی فنا نہیں ہوسکتے۔ کہ اس لکیر
کی انسانی تہذیب کا دامن کھلا ہوا ہے کہ یہ لکیر تسلسل حیات کی ایک طویل شاہراہ نور ہے۔ انسانیت کا ایک منشور عظیم
جس نے ہر دور اور ہر عہد میں اپنے اجزائے پریشاں کو ایک دوسرے سے جوڑا ہے۔ اور جس کی شیرازہ بندی
پنی حیاتِ مستعار کی ساری توانائی صرف کردی۔ اور یہی نہرو کی میراث ہے۔ یہی نہرو کی امانت ہے اور یہ
بیش قیمت تحفہ ہے جو انھوں نے اپنے دور کو دیا۔

جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ آزادی کی جد و جہد میں قربان کردیا۔ اور پھر آزادی کے بعد سترہ برس تک ہندوستان
قافلہ سالار بنا رہا۔ وہ جس نے ساری دنیا کو امن و آشتی اور اتحاد و یک جہتی کا پیغام دیا۔ وہ جس نے انسانی

اخوت و مساوات کا علم بلند کیا وہ جس نے وطنیت اور قومیت کے تنگ دائرہ سے گذر کر ایک عالمی برادری کے نظریہ کو پھیلایا۔ وہ
جس نے نصف صدی تک اپنے عہد کو اپنی فکر و نظر سے متاثر کیا۔ وہ جس کے ناخن گرہ کشا نے نازک سے نازک گتھیوں کو ہنستے کھیلتے
سلجھا دیا۔ وہ جس نے رسم و قدامت کے سیکڑوں آہنی حلقوں کو توڑ دیا۔ وہ جس کے عزم و عمل نے اندھیروں کے قلعوں میں رخنے ڈالا
وہ جس کی نگاہ حق آگاہ نے ہندوستان کو جمہوریت اور سوشلزم کا راستہ دکھایا وہ نہرو —— وہ ہندوستان کی مضطرب روح
وہ عصر جدید کا انقلابی ذہن۔ وہ مختلف زبانوں اور عہدوں کے شعور کا ایک بے باک اظہار وہ نہرو۔ انسان کے ازلی اور ابدی خوابوں کا
ایک پیکر مجسم۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہے آج اس کا جسد خاکی اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچ چکا ہے لیکن اس کا پیام
زندہ ہے۔ اس کا نظریہ حیات زندہ ہے۔ اس کی آواز زندہ ہے۔ اس کے الفاظ زندہ ہیں اس کی روح کا اضطراب
تمنا اس کا آدرش .... اس کی انفرادیت اور عظیم شخصیت کے سارے اجزا و عناصر زندہ ہیں
متحرک ہیں۔ رواں دواں ہیں اور یہی نقوش ہیں یہی امر آوازیں ہیں یہی جاودانی قدریں ہیں جو آج ہم سے مطالبہ کر رہی ہیں
مجھے سمجھو مجھے پہچانو مجھے پرکھو مجھے اپنے سینے سے لگاؤ کہ میں نجات انسانی کی پیامبر ہوں۔ میں ہی سچائی کا راستہ ہوں میں لاکھوں برس
کی انسانی فکر و تہذیب کا حاصل ہوں۔ میں ہی ماضی ہوں حال ہوں اور مستقبل ہوں میں ہی دنیا کی عظیم شخصیتوں کا روپ ہوں اور میں
جواہر لال نہرو ہوں۔

انفرادی زندگی ختم ہو جاتی ہے آدمی مر جاتا ہے لیکن انسانیت آزادی ترقی تہذیب شرافت اور حیات اجتماعی کا رواں
آگے۔ اور آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک جادہ سے دوسرے جادہ پر ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف ایک موڑ سے دوسرے
موڑ کی جانب۔ اور یہ سفر مسلسل ہے یہ راستہ لا متناہی ہے اور اس راہ کے ہر مرحلہ پر قدرت ایک مرد کامل کو پیدا کرتی ہے
ہر موڑ پر ایک خضر راہ نمودار ہوتا ہے اور مسافران سست گام کو ایک نیا حوصلہ سفر عطا کرتا ہے۔

اور عصر حاضر نے بھی ایک خضر راہ ایک سالار کارواں ایک جواہر لال کو پیدا کیا تھا جس کے دل میں حیات کی بصیرت اور
جس کے ہاتھ میں ہدایت کی مشعل تھی۔ جو آج آفاق کے ظلمات میں اوجھل ہو چکا ہے۔ لیکن اپنے پیچھے روشنی کی ایک جگمگاتی ہوئی لکیر
چھوڑ گیا ہے یہ روشنی امر ہے۔ یہ نقش جاوداں ہے جواہر لال زندہ ہے۔ اسی روشنی اور اس نقش کی شکل میں نہرو کا پیام زندہ
نہرو کی آواز زندہ ہے تاریخ کا شعور زندہ ہے انسانیت کا آدرش زندہ ہے۔

اور۔ آج اپنے عظیم رہنما اپنے محبوب جواہر لال کی روح کے آگے خراج عقیدت پیش کرنے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ
ہو سکتا ہے کہ ہم اس روشنی کو اپنے سینوں میں جذب کر لیں۔ اس آواز کو اپنے سامعہ کا ایک اٹل حصہ بنا لیں۔ اور اس
کو دل و جان سے اپنا لیں جو ہمارے لئے اور ہمارے عہد کے لئے جواہر لال کا سب سے بیش قیمت تحفہ، ورثہ اور امانت ہے
(آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے شکریہ کے ساتھ)

پروفیسر شیخ فرید

باغِ اردو

گلستانِ سعدی کا ترجمہ ——— باغِ اردو ——— افسوس (میر شیر علی) کا شاہکار ہے۔ اس کارنامہ نے اسے حیاتِ جاوید بخشی۔ افسوس کے اہتمام سے اس کی پہلی اشاعت سنہ ۱۸۰۲ء میں ہوئی۔ اربابِ نثر اردو کے فاضل مؤلف نے اس نسخہ کی کم یابی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سیر المصنفین کے مؤلف کو ایک نسخہ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ خواجہ غلام الثقلین کے کتب خانے میں اس کا ایک قلمی نسخہ تھا۔"[۱] سید محمد صاحب کے پیش نظر گاؤں کا ۱۸۵۱ء کا مطبوعہ نسخہ تھا۔[۲]

راقم کے پیشِ نظر سنہ ۱۸۰۲ء / ۱۲۱۷ھ کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ اس میں تاریخ اور مہینہ کی صراحت نہیں ہے۔ گر دونوں جلدیں مئی اور دسمبر ۱۸۰۲ء کے درمیان طبع ہوئی ہیں۔

اس نسخہ کی کمیابی کے پیشِ نظر سطورِ ذیل میں اس کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔

باغِ اردو اس دور کی صاف اور سلیس زبان میں گلستان کا عمدہ ترجمہ ہے۔ ترجمہ زیادہ تر لفظی ہے۔ سعدی کے فصیح و بلیغ اشعار اور زبان زدِ خاص و عام مصرعے جو ترجمہ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ ان کو افسوس نے ویسا ہی رکھا ہے۔ اور بقول افسوس "کسی مقام میں ہو بہو بھی کرنے میں آیا ہے"[۳]

باغِ اردو دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد کے سرورق کی عبارت یہ ہے ———

باغِ اردو

ترجمہ گلستانِ شیخ سعدی شیرازی کا۔ واسطے زبدہ نوئینان عالی شان مشیر خاصِ شاہ کیوان بارگاہ انگلستان

مارکویس ولزلی گورنر جنرل بہادر

دام افضالہ کے

مسٹر جان گلکرسٹ صاحب دام ثروتہ کی فرمایش سے

کیا ہوا میر شیر علی افسوس کا

۱؎ اربابِ نثر اردو ص ۱۴۱ ۔ ۲؎ اربابِ نثر اردو ص ۱۰۱ ۔ ۳؎ باغِ اردو جلد اول ص ۲۳ ۔

دعویٰ عبث ہی ہمسے شاعر کو شاعری کا   دیوان ہی ہمارا کیسہ جواہری کا

ہندوستانی چھاپہ خانہ

سنہ ۱۸۰۲ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۱۷

ہجری کے

دوسری جلد کے سرورق کی عبارت درج ذیل ہے۔

باغِ اردو

ترجمہ کیا ہوا امیر شیر علی افسوس کا

دوسری جلد

مع ترجمہ شیخ سعدی کے پند نامے کا

کیا ہوا مظہر علی خاں ولا کا

ہندوستانی چھاپہ خانہ

سنہ ۱۸۰۲ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۱۷

ہجری کے

جلد اول میں " احوال رسم خط " کے عنوان سے جان گلکرسٹ کے رسالہ " رسم خط و اعراب " کا خلاصہ چھ صفحات تک ہے۔ صفحہ سات سے باغِ اردو شروع ہوتی ہے۔ گلستان کے دیباچہ کے قبل مترجم کا دیباچہ ہے جس کا عنوان ہے۔

" پہلا دیباچہ تعریف میں لارڈ صاحب کی اور احوال مترجم کا اور بعضے عذر و غین کتاب کے "

حمد، نعت اور منقبت میں ذیل کے تین شعر ہیں۔[۱]

نہالِ حمد پہلے اس میں بو تو   رہے سرسبز جو نت باغِ اردو
لگا پھر نعت کا اک دوست پودھا[۲]   کہ تا محشر رہے یہ باغ پھولا
پھر اس کے بعد نخلِ منقبت کو   لگا، رونق جو اس کی بیشتر ہو

نہال، نخل، سرسبز، بونا، پودا وغیرہ کا استعمال باغِ اردو کی رعایت سے کیا گیا ہے۔

---

[۱] جلد اول صہ ۔ نسخہ کی کمیابی کے پیش نظر ہر جگہ تمام اشعار نقل کر دیئے گئے ہیں۔ [۲] پودا۔

نثری حمد میں بھی یہی التزام ہے[۷]۔ اس کے بعد حمد میں چند اشعار ہیں[۸]۔

جو ابرِ کرم اس کا برسے ذرا ۔۔۔ تو ہر خارِ صحرا ہو گلبرگ سا
گرے اس کی جس وقت برقِ غضب ۔۔۔ تو کوہ و بیابان جل جائیں سب
وہ خلاقِ کون و مکاں چاہے جو ۔۔۔ تو تاثیر پانے کی آتش میں ہو
ہوا سے اثر خاک کا ہو عیاں ۔۔۔ ملک آدمی ہو ویں اور انس جاں
جواہر کے اعراض ہو ویں محل ۔۔۔ پڑے مذہبِ فلسفی میں خلل
یہ ہرگز نہیں اس کی قدرت سے دور ۔۔۔ یقین اس کا ہر ایک کو ہی ضرور[۹]

جد نعت میں تین شعر ہیں[۱۰]۔

جو پیدا نہ ہوتا وہ شاہِ جہاں ۔۔۔ تو ماہیتوں کا[۱۰] نہ ملتا نشاں
ہیولا و صورت نہ ہوتے بہم ۔۔۔ عدم میں ہیں[۱۰] رہتے سب افراد گم[۱۱]
کلامِ الٰہی ہو جس کی ثنا ۔۔۔ تو بندہ کرے اس کی پھر مدح کیا

ایجاز و معانی کا معجزہ ۔۔۔ کلام اللہ ۔۔۔ رسولِ مقبولؐ کی ثنا رہے۔
منقبت حضرت علی رضی اللہ عنہ میں افسوس کے اعتقادات کی جھلک ہے۔

ستونِ مکانِ شریعت ہی وہ[۱۱] ۔۔۔ خلافت کی مسند کی زینت ہی وہ
ہی دینِ نبی کا ہو ہی انتظام ۔۔۔ وہ مولا ہی اور ہم سبھی ہیں غلام
رسالت ہوئی مصطفےٰ پر تمام ۔۔۔ ولایت ہوئی مرتضےٰ پر تمام
ہمیں اور تمھیں اتنی قدرت کہاں ۔۔۔ کہ دونوں کے رتبے کریں ہم بیاں
پر اتنا تو لگتا ہی اپنا شعور ۔۔۔ اطاعت ہی دونوں کی سب کو ضرور
میں کیا چیز ہوں جو کروں ان میں فرق ۔۔۔ رہوں لیک ان کی محبت میں غرق
الٰہی بحق نبی فاطمہ ۔۔۔ کہ بر قولِ ایماں کنی خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ور قبول ۔۔۔ من و دست و دامانِ آلِ رسول

اردو جلد اول ص[illegible]۔ ص۸ باغ اردو ص۱ / ص۹ ماہیتوں کا۔ ص۹ ہی۔ ص۱۰ گم۔ ص۱۱ یائے معروف و مجہول میں امتیاز نہیں کیا ہے۔

حمد و نعت کے بعد شیر علی افسوس نے اپنے حالات لکھے ہیں[۱۷]۔ اوائل عمر میں گلستاں اور دیوان ولی کے مطالعہ اور موزونی طبع کے باعث شعر گوئی کا تذکرہ ہے۔ لکھنؤ میں شہزادہ جہاندار شاہ کی مصاحبت اور سرپرستی اور ان کے دہلی چلے جانے کے بعد نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کی قدر دانی و سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ستائیسویں تاریخ روز جمعہ کہ وہی سترہویں ماہ اکتوبر کی تھی۔ سن ہجری بارہ سی پندرہ تھے اور سن عیسوی اٹھارہ سو ایک کہ صاحب جلیل القدر کرنل اسکاٹ بہادر نے مجھے طلب بھیجا اور کلام میرا سنا پھر الطاف و نوازش سے فرمایا کہ سرکار کمپنی دام دولتہم کے ملازموں میں اسی تاریخ سے سرفراز ہوا"[۱۸]

افسوس نے کرنل اسکاٹ سے ملاقات کی تاریخ یوں لکھی ہے۔

روز	تاریخ	ماہ	سن
جمعہ	۲۷	؟	۱۲۱۵ ہجری
	۱۷	اکتوبر	۱۸۰۱ عیسوی

۱۲۱۵ھ یکشنبہ ۲۵ مئی ۱۸۰۰ء سے شروع ہو کر ۱۳ مئی ۱۸۰۱ء پر ختم ہوتا ہے[۱۹]۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۱ء ۹ جمادی الآخر ۱۲۱۶ھ سے مطابقت کرتا ہے۔ ۲۷ جمادی الاول ۱۲۱۵ھ جمعہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۰ء کے مطابق ہے۔

راقم کے خیال میں ملاقات کی تاریخ جمعہ ۲۷ جمادی الاول ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۰ء ہے۔

ارباب نثر اردو اور سیر المصنفین میں افسوس کے کلکتہ جانے کی تاریخ ۱۸۰۱ء لکھی ہے۔ ممکن ہے کہ کرنل اسکاٹ کی ہدایت[۲۰] کے مطابق افسوس اطمینان سے کلکتہ روانہ ہوئے ہوں۔

۱۲۱۵ھ باغ اردو کے آغاز کی تاریخ ہے[۲۱]۔ لہٰذا ۱۳ مئی ۱۸۰۱ء کے قبل افسوس کلکتہ پہنچ گئے۔ قرین قیاس ہے کہ دو تین ماہ سفر کی تیاری اور سفر طے کرنے میں صرف ہوئے ہوں گے اور اوائل ۱۸۰۱ء میں افسوس کلکتہ پہنچ گئے ہوں گے۔

کمپنی کے افسروں کی قدر دانی اور عزت افزائی کے بیان کے بعد جان گلکرسٹ کی فرمائش پر گلستان کے ترجمہ کا ذکر کیا ہے۔

۱۷۔ حالات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے۔ ارباب نثر اردو۔ سیر المصنفین۔ اردو داستان تاریخ اردو۔ ص۱۳۔ ص۱۰-۱۶۔ جلد اول باغ اردو ص۱۰-۱۶

۱۸۔ باغ اردو جلد اول ص۱۷ / ارباب نثر اردو ص۹۲۔ ۱۹۔ ص۱۵۔ ۲۰۔ بدل جمعی تمام کلکتہ کو روانہ ہو" باغ اردو جلد اول ص۱۵ ۲۱۔ باغ اردو ص۲

"لیکن تعلق میرا جو مدرسہ ہندی سے ہوا بنا پر اس کے لبا اوقات خدمت میں صاحب عالی طبیعت والا فطنت مدرس ہندی مستر جان گلکرسٹ صاحب دام ثروتہ کہ جامع قوانین اس زبان کے ہیں حاضر ہونے لگا۔ ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ تو گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کر"۔۔۔۔۔۔

اپنی بے بضاعتی کے اعتراف اور گلستان کی "صاف اور پیچ دار" عبارت[۱۷] کے باوجود افسوس نے کمر ہمت باندھی بلیغ کی[۱۸] اور "تمام کتاب اردو میں لکھی اور وہ مقبول خاص و عام کی ہوئی[۱۹]"۔

افسوس نے اس ترجمہ کا نام "باغ اردو" رکھا۔ اس کے شروع کی تاریخ بھی اسی میں سے نکلتی ہے[۲۰]"

میں تاریخ اس کی جب چاہا سے نام ۔۔۔ کہوں دل چسپ با آئین شیکو
کہ اس میں ہاتف غیبی یہ بولا ۔۔۔ ہے از آغاز اردے باغ اردو[۲۰]

کتاب کی مقبولیت کے ذیل میں مارکوئیس ولزلی کے عدل و انصاف کی تعریف کی ہے۔

حمایت اگر اس کی پشہ بھی پائے ۔۔۔ تو ہاتھی کو ہرگز نہ خاطر میں لائے
جو ابر کرم اس کا برسائے زر ۔۔۔ تو ہر ایک گدا لیوے دامن کو بھر
بیاں کیا کروں دانش و عقل کو ۔۔۔ فلاطون بھی اسے تعلیم ہو
سخاوت شجاعت کرامت کرم ۔۔۔ عیاں اس میں ہیں سب بوجہ اتم[۲۱]

صاحب موصوف کی پسندیدگی کو اس کتاب کی مقبولیت کا راز قرار دیا ہے۔

پسند آئے اس کو جو اس کی بہار ۔۔۔ رہے تازگی اس کی لیل و نہار[۲۲]

صاحب بہادر کی نظر کرم کی درخواست ذیل کے شعر پر ختم ہوتی ہے۔

کرم سے ہوں تیرے یہ امیدوار ۔۔۔ نظر مہر کی اس پہ ہو ایکبار[۲۳]

اس کے بعد "کئی سطریں عذروں میں ہیں" (صفحہ ۲۲)

ان سطور میں افسوس نے گلستاں کے ترجمہ کے متعلق چند باتیں کہی ہیں۔ یہ ترجمہ زیادہ تر لفظی ہے۔ کسی مقام پر بامحاورہ بھی کیا ہے۔

۱۷؎ باغ اردو جلد اول ص۱۹ / ۱۸؎ ایضاً ص۱۸ - ۱۹؎ ایضاً ص۱۹ / ۲۰؎ ایضاً ص۲۰

۲۱؎ باغ اردو ص۲۰-۲۱ ۲۲؎ ایضاً ص۲۱ - ۲۳؎ ایضاً ص۲۲ -

ذیل کے اشعار پر دیباچہ کا اختتام ہوتا ہے۔ جن میں ناظرین سے چشم پوشی کی درخواست کی بقا کا تذکرہ اور اپنی عاقبت کی خیر کی التجا ہے۔

رہے گا سدا جگ میں یہ بوستان — ثبات اپنا لیکن ہمیشہ کہاں
بقا نقش کاغذ کو ہے سالہا — اور انساں کے نقشے کو ہر دم فنا
مصنف و مؤلف کو کب ہے قیام — نشاں ان کا رہتا ہے بس ایک نام
یہ ہے طالبو تم سے مجھے التجا — کریں میرے حق میں دعا اتنی
بعشرت کروں باغِ دنیا کی سیر — ہو آخر میری عاقبت بالخیر
شکر ہے لا انتہا اللہ کا — ختم کس خوبی سے دیباچہ ہوا

اصل کتاب کا دیباچہ جو سببِ تالیفِ کتاب۔ امیر کبیر فخر الدین ابوبکر بن ابی نصر کی تعزیت کا عذر اور اختیارِ عزلت کے سبب پر مشتمل ہے صفحہ ۲۶ سے صفحہ ۵۸ تک محیط ہے۔ جلد اول کا ترجمہ ص۱ سے ص۲۲۶ تک ہے۔ آخر میں دس اوراق کا غلط نامہ ہے۔

جلد دوم میں گلستان کے چوتھے باب سے ترجمہ شروع ہو کر ص۲۱۲ پر آٹھواں باب ختم ہوتا ہے۔ باغِ اردو کے خاتمہ کی عبارت یوں ہے۔

"فضلِ رب العالمین و کرم ختم المرسلین سے اٹھارویں ماہ ذیحجہ کی روز پنجشنبہ کلکتے بیچ عہد سلطنت میں شاہِ عالم بادشاہ کے حکومت میں زبدۂ نوئینان عالی شان مشیر شاہ کیواں بارگاہِ انگلستان مارکویس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کی کہ سن ہجری سولہ ہیں اور عیسوی اٹھارہ سو دو یہ ترجمہ کہ مسمیٰ بباغِ اردو ہے تمام ہوا"

عون و توفیق ربِ سبحان سے — ترجمہ یہ کیا تمام میں جب
ختم کی اس کے پیرِ عقل سے کی — میں نے تاریخ عیسوی جو طلب
ابتدائے بہار سے یہ کہا — "باغِ اردو ہوئی گلستان اب"

امید مجیب الدعوات سے اور التجا قاضی الحاجات سے یہ ہے کہ ۹۹ اس کی بھی رونق بہار گلستاں کی مانند گلشنِ دوران میں پائیدار رہے اور مقبول خاص و عام کی بلکہ

ص۲۴ باغِ اردو ص۲۱۳

تمت تمام شد[23]

خاتمہ کے بعد ایک بیت میں افسوس نے تاریخ اختتام لکھی ہے۔

پنجشنبہ ۱۴ سلخ ذی الحجہ ۔ ۱۲۱۷ھ

۱۸۰۲ء ۔ ؟ ۔ ؟

مصرعہ ــــــ باغ اردو چو گلستان ۔ اب ۔ سے ۱۲۱۷ برآمد ہوتے ہیں۔ ابتدائیہ جس سے سبب کے وعدہ جلد تے سے ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے۔ اور افسوس نے ۔۔۔ لکھا ہے۔ ۱۲۱۹ سن ہجری ۱۴ رمضان ۱۲۱۵ھ سے ۱۴ ارمئی ۱۸۰۲ء تک ہے۔

خاتمہ کے خیال میں افسوس نے کلکتے پہنچنے کا ۱۲۱۵ ہجری سن مطابق ۱۸۰۰ء تسلیم کر کے ۱۸۰۰ء کے وائل کو باغ اردو کی ابتدا کی تاریخ تصور کرنا چاہیے۔ ۱۲۱۷ھ بھی افسوس نے ہی صراحت کی ہے۔

تاریخ اختتام غور طلب ہے۔ مادۂ تاریخ کے لحاظ سے ۱۸۰۲ء ہے۔ اور ۱۸۰۲ء کی وضاحت کی گئی ۱۴ ماہ ذی الحجہ پنجشنبہ ۱۲۱۷ھ ۱۸۰۲ء سے مطابقت کرتا ہے۔ تقویم ہجری و عیسوی[22] کے لحاظ سے یکم ماہ ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ کو یک شنبہ ۱۴ اپریل ۱۸۰۲ء ہے۔ اس حساب سے ۱۴ ماہ ذی الحجہ کو چہار شنبہ آتا ہے۔

۱۲۱۶ھ میں ماہ شوال یا اس کے قبل کسی ۲۹ دن کے مہینے کو ۳۰ دن کا مہینہ قرار دے لیا جائے تو ایک دن کا فرق پیدا ہو جائے گا اور ۱۴ ماہ ذی الحجہ چہار شنبہ کے بجائے پنجشنبہ کو آ جائے گا اور وہ ۲۳ اپریل ۱۸۰۲ء سے مطابقت کرے گا۔ اس طرح افسوس کی وضاحت کے مطابق باغ اردو کی تکمیل کی تاریخ ۱۴ ماہ ذی الحجہ پنجشنبہ ۱۲۱۶ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۸۰۲ء آتی ہے۔ اور یہ گمان ہوتا ہے کہ مادۂ تاریخ میں افسوس نے ایک کی کمی کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کر دیا۔ اس حساب سے افسوس نے گلستان کا ترجمہ تقریباً ۱۴/۱۵ ماہ میں کیا۔

خاتمہ کے بعد چند سطور لکھے عذر و نیز اور فائدوں میں ہیں[24] جو اختلاف حرکت و سکون میں یا حروف الفاظ میں کیا ہے۔ اس کو بیان کیا ہے۔

"چند سطریں شیخ مرحوم کے احوال میں ہیں[25]" شیخ سعدی کے حالات کے بعد امیر خسرو کا ذکر کیا ہے۔ امرا اور عہد کی شعرا فوت کی اور تعدد ادانی کا بیان ہے۔ میر شمس الدین فقیر، سراج الدین علی خاں آرزو، سودا، میر کا تذکرہ ہے اپنے عہد کے کاملان فن ـــــ شیخ آیت اللہ ثنا، نور العین واقف، میر قمر الدین منت کا بھی ذکر کیا ہے۔

---

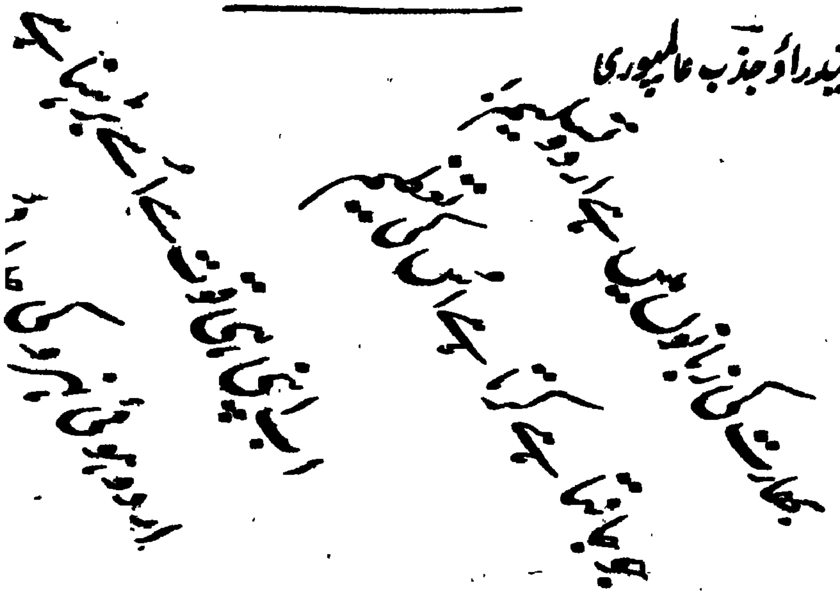
[23] باغ اردو [illegible] ص ۱۱ [illegible] ۱۹۲۳ء [illegible]

مرزا قتیل کے ذہنِ رسا اور طبع ظریف اور اس کی نظم و نثر کی متانت اور رنگینی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے کلام و صحبت سے نہایت محظوظ ہے۔[۲۹]
تفضل حسین خاں کے تبحرِ علمی کے تذکرہ کے بعد "الناس علیٰ دینِ ملوکہم" کی چند مثالیں ہیں۔ تعریف ہے۔[۳۰]

"فائدہ" کے عنوان کے تحت تصنیف و تالیف کا کام کرنے والوں کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے جتلایا ہے کہ مصنف یا مولف کو بھاکا، فارسی، عربی اور قدرے سنسکرت اور ترکی کا علم ہونا ضروری کے لئے جان گلکرسٹ کے رسالہ خطی کے خلاصہ کی سفارش ہے۔ یہ خلاصہ میر بہادر علی میر منشی نے کیا شائع ہوا ہے۔[۳۱]

جلد دوم میں منظر علی ولا کا پندنامہ کا ترجمہ شامل ہے جو صفحہ ۲۲۲ سے ۲۵۵ تک ہے۔ گیارہ[۱۱] بعد سات اوراق پر مشتمل انگریزی میں ایک "تعارف" ہے۔ جس میں عطا حسین تحسین کے چار درویش، قصہ سلطان معین الدین سے چند اقتباسات لے کر ان کو فصیح محاورہ کے مطابق لکھا ہے اور آخر میں سے ایک پارہ نقل کیا ہے۔

رگھو نندن راؤ جذب عالمپوری



۲۹-۳۱ باغ اردو جلد دوم ص۵۹، ص۳۰ باغ اردو ص۲۵۰

میری نیواس لاہوٹی

نرالا کی شخصیت اور شاعری

۱۵ ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کے بعد مادی نقطہ نظر سے نرالا ہمارے درمیان میں نہیں رہے، لیکن گذشتہ پچاس سال میں انھوں نے قلم کے سپاہی کی حیثیت سے ادب اور سماج کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔ ذہنی اور جسمانی طور پر بستر مرگ پر پڑے پڑے بھی مہا بھارت کے مشہور کردار بھیشم کی طرح نرالا اپنی شاعری کے ذریعہ انسانیت کے لئے ریشمی ہار گوندھتے رہے اور ان کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ ان کی انگلیوں نے جواب نہیں دے دیا اور موت نے ان کی زندگی کی کلائی پر راکھی باندھ کر ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا نہیں کر دیا۔ قطرت کے اس عمل کی وجہ سے جسمانی طور پر نرالا کی روح کو سکون نصیب ہو گیا ہو لیکن ہمارے ادبی قافلے کو انھوں نے جو روح عطا کی تھی وہ آج بھی زندہ ہے ہمارے ادب کے لئے حیات آفریں ہے اور انھوں نے جو انمٹ نقش چھوڑے ہیں اس پر ہمارا ادبی کارواں چلتا جائے گا تاکہ ہم اپنے ادب اور سماج کو سنوار سکیں۔

نرالا کی موت ہمارے بے رحم سماج کا ایک المیہ ہے ـــــ سونی ٹہنی کو دیکھ کر ہم سب لوگ بسورتے ہیں اور جب گلاب کی پنکھڑیاں جھڑ کر مٹی میں مل جاتی ہیں تو ہمارا سماج اس کی خوشبو کو تلاش کرتا ہے لیکن جب وہی گلاب کا پھول ٹہنی پر رہتا ہے تو کوئی بھی اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ کیا وہ دھوپ کی تمازت سے مرجھا تو نہیں رہا ہے، مگر جب وہ ٹہنی سے جدا ہو جاتا ہے تو سب لوگ اس کے چرنوں میں بھینٹ چڑھاتے ہیں، خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ہمارے سماج کا یہ دستور اتنا نرالا ہے جتنا کہ خود شاعر اپنی زندگی سے نرالا تھا۔

پورے ہندوستانی ادب کا جائزہ لیا جائے تو چند ہی ایسے نام ہمارے سامنے آئیں گے جنھوں نے ہمارے ادب کے دھارے کو موڑنے میں مدد دی ہے۔ ان میں سوریا کانت ترپاٹھی نرالا کا بھی ایک نام ہے۔ آج سے تقریباً ستر سال قبل دسمبر ۱۸۹۶ء میں صوبہ یو۔ پی کے ایک برہمن خاندان میں نرالا پیدا ہوئے اور ابتدا ہی سے باغیانہ خیالات رکھنے کی وجہ سے انھیں کم عمری ہی میں گھر بار

چھوڑ دیا اور انھوں نے ظلم کے خلاف اپنی بیزاری کا جذبہ ظاہر کرنے کے لئے عشق کی گرمی کو
اس میں ناکام رہے۔

ن۔ م۔ راشد ہندوستان کی تاریخ سے انتہا پسند اشتراکی احساسات کی بنا پر روایات کے
خلاف ہیں اور گرد و پیش سے متعلق ہو کر مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتے تھے لیکن ان کو اس میں جو
کامیابی ہوئی اس کا فیصلہ ہمارے ادبی مورخ کے شعور پر چھوڑ دینا چاہئے۔ میں اس کا
کسی شاعر کا دوسرے شاعر سے مقابلہ کیا جائے اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دی
اگر ہم انگریزی ادبیات کے تجربات سے شعراء کیٹس، شیلی اور بائرن کی مشترکہ خصوصیات
کسی ایک شاعر میں دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ سب یکجا تو یا شی ن۔م۔ راشد ہی میں جو
کیٹس کی طرح سے مستقبل کی خواب آفرینیاں اور بائرن کی طرح سے حال کی ناآسودگیاں شیلی
جلوہ نما ملیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے جمالیاتی شعور کو ایک نیا آہنگ ملا
آزاد نظم کی ہیئت اختیار کرنے سے پائی۔ چنانچہ ن۔م۔ راشد نے فطرت حسن کی شکل میں شوق کے تحت
انقلاب کی بزم میں آتشیں رنگ لگائے ہوں مگر اثر آفرینی کے اعتبار سے قوی ہیں ان کا گریز
مقصد رہی۔ اس کے علاوہ شاعرانہ اظہار کے لئے ن۔م۔ راشد نے جو وسائل اختیار کئے یا جو
کام لیا اس کا شیکسپیئر کے عہد کی شاعری کی روایات سے بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے کہ
اعتبار سے اس باغی شاعر کے یہاں آزاد نظم میں کلاسیکی ہیئت کا پورا اہتمام
نظر آتا ہے جو انگریزی ادب میں شیکسپیئر کے عہد کی خصوصیات میں سے ہے اور راشد کی
یہی وہ مقام ہے جہاں فرد اور سماج ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

ن۔م۔ راشد نے جب آزاد نظمیں لکھنی شروع کیں تو مشرقی روایت پرست نقادوں
بڑی ہنسی اڑائی اور جب مشاعروں میں ن۔م۔ راشد اپنی نظمیں سنانے کے لئے کھڑے ہوتے
یہ طبقہ ان پر پھبتیاں کستے اور مطالبہ کرتے تھے کہ وہ ترنم کے ساتھ اپنی نظم پڑھیں
اس لئے کہ شاعر کی آواز میں لحن ہونے کے علاوہ موسیقی سے بہت لگاؤ تھا لیکن
اس مطالبے کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور انگلستان کی طرح سے اسٹیج کی بنا ڈالی
خود بغیر ترنم کے ڈراموں میں اپنی آزاد نظمیں سنانے لگے اور ان کی یہ تکنیک اتنی مشـ

پھر بھی محسوسات و تجربات کی سادگی، تخیل اور زبان میں شائستگی یہ وہ مزاج تھا جس کے ساتھ شاعری کے میدان میں آئے
نئی نسل کے ذہن پر چھا رہی تھی اور ان کی شاعرانہ عظمت اور فکر کی بالیدگی میں عوامی رجحانات کی
پختگی کا احساس بھی ہے لگتا تھا رفتہ رفتہ یہ آنچ اتنی تیز ہوتی گئی کہ ان سے انقلابی شرارے
پھوٹنے لگے اس موڑ پر پہنچ کر شاعر کو زندگی میں دو ایسے صدموں کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کا
ذہنی توازن بگڑ گیا اور وہ تادم مرگ ان صدموں سے سنبھل نہیں سکے۔ پہلا صدمہ تو جوانی کے
عالم میں بیوی کا داغِ مفارقت دے جانا تھا اور دوسرا صدمہ جوان بیٹی کا چل بسنا تھا۔
نوجوان شاعر کی زندگی میں یہ اتنے بڑے حادثے تھے کہ ان کو جھیل نہیں سکے اور ان کی زندگی پر
سونا پن سرایت کر گیا اور اس سونے پن کو مٹانے کے لئے وہ معشوق کی چوکھٹ پر رموز سجدہ سے
آشنائی پیدا کرنے لگے مگر اس دنیا میں انھیں اتنا بھٹکنا پڑا اور اتنی ٹھوکریں کھانی پڑیں کہ وہ
زندگی سے بیزار ہو گئے اور ایک گونہ بے خودی کی چاہت نے مئے سے رشتہ جوڑ لیا جس سے موجودہ
سماج میں چھٹکارا پانا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے ۔۔۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان فکر و نظر کی
منزلوں سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر کار اس کا حشر مجاز اور نرالا کی موت کی صورت میں
نمودار ہوتا ہے۔

نرالا صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ پہلوان، موسیقار، ادیب اور مصور بھی تھے۔
اپنے اس مخصوص کردار کی وجہ سے وہ دلچسپ شخصیت کے مالک بن گئے تھے۔ ان کی خودداری کا
یہ عالم تھا کہ اس حالت میں بھی جب کہ ان کی عمر کا بڑا حصہ انتہائی افلاس اور تنگ دستی کا
مقابلہ کرتے ہوئے گزرا لیکن انھوں نے کسی سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور جو بھی کوئی سلوک کرنا چاہا
اس سے اپنے دامن کو محفوظ رکھا ۔۔۔ ایک بار یو۔پی کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنا نند بذات خود
مزاج پرسی کے لئے شاعر کے یہاں گئے اور ان سے درخواست کی کہ حکومت ان کے لئے وظیفہ مقرر
کرنا چاہتی ہے تو انھوں نے وظیفہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور جب اسپتال میں شریک ہو کر
علاج کروانے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "میں دارا گنج (الہ آباد کا ایک محلہ)
چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔" وہ ہمیشہ دولت و ثروت کی نمود و نمایش سے بے پرواہ رہے اور
اپنی وضعداری کو نبھاتے ہوئے دنیا سے چل بسے۔ پیسہ ان کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔

اپنے جس مجموعے کو انھوں نے دو سو روپے میں پبلشر کے ہاتھ فروخت کیا تھا، اور جب اس مجموعے سے پبلشر کو ہزاروں روپے کی آمدنی ہوئی تو دوستوں نے اصرار کیا کہ وہ اس سے رائلٹی طلب کریں تو شاعر نے یہ کہہ کر دوستوں کی زبان بند کردی کہ "چلو اچھا ہوا کہ کم از کم وہ پبلشر میری وجہ سے ہزاروں کا آدمی تو ہو گیا۔" وہ ہمیشہ دوسروں کو کچھ دے کر اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت انسان سمجھتے تھے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک بڑے لکھ پتی تاجر نے سردی سے بچنے کے لئے شاعر کو ایک قیمتی شال بھینٹ میں دی، لیکن دوسرے دن وہ کیا دیکھتے ہیں کہ وہی شال ان کے پاس کام کرنے والے ایک ملازم نے اوڑھ رکھی ہے! ان کو بُرا معلوم ہوا اور انھوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیا۔ بس پھر کیا تھا شاعر بگڑ گئے اور انھوں نے کہا کہ " تمہاری شال کتنے روپیوں کی تھی اتنے روپے لے لو اور چلے جاؤ۔ یہ میری اپنی بات ہے شال میں اوڑھوں یا میرا نوکر اوڑھے۔ شال کی جتنی ضرورت مجھے ہے اتنی ہی ضرورت اس کو بھی ہے۔"

نرالا ہندی ہی کے عالم نہیں تھے بلکہ وہ بنگالی، انگریزی اور سنسکرت پر بھی بڑی قدرت رکھتے تھے ہندی ادب کو انھوں نے ان زبانوں کے ایسے شاہکار عطا کئے ہیں جو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے وہ زبان اور انداز بیان کی ذرا سی غلطی کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے اس لئے ان کی نظم ہو یا نثر زبان اور بیان کے لحاظ سے بالکل نکھری ہوئی ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں نرالا کی شاعری پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر میں یہ لکھوں کہ ان کی نظمیں "تلسی داس" اور "رَدھ شکتی پوجا" یا "کون تم کے پار" ہندی ادب میں گراں قدر اضافہ ہے کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ ہندی شاعری کو نرالا کی سب سے بڑی دین بغاوت اور انقلاب ہے۔ نرالا سے قبل یہ دونوں باتیں ہندی شاعری میں ایک طرح سے مفقود تھیں لیکن انھوں نے سماج سے بغاوت اور سماج کو بدلنے کے لئے انقلاب کا نعرہ شاعرانہ انداز میں بلند کیا اور آخر وقت تک وہ اس کے علمبردار رہے۔ اس طرح سے ہندی شاعری کو نرالا کی دوسری دین ان کے گیت ہیں۔ ہندی میں گیتوں کا جو تجربہ نرالا نے کیا ہے وہ ان کی اپنی خصوصیت ہے ان کے گیتوں میں جہاں کلاسیکل موسیقی کا پُٹ شامل ہوتا ہے وہیں سماجی بیداری کی چنگاریاں بھی ملتی ہیں جس کی وجہ سے موسیقی اور انقلاب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر ایک نیا سندیش دیتے ہیں۔ چنانچہ اپنے گیتوں میں شاعر نے پچھڑے ہوئے طبقے اور خاص طور پر طوائفوں سے تعلق

رکھنے والے لوگوں پر بڑے طنزیہ انداز میں بہت چوٹ کی ہے :-

ایک بار بس اور ناچ تو شیاما
سامان سبھی تیار
کتنے ہی ہیں اسُور، چاہیے تجھ کو کتنے ہار!

اسی طرح سے " جمنا کے لئے "۔ " پُربہ کے لئے "۔ " ترنگوں کے لئے "۔ اور " آبشار کے لئے " ایسے گیت ہیں جن کا مقابلہ شیلی کی (WEST WIND) کیٹس کی (ODE TO NIGHTINGALE) اور ورڈس ورتھ کی (ODE ON THE INTIMATIONS OF IMMORTALITY) سے کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ جدوجہد ہی میں زندگی کا راز مضمر ہے تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نرالا نے زندگی کی جدوجہد سے بہت کچھ سیکھا تھا، اور اس سے جو کچھ حاصل ہوا اسے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستانی سماج کو واپس لوٹا دیا جو نئی ہندی شاعری کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ زندگی کی اسی جدوجہد کے دوران میں انہیں رام کرشن مشن میں بھی سہارا ملا جہاں ان کے فلسفیانہ خیالات کی تشفی کا سامان مہیا ہوا، اور رام کرشن وسوامی ویویکانند کے فلسفے نے ان کی شخصیت کو جو ضیا بخشی اور شاعر نے ان دونوں کے فلسفۂ زندگی کو بنیاد بنا کر جس نئی ہندی شاعری کی تخلیق کی اس میں وہ آج بھی منفرد مانے جاتے ہیں۔ ان کی نظم " جاگو پھر ایک بار " میں آزاد روح کا جو ترانہ ملتا ہے وہ گیتا کے " کرم یوگ " اور ویدانتک فلاسفی کے نقطۂ نظر کی تشریح ہے۔

نرالا کی پیدائش ایک بھرے پُرے خاندان میں ہوئی تھی، لیکن یہ تین سال کے ہونے نہ پائے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور یہ ممتا سے محروم ہو گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ بر آمد ہوا کہ ان میں ایک طرف خود اعتمادی پیدا ہونے لگی تو دوسری طرف انھیں زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے معاشی جدوجہد سے دوچار ہونا پڑا اس کی بنا پر ان میں موجودہ سماج کے تعلق سے ایک طرح کی تلخی پیدا ہوگئی اور اس تلخی نے ان کی شاعری کے اس روپ کو نکھارا جسے "ہندی شاعری میں نیا آہنگ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ شکتی کے روپ میں ماں کے تصور کا ذکر نرالا نے اپنی شاعری میں کئی جگہ کیا ہے نرالا کی نظم " سپنج وٹی " کی ماں بھی وہی ہے جو قاضی نذر الاسلام کی شاعری میں شکتی کے روپ میں

دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح سے نرالا اپنے غموں کے بعد جس دنیا کا تصور باندھا تھا و

ماں مجھے وہاں تو لے چل
دیکھوں گا وہ دوار
دوس کا ہار
مرجھت ہوا پڑا ہے جہاں
ویدنا کا سنسار

ہندی شاعری میں ٹی۔ ایس ایلیٹ کی شاعری کو بنیاد بنا کر بہت سے شعرا نے تر مذاق اڑانا شروع کیا تو شاعر کو جلال آگیا اور انھوں نے بھرپور طنز کے ساتھ ایسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

کہیں کا روڑا، کہیں کا لیا پتھر
ٹی۔ ایس ایلیٹ نے جیسے دے مارا
پڑھنے والوں نے جگر پر ہاتھ رکھ کر
کہا، کیسا لکھ دیا سنسار سا گرا

چودہ سال کی عمر میں شاعر کی شادی کر دی گئی تھی، اس وقت انھیں ہندی نہیں آ ان کی بیوی اچھی خاصی ہندی کی پنڈت تھیں۔ بیوی نے نرالا کی شخصیت کے بنا اسی طرح سے مدد دی جس طرح سے کالیداس کو کالیداس بنانے میں اس کی بیوی نے تلسی داس کو تلسی داس بنانے میں ان کی بیوی" رتنا ولی" نے دی تھی۔ جس طرح کسی "مجھے شاعرانہ تحریک شکسپیر کی روح سے ملتی ہے"۔ اس طرح سے نرالا بھی اپنی شر روح سے تحریک حاصل کرتے ہیں اور اس کو "دیوی پریدنا" کا نام دیتے ہیں:۔

تمہیں گاتی ہو اپنا گان
ویہ رتھ میں پاتا ہوں سنمان
بھاونا رنگ دی تم نے اپران
چھند۔ بندوں میں نچ آہوان

نرالا اپنے کو فرد تنہا مانتے تھے، بلکہ اپنے آپ کو پورے کا پورا تنہا ادب تصور کرتے تھے اور یہ ان کے "انا" کی انتہا تھی۔ فرائڈ کے نقطۂ نظر سے نرالا کی شاعری اور شخصیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں "انا" اور "فوق انا" مستقل اور منظم طریقے پر پایا جاتا تھا جو ان کی ذہنی ساخت کا ردعمل ہے۔ اگر نرالا عام انسانوں کی طرح سے زندگی گزار سکتے تو شاید سماجی نقطۂ نظر سے ان کی شخصیت عام انسانوں کی طرح سے پروان چڑھتی تھی لیکن جن حالات اور ماحول سے نرالا کو گزرنا پڑا اس کے نتیجے کے طور پر متدرجۂ بالا تینوں باتیں ان میں سما گئی تھیں اور ان کی شخصیت میں ایک ایسا انوکھا پن سرایت کر گیا تھا جو تمام انسانوں سے مختلف دکھائی دیتا تھا جس کا پرتو ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہوا نظر آتا ہے! اس لئے ہم ان کی شخصیت اور شاعری کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔

نرالا کی شاعری پر سب سے بڑا اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ سنسکرت آمیز ہندی میں شاعری کیا کرتے تھے جو عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ ایک حد تک یہ اعتراض درست معلوم ہوتا ہے، لیکن شاعر نے جن فلسفیانہ خیالات کو بنیاد بنا کر شاعری کی تخلیق کی تھی اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ سنسکرت کا سہارا لیتے ورنہ ان کی شاعری روکھی پھیکی ہو کر رہ جاتی۔

نرالا نے اردو میں بھی شاعری کی ہے اور ان کی غزلیں مشہور بھی ہوئیں، لیکن ان میں فن اور خیالات کا وہ رچاؤ نہیں ہے جو ان کی ہندی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو غزلوں کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے:-

نگہ تمہاری تھی دل جس سے بے قرار ہوا مگر میں غیر سے مل کر نگہ کے پار ہوا

کنارہ وہ ہم سے کئے جا رہے ہیں دکھانے کو درشن دئے جا رہے ہیں

آخر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ نرالا نے جن شاعرانہ انداز اور روایات کو جنم دیا تھا ان کو آگے بڑھانا چاہیے تاکہ ہمیں اپنی ادبی بے مائیگی کا احساس نہ ہونے پائے اور یہی نرالا کی سب سے بڑی یادگار ثابت ہو سکتی ہے۔ (اردو مجلس حیدرآباد میں پڑھا گیا)۔

اقبال کرشن

دو ڈاک انٹرویو

ضیاء احمد بدایونی ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

مولانا ضیاء احمد بدایونی

اقبال کرشن۔ تسلیم، پروفیسر صاحب!

ضیاء احمد۔ جیتے رہیئے۔

ا۔ک۔ آپ کی تاریخ ولادت؟

ض۔ا۔ میری تاریخ ولادت ۲۱ ستمبر ۱۸۹۴ء ہے۔

ا۔ک۔ تعلیمی سرگذشت؟

ض۔ا۔ قرآن مجید اور ابتدائی فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں دار العلوم شمس حاصل ہوا، اور کئی سال تک عربی صرف و نحو منطق، فقہ۔ حدیث اور تفسیر کی تحصیل میں مصروف رہا۔ کچھ عرصے تک گھر پر انگریزی اور حساب سیکھ کر گورنمنٹ ہائی اسکول بدایون داخلہ لیا، اور اسی کے بی۔اے کیا۔ ہر درجے میں اول آیا، اور بی۔اے میں طلائی تمغا حاصل کیا۔ ۱۹۲۳ء میں الہ آباد فارسی میں ایم۔اے کیا اور اول ڈویژن کے ساتھ یونیورسٹی میں اول آیا جس کے بعد یونیورسٹی وظیفہ عطا کیا اور میں دو سال تک وہیں رہ کر "عہدِ اکبری میں ارتقائے ادبِ فارسی" پر ریسرچ شمس العلوم میں میرے اساتذہ اپنے عہد کے ممتاز عالم تھے اور مجھ پر خاص شفقت اسکول اور کالج کے استاد بھی مجھ سے ہمیشہ خوش رہے۔ فراغ تعلیم کے بعد ہی میں مسلم

زمرۂ اساتذہ میں منسلک ہو گیا۔

ا۔ک۔ ادبی مشاغل؟

ض۔ا۔ مجھے اُردو۔ فارسی اور عربی ادب سے خاص ذوق رہا ہے، چنانچہ ادبی موضوعات پر میں نے کافی مطالعہ کیا ہے اور بہ کثرت مضامین لکھے ہیں، جن کی اہلِ علم نے بہت قدر کی اور جو مُلک کے موقر رسائل میں شائع ہوئے۔ خود میرا ذاتی کتاب خانہ مختلف زبانوں اور فنون کی کئی ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ بریں میں ہندوستانی اکاڈیمی اور بعض دوسری ذمہ دار انجمنوں کا ممبر رہا ہوں۔

ا۔ک۔ آپ کی مطبوعات؟

ض۔ا۔ قصائدِ مومن، مع مقدمہ و شرح ــ دیوان مومن مع مقدمہ و شرح (شانتی پریس الہ آباد سے اس کے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں)۔ یادگارِ غالب ۔ لمعاتِ رفی ۔ تذکارِ سلف ۔ تجلیات قولِ سدید ۔ موجودہ تصوف۔

ا۔ک۔ زیرِ طبع؟

ض۔ا۔ "انتخاب کلام شعرائے فارسی مع ترجمۂ اُردو" ساہتیہ اکاڈیمی دہلی میں زیرِ طبع ہے۔

ا۔ک۔ زیرِ تصنیف؟

ض۔ا۔ فی الحال "یو۔جی۔سی" کی زیرِ ہدایت امیر خسروؔ کے جو ستے دیوان پر کام کر رہا ہوں۔

ا۔ک۔ ایک کتاب آپ لکھیں پروفیسر صاحب۔

ض۔ا۔ کون سی کتاب؟

ا۔ک۔ اُردو عروض پر کوئی اچھی HANDY کتاب جدید تقاضوں کے مطابق؟

ض۔ا۔ "آئینۂ بلاغت" مرتبۂ مرزا محمد عسکری اچھی کتاب ہے۔

ا۔ک۔ تمام ہندوستانی زبانوں کے ادبی شاہکار ہندو مذہب کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کی سینچی ہوئی اُردو زبان بہت کچھ سیکولر ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ض۔ا۔ اُردو زبان سے مجھے خاص اُنس ہے۔ اگرچہ عربی و فارسی سے بھی کافی مناسبت ان کے علاوہ انگریزی۔ ہندی۔ ترکی۔ عبرانی بھی کم و بیش جانتا ہوں۔

اُردو میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو ہندوستان کی دوسری زبانوں میں نہیں ہیں یا کم ۔ ہندو مسلم میل جول سے پیدا ہوئی ۔ اس لئے قومی یک جہتی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے ۔ مگر اس نعرہ لگانے والے دیدہ و دانستہ اس حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں ۔ ۲) اُردو کا دامن الفاظ کے لئے ہے ۔ (۳) اُردو اور اُس کا موجودہ رسم الخط ہماری حکومت اور مشرق ارتباط کا اہم وسیلہ ہو سکتا ہے ۔ (۴) اُردو تمام ہندوستان میں بولی یا سمجھی جاتی ہے ۔ ہندوستان کے باہر بھی ۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد دنیا کی بڑی زبانوں کے بولنے شاید تیسرے نمبر پر ہے ۔ (۵) اس کی کثیر تصانیف کا دائرہ سیکڑوں علوم و فنون کو گھیرے (۶) بہ قول شری سنجیوا ریڈی اُردو ہندوستان کی تمام زبانوں سے زیادہ شیریں متمول ترین زبانوں میں ایک ہے ۔

ا ۔ ک ۔ اچھا یہ بتائیں پروفیسر صاحب ۔ طلبا کے اخلاق و عادات ستور بگڑ رہے ہیں ۔

ض ۔ ا ۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ جوں جوں تعلیم بڑھتی جاتی ہے ، ہمارے طلبا و طا اخلاق بگڑتے جاتے ہیں ۔ یہ بلا ہر جگہ اور ہر درس گاہ میں ہے ۔ خود سری ۔ تمائش اسراف وغیرہ کی کثرت ہے جس کا سبب مُلک اور گھروں کا لادینی ماحول ، نیز لیڈر و سیاسی آلۂ کار بنانا ہے ۔

ا ۔ ک ۔ اچھا یہ انجمن میں کتابوں کی منظوری اور طباعت میں اتنی تاخیر فرمائیے تو ۔

ض ۔ ا ۔ انجمن کے وسائل کم ہیں اور کام زیادہ لے رکھے ہیں ۔

ا ۔ ک ۔ جب تک ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل روشن نہیں مستقبل تاریک ہی نظر آتا ہے مجھے ۔

ض ۔ ا ۔ مجھے بڑی حد تک اس سے اتفاق ہے ۔

ا ۔ ک ۔ "یہ آزاد شاعری" کیا ہے ۔ تن آسانی اور شعر گوئی کی قابلیت انحطاط کی مظہر ؟

ف ۔ ا ۔ آزاد شاعری کے بعض نمونے فکر انگیز اور ریجنل ضرور ہیں، مگر مجموعی طور پر خیال کی خامی اور زبان کا سقم زیادہ ہے۔ آزاد شاعری نے اب تک کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں کیا، اور بہ ظاہر اُمید بھی کم ہے۔

ا ۔ ک ۔ اچھا تو اب اجازت چاہتا ہوں ۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ۔ آپ کے قیمتی اوقات میں نے ضائع کئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ف ۔ ا ۔ کوئی مضایقہ نہیں ۔ اِس بہانے سے "نصف الملاقات" کا موقع مل گیا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اقبال کرشن ۔ آداب عرض ڈاکٹر صاحب ۔

گوپی چند نارنگ ۔ آداب عرض ۔

ا ۔ ک ۔ آپ کی تاریخ پیدائش ؟

گ ۔ چ ۔ ن ۔ اس صدی کی چوتھی دہائی کے پہلے سال کا پہلا دن، حساب خود ہی لگا لیجئے ۔

ا ۔ ک ۔ تعلیمی سرگذشت ؟

گ ۔ چ ۔ ن ۔ جسے باضابطہ تعلیم کہتے ہیں، میرے لئے وہ ہمیشہ بے ضابطہ ہی رہی ۔ والد صاحب بلوچستان میں افسر خزانہ تھے ۔ سرکاری انتظام ایسا تھا کہ ہر سال ان کا تبادلہ دوسری جگہ ہو جاتا تھا ۔ کہیں اسکول کا انتظام ہوتا تھا کہیں نہیں ۔ زیادہ تر تعلیم گھر ہی پر بڑے بھائی اور والد صاحب کی نگرانی میں ہوئی ۔ اُردو کا چسکا رسالوں سے پڑا جو تحصیل کے دفتر میں بغیر کسی کوشش کے مل جاتے تھے ۔ ہائی اسکول میں میرا اختیاری مضمون سائنس تھا ۔ دسویں میں بھی اول رہا، والدین کا ارادہ تھا کہ بی ۔ ایس سی کے لئے تعلیم جاری رکھوں ۔ اس کے لئے

دہلی آیا لیکن ملک کی زبردست سیاسی تبدیلی کے بعد وہ بات نہ رہی ۔ دن دفتروں کی منشی گری میں سیاہ اور راتیں بھی پڑھائی میں سفید ہونے لگیں ۔ جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو دہلی کالج سے ایم ۔ اے کیا ۔ بعد میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی اور لسانیات کی ابتدائی تربیت بھی دہلی یونیورسٹی ہی سے حاصل کی ۔ لسانیات میں مزید کام اب امریکہ میں کر رہا ہوں جہاں وس کان سن یونیورسٹی میں اُردو کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تین سال کے لئے آیا ہوا ہوں ۔

ا ۔ ک ۔ ہندوستان کے لسانی مقدر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

گ ۔ چ ۔ ن ۔ ہندوستان صدیوں سے کئی زبانوں کا گھر رہا ہے ۔ یہاں ایک زبان نہ سب کے سر پر لادی گئی ہے نہ لادی جا سکتی ہے ۔ ہندوستان کی بہ ظاہر رنگا رنگ زندگی میں جو باریک سا رشتۂ تہذیبی وحدت کا موجود رہا ہے، اس کی بدولت ہر اچھے زمانے میں کوئی ایک مرکزی زبان علمی طور پر پورے ہندوستان کی زبان رہی ہے ۔ قدیم دَور میں یہ خدمت سنسکرت نے انجام دی، عہدِ وسطیٰ میں ہماری تہذیبی اور سماجی شیرازہ بندی فارسی کی مرہونِ منت رہی اور جدید دَور میں یہ کام انگریزی اور اس کے ساتھ ساتھ اُردو کے ذریعہ ہوتا رہا ہے ۔ نئے ہندوستان کی یہ سب سے بڑی بدنصیبی ہے کہ آج کل ان ہی دونوں زبانوں کی مخالفت کی جا رہی ہے ۔ انگریزی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس وقت صحیح معنوں میں بین الاقوامی زبان کے رتبے پر پہنچ گئی ہے ۔ مغربی ملکوں میں لوگ اپنی زبان کے علاوہ ایک نہ ایک اہم غیر ملکی زبان ضرور جانتے ہیں، مثلاً فرانسیسی، جرمنی، ہسپانوی یا روسی ۔ ہندوستان میں برے بھلے ہم لوگ صرف ایک غیر ملکی زبان یعنے انگریزی سے واقف ہیں ؛ لیکن جہالت کا یہ عالم ہے کہ اس سے بھی منہ موڑنا چاہتے ہیں ۔ ہندوستان میں انگریزی ہی ہمارے لئے صرف ایسا دریچہ ہے جو باہر کی دُنیا کی طرف کھلتا ہے اور اس کو ہم خود پر بند کر لینا چاہتے ہیں ۔ رہی اُردو زبان تو لسانیاتی اعتبار سے اس کی اور ہندی کی بنیاد ایک ہی ہے، یعنے کھڑی بولی ۔ اُردو نے کھڑی بولی کو اس وقت منہ لگایا جب ہندی نام تھا برج بھاشا اور اودھی کا، اپنے چار سو سال کے ارتقائی سفر میں اُردو نے کھڑی کو بنا سنوار کر اس میں شمالی اور جنوبی ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کو سمو کر اور اسے بنگال و بہار سے لے کر مصر و شام تک دُنیا کے تقریباً ایک تہائی بلکہ اس سے بھی زیادہ حصے کے ادبی مزاج و روح سے

لہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ جہالت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ کھڑی کو ہندی کی
جاتا ہے لیکن اس کے اہم ترین ترقی یافتہ روپ یعنی اُردو سے مغائرت برتی جاتی ہے۔
ں ایک مصنوعی زبان کو گلے لگا رہے ہیں اور فخر اس بات پر محسوس کرتے ہیں کہ سنسکرت سے
رہے ہیں۔ بے شک سنسکرت جدید آریائی زبانوں کے لئے بہ منزلہ ماں کے ہے لیکن ماں کا
کر نشو و نما حاصل کرنا ایک بات ہے اور اس کا خون چوسنے لگ جانا دوسری۔ اُردو کا
یقوں کے ذریعے ملنے والے ماں کے دودھ کی بدولت ہے اس کے برعکس مصنوعی ہندی
ناظ پر دھاوا بولتے ہوئے اس بچے کی مثال پیش کرتی ہے جو بجائے دودھ کے ماں کا خون
ہو۔ جو لوگ زبان کی نوعیت سے واقف ہیں، خوب جانتے ہیں کہ کسی بھی مصنوعی زبان کو
نے کی کوششیں خواہ ان کی پشت پر تہذیبی احیا کی کیسی ہی شدید قوتوں کا ہاتھ کیوں نہ ہو،
ں ہو سکتیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ تجربہ ہندوستان کو خاصا مہنگا پڑے گا لیکن وقت کے
ہ احیا پرستی کے اس رجحان میں کمی ضرور آئے گی اور آگے چل کر اُردو کے ادب عالیہ اور
سلوب سے نہ صرف استفادہ کیا جائے گا بلکہ اس زبان کو پھلنے پھولنے کے مواقع بھی
گے۔

آپ کی کیا کیا کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

ت۔ (۱) معراج العاشقین (ترتیب و تحشی) (۲) اُردو مثنویاں (۳) کرشتدار کا اُردو
لی تعلیم کے لسانیاتی پہلو۔

زیر طبع کتابیں؟

ت۔ کچھ نہیں۔

زیر تصنیف؟

ت۔ میں نے یہاں امریکی طلبا کے لئے ایک ثانوی اُردو ریڈر تیار کرنے کا کام
ہے۔ اس میں میرامن سے لے کر رشید احمد صدیقی تک اُردو کے بہترین مصنفین کے
ہوں گے۔ مصنف کا انتخاب اس کی ادبی حیثیت کے پیش نظر کیا جائے گا اور
صرف ایسے شامل کئے جائیں گے جن کی مدد سے طلبا کو ہندوستان کے ادب، تاریخ،

سماج یا کلچر کے کسی نہ کسی پہلو سے روشناس کرایا جاسکے۔ مکمل اُردو الفاظ کی فرہنگ جدید انداز پر مرتب کی جائے گی اور گرامر پر ضروری حواشی بھی ہوں گے۔

اس کے علاوہ میں اُردو کی سماجی صوتیات پر مشینی کام بھی کر رہا ہوں، یعنی آوازوں کی نقل لینے کا۔ سپکٹروگراف کی مدد سے ہر آواز کے مخصوص نقش بن جاتے ہیں۔ ان شکلوں کو ملانا اور ان باہمی نازک ترین اختلافات کو سمجھنا خاصا لمبا اور صبر طلب کام ہے۔ جب نتائج مرتب ہوں طباعت کا خیال آئے گا۔ ابھی یہ منزل دُور ہے۔

ا۔ک۔ ایک کتاب آپ لکھیں نارنگ صاحب "جدید اُردو کی عملی قواعد"۔

گ۔چ۔ن۔ آپ نے اُردو والوں کی ایک بڑی ضرورت کا ذکر کیا۔ عملی قواعد ا ہمارے ہاں قواعد کی بھی کوئی اچھی کتاب نہیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے کوششیں کی تھیں، افسوس ڈیڑھ دو سو سالوں میں اس کام کو آگے بڑھانا تو درکنار، ہم اس ہم پائی کی بھی کوشش نہیں کرسکے۔ عبدالحق صاحب نے کچھ توجہ کی تھی لیکن اہل علم جانتے ہیں جس طرح ان کا انگریزی اُردو لغت باہمی کوششوں کا نتیجہ ہے؛ اسی طرح ان کی اُردو قواعد پلاٹس اُردو مشتق ہے۔ اُردو میں ایک رسم چلی آتی ہے کہ قواعد کو عربی انداز پر لکھنا ہے تو وہی لکیر پیٹتا چلا آرہا ہے۔ انگریزی میں اسی طرح لاطینی نمونوں کی پیروی کی جاتی تھی اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں بلوم فیلڈ نے اس رسم کہن کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا اور اپنے پیچھے کام کرنے والوں کی ایسی جماعت چھوڑ گیا کہ تیس پینتیس سالوں کے اندر اندر صرفی اور نحوی تجزیے کے زمین و آسمان بدل گئے ہیں۔ آج کل ہارورڈ کے پڑوسی سائنسی ادارے ایم، آئی، ٹی زبانوں کو منطق اور اعلیٰ ریاضی کے اصولوں کی روشنی میں کمپیوٹرز کے ذریعے پرکھا اور جانے لگا ہے۔ ایشیائی زبانوں سے دلچسپی روز بروز بڑھ رہی ہے اور اُردو اور ہندی اسمیہ جملے (ناؤن فریس) اور فعلیہ جملے (ورب فریس) پر بھی کام ہو رہا ہے۔ ایک دوست لہجے کی معنوی سطحوں پر کام کر رہے ہیں۔ عملی قواعد کا ڈول ان ابتدائی کوششوں نتائج سامنے آنے کے بعد ہی ڈالا جاسکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ کام کوئی امریکی اسکالر ہی کر

ا۔ک۔ آپ بتائیں کون کون سی زبانیں جانتے ہیں؟

گ۔ چ۔ ن۔ یہ سوال آپ نے شاید اس لئے پوچھا کہ آپ کئی زبانیں جانتے ہیں۔ اس معاملے پر قابل رشک ہیں۔ میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میں غلط یا صحیح یہ سمجھتا ہوں کہ زبانیں جاننے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک ان پر پورا عبور نہ ہو۔ اس کی تعریف میں اپنی لسانیاتی عصبیت کی بنا پر یوں کروں گا کہ زبان بول لینا اور لکھ لینا ایک بات ہے اور اس کے رموز و نکات سے پوری طرح واقف ہونا اور اس کی ہر ہر ادا کا پارکھ ہونا دوسری۔ اب آپ ہی بتائیے اس نقطۂ نظر سے اردو ادیبوں میں سے کتنے صحیح معنوں میں اپنی زبان جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ علمی دُنیا میں زبان جاننے کا یہی مطلب ہے اور ہونا بھی یہی چاہئے۔

ا۔ ک۔ اور ہاں، یہ اردو میں لسانیاتی اصطلاحوں کا ترجمہ تو ٹیڑھی کھیر ہے۔ کوئی مستقل فرہنگ آپ ہی تیار کر دیں نارنگ صاحب!

گ۔ چ۔ ن۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مستقل فرہنگ زبان کی دُنیا میں کوئی چیز ہی نہیں۔ ویبسٹر کا ہر اڈیشن دوسرے سے مختلف ہے۔ دوسرے یہ کہ لسانیاتی اصطلاحوں کے بجائے اس وقت اگر صرف صوتیاتی اصطلاحوں ہی کی فرہنگ تیار کر ڈالی جائے تو بڑی بات ہوگی؛ کیوں کہ زیادہ ضرورت اسی کی ہے۔ پھر یہ کام صرف ایک آدمی کا نہیں۔ دو تین آدمی مل کر اسے کریں تو ایسی فرہنگ تیار کی جا سکتی ہے جو سب کے لئے بڑی حد تک قابلِ قبول ہو۔

ا۔ ک۔ یہ بتائیں کہ آپ نے کبھی شاعری کی؟ ہمارے ادیبوں کو تو یہ عام مرض سا ہے۔

گ۔ چ۔ ن۔ جی نہیں، میں شاعر نہیں۔

ا۔ ک۔ لسانی اعتبار سے ذوقؔ کو غالبؔ پر فوقیت حاصل ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

گ۔ چ۔ ن۔ اگر آپ کے سوال میں لفظ لسانی کے بجائے لسانیاتی ہو تو مجھے جواب دینے میں آسانی رہے گی۔ یہ تو صحیح ہے کہ ذوقؔ کی جمالیاتی میزان میں زبان کے چھل بل اور استعمال محاورہ کو معنی کی لطافت اور ندرت سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لیکن محاورات اور کہاوتیں ہی تو زبان نہیں۔ یہ کبھی نہ بھولیے کہ ذوقؔ کے یہاں زبان دانی کا ادبی مظاہرہ صرف شاعری کی سطح پر ہوا ہے، اور شاعری گو زبان کے ذریعہ کی جاتی ہے لیکن پوری زبان نہیں۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے محاوروں کا حق ادا کر دینا زبان کے کلی اور ادب کو پیش کرنے کے مترادف نہیں ہو سکتا۔

اگر ذوق نے نثر میں کوئی کارنامہ چھوڑا ہوتا تو بات دوسری تھی۔ اُردو میں یہ غلط فہمی زبان نام ہے شاعرانہ ترکیبوں کا، بندشوں کا اور محاورے کا۔ حقیقت یہ ہے کہ ز معنی کی ترسیل کا ۔۔۔۔ اور اس لحاظ سے غالبؔ ذوقؔ سے کہیں آگے ہے۔ ذوق کا کارنا اس نے اُردو کے ایک مخصوص تشکیلی رُخ کو اپنی شاعری میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس کے برعکس زبان کی معنویت کو نہ صرف نکھارا ہے بلکہ اس کی حدود کو وسیع کیا اور اسے نئے امکا روشناس بھی کرایا ہے۔ ذوق کی شاعری میں زبان کے نئے معنوی امکانات کی یشؔ دور دور تک پتہ نہیں۔ پھر اس بات کو بھی خاطر نشان رکھنا چاہیئے کہ غالبؔ نثر کا بو مراسلے کو مکالمہ بنا دینے والی بات شاعرانہ تعلی نہیں۔ غالبؔ نے گفتگو کی سادگی، ر بے تکلفی کو پیش نظر رکھا ہے۔ زبان کا بنیادی مصرف بول چال ہی ہے اور لسانیاتی سب سے زیادہ اہمیت زبان کے اسی روپ کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ غالبؔ کے ٗ زمانے کی زبان پر کام کرنے والوں کے لئے بہترین ماخذ کا کام دے سکتے ہیں۔ ان وجو میں اس سے متفق نہیں کہ لسانیاتی اعتبار سے ذوقؔ کو غالبؔ پر فوقیت حاصل ہے۔

ا۔ک۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ کولمبس کی دُنیا کی کچھ سیر کرائیں، کچھ اپنی سے حال سُنائیں۔

گ۔ چ۔ن۔ یہ داستان خاصی لمبی ہے۔ مختصراً عرض کرتا ہوں۔ اس سال د طویل سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ امریکہ کی کئی اہم یونیورسٹیوں کی علمی و ادبی سیاحت کر مشی گن، بیفلو، ہارورڈ، ایم۔آئی۔ٹی، کولمبیا، ہوورڈ، جارج واشنگٹن، پر پرنسٹن، شکاگو، ان میں بیشتر میں ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ حال ہی میں میک گل یونیورسٹی کے ادارۂ اسلامیات کی دعوت پر مانٹریل گیا تھا جہاں غالبؔ کی تقریر کرنا تھی۔ واپسی پر ٹورنٹو یونی ورسٹی جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہاں عزیز ا اُردو پڑھاتے ہیں۔ شکاگو یونی ورسٹی میں پہلی بار اُردو شاعری پر تقریر کرنے کے لئے گیا "ماڈرن لینگویج ایسوسی ایشن" اور "لنگوئسٹک سوسائٹی آف امریکہ" کی کانفرنسو گیا۔ اس کے علاوہ ایشیائی علوم کی کانفرنس منعقدہ واشنگٹن میں بھی شریک ہو چکا

سیاحت کے دوران میں جہاں جہاں بھی پہنچا، اردو مخطوطات کی کھوج میں بھی رہا۔ اتفاق سے کلیات سودا کا
یک مصور نسخہ ہاتھ لگا ہے جس کی دس تصویروں میں سے پہلی تین غالباً سودا کی ہیں، لیکن یہ تصویریں
نسخۂ جانسن کی تصویر سے مختلف ہیں۔ مزید ثبوت فراہم ہونے پر ہی فیصلہ کیا جا سکے گا کہ نسخۂ جانسن والی
تصویر صحیح ہے یا یہ تصویریں۔ کلیات سودا کے اس نسخہ سے متعلق میں نے نیویارک میں منعقدہ امریکی اورنیٹل
سوسائٹی کے سالانہ اجلاس میں مقالہ پڑھا، سودا کی بعض نظموں کا انگریزی ترجمہ سنایا اور تصویروں کی
سلائیڈز بھی دکھائیں۔ ہندوستان سے باہر مغربی ملکوں میں اردو کا کام کرتے ہوئے سب سے
بڑی دقت مواد کی کمی کی وجہ سے پیش آتی ہے! اس سلسلے میں میں نے آوازوں اور رسم الخط پر ایک
مختصر کتابچہ تیار کر کے یہاں کے ہندوستانی تعلیمی مرکزوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ
پروفیسر محمد مجیب کے ڈرامے "آزمائش" کی فرہنگ (مع صرفی و نحوی توضیحات) بھی مرتب ہو چکی ہے۔
مجھے خوشی ہے کہ میرا تیار کیا ہوا میٹریل وسکانسن کے علاوہ کئی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی
استعمال کیا جانے لگا ہے۔ گرما کی رخصتوں میں انڈیانا کی یونیورسٹی کے لنگوسٹک انسٹی ٹیوٹ میں
تحقیقی کام کرنے کے لئے مجھے فورڈ گرانٹ سے رقم مل گئی ہے۔ وہاں لسانیات کے جدید عالمی رجحانات پر
نہایت اہم سیمینار ہو رہا ہے جس میں چامسکی، پول، ہاکٹ، پالک، ہاس، جیکب سن اور سیمیہ جیسے
امریکی عالموں کے علاوہ چیکوسلواکیہ سے جوزف واچیک، سکنڈے نیویا سے مالمبرگ اور برطانیہ سے
ہلاڈے بھی شریک ہوں گے۔ امید ہے میں اس سیمینار سے مستفید ہوں گا اور جہاں ضرورت ہوگی،
اپنے کام میں ان سے مشورہ بھی کر سکوں گا۔

ک۔　آخر میں ایک غیر ادبی سوال۔ آپ کا کنبہ؟

گ۔ چ۔ ن۔　ایک عدد بیوی اور ایک ہی بچہ۔

ک۔　بہت بہت شکریہ نارنگ صاحب۔ میں نے آپ کو بڑی زحمت دی۔

گ۔ چ۔ ن۔　امریکہ میں رواج ہے، شکریہ کا جواب You Welcome کہہ دیتے ہیں۔
خوش آمدید۔

ک۔ Adieu

گ۔ چ۔ ن۔　اردو میں بھی قریب الصوت لفظ موجود ہے یعنی آداب!

سلیمان خطیب

آخری پرچم

سارے جہاں کے آج ہیں پرچم جھکے ہوئے
امن و اماں کا آج پیمبر چلا گیا

منزل کے کچھ قریب ہی اک حادثہ ہوا
بس کارواں کو چھوڑ کے رہبر چلا گیا

دامن کو پھاڑ لوں کہ گریباں کو نوچ لوں
کس منہ سے میں کہوں کہ جواہر چلا گیا

انسانیت کے غم کا مداوا چلا گیا
ہم جاں بلب ہیں اور مسیحا چلا گیا

ہر ہر نظر اداس ہے ہر دل اداس ہے
گھر گھر سے جیسے کوئی جنازا چلا گیا

ہم بدنصیب رہ گئے رونے کے واسطے
ہنستا ہوا وہ پھول تھا ہنستا چلا گیا

اندرا کو غم ہے آج کہ باپو کدھر گیا
تنہا مجھے وہ چھوڑ کے تنہا چلا گیا

بہنیں کھڑی ہی دونوں کلیجے کو تھام کر
اک اک سے کہہ رہی ہیں کہ بھیا چلا گیا

ایک آخری کرن تھی جواہر کے نام کی
وہ بھی ہمارے گھر سے اجالا چلا گیا

علی جواد زیدی

ہے وہی معرکۂ نیکی و شر میرے بعد
تھم نہ جائیں کہیں یارانِ سفر میرے بعد

کم ہیں ایسے جو کریں عرضِ ہنر میرے بعد
آج غم ناک سے ہیں اہلِ نظر میرے بعد

اب بھی شورِ قدمِ راہرواں ہے تو وہی
پھر بھی سونی ہے تری راہگزر میرے بعد

چند ساعت کے لئے رُک بھی گیا رو بھی لیا
کارواں پھر بھی ہے سرگرمِ سفر میرے بعد

دامن اُلجھائیں ہر اک خار سے وہ بات کہاں
آنے والے تو بہت آئے ادھر میرے بعد

جذب تھا جس میں لہو یاس کی پیشانی کا
بن گیا سجدہ گہہ خلق وہ در میرے بعد

ہجر کی رات لرزتا ہی رہا پلکوں پر
قطرۂ اشک بنا نجمِ سحر میرے بعد

اک مری یاد کی مشعل کے سوا کچھ بھی نہیں
رات اس طرح بھی ہوتی ہے بسر میرے بعد

دار سے آئے گی آواز کہ حق میں ہی تو ہوں
خیرِ جاری سے بدل جائے گا شر میرے بعد

کیا کوئی اور بناتا تھا نشیمن اپنا
پھر اسی شاخ پہ ہے رقصِ شرر میرے بعد

یہ تموج، یہ تلاطم، یہ شہادت، یہ شہود
ختم ہے منزلِ اوّل کا سفر میرے بعد

اشک آنکھوں میں بھرے اس نے بھی دیکھا زیدی
اپنی محفل کو بہ اندازِ دگر میرے بعد

تاج قریشی

زندگی لرزہ بر اندام ہے کیا عرض کروں
کانپتا ہاتھ ہے اور جام ہے کیا عرض کروں
خود نمائی تو فقط مضحکہ بن سکتی ہے
خود فریبی کا جو انجام ہے کیا عرض کروں
جن کے رُخ زُہد سے تپتے ہیں دلوں میں اُن کے
کتنی سرد آتشِ اسلام ہے کیا عرض کروں
اب کہاں روشنیٔ انجمنِ رامش و رنگ
تیرہ سامانی ہے، کُہرام ہے کیا عرض کروں
شیخ کے دل میں نہ اخلاص نہ الفت نہ گداز
صرف احرام ہی احرام ہے کیا عرض کروں
خالقِ منزلِ تو ہو کے ہر اک گامِ عمل
کتنا دور از روشِ عام ہے کیا عرض کروں

خورشید احمد جامی

جب اندھیروں میں ترے گیت کوئی گاتا
افقِ درد پہ اک چاند اُبھر آ
کوئی تیرے لبِ شیریں کی تمنا کرے
آج تک تلخیٔ ایام سے شرما
آخرِ شب کے دھندلکوں میں گلستاں
صرف کانٹوں کا حسیں خواب نظر
نہ در و بامِ ستم ہیں نہ صلیبوں کے چرا
دلِ دیوانہ ترے شہر میں گھبر

ترے دیار میں آکر کبھی اے نگارِ سحر
مری حیات کوئی بد دعا نہ بن جائے
فریبِ حُسنِ بہاراں کبھی اب نہ
دل و نگاہ میں رہتے ہیں جھوٹے
رہِ حیات ہے جامی غبار آلود
مرا خلوص مرا غم کسے نظر آئے

مغموم کلکتوی

○

تجلیات کے پردے اٹھا کے کیا حاصل
متاعِ ہوشِ کلیمی لٹا کے کیا حاصل
بہار و عیش کی دنیا سے دور ہو جب تم
بہار و عیش کے نغمات گا کے کیا حاصل
حقیقتوں کے اندھیرے میں ڈوب جائے دل
تخیلات کی شمعیں جلا کے کیا حاصل
وہ اشک جس کی ضرورت ہے اک زمانے کو
وہ ایک فرد کے غم میں بہا کے کیا حاصل
پلٹ کے وقت کب آتا ہے اشکباری سے
مزارِ وقت پہ چادر چڑھا کے کیا حاصل
جدائیاں ہیں کمر بستہ خیر مقدم کو
تعلقاتِ محبت بڑھا کے کیا حاصل
سجا دے روح کو نیکی کے چاند تاروں سے
حسین پیکرِ مرمر سجا کے کیا حاصل
جب اعتمادِ محبت ہی اٹھ گیا مغموم
نفس کے ساز پہ پھر گیت گا کے کیا حاصل

منظر ایوبی

○

تری نظر سے محبت ٹپک رہی ہے آج
بہار پردۂ گل سے جھلک رہی ہے آج
سنا ہے گھر سے وہ نکلے ہیں سیرِ گل کے لئے
کلی کلی مرے دل کی چٹک رہی ہے آج
جہاں لٹے ہیں کئی کاروانِ اہلِ نظر
وہ رہگزار مری راہ تک رہی ہے آج
جنونِ شوق کے آثار ہو رہے ہیں عیاں
نقابِ چہرۂ گل سے سرک رہی ہے آج
چھپا ہے جلوہ کوئی زیرِ بامِ جس کے لئے
مری نگاہِ تجسس بھٹک رہی ہے آج
بہت قریب ہے شاید حدودِ مہر و نجوم
زمین چہرۂ آدم کو تک رہی ہے آج
ہے ایک عالمِ رنگیں ضرور افق کے پرے
طلب میں جس کی یہ دنیا بھٹک رہی ہے آج
مجھے خبر ہے کہ منظر نگاہِ یزداں میں
ادائے حضرتِ آدم کھٹک رہی ہے آج

صبا جائسی

تمہارا نیم تبسم ......

تمہارا نیم تبسم تو خوب ہے لیکن ......
جو زہر خندہ یہ بن جائے تو کہو بات سبھی کچھ ..
ہنسو کچھ اس طرح سے کہ آنکھوں میں اشک بھر آئیں
ہنسو کچھ اس طرح سے کہ پلکوں پہ بدلیاں چھائیں
ہنسو کچھ اس طرح کہ ہم تم اداس ہو جائیں
اداس ہو کے اگر عمرِ رفتہ مل جائے
تصورات کی رنگینیوں کی باز دید بھی ہو
توہمات کی رعنائیوں پہ رنگ چڑھے
گماں کی گود میں مچلے حقیقتِ صد رنگ
اداس رہنا ہی بہتر ہے ہم اداس رہیں

اداس رہ کے بھی گر کچھ سکون نہ مل پائے
جو بات دل میں ہو اس کو بھی ہم تو کہہ نہ سکیں
غمِ زمانہ کی یلغار پر جو ہنس نہ سکیں
فریبِ حسرتِ الفت سے گر خجل ہو جائیں
تمہارا نیم تبسم ہی پھر تو بہتر ہے

اختر نظمی

"میں سوچتا ہوں"

ایک دلنشیں پیکر
ذہن کے دریچے سے
جھانکتا ہے، رہ رہ کر
سوچتا ہوں میں اکثر
میں نے آرزوؤں کے
دیپ کب جلائے تھے
کب مری تمنا کے
خواب جھلملائے تھے
میں نے اپنے ماضی میں
کس کی آرزو کی تھی
کس کی جستجو کی تھی
کس کی یاد کا سایہ
سوتے، جاگتے میرے
آس پاس رہتا ہے
میری بات سنتا ہے
اپنی بات کہتا ہے
سوچتا ہوں میں اکثر
یہ، جو اک حسیں پیکر
ذہن کے دریچے سے
جھانکتا ہے رہ رہ کر
اس حسین پیکر کا مجھ سے کیا

نقد و نظر

مل صالحہ عابد حسین۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ صفحات (۴۷۷) $\frac{1}{16}$ کراؤن۔ مجلد۔ خوبصورت گرد پوش۔
۵۰ء۷۔

تش خاموشی جیسے ضخیم ناول کے بعد محترمہ صالحہ عابد حسین کا یہ دوسرا ضخیم ناول ہے۔ ہندوستان کی
کے بعد دیہات کو ترقی دینے کی جو کوششیں کی گئی ہیں اس کا ایک عکس اس میں نظر آتا ہے اور اسی مقصد کے
کے لئے ہند و مسلم اتحاد، ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے تجربے دیہاتیوں اور شہریوں کے کردار نہایت دلکش
آویز انداز میں پیش کئے ہیں۔

ادل کا اہم کردار گیتا ہے جو سات سال کی عمر سے حبیب میاں اور صفیہ کی سرپرستی میں تعلیم پاتی ہے،
حبیب اور صفیہ اچھے سوشل ورکر ہیں اس کی تربیت بھی اسی ماحول میں ہوتی ہے۔ وہ دونوں [illegible]
سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے سینے میں عوام کا درد ہے اور وہ جہل، فاقہ، بیماری اور گندگی کو
میں کوشاں رہتے ہیں۔ کملا نگر کے یہ زمیندار عرصہ دراز بعد اپنے وطن کو واپس ہوتے ہیں اور
ستہ حالت دیکھ کر اس کو ترقی دینے کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں دیہاتیوں کے عادات و خصائل
رکے نمایاں کرنے میں ناول نگار نے بڑی چابکدستی اور فکر و نظر کی گہرائی سے کام لیا ہے۔ دیہاتیوں کی
بجنسہ استعمال کی ہے جس سے عبارت میں تنوع اور لطفِ بیان میں اضافہ ہو گیا ہے۔ پریم چند نے
م ناولوں میں ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کے کردار یا تو ابتدا سے نیکی کی راہ چلتے ہیں یا
نیکی طرف آتے ہیں اور اس طرح ناولوں کا انجام نیکی پر ہوتا ہے۔ ایسے ناول جو عموماً مقصد کو
رکھ کر لکھے جاتے ہیں ان میں آورد کی کیفیت زیادہ محسوس ہوتی ہے، لیکن راہِ عمل میں یہ کیفیت
ہے۔ ناول نگار کا اندازِ تحریر قاری کو اپنے ساتھ لئے چلتا ہے اور کہیں ہم اس سے علحدہ نہیں ہوتے۔
ضخامت بھی اکتا دینے والی نہیں، اس کی دلچسپی ابتدا سے آخر تک قایم رہتی ہے آج کل اردو میں
لوں کا فقدان ہے اور ایسے دور میں راہ عمل ایک گراں قدر اضافہ ہے، اور اس قابل ہے کہ
اسے نصاب میں شریک کیا جائے۔

جگناتھ آزاد اور اس کی شاعری مرتبہ حمیدہ سلطان احمد۔ ناشر مکتبہ شاہراہ دہلی۔ صفحات (۲۷۲) مجلد معہ گرد پوش۔ قیمت پانچ روپے۔

جگناتھ آزاد برصغیر ہند و پاک کے ان مقبول اور ہر دلعزیز شعراء میں ہیں جو اپنی علمی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اپنی سیرت سے بھی لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔ وہ مغربی پنجاب میں پیدا ہوئے، اپنے شفیق باپ جناب تلوک چند محروم کے زیر سایہ ابتدائی سے اعلیٰ مدارج تک تعلیم حاصل کی اور لڑکپن نہیں بلکہ بچپن سے شعر کہنے لگے۔ ان کی شاعری میں جاذبیت ہے جو قلوب کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور خیالات کا یہ عالم کہ گویا سامع یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ـــ لیکن بعض وقت وہ اپنے قاری اور سامع سے کچھ اس انداز سے مخاطب ہوتے ہیں جیسے وہ بہت زیادہ عمر رسیدہ پختہ کار اور جہاں دیدہ بزرگ ہوں۔ بیان کے مشاہدہ اور مطالعہ کی گہرائی کا نتیجہ ہے، صرف کتابی مطالعہ نہیں بلکہ سماجی مطالعہ میں بھی وہ اتنی ہی دقت نظر سے کام لیتے ہیں۔ کبھی تو ان کی نظموں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک قاید اور رہبر کارواں ہیں، لیکن پہاڑی نالے کی طرح تیز و تند بہے جانے والے نہیں بلکہ نرم و سبک سیر۔ اس رفتار میں نہ تصادم کا اندیشہ ہے نہ ٹھوکر کا۔

اب تک آزاد صاحب کی جو کتابیں چھپی ہیں ان پر ہند و پاک کے بڑے بڑے ادیبوں نے تبصرے کئے ہیں۔ حمیدہ سلطان احمد صاحبہ نے ان تمام مضامین اور تبصروں کو جمع کر کے ایک کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں، ایک شخصیت اور شاعری، دوسرے تصانیف۔ شخصیت اور شاعری پر لکھنے والوں میں فراق گورکھپوری، اشرف قادری، نازش پرتاب گڈھی، کلام حیدری، نریش کمار شاد، اشرف بھوپالی، سعید سہروردی، گوہر سعیدی ٹونکی اور ارشد کاکوی ہیں۔

دوسرے حصے یعنی تصانیف پر تبصرہ کرنے والوں میں خواجہ احمد عباس، مخمور جالندھری، حامد علی خاں، سر عبدالقادر، کرشن موہن، عبدالحمید عدم، شہاب ملیح آبادی، وقار عظیم، آل احمد سرور، مانی جائسی، تیغ الہ آبادی، غلام رسول نازکی اور عبدالمجید سالک شامل ہیں۔

اس فہرست سے اندازہ ہو سکے گا کہ آزاد کے بارے میں لکھنے والوں میں فراق، نازش، شاد، عدم اور نازکی جیسے شعراء ہیں تو نثر نگاروں میں سر عبدالقادر، حامد علی خاں، سرور اور سالک جیسے نقاد بھی موجود ہیں۔ اس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آزاد کی آزادی سے پہلے کی شاعری کے بارے میں کم کہا گیا ہے، لیکن آزادی کے بعد آزاد نے جو کچھ کہا

ں پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تصانیف میں بیکراں، نذر اقبال، ستاروں سے ذروں تک اور
دل میں اجنبی شامل ہیں، لیکن ایک مجموعہ "نوائے پریشاں" جو ۱۹۶۱ء ہی میں ادارہ انیس اردو الہ آباد سے
شائع ہو چکا تھا اور جس میں پروفیسر احتشام حسین کا سیر حاصل مقدمہ بھی موجود ہے اس پر کوئی تبصرہ یا
احتشام صاحب ہی کا مضمون اور ادارہ کے جنرل سکریٹری محقق فخر الاسلام کا مضمون شامل نہیں اور
نہ اس مجموعہ کا کہیں ذکر ہے۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد جگن ناتھ آزاد نے غالباً دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے اپنی ایک
مشہور غزل سنائی جس کا مطلع ہے ؎

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گذری ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گذری

اس نظم کی رمزیت، ایمائیت، دلگدازی اور درد و کسک پیدا کرنے والی کیفیت نے کتنے ہی
قلوب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس وقت ہندوستانی ادیبوں نے یہ محسوس کیا کہ ایک صاحب دل،
صاحب نظر اور ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے۔ یہ غزل آزاد کی شاعری کے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔
اگرچہ آزاد نے اسی ردیف میں قافئے بدل کر دو اور غزلیں کہی ہیں لیکن اس کو قبول عام کی سند عطا ہوئی۔
پیش نظر کتاب میں اس سے پہلے کی نظموں پر بھی تبصرے ہیں اور اس کے بعد کی نظموں اور غزلوں پر بھی،
تین آزادی کے خونی مناظر نے شاعر کے دل میں عظمت انسان کی جو جوت جلند کی اور گری ہوئی اخلاقی
قدروں کو اٹھانے کے لئے جو کام انجام دیا اس کے تعلق سے تقریباً سب ہی مبصرین نے اشارے کئے ہیں
تاہم حیات آزاد پر اشرف قادری صاحب کا اور شاعری پر فراق، خواجہ احمد عباس، آل احمد سرور
اور غلام رسول نازکی کے تبصرے قابل مطالعہ ہیں۔ توقع ہے کہ آزاد کے پرستار اس کو ایک گراں قدر تحفہ
سمجھیں گے۔

بیت کے گیت ۔۔ مرتبہ فضل اللہ حافظ، منجانب دی۔ کے، ڈھگے۔ ہارڈی کر باغ، چاپل گوڑہ حیدرآباد۔
حیدرآباد میں مسٹر ڈھگے اور مسز ڈھگے اپنے سماجی اور اصلاحی کاموں کی بناء پر محتاج تعارف نہیں ہیں۔
ڈھگے صاحب بظاہر تو چارٹرڈ اکونٹنٹ رہیں لیکن پارلیمنٹ کے ممبر رہ چکے ہیں اور حیدرآباد میں
کئی کمیٹی (انجمن طیلسانین عثمانیہ) انڈو سوویٹ کلچرل سوسائٹی اور ایسی بہت سی انجمنوں کے صدر بھی
رہ چکے ہیں۔ انھوں نے دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح اپنے شہریوں کی مدد کی ہے اور

بلا امتیاز فرقہ و طبقہ سب کا کام کیا ہے چونکہ وہ قومی یکجہتی، اتحاد اور یگانگت کے علمبردار رہیں انھوں نے اکاڈمی کے موقع پر مہاراجہ سرکشن پرشاد کی یاد میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جس نے قومی یکجہتی کو فروغ دیا تھا۔ مہاراجہ بھی ہندو اور مسلمان کی اصطلاح میں نہ سوچتے تھے۔ اپنا مسلک اپنی مثنوی "پریم درپن" میں اس طرح ظاہر کیا ہے:-

"میں ہوں ہندو، میں ہوں مسلمان ہر مذہب ہے میرا ایمان"

مصرعہ اولیٰ طرح کے لئے پیش کیا گیا اور متعدد شعراء نے طبع آزمائی کی۔ اس مشاعرہ کے حسنِ انتظام قدیم مشاعروں کی یاد تازہ کردی۔ "پریت کے گیت" اسی مشاعرہ کا گلدستہ ہے جس کو فضل اللہ مرتب کیا ہے۔ مختلف شعراء کے چند شعر پیش ہیں:-

ڈاکٹر اسد انصاری — میں ہوں امینِ جذبۂ الفت / دل ہے میرا شہرِ نگاراں
پہنچیں گے وہ تا لبِ ساحل / ہوگا جنھیں اندازۂ طوفاں

برق یوسفی — میں نے جلائے پیار کے دیپک / محفل محفل، ایواں ایواں
پیار کے ایواں دیکھ کے گم سم / برق پھرے ہے حیراں حیراں

بہار منوہر لال — آیا ہے اب دورِ بہاراں / کون بچائے اپنا گریباں
پیار جہاں کو ہم نے سکھایا / نعرہ اپنا عظمتِ انساں

تاثیر صدیقی — دیدہ و دل میں سوزِ مجسم / رگ رگ میں ہے شعلہ رقصاں
ہم سب تاثیر اہلِ وفا ہیں / دورِ ہمارا حاصلِ دوراں

حیرت بدایونی — جھنڈا اونچا آج ہے اپنا تاج ہے اپنا، راج ہے اپنا
اپنا دیس ہی اپنا دل ہے اپنی قوم ہی اپنی ہے جاں

خیال فیض الحسن — گنگا، جمنا، تاج، ایلورہ بندیاچل کے ہم رکھوالے
دیش کی رکھشا اپنا ایماں سرحد کے ہم لوگ نگہباں

راہی اکالی چرن گپتا — اندھیاری کالی راہوں میں / ایک جواہر آج درخشاں
پیار کا بندھن پیارا بندھن / قدم قدم پر منزل آساں

ریحانی ہمینن ـــ	روپ تن ہے بغض و کینہ // حرفِ محبت زینت عنواں جب تک دل ہے درد سے خالی // جینا اور مرنا ہے یکساں
طاہرہ سعید ۔ بالونی ـــ	مسجد، گرجا اور گردوارہ // ہر منزل ہے منزلِ جاناں پیار ہے طاقت پیار ہے شکتی // پیار خدا ہے پیار ہے ایماں
مظہر کامل ـــ	ہوں گے ہماری یک جہتی سے // روبہ سارے شیر نیستاں اپنے قدم جب مل کے اٹھیں گے // دشمن سارے ہوں گے ہراساں
نیر صلاح الدین ـــ	دل کا لہو کچھ اور جلاؤ // بجھنے نہ پائے شمعِ شبستاں شب کا دامن جھیگ چکا ہے // پاس کھڑی ہے صبح درخشاں
وقار خلیل ـــ	ظلمت ہم سے آنکھ بچائے // ہم ہیں ابھی خورشید بہ داماں ہم سے وقارِ ہند سلامت // یک جہتی ہے اپنا ایماں
یٰسین ۔ میر یٰسین علی خاں ـــ	پُن ہے پیارے سُرخیٔ گلشن // پاپ سے پیارے سُرخیٔ داماں آؤ ایسی جے جے گائیں // رک رک جائے گردشِ دوراں

قومی یک جہتی کو آگے بڑھانے کے لئے ڈھگے صاحب نے مشاعرہ منعقد کر کے اپنے ہموطنوں کی رہنمائی کی ہے اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یگانگت اور یک جہتی کی تخلیق و توسیع کے لئے مزید ایسے نئے و سائل تلاش کئے جائیں گے۔ اس کامیاب مشاعرہ کے انعقاد کے لئے جناب ڈھگے صاحب قابلِ مبارکباد ہیں اور ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے مشاعرہ کا گلدستہ شایع کر کے ان تصورات کو عام کیا اور اردو کے شعری ادب میں ایک اچھا اضافہ کیا۔

طنز و تبسم :۔ رضا نقوی واہی ۔ ناشر مکتبۂ ادب ۔ روڈ نمبر $\frac{5}{12}$ گردنی باغ ۔ پٹنہ ۔ صفحات (۱۵۲) مجلد ۔ مع خوبصورت گرد پوش ۔ قیمت تین ۳ روپے ۔

یہ رضا نقوی واہی کے طنزیہ اور ظریفانہ نظموں کا مجموعہ ہے، لیکن اس میں طنز کو تبسم پر ترجیح حاصل ہے اور تبسم پر اگر طنز سبقت لے جائے تو دل میں درد اور کسک پیدا کر دیتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے واہی ایک کامیاب شاعر ہیں ۔ جن چیزوں کو وہ چھیڑتے اور قاری کی توجہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں

پوری شدت سے کرتے اور اس کو اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں۔

اس مجموعے میں اکثر نظموں کا تعلق ان کے اپنے شہر پٹنہ سے ہے لیکن وہاں بھی انھوں نے عمومیت کا قایم رکھنے کی کوشش کی۔ میونسپلٹی کے تعلق سے جو نظمیں ہیں وہ ہندوستان کے ہر بڑے شہر پر منطبق ہو سکتی ہیں اور ان نظموں میں مقامی رنگ غالب ہونے کے باوجود بھی ایک عمومیت رکھتا ہے اسی لئے نظم کی دل کشی بڑھ جاتی ہے۔ "انٹرویو" ایک بہت مختصر لیکن بڑی گہرائی رکھنے والی نظم ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر حد سے زیادہ مبالغہ کر رہا ہے، لیکن جو لوگ امتحانوں میں ممتحن اور انٹرویو بورڈ کے ممبر رہ چکے ہیں اس کی تصدیق کریں گے۔

"لال فیتہ" ایک خوب صورت نظم ہے اور دفتریت پر ایک گہرا طنز۔ دفتریت کے چکر سے نکل کر کام کا بہ عجلت ممکنہ تکمیل پانا تقریباً ناممکن ہے۔ "لال فیتے" کے بعد تو گویا فائیل کھڈ میں جا گرتی ہے۔

اس مجموعے میں "ٹیڈی گرل" "ٹیڈی بائے" "لال فیتہ" "نئی یونیورسٹی" "مجھوؤں کا گیت" "اشک گر" "شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو" "مشاعرہ سے پہلے اور بعد" "نقادجی" وغیرہ نہایت دلاویز اور قابل مطالعہ نظمیں ہیں۔ اس کا تعارف "من ترا حاجی بگویم" کے اصول پر احمد جمال پاشا نے کرایا ہے۔

میں نے یہاں نمونے دینے سے گریز کیا ہے اور احمد جمال پاشا کی ہمنوائی کرتے ہوئے کہتا ہوں :۔

"مجھے یقین ہے کہ "طنز و تبسم" کا ادبی حلقوں میں خاطر خواہ استقبال کیا جائے گا اور ناقدینِ ادب اس کے فنکار کی محنت اور "خونِ جگر" کا معاوضہ "سفید داتوں" میں نہیں بلکہ "طلائی سکوں" میں ادا کریں گے۔"

اذکار نوشاہیہ :- از سید شرافت نوشاہی۔ ناشر انجمن سادات نوشاہیہ۔ ساہنپال شریف، گجرات پنجاب۔ صفحات (۱۱۲) قیمت ایک روپیہ۔

یہ رسالہ قطب العالم شیخ الاسلام حافظ سید شاہ حاجی محمد نوشہ گنج اور ان کے اخلاف کے حالات میں ہے۔ فاضل مرتب خود اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور اس تمام کتب خانے کے مالک ہیں جو صدیوں سے جمع ہوتا آرہا ہے اس لئے بزرگان دین کے سنین آپ نے دیئے ہیں وہ انتہائی معیاری اور مستند ہیں۔ آخر میں نوشاہی اعزا و اقربا کے قبرستان کا نقشہ منسلک ہے نقشہ میں قبروں پر نمبر لکھ کر متن میں ناموں کی صراحت کر دی گئی۔ شجرۂ خاندانی کو بھی اگر اسی شکل میں ایک صفحہ پر دے دیا جاتا تو ایک کا دوسرے سے رشتہ بہ یک نظر معلوم ہو سکتا تھا۔ اب پوری عبارت پڑھنے کے بعد ہی ہم ایک دوسرے کے تعلق کو سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت حاجی محمد نوشہ گنج بخش ۹۵۹ھ/۱۵۵۲ء میں تولد ہوئے تھے اور جہانگیر کے معاصر تھے۔ اس تذکرہ میں اس دور کی کوئی سماجی یا معاشرتی ... فاضل مرتب قابل مبارک باد ہیں کہ "نام نیک رفتگان ضایع مکن" کے مقولے پر عمل کیا اور ان بزرگانِ دین کے صحیح حالات پیش کئے جن ...

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء فون ۴۵۲۰۶
۲ شمارہ ۹ ستمبر ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

نا ... پروفیسر عبدالمجید صدیقی

نصیرالدین ہاشمی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

مشاورت:- رمن راج سکسینہ۔ وقار خلیل

معتمد

محمد اکبرالدین صدیقی

سالانہ ہندوستان سے .... چھ روپے
ششماہی .... تین روپے
... سے .... دس روپے

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے
... نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر
ایوانِ اردو۔ خیریت آباد، حیدرآباد دکن
سے شائع ہوا

فہرست

معلوم نہیں ستمبر ہی کو منحوس ستارے گردش میں آتے ہیں کہ اس مہینے میں دکن پر ہمیشہ آلام و مصائب کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ پہلے یہیں طغیانی کے حادثات ہوئے اور سیاسی آندھیاں اٹھیں۔ سیاست و سماج کا ایسا تہ و بالا ہوا کہ باید و شاید۔ پھر دو عظیم جنگیں بھی ستمبر کے مہینے میں شروع ہوئی تھیں اور ان سے جو تباہ کاریاں ہوئیں ان کو ہم سب جانتے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو کے لئے بھی یہ مہینہ کبھی سازگار نہیں ہوا۔ دو سال پہلے اسی مہینے میں ادارے کے محترم بانی ڈاکٹر زور کا انتقال ہوا۔ ان کے مرنے سے حیدرآباد کیا، تمام دنیائے اردو میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ مرحوم اپنے پیچھے غمگساروں کا بے پناہ ہجوم چھوڑ گئے اور اب دو سال کے بعد غمگساروں کے آنسو تو تھم گئے لیکن دل [illegible] ہیں۔ ان کی وہ دل توانا یاد کو ہم کیسے فراموش کرسکتے ہیں۔

زور کی شخصیت ایک مسلسل پیہم اور جہدِ مسلسل تھی۔ ان کے دل و دماغ میں بجلیاں کوندتی تھیں۔ ان کے خیالات اور منصوبے بجلیوں کی طرح باہر نکلتے تھے اور بہت جلد تعمیری قالب میں ڈھل جاتے تھے۔ انھوں نے مہینوں کا کام دنوں میں کیا اور جب تک ان کے منصوبے حسبِ دلخواہ عملی صورت اختیار نہیں کرلیتے وہ چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ ان کا ہر منصوبہ ایک ادارہ اور ہر خیال ایک تخلیقی شاہکار کی صورت میں اجاگر ہوتا تھا۔ زبان، ادب و تاریخ کے کتنے شعبہ ہائے حیات اس وقت موجود ہیں جو مرحوم کی جہدِ مسلسل کے رہینِ منت ہیں۔ وہ اپنی حیاتِ ناپائدار میں اس قدر کام کرگئے جو اب شاید صدیوں میں بھی نہ ہوسکے۔ "آن قدح بشکست و آں ساقی نماند"۔

زور کا سب سے بڑا وصف ان کی تنظیمی صلاحیت تھی۔ وہ ایسے منظم انسان تھے کہ ان کی مثال بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ تنظیمی صلاحیت ہر شخص میں نہیں ہوتی۔ یہ قدرت کی ودیعت ہے، ذاتی سعی اور اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی "ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"۔ تنظیم اصل میں مختلف توانائیوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا نام ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ افراد اپنی ذہنی و اخلاقی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کرکے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ اس تعاون سے جو حرکی قوت پیدا ہوتی ہے وہ بے اندازہ اور انفرادی جد و جہد سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ انفرادی عمل سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ ایسے عظیم الشان اور مستحکم نہیں ہوتے جو متحدہ عمل سے ہوتے ہیں۔ ایک شخص میں جو کمی ہوتی ہے وہ دوسرا شخص پورا کردیتا ہے اور یکجہتی گویا ایک جامعیت ہوتی ہے۔ زور قدرت کے اس راز کو خوب سمجھتے تھے۔ اس تعاون اور اتحادِ عمل سے انھوں نے جو کام لیا اور ملک کی جو ادبی اور ثقافتی خدمت کی وہ اعجاز سے کم نہیں ہے۔

زور ایک مردم شناس انسان تھے [illegible] بہت صلاحیت رکھتے تھے ان کو اپنی طرف کھینچ لیتے تھے اور اپنے ساتھ بہت سی صلاحیتوں کو آگے بڑھاتے تھے اور انھیں کو یکجہت کرکے ایک حرکی قوت پیدا کردیتے تھے [illegible]

[illegible]

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون

اگسٹ ۱۹۶۴ء کا آخری ہفتہ انتہائی الم ناک سانحوں سے شروع ہوا ۔ ۲۳ اگسٹ کو مولوی حکیم غلام مرتضٰی صاحب مہتمم مجلس اشاعت العلوم جامعہ نظامیہ نے ستر (۷۰) سال کے سن میں داعی اجل کو لبیک کہا! ۲۵ اگسٹ کو دکن کے ممتاز عالم دین اور طریقہ قادریہ کے پیر مجلس علمائے دکن کے معتمد حضرت سید محمد بادشاہ حسینی صاحب نے ۶۷ سال کی عمر میں وصال فرمایا اور ۲۷ اگسٹ کو برصغیر ہند و پاک کی مقدس ترین ہستی جو علم حدیث میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی اور زہد و اتقا میں بے مثل تھی اور جس کی ذات (۶۰) سال تک دکن کیلئے شمع ہدایت بنی رہی یعنی حضرت مولانا ابوالحسنات سید عبد اللہ شاہ صاحب قادری و نقش بندی نے وصال فرمایا اور بلا تفریق مذہب و ملت برصغیر ہند و پاک میں کروڑوں عوام کو سوگوار چھوڑ گئے ۔ سن شریف ۹۲ سال تھا دکن میں آپکی ذات مرکز ہدایت اور منبع فیض تھی ۔ آپکا زندگی کا ہر فعل کتاب و سنت کا آئینہ دار تھا ۔ آپ کی حیات پاک میں نام و نمود کو کوئی دخل نہیں تھا ۔ عزلت اور گوشہ نشینی میں رہ کر آپ نے ملک کی وہ روحانی، مذہبی، اخلاقی اور ادبی خدمت انجام دی کہ اس کی نظیر دو پچھلی صدیوں میں نہیں ملتی ۔

آپ کے اساتذہ مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ بانی جامعہ نظامیہ مولانا حبیب الرحمان سہارن پوری اور مولانا منصور علی خاں جیسے اعلیٰ پایہ علما رہے ہیں مدارج سلوک کے طے کرنے کیلئے آپ نے حضرت مسکین شاہ صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور حضرت موصوف نے آپ کو تربیت کیلئے حضرت سید بادشاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تفویض فرمایا ۔ حضرت مسکین شاہ صاحب قبلہ کا سلسلۂ بیعت دو واسطوں سے حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے ۔ حضرت بادشاہ صاحب بخاری نے آپ کی ریاضت اور مجاہدہ شاقہ کو دیکھ کر آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا ۔

آپ نے مسجد حسینی علم کو اپنے درس و تدریس کیلئے انتخاب فرمایا اور ساٹھ سال کی طویل مدت تک آپ تشنگان علم کو فیض روحانی سے سیراب کرتے رہے ۔ آپ نے اپنے والد بزرگوار مولانا سید مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں حج و زیارت روضہ نبوی صلعم کی سعادت بھی حاصل فرمائی تھی ۔ آپ جمعہ کی نماز ہمیشہ مکہ مسجد میں ادا فرماتے اور پہلی صف میں منبر سے قریب تشریف فرما رہتے تھے ۔

آپ نے صرف درس و تدریس کے ذریعہ ہی رہنمائی نہیں کی بلکہ اپنی کثیر تصنیفات بھی یادگار چھوڑیں ۔ آپ کی تالیفات میں زجاجۃ المصابیح ... کتاب محبت ۔ تفسیر سورہ یوسف ۔ مواعظ حسنہ ۔ قیامت نامہ ۔ معراج نامہ ۔ میلاد نامہ ۔ سلوک ... [illegible] ... فضائل نماز ... مقبولیت حاصل کر چکی ہیں ۔ آپ ... [illegible]

وعظ و تقریر میں بھی آپ کا اسلوب بیان قدیم علماء سے ملتا جلتا ہے۔ آپ کے مریدین کی تعداد پانچ لاکھ سے زائد ہے جو برصغیر ہند و پاک میں پھیلے ہوئے ہیں اور عقیدتمندوں کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب۔

دوسری ہستی جس کی مفارقت کا داغ حیدرآباد دکن نے اٹھایا، مولانا سید بادشاہ حسینی صاحب کی ہے۔ آپ مولانا سید عمر قادری صاحب "تفسیر قادری" کے فرزند تھے۔ آپ نے اپنے والد بزرگوار اور مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ سے دینی تعلیم حاصل کی اور فراغ تعلیم کے بعد والد بزرگوار ہی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آپ چالیس سال تک بعد نماز جمعہ بالالتزام مکہ مسجد میں وعظ فرماتے رہے۔ آزادی ہند کے بعد حج و زیارت کا شرف حاصل کیا اور تعداد شریفین میں بھی حاضری دی۔ آپ نے وعظ و پند اور رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ معتمد علمائے دکن کی حیثیت سے مسلمانوں کی سماجی خدمت بھی انجام دی۔ پولیس ایکشن کے بعد جب حالات نے خطرناک صورت کرلی تو آپ حکومت اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک واسطہ بنے رہے اور ہمیشہ اسلامی امور کیلئے نمائندگی فرمائی۔ جامعہ عثمانیہ میں جب کبھی اسلامی علوم کیلئے مضرت رساں تبدیلیاں عمل میں لائی جانے لگیں تو اس وقت بھی آپ نے آواز بلند کی اور اردو کے تعلق سے بھی جب کبھی نقصان کا اندیشہ دیکھا حکومت کو متنبہ کیا۔ آپ کی آواز حکومت کی نظر میں وزن رکھتی تھی اب علمائے کرام کی صف میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جو عوام کی رہنمائی کا حق ادا کرسکے۔

تیسری ہستی حکیم غلام مرتضیٰ صاحب کی ہے جو آپ بارہ سال کی عمر میں مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے اور نو دس سال کا تعلیمی دور گذارنے کے بعد طب کی بھی سند حاصل کی اور اپنی درسگاہ ہی میں وابستہ ہوگئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت بھی مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ کے زیر نگرانی ہوئی۔ جب مولانا کا وصال ہوا تو میر مجلس پر حبیب الرحمن خاں صدر یار جنگ شروانی صدر الصدور امور مذہبی کا انتخاب عمل میں آیا۔ جامعہ نظامیہ کی مجلس اشاعت العلوم کے پہلے مہتمم ولی الدین صاحب کے انتقال کے بعد شروانی صاحب نے حکیم صاحب موصوف کو مقرر کیا اور وہ درس و تدریس کے علاوہ اشاعتی فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ آپ نے رکن الدین عماد کاشانی کی کتاب شمائل الاتقیا مرتب کرکے بڑے اہتمام سے شائع کی اور اس کے بعد حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے رسالہ پند و نصائح کے جستہ جستہ مقامات کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔

آپ نے تین مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی پہلے دو دفعہ سرکاری طبیب قافلہ کی حیثیت سے حاجیوں کی خدمت انجام دی۔ جامعہ نظامیہ آپ کی خدمات کو کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔ اور مجلس اشاعت العلوم کے مہتمم کی حیثیت میں اہل اردو بھی ان کی خدمات کو بہ نظر استحسان دیکھتے رہیں گے۔۔۔

الحاج مرزا شکور بیگ

نذرِ زور

آج مجھ پر اس لئے طاری ہے رقت زور کی — پھر رہی ہے ہر گھڑی آنکھوں میں صورت زور کی

سینیئر تھے مجھ سے لیکن بے تکلف دوست تھے — میرے دل سے مٹ نہیں سکتی محبت زور کی

کام کرتے ہی نہ تھے اوروں سے بھی لیتے تھے کام — کوئی لائے گا کہاں سے اب وہ عادت زور کی

صاف گوئی میں تو وہ رکھتے نہ تھے اپنا جواب — کچھ نہ ہوتا بھی تو کیا کم تھی یہ خصلت زور کی

نام روشن کر دیا اردو نے بے شک زور کا — زور نے بھی کی بہت اردو کی خدمت زور کی

بیسیوں شاگرد ایسے اب ہیں پایے کے ادیب — طالب علمی میں تھی جن پر عنایت زور کی

دیکھ لینا جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے — کم نہیں ہوگی۔ بڑھے گی اور عزت زور کی

آج اردو کے ہیں جو چوٹی کے شاعر او ادیب — ان کے دل سے پوچھئے دراصل عظمت زور کی

کارواں اردو کا مرزا یوں تو اب بھی ہے رواں
پھر بھی سب محسوس کرتے ہیں ضرورت زور کی

پروفیسر جہاں بانو نقوی

اندازِ بیاں اور

غالب ــــ میری ہی نہیں، میری طرح بہت سے دلوں کی دھڑکن بنا ہوا ہے۔ اس کے طرزِ بیان کا انداز کچھ ایسا ہمہ گیر ہے کہ جیسے زندگی کا کوئی پہلو اس سے بچ نہ سکا۔ اس کی شاعرانہ نزاکتوں نے ہر دل کو مسخر کر لیا ہے۔ متعدد لوگوں نے اس کے کلام کی شرح لکھی۔ ہر ایک نے اس کو اپنے طور پر سمجھا۔ مگر پھر بھی جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا۔

میرؔ، فانیؔ اور حسرتؔ نے اردو شاعری کو دردوغم کی لذت عطا کی، سوز و گداز دیا۔ مومنؔ نے اس کے حسین ماتھے پر بانکپن کا جھومر سجایا۔ اکبرؔ و نظیرؔ نے طنز و مزاح کے دریا بہا دیئے۔ داغؔ نے سادگی و پرکاری کے وہ جوہر دکھائے کہ سارے ہندوستان میں اردو زبان کی دھوم مچ گئی ــــ اقبالؔ۔ وہ مردِ مومن۔ مردِ مجاہد۔ وہ اپنے کلام کا اپنا آپ شاہین ــــ ع

میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

کہنے پر ہی اس نے اکتفا نہ کی۔ بلکہ خودی و خودداری کے بھی آداب سکھائے۔ قلندری و بے نیازی کے گر بتائے۔ اور شاعری کے ذریعہ سارا قرآن سمجھا دیا۔ آیاتِ قرآنی کے سرمہ و غازہ سے اس کے نوک پلک سنوارے۔

اور غالبؔ۔ اردو شاعری کی شہ رگ ہے۔ اس نے اردو نثر کو اپنے خطوط سے مالا مال کیا۔ خط کیا ہیں۔ اچھی خاصی تفسیر ہیں۔ اس نے کچی لپٹی نہیں رکھی۔ صاف گو، صاف باطن ــــ صاف دل ــــ دوستوں کو دل و جان سے چاہا۔ ان پر جی جان قربان کیا۔ دشمنوں کو کھلے بندوں برا بھلا کہا۔ غیبت نہیں کی۔ جس نے اس کو قریب سے دیکھا۔ اس نے اس سے پیار کیا۔ اس کی شخصیت کو پہچانا۔ جس نے تعصب برتا۔ وہ پکا دشمن بن گیا۔ مگر اس بوالہوسی سے کیا ہوتا ہے۔ غالبؔ غالب ہی رہا۔

(۱)

وہ میخانوں میں اونک گیا۔ چور دروازہ سے نہیں گھسا۔ اس نے خلوت میں گناہ کو جائز سمجھنے والوں پر صاف صاف کہہ دیا ــــ

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ہم روزِ روشن میں جاتے ہیں۔ اندھیرے میں نہیں۔ اور واعظ اندھیرے کا منتظر رہتا ہے۔

(۲)

ب آئیے دیکھیں وہ اپنا سب کچھ لٹا کر بھی کتنا مطمئن ہے۔ کسی کی دی ہوئی امانت کو اگر ہم لوٹا دیں تو اس میں ہمارا ایثار تو نہیں ہوا۔ اس کی مہربانیوں کا بدلہ جان جیسی پیاری چیز بھی نہیں ہو سکتی ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی　　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پہلے حق کے معنی سچ کے ہیں اور دوسری دفعہ حق فرض کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سچائی اور فرض لازم و ملزوم سے فرض قائم ہوتا ہے اور فرض سے حق کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے ——— عرض کرنا یہ ہے کہ غالب کا ہر شعر بذاتِ خود اتنا منطبق ہوتا ہے کہ اس سے بہتر مثال ممکن ہی نہیں ——— عموماً اشعار ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔

(۳)

سی خوب صورت مکان کو دیکھ کر اور اس کی دلکش حسین "شخصیت" کے مکین کو تصور میں لا کر تیا یئے آپ غالب کو ہیں؟ وہ تو جنت میں بھی اپنے محبوب کے گھر کی تعریف سے باز نہیں آتا۔ اور اس کے جواب میں رضوان بہشت کی نی میں بلا وجہ بھی منہ سکھا رہا ہے۔ ؎

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

(۴)

ے بڑھیئے۔ اور ذرا سنیئے۔ کچھ کہہ رہا ہے۔ عشق و زندگی کو لازم و ملزوم ٹھہرانے کا ایک نیا اسلوب۔ اگر انسان کو ہے وش کر لیا جائے تو عشق کی شمع بغیر وہ روشن نہیں ہو سکتی اور جب تک انسانی جسم کے خرمن کو عشق کی برق بھسم نہ کر دے اس وقت تک وہ رونقِ ہستی محروم رونقِ ہستی ہے۔ عشقِ خانہ ویراں سازے　　　انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں

(۵)

ب چلیئے ذرا آپ کے دولت خانہ یا غریب خانہ کو چلیں۔ جہاں آپ کے ستھرے ذوق نے ایک پھول باغ اگا کر گھر کی اداسی کو ہنسا دیا ہے جس کو دیکھ کر ایک شاعر کہتا ہے ؎

گھر میں چھوٹا سا خیابان بنا رکھا ہے　　　دل کے بہلانے کا سامان بنا رکھا ہے

ر غالب نغمہ سرا ہوا ؎

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں　　　خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

(۶)

ب نے جہاں پیٹ کی آنچ سے مجبور ہو کر قصیدے لکھے ہیں۔ ثنا خوانیاں کی ہیں۔ وہاں اپنی بلند فطرت کے پیشِ نظر ز دوسروں سے بھی پیار کیا ہے۔ اس نے اپنا ایک بھوڑا بھی نہیں ہنایا۔ آپ کہیں گے انگور کھٹے ہیں۔ ہیں۔ وہ میٹھے بھی ہوتے تو وہ انہیں منہ نہ لگاتا۔ وہ غریب کا بھی احسان مند ہونا نہیں چاہتا۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔

آپ کچھ اور سوچیں۔ تو اور بات ہے۔ اس نے اقبال سے پہلے ہی خودداری کے آداب سیکھ لئے تھے ؎

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم   اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

(۷)

اور جب وہ اس حسین کائنات کو دیکھتا ہے۔ یہاں کے نظر فریب جلوؤں پر اس کی نظر پڑتی ہے تو وہ بڑا ہی صاحب بن کر یوں اپنے خیالات کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اور آپ کو۔ ہم کو ایک ایسا مثالی شعر دیتا ہے کہ ایسے جلوؤں سے متاثر ہو کر آپ ہم بھی اس شعر کو اپنے دماغ میں گھومتا محسوس کرتے ہیں ؎

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے   طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

(۸)

یوں بھی خواب کب شرمندۂ تعبیر ہوئے ہیں۔ اور اس کی اپنی تو تقدیر ہی سو رہی تھی۔ وہ خود بے خواب تھا۔ مالی پریشانی کی وجہ آسودگی کا دور دور پتہ نہ تھا۔ نیندیں اچاٹ تھیں۔ پھر خواب کا کیا سوال ——— وہ اپنی سوئی ہوئی قسمت سے ایک زیادہ نہیں ——— صرف ایک میٹھی نیند قرض لینا چاہتا ہے لیکن پھر یہ خوف دامن گیر ہے کہ اس قرض کی ادائی کس طرح ہوگی۔

لوں وام بختِ خفتہ سے ایک خوابِ خوش ولے   غالب۔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں!

ایک ایسا شخص جس کی آمدنی کے ذرائع محدود ہوں۔ وہ اگر قرض لینا چاہے تو وہ بھی انہیں الجھنوں میں پڑ جائے گا۔ کہ پھر ادا کس طرح کروں؟

(۹)

آپ کو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا؟ آپ تھکے ماندے گھر لوٹے۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کس کو ڈھونڈھ رہے ہیں آپ؟ دیکھئے وہ تو آئینہ دیکھ رہا ہے۔ اور آپ نے سوچا۔ غالب نے کتنی صحیح عکاسی کی ہے ؎

تماشہ کر اے محوِ آئینہ داری   تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے   صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

کسی اور شاعر نے بھی اس خصوص میں بڑا اچھا خیال پیش کیا ہے۔ کہتا ہے ؎

اچھا ہوا اور آئینہ دیکھ لے   گھر میں ترا جواب نکلا

(۱۰)

کبھی آپ کو کسی نے جھوٹوں نہ پوچھا۔ محفلیں آراستہ ہوئیں۔ بزمیں سجیں۔ دعوتیں اڑائی گئیں۔ اور آپ کبھی نہ آئے۔ مگر آج کیا ایسی بات ہوئی۔ آپ نے بہت زور مارا۔ عقل کے ساتھ خوب خوب بحث رہی۔ پر کچھ بھی پلے نہ پڑا۔ اور

غالب ہی آیا اس مسئلہ کو سمجھانے ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

(۱۱)

رقیب بھی کتنا اوچھا اور کم ظرف ہے۔ کہیں مہینوں برسوں میں اس کو تیرا خط ملا ہے۔ اس راز کی چیز کو بھی راز کے طور پر رکھنے کا کم بخت کو سلیقہ نہیں ؎

غیر پھرتا ہے۔ لئے یوں ترے خط کو کہ اگر کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے؟ تو چھپائے نہ بنے

(۱۲)

ہر بات میں ایسی بال کی کھال نکالتا ہے۔ کہ اس کے آگے بات بنانا تو چھوڑیئے بات کرنی مشکل ہے ؎

نکتہ چیں ہے۔ غم دل اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات۔ جہاں بات بنائے نہ بنے

(۱۳)

ذرا سوچیئے ٹھنڈے دل سے سوچیئے۔ آپ کو۔ ہم کو کوئی گالی دے گا تو ہم کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک کی چار سنائیں گے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے تیار ہو جائیں گے مگر اس کی اعلیٰ ظرفی، فیاضی اور بلند حوصلگی دیکھیئے۔ وہ محبوب کے دربان کو بھی اتنی دعائیں دیتا ہے کہ پھر کوئی دعا۔ اس کی گالیوں کے جواب میں دینے کو باقی نہیں رہتی ؎

واں گیا بھی میں تو اس کی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

(۱۴)

آپ سے کسی نے وعدہ کیا ہے کہ کہیں ساتھ ساتھ چلیں گے۔ آپ وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ دیکھا تو آپ کا ساتھی بالکل تیار نہیں — وہاں تو ابھی سنگار ہو رہا ہے۔ کیا ایسے موقع پر غالب بھولنے کی چیز ہے ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

(۱۵)

دل کس کے پاس نہیں ہوتا۔ مگر ہر دل کی نوعیت اور کیفیت جدا ہے۔ کہیں دل مسرتوں کے ہجوم میں بلیوں اچھلتا ہے۔ اور دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ مگر زندگی میں ایسی پر مسرت گھڑیاں بہت کم آتی ہیں۔ عام طور پر دل دکھتا ہے۔ دل بیٹھتا ہے۔ دل ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسی مضبوطی سے ٹوٹتا ہے کہ پھر جڑتا نہیں۔ غالب کے سینہ میں بھی عام انسانوں جیسا ہی ایک دل تھا۔ جس پر زخم ہی زخم تھے۔ اور یہ اس مجروح دل کی تشریح ہے ؎

دل نہیں۔ ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

(۱۶)

نیک، شریف اور اعلیٰ ظرف ہوتے ہوئے اس کو اپنی حقیقت کا علم تھا۔ اس کی شہرت اور ہر دل عزیزی ہر آ جدھر نظر اٹھی دشمن ہی دشمن نظر آیا۔ کسی کی آستین میں دشنہ پنہاں۔ کسی کے ہاتھ میں خنجر کھلا۔ پیٹھ پیچھے بولنے اور بدگوئی کرنے والے۔ مگر غالب کسی کا شاکی نہیں۔ اس کو تو صرف اس چرخِ نیلی فام سے شکایت ہے۔

بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے۔ کس ہنر میں یکتا تھے

(۱۷)

کبھی کسی گھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار دیکھ کر آپ کے ذہن میں غالب کا یہ شعر نہیں آیا ؎

یاد آگیا مجھے۔ تری دیوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا

(۱۸)

عشق کو بلا سمجھ کر اہل بوالہوس دور دور ہی رہا۔ مگر اس جذبہ کی اسی نے قدر کی۔ اس کو سینہ سے لگایا۔ اس اذیتیں جھیلیں اب اپنے بعد کیا ہوگا؟ یہ غم مارے ڈالتا ہے۔ اور وہ چیخ اٹھتا ہے ؎

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد
آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب

(۱۹)

اور پھر اپنے بعد مہر و وفا کے بے آسرا ہونے کا بھی رنج گھلا رہا ہے۔ ان کی کس مپرسی کا غم الگ جان لیوا ہے ؎

کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی

(۲۰)

زمانہ نے اس کو بہت ستایا۔ بڑے دکھ دیئے۔ بڑا حساس تھا۔ بلا کا سیر چشم۔ جی بھرتا ہی نہیں غم سے۔ اس کو زیادہ کی توقع تھی۔ لوگ ستم بھی کرتے ہیں تو ان کا ستم اتنا بدن چور ہوتا ہے کہ ستم سہنے والوں کی تشنگی دور نہیں ہو۔ بھرپور ہو۔ پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ؎

وگرنہ ہم تو زیادہ توقع رکھتے تھے
زمانہ سخت کم آزار ہے۔ بجانِ اسد

(۲۱)

کبھی خدا نہ کرے کسی کے گھر کوئی غمی کی محفل ہو تو غالب ہی کیوں بہت زیادہ یاد آتا ہے۔ جیسے وہ بھی فلسفہ بیان کر رہا ہو ؎

نوحۂ غم ہی سہی۔ نغمۂ شادی نہ سہی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

غرض غالب کی شاعری میں اتنے متلون جلوے ملتے ہیں کہ ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وہ ہم کو ہر موقع کی مناسبت کا شعر دیتا ہے۔ وہ تو ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ہمارے ہی آس پاس کہیں چھپا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ میر کبھی کبھی یاد آتے ہیں۔ مومن بھولے بھٹکے کبھی ہماری زندگی میں چہل قدمی کرتے آجاتے ہیں۔ اقبال کی آگے پیچھے چلتا محسوس ہوتا ہے —— مگر یہ غالب اس نے تو خدائے پاک کی مصلحت و مشیت کے سارے راز جان لئے تھے۔ اور اس کی شاعری کے وصف بیان کرتے کرتے ؎

انگلیاں فگار اپنی۔ خامہ خونچکاں اپنا

(اردو مجلس حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ یوم غالب میں پڑھا گیا)

پروفیسر شیخ فرید

باغِ اردو

(بسلسلۂ گذشتہ)

باب دوم سے دو حکایتوں کا ترجمہ نقل ہے۔

پہلی حکایت :۔

"ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلانے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں؟ کہا اس نے کہ بظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے آگاہ اللہ ہے۔[۵]

جس کو ظاہر میں متقی دیکھے — اسکے تقوے کا تو نہ کر انکار
کھوج مت کر کسی کے باطن کی — محتسب را درون خانہ چہ کار[۱۶]

دوسری حکایت :۔

"ایک فقیر کو میں نے دیکھا کہ کعبے کے آستانے پر سر کو رکھ کر اپنا منہہ زمین سے ملتا تھا اور عجز و نیاز سے کہتا تھا کہ یا غفور یا رحیم تو جانتا ہی کہ ظالم سے کیا صادر ہووے اور جاہل سے کیا ظاہر کہ یہہ تجکو ہی لایق ہی

عذر تقصیراتِ خدمت ہی فقط لایا ہوں میں — طاعتوں سے مطلقاً رکھتا نہیں تاب و توا[ں]
عارف استغفار کرتے ہیں عبادت سے مدام — توبہ کرتے ہیں گناہوں سے ہمیشہ عاصیا[ں]

بجز لائے بندگی چاہتے ہیں عابد و ذاکر اور قیمت جنس کی تاجر۔ یہ بندۂ امید وار امید لایا ہی د طاعت اور گدائی کرنے آیا ہی نہ تجارت۔ وہ سلوک ہم سے کر کہ جیسکے تو لایق ہی نہ وہ امر جو ہمارے حال کے موافق ہی۔

قتل کر یا بخش اب تو در پہ تیرے سر رکھا — حکم کیا بندیکا جو فرمائے تو لا دے بجا

---

[۱۶] گلستان ۔ باب دوم ۔ حکایت ۱ صفحہ ۳۳ / باغ اردو صفحہ ۱۱۳ ۔

[۵] باغ اردو میں اللہ کا املا یوں لکھا ہے ۔ اللّٰہ

در پہ کعبہ کے ایک سائل یوں　　　کہہ رہا تھا عجز سے یہ رو رو کر
طاعتیں مت قبول کر لیکن　　　قلم عفو کھینچ عصیاں پر صـ۱۷ـ

باب دوم سے مثنوی ــــ

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند　　　کہ اے روشن گہر پیر خرد مند صـ۱۸ـ .... تک

ترجمہ ملاحظہ کیجئے :ــــ

کسی نے پیر کنعاں سے یہ پوچھا　　　کہ ای عالی گہر گوہر سے اعلیٰ
وہ بوئے پیرہن جہاں مصر سے آئے　　　پسر کو چاہ کنعاں میں نہ تو پائے
یہ تیرا طور بس حیرت فزا ہی　　　سبب اس کا بتا دے جلد کیا ہی
یہہ سن اسنے کہا ہم برق ساں ہیں　　　نمایاں ہیں کبھی گاہے نہاں ہیں
کبھو پاؤں تلے نے لیں سما کو　　　کبھی دیکھیں نہ اپنی پشت پا کو
اگر عارف کا رہتا ایک سا طور　　　اٹھا تا ہاتھ دو جگ سے وہ فی الفور

دوسرے قطعہ ــــــ　دوش مرغی بصبح می نالید　　　عقل و صبرم ببرد طاقت و ہوش صـ۱۹ـ .... تک

ترجمہ دیکھئے :ــــ

کل سحر کو صدائے مرغ سحر　　　لیگئی اپنے صبر و طاقت و ہوش
کان میں ایک دوست کے آخر　　　جوں ہیں پہنچی مری صدائے خروش
بولا وہ دھیان میں نہ تھا کہ مجھے　　　کر یہ یوں طیر کی صدا مدہوش
میں کہا جوش آگیا یہہ مجھے　　　کہ وہ ذاکر ہوں اور میں خاموش

بعض اشعار کی تشریح میں جہاں شارحین میں اختلاف ہے افسوس نے وہاں دونوں طرح کے مطلب کو نظم کر دیا ہے۔ شام کا ایک زاہد مرتاض ایک بادشاہ کی خواہش پر صحرا سے شہر میں بادشاہ کے خاص محل اور باغ میں آکر مقیم ہوتا ہے۔ اس دلکشا اور پُر فضا باغ کی تعریف میں ذیل کا قطعہ ہے :ــــ

گل سرخش چو عارض خوباں　　　سنبلش ہمچو زلف محبوباں
ہمچناں از نہیب برد عجوز　　　شیر نا خوردہ طفل دایہ ہنوز صـ۲۰ـ

---

۱۷ گلستان باب دوم دوسری حکایت ص۳۵ باغ اردو ص۱۱۴ــ۱۱۵ ۱۸ گلستان ص۳۸ ، باغ اردو ص۱۲۹ ۔
۱۹ [illegible] ص۴۴ باغ اردو ص۱۵۵ــ۱۵۴ ، ۲۰ گلستان ص۰۱۰ ، ص۴۰ [illegible]

افسوس نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے :-

رخ خوباں سا لالہ زاں کا گل ۔ لالہ رویونکی زلف سا سنبل
ہی وہ ہر ایک ہنوز جیسا تھا ۔ اپنی صورت پہ اور نرد تانا
کم بھی چلیگے جالے بیکا صدما ۔ ایک کو انمیں سے نہیں پہنچا
اور نزاکت کو کیا بیان کیجیے ۔ شیرنا خوردہ طفل ہو جیسے

"بعضوں کے نزدیک معانی بیت ثانی کے لیے ہیں۔"

چلیگے جالے بیکا انھیں صدما ۔ فی الحقیقت کچھ ایک ہی پہنچا
پر نزاکت کہوں ہر ایک کی کیا ۔ شیرنا خوردہ طفل ہو جیسا ص[21]

خانقاہ سے ایک صاحب دل کی مدرسہ میں آمد ص[22]

چھوڑ کر اپنی خانقاہ کینئیں ۔ مدرسے میں ایک اہل دل آیا
تج ہی دی عابدوں کی ہمراہی ۔ انکی صحبت کے عہد کو توڑا
تب کہا میں نے عابد و عالم ۔ فرق رکھتے تھے کس قدر بتلا
جب وہ بولا کہ سچ کہوں تجھسے ۔ مجھپہ ہر ایک حال جو ہی کھلا
کھینچ لے کملی اپنی موج سے وہ ۔ پکڑے ڈوبتے ہی یہہ قصد اسکا ص[23]

روایت درپردہ کی منظوم حکایت کا منظوم ترجمہ :- ص[24]

سن یہہ قصہ کشور بغداد کا ۔ یوں نشان درپردے بیچ جھگڑا پڑا
گرد رہ کا دکھ سفر کا رنج سب ۔ پردے سے کہنے لگا یوں ہو غضب
میں بھی اور تو بھی غرض دونوں غلام ۔ شہ کی درگہہ کے ہیں بندے لا کلام
چین سے واقف نہیں ہیں عمر بھر ۔ دوڑتا ہوں ہر وقت نت میگا سفر
قلوسا دکو تونے ٹک دیکھا نہیں ۔ رنج جنگل سے کبھو کھینچا نہیں
نے سموم دشت ہی تجھکو لگی ۔ خاک رستے کی نہ ٹک تجھپر پڑی

---

۲۱ باغ اردو ص۱۰۳ ۔ ۲۲ فارسی قلمی گلستان ص۵۱ / باغ اردو ص۱۸۳ ۔
۲۳ گلستان ۔ روایت درپردہ ص۳۰ / باغ اردو ص۱۷۷-۱۷۸ ۔

ہی بہت کوشش میں میرا ہی قدم — کس لئے پھر تو ہی اتنا محترم
پاس تیرے مہر و مہ سے ہیں غلام — اور کنیزیں خوبصورت بھی مدام
ہاتھ میں میں پا جیو نکلے ہوں پڑا — اور سفر کے بیچ سرگرداں سدا
گفتگو جھنڈے کی وہ جب سن چکا — تب لو پردہ اتنے یوں کہنے لگا
ہی ہمیشہ سر مرا اور آستان — لے تری مانند سر بر آسماں
گردن اونچی جو کہ بیہودہ کرے — اپنی گردن کہ وہ بھل آپ ہی گرے

باب سوم — فضیلت قناعت — سے پہلی حکایت کا ترجمہ[۲۵] نمونتہً نقل کیا گیا ہے —

"ایک سائل رہنے والا مغرب کا حلب کے بزازوں کی صف میں کہتا تھا کہ اگر تمکو انصاف ہوتا ای صاحبانِ نعمت اور ہمیں قناعت تو رسم سوال کی جہاں سے اٹھ جاتی۔ قطعہ —

ای قناعت مجھے تو نگر کر — کہ بجز تیرے کچھ نہیں نعمت
صبر لقماں نے اختیار کیا — صبر جس کو نہیں نہیں حکمت

باب چہارم سے پہلی حکایت کا ترجمہ پیش ہے[۲۶] : —

"ایک دوست سے میں نے کہا کہ چپ رہنا میں نے اس سبب اختیار کیا ہی کہ بولنے میں اکثر اوقات نیک و بد کا اتفاق ہو جاتا ہی اور آنکھ دشمن کی سوائے بدی کے کچھ نہیں دیکھتی۔ بولا وہ کہ اے برادر دشمن وہی بہتر ہی کہ نیکی نہ دیکھے : —

ہی بڑا عیب ہنر دشمنی کی آنکھو نہیں — پھول ہی سعدی پہ ہی آنکھو میں دشمن کی خار

مدعی کا ہو گند صالح کی جانب سے اگر — تو اشارہ یوں کرے یہہ ہی بڑا جھوٹا شریر

گو جہاں روشن ہی سورج سے سدا — پر چھچھوندر کی نظر میں ہے برا

---

[۲۵] گلستان ص۵۵ / باغ اردو ص۲۰۔
[۲۶] گلستان - باب چہارم ص۶۲ / باغ اردو جلد دوم ص۱۰۲ شعر۳ عربی شعر کا ترجمہ ہے۔

باب پنجم سے آخری منظوم حکایت کا منظوم ترجمہ ملاحظہ کیجئے:۔ [۲۷]

جوان ایک پاک باز اور خوش چلن تھا — لگا ایک خوب رو سے اسکا من تھا
سنا ہے یہہ کہ ایک دریا کے اندر — بھنور میں گر پڑے دو نو وہ ملکر
جون ہیں ملاح اسکے پاس پہنچا — کہ تا وولے نہ پکڑے ہاتھ اسکا
کہے تھا وہ بہی موجوں میں رو رو — پکڑ تو یار کو اور چھوڑ مجکو
تھی ان باتوں پہ اسکی خلق درہم — وہ جی دیتا تھا اور کہتا تھا ہر دم
یہ حال عشق اس جھوٹے سے مت سنا — جو بھولے سختیوں میں دوست اپنا
بسر یاروں نے کی یوں زندگانی — ہو گذری جسپہ سن اسسے کہانی
ہے فن عشق میں سعدی یہہ استاد — عرب کے جوں لغت میں اہل بغداد
لگا دلبر سے ہی دل اے خرد مند — کسیکو دیکھ مت بس آنکھ کر بند
اگر مجنوں و لیلی ہوتے فی الحال — اسی دفتر سے لکھتے عشق کی چال [۲۸]

باب ہفتم — ضعف پیری — کی آخری منظوم حکایت کو افسوس نے نظم کے پیرایہ میں یوں بیان کیا ہے:۔

سنا ہی اندر نے ایک پرانے بڈھے نے — کروں بڑھاپے میں شادی خیال یہہ باندھا
تھی ایک دختر نیکو جمال گو ہر نام — قد اسکا سرو سا غنچے سے ہونٹھ منہ گل سا
اسیکے ساتھ کسی ڈھب سے کتخدائی کی — برنگ درج گہر پر اسے چھپا رکھا
جو کچھ عروسی کو لازم ہی تھا سبہی موجود — پہ اٹھتے اٹھتے عصا شیخ جی کا گر ہی پڑا
جو ہووے سوزن فولاد تو چھلنے سیئے — کماں تو کھینچی بہت پر نہ تیر مار سکا
دلیل چاہی گلہ کرکے اسکا یاروں سے — کہ سارا گھر مرا اس بدچلن نے صاف کیا
تدان جھگڑے ہوے ایسی شوہر و زن میں — کہ تا محکمہ احوال انکا جا پہنچا
جب اس قدر ہوئی رسوائی تب تو سعدی نے — کیا نہ پاس ذرا اسکا بلکہ صاف کہا
بس اب زبون نکہہ کیا خطا ہی دختر کی — جو ہاتھ کا نپین ہیں تیرے گہر پروئیگا کیا [۲۹]

---

[۲۷] گلستاں ص۱۹ / باغ اردو جلد دوم ص۱۷ ۔
[۲۸] " " / " " ص۲۲ ۔
[۲۹] " " / " " ص۵۸ ۔

باب ہفتم سے پہلی حکایت کے نثری حصہ کا اقتباس ملاحظہ کیجئے :—

"ایک وزیر کا بیٹا نادان و کند ذہن تھا۔ ایک فقیہ کے پاس بھیجا اسکو کہ اس لڑکے کو تربیت کر شاید کہ عقلمند ہو جائے۔ چنانچہ معلم نے تعلیم اس کو کیا پر کچھ فائدہ ہوا۔ تب اسکے باپ کے پاس ایک شخص کو بھیجا کہ بیٹا تیرا عاقل ہوا اور مجکو دیوانہ کر دیا"[۳۰]

باب ہشتم سے "پند و حکمت" کے چند جواہر ریزے ملاحظہ کیجئے :—

"حکمت — مال عمر کی آسایش کے واسطے ہے نہ عمر واسطے جمع کرنے مال کے، ایک عقلمند سے پوچھا کہ نیک بخت کون۔ کہا اسنے نیک بخت وہ ہی کہ جس نے کھایا اور کھلایا اور بدبخت وہ ہی کہ جو مر گیا اور چھوڑ گیا"

(۲) "حکمت — عالم بے تقوی مشعل رکھتا ہی پر ہی اندھا۔

بے فایدہ عمر کو گنوایا　　　　کچھ مول لیا نہ زر گرایا[۳۲]

(۳) "حکمت — جب تلک زر سے کام نکلے جان پر جوکھوں اٹھانا لایق نہیں۔

تھک چکیں جب تیرے سب حیلوں سے ہات　　　　پھر تکر تلوار بن کچھ اور بات[۳۳]"

(۴) "حکمت — دشمن کے عجز کرنے پر رحم نہ کرکہ اگر قادر ہوگا تو مہر نہ کرے گا تجھ پر

شیخی نہ کرنا تو دو رکی دشمن جو دیکھے ناتواں　　　　ہر پیرہن میں مرد ہی پر مغز ہی ہر استخوان[۳۴]"

(۵) "حکمت — حق تعالیٰ عیب دیکھتا ہے اور چھپاتا ہی ہمسایہ نہیں دیکھتا لیکن بکھانتا ہی۔[۳۵]"

گلستاں کے خاتمہ[۳۶] کے بعد باغ اردو کا خاتمہ ہے۔ گلستان کے خاتمہ کا ترجمہ یوں کیا ہے :—

"مدد سے بادشاہِ محسن کی اور اللہ معاون کی کتاب گلستان تمام ہوئی اور اسمیں

---

۳۰ گلستان ص۹۳ ر باغ اردو جلد دوم ص۸۹ ۔

۳۱ باغ اردو جلد دوم ص۱۴۴ ۔

۳۲ 〃 〃 〃 ص۱۴۶ ۔

۳۳ 〃 〃 〃 ص۱۵۲ ۔

۳۴ 〃 〃 〃 ص۱۵۳ ۔

۳۵ 〃 〃 〃 ص۲۱۳ ۔ ۳۶ باغ اردو۔ خاتمہ ص۲۱۲—۲۱۰ ر خاتمہ باغ اردو کا ص۲۱۳—۲۱۲ ۔

کلام متقدمین کا بطریق استعارہ بطور مؤلفوں کے نہیں ملایا بلکہ یہ دھیان بھی دل میں نہیں آیا۔

جامہ پرانا اپنا جو پہنے بنا سنوار بہتر ہی اس نئے سے جو ہاتھ آئے مستعار

اکثر گفتگو سعدیکی طرب انگیز و ظرافت آمیز ہی تا اشخاص کم فکر طعنے نہ دے سکیں کہ بیہودہ بکبک سے مغز پھرانا اور بیفائدہ رنج اٹھانا عقل مندوں کا کام نہیں۔ لیکن مخاطب فی الحقیقت صاحبدلان روشن رائے سے ہی اسواسطے ظاہر کیا جاتا ہی کہ اس نے نصیحت کے موتیوں کی لڑی بنائی ہی اور پند و نکی داروے تلخ شہدِ ظرافت میں پلائی ہی تو طبع سننے والوں کی ملول نہو اور دولتِ قبول سے محروم نرہے

نصیحت میں نے کی ہے اپنے موقع پر مزا پایا ہے اسمیں عمر کھو کر
کسی کے سننے ان سننے سے کیا کام رسولوں کو فقط دینا ہی پیغام
سدا مصنف و کاتب کے حق میں اے ناظر طلب خدا سے کیا کیجیو رحمت و غفران
اور اسکے بعد جو مالک ہو اسکا اسکے لئے پھر اپنے واسطے توفیق چاہیو ہر آن

سطورِ بالا میں اقتباسات کا حصہ کافی طویل ہوگیا ہے مگر کتاب کی کمیابی کا خیال کرتے ہوئے کچھ زیادہ نقل کر دیئے گئے ہیں۔ تاکہ ناظرینِ کرام کی ان حصوں تک آسانی سے رسائی ہوسکی۔

افسوس کا یہ ترجمہ زیادہ تر لفظی ہے۔ عربی اور فارسی اشعار کا ترجمہ اشعار میں کیا ہے کہیں کمی بیشی کر دی ہے۔

ترجمہ کے متعلق افسوس کا بیان باغ اردو جلد اول میں "کئی سطریں عذر و تمہید میں" کے تحت ملتا ہے

"فقیر نے اسکی نظم و نثر کا مطلب مع عربی موافق اپنے مقدور کے نہیں چھوڑا مگر زیادہ کمی کہیں کہیں کی ہی اور جہیں نظم و نثر میں اختلافِ نسخ دیکھا ہی با اختلافِ معانی۔ بعض جا گہہ تو ہر ایک کا ترجمہ کیا ہی اور بعضے مقام میں جسکی ترجیح اپنے نزدیک ٹھہری ہی اس کا کیا ہی اور مرجوح کو ترک کسی مقام مقام میں ہو بہو کرنے میں آیا ہی۔ گو محاورے سے اندکے تفاوت ہوگیا ہو پر اکثر رعایت محاورے ہی کی منظور رہی ہی"[۳۲]

---

[۳۲] باغ اردو صفحہ ۲۳ جلد اول۔

پروفیسر عبدالمجید صدیقی

سلطنت بہمنی کی باقیات

چودھویں صدی کی مرکز گریز فضا میں جو سلطان محمد تغلق کی بے ڈھنگی سیاست سے پیدا ہوئی تھی ہندوستان کے اور صوبوں کے ساتھ سنہ ۱۳۴۵ء میں دکن بھی آزاد ہو گیا۔ اس آزادی کے علمبردار وہ ترک افسر تھے جن کو امیرانِ صدہ کہتے ہیں۔ انہی امیرانِ صدہ نے نہ صرف دہلی کے علی الرغم دکن کو ایک آزاد سلطنت میں بدل دیا بلکہ دکن میں ایک نئی روح پھونک دی اور یہاں ایک دکھنی قومیت بنا دی۔ حالانکہ ان لوگوں کو دکن میں آئے ہوئے ابھی نصف صدی سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ دکن کی آب و ہوا میں بڑی جاذبیت ہے، یہ بہت جلد سرایت کر جاتی ہے۔ چنانچہ امیرانِ صدہ اپنے کو ..... اہلِ ہند کے مقابلے میں دکھنی کہنے لگے۔ اسی ماحول میں دکھنی زبان بھی پیدا ہو گئی جو نہ صرف روزمرہ کے تبادلۂ خیال کا ذریعہ ہو گئی بلکہ آیندہ پچاس سال میں ترقی کرتے ہوئے ادبی اور علمی جولانیوں کا مظہر بن گئی۔ اس نئے سماج میں وہ تمام عناصر موجود تھے جو قومی تعمیر کے لئے ضروری تھے۔ یعنی جغرافی اور قومی وحدت، جدید زبان، نئی زندگی اور امنگیں۔ یہ آزاد سلطنت صرف دو سال کے بعد سلطنت بہمنی کہلانے لگی۔ کیونکہ سنہ ۱۳۴۷ء میں اسمٰعیل فتح کی جگہ جو عمر رسیدہ تھا علاء الدین بہمن شاہ کو تخت نشین کیا گیا، جس میں زیادہ کارکردگی اور جولانی تھی، اور قدیم شاہ ایران بہمن بن اسفندیار کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے ایک بڑے شاندار خاندانی پس منظر کے ساتھ تخت پر آیا تھا۔ مولانا عصامی کے الفاظ میں "چراغ خوش از دودۂ بہمن است" بہمن شاہ کے لائق جانشینوں کے زمانے میں یہ بہت بڑی سلطنت بن گئی جو پاکیزہ نظم و نسق، بین الاقوامی دوراندیشی، ذہنی و اخلاقی تعمیری پروگرام سے آراستہ تھی۔ بہمن شاہ کے لائق جانشین محمد شاہ اول (۱۳۵۸ء - ۱۳۷۵ء) محمد شاہ دوم (۱۳۷۸ء - ۱۳۹۷ء) فیروز شاہ (۱۳۹۷ء - ۱۴۲۲ء) احمد شاہ ولی بہمنی (۱۴۲۲ء - ۱۴۳۴ء) ایسے جلیل القدر فرمانروا تھے جو مشاہیرِ عالم کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے علم و فضل، شائستگی اور سیاسی فرزانگی سے دکن کو دکن بنا دیا، سیاست کو سنوارا، تمدن کی آبیاری کی اور علم و فن کے دریا بہا دیئے۔ محمد شاہ لشکری کے عہد میں جو سنہ ۱۴۶۳ء (۸۶۷) میں تخت پر بیٹھا تھا سلطنت بہمنی گوا سے سونی پٹم تک پھیل گئی تھی اور تمام سطح مرتفع دکن پر بہمنی پرچم لہرا رہا تھا۔ بہمنی افواج کی نقل و حرکت سے ہمسایہ سلطنتیں لرزہ براندام ہو جاتی تھیں۔ اس شاہانہ جلال، رعایا پروری و علم دوستی کی گرم بازاری سے دکن کو جو فائدہ پہنچا ہے وہ ظاہر ہے، اور اہلِ دکن کے دلوں پر اس سلطنت کا جو سکہ بیٹھا تھا وہ کبھی محو نہیں ہوا۔ اہلِ دکن ہندو مسلمان دونوں یہ سمجھتے تھے کہ بہمنی تاجدار ہی دکن کے اصل وارث ہیں اور دکن پر راج کرنا انھیں کا حصہ ہے۔

لیکن "مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی" بہمنی سلطنت کی تعمیر ابتدا میں جو جراثیم بھی چھپے ہوئے تھے وہ اس کو چاروں طرف سے کھوکھلی کرنے لگے اِس سلطنت کے زوال کا باعث طبقہ واری کش مکش ہے جو پندرھویں صدی کے وسط سے شروع ہوگئی۔ احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد سے جس کا انتقال ۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء میں ہوا طبقہ واری کش مکش کے آثار پیدا ہوگئے اور اس کے بیٹے علاء الدین ثانی کے عہد میں یہ کش مکش ایک خطرے کی صورت میں تبدیل ہوگئی۔ بات یہ تھی کہ احمد شاہ کے عہد سے بے شمار ایرانی و ترک دکن میں وارد ہونے لگے۔ ان میں بعضے تاجر تھے جو تجارت کی غرض سے آئے تھے اور بعضے اہلِ علم، اور یہ سب دکن کی مہمان نوازی اور دربار کی سرپرستی سے فائدہ اٹھا کر بہت جلد سربلند ہوئے اور سیاست پر چھانے لگے۔ سیاسی اقتدار کے حرص و آز میں تاجروں نے تجارت چھوڑ دی اور اہلِ علم۔۔ اپنی محفلوں کو خیرباد کہہ کر سیاسی میدان میں کود پڑے اور ان کے غلبے سے سیاسی اور معاشی میدان میں ہر روز جنگ ہونے لگا اور اہلِ ملک کو ان سے شکایت پیدا ہونے لگی۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ امیرانِ صدہ اور ان کی اولاد دکھنی قومیت کے اصل بانی اور معمار ہیں اور آج ان کو دکن میں آئے ڈیڑھ سو سال ہو گئے تھے۔ انہی لوگوں نے دہلی کی سیادت سے منہ موڑ کر دکن کو آزاد کیا اور سلطنت بہمنی کی عمارت کھڑی کی تھی اور یہ اپنے کو دکن کا صحیح وارث سمجھتے تھے، اور جو لوگ باہر سے آکر سیاسی اور معاشی ذرائع کو غصب کرنے لگے۔ ان کو آفاقی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ یہ کش مکش ہر روز تیز ہوتی گئی، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ علاء الدین ثانی کے عہد میں جس کا انتقال ۸۶۲ھ/۱۴۵۸ء میں ہوا، خون کی ندی بہہ گئی۔ چاکنہ کے میدانِ جنگ میں اہلِ دکن نے موقعہ پاکر بے شمار آفاقیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ یہ ایک دردناک سانحہ تھا! اس سے دونوں طبقوں کے درمیان رقابت کی آگ بھڑک گئی۔ شاہانِ وقت اور ان کے وزراء نے اس معاملے میں دور اندیشی سے کام نہیں لیا، بلکہ اس کو اور بھڑکایا اور یہ سلطنت کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔

صورت حال یہ تھی کہ ملک دو طبقوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور آپس کی کش مکش کی وجہ سے اہلِ ملک کی تمام ذہنی اور اخلاقی طاقتیں جو ملک کی بہبودی میں کام آتیں وہ سب رائگاں جا رہی تھیں۔ جو دل و دماغ ملک کے ذہنی اور اخلاقی معیار کو بلند کر سکتے تھے وہ رقیبانہ کش مکش میں مبتلا تھے اور اپنی توانائیاں ضائع کر رہے تھے۔ ہر عہد میں ان مخالف طبقوں کی سرگرمیاں بڑھتی ہی گئیں اور ان میں نیا پانی جمع ہو رہا تھا۔ علاء الدین ثانی کے عہد میں آفاقیوں کا سرغنہ خلف حسن بصری تھا تو دکھنی طبقے کے سرگروہ میاں من اللہ دکھنی تھے۔ محمد شاہ لشکری کے عہد میں ان طبقوں نے نئے سر سے جنم لیا۔ اس وقت آفاقیوں کو خواجہ محمود گاواں جیسے شخص کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ خواجہ محمود گاواں جو دکن میں اپنی سیاسی فرزانگی اور علم و فضل کی بدولت مشہور ہے وہ ایک تاجر کی حیثیت سے دکن آیا تھا۔ اس میں علم و فضل تھا اور سیاست کے اچھے جوہر تھے، چنانچہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کے زور سے یہ بہت جلد ترقی کر گیا۔ ہمایوں بہمنی کے عہد میں یہ وزیر ہو گیا اور محمد شاہ لشکری کے عہد میں وزیر اعظم کی خدمت پر فائز ہو گیا! اس کی

دوستی اور سیاسی صلاحیتوں کی بدولت ملک کو بہت فائدے بھی پہنچے۔ اگر محمود گاواں چاہتا تو اپنے اثر سے وہ
پاٹ سکتا تھا جو دو فرقوں کے درمیان حائل ہو رہی تھی لیکن اس شخص میں ایک تنگ نظری بھی تھی۔ اسلئے اس نے یہ خلیج
زیادہ گہری کردی۔ ترکوں اور ایرانیوں کی دل کھول کر سرپرستی کی اور ان کو سر چڑھا لیا۔ یوسف عادل خاں سوائی جو
م کی حیثیت سے بیدر آیا تھا اس کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ ان حالات میں سماج میں زیادہ تلخی پیدا ہوگئی اور دونوں
ایک دوسرے کے زیادہ دشمن ہوگئے۔

محمود گاواں کی اس فرقہ بندی کا ردِ عمل بھی ضروری تھا۔ اس کے مقابلے میں دکھنی فریق بھی طاقتور ہونے لگا۔
س فریق کو ملک حسن بحری کی صورت میں ایک ذی اثر رہنما مل گیا۔ ملک حسن کی افتاد دیکھی جائے تو وہ ایک نومسلم دکھنی تھا۔ بیجانگر
یوں میں گرفتار ہو کر آیا اور شاہی محل کے خدمتگاروں میں شامل ہوگیا۔ شہزادگی کے زمانے میں محمد شاہ لشکری کے ساتھ
تا اور مکتب جاتا تھا، اس طرح اس کے رسوخ بہت بڑھ گئے اور جب سنہ ۱۴۶۳ء میں محمد شاہ لشکری بادشاہ
یا تو اس کے اور بھاگ کھلے۔ اس کو نظام الملک کا خطاب ملا۔ چونکہ اس کے بادشاہ سے گہرے تعلقات تھے اور
محل کے اندر اور باہر اس کا بہت اثر تھا، تمام دکھنی اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے اور ایک طاقتور جتھا بن گیا جو
گاواں کو مارنا چاہتا تھا۔ ملک حسن نظام الملک کے بادشاہ سے قریبی تعلقات تھے اور وہ خلوت اور جلوت میں
ماہ کے ساتھ رہتا تھا اس لئے اس کو محمود گاواں کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے کا پورا موقع مل گیا۔ بجواڑے کے
کنڈہ پلی کے شاہی کیمپ میں جہاں سے مشرقی فتوحات کے لئے فوجوں کی نقل و حرکت ہوتی تھی سازش پایۂ تکمیل کو
محمود گاواں کے خلاف ایک جعلی خط بنایا گیا کہ یہ راجہ اڑیسہ سے بھی بادشاہ کے خلاف سازش کر رہا ہے۔
شاہ مخمور تھے اس جعل میں پھنس گئے اور اپنے حبشی غلام جوہر کو حکم دیا کہ خواجہ کو قتل کر دو۔ چنانچہ جوہر کے ایک وار سے
گاواں کا خاتمہ ہوگیا۔

سنہ ۱۴۸۱ء / ۸۸۶ھ میں خواجہ محمود گاواں کا قتل ہوا۔ اس خونِ ناحق سے سلطنت کو ایسی کاری ضرب لگی کہ اس کی بنیادیں سب ہل گئیں۔
خواجہ محمود گاواں نے اپنی ذات میں ایسی مرکزیت پیدا کرلی تھی کہ وہ بذاتِ خود ایک سلطنت بن گیا تھا چنانچہ
کے افقِ سیاست سے ہٹتے ہی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ کیونکہ جو دست و بازو حکومت کے کل پرزوں کو گھماتے تھے
ہ کٹ گئے اور اس وقت ملک میں کوئی ایسی بڑی شخصیت بھی نہ تھی جو اس خلاء کو پر کرتی۔ اس کا رقیب ملک حسن نظام الملک بحری
کی جگہ پیشوا ہوگیا اور اپنی دیرینہ آرزو پوری کرلی لیکن وہ اس جلیل القدر خدمت کا اہل نہیں تھا۔ اس میں نہ تو سیاسی
نہ تھی اور نہ تجربہ تھا۔ اس کی عمر شاہی محل کے اندر اور باہر ریزہ کاری میں بسر ہوتی تھی۔ اس کے پیشوا ہوتے ہی
نمال شروع ہوگئیں اور جو ہوا خواہ اس کے ارد گرد جمع ہوئے وہ ملک کے سنگین مسائل کو کیا سمجھتے اور اس کا نتیجہ

ظاہر ہے۔ ملک میں ہر جگہ شکست و ریخت شروع ہو گئی اور سلطنت کے تار و پود بکھرنے لگے، اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ ایک سال کے بعد محمد شاہ لشکری خود راہی عدم ہو گئے اور ان کا مرنا ایک درد ساختہ تھا مگر چہ اس بادشاہ میں بہتیری کمزوریاں تھیں تاہم [illegible] سیاسی دم خم بھی تھا اور اگر وہ دو چار سال اور زندہ رہ جاتا تو شاید سلطنت کو اس قدر جلد دھکا نہ لگتا۔ ان کا شاہانہ جلال آج نہیں تو کل غالب آتا اور جو امراء اور عہدہ دار خواجہ کے قتل سے بگڑ کر سرتابی کر رہے تھے وہ کبھی تو اس کے شاہانہ وقار کے سامنے سر جھکا دیتے۔ محمد شاہ لشکری بڑا سپاہی اور فاتح تھا جس نے گوا سے لے کر مسولی پٹم تک سلطنت کے ڈانڈے ملا دیئے تھے اور ان کی بدولت آج تمام سطح مرتفع دکن پر بہمنی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ لیکن اس کے مرنے سے تمام امیدوں پر پانی پھر گیا ملک وزیر باتدبیر تلوار کی گھاٹ تو اتر چکا تھا لیکن فرمانروائے وقت بھی دنیا سے رخصت ہو گیا، اور اس پر طرہ یہ تھا کہ ان کے بعد، ان کا ایک کمسن بیٹا محمود شاہ تخت نشین ہوا جس کی عمر بارہ[12] سال سے زیادہ نہ تھی۔ یہ کمسن لڑکا اس بارِ گراں کو کیا سنبھالتا جب کہ ملک کی مخالف طاقتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ مرنے والا بادشاہ اس سے بے خبر نہیں تھا بلکہ وہ آنے والے خطرات کو سمجھ رہا تھا۔ گو اس نے محمود شاہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے ولیعہد نامزد کر دیا اور شاہی محضر پر اکابرِ سلطنت اور قاضی اور مشائخین کی مہریں لی گئیں لیکن وہ دل میں سمجھ گیا تھا کہ اس کے بعد سلطنت بہمنی بہت جلد دم توڑنے والی ہے۔ سلطنت کے اکابر جب (؟) جلیل القدر بادشاہ کے سامنے سر نہیں جھکاتے تو بارہ[12] سالہ بچے کی کیا اطاعت کریں گے اور ان کی پیش بندی صحیح تھی چنانچہ اسی دن سے جب کہ اس کی روح پرواز ہوئی تھی سلطنت کی بت جھڑ شروع ہو گئی۔ اسی وجہ سے محمد شاہ لشکری کی موت کو خرابی دکن سے تعبیر کرتے ہیں اور انہی الفاظ سے اس کی تاریخِ وفات نکالی گئی ہے ؎

شہنشاہ جہاں شاہ محمد — کہ در بحرِ فنا ناگہ فرو شد

دکن چون شد خراب از رفتنِ او — خرابیِ دکن تاریخ او شد[1]

خرابیِ دکن کے معنے یہ تھے کہ مرکزی حکومت ہر روز کمزور ہونے لگی اور اس کے چاروں طرف ذی اقتدار لوگ سر اٹھانے لگے۔ یہ سرتابیاں تو محمد شاہ کے عہد سے شروع ہو گئی تھیں اور محمود گاواں کا قتل ان بغاوتوں کا سرچشمہ تھا۔ غالباً تیسری صفر ۸۸۷ھ (۱۴۸۲ء) کو مرحوم بادشاہ کی فاتحہ سوم کے بعد دربار تاج پوشی منعقد ہوا۔ نظام الملک بحری قوام الملک کبیر اور قوام الملک صغیر اور قاسم برید ترک دربار میں موجود تھے۔ شاہ محب اللہ اور شاہ حبیب اللہ نے جو اس زمانے کے مشائخینِ عظام تھے کمسن بادشاہ کو تخت فیروزہ پر بٹھایا اور اس کے سر پر تاج رکھا اور وزراء امرائے دربار نذر پیش کر کے اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ دیکھنے کو تو دربار کا رنگ وہی معلوم ہوتا تھا جو محمود شاہ کے

---

[1] فرشتہ مقالہ سوم ص ۳۶۱۔

یوں کے عہد میں پایا جاتا تھا لیکن اندرونی جذبات کو دیکھا جائے تو حالات وہ نہیں تھے بلکہ باغیانہ جذبات کی
یہ دو تند ہی تھیں اور بعض لوگوں نے چپکے سے کہہ ہی دیا کہ یوسف عادل خاں سوائی۔ دریا خاں۔ طوخاں اور
ملک جیسے امرائے کبار کی عدم موجودگی میں یہ دربار کیسے منعقد ہو سکتا ہے۔ دوسروں نے اس کا جواب یہ دیا کہ
امیر کے انتظار میں شاہی دربار کیونکر ملتوی ہو سکتا ہے، جب یہ لوگ آجائیں گے تو آیندہ دربار میں شریک ہو کر نذریں گذران سکتے ہیں۔
جواب سے مخالفین کی تشفی ہو سکتی تھی مگر اس گفتگو سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ملک میں بعض شخصیتیں ایسی ہیں جو بادشاہ کے
ن بدوش کھڑی ہو سکتی ہیں اور اپنا وقار منوا سکتی ہیں۔ یہ آیندہ کے سیاسی انتشار کا پیش خیمہ تھا۔ ملا عبد الکریم جو
یخ محمود شاہی کا مولف ہے وہ اس دربار میں موجود تھا وہ لکھتا ہے کہ دربار کی یہ گفتگو آنے والی بغاوتوں کی
ان دہی کر رہی تھی کہ سلطنت بہمنی کی بچی کچھی ٹوٹنے کو ہے۔[1]

رقابت کی جو آگ دلوں میں سلگ رہی تھی وہ کیسے بجھتی۔ ابھی بادشاہ کی تخت نشینی کو تین مہینے ہوئے تھے کہ جنگ وجدال کے
ر ظاہر ہونے لگے۔ یوسف عادل خاں۔ دریا خاں۔ فخر الملک کو دکن سے واپس آئے تو ان کے ساتھ ترکوں اور
دل کی چیدہ فوج تھی اور جب یہ لوگ قلعہ میں بادشاہ کے سلام اور مبارک باد کے لئے حاضر ہوئے تو ان کے
سپاہی قلعے کے اندر دارالامارہ میں داخل ہو گئے کیونکہ ان کو ڈر تھا کہ دربار میں تلوار نہ چل جائے۔ حالانکہ بہمنی روایات کے
بق شاہی دربار میں کوئی امیر اور وزیر اپنی محافظ فوج نہیں لا سکتا تھا اس وقت تو یہ بلا ٹل گئی لیکن نظام الملک
س کے ہوا خواہ اس ادھیڑ بن میں لگے ہوئے تھے کہ خواجہ محمود گاواں کی طرح یوسف عادل خاں کو نیست و نابود
یں کیونکہ اس وقت یوسف بساطِ سیاست کا بڑا مہرہ تھا اور محمود گاواں کی جگہ غیر دکھنی فریق کی معاونت
ہا تھا اس کے ہوتے ہوئے نظام الملک بحری کو اپنے اقتدار کا کیا اطمینان ہو سکتا تھا، اس نے قوام الملک کو
ترکوں کو مارنے کی بنیاد ہی کر دی چنانچہ ایک روز یوسف عادل خاں اور فتح اللہ عماد الملک کو شاہی احکام
یے گئے کہ وہ اپنی فوجیں بادشاہ کے ملاحظے میں پیش کریں۔ فتح اللہ تو اپنی فوج لے کر قلعے کے اندر آیا اور بادشاہ کے
نظے کے لئے پیش کر دی، لیکن یوسف عادل خاں قلعے کے باہر کھڑا رہا۔ اتنے میں قلعے کے دروازے بند کر دیئے گئے۔
ن خاں دکھنی جو یوسف عادل خاں کا دشمن تھا اس نے تلوار کے وار کر دیئے، قوام الملک کو مار دیا اور
دالملک کو نوال کو قید کر دیا اور ترکوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا، اور یہ آگ شہر میں بھی پھیل گئی، چنانچہ
پیدر میں تین روز تک میدانِ کارزار گرم رہا اور اس دار و گیر میں فریقین کے تین چار ہزار آدمی کھیت ہو گئے۔
خر علماء و مشائخینِ وقت نے بیچ میں پڑ کر اس آگ کو ٹھنڈا کیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں کے لئے اطمینان ہو گیا اس میں

---

[1] تاریخ محمود شاہی کا یہ بیان معدوم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ اصل تاریخ ناپید ہے۔

دکھنی فریق کے مقابلے میں ترکوں کا بہت نقصان ہوا۔ یوسف عادل خاں اور ترکوں نے یہ صلح بہت غنیمت سمجھی اور فوراً بیجاپور چلے گئے، کیونکہ اس وقت بیجاپور ان کا اچھا امن تھا۔

ترکوں کے بیدر سے ہٹنے سے نظام الملک بہت ذی اختیار ہوگیا اور اس نے اپنے ہواخواہوں کو اپنے گرد اپنے ہاتھ پیر مضبوط کرنا شروع کیا۔ اپنے بیٹے ملک احمد کو جنیر کا گورنر بنایا۔ فخر الملک دکھنی کو امیر الامراء بنایا اور خطاب دیا۔ فتح اللہ عماد الملک کو منصب وزارت اور دبیر جملہ کا عہدہ دیا گیا اور قاسم برید کو کوتوال کی خدمت۔ اگرچہ آخر الذکر ترک تھا لیکن سنی ہونے کی وجہ سے دکھنی فریق کے ساتھ شریک تھا کیونکہ غیر دکھنی فریق میں شیعہ تھے اس طرح مرکزی حکومت بالکلیہ دکھنی فریق کے ہاتھ میں تھی اور چار سال تک رہی۔ اس کو دکھنی انتہائی عروج کہنا چاہیئے لیکن یہ عروج کچھ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ نظام الملک کی اخلاقی کمزوریوں کی وجہ فضا تلخ اور سیاست بدتر ہونے لگی اس میں وزارتی ذمہ داریوں کی مطلق صلاحیت نہ تھی۔ خود اس کے اس کے دشمن ہوگئے اور بادشاہ کے کان بھرنے لگے کہ نظام الملک بادشاہ کو بےبس بنانا چاہتا ہے۔ ادھر مشرق اور مغرب میں بڑی بغاوتیں کھڑی ہوگئیں اور ان باغیوں کو یہ شکایت تھی کہ نظام الملک جیسا نااہل شخص سلطنت کے سیاہ و سفید پر قابض ہے۔ یہ لوگ اس کا اقتدار چھیننا چاہتے تھے۔ تلنگانے میں قوام الملک نے بغاوت کردی تو مغرب میں بہادر گیلانی بغاوت کر بیٹھا۔ محمود شاہ اور نظام الملک پہلے ورنگل گئے، ان کی آمد سے ڈر کر قوام الملک راجمندری کی طرف پیچھے ہٹ گیا لیکن اس دوران میں نظام الملک کو مارنے کی سازشیں ہو رہی تھیں۔ نظام الملک کے دشمن بادشاہ کے پاس جمع ہوگئے۔ یہ اجتماع بادشاہ کے لئے بہت ہمت افزا ثابت ہوا اور اس نے اشارہ کیا کہ کسی ترکیب سے نظام الملک کو مار دو۔ اب نظام الملک کو یہ خبر پہنچی تو وہ بیدر کی طرف بھاگا اور چاہا کہ شاہی خزانے پر قبضہ کرکے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرے۔ حالانکہ جنیر اس کی اچھی پناہ گاہ تھی جہاں اس کا بیٹا ملک گورنر تھا، جنیر بھاگتا تو اس کی جان بچ جاتی، بیدر میں اس کے بہتیرے دشمن تھے، خود دل پسند خاں جو شہر کی حفاظت پر مامور تھا اس کا دشمن تھا، وہ موقعہ کی تاک میں تھا۔ ایک روز مشورہ کرنے کے بہانے سے اس کو کمرے میں لے گیا اور ایک وار میں قتل کر دیا۔

ملک حسن نظام الملک بحری کے قتل سے سلطنت میں ایک اور رخنہ پڑگیا۔ نظام الملک وزارت کا اہل نہ تھا تاہم اس کی رہبری میں حکومت کے کل و پرزے جوں توں چل رہے تھے۔ کچھ نہیں تو اس کے اثر سے دکھنی فریق اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوجاتا تھا اس کے مرنے سے مرکزی حکومت متزلزل ہوگئی اس پر طرہ یہ ہوا کہ ایرانیوں اور ترکوں سے کام لینا شروع کیا، کیونکہ نظام الملک کے قتل سے بادشاہ اور دکھنی فریق میں بڑی خلیج حائل ہوگئی دکھنی جانتے تھے کہ خود بادشاہ نظام الملک کے قتل کا ذمہ دار ہے۔ اب بادشاہ کے لئے ایک ہی راستہ تھا کہ غیر ملکی

مہاراشٹر مقبوضات۔ چنانچہ مرکزی حکومت ترکوں اور ایرانیوں کے ہاتھ میں آگئی اس سے دکھنی فریق میں مخالفت کی آگ بھڑکنے لگی۔ اب اس فریق کے سامنے غیر دکھنی طاقت کو توڑنے کا ایک ہی ذریعہ تھا، یعنی خود بادشاہ کو ہی تلوار کے گھاٹ اتار دے۔ چنانچہ تمام دکھنی سرغنے اس وقت دل پسند خاں کے گرد جمع ہونے لگے ان کے ساتھ حبشی بھی تھے۔ چنانچہ پہلی ذیقعدہ سنہ ۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) کو یہ سازشی قلعے میں داخل ہوگئے۔ قلعے کے محافظ دستے کو پہلے سے فراہم کرلیا گیا تھا۔ جونہی یہ داخل ہوئے قلعے کا دروازہ بند کرلیا گیا تاکہ باہر سے ترک اور ایرانی اندر نہ آنے پائیں۔ جب حملہ شروع ہوا تو چند ترک و ایرانی بادشاہ کے پاس موجود تھے انھوں نے تیر و تفنگ سے مقابلہ کیا اور قلعے کے باہر بھی ترکوں کو اس حادثے کی خبر کردی چنانچہ باہر سے قاسم برید۔ اژدر خاں محمود گیلانی اور کشور خاں تین چار سو ترکوں کے ساتھ کمند ڈال کر قلعے میں داخل ہوگئے اور دکھنیوں کا مقابلہ کیا اور بادشاہ کی جان بچالی لیکن شہر میں بڑا کشت و خون ہوگیا۔ بادشاہ نے دکھنیوں کے قتلِ عام کا حکم دے دیا پھر کیا تھا تین روز تک جنگ کی آگ بھڑکتی رہی، دکھنیوں کا قتلِ عام ہوا اور ان کے مکان لوٹے گئے۔ آخر شاہ محب اللہ کے فرزندوں نے بادشاہ سے سفارش کرکے بیچ بچاؤ کیا۔

اس طریقے سے خونریزیاں تو ختم ہوگئیں لیکن اس زلزلے سے سلطنت کے در و دیوار ایسے ہل گئے تھے کہ پھر ان کی سنبھال مشکل ہوگئی۔ ایک طرف مغلوں اور ترکوں کے حوصلے بڑھ رہے تھے تو دوسری طرف خود بادشاہ کی عیش و عشرت بھی سلطنت کو گڑھے میں لے جا رہی تھی۔ دکھنیوں کی رستخیز سے جب ان کی جان بچ گئی تو وہ عیش و عشرت میں ایسے ڈوبے کہ دنوں تک ان کو نظم و نسق کی مطلق خبر نہیں ہوتی تھی۔ تختِ فیروزہ کے جواہر، جام و صراحی اور طنبورہ سے پرے نگاہ نہ جاتے تھے۔ سربرآوردہ ترک امرا اپنے بچاؤ کے لئے اپنے صوبوں کو چلے گئے اور جو لوگ مرکز میں رہ گئے تھے وہ بادشاہ کو بے بس کرکے اپنا اقتدار بڑھانے لگے۔ چنانچہ قاسم برید ترک جو پہلے معمولی سر نوبت تھا اور ملک حسن کی وزارت میں کوتوال ہوگیا تھا اب وزیرِ کل بن بیٹھا اور بیدر کے اطراف کی گورنری اپنے نام لکھالی اس کے علاوہ قندھار۔ کلیانی اودگیر کے قلعے اپنی جاگیر میں اینٹھ لئے۔ بادشاہ کی کمزوری اور قاسم برید کا غلبہ چاروں طرف بغاوت کی دعوت دے رہا تھا۔ اب صوبہ داروں کو موقع تھا کہ مرکزی حکومت سے رشتہ توڑ کر خود سر بن بیٹھے۔ چنانچہ ملک احمد جو ملک حسن نظام الملک بحری کا بیٹا اور مہاراشٹر کا گورنر تھا سنہ ۸۹۵ھ (۱۴۹۰ء) میں جنیر میں پانچ نوبت بجوا دیئے جو خود مختاری کا اعلان تھا، اور اس نے فتح اللہ عماد الملک اور یوسف عادل خاں کو بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی خود مختاری کا اعلان کردیں۔ چنانچہ ملک احمد کے ساتھ بیجاپور میں یوسف عادل خاں اور برار میں فتح اللہ عماد الملک بھی خود مختار بن بیٹھے۔ ایسے ہی گولکنڈے والی صوبہ داری جہاں سلطان قلی قطب الملک ہمدانی گورنری کر رہا تھا تو وہ ذرا دیر میں جاگی اس کی وجہ یہ تھی کہ قطب الملک میں جذبۂ وفاداری زیادہ تھا اسی وجہ سے سلطان قلی اس بات کو گوارا نہیں کرتا تھا کہ وہ محمود شاہ کے جیتے جی اس کی عنایات بھول جائے اور سرتابی کر بیٹھے اس وجہ سے گولکنڈے کی خود مختاری دوسرے صوبوں کے مقابلے میں اٹھارہ سال کے بعد

ہوئی۔ یعنی دوسرے تمام صوبے سنہ ۱۴۹۰ء میں خود مختار ہوئے تو گولکنڈہ ۹۲۴ھ ۱۵۱۸ء میں خود مختار ہوا۔

اب رہی بیدر والی چھوٹی قلمرو، تو وہ محض بے ہنگام حالات کی پیداوار تھی! اس کی ہستی کو ایک بے ہنگام تماشا کہنا چاہیئے۔ اس میں نہ تو لسانی تقسیم یہاں تھی نہ قومی جذبہ، بلکہ اس میں وزرائے وقت کی غداری تھی تو دوسری طرف محمود شاہ کی کمزوری کہ وہ دیکھتے دیکھتے قاسم برید کی چال میں پھنس گیا۔ جب دکن کے صوبہ دار اپنے دربار میں خود مختار بن بیٹھے تو وہاں بیدر کا سر نوبت قاسم برید بھی مقتدر ہو گیا۔ چونکہ یہ ملک حسن بحری کے طبقے میں شامل تھا ملک حسن نے اس کو بیدر کا کوتوال بنا دیا تھا، اور جب ملک حسن کا خاتمہ ہو گیا تو وہ محمود شاہ پر اثر ڈال کر وزیر کل ہو گیا۔ ایک مقتدرانہ حیثیت حاصل کر لی اور بادشاہ کو کٹھ پتلی بنا دیا اور بادشاہ کے نام سے خود حکومت کرنے لگا لیکن یہ چھوٹی بساط تھی کہ اس کو ایک قلمرو کہتے ہوئے پس و پیش ہوتا ہے۔ اس میں صرف چار یا پانچ اضلاع یعنی قندھار، اوڈگیر، چاکنہ، کلیانی اور اودگیر کرناٹک کے اضلاع شامل تھے۔[1] اس قلمرو کی ایک بدنما لقب دعویٰ یہ تھی کہ بریدیوں نے اس بادشاہوں کو نہ صرف بے بس کر دیا بلکہ ان کے عظیم الشان تمدنی آثار مٹانے سے بھی دریغ نہیں کیا تاکہ لوگ بہمنیوں اور بریدیوں کو یاد رکھیں۔ اس کے علاوہ اپنی چھوٹی سی بساط کو آنے والوں سے بچانے کے لیے سلاطین دکن کو آپس میں لڑا دیتے تھے تاکہ ان کے ہمسایہ سلاطین جنگ و جدل میں پھنس کر ایسے کمزور ہو جائیں کہ بیدر آنے کا خیال نہ کریں! مورخ بریدیوں کو دکن کی لومڑی کہتے ہیں۔ قاسم برید کا بیٹا امیر برید تھا جو باپ کے مرنے کے بعد سنہ ۱۵۰۴ء مقتدر ہوا۔ اس نے محمود شاہ کو اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ بقول فرشتہ[1] "آنحضرت دل از مال و ملک در دست امیر برید گرفتار گشتہ در میان مردہا نہ در میان زندہ محسوب بود"۔ علی بن عزیز اللہ کہتا ہے "در اواخر ایام سلطنت بالکلیہ عنانِ اختیار از قبضۂ اقتدار سلطان بیرون رفتہ ملک برید ...... در گوشۂ عزلت دا انزوا نشاشیدہ"[2] محمود شاہ کی بے بسی ذیل کے شعر سے معلوم ہوتی ہے جو وہ کبھی کبھی پڑھتا مصائب کا اظہار کرتا تھا ؎

در بحرِ غم فتادم و امواج بے عدد　　　تاچند دست و پا بزنم یا علی مدد

(باقی آیندہ)

---

[1] فرشتہ مقالہ سوم ص ۳۷۴　[2] برہان مآثر ص ۱۶۶۔

عبدالودود

دیوانِ نسیم دہلوی

نسیم دہلوی کے دیوان کا نام دفتر شگرف = ۱۲۸۴ ہے۔ صفحہ ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۲۸۵ھ میں "نواب میرزا محمد تقی خاں" کی فرمائش سے محمد مصطفیٰ خاں کے مطبع مصطفائی میں چھپا تھا۔ صفحات ۲ و ۳ میں دیباچہ ہے جو نسیم کے شاگرد تسلیم کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے بیانات ذیل توجہ طلب ہیں۔

"۱۲۴۲ھ میں میرزا محمد اصغر علی خاں نسیم ابن نواب آقا علی خاں تا چند (کذا) شاگرد حکیم مومن خاں ... دہلی سے لکھنؤ میں تشریف فرما ہوئے۔ غلغلہ شیوا بیانی آوازۂ نکتہ دانی بلند ہوا اکثر صغار و کبار و امرائے روزگار فیض یاب تلمذ حضرت والا ہوئے۔ ہر طرف شاعری کی دھوم دھام ہوئی۔ عالم بندی کی حقیقت معلوم ہوئی۔ فصاحت نے شگی زبان پر زہر کھایا بلاغت نے زمین شعر کو آسمان بنایا واقعی چھپی بندش میں کچھ کلام نہیں تمام نہیں۔ بایں ہمہ ... کبھی ترتیب دیوان کا خیال نہ آیا بسبب وارستہ مزاجی اور عالی ہمتی کے کچھ فراہم نہ فرمایا ... حقیقۃً عالم ہے ... بے نشان کئی مثنویاں موزوں فرمائیں کوئی ناتمام رہی کسی کا پتہ نہیں۔ ایک جلد لغت لیلیٰ (کذا) کی باقی رہی۔ نظر ثانی کی نوبت نہ آئی چھپ گئی۔ آخر کو ۱۲۸۱ھ بارہویں ... رمضان ... کو ... حریم حرم عالم جاودانی میں لبیک گویاں حاضر ہوئے ... الحال ... نواب محمد تقی خاں بہادر ... ابن نواب صاحب اصغر علی خاں ابن نواب محمد علی خاں بہادر سالار جنگ ... نے کچھ کلام پرچہ پرچہ جابجا سے فراہم کیا ... ایک دیوان ترتیب دیا ... مطبع مصطفائی میں چھپنے کی اجازت دی۔ مصارف کی کفالت کی۔"

صفحات ۴ و ۵ میں اسیر شمس شاگرد ناسخ، متنوع شاگرد رشک، علی محمد خاں دل شاگرد نواب ظریف خاں عیش شاگرد آتش، فضل علی خاں شوق ابن ... اور تلامذۂ نسیم عاشق، باسط علی شوکت، ضیاء الدین لال شگفتہ، آفریں شادی لال چمن، محمد حسین ملال اور اصغر علی بیگ گوہر کے قطعات تاریخ ...

نو کا دبستان شاعری صفحہ ۲۰ میں ہے: "حضرت کا بیان ہے کہ ۱۲۱۳ھ میں ... پیدا ہوئے ... ۱۲۴۱ھ میں شکر گذار سے کچھ پہلے لکھنؤ چلے آئے" اس سے صریحاً سالِ ولادت دو سال قبل مراد ہے۔ اور یہ قطعاً غلط ہے۔ نسیم کے استاد مومن کی سالِ ولادت کا لحاظ کرتے ہوئے ۱۲۱۴ھ جس کی کوئی سند موجود نہیں، قابلِ قبول ہے۔ تہ مبالغہ ... ایک ... نظم اردو میں ... باقی جلدیں شاید ... لکھی ہیں۔

ہیں۔ ولی نے "اے استاد کمالِ سخن" سے تاریخ نکالی ہے۔

صفحہ (۶) سے دیوان شروع ہوتا ہے اور اس کا آغاز قصائد سے ہوتا ہے جن کے ابیات کی مجموعی تعداد ۵۰۶ ہے پہلا مصرع یہ ہے: "پیرہن میں ہے مرا شاہدِ مضموں پنہاں" واجد علی شاہ کی مدح میں ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

صورت شعر میں بتیس طرح کے ہیں رنگ
علم استاد سے آگاہ نہیں ہر ناداں

چند اعداد افاعیل کو کہتے ہیں عروض
ان کے پڑھ لینے سے شاعر نہیں ہوتا انساں

جہلا نے جو پڑھی کوئی کتاب اس فن کی
بن گئے بے خلش شکردہ استادِ زماں

کہتے پھرتے ہیں یہ کیا بحر ہے اور دائرہ کیا
دیکھو ہم نے بھی طبیعت سے نکالی اوزاں

دیکھ سیفی کے رسالے کو بنے خود سیفی
ہیں تو بے قاعدہ لیکن وہ ہوئے قاعدہ داں

لفظ تجنیس نہ تحقیق سمجھتے ہیں کچھ
خرم اور خزم کی تحقیق میں اکثر حیراں

صنعت قافیہ میں ذکر اگر آ جائے
پوچھیں اقسام روی کی تو نہ ثابت ہو نشاں

ہو جو ترکیب مضافی کی ضرورت واقع
صورت آئینہ وہ جائیں سراپا حیراں

پوچھے گر کوئی تو ارشاد ہو یہ از رہِ طعن
فارسی گو نہیں اردو کے ہیں ہم قاعدہ داں

کسی استاد کا دیوان اگر کوئی پڑھے
ایک بھی بیت کے معنی نہ ادا ہوں یکساں

کہتے ہیں عرفی و فردوسی و خاقانی کو
جل گئی روح تک ان کی وہ کہے شعر تپاں

صدقے ان پر جو نہیں علم سخن سے آگاہ
خوش بہت ہوتے ہیں کہیے اگر استاد زماں

اے خدا کیا ہوئے استادِ سخن فہم افسوس
کیسے یہ خوبی اعمال سے دیکھے انساں

وہ عروضی نہیں جو فعل و فعولن جانے
پوچھے مجھ سے تو بتاؤں تجھے کچھ اس کا نشاں

پہلے تخییل کہ آغاز ہے اس پر موقوف
جس کو علامۂ طوسی نے کیا زیبِ بیاں

اس کی اقسام ہیں جو حضرتِ عرفی[1] نے لکھا
شک نہیں اس میں کسی طرح سمجھ رکھ لے جاں

شعر بھی تین[۳] ہیں مضمونی و حالی کیفی
ان کے اجتماع سے ابیات میں آئے نقصاں

پھر ہے میزان معانی کہ تلے ہر مضموں
بیت مطلب میں برابر نہ ہوئے اس کی بہاں

جب ملی ان سے فراغت تو پڑے جھگڑا اور
پاک ہیں جملہ باہم سے زوائد پنہاں

دیکھ ہے مفرد اصلی سے مرکب کیا کیا
تثنیہ جمع ہو ہر واحد ذاتی ہی کہاں

---

[1] عرفی کی کوئی کتاب جس میں اقسام تخییل کا ذکر ہو میری نظر سے نہیں گزری۔

قائمہ کیا مجھے اس ہرزہ خیالی سے لقیم — ہے تعلق صفت شعلہ زن ہلال زباں
ربط کھتی جو تخیل مجسم سے زباں — تلوے آتے ہیں دم فکر ہزاروں ساماں
نو عروسی کے مزے تجنیس بندش میں دیکھ — لفظ بھی میرے معانی کی طرح ہیں نازاں
اس قدر بخشش پیہم سے ہوا ہے شہرہ — بھنہ چھپا نے لگا افسانۂ حسن خوباں
اب تو دیوانے بھی کھاتے ہیں گہر کو میں — دیکھتے ہیں دُر عوض سنگ کنار طفلاں
شوکتیں[*] چہرۂ روشن ہیں وہ دیں خالق نے — حسن کے رعب سے خورشید ہو لرزاں
از رہ خویشی جگر بستہ احبّ باہم — صورت غنچہ و گل سب ہیں شاداں خنداں

دوسرا قصیدہ بھی واجد علی شاہ ہی کی مدح میں ہے۔ اس کے بھی بعض ابیات ملاحظہ ہوں:-

تن سے مدوہیں آنکھ سے نیندیں کنارہ کش ہیں — قصر خالی دیکھ کر ہیں جسم فاقوں کے مکاں
فکر شاعر سے جو بدلی صورت دو بدل — ضرب آخر میں ہوا ہر فاعلاتن فاعلاں
بیں تیمم خسروِ ملک سخن خامے کو روک — اور صورت پر دکھا اب حسن مضمون جہاں
ربط ہفت اقسام بندش اور نہ تخییل صاف — تا لبشیں دیتا ہے مثل جوہر وقت امتحاں
صدر مطلع رکن حشوی ابتدا ضرب و عروض — قید ہیں میزان لفظی میں اگر ڈھونڈو نشاں
قالب ترکیب لفظی میں نہیں دخل فضول — ذہن میں آتا نہیں بھولے سے حرف رائگاں
کیا کوئی سمجھے گا، یہ رمز سخن کچھ اور ہے — ہاں وہی سمجھے تو سمجھو میں ہوں جس کا مدح خواں
حاسد و نافہم و جاہل سے نہیں امید داد — ذرۂ ناچیز کیا جانے کمال آسماں

چھٹا قصیدہ شرف الدولہ مظفر الملک محمد ابراہیم خاں بہادر مستقیم جنگ کی مدح میں ہیں۔ بعض اشعار:

قصد کے ہوتے ہیں در پردہ جو کچھ کچھ ایما — ضبط اور نطق میں ہوتی ہے بہم ردّ و بدل
آمد و کہتی ہے کیا آپ ہوئے زاہد خشک — کہ پڑے جودت خاطر میں ہزاروں ہی خلل
طعنے دیتی ہے تمنا کہ مبارک باشد — اب تو دا خط سے زیادہ ہیں جبیں پر بل
جو صلے کہتے ہیں اس بے ادبی سے گزرو — کہہ دو ناصح سے کہ جا بزم محبت سے نکل
لاجرم مرضی احباب مناسب سمجھا — طبع کو میل ہوا جانب تمہید غزل
اتنے میں آ کے مضامین قصائد نے کہا — صورت و عدۂ دیدو نہ گئے آج بدل

---

[*] شوکتیں، رغبتیں، مندیں وغیرہ میں صیغۂ جمع بلا ضرورت ہے یہ بھی شاعر خلیل تخلص

ناگہاں غلغلہ فسردہ دلی تک جو پہنچ آیا — کھول دی نشترِ مضموں نے سخن کی اکحل
ٹھہرو کذا، او غلغلہ کہ ایک دم تکلیفِ سخن — فکرِ صافی سے ہوا آئینۂ دل صیقل
شور ہے چار طرف فصلِ بہار آ پہنچی — جوشِ مستی میں چٹکتے ہیں امنڈ کر بادل
ناز کرتی ہوئی آتی ہیں ہوا میں بطِ مے — کھل رہے ہیں دلِ مشتاق کے سینوں میں بغل
رنگ سے ہو جاتی ہے ساغر میں الٹ کر ہی شراب — سبز ہو جاتی ہے مینا کی طرح سے بوتل
ہیں حکایاتِ جگر سوز کے باہم چرچے — شغلِ واسوخت کسی جا کہیں افسانۂ نل
شرف الدولہ ہے نواب فلک قدر ایسا — کہ نہیں حیزِ امکاں میں کوئی آج مثل
روح دشمن کی ہوئی ہستی و عالم سے مردود — دو کشاکش میں رہے صورتِ ادنیٰ و رذل
خصمت اے جوش کہ ہے اور طرف خیالِ جل — بچھ گیا فکرِ معلیٰ کا فلک پر دنگل
گر نہ آمیزشِ تجویز سے پائیں ترتیب — حشر تک دفترِ اقلیم رہیں سب مہمل
راست پھر کج ہو جو آدابِ حضوری پائے — چیں جبینوں سے نکل جائے سرِ زلف کے بل
کن سے لے تا دمِ برخیز ہوا مجمعِ شب — تب کہیں قالبِ ہموار نے پایا ہیکل
دوستوں کے لیے جنگل میں ہو منگل ہر روز — دشمنوں کے لیے منگل میں ہو سونا جنگل

باقی ماندہ قصائد کے ممدوحین : ظفر الدولہ معتبر الملک رفیع المنزلت علی اصغر خاں[1] بہادر نامر جنگ (۲)؛ رکن الدولہ (۱)، وصی علی خاں بہادر (۲) حضور محل (۱)۔

شوخیاں کرتی ہے کیا کیا دمِ رفتار نظر — شرم کہتی ہے بچے گی مری عصمت کیوں کر
آرزو دینے لگی پاسِ ادب کو طعنے — آپ کو حضرتِ تقویٰ کا مبارک رہے گھر

برشتگی ہے نگہ میں پہ گرم ہے جوبن — فروغِ عارضِ گل ہے فتیلۂ روشن
بہت دنوں میں قدم رنجگی بہار نے کی — کہ ہر طرف ہے گل افشاں زمانۂ گلشن
حجابِ دید سے ہوتی ہیں منعقد غنچے — دکھا رہی ہے مزے نوعروسیٔ گلشن

فکرِ صائب کی بدولت اصفہاں ہے لکھنؤ — ہے مرے فیضِ سخن سے عزتِ ہندوستاں
چاہتا ہوں تم کہو اتنا کہ ہاں پھر کیا ہوا — کہہ رہا ہوں دیر سے میں اپنے دل کی داستاں

وسعتِ حوصلہ کی حد نہیں ہوتی معلوم — ہر زیادہ نظر آتا ہے نگاہوں میں کم

---

[1] یہ بھی شاعر اور شاگردِ آتش ہیں

بہار آئی کھلے ہیں غنچے نمو پائی ہے چمن کا سماں — وظیفہ گل ہے ان دنوں میں تراغۂ عندلیبِ لیلا
فسانۂ غم نے بعد مدت اثر دکھایا ہے غفلتوں کا — ہوئے ہیں مصروف چارہ سازی دلِ تپاں خاطرِ پریشاں
کھلی جو سنبل کی زلف پرخم مزاج از خود ہوئے ہیں برہم — طواف میں ہے نگاہ پیہم نثار ہوتے ہیں تحفہ جاں
سبو و ساغر چھلکے ہے ہیں بہک رہی ہے زبان پی میں — سرور مے سے ہے لغزش پا پڑے میں افتادگی کے جاں

خاطر میں آکے قصد جنوں منہ میں جاکے بات — پہنچوں جو تا بگوش مخاطب ہو بے قرار
تا آسمان خطاب معلی کی ہے پکار — بانوئے شہ حضور محل صاحب وقار
ایفائے وعدہ میں نہ کمی کیجئے حضور — فضل خدا سے آج موافق ہے روزگار

ما نند شانہ ہے خلشوں پہ جو روزگار ۳۸، محفوظ ہے ہر ایک رفیق اور اہل کار ۳۹، کسی سے سرخرو ہونا ۴۰، حلقہ ہائے
س کو ہو رحم جانب دلہائے بیقرار، نگہ میں لاکھوں کرامتیں ہیں زبان میں بیحد عنایتیں ہیں ۳۸، فرمان پذیر، ترقیں پرائے
عفو دعا کے بھی اشعار چند سن لیں ہم (اس کے بعد صرف ۲ شعر) ۳۷، الٰہی تا کہ زمین پر ہو نور کا عالم، حضور قلب، جور و ستم
ں طرح سے، پھری عنانِ قلم، مشاطگی معنی ۳۵، عقدہائے اہم، جمال شاہد تجویز میں دو حسن رقم، مضطرب الحال، حاتم ق، سدا، بحر رحمت کے
درس اشعار ہوتے ہیں رقم ۳۴، دنیا میں بخیل آدمی ہے اس کا ممنونِ کرم، پتا دینا، دھڑکا نہ مرنے کا رہے دیکھا کرے حسن قدم،
ری (کذا)، سارا بھرم جاتا رہے، کیا دخل مثل عمر گذشتہ پھر آسکے ۳۳، کیا کیا خاطر بے تاب نے تفویض ظلم ۳۲، موقوف کریہ
سلسلہ، ذکر این و آں ۳۲، مخلصی ۳۱، پہنچے شاعر کے تصور کا فلک پر پرچم، رفعت حوصلہ، جیسے اوزان رباعی پہ تصدق احرم، عقیمہ
۳، پیدائشِ نم، غبن ورمل، قلم اٹھتا ہے، طرۂ زریں، حدِ قدم، ہرزہ پیمائی ۲۹، وسعت حوصلہ، معدود، لغزشیں کرنا ۲۸، خانۂ
خاوجود، نصب ہونا، زری، ہوں قصیدے میں غزل کی کچھ ادا رنگینیاں (درس کہ ق قدسیاں)، شوکت افزا ۲۷، مور کو
نتِ سلیمانی پہ ہو نقل مکان، جن میں لہراتی ہیں میدان ثنا کی گردشیں ۲۷، فیض مطوّل ۲۶، جلوہ فزا، آثار (فعل جمع کے ساتھ)
بن بکار، ذلیل اور خوار ۲۵، زنارت، مہریں، سینہ شگاف، قدم پہ سر کو رکھے پھیل چرخ بے تکرار ۲۴، شوخی بارِ زبان ہے
ثبت معقول ناطق اسرار، کشیدہ بینی روشن پہ کرتی ہے اظہار، کشیدہ مزاج، تصوران کے گئے ہوتی ہے صیقل الابصار، صاحب جوش
۲، گھڑی گھڑی ہے زیادہ ترقی دیدار، مدح خیز، زاییدگی، سلسلہ وار، جوشِ بذل، تسلسلِ انظار، کہ نعرئی ہیں، نقاد کمیٖد
نچھاور، ادب شعار ۲۲، ہزار طرح سے خاطر میں ہے لحاظ سخن، وحید زمن، دو زبان میں قفل دہن، شوکت خاطر ہوائے
بے ادبی ہے تہنیہ میکار موثر دل، دکھاؤں اور طرح سے کلام کا جوبن، فن یاد ہونا، حضرت من، پرورش اضطراب، حدیث
دغلی ہے قبول خاطر خلق ۲۱، مردن، احتیاج ش، دیکھ لیں صورت اصلی کو مزاج ابتر ۲۰، گدگداتا، پنھاتا ۱۹، جلانے
الے کھٹ سے ہوں رغبتیں گھور رہی ہیں طرف بے ادبی ۱۸، تو ہے خود رفتہ آئے کہیں ایمان میں خلل، اول دا خر کرتی ہے

اک بعد اقل، ایک پرواز میں ہو ہمسفر قوت شل، جوش الفاظ سے کرتا ہے خلش کی رمزیں، سنبل ۱۶، کچھ اشاروں میں بتا دیتا ہوں میں طرز بدل ۱۷، بے تیش ہفت خزائن ۴۹، ہیکل ث، نہ رہے محفظہ ہر میں اضداد فلل ۱۸، قدرت حق کا تماشہ ہے نہ جادو نہ عمل، ہاتھ آئے جنوں کے لئے ترکیب جل، بیضۂ چرخ بنے آبلۂ پائے نل، صبح نے منہ پہ سیاہ دامن شب کا آنچل، خیال مختل ۱۸، الٰہی خدا ناکہ رہیں رات سے دن دست و بغل، چشم حیا خیز ۱۹، گھڑیاں گنا، روائیں اوڑھ لیں، دم نظارہ صفیں کی صفیں رہیں برہم ۳۶، ناطا قتی ۱۱۔

کامیاب قصیدہ نگاری کے لئے جوش، قوت اور تعمیری صلاحیت کی ضرورت ہے۔ نسیم کے یہاں اس کی کمی ہے۔ بعض قصائد میں انھوں نے محض عروض دانی کے اظہار کے لئے مصطلحات عروض استعمال کئے ہیں۔ ان کا یہ قول صحیح نہیں کہ عروضی ہونے کے لئے "فعل فعولن" جاننا کافی نہیں، سب سے مقدم تخییل ہے۔ عروضی ہونے کے لئے فن سے واقفیت کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ شاید نسیم یہ کہنا چاہتے تھے کہ شاعر ہونے کے لئے عروض دانی کافی نہیں۔ ان کے یہاں ایطائے جلی بھی موجود ہے، چنانچہ ایک قصیدے میں پہلے خوباں بطور قافیہ آیا ہے اور اس کے معاً بعد طفلاں ملتا ہے۔ ایطائے جلی کی اور مثالیں بھی ان کے یہاں موجود ہیں۔

صفحہ ۴۰ قصائد کے بعد دو رباعیاں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

انساں کا جو کذب پر شعار آتا ہے — خاطر یہ ہر ایک کی غبار آتا ہے

پر وعدۂ یار کچھ عجب شئے ہے نسیم — گر جھوٹ ہو اعتبار آ جاتا ہے

صفحہ ۴۱ میں نام کتاب و مصنف و مطبع وغیرہ درج ہے اور صفحہ ۴۲ تا صفحہ ۲۳۵ غزلیں ہیں جن میں کہیں کہیں فردیات اور ایک زمین کے دو دو شعر شامل ہیں، حالانکہ غزلیات کے بعد کچھ اشعار بعنوان متفرقات صفحہ ۲۳۵ تا صفحہ ۲۳۷ میں مرقوم ہیں۔

سب رس کا زور نمبر

۱ - یہ مبالغہ نہیں کہ سب رس کے اس نمبر کو ایک اہم دستاویز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔
"قومی زبان" حیدرآباد

۲ - سب رس نے یہ نمبر شایع کر کے اپنا حق ادا کیا ہے جسے صرف وہی ادا کر سکتا تھا۔
"کتابی دنیا" کراچی

۳ - جو شخص بھی ڈاکٹر زور مرحوم کے متعلق کسی حیثیت سے تحقیقی کام کرنا چاہے گا اس کے لئے اس نمبر کا مطالعہ ناگزیر ہو گا۔
پروفیسر سید احتشام حسین "شاہکار" الہ آباد

پچاس سے زائد تصاویر، صفحات ۴۰۰، قیمت چھ روپے

ایوان اردو - ادارۂ ادبیات اردو - خیریت آباد - حیدرآباد نمبر ۴

ڈاکٹر ممتاز احمد

نیا سورج نئی کرنیں اردو شاعری میں

ہر وہ شخص جسے اردو شاعری سے کچھ بھی دلچسپی رہی ہے اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہے کہ اردو شاعری نے زمین اور سانچہ فارسی شاعری سے اکتساب کیا ہے اور شاید اسی اکتساب کی پاداش ہے کہ اردو شاعری اب تک اپنی ترقی کی اس منزل پر نہیں پہنچی ہے جہاں پہنچ کر دنیا کے بزرگ شعری ادب سے اپنی آنکھ ملا سکے۔

بہر حال یہ حقیقت حال تھی۔ اور ہم آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ ان ہی مروجہ اسالیب اور مضامین کی وجہ سے تنگ (آکر) محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نے اردو شاعری کے لئے راہِ نجات ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب قائم کی اور اسی انجمن کے جلسے میں آپ نے جدید نظریہ شعر کو بھی پیش کیا۔ علاوہ بریں اس انجمن کی طرف سے جو مشاعرے ہوا کرتے تھے اس میں مصرعہ طرح کے عوض نظم لکھنے کے لئے موضوع دیئے جانے لگے۔

اسی "انجمن پنجاب" کی آواز پر مولانا حالی نے بھی لبیک کہا اور عملی طور پر اس مشاعرے کے لئے "برکھا رت" "امید" "انصاف" "حب وطن" جیسے مختلف النوع موضوعات پر مشتمل نظمیں بھی لکھیں۔ حالی سے شعر متاثر ہوئے اور انھوں نے قومی موضوعات پر نظمیں لکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے ناول "فلپانا" کو بھی غیر مقفی نظم کی صورت میں ڈرامائی لباس پہنایا۔ مولانا شبلی نے بھی اردو شاعری کے ذخیرے سے بے اطمینانی ظاہر کی اور اسے بجا طور پر خیال بانے پارین "سے پُر" سمجھا۔ ان بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ خاطر خواہ نظر آنے لگا۔ اب تک اردو شاعری میں روایتی عشق اور حسن بے ثباتی دنیا، محاورات اور ضرب الامثال کے بھنور میں جو پھنسی ہوئی تھی اس میں نمایاں کمی آنے لگی۔ آزاد، حالی، شبلی اور شرر میں قومی اور ملی مضامین سے مملو ہو کر گرد و پیش کو متاثر کرنے لگیں۔ اب اردو شاعری کے پرانے استعاروں میں نئے معانی نظر آنے لگے اور "نیفس" اب درد دل سے قوم کا درد سمجھا جانے لگا۔ ذلت اور فقیر سے مراد محبوب کے دربار میں رسائی یا نارسائی کے عوض اقتصادی بدحالی یا بدحالی مقرر ہوئی۔ ان بزرگوں نے اخلاق، مناظر فطرت اور حب الوطنی کے جذبے کو استعارے میں پیش کیا۔

اسمٰعیل میرٹھی نے مخصوص طور پر بچوں کے لئے نظمیں لکھیں۔ انھوں نے انگریزی نظموں کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ بے قافیہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اسی کے ہم نام ابو البحر اسمٰعیل دانا پوری نے بھی بچوں کے لئے نظمیں لکھیں۔ "چراغِ مکتب" ان کی مشہور نظم ہے۔

اکبر نے اردو شاعری میں موضوع کو بے پناہ وسعت دی ان کی شاعری عہد جدید کا ایسا شعری مرقع ہے جس میں اس عہد کی تقریباً

تمام تحریکات کے نقش و نگار موجود ہیں۔ اکبر نے بے قافیہ نظمیں بھی لکھی ہیں ان کا اصل مقصد قوم کو مغربی تہذیب کے اثر سے محفوظ رکھنا ہے

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے — بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابن بھی ہے
لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں اے ہندی — یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون ہے

شوق قدوائی نے اردو شاعری میں پاکیزہ نسوانی جذبات کی پیش کش کے ساتھ ساتھ "سائنس اینڈ ریلیجن" جیسے خشک پر بھی شاعرانہ شگفتگی اور آراستگی سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کا مسدس "لیل و نہار" اور منظوم ڈرامہ "قاسم و زہرا" مشہور ہیں۔ آزاد اور عظمت نے انگریزی وضع کے ترکیب بند اور اسٹینزا میں نظمیں لکھی ہیں۔ اور ہندی بحریں بھی استعمال کی ہیں۔ نظم نے قصیدہ دنیا کی بزرگ پر لکھا ہے۔ اور اپنے قصیدوں میں بند کا استعمال کیا ہے۔ آنحضرت صلعم کی حیات مقدس کے مختلف پہلوؤں پر ان کا قصیدہ بڑا اہم اقبال اردو شاعری میں ایک نئے مرحلۂ شوق کے ساتھ آئے انھوں نے اہل نظر ... کی حقیقت کو سمجھنے کی دعوت دی مقصود ہونے کے لئے سوز حیات ابدی ضروری قرار دیا۔ شاعری کی ایسی لے اور مغنی کے ایسے نفس کو جس سے چمن افسردہ ہو بیکار کہا۔ غرض اقبال نے اردو شاعری کو ایک نیا رنگ عطا کیا۔ جس سے اردو شاعری ہنوز بے بہرہ تھی۔ ان کی شاعری سے اردو ہیئت اور مواد دونوں لحاظ سے جلیل و جمیل بن گئی۔

اقبال کے اثر سے اب اردو شاعروں کی نظر حیات و کائنات کے مسائل پر اٹھنے لگی "یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ" کے تخیل سے نوجوان دماغ خصوصاً سرشار نظر آنے لگے۔ تغزل اور تعشق کی فرسودہ خیالی اب خام خیالی کی تصویر نظر آنے لگی۔ مناظر فطرت کائنات کے رازہائے حقایق کی پردہ دری کی تمنا انگڑائی لینے لگی۔ دوسری طرف سودیشی اور کھدر کی تحریک سیلف گورنمنٹ اور ہوم رول کی تحریکوں نے قومیت اور وطنیت کا شدید احساس دلوں میں پیدا کیا۔ چنانچہ وحید الدین سلیم اپنی شاعری کے ذریعہ پیام فطرت کے ساتھ ساتھ مظاہر فطرت کو بھی بیان کیا۔ حسرت موہانی نے اردو شاعری میں عشق کی روشنی شامل کی۔ فانی کی نالہ و فریاد بھری دنیا کو اصغر گونڈوی نے شرار معنوی سے پُر نور کیا۔ ساغر نے اردو شاعری میں ہندی تلمیحات اور ہندی بحروں کا استعمال کیا۔ جمیل مظہری نے بدیسی گیتوں سے بھارت ماتا کی اس بیٹی اردو شاعری کو نجات دلائی۔ اور اردو شاعری میں تشبیہات ہند و معانی مقتضا قائم کی۔ فراق نے اردو شاعری کو ایک نیا درد و گداز اور ان ہی کی زبان میں ایک چھیلا پن اس کا حسن دیا۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے "سوز تقریر کی شمشیر" کو "حسن تحریر کی تقدیر" بنا کر اردو شاعری کے فنی حسن میں اضافہ کیا عظمت اللہ خاں نے اردو شاعری میں ہندی اور سنسکرت پنگل کا استعمال کیا۔ اور اپنی نظموں میں جنگلوں کے کامیاب اور تجربے بھی کئے ہیں۔

جوش نے ابھی تیشنل نظموں سے لیکر عشقیہ اور جذباتی اور تقریباً ہر طرح کی نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن جوش اردو شاعری میں اپنے الفاظ نئی تراکیب اور نئی اصطلاحوں کی وجہ سے یاد کئے جائیں گے ان چیزوں کے علاوہ جوش اب تک اردو شاعری میں کچھ اضافہ نہ کر سکے۔ جگر سے اردو شاعری ایک نئے کیف اور مدہوشی کی لہر سے مانوس ہوئی۔ منتی لکھنوی نے الہ آباد و جون پور اور بھی ...

مقامات کے جغرافیائی حالات پیش کئے۔" لندنی معشوقہ اور دہلوی عاشق" ان کے شدید نصب العین کی نمائندہ نظم ہے۔ سیماب کی نظمیں بھی اخلاقی اور سیاسی مضامین سے پُر ملتی ہیں۔" قبروں کے غلط کتبے" ان کی مشہور نظم ہے حفیظ جالندھری نے اردو شاعری میں گیت کے اضافے کئے ہیں۔ ان گیتوں کی وجہ سے اردو شاعری میں ہندی کے سلیس الفاظ اور ہندوستانی زندگی کا رسیلا پن آگیا۔ اختر شیرانی نے وطن دوستی اور حسن فطرت کو ایک نئی ترکیب سے مرصع کرکے اردو شاعری میں پیش کیا۔ مرزا ہادی رسوا نے" لیلیٰ مجنوں" نام سے ایک منظوم ڈرامہ اردو کی تمام مروجہ بحروں میں لکھا۔ اور یگانہ نے رباعیات میں خصوصاً انگریزی کے طور پر سلنگ کا استعمال کیا۔ سرور جہان آبادی نے اردو شاعری میں مقامی رنگ بھرا۔ اور اس کو ایک زبردست وطنی احساس بخشا۔ انھوں نے کالی داس کی نظموں کو بھی اردو کا لباس پہنایا۔ چکبست نے بھی قوم اور وطن کی محبت کے نغمے گائے۔ فطری مناظر اور غیر مذہبی عقائد کا غیر متعصبانہ اظہار کیا۔ موہن سنگھ دیوانہ اور جگت موہن لال رواں نے اردو شاعری میں ہندو مذہب، روایات، عقائد، اور اس کی تاریخ کو پیش کرکے قابل قدر اضافہ کیا۔ اسی طرح تلوک چند محروم نے باباگرونانک اور رامائن کے بعض سین کو اردو نظموں میں پیش کیا۔ آنند نرائن ملا نے اردو شاعری کو وسیع المشربی اور ہمہ گیری عطا کی۔ روش صدیقی نے نظم کی پیش کش کے لئے ترجیع بند کا پیمانہ اختیار کیا۔

اس طرح اردو شاعری کا میدان گوناگون جذبات، مناظر فطرت، وطن دوستی اور وسیع المشربی کے ہمہ گیر اوصاف اور احساسات سے وسعت حاصل کر رہا تھا کہ اردو شاعری کے میدان میں ایک نیا گروہ داخل ہوا۔ اس نے گلتے ہوئے ناسور اور بہتی ہوئی پیپ اور کراہتی ہوئی انسانیت کے نقشے کو شاعری میں پیش کرنا مدعائے شاعری سمجھا۔ اس نے جاگیردارانہ نظام اور پیداوار کی غیر منصفانہ تقسیم کو انسانیت کے لئے ایک ظلم سمجھا اور انسانیت پر ان ہی مظالم کے پس منظر میں اپنی شاعری کا پھریرا لہرایا۔ ان میں فیض، مجاز، ن۔م راشد، مخدوم محی الدین، میرا جی، سردار جعفری، جذبی، اختر الایمان، فکر تونسوی، کیفی اعظمی، نیاز حیدر، عدم، امین حزیں، جگن ناتھ آزاد، احسان دانش، اسلام مچھلی شہری، احمد ندیم قاسمی، غلام ربانی تاباں، یوسف ظفر، قیوم نظر، جان نثار اختر اور بے شمار دوسرے شعراء ہیں۔

ان متذکرۂ بالا شعراء کے یہاں صرف کراہتی اور سسکتی ہوئی زندگی کا نقشہ ہی نہیں ہے بلکہ بقول فراق بزم ناز کی روایتیں بھی بدلی ہوئی ہیں ان کے یہاں قفس، چمن، صبا، صیاد، وغیرہ، پیمان روایاتی علامتیں نہیں ہیں بلکہ پرانے نقوش نئے معانی میں مستعمل ہیں۔ یہ تذکرۂ گل سے زیادہ سنگین حقائق کہنے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں۔ ان کو غم دوراں میں غم جاناں کی طرح تاب و تب سوز ازل ملتا ہے۔ یہ مغرب و مشرق میں چراغاں کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور اسرار حیات اس لئے فاش کرتے ہیں کہ پیکار حیات آسان ہو اور اپنے فن کا آئینہ ان چیزوں کو دکھانا فن کا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کی محنت سے جمال عالم عبارت ہے۔ ہند کے بتکدے میں گنگوں کنول جھلکتا ہوا دیکھ کر انھیں کچھ سکھ چین اور سکون ملتا ہے۔ یہ مہ و ستارے کو دیکھ کر انسان کے خوابوں کی تعبیر پالیتے ہیں۔ بزم ناز کی بدلی ہوئی روایتوں کی وجہ سے اب پس چلمن کی دیویاں نگاہوں میں نہیں جچتی ہیں اس لئے اب پس چلمن کی دیویوں کے آنچل کو پرچم میں بدلنے کی ترغیب دیجاتی ہے اور قصبوں اور دفتروں پر مزدوروں کے قابض ہونے کا خواب دیکھا جاتا ہے۔ ان ہی

شاعروں میں سے کوئی قوالی لکھ کر وہ کے احساس میں انقلاب کی شعلہ فشانی دیکھنا چاہتا ہے اور کوئی گیت لکھ کر شہ
آہنگ کو عوام کی رگ و پے میں سرایت کرنے کا آرزومند ہے اور کوئی جنسی لذت کو بیان کر کے خدا کو پشیمان دیکھنا چاہ
اور ان میں سے ایک تو گانے کو تے کا جس سے اس کی مراد معشوق کے کاجل کا پھیلاؤ ہوتی ہے اسے دیکھ کر اتنا د
کرتا ہے کہ اس کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

غرض یہ کہ جدید شاعری نے زندگی کے مشاہدے سے زندگی کے مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ سلمیٰ، نورا، اور مریم کے مجسمہ کو پیش کر کے اردو شاعری کو عورت کا ایک زبردست تصور دیا۔ اخباری انتقابی اور مدافعتی شاعری بھی پیش کی۔ سیاسی اور علمی زندگی کے انقلاب و اثرات اور اعمال کو بھی بیان کیا۔ انگریزی، سیلنگ، اسٹینزا، ہندی اور سنسکرت ۔ آزاد نظم، گیت، کجری اور قوالی بھی پیش کی۔ عوام کی دھڑکنوں کو شاعری میں سمویا۔ وطن کے بہشت، جبل، صحرا، دریا اور ا تک کی اہمیت وطن کے باسیوں کے دلوں میں بٹھائی۔ چینی حملہ کے وقت عوام کے اخلاقی معیار کو بلند۔ ان کی ہمتوں کو جوان. گرم رکھا۔ جدید شاعری کے اس رنگا رنگ پہلو اور اس کی جاذبیت سے کسی کو انکار کی مجال نہیں۔ آج کا شاعر سائنس، تمدن، عمرانیات اور تاریخ کے علاوہ اور اس کے مختلف پیچ وخم سے واقفیت رکھتا ہے۔ لیکن جدید شاعری میں ہم ایسی کے شدید طور پر منتظر اور متمنی ہیں کہ جن کو دیکھ کر محرومی بھی تماشائی بن سکیں۔

(بہ شکریہ آل انڈ

ید الحسن

انگلیاں

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں تو نظر آتی ہے اک بوند لہو کی

ب نے اس شعر میں محبوب کی حنائی انگلی کا بڑا خوب صورت خیال باندھا ہے۔ کہتے ہیں کہ عشق نے عاشق کے ے ایک قطرۂ خون چوس لیا۔ اب بھی محبوب کے وصل کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اس ناامیدی کے عالم میں اگر ں حنائی انگلی کا تصور ہی قائم ہوجائے تو وہ عاشق کے دل میں لہو کی ایک بوند بن جائے گی اور اس طرح جینے کا سامان ے گا۔

پنے محبوب کی انگلیاں تو حرزِ جان ہوتی ہی ہیں، ایسی ویسی انگلیاں بھی جدید زمانہ کی تراش خراش کی بدولت ن چبھنے لگتی ہیں۔ چپٹی بھدی انگلیاں مخروطی نظر آنے لگتی ہیں۔ سیاہ انگلیوں پر سرخ نیل پینٹ کسی دست دراز ں پکڑنے پکڑتے پہنچا پکڑ لینے کا بہانہ بن جاتا ہے۔

ن انگلیوں نے بھی دنیا میں عجیب و غریب کرشمے دکھائے ہیں۔ دنیا کے تمام عجائبات انہیں انگلیوں کا معجزہ ہیں جو ے پیکر اختیار کرکے ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی پا گئے۔ ان صناعوں کی انگلیاں تو ایسی حسین نہ ہوں گی کہ جس کا تصور حیات لیکن جب تاج محل کی خوب صورت گل کاری اور مہین مہین سی مرمریں جالیاں کسی دیدہ ور کے سامنے ہوں گی ں کے دل میں یہ احساس جاگ اٹھے گا کہ کاش وہ معجزنما انگلیاں اس کے ہاتھ آجاتیں اور وہ ان کو اپنے سینے میں رکھ لیتا۔ انہیں انگلیوں نے ایسے ایسے نادر اور خوبصورت بت تراشے کہ لوگ انہیں خدا کہہ بیٹھتے۔ یہی انگلیاں ہیں کہ جنھوں نے ری اور ہیرے جواہر کے خوشنما زیورات ایجاد کرکے معشوقوں کو سر سے پیر تک آراستہ کیا اور ان کے حسن کو چار چاند یہ انگلیاں ہی تو ہیں جن کی کاریگری سے حسین صورتیں خط و رنگ میں مقید ہو کر پیکر تصویر بن گئیں۔ اور تو اور دنیا میں ی تحریریں پائی جاتی ہیں، یہ انگلیوں ہی کا کمال ہے۔ خطاطی کے لاکھوں نمونے سر اور آنکھوں پر رکھنے کے لائق ہیں۔ لفظوں ے صفحۂ قرطاس پر اس طرح آراستہ کئے گئے کہ چمن زارِ کشمیر کی قسم کھانے لگے۔ قرآنِ مجید کے ایسے نسخے بھی پائے گئے یاول کے کسی حرف پر سوئی کی نوک رکھ دی جائے تو سوئی سیکڑوں صفحات سے گزر کر آخری صفحہ تک اسی حرف پر پہنچے گی

جس حرف سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ انگلیوں کا یہ کرشمہ دیدۂ حیراں کو آئینہ سامان بنا دیتا ہے۔

نامہ و پیام کے سلسلہ میں تو یہ انگلیاں لکھنے والے کا دل نکال کر کاغذ پر رکھ دیتی ہیں۔ اس پر بھی اگر وہ سنگ دل محبوب نہ پسیجے تو لکھتے لکھتے زخمی ہو جاتی ہیں۔ اس خونیں خامہ فرسائی کی کیفیت کو استاد غالب کی پرکار انگلیوں پر دیکھئے، لکھتے کیا ہیں:

درد دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

سرخ پرچم کے علم برداروں کو تو کاغذ قلم کی بھی ضرورت نہیں۔ ایک سرخ رو کا کہنا ہے کہ

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

کسی باغباں کی انگلیاں بھی غضب کے فتنے جگاتی ہیں۔ یہی ظالم انگلیاں خیاباں خیاباں ایسے ارم پیدا کر کے نکہت گل سارے عالم کو لے خود بنا دیتی ہے۔ زمین چمن سے وہ وہ گل کھلتے ہیں کہ بلبل کا نالۂ فریاد کی لے بن جاتا۔ نغمہ و رنگ و بو کے اس قیامت خیز امتزاج پر نظر کرنے والے کی نگاہ، چشم نرگس کی طرح کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے۔

حلوے، مربے، اچار، چٹنیوں کو بھی انگلیوں نے وہ لذت بخشی کہ زبان چٹخاروں سے آشنا ہو گئی۔ دنیا میں یہ تہذیب و شائستگی اور لذتِ کام و دہن باقی ہے انگلیوں کا یہ احسان فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

انگلیوں کے اشارے بھی کچھ کم جان لیوا نہیں ہوتے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں متحرک انگلیوں کو دیکھ کر انسان جی اٹھتا ہے۔ اور مقرر کی سحر انگیزی بھی انگلیوں کی جاں سوز حرکت ہی پر منحصر ہے۔ حیرت کے عالم میں بھی چہرے پر انگشت انسان کو دم بخود کر دیتی ہے۔

انگلیاں گواہی بھی دیتی ہیں۔ شہادت کی انگلی کا اٹھ جانا ہی مہر تصدیق ہو جاتا ہے۔ البتہ اعتراض کی انگلی اٹھ کر دل و جگر کباب کر دیتی ہے۔ کسی نے بلبلا کر کیا خوب کہا ہے کہ

ہم وہ جو مل کے بیٹھیں تو اٹھتی ہیں انگلیاں
کیا مل کے بیٹھتے نہیں دنیا میں چار لوگ

انگلیوں کے کس کس فن کو گنایا جائے۔ اگر انسان کے ہاتھ میں انگلیاں نہ ہوتیں تو ساری خدائی ایک چٹیل یا گھنا جنگل بن جاتی۔ انگلیوں کو خدا نے تعمیر و تخریب دونوں ہنر عطا کر کے وہ آزادی مطلق عطا فرمائی ہے کہ کسی شکایت کا موقع ہی نہیں رہا جو شخص اس خدائی عطیہ سے تخریبی کام لیتا ہے وہ گھاٹے میں آجاتا ہے اور چونکہ اس کی بدبخت انگلیاں بگاڑ باقی بھی نہیں رہ سکتا کیونکہ ستم ڈھانے والی انگلیاں جو آگ اٹھی رہیں اور اس ظالم کا کیا دھرا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح جو احسان مند شخص اپنی پیار کا جادو جگاتا ہے وہ کبھی نقصان میں نہیں رہتا۔ اس کی انگلیوں کا حسن رہتی دنیا تک جوت جگاتا ہے۔ ظالموں کی انگلیاں حشر کے میں ہمیشہ ہمیشہ جلتی رہیں گی اور محسنین کی انگلیاں جنت میں شجر طوبیٰ کی حیات افروز شاخ کی طرح تر و تازہ او ر دائم و

رشید انجم (بھوپال)

التجا

(ص کے نام)

اپنے حالاتِ پریشاں پہ نظر جب کی ہے
اُلجھے اُلجھے سے خیالات کو جب دیکھا ہے
جانے کیوں مَیں نے یہ سوچا ہے اک دن جا کر
موت کی وادیٔ رنگین کو ڈھونڈھ ہی لوں

میں نے دُنیا سے اِسی سوچ کا اظہار کیا
کاسۂ زیست میں میرے احباب
نفرت و یاس کے کنکر بھر دیں
چھین لیں مجھ سے تبسّم کا جمالِ رنگیں

ذہن و احساس کی ہر بزم کو ویراں کر دیں
اور مَیں دوزخِ نفرت میں سلگ کر رہ جاؤں
میرے انفاس سے اُٹھتی ہوئی خواہش کی لویں
پھونک ڈالیں مری امیدِ حیات

لیکن اے دوست
یوں اچانک ترے آجانے سے
سوچ کی دُنیا کا ہر لحظہ جواں ہوتا ہے
تیری بے لوث محبت کے حسیں سائے میں
ہر قدم پر مجھے منزل کا گماں ہوتا ہے

میں نے بھی سوچ لیا ہے مرے محبوب جمال
اب کبھی یاس کے سایوں میں نہیں بھٹکو نگا
ذہن و احساس میں اُمید کے گل مہکیں گے
پردۂ زیست میں آنسو نہیں پلنے دونگا

صرف اتنی سی مگر تجھ سے تمنّا ہے مری
اپنے معصوم تبسّم کے منوّر جلوے
مرے مغموم اندھیروں میں بسائے رکھنا
مری غمناک جوانی کے جہانِ غم کو
زر فشاں پیار کے نغموں سے سجائے رکھنا
تاکہ یہ دامنِ احساس نہ میلا ہو جائے

کیفؔ انصاری

زندگی کچھ دیر کی ہے شام کا سایہ ہوں میں
رات کی گہرائیوں میں ڈوبنے والا ہوں میں

دن کو کرتا ہوں ترے کوچے میں کرنوں کا سفر
رات کو موجِ ہوا کیساتھ اُڑ جاتا ہوں میں

پھول کی صورت کھلا رہتا ہوں جب آٹھوں پہر
کیوں دلِ احباب میں چبھتا ہوا کانٹا ہوں میں

دھوپ آتی ہے تو ہو جاتی ہے سب تنظیم ختم
ریت کی مانند راہوں میں بکھر جاتا ہوں میں

ہو گیا احساس جس دن بھاگ جاؤں گا کہیں
ساحلوں میں قید ہوں تو کیا ہوا دریا ہوں میں

وہم کے شیشے لگا کر دیکھنے والے ملے
کیفؔ جو کچھ ہوں کسی کو کب نظر آتا ہوں میں

آذر پیابانی (مدراس)

دل سے نقوشِ تلخیٔ دوراں مٹائیے
زخموں کو پھول، درد کو درماں بنائیے
رہ جائے میکدے میں مری تشنگی کی شرم
بادہ نہیں تو زہر سہی، کچھ پلائیے
ہو جائے تیز درد کی لو ہر نفس کے ساتھ
زخموں کو چھیڑیئے تو ذرا مسکرائیے
ہر صبح شب گزیدہ ہے، ہر شام غم نصیب
ہے زندگی یہی تو خدارا بچائیے
ویراں روش ہے، فضائے چمن اداس
افسانۂ بہارِ گذشتہ سنائیے
دل کیوں رہے رہینِ کرم ہائے روزگار
دل کو ہجومِ رنج کا خوگر بنائیے
ہے واقعی ردائے غزل تنگ آج بھی
طبعِ رسا کو اور کہیں آزمائیے
مل جائے گی ضرور کہیں منزلِ حیات
دل کو مگر خلوص کا پیکر بنائیے
تسکیں کی اور کوئی جو صورت نہیں ہنوز
آذر قریبِ منزلِ مقصود دکھائیے

قاضی سعید الدین مسعود

گناہ گار یہ ناکردہ کار ٹھہرے گا
مگر حضور میں دیوانہ وار ٹھہرے گا

تمہارے دید کی حسرت لئے ہوئے برسوں
یہ بدنصیب سرِ رہگذار ٹھہرے گا

کوئی ٹھہر نہ سکا حادثات کی زد پر
ترا قرار، مرا اضطرار ٹھہرے گا

وہ کارواں جسے پل بھر کبھی نہیں مل نہ سکا
سکوتِ شب میں لبِ جوئبار ٹھہرے گا

ابھی تو نور بکھیرینگے آنسوؤں کے دیے
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

ممتاز راشد (اجمیری)

سنا ہے اب تک ستم گردں کا ہے سازِ دار و رسن سلامت
ہمیں بھی کیا غم ہمارے نغموں کا ہے اگر بانکپن سلامت

ہزار شعلہ بدست قاروں نے ہر قدم پر الجھنا چاہا
ترے خیالوں کے پیکروں کے رہے مگر پیرہن سلامت

جبینِ ساقی پہ برہمی ہے ہر اک نظر زہر میں بجھی ہے
ابھی ہیں شاید اس انجمن میں کچھ اور اہلِ کفن سلامت

لبوں پہ مہریں لگا دُچاہے مگر اندھیروں کے رہنماؤ
گذر ہی جائیگی رات غم کی نوائے مرغِ چمن سلامت

تسلیلی شامیں، جوان راتیں، حسین صبحیں ہیں جنکے دم سے
وہ چشمِ مے گوں، وہ زلفِ شبگوں، ہے ان کا وہ رنگِ بدن سلامت

مرے تصور میں یادِ یاراں کی نرم کلیاں چٹک رہی ہیں
ہے آشنا سی فضائے زنداں نسیمِ صبحِ وطن سلامت

پروفیسر عبدالمجید صدیقی
محمد اکبرالدین صدیقی

نقد و نظر

تحقیقاتِ چشتی (جلد اوّل و دوم)

مؤلف نوراحمد چشتی۔ ضخامت ۱۳۲۰ صفحات۔ عمدہ ٹائپ۔ قیمت: ۳۰ روپے
ناشر: پنجابی ادبی اکیڈیمی۔ ۱۲۔ جی ماڈل ٹاؤن۔ لاہور (پاکستان)

تحقیقاتِ چشتی لاہور کے قدیم تاریخی مقابر، کوتی عمارات، باغات، مناور اور گردواروں کا قابلِ قدر مرقع ہے جو انیسویں صدی کے یعنی ۱۸۶۴ء میں قلمبند ہوا تھا۔ اس کے مصنف مولوی نوراحمد چشتی انیسویں صدی کے بڑے اہلِ قلم معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں اس کتاب کے علاوہ تحفہ چشتی، مشعر صرف دخو، یادگارِ چشتی وغیرہ جیسی اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ مصنف کا بیان ہے کہ یہ کتاب انھوں نے لاہور کے مددگار کمشنر ولیم گولڈ اسٹریم کے ایما سے لکھی تھی۔ اس میں لاہور اور اس کے گرد و نواح کے تاریخی باغات، مساجد، و مناور کی تاریخ اور متعلقہ کیفیت ملنے کے ساتھ ان صوفی بزرگوں کے حالات بھی قلمبند کئے ہیں جو لاہور اور اس کے گرد میں مدفون ہیں اور ان کی قبریں اور مقبرے پائے جاتے ہیں۔ یہ تمام مواد بڑی محنت سے جمع کیا گیا ہے۔ یہ تمام بزرگ وہ ہیں جو وطن مالوف، ایران و ترکستان کو خیرباد کہہ کر ہندوستان میں آکر بس گئے اور اپنی اصلاحی جد و جہد سے تمام ماحول کو متاثر کیا۔ اس سے پہلے اس میں ہندوستان کا تاریخی پس منظر بھی پیش کیا گیا ہے تاکہ مساجد و مناور اور دیگر عمارات کی تاریخ سمجھنے میں آسانی ہو۔ پس منظر ہندوستان کی قدیم وسطی اور حالیہ تمام تاریخ پر حاوی ہے۔ یعنی یہ قدیم راجہ ہیا ماج دہانی سے شروع ہوتا ہے اور اس پر ختم ہوتا ہے جبکہ رنجیت سنگھ کا خاتمہ ہوا اور اس کی اولاد دلیپ سنگھ وغیرہ انگریزی حکومت کے اثر میں بے اختیار ہو کر رہ گئے۔ تاریخی پس منظر کے بعد اصل موضوع شروع ہوتا ہے۔ پہلے عمارات اور باغات وغیرہ کی وضاحت ہے۔ جہاں تک صوفیوں کا تعلق ہے ان کی موت و زندگی اصلاحی کام اور کشف و کرامات ادبی دلچسپی سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ تمام مواد دو جلدوں میں سمویا گیا ہے۔ جلدوں کی تقسیم میں کوئی باقاعدگی نہیں ہے بلکہ پہلی جلد کے حجم کو گھٹانے کے لئے دوسری جلد شروع کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ایک ہی بزرگ کا تذکرہ دو جلدوں میں بٹ گیا ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ لاہور کی ادبی اکیڈمی نے اس مخزن کو نہ صرف از سرِ نو شائع کیا بلکہ اصل مسودے میں ضروری تغیر و تبدل کر کے اس میں خوش اسلوبی پیدا کر دی ہے۔ ورنہ ناشرین کے بیان کے مطابق اصل مسودے کے اجزا غیر مرتب اور منتشر تھے۔ ایک ہی موضوع مختلف جگہ لکھا گیا تھا۔ یہ اکیڈمی کا کام قابلِ تحسین ہے کہ اس کی توجہ سے یہ قابلِ قدر مرقع محفوظ ہو گیا۔ اب یہ تیسری مرتبہ شائع ہو

اگر اس کی اشاعت نہ ہوتی تو شاید یہ مرقع ناپید ہو جاتا اور تاریخ کا یہ بیش بہا ذخیرہ تاریخ دانوں کے ہاتھ میں نہ ہوتا۔ اس کو تصنیف ہوئے آج ایک سو سال ہو چکے ہیں۔ یہ نہ صرف تاریخی عمارات و باغات وغیرہ کا مرقع ہے بلکہ مذہبی اور روحانی معلومات کا مجموعہ بھی ہے۔ کیونکہ اس میں لاہور کے تمام صوفی بزرگوں کے حالات بھی جمع ہو گئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وسطی زمانے کی تاریخ ہند صوفیائے کرام کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ یہی خانقاہ نشین درویش وسطی تہذیب و تمدن کے شمع بردار تھے۔

لیکن اس کتاب کی تدوین و اشاعت کے بارے میں چند امور کا اظہار ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت اصولِ تدوین کے مطابق نہیں ہوئی ہے۔ اس میں نہ کوئی مقدمہ ہے نہ اشاریہ جس سے کتاب پڑھنے والوں کی خاطر خواہ رہبری ہو۔ تدوین کا اقتضا یہ ہے کہ کتاب میں ایک سیر حاصل مقدمہ ہونا چاہئے جس میں مصنف کے خاندانی، سماجی اور علمی حالات اور موضوع کتاب کی اہمیت اور وسعت پر روشنی پڑ سکے۔ مقدمے سے کتاب کا وزن بہت بڑھ جاتا ہے۔ اگرچہ ادارہ ... اکیڈمی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ چیزیں ان کے پیش نظر تھیں لیکن حجم کی زیادتی کے ڈر سے اس منصوبے کو ترک کرنا پڑا۔ لیکن ہمارے خیال میں طوالت کے ڈر سے تدوین کے ایک ضروری عنصر کو چھوڑنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ بجائے دو جلدوں کے تمام مواد تین جلدوں میں سمویا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ خود اصل تصنیف میں بہتیری خامیاں اور کوتاہیاں رہ گئی ہیں۔ حاشیے میں ان کی اصلاح اور وضاحت ضروری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعات نگاری میں تحقیق سے کام نہیں لیا ہے اور تاریخ لکھنے میں ان سے بہتیری فروگذاشتیں ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر بابر کی تخت نشینی ۱۵۳۰ء (ص ۲۰) لکھی گئی ہے حالانکہ وہ ۱۵۲۶ء کا واقعہ ہے اور اکبر کی پیدائش ۱۵۳۲ء بتایا گیا ہے (ص ۵۵) حالانکہ وہ ۱۵۴۲ء میں ہوئی ہے اور ہمایوں کا انتقال ۱۵۳۹ء لکھا گیا ہے (ص ۵۵) حالانکہ وہ ۱۵۵۶ء کا واقعہ ہے۔ اس طرح اس مرقع میں تاریخ اور واقعات کی بہتیری غلطیاں پائی جاتی ہیں جو بڑا معلوم ہوتی ہیں۔ حاشیے میں ان کی اصلاح اور وضاحت ضروری تھی۔ (م ص)

لیکن ان خامیوں کے قطع نظر یہ قابلِ قدر کام ہے اور امید ہے کہ اہلِ علم اس سے پورا استفادہ کریں گے۔

روزگار فقیر: ڈاکٹر اقبال کو فوت ہوئے ابھی پچیس سال سے زیادہ نہیں ہوئے کہ ان پر بہتیری کتابیں لکھی گئیں اور آئے دن لکھی جا رہی ہیں۔ مضامین اور مقالات تو شمار سے باہر ہیں۔ منجملہ ان کے عبدالسلام ندوی کی اقبالِ کامل، ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی روحِ اقبال، اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی فکرِ اقبال قابلِ قدر تصنیفیں ہیں۔ ان تصانیف سے اقبال کے خیالات عالیات پر جو روشنی پڑتی ہے وہ بے اندازہ ہے۔ آخر الذکر فکرِ اقبال تو ایک بھرپور تصنیف ہے جس میں اقبال کی تمام ذہنی کاوشوں اور فکری بلندیوں کو کھول کر دکھایا گیا ہے۔ لیکن روزگار فقیر جس کو فقیر وحید الدین صاحب نے حال میں تالیف کیا ہے ایک نیا اضافہ ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی زندگی اور ان کے افکار کے بہتیرے گوشے ایسے ہیں جو ابھی صفحۂ قرطاس پر ابھرے نہیں تھے۔ گذشتہ مصنفین نے اقبال کی فکری بلندیوں کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے لیکن شاعرِ مشرق کو بہ حیثیت انسان کے پیش نہ کر سکے۔ اقبال کے افکار کو سمجھنے کے لئے انکی نجی زندگی کا مطالعہ ضروری ہے کہ وہ کیسے انسان تھے۔ کس ماحول کی پیداوار تھے۔ ان کے قلبی اور ذہنی واردات کا کیا رنگ تھا۔ ان کے قلب و دماغ ان کے ماحول سے

[illegible]

فقیر وحید الدین صاحب نے روزگار فقیر لکھ کر اندھیرے میں ایک نیا چراغ روشن کر دیا۔ اقبال کی نجی زندگی اور اس کے قلب و
کی واردات کو اس خوبی سے بے نقاب کیا ہے کہ شاعرِ مشرق کی زندگی کے بہت پردے کھل گئے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے
کو خود ان کے الفاظ و بیانات میں ظاہر کیا ہے یا دوسرے الفاظ میں اقبال کو خود ان کے آئینے میں دکھایا ہے اور یہ ایسا کمال ہے کہ شاعر
بحیثیت انسان کے ہمارے سامنے آگئے۔ ان کا موضوع خود انسان ہے جو سوانح حیات ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں وہ ہم اپنے
کو اصل جامے میں نہیں پیش کر سکتے اور اس کے دل و دماغ کے اندرونی سوتوں کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ "روزگار فقیر" اقبال کی زندگی کا صحیح
جاذبِ نظر مرقع ہے۔ سچ پوچھو تو حقیقی سوانح نگاری یہی ہے۔ اور یہ ایک بہتر قابل قدر فن کاری ہے۔ اس میدان میں ہر سوانح
نہیں اتر سکتا۔ اس کا حق صرف وہی ادا کر سکتا ہے جس نے اپنے ممدوح کو قریب سے دیکھا ہو اور اس کو دن رات کی ہم نشینی حاصل
قربت و ہم نشینی ہی سوانح نگار کی اصل قدر و قیمت ہے۔ فقیر وحید الدین صاحب کو اس کا فخر حاصل ہے کہ موصوف نے
بہت قریب سے دیکھا تھا اور شاعرِ مشرق کی قلبی و ذہنی واردات کا دل سے مطالعہ کیا تھا۔ اگر "روزگار فقیر" کا کسی اور
مقابلہ کیا جا سکتا ہے تو وہ انگریزی میں ڈاکٹر جانسن کی سوانح حیات ہے جس کو اس کے دوست باسول نے لکھا تھا۔ اور آج
انگریزی زبان کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس کی خوبی یہی ہے کہ باسول نے ڈاکٹر جانسن کو خود اس کے الفاظ اور بیانات میں
کیا ہے اور اس طرح جانسن کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

زبان و اسلوب بیان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو "روزگار فقیر" ادبِ لطیف میں بہت بڑا اضافہ ہے۔ فقیر ص
اردو میں ایک خاص اسلوب و طرزِ تحریر کے مالک ہیں۔ شستہ اور بے تکلف زبان ان کے قلم کی خصوصیت ہے۔ زبان کی
کے ساتھ اس میں اس قدر لوچ و گھلاوٹ ہے کہ پڑھنے والا مسحور ہو جاتا ہے اور کتاب ختم کئے بغیر دم نہیں لیتا۔ یہ خاص اسلوب
آزاد اور سرشار کو حاصل تھا۔ فقیر صاحب کے رشحاتِ قلم بھی ایک خاص طرزِ تحریر کے قالب میں ڈھل رہے ہیں اور یہ آئندہ ای
کی صورت اختیار کر لیں گے۔ کتاب کی ظاہری خوبیاں بھی معنوی خوبیوں سے کم نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب مصنف کو جس قدر
تحریر کا ملکہ ہے اس سے زیادہ طباعت کی پاکیزگی کا شوق بھی ہے۔ کتاب اس قدر سلیقے سے چھاپی گئی ہے کہ دل سے تعریف نکلتی
دیدہ زیب طباعت بہت کم دیکھنے آتی ہے۔ خدائے تعالیٰ مصنف کو اور زیادہ زورِ قلم عطا فرمائے۔ (م۔ ص)

بچہ۔ سنِ بلوغ تک : نور الحسن صاحب وظیفہ یاب صدر مدرس۔ 1/16 کراؤن صفحات ۲۷۱۔ کتابت اور طباعت اچھی اور
قیمت دو روپے۔ پتہ ۳/۶/۱۳۹ آبگینہ حمایت نگر حیدر آباد (دکن)

بچوں کی تربیت پر اردو میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں خصوصاً عصرِ حاضر میں اس طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ نور الحسن صاحب
اس سے پہلے بھی کئی کتابیں لکھی ہیں اور سب بچوں کی نگہداشت اور ان کی تربیت کے موضوع پر۔ یہ گراں قدر کتاب تین
ابواب پر منقسم ہے۔ پہلا باب بچہ کی پیدائش اور اس کا جسمانی نشوونما ہے۔ دوسرا بچہ کے جذبات کی نشوونما۔ تیسرا بچہ کی زند
دور یعنی پیدائش سے چھ سال تک تخلیق دوسرا چھ تا ۱۲ برس جبکہ بچہ میں امتیازی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں اور تیسرا بارہ تا ۱۸

زانہ اس کے بعد چوتھا باب بلوغ سے متعلق ہے جس میں اس کی جنسی حرکات و سکنات اور اعمال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں بچہ درا شتاً اور ماحول سے جو کچھ حاصل کر سکتا ہے انھیں پیش کیا گیا ہے اور ستاھی کھیلوں کی اہمیت بھی واضح کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں قسم قسم کے بچوں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ ساتویں میں تربیت کے چند اصول بتائے ہیں اور نویں میں بچہ کی بنیادی نفسیاتی ضرورتوں کا اظہار کیا ہے۔ نواں باب بچہ کے متعلق چند عجیب مشاہدات پر مبنی ہے۔

فاضل مصنف اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں رکھتے ہیں اور مغربی ممالک میں تعلیم پائی ہے۔ وہاں کے نظام تعلیم اور نظام تربیت سے واقفیت رکھتے ہیں اس کے نتائج کا اظہار زیر تبصرہ تصنیف میں جگہ جگہ ہوتا ہے۔ انداز بیان نہایت سلیس ستھرا اور شگفتہ ہے۔ کہیں کہیں زبان کی ایک دو لغزشیں نظر آتی ہیں مثلاً صفحہ ۱۴ پر ایک جملہ ہے وہ اشیا جن پر کھی بیٹھی ہو یا جو کھلی ہوئی رکھی ہوئی چھونا نہیں چاہیئے۔

یا صفحہ ۱۹۸ پر ابتدائی آدمی کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ توجہ مرکوزیت، برداشت اور محنت کو زندہ رہنے کی خاطر اولیت دیں یا صفحہ ۲۰۱ پر مانٹی سوری.... بیان فرماتی ہیں لکھا اور پھر صفحہ ۲۶۳ پر مانٹی سوری کہتی ہے کہنا مناسب نہیں۔

اگر دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئے (اور خدا کرے کہ آئے اور کتاب کو قبول عام عطا ہو) تو ایسی غلطیوں کی اصلاح کر دینا مناسب ہوگا کتاب ایسی ہے کہ صرف ماں باپ ہی نہیں بلکہ ہونے والے ماں باپ بھی اس کو از حد مفید پائیں گے بشرطیکہ انھیں اپنی اولاد کی صحیح تربیت کرنا منظور ہو۔ (ا۔ ص)

غفو میاں: از عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ صفحات ۱۶۰ مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت ۲۰۰ اردو ادب میں آزاد، خوجی، چچا چھکن اور قاضی جی وغیرہ کی طرح پان دان والی خالہ بھی آسمان شہرت پر جا براجی ہے۔ تخلص بھوپالی کا یہ بڑا جاندار کردار ہے جس نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ اب موصوف نے ادب کو ایک اور کردار غفو میاں سے روشناس کرایا ہے۔

سیاسی انقلاب سے جب بھی کوئی ملک دوچار ہوتا ہے تو عوام عموماً دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ انقلاب کا ساتھ دیتا ہے دوسرا گروہ اس کی مخالفت کرتا ہے اور چند افراد ایسے بھی ہوتے ہیں "جو نہ تک دیدیم دم نہ کشیدیم" پر عمل کرتے ہیں۔... اپنے آپ میں اتنا کس بل نہیں پاتے کہ رخ کو موڑ سکیں اور نہ وہ نئے حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں البتہ ان کا صرف ایک کام یہ رہ جاتا ہے کہ ماضی کی یاد کو سینہ سے لگائے رہیں اور حال میں اگر کوئی برائی نظر آئے تو بہ بانگ دہل اس کا اعلان کریں۔ پان دان والی خالہ نے یہی کیا اور غفو میاں بھی یہی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک خوش حال اور فارغ البال ماحول کے پروردہ ہیں اور اب گنے چنے افراد کو خوش حال اور عوام کو بدحال دیکھنا گوارا نہیں۔ خالص گھی کھائے ہوئے وناسپتی کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھیں ہر چیز میں آمیزش نظر آتی ہے۔ ہر چیز میں تصنع دکھائی دیتا ہے گرانی پر جھنجھلا اٹھتے ہیں اور اس طرح وہ عوام کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ جب اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو مزاح پر طنز کا رنگ غالب آجاتا ہے وہ انتخابات میں ووٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور انتخابات میں جتنی دھاندلیاں ہو سکتی ہیں ان سب کو نہایت فنکارانہ انداز میں منظر عام پر لے آتے ہیں۔ کبھی تو وہ عدالت کے گواہ بن جاتے ہیں اور کبھی زبردستی کے الحاق بلکہ طفیلیا... اور طے ہمارے کی کوئی خواہ مخواہ اسنظر عام پر آتی ہیں۔ تخلص بھوپالی صاحب نے غفو میاں کے روپ میں تہذیب و تمدن کی

قدروں کو محفوظ کرنے اور نئی تہذیب کے کراہت آمیز اور نفرت انگیز پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ تکرار جو تکیہ کلام کی شکل میں ادا ہوئے ہیں، کبھی تو لطف دیتی ہے لیکن کبھی ثقہ طبیعت پر گراں گذرتی ہے۔ طنز کے وہ تیرو کو اختیار کرنے کے بارے میں منفی رویہ کا اظہار کرتے ہیں بے حد دل کش اور دل آویز ہیں۔ بلحاظ خیالات پاندان والی خالہ میں کوئی فرق نہیں۔ وہ خالہ ہیں اور یہ غفور میاں۔ خالہ نے جہاں نسوانی روزمرہ اور محاوروں کا ایک ذخیرہ پیش کر دیا ہے مردوں کی بولی ٹھولی کو محفوظ کر دیا ہے۔ ممکن ہے پانچ دس برس بعد یہ لب و لہجہ، یہ انداز بیان اور یہ بولی محض کا بالکل ویسے ہی جیسے حکومت کی منصوبہ بندیاں غفور میاں کی نظر میں باقی ہیں۔

تخلص صاحب قابل مبارک ہیں کہ ادب کو انھوں نے جاندار اور طویل حیات پانے والے کردار عطا کئے۔

سید توفیق احسن اٹاوی۔ کوٹھی محسن الملک۔ اٹاوہ۔ (نظموں کا مجموعہ) مطبوعہ نظامی پریس لکھنو صفحات

یادِ ایام: قیمت ۲/۱ ۲ روپے۔

توفیق صاحب محسن الملک کے بڑے بھائی غلام عباس صاحب کے پوتے ہیں۔ علی گڈھ یونیورسٹی سے قانون میں ڈگری لے کر وطن اٹاوہ میں وکالت کرتے ہیں۔ فرصت کے اوقات شعر و شاعری کے لئے وقف ہیں چنانچہ اس سے پہلے صبح درخشاں اور منظر عام پر آچکے ہیں۔ پیش نظر مجموعہ میں رباعیات بھی ہیں۔ اشخاص پر نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ توفیق صاحب کے کہنہ میں درد بھی ہے اور اثر بھی۔ کہیں حالاتِ حاضرہ کی عکاسی کی ہے اور کہیں درد دل کی واردات بیان کی ہے۔ خیالات ہے اور اظہار میں شوخی و ندرت۔ غزل سے نمونۃً چند شعر پیش ہیں۔

تجھے حور باغ جناں ملی، مجھے زاہد اس کی رضا ملی
ترے لاکھ سجدوں کا وہ عوض مری ایک توبہ کا یہ صلا

کبھی اپنے دن پھر ہی گئے تری صبح و شام ہو گی
نہ رہے گا اہل گلشن کبھی ایک سا زمانہ

خاک تک محفل سے پروانوں کی پھکوا دی گئی
اور اہل دل یہ تذلیل وفا دیکھا کئے

نالۂ دل، بوئے گل، بادِ صبا، امواج سحر
سب کو اس دنیا میں آتش زیر پا دیکھا کئے

ترا حرف حرف صادق مرا لفظ لفظ باطل
تو کہے تو سب حقیقت، میں کہوں سو وہ فسانہ

سبز باغ ایسے محبت نے دکھائے بخدا
اب تو ہر فکر خوش انجام سے جی ڈرتا ہے

میں نے تو زہر بھرے جام پیئے ہیں اکثر
شیخ کا بادۂ گلفام سے جی ڈرتا ہے

الطاف حسن قریشی۔ صفحات ۱۷۴ مجلد معہ گرد پوش۔ کتابت اور طباعت عمدہ اور کاغذ چکنا

ملاقاتیں: قریشی صاحب "اردو ڈائجسٹ" لاہور کے ایڈیٹر کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں۔ اردو ڈائجسٹ کی ترتیب و تزئین اور طباعت وغیرہ میں وہ جس سلیقہ کا اظہار کرتے ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں۔ موصوف نے پاکستان کے لئے ہیں اور انھیں قلمبند کر کے کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔ حسب ذیل اصحاب سے انھوں نے ملاقات کی ہے۔

۲۔ مسٹر اے کے بروہی ۳۔ میاں بشیر احمد۔ ۴۔ تمیز الدین خاں۔ ۵۔ حمید احمد خاں۔ ۶۔ ڈاکٹر خدیجہ فیروز الدین۔ ۷۔ جسٹس ایس اے رحمان ۸۔ صلاح الدین احمد۔ ۹۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ۱۰۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر۔ ۱۱۔ غلام رسول مہر۔ ۱۲۔ جسٹس ایم آر کیانی۔ ۱۳۔ جسٹس محمد شریف۔ ۱۴۔ چودھری محمد علی ۱۵۔ چودھری نذیر احمد خاں۔ ۱۶۔ حکیم نیر واسطی۔

ان اسمائے گرامی میں ہم دور افتادگان کے لئے کچھ جانے پہچانے ہیں ان سے اس قدر یگانگت اور اپنائیت محسوس ہوتی ہے گویا ان سے روحانی اور قلبی رشتہ ہے بعض ایسے بھی ہیں جن سے ہم "ملاقاتیں" کے توسط سے متعارف ہوئے ہیں۔ ان ملاقاتوں میں جو سوالات کئے گئے ان میں کافی تنوع ہے لیکن دو ایک سوال مثلاً اردو کے قومی زبان بننے کے بارے میں اور دوسرے دستور اسلامی کے تعلق سے اہم ہیں اور بیشتر اکابر کی آراء میں بہت زیادہ یکسانیت ہے۔ اسلامی دستور کے بارے میں مولانا مودودی نے کتنی واضح اور کھلی رائے ظاہر فرمائی کہ عوام کی اخلاقی قدریں جہالت کے باوجود نہیں بدلیں۔ مسلمان برائی کو برائی سمجھتا ہے لیکن تربیت کی کمی نے اس کو اسلام سے عملاً دور رکھا ہے چنانچہ قریشی صاحب خود معترف ہیں کہ جب انھوں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ "تم ان لوگوں کے زمرے میں تو نہیں آتے جو اسلام کو مانتے ہوئے اس کے حدود میں رہنے کے لئے تیار نہیں" اور انھیں جواب میں دل کی یہ آواز سننا پڑتی ہے کہ ایسی باتیں بڑھاپے میں اچھی لگتی ہیں۔

بروہی صاحب سے اردو زبان کے ارتقا اور فروغ کے بارے میں حکومت کی توجہ کا ذکر کیا تو جواب ملا کہ "حکومت کی توجہ علم و ادب کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ہم پر یہ حقیقت منکشف کرتا ہے کہ جب کبھی علم و ادب کو شاہی سرپرستی حاصل ہوئی اس کی روح اور تازگی ختم ہو گئی ...... ادب عالیہ خوش حالی اور عیش کوشی کی فضا میں جنم نہیں لیا کرتا۔ زندگی کی حسرت و نامرادی، حالات کی پیہم کش کش اور مصائب و حوادث کا تاثر جو فن کار کی روح میں سوز و تڑپ اور درد کی لہریں پیدا کرتے ہیں جو خون جگر میں تحلیل ہو کر فن کی تخلیق کرتی ہیں۔"

قریشی صاحب نے جب میاں بشیر احمد سے یہ سوال کیا کہ اردو ادب میں "ہمایوں" نے ایک انفرادی مقام کیوں حاصل کیا تو میاں صاحب نے جواب میں فرمایا کہ "یہ مسلسل ۴۵ سال تک ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں پوری باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ دوسری چیز اس کی قلمی متانت اور ادبی پاکیزگی تھی۔ ہمایوں نے قارئین کو ہمیشہ ایسا مواد فراہم کیا جس سے جہاں ایک طرف فکر و نظر کی آبیاری ہوتی تھی وہاں اخلاق و کردار پر بھی خوش گوار اثر پڑتا تھا۔ تیسری بات یہ کہ مضمون کے معیار کا فیصلہ مضمون نگار کے نام کی بجائے نفس مضمون سے کیا جائے ...... اس سے نوجوان طبقے میں اچھا لکھنے کا رجحان تقویت پکڑتا گیا۔"

قریشی صاحب نے پروفیسر حمید احمد خاں سے اردو کے لئے رومن رسم الخط کے بارے میں رائے پوچھی تو پروفیسر صاحب نے فرمایا "میرے نزدیک تو اس مسئلے کا تعلق ہماری زندگی کی بنیاد سے ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی مشین کے کسی پرزے کو تبدیل کر کے اس کی جگہ نیا پرزہ لگا دینے کے ہم معنی نہیں ہے۔ موجودہ رسم الخط سے ہماری دینی، روحانی، تہذیبی اور قومی روایات وابستہ ہیں۔ رومن رسم الخط کے اختیار کرنے کے بعد ہمیں ان تمام ذخائر علوم سے عملاً محروم ہو جانا پڑے گا۔ جن میں ہمارے آباء و اجداد کا نہایت ہی بیش قیمت خون جگر شامل ہے۔ نہ معلوم ہم ترکی کے تجربے سے سبق کیوں حاصل نہیں کرتے۔ وہاں پینتیس سال کے طویل عرصے میں صرف دو سو پرانی کتابیں نئے رسم الخط میں منتقل کی جا سکتی ہیں ......

لاطینی رسم الخط اختیار کر لینے سے ترکی اور فرانسیسی زبانیں ایک نہ ہو سکیں۔

جسٹس ایس اے رحمٰن سے جب یہی سوال کیا تو انھوں نے پروفیسر حمید احمد خاں کے بیان پر یہ اضافہ فرمایا کہ "ہمیں اپنے اصوات کو رسم الخط میں ادا کرنے کے لئے خود رومن رسم الخط میں نئی نئی علامات کا اضافہ کرنا ہوگا دوسرے لفظوں میں اس طرح جو نیا رسم الخط وجود میں آئے گا وہ ان کے لئے بھی بڑی حد تک اجنبی ہوگا جو انگریزی زبان لکھ پڑھ لیتے ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد (مرحوم) نے اسی سوال کے جواب میں فرمایا کہ رومن رسم الخط اختیار کرنا قومی خودکشی کے مترادف ہوگا اور یہ خودکشی نہیں ہونے دیں گے۔

اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر ایک نوجوان نومسلم امریکی سے ملاقات کا حال انتہائی دلچسپ دلآویز اور ساتھ ہی مسلمانوں کے درس عبرت ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور سے جب قریشی صاحب نے سوال کیا کہ پاکستان میں اردو کے مستقبل کے بارے میں کیا رکھتے ہیں تو جواب ملا کہ :-

"اس وقت اردو کو کمزور کرنے کے لئے علاقائیت کا حربہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ دراصل انگریزی کے بے جا اقتدار کو برقرار رکھنے کی آ ہے مگر مجھے یقین ہے کہ قوم بہت جلد علاقائیت کے خطرے کا احساس کرے گی۔ مغربی پاکستان میں حکومت نے اردو کو بارھویں جماعت تک ذ دے کر ملک کی وحدت کے لئے ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔"

ایسا ہی ایک سوال جسٹس محمد شریف سے پوچھا گیا جس پر انھوں نے جواب دیا کہ :-

"اردو ہماری قومی زبان ہے۔۔۔۔ میرا خیال ہے جب تک ہمارا ذریعہ تعلیم اردو نہیں ہوگا تعلیمی معیار اونچا نہیں ہو سکتا۔۔۔ نزدیک سائنس کے مضامین کے لئے بھی انگریزی زبان ضروری نہیں۔ روس نے سائنس کے میدان میں جو اتنی ترقی کی۔ ہے کیا وہ انگریزی زبان ہے۔ ہم اپنی قومی زبان میں سائنس پڑھ کر زیادہ سے زیادہ تخلیقی اور تحقیقی کام کر سکتے ہیں۔"

رومن رسم الخط کے بارے میں چودھری نذیر احمد خاں سے رائے دریافت کی گئی تو چودھری صاحب نے فرمایا کہ :- "رومن رسم الخ کرنے سے ہمارا پورا دینی، ثقافتی، تاریخی، لسانی، صوتی اور احساساتی سرمایہ ضائع ہو جائے گا اور ہم ایسے ماہر بن جائیں گے جن کا ماضی نہ

"ملاقاتیں" ایسے لوگوں سے ہوئی ہیں جنھوں نے برسوں ایک ایک مسئلہ پر غور و فکر کیا ہے۔ ان میں کئی حضرات ایسے ہیں جو آج ہم رہنما ہیں جن کی رائیں قوم اور حکومت کی نظر میں وقیع ہیں۔ ایسے حضرات بھی ہیں جو عنانِ حکومت کو تھامے رہے اور انتہائی بلند عہدہ مناصب پر فائز رہے۔ ان ملاقاتوں کی روداد انتہائی دلکش، حسین، فکر انگیز اور اس لئے بھی زیادہ سے زیادہ پڑھے جانے کے کہ یہ زعمائے ملت، چوٹی کے ادیبوں اور با عمل افراد کے تخیلات و تصورات کا عکس جمیل ہے۔ (ا۔ص)

بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء   فون ۳۵۲۰۹

جلد ۲۷ شمارہ ۱۰   اکتوبر ۱۹۶۴ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

نگران: پروفیسر عبدالمجید صدیقی

مجلسِ مشاورت: میر حسن۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
رمن راج سکسینہ۔ وقار خلیل

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

زرِ سالانہ ہندوپاک سے ــــ چھ روپے
ششماہی ــــ تین روپے
غیر ممالک سے ــــ دس روپے

مہتمم ادارۂ ادبیاتِ اردو کے
اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر
ایوانِ اردو۔ خیریت آباد
حیدرآباد دکن ۴
سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

اگست اور ستمبر کے دو شماروں میں بہمنی سلطنت کی باقیات پر ایک مضمون پیش کیا گیا اسی طرح اس شمارہ میں "دکن اور دکھنی کا آغاز" پیش کیا جارہا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ یہ تین قسطوں میں تکمیل پا سکے۔ اس مضمون سے محققین کو یہ سمجھنے میں بہت زیادہ مدد ملے گی کہ دکھنی زبان کی ابتدا کیسے ہوئی اور دکھنی کے شاعروں نے ہندی کے بجائے اس کو دکھنی کا نام کیسے اور کب دیا۔ دکھنی کس طرح پروان چڑھتی رہی اور چار صدیوں تک عوامی شعرا اور ادیبوں کی زبان بنی رہی۔

ستمبر بانیٔ ادارۂ ادبیات اردو ڈاکٹر زورؔ کی رحلت کا مہینہ ہے۔ ادارہ نے اپنے بانی کی یاد میں تین ترتیب دیا تھا۔ ۲۲ ستمبر کو مسجد افضل گنج میں قرآن خوانی کی مجلس منعقد ہوئی۔ ۲۳ کو ادارۂ ادبیات اردو میں ایک نمائش ترتیب دی گئی جس کے تین حصے تھے درمیانی حصے میں ڈاکٹر زورؔ کی تمام تصانیف کو پیش کیا گیا تھا۔ ایک طرف ان جرائد کو رکھا گیا تھا جس میں ان کے مضامین شائع ہوئے اور دوسری طرف ایسے رسائل اور کتابیں تھیں جس میں ڈاکٹر زورؔ صاحب پر مضامین اور مقالات تھے۔ ایک حصے میں ان کی وہ تمام تصویریں بھی رکھی گئی تھیں جو ادارہ کی مختلف تقریبوں کے موقعوں پر افتتاح صدر ادارہ جناب پروفیسر سید علی اکبر صاحب کے ہاتھوں ہوا اور اس کے بعد ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی اس تصویر کی ادارہ کے ہاتھوں عمل میں آئی جس کو ادارہ کے ایک بڑے محسن اور مرحوم کے عزیز دوست نواب عنایت جنگ بہادر نے ادبی محفل منعقد ہوئی جس کا آغاز پروفیسر عبدالمجید صدیقی نائب صدر ادارہ کی تقریر سے ہوا۔ حیدرآباد کی مختلف ادبی انجمنوں کے ونشی دھر ودیالنکار (ہندی پرچار سبھا) جناب فضل الرحمن صاحب (موتی لال نیشنل انٹیگریشن سنٹر) جناب ایم باگا ریڈی صاحب (انجمن تحفظ اردو اساتذہ اردو جامعہ عثمانیہ) اور خواجہ محمد احمد صاحب (ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) نے ڈاکٹر زورؔ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان کے ڈاکٹر ایس آر کلکرنی اور خواجہ حمید الدین صاحب شاہد (رکن ترقی اردو بورڈ پاکستان، کراچی) نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ مسز حسین علی خاں خاں صاحب اور بانو طاہرہ سعید صاحبہ نے ڈاکٹر صاحب پر اپنی نظمیں سنائیں۔

۲۴ ستمبر کو ساڑھے نو بجے شب علامہ حیرت بدایونی کی صدارت میں ایک محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس کی پہلی نشست مرحوم کے مصرعے ؎

عہدِ پیری میں بھی اے زورؔ جواں ہیں کچھ لوگ

پر طرحی غزلیں سنائی گئیں۔ ان محفلوں کی تفصیل روداد ہم آئندہ شمارے میں پیش کریں گے۔

(باقی ہے)

پروفیسر عبدالمجید صدیقی

سلطنت بہمنی کی باقیات

(بسلسلۂ گذشتہ)

اب پندرھویں صدی کے آخری عشرے میں دکن کا سیاسی نقشہ یہ تھا کہ اس کی سالمیت ختم ہو چکی تھی اور یہ پانچ قلمروؤں میں بٹ گیا تھا۔ اہلِ دکن جو تختِ فیروزہ کے سامنے سر جھکاتے تھے وہ اب پانچ شاہی درباروں کی دہلیز پر سر رکھنے لگے۔ اس سے دکن کی سالمیت کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ تمدن کی رفتار بہت دنوں تک رکی رہی۔ قومی اور تمدنی تعمیر جو سیاسی وحدت میں ہوتی ہے وہ طوائف الملوکی میں نہیں ہوتی، لیکن اس سے ایک فائدہ بھی ہوا کہ ان چھوٹی سلطنتوں نے اپنے محدود دائروں میں زبان و تمدن کو اُجاگر کرنے کی جو گہری جدوجہد کی وہ بہمنیوں کی وسیع سلطنت میں ممکن نہ تھی۔ بہمنی حکمرانوں کو بعض وقت مُلک کے چھوٹے معاملات سے چشم پوشی کر کے سطحِ مرتفع دکن کے بڑے مسائل سُلجھانے پڑتے تھے۔ اب جو مُلک کی سیاسی تقسیم ہوئی تو اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ بیدر والی چھوٹی قلمرو کو چھوڑ کر باقی چار سلطنتیں، نظام شاہی، عماد شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی لسانی بنیاد پر قائم ہوئی تھیں۔ نظام شاہی مہاراشٹر کی سلطنت تھی جہاں مرہٹہ قوم آباد تھی اور مرہٹہ زبان بولی جاتی تھی۔ بیجا پور کرناٹک کی سلطنت تھی جہاں کنڑی زبان بولی جاتی تھی اور کنڑی روایات تھیں اور گولکنڈے والی سلطنت موجودہ آندھرا پردیش پر حاوی تھی جہاں تلنگی زبان رائج تھی اور تلنگی تمدن کا بول بالا تھا۔ برار بھی اپنے جغرافی خصوصیات کے ساتھ ہمیشہ جداگانہ خطہ رہا ہے اور جداگانہ انفرادیت کا طالب رہا ہے۔ یہ لسانی تقسیم اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ دور دکنی بہمنی دستور ساز ان جغرافی و لسانی و ثقافتی امتیازات کو خوب سمجھتے تھے اور جب ان لوگوں نے دکن کا دستور بنایا تو ان امور کا پورا لحاظ رکھا اور لسانی بنیادوں پر مُلک کی صوبہ داری تقسیم کی تھی۔ مُلک کے صرف چار جغرافی اور لسانی صوبے بنائے تھے، جن کو وہ "طرف" کہتے تھے اور صوبہ دار کو "طرفدار" کہتے تھے، اور اس اصولی تقسیم کا مقصد یہ تھا کہ ان خطوں کے باشندے اپنے جغرافی حدود کے اندر اپنی زبان اور روایتوں کو اُجاگر کر سکیں۔ چنانچہ بہمنیوں کے ڈیڑھ سو سالہ دورِ حکومت میں اہلِ دکن نے اپنی زبانوں اور روایات کو خوب ترقی دی۔ وہی چار خطے جو چار صوبوں کی صورت میں بہمنی وحدت میں منسلک تھے اب ذی اختیار قلمرو کی صورت میں نمایاں ہو گئے۔ ان قلمروؤں کا وجود بہمنی تقسیم کا رہینِ منت تھا۔

دکن کی یہ سیاسی اور ارضی تقسیم دیکھنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ سنہ ۱۴۹۰ء میں بہمنیوں کا ہمیشہ کے لیے چراغ گُل ہو گیا اور ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا، لیکن بہمنی تاریخ کا یہ ایک دلچسپ منظر ہے کہ گو پورا مُلک ذی اختیار قلمروؤں کو

فسکل میں بٹ گیا لیکن آیندہ پچاس سال تک بہمنی تاج و تخت باقی تھے۔ ان بادشاہوں کا نام تھا اور
سکے چلتے تھے۔ اگرچہ بہمنی خاندان کے آخری سلاطین محمود شاہ، احمد شاہ علاء الدین ثانی ولی اللہ کا
شاہی محل کی زینت بنے ہوئے اور بریدوں کے ہاتھ میں جکڑے ہوئے تھے لیکن حکومت انھیں کے نام سے
دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ کلیم اللہ کے مرنے کے بعد جو آخری بدنصیب بادشاہ تھا آیندہ بیس سال تک اس
چلتے تھے۔ وہ دنیا میں نہ تھا لیکن اس کے نام کے سکے جاری تھے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ جب تک محمود شاہ جس
دکن کی تقسیم ہوئی ہے، زندہ تھا اس کے پیغام پر دکن کے حکمران دوڑے آتے تھے۔ چنانچہ ۱۴۹۳ء میں
جو گوا اور کونکن کا گورنر تھا بغاوت کی تو خود محمود شاہ نے اس پر حملہ کیا اور اس کے اشارے پر دکن کے
بادشاہ کی مدد کے لئے اپنی فوجیں لائے تھے اور اس کے بعد ۱۵۰۳ء میں والیٔ بیجاپور یوسف عادل خاں پر حملہ
اس نے دکن اور ہندوستان کی روایات کے خلاف شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا تھا تو محمود شاہ
حملہ کردیا، لیکن اس حملے میں دکن کے اور حکمران بھی بادشاہ کے بلاوے پر دوڑے آئے تھے اور یوسف
بھاگنا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ بہمنی تاج و تخت کی جلوہ ریزیاں برسوں تک باقی تھیں، کیونکہ بہمنی سلاطین
دوران میں دکن کی جو تمدنی آبیاری کی تھی وہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ اہلِ دکن کے دلوں پر اس
بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے خاندان کی بادشاہی جچتی نہیں تھی۔ گولکنڈہ، بیجاپور
برار کے جدید حکمرانوں میں پشتوں تک شاہی جاہ و جلال پیدا نہیں ہوا۔ ان کی رعایا ان کو "شاہ" کہتے
چڑھاتی تھی، لیکن یہ حکمران بھی اپنے کو "بادشاہ" کہتے ہوئے شرماتے تھے، کیونکہ اس وقت محمود شاہ بہمنی
جانشین بیدر میں موجود تھے، ان کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بادشاہ کہنے کی کس کو جرأت ہو سکتی تھی۔
دکن میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان تاریخوں کے مصنفوں نے ان تمام حکمرانوں کو "شاہ" لکھ دیا اور یہ ا
بیجا تصرف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دو تین پشتوں تک ان حکمرانوں نے اپنے کو "شاہ" نہیں کہا بلکہ صوبہ
قناعت کرتے رہے۔ چنانچہ مورخ فرشتہ صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ان حکمرانوں کے نام کے ساتھ "شا
اس کا تصرف ہے۔ والیٔ احمد نگر احمد نظام الملک کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "خطاب پدر را برخود اطلاق
بہ احمد نظام الملک گردید۔ ہر چند آن جناب لفظِ شاہ برخود اطلاق نکردہ۔ اما چون شہرت او در د
ہر آئینہ فقیر حقیر محمد قاسم فرشتہ او را احمد نظام شاہ یاد کردہ مرقوم نامۂ تحقیق میگرداند"[1]۔ ان حکمرا
جاری کئے وہ سب محمود شاہ کے نام سے مسکوک تھے۔ یہی احمد نظام الملک ہے جس نے سب سے پہلے خو

---

[1] فرشتہ مقالہ سوم ص ۹۴۔

جرأت کی تھی اور دوسرے ہمسایہ صوبہ داروں کو جو بیجاپور، برار اور گولکنڈے میں تھے اعلانِ خودمختاری کی ترغیب دی تھی۔ نوبت تو بجنے لگی جو شاہی کی علامت تھی لیکن اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور چترِ سفید اپنے سر پر بلند کیا اور خطبے سے محمود شاہ کا نام خارج کر کے اپنا نام شامل کر دیا تو اہلِ دکن میں سنسنی پھیل گئی۔ اُمرائے دکن نے نظام الملک کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا، اور فرشتہ کے الفاظ میں سبھوں نے ہمزبان ہو کر کہا کہ "با وجود سلطان محمود بہمنی چتر بر سر گرفتن و خطبہ بنام خود خواندن نہایت بے ادبی است" اس عوامی جذبے کا اثر یہ ہوا کہ احمد نظام الملک نے یہ روش فوراً چھوڑ دی اور پھر خطبے میں محمود شاہ کا نام شامل کر دیا۔[1] البتہ اس کے جانشین برہان نے جو ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹ء میں گدی نشین ہوا تھا ایک عرصے کے بعد یعنی ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ء میں لقب شاہ اختیار کرنے کی جرأت کی اور یہ اس وقت ہوا جب کہ بہادر شاہ والیٔ گجرات کے حملے سے اس کی گلو خلاصی ہوئی تھی اور بہادر شاہ نے واپس جاتے ہوئے اس کو شاہ کے لقب سے پکارا تھا۔[2] جہاں تک بیجاپور کا تعلق ہے ابراہیم اول نے جو ۹۴۱ھ / ۱۵۳۴ء میں گدی نشین ہوا تھا سب سے پہلے لقبِ شاہ کے ساتھ اپنے نام کا سکہ جاری کیا اور یہ تیسری پشت کا واقعہ ہے۔

گولکنڈے کی وفاداری تو ضرب المثل بن چکی ہے۔ اس نے سب سے زیادہ وفاداری کا ثبوت دیا۔ اس سلطنت کا بانی سلطان قلی محمود شاہ بہمنی کا دست پروردہ تھا۔ اس کو محمود گاواں کے جیتے جی کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ محمود شاہ کے عہد میں سنہ ۱۴۸۷ء میں بیدر آیا اور شاہی دربار سے توسل حاصل کر کے سلطنت کی مختلف خدمتیں انجام دیں اور بالآخر سنہ ۱۴۹۲ء میں محمود شاہ کی عنایات سے تلنگانہ کا گورنر ہو گیا اور اسی وجہ سے اس نے محمود شاہ کی زندگی تک نمک کا پاس و لحاظ رکھا اور باوجود اس کے کہ دکن کے تمام صوبہ دار احمد نظام الملک، فتح اللہ عماد الملک اور یوسف عادل خاں سب سنہ ۱۴۹۰ء میں خودمختار ہو گئے اور اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا لیکن سلطان قلی نے محمود شاہ کے حینِ حیات کوئی حرکت نہیں کی بلکہ اپنے کو محمود شاہ کا خادم اور صوبہ دار ہی سمجھتا رہا۔ چنانچہ "مسجدِ صفا" کا کتبہ جو گولکنڈے میں اس کے ہاتھوں تعمیر ہوئی تھی، اس وفاداری کا آئینہ دار ہے۔ یہ جامع مسجد جس کو "مسجدِ صفا" کہتے ہیں سلطان قلی نے ۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء میں بنائی تھی۔ اسی سال محمود شاہ کا انتقال ہوا ہے اور اس کتبے میں محمود شاہ بہمنی کا نام درج ہے۔ حالانکہ یہ محمود شاہ کی زندگی کا آخری سال تھا۔ "بناء ہذا المسجد الجامع فی زمان سلطان الاعظم المتوکل علی اللہ الغنی ابی المغازی محمود شاہ بن محمد شاہ البہمنی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ و بانیہ المتوکل الی اللہ مالک الملک سلطان قلی المخاطب بقطب الملک فی سنہ اربع و عشرین و تسعمائہ"[3] سلطان قلی نے

---

[1] فرشتہ مقالہ سوم ص ۹۶۔

[2] " " ص ۱۰۸ - برہان مآثر ص ۲۶۸۔

[3] Land Marks of The Deccan By Bilgrami p. 110

کبھی اپنے کو بادشاہ نہیں کہا بلکہ ہمیشہ قطب الملک کہتا تھا اور اس کے جانشینوں نے بھی دو پشتوں تک اپنے کو بادشاہ نہیں کہا تیسری پشت میں اس کے پوتے محمد قلی قطب شاہ نے اپنے کو قطب شاہ کہا ہے۔ یہ اس خاندان کا پانچواں بادشاہ ہے اس کا انتقال سنہ ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۲ء میں ہوا تھا اور اس وقت اس سلطنت کو قائم ہوئے تقریباً سو سال ہو چکے تھے ان حکمرانوں نے اپنے نام کے سکے تو بہت کم جاری کئے بلکہ آخر وقت تک دکن کے قدیم طلائی سکے استعمال کرتے تھے جن کو "ہون" کہتے ہیں۔

فتح اللہ عماد الملک نے والیان احمد نگر اور بیجاپور کی پیروی میں سنہ ۸۹۵ھ/۱۴۸۹ء میں برار میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھا دیا لیکن شاہ کا لقب اختیار نہیں کیا۔[1] اب رہا بریدی خاندان جس کی قاسم برید نے بنا ڈالی تھی اس کا رنگ سب سے نرالا ہے، اس کا اقتدار اور مدنی تمدن لوگوں کو کھٹکتا تھا۔ بریدی وہاں راج کرتے تھے جہاں تخت فیروزہ بچھا تھا اور محمود شاہ وارث تخت و تاج موجود تھا۔ بہمنی سلاطین کے ہوتے ہوئے برید اپنے کو سلطان یا بادشاہ کیسے کہہ سکتے تھے انھوں نے کبھی اپنے کو بادشاہ نہیں کہا اور آج تک اہل دکن ان کو بادشاہ تسلیم نہیں کرتے۔ قاسم برید اور اس کا بیٹا امیر برید تو اپنے کو بادشاہ کہتے ہوئے ڈرتے تھے اور یہ سب محمود شاہ اور اس کے جانشینوں کے نام لے کر اپنا اقتدار جتاتے تھے۔

علی برید اس خاندان کا تیسرا اور سب سے بڑا حکمران تھا جس نے سنہ ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء سے سنہ ۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء تک حکومت کی اسی نے سب سے پہلے شاہ کا لقب اختیار کیا۔ ان حکمرانوں نے جو سکے جاری کئے تھے ان پر محمود شاہ اور اس کے جانشینوں کے نام یعنی احمد شاہ علاء الدین سوم کلیم اللہ وغیرہ موجود ہیں۔ اس خاندان کا چوتھا حکمران ابراہیم برید ہے جس کا انتقال سنہ ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء میں ہوا، اس نے سب سے پہلے اپنے نام کا سکہ جاری کیا تھا، لیکن سکے کے دوسری جانب بہمنی بادشاہ کلیم اللہ کا نام مضروب ہے کیونکہ لوگ بریدی سیادت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور جب تک کلیم اللہ کا نام زیب سیاست نہیں ہوتا سکہ نہیں چلتا تھا، اور یہ عجیب لطف کی بات ہے کہ محمود شاہ کے انتقال کے بعد جو سنہ ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء میں ہوا اس کے چار جانشین تخت نشین ہوئے تھے،[2] یعنے احمد شاہ، علاء الدین سوم، ولی اللہ، کلیم اللہ وغیرہ، اور وہ برائے نام دربار کی زینت تھے۔ ان کی حکومت میں صرف نام تھا اور اقتدار بریدیوں کے ہاتھ میں تھا لیکن بیدر ہی کیا تمام دکن میں حکومت ان کے نام سے ہوتی تھی بہمنی خاندان کا آخری بے بس بادشاہ کلیم اللہ تھا جو صرف دو سال سنہ ۹۳۱ھ/۱۵۲۵ء سے لے کر سنہ ۹۳۳ھ/۱۵۲۷ء تک برائے نام شاہ شطرنج تھا اور بالآخر سنہ ۹۳۴ھ/۱۵۲۷ء میں بریدیوں کی زبردستیوں سے تنگ آکر احمد نگر بھاگ گیا۔

کلیم اللہ کے احمد نگر بھاگنے سے بہمنی خاندان کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ سنہ ۹۳۴ھ/۱۵۲۷ء کا واقعہ ہے جب کہ ہندوستان میں مغل شہنشاہیت کی بنیاد پڑ رہی تھی اس سنہ میں جنگ کنواہہ ہوئی تھی۔ یہ بدنصیب کلیم اللہ اس امید میں احمد نگر بھاگا تھا

---

[1] فرشتہ مقالہ سوم ص ۳۰۴۔

[2] " " ص ۱۷۶۔

۔ہان نظام کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرے ۔ وہ عظمت ایسکیا حاصل ہوتی ۔ اس کی مدد
تھے ۔البتہ اس کا شاہی وقار اور شاہی روایتیں اس کے ساتھ تھیں ۔ والی احمد نگر نے بہت دھوم دھام سے
کیا اور بڑی تعظیم کے ساتھ شہر میں لایا اور اس کو تخت پر بٹھا کر خود دست بستہ اس کے سامنے کھڑا ہوگیا کہ
مالک ہے ' اور یہ تعظیم ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ ہوئی ۔[1] اس تعظیم سے شاہانِ بہمنیہ کا پرانا جاہ وجلال
ے پھر گیا اور معلوم ہوتا تھا کہ دکن کے جدید حکمران شاہانِ بہمنیہ کے نوکر وخادم ہیں ۔ احمد نگر آنے کے دو سال کے
ب بادشاہ کا انتقال ہی ہوگیا اور اس کی میت بیدر آئی اور گورستانِ شاہی میں دفن ہوئی جہاں اس کے
ے پیوندِ خاک تھے ۔یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ گو کلیم اللہ دنیا سے رخصت ہوگیا لیکن برسوں تک سکوں سے
مٹا ! اس کے بعد بھی بیدر میں تمام سکے اسی کے نام سے جاری ہوئے ۔ یہ عجیب لطف کی بات ہے کہ بیدر میں
بعد میں سال تک اس کے نام کے سکے جاری ہوئے ۔ ۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ء میں اس کا انتقال ہوا لیکن اُن کے نام کے سکے
۔ دریافت ہوئے ہیں اور ممکن ہے کہ آیندہ اور سکے بھی دریافت ہو جائیں ۔ یہ بہمنی وقار کی بہت بڑی دلیل ہے ۔
دوسرا رُخ بھی دیکھنے کے قابل ہے ۔ بہمنی آب وتاب اور اس کی روایتیں صدیوں تک دکن میں قایم رہیں
ہائے حیات میں جلوہ ریز رہیں ۔سچی بات یہ ہے کہ دکن کی چار یا پانچ سلطنتیں جو چار مختلف جغرافی خطوں میں
ان پر سرتا پا بہمنی رنگ چڑھا ہوا تھا کیونکہ آخر یہ بہمنی درخت کی شاخیں تھیں ۔ وہ نئی سیاست اور
سے لاتے ۔ان سلطنتوں کے بادشاہ اسی انداز سے جلوس کرتے اور دربار سجاتے تھے جیسے بہمنی فرمانروا
پور ' احمد نگر اور گولکنڈے کے درباروں میں فیروز شاہ اور احمد شاہ کا جاہ وجلال ٹپکتا تھا ۔ دستورِ حکومت کو
تھا ۔ مرکزی اور مقامی حکومتیں بہمنی تنظیم کی نقل تھیں ۔ وزراء کے نام اور قلمدانِ وزارت وہی تھے جو
کے زمانے میں تھے ۔ وزیرِ اعظم کو پیشوا ، وزیرِ فینانس کو میر جملہ ، وزیرِ داخلہ وزیرِ کل اور وزیرِ فوج کو
م سے پکارتے تھے جو بہمنی اصطلاحیں ہیں ۔نظامِ قانون خواہ وہ فوجداری ہو یا دیوانی ' سب کا سب
نم ونسق کے تمام اصول تمامتر بیدر کے محکموں سے اخذ کئے گئے تھے ۔ نظامِ مالگذاری اور محاصل بھی
ے تھے ۔داعی ورعایا کے خوشگوار تعلقات اور مذہبی رواداری کی زرین روایتیں جو بہمنی بادشاہوں نے
دکن کی تمام سلطنتوں میں جاری رہیں ۔ مذہبی رواداری اور رعایا پروری کی بنیاد پر بہمنی سلطنت قایم تھی ۔
نے انھیں روایات کے زور سے اپنی رعایا کے دل موہ لئے ورنہ دکن کی دراوڑی قوموں میں جو زبان اور
ے اجنبی تھیں ان سلاطین کی ہر دلعزیزی کیسے پیدا ہوتی ! اس کے علاوہ تمدنی لطافت اور علم وفضل کا زرین سرمایہ

---

[1] مقالہ سوم ص ۳۶۷ ۔

جن سے دکنی سلطنتیں جگمگا رہی تھیں وہ بہمنی بادشاہوں کا ترکہ نہیں تو کیا تھا۔ اسی سرمایۂ حیات سے تو یہ سلطنتیں سربلند ہوئیں۔ دکنی زبان جس کو گولکنڈے اور بیجاپور کے دربار اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں بہمنی زمانے کی پیداوار ہے۔ بہمنی دَور میں ہی یہ پودا لگا تھا اور اس کے بعد گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں نے اس کو اتنا سینچا کہ وہ ایک تناور درخت بن گیا۔ پندرھویں صدی کے اوائل میں جو فیروز شاہ بہمنی کا عہد ہے حضرت بندہ نواز رحمتہ اللہ علیہ نے "معراج العاشقین" کے نام سے تصوف میں ایک بلند پایہ کتاب تصنیف کر دی تھی جو ٹھیٹ دکنی زبان میں ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہمنی زمانے میں دکنی معمولی بول چال کی زبان نہیں رہی تھی بلکہ علمی زبان بن گئی تھی اور وہ اس قابل ہو گئی تھی کہ اس میں بلند پایہ علمی کتابیں تصنیف ہو سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ سترھویں صدی کے وسط سے دکن میں جو مرہٹوں کا احیا ہوا اور مرہٹہ راجدھانیاں قایم ہونے لگیں تو ان کی سیاسی تنظیم بھی بہمنی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سیواجی نے اپنی سلطنت میں جو وزارتی تنظیم کی تھی اس کا پورا ڈھانچہ بہمنی تھا۔ اس کے وہی وزراء تھے جو بہمنی سلطنت میں ہوتے تھے بعض اصطلاحیں بھی بہمنی تھیں، مثلاً وزیر اعظم کو "پیشوا" وزیر مال کو مجموعہ دار کہتے تھے اور یہ اصطلاحیں تو برسوں تک تھیں اور پیشواؤں کے نام سے تو مرہٹوں کا ایک بڑا خاندان کھڑا ہو گیا۔

پروفیسر سید سراج الدین
شعبۂ انگریزی جامعہ عثمانیہ

فراسٹ اور اس کی شاعری

۱۹ برس کی عمر میں جب فراسٹ کی پہلی نظم نیو یارک کے ایک پرچہ میں چھپی تو اس کی ماں تو خوش ہوئی لیکن دادا کو، جو باپ کے مرنے کے بعد اس کا سرپرست تھا، بڑی تشویش ہوئی اس نے خیال کیا کہ یہ شخص تو اب ہاتھ سے گیا۔ یہ سوچ کر اس نے تجویز کی کہ ایک سال تک رابرٹ فراسٹ صاحب مشق سخن کرتے رہیں اگر اس عرصے میں کامیاب ہوئے تو مضائقہ نہیں، شاعر بن جائیں اور نہ یہ عہد کریں کہ پھر کبھی ایک مصرعہ بھی نہیں لکھیں گے۔ سنتے ہیں کہ فراسٹ نے ایک نہیں، بیس سال کی مہلت مانگی۔ یہ ذکر میں نے اس وجہ سے چھیڑا کہ آپ فوراً یہ جان لیں کہ آپ کا سابقہ ایک ایسے شخص سے ہے جو واقعی شاعر ہے، شوقیہ شعر گو نہیں، جس کو شروع ہی سے یہ احساس ہے کہ اسے شعر کہنا ہے اور بس شعر اس کی تقدیر ہے۔

فراسٹ نے سوائے شاعری کے اور کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کیا۔ ویسے کئے اس نے بہت سے کام۔ ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد کے بارہ سال مختلف کام کرتا رہا۔ ملوں میں کام کیا، پاپوش سازی کی، مدرسی کی۔ پھر ہارورڈ میں دو سال طالب علم رہا اور بغیر کوئی ڈگری لئے یونیورسٹی چھوڑ دی۔ مایوس ہو کر اس کے دادا نے اسے کچھ زمین خرید دی اور دس سال تک فراسٹ اور اس کی نوعمر بیوی نیوہیمپشائر کے ایک کونے میں عشق اور کاشت کاری کرتے رہے۔ ان دونوں کو کاشت کاری سے کوئی خاص شغف تو نہ تھا لیکن عزلت گزینی اور آوارگی کی خواہش نے ان کا دامن کھینچا اور دس برس فراسٹ نے گوشۂ تنہائی میں گزار دیے جیسے شعر لکھتا ہے

آخر لوگوں نے مایوس ہو کر ہم دونوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔"

وہ ایک نظم میں لکھتا ہے ؎

یہ سوچ کر کہ ہم کو سمجھنے میں ان سے غلطی ہوئی تھی، اور ہم کبھی سڑک کے کنارے، کسی کونے میں،
دو شریر، آوارہ، بہشتی ہستیوں کی طرح بیٹھ کر یہ کوشش کرتے ہیں کہ دیکھیں ہم اپنے آپ کو
دور افتادہ محسوس کر سکتے ہیں یا نہیں۔"[1]

پھر ایک روز فراسٹ نے اپنی زمین بیچ دی اور انگلستان چل دیا۔ وہاں بھی اس نے دورافتادگی کو اپنایا اور گلوسٹر میں کچھ زمین لے کر کاشت کاری کی کوشش کی۔ سردیوں میں ایک شام آگ تاپتے، اپنی نظموں کے اوراق الٹتے ہوئے اسے خیال آیا کہ

---

[1] In Neglect, Poems, Holt & Co. 1946 P. 18

ممکن ہے کوئی انھیں چھاپ بھی دے۔ اور ایک روز یوں ہی اپنی نظمیں لے کر وہ ایک ناشر مسز نٹ کے پاس جا پہنچا، جس سے
اور مسز نٹ نے واقعی انھیں چھاپ دیا۔ یہ اس کا پہلا مجموعہ تھا، ایک لڑکے کا عزم (A Boy's will)
انگلستان میں نقادوں نے ان نظموں کی بڑی داد دی۔ فراسٹ کی زبان کی سادگی، اس کے تیز مشاہدے اور ایک خ
فضا نے جو اس کی نظموں میں تھی لوگوں کو مسخر کر لیا۔ انگلستان میں ان دنوں شاعری کے جارجین (Georgian
دور کا عروج تھا جس میں قدرت اور اس کی دلفریبی کا خاص مقام تھا لیکن جارجی شاعری کی نیچر الوار کی چھٹی منانے والے، بے فکر
نیچر تھی۔ فراسٹ کی فطرت ایک ایسے شخص کی فطرت تھی جو کاشتکار بھی تھا اور قلندر بھی، جس کے لئے قدرت ایک حد
ایک سِرِّ نہاں بھی تھی۔

ایک سال اور گزرا اور ۱۹۱۴ء میں فراسٹ کا دوسرا مجموعہ (North of Boston)
یہ بھی غضب کی کتاب تھی۔ اس کی زبان چیت بات چیت کی زبان تھی جو ایک خاص چاشنی پا کر شاعری بن گئی تھی۔ ا
اس قدر بے روک اور بے تکان ہے کہ یہ اچنبھا ہوتا ہے کہ یہ روزمرہ کے کاروباری بات چیت الفاظ شعر کیسے بن
ہم اسے سہل ممتنع کہیں گے یعنی وہی میر والی بات کہ بظاہر تو کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ابہام بھی نہیں لیکن شعر
یہاں یہ بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ سہل ممتنع ایسا کمال نہیں جو محض لسانی ہو۔ یہ سادگی دراصل
جو تجربہ شاعر بیان کرنا چاہتا ہے وہ اتنا گہرا اور وسیع ہے کہ اس کی طرف بس ایک بے ساختہ سا اشارہ
اس کی تشریح فضول ہے۔ جیسے میر کا یہ شعر کہ

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میر   کیا دوانے نے موت پائی ہے

(North of Boston) میں بھی فراسٹ کی نظموں کی سیدھی سادی، چند
معنی کی ایسی تہیں ہیں جو ہمیں اچنبھے میں ڈال دیتی ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کی یہ بات سچ ہے کہ اونچی شاعر
اچنبھا ہوتا ہے کہ پڑھنے والا چونک پڑے کہ یہ معنی کہاں سے نکل آئے۔

۱۹۱۵ء کے شروع میں فراسٹ جنگ کے شور سے بھاگ کر پھر امریکہ چلا آیا۔ یہاں پہنچ کر پتہ
ہولٹ اینڈ کمپنی نے چھاپ دی ہیں اور اس کی نظمیں سارے ملک میں گونج رہی ہیں اور لوگوں نے ا
اسے امریکی شاعری کے ایک نئے دور کا سرہنگ بنا دیا ہے۔

لیکن فراسٹ نے ایک خاص فراسٹانہ حرکت یہ کی کہ پھر ایک فارم خرید لیا اور پانچ سال
وہی دوری، تنہائی، عزلت۔ لیکن یہ سلسلہ نہیں کیونکہ ادبی امریکہ کے سارے دروازے یکایک اس پر کھ
۱۹۳۶ء تک وہ مختلف کالجوں اور اداروں میں "شاعر پروفیسر" کی حیثیت سے مقیم رہا۔ ہارورڈ

rd, Michigun, Amhurst, Massachusatt and Dartmouth.

چارلس ایلیٹ نارٹن لیکچرر ہے، چار دفعہ اسے شاعری کا سب سے اونچا امریکی انعام Pulitzer prize دیا گیا، کیمبرج، میسچوسٹس، میں اس نے ایک مکان خریدا اور ورمونٹ Vermont. میں پانچ فارم۔ فارم کی عزلت گزینی کی زندگی ہمیشہ اس کی دامن گیر رہی۔

North of Boston کے بعد ۱۹۴۹ء تک جب اس کا مکمل کلام چھپا فراسٹ کی نظموں کے کئی مجموعے شائع ہوئے[1] (A Boy's will) سے لے کر Masque of Mercy. تک ان کی تعداد دس ہوتی ہے۔ پھر کئی برس کے وقفے کے بعد ۱۹۶۲ء میں ۸۷ برس کی عمر میں، فراسٹ نے ایک اور کتاب In the clearing شائع کی جس کی بعض نظموں کے چھوٹے چھوٹے تیز مصرعے اب بھی، اس بڑھاپے کے باوجود، زندگی کی حرارت سے گرم ہیں، یہ ضرور ہے کہ یہ حرارت قلبی نہیں دماغی ہے۔

رابرٹ فراسٹ کا باپ[2] جو نیو انگلینڈ کا باشندہ تھا، ایک ایسا شخص تھا جسے عام زبان میں بے چین روح کہتے ہیں۔ نیو انگلینڈ سے بیزار ہو کر وہ کیلی فورنیا چلا گیا تھا جہاں سان فرانسسکو میں ۱۸۷۵ء میں رابرٹ فراسٹ پیدا ہوا۔ ساری زندگی فراسٹ کے باپ نے نیو انگلینڈ کا رخ نہیں کیا اور اس کی مذمت کرتا رہا لیکن مرا تو وصیت میں یہ لکھ چھوڑا کہ اسے نیو انگلینڈ میں دفنایا جائے۔ ایک عجیب تضاد! رابرٹ فراسٹ میں بھی ایسے کئی تضاد موجود ہیں جو اس کی شخصیت اور شاعری کی جان ہیں۔ ان قدروں کی ہم دوشی نے اس کی نظموں کو ایک تناؤ اور طنطناہٹ بخشی ہے جو ان کی تاثیر کی ضامن ہے۔ امریکی تنقید کے ایک نئے مکتب نے اسی تناؤ (Tension) کو شاعری کی بنیادی صفت قرار دیا ہے یعنی ہر نظم ایک ایسا ربط ہو جس کے تار کھنچے ہوئے ہوں۔ فراسٹ کی نظموں کے تار ان قدروں کے درمیان کھنچے ہوئے ہیں جو اس کی شخصیت میں پیوست ہیں۔ وہ بہ یک وقت تنہا بھی ہے اور انسانوں میں ملا ہوا بھی، آدمی کی تنہائی اور اس بے پایاں کائنات میں اس کی بے حیثیتی کا بھی قائل ہے اور اس کی محبت اور کائنات میں اہمیت کا بھی، اس میں دہریت بھی ہے اور روحانیت بھی، الحاد بھی، ایمان بھی۔ آپ نے اس کا وہ مشہور شعر تو سنا ہوگا۔

"اے خدا میں نے تجھ پر جو چھوٹے چھوٹے مذاق گھڑے ہیں انہیں معاف کر دے، اور میں اس ایک
بڑے مذاق کو معاف کر دوں گا جو تو نے مجھ پر کیا ہے۔"

---

[1] Mountain Interral, 1916. A Further Range, 1936 West Running Brook, 1928. New Hampshire, 1923. Masque of vision, 1945. Staple Bush, 1947 A Witness Tree 1942. Mercy, 1947.

[2] William Prescott Frost

فراسٹ کی ذات اور اس کی نظموں میں تضادوں کی اس اہم جلیبی کے ذکر کے بعد ایک اور بات عرض کرنی ہے جو اس کی شاعری میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ فراسٹ نے اپنے ایک مضمون (The Constant Symbol) میں لکھا ہے کہ شاعری کے متعلق اس نے جو بیسیوں باتیں کہی ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ شاعری دراصل رمز کا نام ہے۔ ہر نظم ایک استعارہ ہے ورنہ کچھ نہیں۔ بات کہی کچھ جائے مطلب کچھ ہو یعنی وہی "سترِ دلبراں در حدیث دیگراں" والا قصہ۔ بات تو ہو رہی ہے کسی پھول کی، کسی ندی نالے کی، کسی پہاڑ کی، درختوں کی گھنی سبز تاریکی کی لیکن مطلب ہے انسانی زندگی، انسان، ازل، ابد۔ یہ بات تو آپ کے دل کو لگی ہوگی کیوں کہ رمز ہماری شاعری کے خمیر میں ہے۔ ایک طرح سے دیکھئے تو ساری اردو شاعری سترِ دلبراں در حدیث دیگراں ہے۔ فراسٹ بھی مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کی باتوں میں سموتا ہے۔ بادہ و ساغر اس کی شاعری میں مظاہرِ فطرت ہیں، عام انسان ہیں، چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں۔ "حق" سے اس کا مطلب ہمہ اوست یا ہمہ از اوست، یا "لم یلد و لم یولد" والا خدا نہیں لیکن ہے کچھ ضرور جو کبھی کبھی اس خدا کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے لیکن کوئی شکل نہیں اختیار کرتا، کوئی صفت نہیں اختیار کرتا، نہ قہر کی نہ مہر کی۔ بلکہ فراسٹ کی شاعری میں "حق" محض ایک موہوم سا امکان ہے ایک مبہم ماورائی جس کا احساس تو شاعر کو ہر جگہ ہوتا ہے، کھیتوں میں، چڑیوں کے راگ میں،[1] تاروں بھرے آسمان تلے،[2] عام انسانوں کی زندگیوں میں[3] لیکن جس کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک معمہ ہے جس کے ٹکڑے عالم میں بکھرے پڑے ہیں جنھیں ملا لیں تو ممکن ہے معمہ حل ہو جائے لیکن جوڑ نہیں پاتے اور خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ معمہ بھی ایک دھوکا ہو، کائنات کی بے پایاں بے معنویت میں معنی ڈھونڈنے کی ایک خواہش۔ لیکن فراسٹ کی تقریباً ہر نظم میں ماورائی اس طرح گھس آتا ہے جیسے سمندر زمین کی خلیجوں میں:—

> "ریت کے ساحل پر جتنے لوگ ہیں ان سب کی پشت زمین کی طرف ہے اور نظریں سمندر پر
> جیسے وہ سارا دن دیکھتے رہتے ہیں . . . . .
> نہ ان کی نظریں وسعت میں زیادہ دور جا سکتی ہیں نہ گہرائی میں لیکن یہ حقیقت بھی
> انھیں اس مسلسل نظارے سے باز نہیں رکھتی"[4]

فراسٹ کی شاعری اس کی بہت سی نظموں کے ڈرامائی گفتگوئی انداز کے باوجود بنیادی طور پر تغزلی، داخلی شاعری

---

[1] "The Oven Bird" Mt. Int. Poems p. 125

[2] "Stars" A Boy's Will Poems P. 10

[3] "Death of a Hired Man", Home Burial etc. North of Boston, Poems Ps 37, 59

[4] (A Further Range, Poems. P. 347) Neither out far Nor in Deep

ے ہر ڈرامے کا اسٹیج اس کا اپنا تخیل اور اس کی اپنی ہستی ہے۔ اسی لئے اس کی شاعری فطرتاً تنہائی کی شاعری ہے' ئی جو انسان کی تقدیر ہے' جو ازلی ابدی ہے' جو دلکش بھی ہے اور مہیب بھی' جس سے شاعر خائف بھی ہے شق بھی۔ فراسٹ کے پہلے مجموعے (A Boy's Will) سے لے کر اس کی آخری کتاب (In the Clea تک یہ تنہائی اس کے ساتھ ہے' کبھی ارمان کی شکل میں' کبھی محض خارجی منظر کی شکل میں' ن کر' کبھی خواب بن کر۔ (A Boy's Will) کی نظم "Into My Own" کو لیجئے پرانے تنومند درختوں کو دیکھ کر نوجوان فراسٹ میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش ان کی گھنی' سرسبز پھیلی ہوئی ابدی تاریکی سے ہمکنار ہوتی اور کسی روز وہ اس میں غائب ہو جاتا اور کبھی کھلے میدان یا گرد آلود تا۔ "Vanlage point" کو لیجئے:-

"اگر میں درختوں سے اکتا جاؤں اور انسانوں کی جستجو ہو تو میں نور کے تڑکے پہاڑی کی
ایک ڈھلان پر چلا جاتا ہوں جہاں سے مجھے دور انسانوں کے گھر نظر آتے ہیں اور
ان سے پرے ایک ٹیلے پر ان کی قبریں۔

س کے سارے مجموعوں سے گزر جائیے آپ کو ایک محیط تنہائی ملے گی۔ اس کا عشق بھی تنہائی میں پرورش پاتا ہے' درمیان وہ اور اس کی محبوب تنہا ہیں "Love a Question" میں دکھایا ہے ۔ر افتادہ مکان میں تنہا ہیں جب ایک مفلس خانہ بدوش اندھیرے سے نکل کر ان کے دروازے پر دستک دیتا ہے دو نے اس کے کھٹکھٹانے پر دروازہ کھولا ہے لیکن سوالی بن کر رہ جاتا ہے۔ "Generations of Men" میں مقام پر جمع ہوئے ہیں جو ان کے خاندان کا مقام آغاز ہے۔ وہ سب ایک رستوران میں آنے والے ہیں لیکن رسے یہ مجمع بھی نہیں ہوتا' صرف ایک شخص اور ایک لڑکی چلے آتے ہیں اور پھر بس ان دونوں کی تیز' ذہین راں باتوں کے پس منظر میں رم جھم برستا مینہ اور نیچے وادی میں بہتے ہوئے نالے کا شور۔ "In the Cle کی ایک نظم میں[1] ایک ایسی سڑک کا ذکر ہے جس پر ساری ٹریفک بند ہو چکی ہے۔ صرف فراسٹ قدمی کرتا ہے اور اپنے خیالوں میں وہ کوئی خاموش گفتگو کرتا بھی ہے تو اس درخت سے جس کے پتے سڑک پر ما دیتے ہیں' پھر جب سردیاں آتی ہیں تو وہاں شاعر بھی نہیں آتا بس کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا چوپایہ برف پر ے نشان چھوڑتا ہوا گزر جاتا ہے۔ یہ ایسی تنہائی ہے جس میں تنہائی کا احساس کرنے والا انسان بھی دخل نہیں دیتا۔ ا یہ تنہائی حاصل بالذات نہیں۔ اس کے آغوش میں ایسے سوالات ابھرتے ہیں جو کبھی تسکین نہیں پاتے

---

[1] "Close for good"

کیوں کہ ان کا کوئی مکمل جواب فراسٹ کے بس میں نہیں۔ اس لحاظ سے فراسٹ کی تنہائی ایک ادھورے قلندر کی تنہائی ہے جس میں [illegible]شی و سرمستی نہیں جو قلندر کی شان ہے اور جو کائنات کا احاطہ کرتی ہوئی اس مبداء سرخوشی سے جا ملتی ہے جو سرمد و منصور کا خدا اور افلاطون و ارسطو کا سبب اول ہے۔

اس کی کئی وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ امریکہ میں کوئی ایسی روحانی روایت نہیں جس میں فراسٹ کی قلندری کو آسودگی مل سکے۔ لے دے کے اس کے لئے نیو انگلینڈ کی پیوریٹن (Puritan) روایت ہے جس کی بنیاد ایک کڑا اخلاقی نظام ہے جس کی ڈور یں ایک حاکم مطلق کے ہاتھ میں ہیں۔ اس نظام کی بعض اخلاقی قدریں فراسٹ کی نظموں میں یقیناً جاگزیں ہیں لیکن چوں کہ اپنی شاعری کے روایتی انداز اور ہیئت کے باوجود وہ ایک جدید اور ذہین انسان ہے یہ پیوریٹن روایت اس کے لئے کافی نہیں۔ وہ ان سوالوں کا کوئی جواب فراہم نہیں کرتی جو ارض و سما کی خاموشی میں شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، نہ اس سے اس خوف کو دور کر سکتی ہے جو اس کے دل کے کسی کونے میں بیٹھا ہوا ہے۔

دوسرے یہ کہ امریکہ ایک ایسی زبردست مادی، سائنسی روایت رکھتا ہے کہ اس میں پرورش پائے ہوئے کسی ہوش مند انسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ ایک صوفیانہ جست میں اسے پار کر جائے۔ اس روایت کا بنیادی خیال یہ ہے کہ کائنات کی ترکیب ایک ایسے ناقابل فنا مادے سے ہوئی ہے جو ایک مسلسل حالت تغیر میں ہے، ایک مسلسل اور متنوع صورت پذیری میں مصروف ہے، لیکن جو بہ ذات خود بے معنی، بے قیمت اور بے مقصد ہے[1]۔ اس نظریے سے فراسٹ جیسا جدید شاعر آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ اسے بھی دنیا کی یہ ساری مادی ترقی فضول اور لایعنی نہیں معلوم ہوتی" اگر یہ بے معنی ہوتی" وہ پوچھتا ہے" تو کوئی بتائے کہ کس لئے آج مشرق اپنے طویل اور جاں گسل گیان اور ریاضت سے چونکا ہے اور مغرب کے مادی راستے پر چل پڑا ہے؟ کیا محض مغرب کو خوش کرنے کے لئے[2]؟" مغرب کی یہ وزنی مادی روایت فراسٹ کے لئے روایتی مسیحیت کو ناقابل قبول بنا دیتی ہے لیکن دوسری طرف یہی مسیحیت جو نیو انگلینڈ کے رگ و ریشے میں بسی ہوئی ہے اسے ایک مکمل مادہ لایعنیت کو قبول کرنے سے باز رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فراسٹ نہ ان دونوں کا پوری طرح قائل ہے، نہ ان دونوں سے پوری طرح آزاد۔ اس کی حالت یہ ہے کہ "کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے"۔ نہ وہ کعبے کی طرف جاتا ہے، نہ کلیسا کی طرف۔ بہت سے جدید نقادوں نے[3] اس کی اس غیر وابستگی پر تنقید کی ہے۔ ان کے خیال میں فراسٹ شاعر کی حیثیت سے (Yeats) اور (Eliot) کے درجے کا نہیں کیونکہ فراسٹ کے برخلاف ییٹس اور ایلیٹ کے ہاں ایک باقاعدہ نظام فکر ہے جس کے

---

1. N. York "Science and the Modern World."
Whitehead New American Library of World Literature 1958 P. 18
2. Holt 'In the Clearing" P. 49 Kithy Howk Winston, 1962.
3. The New Republic 1844. " The case against Mr. Frost Malcolm Cowley Durban," Human Values in the Poetry of R. F. "George W. Nitchie
N. C. 1960

ہ سے ان کی نظمیں اور علامتیں زیادہ ریچی ہوئی اُبھری اور پرمعنی ہوگئی ہیں۔ ییٹس (Yeats) ایلیٹ،
آڈن (Auden) نے جو علامتیں گڑھی اور استعمال کی ہیں وہ مغربی علوم و اساطیر اور مائیتھولوجیکس
سے ایسی گتھی ہوئی ہیں کہ ان کو سمجھنا ایک تہذیب کی گہرائیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنا ہے۔ فراسٹ کے اشارے
ت سادہ ہیں لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان میں بے ساختگی زیادہ ہے۔

ال بہرحال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فراسٹ کی شاعری میں کسی مثبت فکر کا پتہ چلتا ہے یا اس کی ہر نظم ایک الگ قائم بالذات
یہ محسوس کرتے دیر نہیں لگتی کہ فراسٹ کی غیر یقینیت اور تذبذب کے باوجود اس کی نظموں میں ایک رشتۂ فکر
جو کبھی غائب کبھی پیدا ہے، اور جو اس کی آخری کتاب (In the Clearing) میں
چھوٹے سے فکری نظام کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس نظام کو جاننے سے پہلے اس خوف کو سمجھنا ضروری ہے جو
طرح فراسٹ کی شاعری اور شخصیت کا ایک جزو ہے۔

خوف اکثر ایک عجیب سا انجانا خوف ہے، اس خوف سے مشابہ جو بچوں کو اندھیرے میں محسوس ہوتا ہے۔
ب سے زیادہ موثر اور شاعرانہ اظہار فراسٹ کی نظم (The Fear) ہے[1] جس میں
قندیل لئے اندھیرے میں گھور رہی ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ تاریکی میں کوئی ہے، ایک چہرہ سا اسے
میں نظر آیا ہے۔ اس کا شوہر اسے یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہاں کچھ بھی تو نہیں لیکن وہ نہیں مانتی،
کر اندھیرے میں چل پڑتی ہے کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ گھر جا کر کھڑکیوں کے پردے کھینچ دینے اور کواڑوں کو
نے سے اس کا یہ خوف ختم نہیں ہوگا۔ اندھیرے میں یہ چہرہ اس کا ہر جگہ پیچھا کرے گا۔ اگرچہ بعد میں یہ پراسرار شخص
لی شاعر نکلتا ہے، غالباً فراسٹ خود، جو اپنے بچے کو لے کر گھومنے نکلا ہے لیکن نظم کا استعارہ بالکل واضح ہے۔
اندھیرے کے کنارے انسان قندیل لئے کھڑا ہے، اسے شبہ ہے کہ اس اندھیرے میں کوئی ہے جس کا اسے
ہے اور تلاش بھی۔ اپنی جگہ یہ نظم قیامت کی نظم ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ فراسٹ اس اندھیرے میں کچھ زیادہ
جاتا اور پھر کچھ فاصلے کے بعد اس کی قندیل بجھ جاتی ہے جیسا کہ اس مذکورہ نظم میں ہوتا ہے۔ یہ وہ
ہے جس سے فقر و قلندری میں سابقہ پڑتا ہے اور جس کے راستے سے بڑی ریاضت کے بعد نور کی کرن پھوٹتی ہے۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر   اٹھتے ہیں حجاب آخر کرتے ہیں خطاب آخر

سٹ میں یہ خوف دراصل ایک کازمک (Cosmic) خوف ہے۔ کائنات مادے کے ذروں کا
ئی سیلاب ہے جس میں کوئی نظم نہیں کوئی مقصد نہیں۔ اس لا متناہی بدنظمی کے کنارے انسان نے اور

---

[1] 'North of Boston' Poems, Holt. Co. 194

ساری کائنات میں صرف انسان نے تھوڑا سا نظم، تھوڑی سی خوش سلیقگی پیدا کی ہے اور یہ خوف اس کے دل پر حاوی رہتا ہے کہ کیا جانے کس روز ذروں کا وہ بے معنی سیلاب جو اس کے چاروں طرف بپا ہے اس کے اس چھوٹے سے گھروندے کو اجاڑ دے اور اپنی لایعنیت کا جزو بنالے۔ (Storm Fear) میں کم و بیش اسی خیال کا اظہار کیا گیا ہے۔

فراسٹ حقیقی معنوں میں کبھی اس خوف پر غالب نہیں آتا بس اس سے سمجھوتہ کر لیتا ہے کیونکہ وہ ادھورا قطعی ہر اس کے لئے انسان کی ہر وہ کوشش جو تنظیم اور فارم کو جنم دے ایک کارنمک اہمیت کی حامل ہے چاہے وہ شاعر کی نظم کیوں نہ ہو۔ فراسٹ کے نزدیک ہر نظم اس عظیم بے نظمی کو کم از کم تھوڑی دیر تھامنے کی ایک کوشش ہے جو کائنات میں بپا ہے۔ وہ اسے " A momentary stay against confusion " کہتا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ فراسٹ نے اس خیال کو اپنایا ہے کہ جب مقصد و ارادہ انسانی دنیا میں اس قدر اہم ہیں اور آدمی روح کی گہرائیوں میں پیوست ہیں تو پھر لوگ چاہیں کچھ کہیں گمان غالب یہ ہے کہ مقصد و ارادہ کائنات کا جبلی آدیش ہے اس لحاظ سے انسان کائنات کی خواہش تنظیم کا سب سے اہم کارندہ ہے، لہٰذا سائنس زندہ باد، مشین زندہ باد، یہ کارندہ چلتا رہے، کاروبار کی سمت ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے[3]۔ فراسٹ کے خیال میں اس سے بحث نہیں کہ یہ مقصد و ارادہ کسی ہستی کا یا محض ایک قوت ہے جو اور قوتوں کے ساتھ نشو و نما پا رہی ہے اور ایک تشکیلی کاروبار میں مصروف ہے اس کے ایمان کے بس یہ جاننا کافی ہے کہ اس سارے ہنگامۂ آب و گل کے پیچھے ایک مقصد کارفرما ہے[4]۔ اس لحاظ سے فراسٹ ایک ایسا صوفی ہے ایک خاص مقام تک آکر رک جاتا ہے، جسے عرفان حاصل نہیں ہوتا۔ وہ حیرت اور شک کی منزلوں تک تو پہنچ جاتا ہے جو تصوف کی اہم منزلیں ہیں لیکن یہاں آکر "جنوں" کا ساتھ چھوڑ دیتا اور "عقل" کے دائرے میں آجاتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے شعروں میں وہ ہمہ گیر مستی اور انبساط نہیں جو مثلاً حافظ کے ان اشعار میں ہے:-

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند ۔۔۔ گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند
نقطۂ عشق دلِ گوشہ نشیناں خوں کرد ۔۔۔ ہمچوں آں خال کہ بر عارضِ جانانہ زدند

· A Boy's Will, Poems, P. 11
· Accidentally on purpose, In the C. L. P. 340.
· Kitty Howk, In the Clearing, Ps. 57, 58
· Accidentally on purpose, In the Clearing P. 34

...شاہ آبادی

حرفِ آشنا

...ِشنا"۔۔۔ صفیہ اختر کے اُن خطوط کا دوسرا مجموعہ ہے جو انھوں نے بہ زمانۂ عشق و ازدواج اپنے دوست...
...ر اختر کے نام یکم اکتوبر ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک لکھے اس مجموعے میں زبیر فاطمہ صاحبہ کا پیش لفظ بھی
...ں سے صفیہ اور اختر کے شادی سے پہلے اور بعد کے باہمی تعلقات عشق و اشتیاق کی بڑی پاکیزہ اور
...ئی ہوتی ہے لیکن خود زبیر فاطمہ، اختر یا صفیہ سے کیا رشتہ رکھتی ہیں اس کی وضاحت نہیں ملتی جو تقریباً
...ہر ا

...آشنا" سے پہلے بھی صفیہ اختر کا ایک مجموعۂ خطوط "زیرِ لب" چھپ کر مقبول خاص و عام ہو چکا ہے جو اپنی
...، اور تحریک آفریں اندازِ بیان کے اعتبار سے حکایتی ادب میں ایک خاص مقام رکھتا ہے جس کے متعلق پہلے
...ل. "زیرِ لب" میں ۲۴ر دسمبر ۱۹۴۹ء سے ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۳ء تک یعنی شادی کے چار پانچ سال بعد
...ط ہیں اور "حرفِ آشنا" میں بعض خطوط ایسے بھی ہیں جو شادی سے قبل لکھے گئے ہیں جن سے صفیہ کی طبع لطیف
...پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ صفیہ "حرفِ آشنا" میں "زیرِ لب" کے برخلاف اختر کی بیوی کے ساتھ ساتھ ان کی
...یہ میں بھی جلوہ گر ہیں اس لئے ان ذاتی و نجی خطوط میں بیک وقت حسنِ معصوم کی پردہ داریاں بھی ہیں،
...نکاریاں بھی اسی کے ساتھ فکرِ جاناں کی ہوش ربائیاں اور غمِ دوراں کی صبر آزمائیاں بھی ہیں لیکن یہ سب کچھ
...یے میں کہ وہ اکثر مقامات پر "شاہدِ نازک خیالاں" اور "خاطرِ آشفتہ حالاں" سب کے لئے متاعِ گراں بہا کا حکم
...یہ موضوع کی تہہ داری کے اعتبار سے "حرفِ آشنا" کو "زیرِ لب" کے مقابلہ میں اگر شراب دو آتشہ کہا جائے تو
...اگر طرزِ تحریر اور اندازِ بیان کی شگفتگی و لطافت کی بنیادوں پر ان مجموعوں کا موازنہ کیا جائے تو "حرفِ آشنا" کو
...نہیں دی جا سکتی کہ ان میں علی الترتیب "شعریت" اور "تغزل" کا فرق واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ
...شعریت کہیں کہیں تغزل کی ہم کناریت تک پہنچی ہوئی ضرور نظر آتی ہے لیکن ایسے مقامات نسبتاً بہت کم ہیں۔
...یہ خاتون کا وہ فطری و تاریخی حجاب ہے جو اسے خصوصاً اپنے دوست اور عموماً شوہر سے بے تکلف بات کرنے سے
...وہ بنیادی چیز ہے جس کی بنا پر صفیہ نے ان خطوط میں "حسین اشاروں" کے بجائے "متین سہاروں" اور دقتا ڈگاہوں سے

...پ "بھی صفیہ کے اپنے شوہر ہی کے نام لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ ہے لیکن چونکہ یہ خطوط شادی کے کم و بیش چار پانچ سال بعد
...با لئے اتنی مدت میں شوہر سے ان کی ایک گونہ بے تکلفی قرین قیاس امر ہے۔ صابر

کام لیا ہے ظاہر ہے کہ ایسی اندیشناک صورت میں "تحریر و گفتگو" وہ لطیف و دلآویز کیفیت نہیں پیدا کر سکتی جسے تغزل کہتے ان خطوط میں عدم تغزل کا یا تغزل کی کمی کا قطعی سبب صفیہ کی فنکارانہ خامیاں بھی بتائی جا سکتی تھیں کیونکہ میں سے ابھی اُن کے مجموعوں میں شعریت اور تغزل کے فرق کا سبب "انداز بیان" ہی کو ٹھیرایا ہے لیکن ایسا اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ حرف آشنا خطوط میں بھی بعض مقامات ایسے ہیں جو بلا شبہ اپنے اندر تغزل کی دھیمی دھیمی مہک رکھتے ہیں مگر ایسے مقامات نسبتاً بہت کم اس کا سبب صفیہ کے خیال و بیان کی عدم مطابقت کے بجائے ان کا وہی فطری و مشرقی حجاب ہے۔ چنانچہ شادی سے لکھے ہوئے مندرجہ ذیل خط کا یہ رُسکا رُکا سا انداز بیان اس امر کی تصدیق کرتا ہے ۔۔

"غور و خوض کے بعد اس حماقت خیز نتیجے پر پہنچی ہوں کہ خود اتنا بڑا قدم اٹھا رہی ہوں جو شاید آپ پر بھی میری دلیری کی طرف سے اچھا نقش قایم نہ کرے۔ بہر کیف میری نیت صاف ہے۔ میری خواہش ہے کہ جس دوستی میں ہمواری پیدا کرنے کی کوشش و خواہش آپ کی طرف سے ہوئی تھی وہ غلط قسم کی اطلاعات اور بدگمانیوں کی وجہ سے اس طرح منقطع ہو کہ دوستی کے امکانات بھی باقی نہ رہیں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ آپ اس تحریر کو کس قدر اہمیت دیں گے، لیکن کم سے کم یہ توقع ضرور ہے کہ بیجا رسوائی نہ کیجئے گا...!"

خاص طور پر اس آخری جملہ میں "اپنی تحریر" کی "توقع اہمیت" جاننے کا شوق اور "بیجا رسوائی" کا خوف ابتدائے شوق میں پیدا ہونے کا بے نام اور رنگا رنگ جذبات نفس کا کیسا معصوم و دل نواز مرقع ہے اور اسی کے ساتھ بات بنائے نہ بنے کیسی پاکیزہ اور بینظیر مثال۔

کہنے کو تو صفیہ بظاہر کس اطمینان سے کہہ رہی ہیں کہ اس خط کا مقصد اُس دوستی کا تحفظ ہے "جس کی خواہش جاں نثار اختر" نے کی تھی لیکن خط کا محتاط و نازک انداز اسلوب خود صفیہ ہی کو اس با خبر "غنچۂ خاموش" کے روپ میں پیش کر رہا ہے جو "پھول" بننے کی آرزو لئے ہوئے "موج نسیم" کا بے تابانہ انتظار کر رہا ہو۔ علی الخصوص اقتباس ذیل صفیہ کی اس حالت منتظرہ کی گویا قسم کھا رہا ہے۔

"اس ضمن میں میری خواہش رہی کہ اسرار بھائی (مجاز) ثالث کی حیثیت اختیار کر کے درمیانی معاملات کو سلجھا سکیں مگر انھیں جھجک کافی ہونے سے یا پھر یہ کہ آپ کو اس قسم کا خیال ہی نہ آیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی نوبت نہ آسکی۔ اس مرتبہ ۱۶ / ۷ کو اپنی دوست آمنہ منظور کے ہاں سے واپسی پر اسرار بھائی سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ آپ کی آمد کی خبر سنکر میں نے پھر اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ آپ سے اس گفتگو کو چھیڑیں مگر حسب دستور بات خاموشی پر ٹل گئی۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ صفیہ کی حیثیت اس سلسلۂ شوق میں "طالب" کی ہے "مطلوب" کی نہیں لیکن ایسے طالب کی جو "تہذیب شوق" کے تمام پاکیزہ پہلوؤں سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "جذبات"

باوجود "ملکی پھلکی" "کم اور سنبھلی ہوئی" زیادہ نظر آتی ہیں۔ اگرچہ وہ اس باب میں کسی انتہا پسندی یا جذباتیت کا شکار ہوتیں تو وہ اختر کی زندگی میں شریک ہونے کی اس قدر شدید آرزو رکھنے کے باوجود ایسا محتاط و متوازن نقطۂ نگاہ اختیار نہ کر سکتیں جو اقتباس ذیل سے ظاہر ہے جس سے ان کے متین و مہذب احساسات و لب و لہجہ کی ترجمانی ہوتی ہے:۔

"اگر آپ کو موصوفہ سے اس قدر پر خلوص تعلقات رکھنے کے باوجود زندگی میں ایک خلا محسوس ہوتا ہے جسے پر کرنے پر آپ کو آمادہ پاتی ہوں۔ اگر آپ کی زندگی ہر طرح سے پر ہوتی تو اس کا مبین ثبوت یہ ہونا چاہیئے تھا کہ آپ اس ضرورت سے بے نیاز ہوتے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر مجھے یہ یقین کرتے ہوئے اپنی تذلیل نظر نہیں آتی کہ میری گنجائش آپ کی زندگی میں ہے۔"

حسب آرزو اختر کی زندگی میں "اپنے لئے گنجائش" دیکھنے کے باوصف صفیہ نے کنایۃً "موصوفہ" کی دل شکنی کا لحاظ جس خلوص و احترام سے کیا ہے اس سے ان کی وسیع القلبی و عالی ظرفی ٹپکتی ہے اور جنوں آفریں جذبات پر ان کے ضبط و اختیار کا ثبوت ملتا ہے ع درجنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست!

یہ ضرور ہے کہ فرط محبت کی بنا پر اس احتیاط و توازن کے بند کہیں کہیں ٹوٹ سے گئے ہیں جس سے بلاشبہ نقاب حسن میں ایک جنبش سی آکر رہ گئی ہے لیکن اس کے نتیجے میں کوئی ایسی "تمنا" ہرگز بے نقاب نہ ہو سکی جو ان کی مہذب اور "جائز آمادگی" کے بجائے "جذباتی سپردگی" کا پتہ دے یا جس سے ان کے عاشقانہ جذبات کی طہارت و متانت پر کوئی حرف آسکے۔ غرض یہی وہ بنیادی سنجیدگی ہے کہ وہ اپنے دل میں اختر کے لئے بے پناہ "محبت" دیکھنے کے باوصف اس محبت کو اپنی عاشقانہ طبیعت کے بجائے "عورت کی فطرت" سے تعبیر کرتے ہوئے کس متین و متوازن پیرائے میں کہتی ہیں کہ:۔

"شوہر کا تصور اب میرے لئے دیوتا کا تصور نہیں ہے ایک دوست کا تصور ہے لیکن ایسے دوست کا جو مجھ سے بہت باتوں میں فوقیت رکھتا ہو۔ خیالات میں، ارادوں میں، عمل میں اور پھر اس فوقیت کو تسلیم کرنے میں مجھے ایک ابدی سکون حاصل ہوتا ہے۔ شاید یہ جذبۂ تعظیم ہی عورت کی فطری کمزوری ہے جس سے مرد ہمیشہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ اپنی ذہنی پختگی کے باوجود مجھے یہ نسائی کمزوری حسین نظر آتی ہے۔"

عام اعتبار سے اول تو ایک "ذہنی پختگی" رکھنے والی خاتون اپنی "نسائیت" کو سرے سے "کمزوری" ہی نہیں سمجھتی چہ جائیکہ وہ اسے "حسین" بھی سمجھے لیکن چونکہ صفیہ وفا شعار عاشق پہلے ہیں اور پختہ ذہن خاتون بعد میں، اس لئے وہ اپنی عاشقانہ سادگی یا مجبوری کو ذہنی پختگی کی بنا پر کس عمدگی سے "عورت کی کمزوری" ظاہر کر گئیں۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ صفیہ کی ان عاشقانہ بے قراری کے باوجود ان کی ذہنی پختگی والا دعویٰ بڑی حد تک مدلل ہے یعنی اگر وہ حقیقتاً پختہ ذہن اور باخبر خاتون نہ ہوتیں اور اس باب میں "سر افگندیم بسم اللہ" کی قائل ہوتیں تو شادی سے قبل ازدواجی زندگی کے ایسے حقیقی اور اتنے مکمل تصور تک ہرگز نہ پہنچ سکتی تھیں جو ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہے:۔

"مجھے شادی شدہ زندگی کا کریہہ ترین پہلو ہمیشہ پچھلے وقتوں میں شوہروں کا ذوقِ ملکیت اور موجودہ تہذیب میں بیویوں کا شوہروں پر پہرہ ہی محسوس ہوتا رہا ہے۔ میرے تصورات میں میرا ہمیشہ یہی منشا ہے کہ مجھے اس غیر فطری کھینچا تانی سے بالاتر ہونا چاہئے۔ اب تک میرا تصورِ انسانیت اتنا محدود بھی نہیں رہا ہے کہ میں طے کر لوں کہ ایک مرد کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو بیوی کی زندگی میں غرق کر دے۔ انسانیت کا اتنا کم مایہ تصور انسانیت کی توہین ہے۔ شوہر اور بیوی کی دلچسپیاں، وابستگی اور مشاغل بے شمار اور مختلف النوع ہو سکتے ہیں اور ہونے بھی چاہئیں بشرطیکہ کوئی ایسا رشتہ قایم ہو جو دونوں کی زندگی میں اکثر لمحات کو ایک دوسرے کا شریک کار بنانے میں ضامن بنے۔"

صفیہ کا شوہر کو اتنی آزادی دے ڈالنے کے باوجود آخر کار ایک ایسے "رشتہ" کی بقاء و لزوم پر زور دینا جو مجموعی رشتوں کا محور و مرکز ہو، دراصل آزادیٔ شوہر قبول کرنے کے باوجود اختر کے دل میں اپنی چاہت اور اہمیت دیکھنے کا ثبوت ہے اس لچکدار اور رُکے رُکے طرزِ گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ صاف صاف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ "اختر میں شادی کر کے تمہارے شاعرانہ مشاغل اور آزادی کی حامی ضرور ہوں لیکن مجھے اس روشن خیالی اور ترقی پسندی کی کوئی ایسی سزا نہ دے ڈالنا کہ تمھیں دیکھنے کو بھی ترسنا پڑے اور زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے!"

صفیہ کو اختر کی رفیقۂ حیات ہونے کا در پردہ کتنا شوق تھا اور انھوں نے اپنے اس شوق بے پناہ کے ساتھ اپنی داخلی و خارجی زندگی اور اس کی ضرورتوں کو اختر کے سامنے جس خلوص و سادگی سے ظاہر کیا ہے اس کا بھرپور احساس خصوصاً شادی سے قبل لکھے ہوئے خطوط کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے لیکن کم از کم یہ جاننے کے لئے کہ صفیہ نے اختر کے دل میں آتشِ شوق بھڑکانے اور انھیں اپنی طرف پوری طور پر متوجہ کرنے کے لئے جو معصوم و دل نواز اشارے کئے ہیں اور اپنی طرف اختر کے دل میں غلط فہمی پیدا کر سکنے والے ہر ممکن پہلو کو جس صداقت و احتیاط سے ظاہر کیا ہے وہ ذیل کے اقتباس میں دیکھئے

"رہا عملی زندگی کا سوال، سو یہ کہنا کافی ہوگا کہ تین سال سے مجھے مزدوری کی عادت پڑ چکی ہے (مسلم گرلز کالج کی استانی کی حیثیت سے) اور اس محنت سے مجھے اپنے میں ایک قوت کا احساس ہوتا ہے۔ بس اس وقت تک اپنے آپ کو اس محنت کے لئے آمادہ پاتی ہوں جب تک میری خانگی زندگی کی مسرتیں اس کے سبب خطرے میں نہ پڑ جائیں۔ ایسی صورت میں جب کہ میری اور غالباً آپ کی بھی معاشرت (مجوبہ) قسم کی ہے۔ مالی مشکلات میں کشمکش کا امکان کم ہے۔ میری اور میرے کنبہ کی معاشرت نہایت سادی ہے۔ مجھے اسی زندگی میں تسکین نظر آتی ہے۔ میری ضروریات محدود و مختصر ہیں ایسی حالت میں میں کسی پر بار بھی نہیں بنوں گی۔"

صفیہ کا اپنی اس قابل قدر ملازمت کو "مزدوری" کہنا اور پھر اسے مرعوب کرنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے صرف اسی وقت تک ضروری بتانا جب تک کہ وہ باہمی مسرتوں کے لئے مضرت رساں نہ ہو جائے۔ گویا صاف طور پر یہ کہہ دینا ہے کہ "اختر یقین کرو کہ

اپنی معاشرت یا شخصیت ظاہر کرنے کے بہانے تمہیں اپنی ملازمت کا لالچ نہیں دے رہی ہوں بلکہ یہ محض اس لئے کہنا چاہا کہ خدانخواستہ تمہیں اپنی مالی مشکلات کے سبب مجھے اپنانے میں کوئی اندیشہ لاحق ہو۔ خاص طور پر صفیہ کا اس سلسلے میں یہ کہنا کہ "ایسے حالات میں بھی کسی پر بار بھی نہیں ہوں گی"۔ اختر کو شادی پر راضی دیکھنے کا کیسا معصوم و دلآویز نمونہ ہے اور ساتھ ہی صفیہ کی اختر کے ساتھ بے پناہ محبت و رغبت کی کیسی پاکیزہ و صالح مثال!

سچ تو یہ ہے کہ صفیہ اپنی اس آمادگی یا پیش قدمی کا جائزہ لے کر اندرونی بے قراری کو چھپانے کی جتنی کوشش کرتی ہیں وہ کمبخت اتنی ہی ظاہر ہونے لگتی ہے اور ایسا ہونا قدرتی امر ہے۔ چنانچہ (اپنے آپ کو حد اعتدال میں رکھنے کی دانستہ کوشش کے باوجود) کبھی کبھار ان کا جذب ذوق سپردگی چھپائے نہیں چھپتا۔ دیکھئے! :-

"کب ملیں گے ہم لوگ۔ سچ بتاؤ! تصویروں کی فرمائش ضرور پوری کر دوں گی گو کہ ان سے تمہارے ذوق لطیف کو صدمہ پہنچنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ بہرحال قصور میرا نہیں، تمہاری نظر انتخاب کا ہے، لہٰذا غصہ کرو تو اسی پر"۔

یہاں "قصور" کے باب میں "بہرحال" کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ صفیہ کو اب ہر حالت میں اپنا لینا چاہئے، یعنی یہ کہ اختر کو اب اپنی ہونے والی بیوی کی صورت پسند نہ ہونے کے باوجود اس کا حق نہیں رہا کہ وہ اپنے انتخاب پر نظر ثانی کرے یا ترک تعلق کی سوچے۔ شوق کی یہ معصوم ضد "طفل خوابیدہ" کی مسکراہٹ سے زیادہ پاکیزہ اور دلنشیں ہے۔

صبر و انتظار کا آخر کوئی انجام بھی تو ہوتا ہے لہٰذا صفیہ کا یہ دیرینہ جذبۂ لطیف کہاں تک ناکام و نامراد رہتا اور ان کی روح مضطرب کے پرخلوص سجدے آخر کب تک تشنۂ تاثیر رہتے۔ چنانچہ وقت نے کروٹ بدلی، اندھیرے چھپ گئے اور صبح امید مسکرائی یعنی وہ ساعت دل نواز آپہنچی جس کے لئے صفیہ کی تخلیق ہوئی تھی۔ الغرض وہ ایک طویل انتظار کے بعد شریک حیات اختر کی زندگی میں شریک ہو گئیں اور آخر کار عمر مدتوں کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا!

لیکن شادی کے بعد ابھی یہ اسیران شوق و شباب عہد نشاط سے بہ قدر ذوق محظوظ نہ ہو سکے تھے کہ غم دوراں فکر ملازمت کے روپ میں دو آرزو مندوں کے درمیان حایل ہو گیا اور صفیہ اپنی روح رواں اور مرکز قلب و نظر سے کٹ کر لوالیار سے علیگڈھ واپس آ گئیں۔ شادی کے بعد صفیہ آنے کو تو ہمت کر کے علیگڈھ واپس آ گئیں لیکن دل و دماغ اپنے ساتھ نہ لا سکیں وہ تو گویا جلوہ گاہ اختر ہی کی معطر فضاؤں میں کھو کر رہ گئے تھے۔ ایسی پریشانی میں ظاہر ہے کہ وہ متاع عزیز حاصل نہیں ہو سکتی جیسے سکون و اطمینان کہئے جس کے بغیر کالج کے معلمانہ فرائض کی ادائیگی ناممکن ہے۔ مختصر یہ کہ اختر کے بغیر صفیہ سے دو ایک ہفتے بھی چین سے بسر نہ ہو سکے اس بے چینی کی تہہ میں "تجدید ملاقات" کے ساتھ ساتھ خطوط کے عدم جواب سے پیدا شدہ اندیشے بھی تھے لیکن ابھی "بتقریب سفر" عمل بامد معانہ جا سکا تھا کہ (شاید) کالج سے رخصت نہ ملنے کے سبب کاروان آرزو پر جمود طاری ہونے لگا اور آداب ملازمت کی عدم پابندی سے اعد روانگی کے نتیجے میں "غم فردا" جھلکنے لگا لیکن بایں ہمہ صفیہ کے شوق بے تاب نے ان کی ایک نہ مانی اور وہ آخر کار

اپنے حبیب کی طرف چل پڑیں اور پھر اس حسن ظن کے ساتھ کہ جو بے قراری وہ یہاں عرصۂ حیات تنگ کئے ہوئے ہے وہیں ادھر بھی کار فرما ہوگی لیکن افسوس کہ ان کا یہ تصور غلط نکلا اور انھیں اپنے اختر کو خیر مقدمانہ سرگرمی کی بجائے مصروف شعر گوئی دیکھ کر کوفت ہوئی ۔ پھر اختر کا اس وقت معمولی سے رسمی التفات کے بعد یہ کہنا کہ "اس نظم کے مکمل ہونے تک کوئی ان سے بولے نہیں" اس پر مستزاد !۔ ایسے نازک وقت خفگی یا ضد چونکہ رفاقت دوست کے خلاف تھی اس لئے صفیہ نے بہ ہزار مشکل اختر کی یہ بے توجہی گوارا کرلی اور چپ ہوگئیں لیکن بعد میں یہ نظم سن کر اور بالخصوص یہ جان کر اس نظم "حسین آگ" کے محرک انھیں کے جلوہ ہائے شعر نواز ہیں تو صفیہ کے کیف و سرور کی انتہا نہ رہی بلکہ یوں کہئے کہ وہ خلاف توقع تھوڑی دیر کے لئے وجدانی فضاؤں میں کھو گئیں اس وقت صفیہ نے دل ہی دل میں قدرتی طور پر اپنا جو وقار محسوس کیا ہوگا وہ شرح و تفصیل سے ماوراء ہے یشوق کی اس لطیف و بے نام کیفیت کو کچھ وہی محسوس کرسکتا ہے جسے "طالب" ہونے کے باوجود "مطلوب" ہونے کا امتیازی فخر حاصل رہا ہو الغرض ادھر صفیہ مصروف دید تھیں ادھر گھڑی وقت مصروف رفتار ۔ چنانچہ ابھی جیسے آنکھ بھی جھپکنے نہ پائی تھی کہ ہفتہ عشرہ گذر گیا اور صفیہ یہی کیف ناتمام لئے علیگڈھ لوٹنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوگئیں کہ مبادا ملازمت خطرے میں پڑ جائے کیونکہ اس طرف سے وہ گوالیار آتے وقت ہی فکر مند تھیں صفیہ کو واپسی پر "بہر حال" تیار دیکھ کر عموماً اختر نے اور خصوصاً زبیر فاطمہ صاحبہ نے انھیں بہت کچھ روکا لیکن صفیہ کو اپنا مزید قیام بقائے ملازمت کے خلاف معلوم ہوا حالانکہ محبت کی بنا پر ان کے قدم مطلق نہ اٹھتے تھے ۔کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اختر تنہائی میں بغیر کسی خاص سبب کے بھی اداس رہنے کے عادی ہیں چہ جائیکہ ایسی صورت میں غرض ان حالات میں واپسی کا اقدام گو خود صفیہ کی مرضی کے بھی یکسر خلاف تھا لیکن چونکہ سخت مجبور تھیں اس لئے بچشم نمناک واپس ہوگئیں ! عشق و ازدواج کے ایسے نشہ آمیز معاملات میں عقل و خرد سے یہ مہذب وابستگی اور یہ مستقبل شناسی صفیہ کی "ذہنی پختگی" اور سنجیدگی کی کیسی کامیاب مثال ہے۔

صفیہ کو ابھی علیگڈھ پہنچے ایک آدھ ہفتہ ہی ہوا تھا کہ اختر کے بغیر ان کا جی چھوٹنے لگا ۔ گھر اور اس کی اداس خاموشی سے دل بجھتا ہوا محسوس ہونے لگا ۔غرض فرقت کی سکون دشمنی نے انھیں تصویر اضطراب بنا دیا ۔چنانچہ وہ اسی عالم جاں گداز میں اختر کو مخاطب کرتی ہیں ۔

"بعض لمحے ایسے ویران محسوس ہوتے ہیں کہ بس جی چاہتا ہے کہ اُڑ کر تم تک پہنچ جاؤں ۔تم اپنے پروگرام سے آگاہ کرو کب آؤگے ۔اب تنہائی بھاری ہے ۔میرے بار بار آنے کو رسم دنیا کے خلاف سمجھنا اور جو ان آرزوؤں کا خون پی کر رہ جانا دراصل ازدواجی زندگی کا جدید اور ترقی پسندانہ تصور رکھنے کے باوجود صالح روایات کے احترام کا کیسا نادر ثبوت ہے ! جو بیک وقت درس عبرت بھی ہے اور پیام ضبط بھی "۔

ظاہر ہے کہ اختر کی جدائی میں صفیہ کا سکون و اطمینان حرام تھا لیکن انھوں نے اکثر اپنے پریشان کن حالات سے

اپنے شاعر نازک مزاج کو ناواقف رکھا تاکہ ان کی یہ المناکی اختر کے لئے تکلیف دہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ غم انتظار سے تو انکار نہیں کرتیں لیکن اسے کچھ اس نوعیت سے ظاہر کرتی ہیں کہ یہ غم انتظار گو بایک وقت درد بھی ہے اور ان کی اپنی طبیعت و عادت بھی۔ چنانچہ لکھتی ہیں :۔

"اچھا میرے دوست کب آؤ گے! صفیہ کی زندگی کا ہر لحظہ انتظار ہی کا لحظہ ہے یہ انتظار تو اس زندگی کے شروع ہونے سے پہلے بھی اس کا حصہ تھا۔ فرق یہ ہے کہ اس وقت غیر شعوری سا تھا اور اب اس کا احساس بیدار ہے۔ بہرحال خود کو بے شمار پیار اور دعائیں۔"

یہاں اختر کے بجائے خود ہی کو بے شمار پیار اور دعائیں کرنے کا ایک مطلب تو شاید یہ ہے کہ وہ شادی سے قبل اور بعد کے طویل انتظار کیلئے اس انعام لطیف کی جائز حق دار ہیں، دوسرے چونکہ صفیہ کی نگاہ میں اپنے آپ کو پیار کرنا گویا اختر ہی کو پیار کرنا ہے۔ بہرطور پیار کا یہ طرز "من تو شدم تو من شدی" والے خشک فلسفہ کی بڑی رنگین و کیف آور مثال ہے۔

اس خوش مزاجی اور زندہ دلی کے باوصف اکثر اوقات اختر کی مسلسل جدائی انھیں سخت گراں گذرتی تھی اور کیوں نہ گذرتی، شادی سے قبل انتظار کی تیر کوئی وجہ بھی تھی لیکن شادی کے بعد بھی اس بلائے جان کا تسلط انھیں ماہئی بے آب بنا دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ شادی کے بعد صفیہ کی اول و آخر قسم کی اہم ترین تمنا ایک اور صرف ایک یعنی اختر کی دوستانہ خدمت تھی لیکن کمبخت ملازمت نے انھیں اسی سے محروم کر رکھا تھا۔ غرض شادی کے بعد صفیہ کو جن مسرتوں اور راحتوں کا یقین تھا ان کا حصول تو کجا اُلٹے وہ عذاب ہجر اور غم حیات میں اس بے طرح پیچ و تاب کھاتی رہیں کہ عیاذاً باللہ! ہرچند وہ اپنی ان کلفتوں اور درد انگیز زندگی کے بیشتر سانحات سے اختر کو دانستہ بے خبر رکھتی ہیں تاکہ ان کی یہ پریشانی اختر کی پریشانی کا باعث نہ ہو جائے۔ لیکن آخر تا کجا! چنانچہ وہ کبھی کبھار اختر سے مجبوراً شکایت بھی کرنے لگتی ہیں۔

سچ پوچھئے تو صفیہ کے جذبات لطیف کا صحیح تقاضہ تو یہ تھا کہ انھیں ہر لحظہ اختر کے ساتھ رہنا نصیب ہوتا اور عیش و نشاط سے قطع نظر ایک گونہ سکون قلب کے ساتھ ان کی زندگی بسر ہو جاتی لیکن ہوا وہی جو ان کے آرزو دشمن مقدر کو منظور تھا۔ چنانچہ وہ کبھی اپنے زندان نصیب بھائی انصار کی فکر میں گھلتیں تو کبھی مجاز کی اندیشناک آوارگی انھیں بدحواس کر دیتی۔ ان آفات سے ذرا بے فکر ہوتیں تو کبھی خود کی ـــ اور کبھی اپنے بچے جاوید اور آدیس کی تشویشناک علالت بلائے جان بن جاتی۔ ان سے ابھی پوری طرح آزادی نہ ملتی کہ اپنے دور افتادہ مجبور و مفلس والدین کی زندگی کا کوئی نہ کوئی المیہ ان کا سکون قلب ہلا دیتا اس پر اختر کی جدائی مستزاد! غرض ان پر کوئی دن ایسا نہ گذرا کہ فرط رنج و الم سے ان کی آنکھیں نہ بھیگ گئی ہوں اور انھیں اپنے مستقبل سے مایوس کن اندیشے نہ ہوئے ہوں چنانچہ اسی عالم اضطراب میں ان کی روح سے نکلی ہوئی یہ چیخ کس قدر بھیانک اور جگر خراش ہے :۔

"اب حالات اس حد پر پہنچ چکے ہیں کہ انھیں اس طور سے چھوڑے رکھنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ گھر ہر وقت

یا جیسے ساعلوم ہوتا ہے کسی وقت منہ کو آجاتا ہے تو شرمندہ ہی ہوں معلوم نہیں میری یہ تپسیا کب ختم ہوگی، بہت کر چکی ہے یہ تپسیا میرے دوست! کیا ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں؟ آخر کہاں تک پرکھوگے کتنا جانچوگے۔ دوری بہت پریشان ہے اور بہت اذیت انگیز اب تو قریب کر لو مجھے میری روح اس تنہائی سے تنگ آچکی ہے ہر طرف اندھیرا ہے! اک تمہارے چراغ کی روشنی مجھے جلا دیتی ہے تو یہ بھی اتنی دور سے"

حق تو یہ ہے کہ اس ہمت شکن اضطراب میں صفیہ نے ممکنہ حد تک اپنے دور افتادہ شوہر کو جس محبت سے اور چاؤ سے ذہنی سہارا دیا ہے وہ ازدواجی زندگی کی ایسی نادر مثال ہے جو داد کے بجائے دعا چاہتی ہے۔ خاص طور پر ۱۹۳۷ء کے غیر یقینی حالات میں علیگڑھ کی تنہا زندگی اور خوف کے سبب آٹھوں پہر جو حوصلہ شکن اضطراب لاحق رہا اس کی تفصیل اس قدر ہولناک اور ماتمی درد انگیز و جاں گداز ہے کہ خدا کی پناہ! لیکن اسی کے ساتھ ان قیامتوں میں صفیہ نے جس ممکنہ سنجیدگی اور ہمت سے کام لیا ہے وہ بجائے خود گراں قدر کارنامہ ہے ایک دیوانۂ دوست کی دانشمندی کا۔

بھوپال سے اختر کے مسلسل بلانے کے باوجود صفیہ کو کسی صاحب اعتماد و معتبر ملازم کا نہ ملنا اور ان کا یہاں سے تنہا نہ نکل سکنا اور اپنی اس نافرماں برادری سے اختر کے دل میں پیدا ہونے والے شبہات پر طرح طرح سے فکر کرنا اور مغموم و خوفزدہ ہو جانا صفیہ کی زندگی کا ایک المناک سانحہ ہے۔

بغیر کسی خاص اہتمام کے لکھے گئے ان نجی خطوط کی حسین و جمیل اثر آفرینی اس دردناک احساس کو ابھارتی ہے: صفیہ کی جواں مرگی کے سبب ہر ادب دوست کے سینے میں موجزن ہے۔ صفیہ کے پاکیزہ و متغزلانہ احساسات کی مسلسل پامالی ـــ ان کی اذیت انگیز زندگی ـــ اور جواں مرگی ایک قیامت تھی جو مختلف بلاؤں کی صورت میں نازل ایک انسان دوست شخصیت کو "موئے آتش دیدہ" کر گئی لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس بار گراں کے باوجود صفیہ کے پائے کردار ایک لمحے کے لئے بھی نہ لڑکھڑا سکے بلکہ وہ منزل کی طرف ہر آن یہی کہتی ہوئی آگے بڑھتی رہیں کہ

الٰہی موت نہ آئے تباہ حالی میں　　　یہ نام ہوگا غم روزگار سہہ نہ سکا! (جذبی)

کشتۂ معشوق "مردہ" نہیں شہید ہوتا ہے اور شہید کو زندہ نہ ماننا نادانی ہے۔ لہٰذا کتنی مبارک ہے وہ زندگی جو موت و شمن سے اپنی بلند کرداری کی ترجمانی کا کام لے۔ سچ ہے یہ قول شفا

انھیں کو زندہ کہلانے کا حق ہوتا ہے دنیا میں　　　کہ جو مر کر بھی اپنی زندگی کی بات رکھتے ہیں

صفیہ کی اختر کے ساتھ مجنونانہ رفاقت کی روشنی میں اگر خدیجہ (اختر کی موجودہ بیگم صاحبہ) کو صفیہ کی ـــ تمنائے حیات ثانیہ ـــ کی مجسم تصویر کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کیونکہ بہ قول جامی ؎

کشتگانِ غمزۂ "معشوق" را　　　ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

ڈاکٹر سری رام شرما (ایوننگ کالج حیدرآباد)
مترجم: مولوی غلام رسول

دکن اور دکنی کا آغاز

ڈاکٹر سری رام شرما ہندی کے اُن گنے چنے ادیبوں میں ہیں جنھوں نے بہت کم مدت میں کئی دکنی کتابوں کو ہندی دنیا سے روشناس کیا۔ دکنی کی نظم و نثر کے نمونے، سب رس (وجہی) قطب مشتری (وجہی) کلیات علی عادل شاہ، خطوط غالب دو جلدوں میں مع مقدمہ و حاشیہ اور خالق باری اُن کی مقبول و مشہور تالیفات ہیں۔ موصوف نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے "دکنی ہندی کا آغاز و ارتقا" کے عنوان سے آگرہ یونیورسٹی میں مقالہ پیش کیا جس پر پنڈت شرما صاحب کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی اور یہ کتاب اب ہندی ساہتیہ سمیلن الہ آباد سے شائع ہوئی ہے جس کا پہلا باب دکنی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے اس لئے اس کا ترجمہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش ہے۔ (ا۔ ص)

گوداوری اور کرشنا کے درمیانی خطہ کا تاریخ ہند کے نشان و صفحات سے گہرا تعلق ہے۔ ہمارے برصغیر کے چاروں طرف کی وسیع آخری سرحدوں تک سیاسی، سماجی اور ثقافتی اتحاد و یگانگت پیدا کرنا نہ صرف علما ہی کے لئے، بلکہ سیاسی پیشوا افراد کے لئے بھی مشکل رہا ہے، لیکن دانستہ یا نادانستہ اسباب کی بنا پر تاریخی لحاظ سے ابتدا ہی سے یہ اتحاد بہت سی باتوں میں پایا جاتا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی علما شمال اور دکن کے تفرقہ کو گزشتہ پچھلے سو سال سے عوام کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں لیکن نسل، ذات، زبان، عقیدہ، سماجی تنظیم اور روایات کے پیش نظر شمال و دکن یا آریا اور دراوڑیوں کے درمیان علیحدگی کی جتنی مثالیں تاریخ، تقابلی لسانیات اور نسلیات کے صفحوں میں ملتی ہیں ان سے زیادہ ملک کے قدیم ادب اور عوامی زندگی میں یگانگت کی صورتیں موجود ہیں۔ ان سے شمال اور دکن کی قدرتی تقسیم کا ثبوت نہیں ملتا۔ شمال و دکن کے مختلف علاقوں میں اتحاد و یکسانیت کے اثرات برابر پائے جاتے ہیں۔ ان اثرات کے تحت ہی گوداوری اور کرشنا کے موجودہ علاقے نے بڑی حد تک مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے وندھیا چل، وردست پڑے کے ناقابل عبور پہاڑی سلسلے کو دونوں طرف کے باشندوں [illegible]

* [illegible] شمالی سمت سے وندھیا چل پار کیا تھا۔

پا پیادہ طے کیا تھا۔ اس دور میں دو آب گوداوری اور کرشنا کے سماجی حالات اور ذہنی تخیلات میں تبدیلیاں آ گئیں جو جنوبی ہمالہ سے لے کر گوداوری کی وادی تک کے افکار و خیالات کا مظہر تھیں۔ ان کا تعلق اس روحانیت اور فلسفہ سے بھی قائم ہوا جسے مقدس رشیوں اور منیوں نے سندھ، ستلج، جہلم، گنگا، جمنا اور سرسوتی کے کنارے حاصل کیا تھا۔

دکشن (دکن)، دکشنا پتھ (دکنا پتھ) ویدوں اور اسی سلسلے میں جو ادب تیار ہوا، اس میں شمال مغرب اور مشرق تینوں سمتوں کے باشندوں کی طرح دکن کے رہنے والوں کا بھی ذکر ملتا ہے یعنی رامائن اور مہابھارت کے زمانے میں لوگ دکن کے الگ الگ صوبوں میں بسی ہوئی بہت سی قوموں سے واقف تھے۔ قدیم ادب میں دکشنا پتھ اور دکن کا لفظ محض سمت کو ظاہر نہیں کرتا۔ ابتدا میں "دکشنا پتھ" کے لفظ کا استعمال اس راستے کے لئے ہوتا تھا، جو وندھیاچل سے دکن کی طرف جاتا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس راستے آس پاس کے آباد صوبے کے لئے "دکشنا پتھ" کا لفظ مستعمل ہونے لگا۔ جب کہ نل دمینتی نے اپنی مصیبت کے وقت ڈنڈکا رنیے یعنی وہ جنگل جو نربدا سے لے کر گوداوری کے کنارے تک پھیلا ہوا ہے اور اس سے متصل چھوٹے چھوٹے جنگلوں کو پار کر کے دکن کا رخ کیا، تو وہ دونوں ایسے مقام پر پہنچے، جہاں مختلف راستے ملتے تھے۔ ایک راستہ ودربھا کو جاتا تھا اور دوسرا کوشلوں کے خطے کو۔ دکشنا پتھ کو جانے والے راستے وہاں سے نکلتے تھے[۲]۔ اس طرح مہابھارت کے زمانے میں "دکشنا پتھ" کا لفظ خاص علاقے کے لئے استعمال ہونے لگا تھا۔ دکن کے دراوڑیوں کا صوبہ "دکشنا پتھ" سے جدا تھا، چنانچہ مہاراجہ دسرتھ نے کیکئی کے غصہ اور خفگی کو دور کرنے اور دلجمعی کے لئے اس سے کہا تھا کہ دراوڑ، سندھ سوویر، سوراشٹر، دکشنا پتھ، انگ (بنگال)، انگ (چمپا پوری)، مگدھ، متس لیسے (راجپوتانے کا علاقہ)، کاشی (بنارس)، اور کوشل میں جو دولت ہے وہ سب تمھیں دے سکتا ہوں[۳]۔

گپت خاندان کے زمانے میں نربدا سے لے کر راس کماری تک کی سرزمین "دکشنا پتھ" مانی جاتی تھی۔ راج شیکھر (۸۰۰ تا ۹۲۰ء) نے آریاوَرت اور دکشنا پتھ کی سرحد ماہشمتی نگری تک تسلیم کی ہے[۴]۔

ان سب بیانوں سے پتا چلتا ہے کہ دکشنا پتھ کی شمالی سرحد نربدا بنائی گئی تھی، لیکن دکن میں اس کی حد متعین نہیں ہوئی تھی۔ مہاکاویوں (رامائن اور مہابھارت) کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں دکشنا پتھ کی جنوبی حد آندھرا سے ملی ہوئی تھی۔ والمیکی رامائن میں بعض مقامات پر دکن کے باشندوں کے لئے "داکشی ناتیے" لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دکن کے باشندے رامائن کے زمانے میں ایک ہی نام سے موسوم ہونے لگے تھے[۵]۔ راج شیکھر نے بھی داکشی ناتیے کا لفظ انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے[۶]۔

مہاکاویوں کے زمانے میں دکن مختلف علاقوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر ایک علاقے کا شخص لفظ "داکشی ناتیے" کے علاوہ اپنے علاقے کے نام سے بھی منسوب ہوتا تھا۔ اس زمانے میں دکن میں آندھرا، کرناٹک، تامل ناڈو اور کیرالا جس سلسلے سے آباد ہیں، اسی طرح مہاکاویوں کے عہد میں بھی

---

[۱] مہابھارت، ... [۲] ... [۳] والمیکی رامائن، ایودھیا کانڈ ۱۰۔ ۳۷ ... ۳۸ (۲) کاویہ میمانسا باب ۷، ص ۲۲۹۔ [۴] ... جنوبی نربدا کے کنارے پر موجودہ مہیشور، ماہشمتی نگری کہلاتی تھی۔ [۵] والمیکی رامائن بال کانڈ سرگ ۱۳ [۶] کاویہ میمانسا باب ۳ ص ۹۔

...تھے دکن میں جنوبی کی راہ سے داخل ہونے والا شخص آندھرا سے سفر کا آغاز کرتا تھا۔ سیتا جی کی تلاش میں جو شخص دکن کی سمت روانہ ہو
...نے ان کی رہنمائی کرتے وقت سگریو نے کہا تھا "وندھیا چل، نربدا، کرشنا، وینی ودا، دنڈکا رنیہ اور گوداوری کے قریب جا کر ان کے جنگلوں
...میں تلاش کرنے کے بعد آندھرا، پنڈر، چول، پانڈیہ پھر اس کے بعد آیو کھ پہاڑ پر جانا چاہیئے۔

آندھرا : دراوڑ | شمال سے دکن میں داخل ہوتے وقت پہلے آندھرا کا علاقہ پڑتا تھا۔ ماہرین لسانیات اور مورخین نے تسلیم
...کیا ہے کہ زبان اور خون کے اعتبار سے آندھرا لوگ بھی دراوڑیوں سے متعلق ہیں، مگر سنسکرت کی مہا کاویوں میں آندھرا کو اور دراوڑیوں کو
...الگ الگ شمار کیا گیا ہے۔ مہا کاویوں کے مصنف آندھرا پردیش اور آندھرا لوگوں سے واقف تھے۔ دکن کے دراوڑیوں اور دکن کے لوگوں سے
...آندھرا جدا مانے جاتے تھے۔ دشوار گذار پہاڑیوں میں رہنے والی قوموں مثلاً تال چر، چو، چیپ، وسے ثبت کی شمولیت نہ آندھرا لوگوں
...میں کی جاتی تھی اور نہ دراوڑیوں میں، یہ قومیں آج بھی ناشائستگی کی حالت میں پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتی ہیں۔ آندھرا اور کرناٹک کے
...جنگلوں اور پہاڑوں میں بسنے والے ہندستان کے قدیم باشندے گونڈ وغیرہ آج بھی اپنا وجود دراوڑیوں سے جداگانہ رکھتے ہیں۔ مہابھارت
...میں ان قوموں کا ذکر پایا جاتا ہے۔[۱] ایک مقام پر آندھرا، پانڈیہ اور کیرالہ میں سے کسی لفظ کا استعمال نہ کرتے ہوئے صرف دراوڑ لفظ کا
استعمال کیا گیا ہے۔[۲]

مہاراشٹرا | اشوک کے ایک کتبے میں کچھ دکشنی اتیے لوگوں جیسے بھوج، مہابھوج، ستیہ پتر، کیرالہ پتر، پے تے نک، پالیکے
...اور چولوں کا ذکر ملتا ہے۔ دکشناپتھ کا بڑا حصہ آگے چل کر مہاراشٹر میں شامل ہو گیا۔ دکن کے مہاراشٹری علاقے اور اس کے باشندوں کا
...ذکر مہا کاویوں میں اس شکل میں نہیں ملتا، جن صورتوں میں آندھرا، دراوڑی اور ان کے صوبوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے ...
...۵۰۰ء) نے مہاراشٹر لفظ علاقے کے لئے مختص کیا۔ ست یا شریہ پل کیشی کے باوامی والے کتبہ (۶۶۱ء) میں بھی ایک علاقے کے لئے
مہاراشٹر کا لفظ پایا جاتا ہے۔ مہاراشٹر کے تین حصے ہیں:۔

(۱) اپ رانت (کوکن)، (۲) ودربھا (۳) دنڈکا رنیہ۔ ودربھا اور دنڈکا رنیہ دکشناپتھ سے تعلق رکھتے تھے مورخین
کی رائے کے مطابق آریہ وندھیا وغیرہ کو پار کر کے دکشناپتھ میں جا بسے، کچھ آریاؤں کے بارے میں اشوک کے مذکورہ بالا کتبے سے
معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

ستیہ پتر | سات وت پتر، ستیہ پتر کہلانے لگے۔ یہ لوگ شمال سے دکشناپتھ آئے تھے۔ گوری شنکر اوجھا نے ستیہ پتر کا
...ستیہ پتر" اور کیتکر نے اس لفظ کا تعلق "ست پتر" سے بتلایا ہے۔ پتے نک کا تعلق پیٹھن (پرتشٹھان) شہر
...سے، جو لوگ مگدھ سے دکشناپتھ میں آئے وہ مہاراجک اور مہاراشٹرک کہلانے لگے۔ کچھ لوگ عام باشندوں کے لئے مہاراشٹر کا

۱۔ ...کی ... کا سنگ م اشوک ... ۱۳ ... مہابھارت ۵/۱۳۰/۲۵ ، ۲/۳۱/۱۲ ، ۶/۵۷/۴۴/۳ ، ۱۶/۲۹
۲۔ مہابھارت ۱۴/۴۲/۱۶

مقامات کے لئے مہاراشٹر استعمال کئے جانے والے لفظ میں تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ راشٹرک لوگ بنگال اور شمالی ہند کے تربیت یافتہ مہاراشٹرکوں کی مادری زبان "پان چالی" تھی۔ شمالی ہند کی ایک بہادر قوم جو ویراشٹرک کہلاتی تھی۔ مہاراشٹر میں بس گئی۔ ویراشٹرک لوگ شمالی رکرو (موجودہ میرٹھ ڈویژن) اور شمالی مدر" سے آئے تھے۔ ویراشٹرکوں کی زبان اپ بھرنش تھی۔

زیادہ تر مہاراشٹریوں اور آریوں کو مختلف ذاتوں سے تعلق رکھنے والے مانتے ہیں۔ اس بارے میں جو ثبوت پیش کئے جاتے ہیں وہ غیر اختلافی نہیں ہیں۔ اس مختلف فیہ مسئلہ میں ہم کو اس موقع پر غور کرنا غیر ضروری نہیں ہے۔ کمارل بھٹ کے زمانے میں جب برہمنوں کو پنچ گوڑوں اور پنچ دراوڑیوں میں تقسیم کیا گیا تب تامل، آندھرا اور کرناٹک کے ساتھ ساتھ گجرا اور مہاراشٹر کے برہمن پنچ دراوڑ کہلانے لگے۔

۱۱۰۰ ق۔م سے لے کر ۰۰ق۔م تک شمال کے باشندے بڑی تعداد میں دکشنا پتھ میں آباد ہوتے رہے اور وہاں سے کچھ خاندان دکن کی طرف چلے گئے۔ مذکورہ بالا دور جو گیارہ سو سالوں پر مشتمل ہے یہ ہندستانی آریائی زبان کے نقطۂ نظر سے نہایت ہی اہم تھا۔ عہد وسطی کی آریائی زبان کی تمام تبدیلیاں اسی دور میں عمل میں آئیں اور عہد جدید کی آریائی زبانوں میں جو انقلاب آیا اس کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا تھا۔ کرو، پان چال، مدر اور مگدھ سے نقل مقام کرنے والے لوگ اپنی علاقائی پراکرتوں کے ساتھ دکشنا پتھ آئے تھے۔ ان مختلف پراکرت زبانوں کے میل ملاپ سے ایک پاکیزہ اور شستہ عوامی پراکرت رائج ہوئی۔ جو "مہاراشٹری" کے نام سے مشہور ہوئی اور عرصہ دراز تک شمالی ہند والوں کے لئے بھی یہ معیاری اور ٹکسالی زبان کا کام دیتی رہی۔ مہاراشٹری نے فصیح اور بلیغ ہونے کے سبب تھوڑے دنوں میں سارے ہندوستان میں امتیازی درجہ حاصل کر لیا۔

۶۰۰ ق۔م سے بارھویں صدی تک شمالی ہند والوں کی آمد دکن میں گو وسیع پیمانے پر نہیں ہوئی، تاہم شمال سے دکن اور دکن سے شمال تک آمد و رفت بند نہیں ہوئی۔ جب تیرھویں صدی میں مسلمانوں نے دکن پر چڑھائی شروع کر دی، تو انیسویں صدی تک شمال کے ہزاروں خاندان یہاں جا کر آباد ہوتے رہے۔ اس دور کے پردیسی دکشنا پتھ تک ہی محدود نہیں رہے۔ انھوں نے چول، کرل اور پانڈیے کے باشندوں کو شکست دی اور آندھرا، کرناٹک میں بھی دور دور تک کئی نئے دیہات اور شہر بسائے۔ ان حملہ آوروں سے پہلے جو شمالی ہند والے دکشنا پتھ میں آباد تھے، ان کو بھی نو واردوں کے سامنے ہار ماننی پڑی، چونکہ نو واردوں کے قائدین ایک الگ مذہب اور ثقافت کے حامل تھے اور دوسرے دھرم اور دوسروں کی تہذیب و تمدن کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یکسر مختلف تھا۔ اس سے دکن میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

دکھن | گذشتہ پانچ چھ صدیوں سے " دکھن " کا لفظ جس محدود علاقے کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اتنے محدود علاقے کے لئے کبھی بھی دکن کا لفظ مستعمل نہیں ہوا۔ شمال میں نربدا، مغرب میں تاپتی اور مشرق میں مہاندی سے سمندر تک کی سرزمین دکن کہلاتی تھی، مگر مسلمانوں کی آمد کے بعد " دکھن " کا لفظ اس خطے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ جو کسی زمانے میں دکشنا پتھ کا حصہ تھا۔ خاندیش، برار، اپ رانت کو چھوڑ کر باقی مہاراشٹر دکھن کہلانے لگا۔ کچھ ثبوت ایسے ملتے ہیں، جن کی بنا پر کہا جا سکتا

درمیانی علاقہ دکن تھا۔

جب مغلوں نے دکن کی آزاد ریاستوں کو ختم کرکے اپنی سلطنت کی توسیع کی تو "دکن" کا لفظ بڑے وسیع علاقے کے لئے استعمال ہونے لگا۔

اکبر نے انتظام حکومت کی رو سے مالوہ، برار، خاندیس اور گجرات کو ملا کر "دکن" صوبہ بنایا تھا۔ آگے چل کر احمد نگر کا رقبہ بھی "صوبہ دکن" میں شامل ہوگیا۔ شہزادہ دانیال دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تھا[۱]۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں مالوہ گجرات کو چھوڑ کر دکن کی ہئیت اور شکل حسب سابق برقرار رکھی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں "دکن" میں آدھا ملک بہت بڑا علاقہ شامل ہوگیا کیونکہ گولکنڈہ اور بیجاپور مغلیہ سلطنت کا جز بن چکے تھے۔ اورنگ زیب کے حملے سے بہت پہلے دکن کے مسلم حکمران بیجانگر کو فتح کر چکے تھے، اس لئے بیجانگر کے ذریعے دور دراز کے مقبوضہ دکن پر مغلوں کو خود اقتدار حاصل ہوگیا۔ ان حالات میں اکبر کے عہد کی "دکنی" سرحدوں میں تبدیلی ہوئی۔ مالوہ اور گجرات دکن میں نہیں رہے۔ اورنگ زیب نے چھ صوبوں یعنی (۱) برار (۲) خاندیس (۳) اورنگ آباد (۴) حیدرآباد (۵) محمد آباد بیدر (۶) بیجاپور کو ملا کر دکن بنایا۔

اورنگ زیب کی فتح سے پہلے بیجاپور اور گولکنڈے کے حکمران اپنے کو "دکن کے حکمران" مانتے تھے۔ اگر ان حکمرانوں کے خیالات کو قبول کر لیا جائے تو بندھیاچل سے دکن تک مغلوں .... کا مقبوضہ علاقہ دو برہا اور خاندیس کو چھوڑ کر اس زمانے کے گولکنڈہ اور بیجاپور کی حکومتوں کے رقبے کو ملانے سے دکن بنتا تھا۔ گولکنڈے کے لوگ تلنگانے کو دکن کا بہترین حصہ تصور کرتے تھے۔ تلگو زبان والا صوبہ کاکتیہ خاندان کی شکست کے بعد دو حصوں میں منقسم ہوگیا تھا۔ تقریباً آدھے علاقے پر بیجانگر اور آدھے پر گولکنڈے کی حکومت تھی۔ جس صوبے پر گولکنڈے کے قطب شاہوں کا اقتدار تھا، اس کا ایک حصہ تلنگانہ کہلاتا تھا اور آج بھی کہلاتا ہے۔ اس کی نسبت گولکنڈے کے شاعر وجہی نے لکھا ہے۔

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں	پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ	انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ
دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے	کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
دکھن ملک بہتیچ خاصا اَہے	تلنگانہ اس کا خلاصہ اَہے[۲]

گولکنڈہ کا حکمران محمد قلی قطب شاہ اپنے تاج کو دکنی حکومت کا امتیازی نشان مانتا تھا۔

۱۔ دلسنِ اسمتھ۔ اکبر۔ ص ۲۰۶۔ ۲۔ قطب مشتری ص ۱۴۹ ہندی ایڈیشن

سو سیں ناریل کے پھل یوں زمرد مرتبانان جوں   ہو داس کے تاج کوں کہتا ہے پیالہ کر دکھن سارا[1]

بیجاپور کے شعرا نے بیجاپور کے بادشاہ کو دکن کا حکمران بتایا ہے۔ نصرتی اپنے سرپرست علی عادل شاہ (ثانی) کے بارے میں لکھتا ہے

دکھن زینت ہے اس فخر تے باغ باغ   کہ تس گھر میں تج سا گہر شب چراغ[2]

تاریخی پس منظر | دکن ہندستان کی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اس بڑے صوبے میں دکن کی تین زبانوں کا سنگم ہوا ہے یہاں مختلف ثقافتوں کا سرچشمہ اور ارتقا ہوا۔ کئی شاہی خاندانوں نے اس صوبے میں اپنے عہد کی رہنمائی کی اور عالموں نے ادبی تخلیق میں اعانت کی۔ اس صوبے پر ۲۰۰ ق۔م سات واہنوں کی حکومت رہی ہے۔ تروسے کو ہنگ، واکاٹک گپت، کل چری سیالوکیا راشٹ کوٹوں کے بعد یادو خاندان کے لوگ حکمران رہے ہے۔ تیرھویں صدی کے اواخر میں علاؤالدین خلجی کے حملوں کے باعث یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ دوسری طرف کاکتیا اور بیجانگر کے حکمرانوں کا سلسلہ تھا۔ یہ سلسلہ بھی چودھویں صدی میں کاکتیا کی اور سولھویں صدی میں بیجانگر کی شکست کے ساتھ انجام کو پہنچا سات واہنوں سے لے کر کاکتیوں، یادوؤں اور بیجانگر کی حکومتوں تک اس علاقے میں فن کاری، ادب اور تجارت نے جو غیر معمولی ترقی کی تھی۔ اس کی شہادت اجنتہ کے غار اپنے کمال فن کا رنگ ایلورہ کا کیلاش مندر اپنی عظمت سے اس کی شہادت دیتے ہیں۔ ورنگل اور بیجانگر کے مندر اور محلات جو برباد ہوگئے پھر بھی ان کے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے افسانے سناتے ہیں۔ زبان اور ادب کے میدان میں "گاتھا سپت شتی" اور "ہیتو بندھ" اسی عہد کی دین ہیں۔ اس اہم زمانے میں شمال اور دکن میں بہت کچھ لین دین ہوا۔ دونوں صوبوں میں پہلے سے زیادہ فکری توازن قائم ہوا۔ جس زمانے میں شمال ہند سے مسلمانوں کی قیادت میں دکن پر حملہ ہوا جدید ہند آریائی زبانیں بہت کچھ پھل پھول چکی تھیں۔ اور ادب میں اونچا مقام حاصل کرنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کا تعلق اپ بھرنش سے ٹوٹ چکا تھا۔ دکنی کے عمل ارتقا کو سمجھنے کے لئے یہ عہد نہایت اہم ہے۔ لہٰذا اس زمانے کے چند بڑے بڑے واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) تیرھویں صدی کے آخری عشرے میں دیوگری پر علاؤالدین خلجی کی فتح کے ساتھ دکن اور دکشناپتھ کی تاریخ کا نیا باب شروع ہوا۔ خلجی نے دکن پر اپنا زیادہ اثر نہ ڈالا۔ اس کے سپہ سالار ملک کافور نے دیوگری کے ساتھ ساتھ ورنگل پر اقتدار جما کر ان واقعات کے لیے پس منظر تیار کیا، جو محمد تغلق کے زمانے میں پیدا ہوئے۔

(۲) محمد تغلق کے زمانے میں کل ہند کو ایک حکومت کے تحت لانے کی کوشش کی گئی۔ دکن میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے محمد تغلق نے دلی کی بجائے "دیوگری" میں پایۂ تخت بنانے کا عزم ۱۳۲۷ء میں کیا۔ اس فیصلے کی بنا پر دلی کے فوجی افسروں، شرفا اور محنت کشوں کو دیوگری جانا پڑا۔ دیوگری کو پایۂ تخت کے مطابق بنانے میں لاکھوں روپے صرف ہوئے۔ لیکن محمد تغلق کو اپنا

---

[1] قلی قطب شاہ۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ۔ [2] نصرتی۔ علی نامہ

ارادہ بنا لیا[1] اور تمام روحانی پیروی چلی گئی۔ یہ واقعہ لسانی نقطۂ نظر سے بہت ہی اہم ہے۔ دلی سے آنے والے کئی خاندان دیوگری میں رہ گئے۔ جب تغلق خاندان کی حکومت رو بہ زوال ہو گئی تو انہی خاندانوں نے مل کر علاؤالدین بہمن شاہ کی قیادت میں بہمنی حکومت قائم کی۔ جو خاندان دلی سے دیوگری آئے اور دیوگری سے گلبرگہ گئے ان میں زیادہ تر تعداد اُن خاندانوں کی تھی جو حقیقتاً دلی کے باشندے تھے۔ کچھ خاندانوں کا تعلق دوسرے ہندی زبان والے صوبوں سے تھا۔ اس وقت کھڑی بولی کا چلن رائج تھا وہ ان خاندانوں کے ساتھ دیوگری پہنچی۔ چند مسلم خاندانوں کو چھوڑ کر کل تاجر اور مزدور پیشہ گھروں اور بازاروں میں کھڑی بولی استعمال کرتے تھے۔

(۳) ۱۳۴۷ء میں علاؤالدین بہمن شاہ نے دکن کی آزادی کا اعلان کیا اور گلبرگہ میں بہمنی حکومت قائم ہوئی۔ گلبرگہ میں مسلم ثقافت کے ایک نئے مرکز کے قیام سے دکن میں کئی ردِعمل شروع ہوئے۔ بہمنیوں کے پاس دابھول، چول، راجاپور اور گوا کی بندرگاہیں تھیں، جن کے سبب ایران، عرب، افریقہ اور ملایا سے ان کا راست ربط قائم ہوا۔ ان ملکوں کے متعدد بڑے آرزومند قسمت آزمائی کرنے والے نوجوان دلی کا سفر کئے بغیر گلبرگہ اور دوسرے دکنی شہروں میں پہنچتے تھے۔ ان لوگوں کی ادبی زبان فارسی، عربی اور ترکی تھی۔ محمد تغلق کے زمانے میں جو خاندان دلی سے آئے تھے وہ اپنے اصلی مقام سے دور ہو گئے۔ لہٰذا ان کی رفتار گفتار، وضع قطع اور رہن سہن کا نشوونما آزادانہ طور پر ہونے لگا۔ ساتھ ہی محمد شاہ (بہمنی) کے زمانے میں گلبرگہ کو مسلم ثقافت اور عربی، فارسی تعلیم کا عظیم مرکز بنانے کی کوشش کی گئی۔ محمد شاہ بہمنی ثانی نے فارسی کے مشہور شاعر حافظ شیرازی کو مدعو کیا تھا۔ گرچہ چند وجوہ سے حافظ ہندوستان نہ آ سکے۔ جو مسلمان شمال سے دکن میں آ کر بس گئے تھے، وہ اپنے آپ کو دکھنی یا ملکی کہتے تھے اور ایران، عراق اور عرب سے آنے والے مسلمان "آفاقی" کے نام سے منسوب کئے جاتے تھے۔........ آفاقی لوگ ایرانی اور عربی وضع قطع اور زبان کی نمائندگی کرتے تھے اور دکھنی لوگ تغلقی شمالی ہند کی ثقافت اور زبان کے نمائندے تھے۔ ایران اور عرب سے آنے والے لوگوں کا آپ کو مقامی ہندوؤں ہی سے نہیں مسلمانوں سے بھی ممتاز ماننا فطری تھا اور یہ بھی فطری تھا کہ دکھنی مسلمان زبان اور تعلیم کے معاملے میں آفاقیوں کا امتیاز کو قبول کرنے پر بھی احساسِ کمتری کے جذبے سے پیدا ہونے والے ردِعمل سے بچ نہ سکے۔ بہمنی خاندان کے حکمران کبھی آفاقیوں کو بڑھاوا دیتے تھے اور کبھی دکھنی مسلمانوں کو۔ بعض مقامی خاندانی ہندوؤں کی تائید بھی حاصل تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکھنی مسلمان مہاراشٹرا اور کرناٹک کی قدیم ثقافت اور زندگی کے نقطۂ نظر سے واقف ہو گئے۔ آفاقی اور دکھنی لوگوں کا مقابلہ صرف انتظامی امور ہی میں نہیں بلکہ روزمرہ زندگی اور ثقافتی میدان میں بھی موجود تھا۔ محمد شاہ بہمنی (ثانی ۱۳۷۸ تا ۱۳۹۷ء) نے غیر ملکی لوگوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اُس نے گلبرگہ کو ثقافتی مرکز بنا کر دلی کو نیچا دکھانے کی کوشش کی تھی، مگر اس کے جانشین فیروز شاہ بہمنی (۱۳۹۷ تا ۱۴۲۲ء) کو سیاسی وجوہات

---

[1] دکن کا بہمنیہ۔ ارشد خاں غوری ص ۱۱۔

دکھنی ثقافت [illegible] وت حاصل کرنا چاہا۔ اکبر کے دادا بابر (۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء) کی تخت نشینی سے ۱۳۰ برس پہلے فیروز شاہ بہمنی نے عرب و ایرانی ثقافت سے ہٹ کر دکھنی مسلمانوں، شمالی ہند سے آئے ہوئے ہندوؤں اور مقامی لوگوں کا تعاون حاصل کیا۔ بہمنیوں کی ثقافت میں زیادہ دلچسپی لی۔ گلبرگہ کنڑی زبان کا علاقہ ہے۔ یہاں کی عوامی ثقافت کا اس نے احترام کیا۔ کنڑی کے برہمنوں کو اونچے عہدے دیئے گئے۔ نرسنگھ نامی برہمن بہمنی خاندان کا استاد بنا اور بیجانگر کی راج کماری کا بیاہ فیروز کے ساتھ ہوا۔[1] فیروز کے مقبرے پر ہندو تعمیر کاری کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اُس نے مقامی ثقافت اور بیرونی اثر میں اشتراک قائم کرنے کی سعی کی۔

دکھنی کے ماہر اولین مصنف خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے والد محمد تغلق کے زمانے میں دیوگری آئے تھے اور ان کی وفات ۲۰ جون ۱۳۲۰ء کو خلد آباد (اورنگ آباد) میں ہوئی تھی۔ خواجہ بندہ نوازؒ نے ۴۰ برس کی عمر میں گلبرگہ پہنچے تھے۔ ان دنوں وہاں بہمنی خاندان کی حکومت تھی۔ بہمنی خاندان کے بادشاہوں کو دکن میں بیجانگر اور شمال و مغرب میں خاندیس، مالوہ اور گجرات کے حکمرانوں کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا۔

(۴) بہمنی سلطنت کا زوال اس کے بڑے فوجی افسروں کی بغاوت کے باعث ہوا۔ سب سے پہلے امیر قاسم برید نے ۱۴۸۷ء میں بیدر میں بریدشاہی خاندان کی حکومت قائم کی۔ سنہ ۱۴۹۰ء میں بہمنیوں کی خدمت سے علیحدہ ہو کر احمد نظام شاہ نے احمد نگر میں اور یوسف عادل شاہ نے بیجاپور میں نئی حکومتوں کی بنا ڈالی۔ ان میں حکومتوں کے قیام کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے ۱۵۱۲ء میں گولکنڈے کو پایہ تخت بنا کر اپنی حکومت قائم کی۔ ان چاروں حکومتوں نے بہمنی خاندان کے بانیوں کے اصولوں پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ بہمنی حکومت کے زمانے میں دکن اور دلّی کے درمیان گہرا رابطہ نہیں رہا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ گجرات، مالوہ، اور خاندیس میں آزاد مسلم حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ یہ حکومتیں دلّی کے بادشاہوں کو الجھائے رکھتی تھیں۔ اور جب کبھی موقع ملتا بہمنی حکمرانوں کے خلاف جنگ شروع کر دیتی تھیں۔ یہ حالت بہمنی بادشاہت کے اختتام کے بعد اکبری حکومت کے ابتدائی زمانے میں بھی قائم رہی۔ جب بہمنی بادشاہت کے خاتمے کے بعد دکن میں چار مسلم حکومتیں قائم ہوئیں تو یہ ایک دوسرے سے مسابقت کرتی تھیں، مگر بیجانگر کی وجہ سے ان میں اتحاد ہو جاتا تھا۔ ان چاروں حکومتوں کی یہ آرزو تھی کہ دلّی کے مانند بیجاپور، احمد نگر، بیدر، اور گولکنڈہ مسلم ثقافت کے مرکز بنیں۔ جن حالات میں ان مسلم حکومتوں کو حکومت کرنی پڑ رہی تھی۔ ان کا یہ فطری نتیجہ تھا کہ یہاں رواداری سے کام لیا جاتا، لہٰذا مقامی فن کاری اور ادب کی بہت حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ چاروں حکومتوں میں احمد نگر نے جلدی سے ترقی کی۔ سولھویں صدی میں احمد نگر خوشحال اور منظم سلطنت تھی۔ اکبر کے حملے کے باعث چاروں میں سب سے پہلے اسی حکومت کو زوال آیا۔ (باقی آئندہ)

---

[1] دکنی کلچر۔ نصیر احمد خان، شمارہ ۱۲۲ تا ۱۲۷

رزاق فاروقی

مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک قدیم مضمون

احسن الاخبار کلکتہ کا مجھے ایک ہی شمارہ دستیاب ہوا ہے جس پر یکم جون ۱۹۰۲ء درج ہے۔ چونکہ یہ شمارہ ناقص ہے اس لیے اس میں مندرجہ ایک مضمون ناتمام رہ گیا ہے۔ مضمون کے آخر میں "آزاد دہلوی از کلکتہ" درج ہے۔ مضمون کا ابتدائی حصہ موجود نہیں۔ چونکہ اخبار کے شمارہ مذکور پر سن ۱۹۰۲ درج ہے اس لحاظ سے اس سن میں مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر صرف ۱۴ سال قرار پاتی ہے۔ مولانا کا سنِ پیدائش ۱۸۸۸ء ہے۔ اِن کے والدان کو فیروز بخت پکارتے تھے چنانچہ ان کا سنِ پیدائش اس مصرعے سے نکلتا ہے:۔

جواں بخت و جواں طالع جواں باد سبحان اللہ

۱۸۸۸ء کو ان کا سنِ پیدائش تسلیم کیا جائے تو ۱۹۰۲ء میں ان کی عمر صرف ۱۴ سال ہوگی۔ واقعی یہ بخت کی فیروزمندی تھی کہ انھوں نے اپنی کم عمری میں بلا تکلف اردو نثر کے گیسو سنوارنے کا کام شروع کیا۔ ہمیں جو چیز خاص طور پر حیرت میں ڈالتی ہے وہ مولانا کا اندازِ فکر ہے۔ چودہ سالہ لڑکے سے ملی مسائل اور وہ بھی قوم کے تعلیمی موضوع پر ڈھٹائی سے خامہ فرسائی کرنا سوائے خدا کی دین کے اور کچھ نہیں۔

میں نے متذکرہ ناتمام مضمون کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ آزاد لائبریری علیگڈھ، رضا لائبریری رام پور، سالار جنگ لائبریری حیدرآباد، اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد اور کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں احسن الاخبار کلکتہ مورخہ یکم جون ۱۹۰۲ء کا شمارہ مجھے نہیں ملا۔ اس لیے توقع رکھتا ہوں کہ اگر کسی علم دوست کو اس مضمون سے واقفیت ہو یا متعلقہ شمارہ ان کے پاس ہو تو اس ادھورے مضمون کو "سب رس" کے ذریعہ مکمل کریں گے۔

مضمون یہ ہے:۔

"کتاب اس تعلیم میں نہیں رکھی گئی جس سے احکام دین کے اسرار اور
ان کے خوبیاں معلوم ہوں، حالانکہ زمانۂ حال کے موافق اس کی
بڑی ضرورت ہے۔"

"پس اگر اس کا کوئی علاج ہے اور ہم کو سوجھتا ہے تو یہی ہے کہ جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے اور اسلام کو عقل کے موافق کر دکھایا جائے اور اس طرح کہ اسلامی معتقدات بھی قایم رہیں اور تطبیق کی تشفی بھی

ہوجائے۔ جب یہ بات طے ہوگئی تو پھر اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ہماری قوم کے وہ سربرآوردہ اصحاب جو اس کام کے اہل ہیں کیوں ایک ناگوار سکوت اختیار کیے ہوئے ہیں ۔کیا اُن کے نزدیک ہندوستان کی مذہبی حالت قابلِ اطمینان ہے؟ نہیں! بلکہ وہ حضرات خود اپنی تحریر و تقریر میں اس کا ذکر کرتے ہیں اور بعض ذی علم وعدہ بھی فرما چکے ہیں کہ ہم چناں چنیں کریں گے مگر ان کا یہ وعدہ کسی معشوق کے وعدۂ وصل کا اثر رکھتا ہے جس کا ایفا ہونا عشاق کی پرشوق نگاہ میں بالکل غیر ممکن ہے! الغرض جو حضرات اس کام کی قابلیت رکھتے ہیں انھوں نے سکوت اپنا مسلک قرار دیا ہے اس لیے مجبوراً ہم نے آج اس راہ کا سفر اختیار کیا ہے جس کی تکالیف کا تحمل ہم میں نہیں ہے اور اس دریائے ناپیدا کنار کے طے کا ارادہ کیا ہے جس کی طاقت ہم میں نہیں ہے ۔ مگر شوق ہے اور ضرورت نے مجبور کیا ہے۔ کیا عجب کہ ہماری یہ پیش قدمی کسی حسین کے جذبۂ حسن کا اثر رکھتی ہو۔ جس کے نظارہ کے لیے ہر شخص بے تاب ہو جاتا ہے اور بے اختیار مہرِ سکوت کو توڑ کر چلا اٹھتا ہے کہ ع قربان نگاہے تو شوم باز نگاہے!! آیندہ تمہید میں اسلام کی ابتدائی کیفیت اور یونانی فلسفہ کی اشاعت، علمِ کلام کی ایجاد اور اس کی پوری مفصل تاریخ پھر عربوں سے اہلِ یورپ کا فلسفہ حاصل کرنا اور اس میں حیرت انگیز ترقی آج کل کا نیا فلسفہ اور اس کی تعلیم ایک دلچسپ طریقے سے بیان کیجائیگی اور پھر اصل مضمون شروع ہوگا جس میں اوسی علمِ کلام جدید کے اصول اور فروغ سے بحث کے بعد تمام اسلامی اعتقادات، عبادات، عملیات کے عقلی اسرار اور فوائد بیان ہوں گے ۔ ناظرین مشتاق رہیں۔۱۲"

آزاد دہلوی از کلکتہ

مندرجۂ بالا عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کسی مدرسہ کے نصابِ تعلیم پر اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں! اس مضمون کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس سے حسبِ ذیل باتوں کا استخراج کر سکتے ہیں:۔

۱۔ مولانا کی ادبی خدمات کے تعین کے لیے ان کے اسلوب کی درجہ بندی میں اس ابتدائی عمر کے مضمون سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ مولانا کی تحریر کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے پاس داعیانہ پیام کی وجہ تخاطب کا انداز تحریر نمایاں ہے، اس لیے قوتِ استدلال، شکایتی لہجہ، اور پُروقار الفاظ کی بندش ہمیں ان کے ہاں نظر آتی ہے۔ یہ تمام باتیں اس ابتدائی نقش میں بھی نمایاں ہیں اور مستقبل کی نشاندہی کرتی ہیں۔

۳۔ مضمونِ زیرِ بحث میں علومِ اسلامی کی تعلیم کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے، ۱۹۰۲ء میں جو افکار پیش کیے ہیں وہی بعد میں ارتقا کے بعد یعنی ۱۲ سال بعد ۱۹۱۴ء میں الہلال کے صفحات پر ہمیں ملتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں جدید علم کلام کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کو عقل کے موافق

کہ کسا نقد کے لیے اس علم سے استفادہ کیا جائے لیکن مارچ [illegible] کے الہلال کے شذرات میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم الکلام اور قرآن پاک کی تعلیم سے واقف تھے اور جو غیر الذکر کی تعلیم پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اپنی یہ رائے انھوں نے ندوۃ العلماء کے بارے میں ظاہر کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"اس بوالعجبی پر ہمیشہ ماتم کیا جائے گا کہ تمام علومِ اسلامیہ کے درس و تدریس کا اصل مقصود قرآن تھا اور سب کے سب اس کے لیے بمنزلہ آلات و وسائل کے تھے، مگر اجرامِ سماویہ کا مطالعہ کرنے والا دوربین کے بنانے میں ایسا غرق ہو گیا کہ اُسے آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ یعنی معقولات اور فلسفۂ کلام اصل مقصود بن گئے اور قرآن اور علومِ قرآن بالکل نظر انداز کر دیئے گئے۔ پھر یہ حالت یہاں تک بڑھی کہ یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ ہمارے مدارس کا اصل مقصود کیا ہے۔؟"

۴۔ اس مضمون سے مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ابتدائی عمر ہی سے آزادانہ سوچنے کے عادی تھے، وہ یہ چاہتے تھے کہ اسلام کی بھی تفسیر جدید ہو اور اس مذہب کے اعتقادات، عبادات اور عملیات کے عقلی اسرار کا انکشاف کیا جائے۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی کی رحلت

یہ خبر نہایت رنج و غم کے ساتھ سُنی جائے گی کہ اُردو دنیا کے ایک مشہور ادیب، دکن کے مشہور محقق، حیدرآباد کے مورخ، نسوانی دنیا کے محسن، ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے مؤسسین میں سے ایک مؤسس ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ کی مجلس کے ایک رکن۔ انجمن خواتینِ دکن اور کتب خانہ انجمن خواتینِ دکن کے بانی نصیر الدین ہاشمی نے شنبہ ۲۶ ستمبر کو گیارہ بجے انتقال کیا اور درگاہ حضرت سید احمد باحیارہ (فرسٹ لانسرز) میں بعد عشاء تدفین عمل میں آئی۔

ہاشمی صاحب نے جو ادبی اور سماجی خدمات انجام دی ہیں وہ بھلائی نہ جا سکیں گی۔ ادارہ کی مجلسِ انتظامی کے خصوصی اجلاس منعقدہ ۲۹ ستمبر میں جو قرارداد منظور کی گئی حسبِ ذیل ہے۔

"مولوی نصیر الدین ہاشمی مرحوم اُردو کے بڑے عالم اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے بانیوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا وہ بحیثیت رکنِ انتظامی اپنے مفید مشوروں سے ادارہ کی رہبری کیا کرتے تھے ان کے انتقال سے نہ صرف ادارہ کو بلکہ اُردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔"

مجلس ادارت نے یہ طے کیا ہے کہ جنوری میں سب رس کا ہاشمی نمبر نکالا جائے۔ اہلِ قلم حضرات سے گزارش ہے کہ وہ مضامین نومبر کے ختم تک عنایت فرمائیں۔

پروفیسر شیخ فرید

اے عزمِ راسخ اے جذبۂ دل
جادہ بہ جادہ منزل بہ منزل
افکارِ دنیا، احساسِ عقبیٰ
ہے دو جہاں کے اک دل مقابل
احساسِ رفعت، مشکل بھی آساں
احساسِ پستی آساں بھی مشکل
حیرانیاں ہی حیرانیاں ہیں
حسنِ مجسم آئینۂ دل
عرفانِ ہستی ہوگا فرید اب
شاید یہی ہے عشق کا حاصل

اختر نظمی

کوئی شکوہ نہیں ہے کسی سے
صلح کر لی ہے اب زندگی سے
ذہن نے ایک پیکر سنوارا
روشنی مل گئی روشنی سے
اُن سے ملنے گئے اور اکثر
آ گئے دیکھ کر دور ہی سے
شوق کی پُر فضا وادیوں کا
فاصلہ ہے بہت آگہی سے
کتنے افسانے یاد آ گئے ہیں
ذکر اُن کا سنا جب کسی سے
اپنے ہی شہر سے آج اختر
ہم گذر آئے ہیں اجنبی سے

شفا گوالیاری

نفرت سے پھوٹتی ہے محبت کبھی کبھی
نورِ آفریں بھی ہوتی ہے ظلمت کبھی کبھی

اے ناقدینِ دار و رسن کچھ خبر بھی ہے
ایثار چاہتی ہے محبت کبھی کبھی

ایسا بھی وقت آتا ہے اہلِ نیاز پر
ہوتی ہے ناگزیر بغاوت کبھی کبھی

دانستہ کھانے پڑتے ہیں دھوکے حیات کو
آتی ہے پیش ایسی بھی صورت کبھی کبھی

نبضِ جہاں پہ ہاتھ ہو رخِ وقت پر نظر
ہوتی ہے فرض یوں بھی عبادت کبھی کبھی

لانے کو دوستی کی حقیقت بہ روئے کار
ہوتی ہے دشمنی کی ضرورت کبھی کبھی

روتے ہیں اور آنکھوں کو ہوتی نہیں خبر
یہ رنگ بھی دکھاتی ہے غربت کبھی کبھی

تخلیقِ شعر کے لئے آنسو ہی کیا شفاؔ
ہوتی ہے خونِ دل کی بھی حاجت کبھی کبھی

محسن بھوپالی

نگارِ صبح درخشاں سے لو لگائے ہوئے
ہیں اپنے دوش پہ اپنی صلیب اٹھائے ہوئے

گذر رہے ہیں دبے پاؤں وقت کی مانند
فرازِ دار پہ اپنی نظر جمائے ہوئے

صلہ طلب نہ طلبِ خونِ دل چھڑکتے چلیں
ہر ایک خار ہے دستِ طلب بڑھائے ہوئے

وہ اب بھی سایۂ ابرِ رواں کو تکتے ہیں
جنھیں زمانہ ہوا اپنا گھر جلائے ہوئے

چھلک سکا نہ کبھی جامِ چشمِ تر محسنؔ
اگرچہ عمر ہوئی ہم کو گنگنائے ہوئے

عارف حجازی

وہ برق گری، وہ آگ لگی، برباد ہوا کاشانۂ دل
پھر شہرِ تمنا لٹنے لگا اور چور ہوا پیمانۂ دل

ممنونِ ستم ہم ان کے رہیں یہ بھی تو عنایت ہے ان کی
ہم سے نہ سہے گر زخمِ جگر چھیڑا نہ کہیں افسانۂ دل

لو ہوش کے ناخن دیوانو، انجامِ وفا کو دیکھ تو لو
امید کی شمعیں بجھنے لگیں اس طرح جلا پروانۂ دل

ہم دل سے ہوئے مجبور اتنے دیکھا جو تمہیں سب بھول گئے
دنیا تو ہوئی ہے دشمنِ جاں اور تم بھی ہوئے بیگانۂ دل

تاراج ہوا ہے دل کا چمن، یہ کیسی بہاریں آئی ہیں!
اب شہرِ تمنا کس کو کہیں، آباد نہیں ویرانۂ دل

فیض الحسن خیال

دل کی سرد آہوں میں، درد کی کراہوں میں…
کروٹیں بدلتی ہے، زندگی مچلتی ہے، عشق…

اذنِ میکشی دیدو، کیفِ تشنگی دیدو، جو…
قسمتیں ہماری ہیں، عظمتیں ہماری ہیں، یہ…

آرزو بھٹکتی ہے، زندگی سسکتی ہے، غم کے…
شب تما سویرے ہیں، کس قدر اندھیرے ہو…

بھیگی چاندنی راتیں، ہلکی ہلکی برساتیں، سحَ…
ہوش جا رہا ہے اب، لطف آ رہا ہے ا…

اشک کی روانی میں، غم کی حکمرانی میں، زند…
کوئی بھی نہ کام آیا، اک خیال کو پایا…

جمیل قریشی

تیرے قامت تیرے گیسو کی لئے دل میں لگن
دیکھ جا پہنچے ہیں دیوانے سرِ دار و رسن
ایک بھی ہو نہ سکا تیرے سرو پا کا جواب
فکرِ شاعر نے تو ڈھالے کئی چاندی کے بدن
خود غرض ڈال چکے حرص و ہوس کی بنیاد
وقت نے بھی دیئے انسان کی عظمت کے کفن
دورِ حاضر سے کہو اتنا جنوں ٹھیک نہیں
ورنہ پڑ جائے گی تاریخ کے ماتھے پہ شکن
خواب تھا عہدِ جوانی کہ ہوا ختم یہ جب
لذتِ خواب سے ٹوٹا کیا دن رات بدن
زندگی ہم نے گذاری ہے حوادث میں جمیل
اپنے احباب ہیں بچپن کے بھی رنج و محن

نجیب انجم

کرنوں کی جستجو نہ ستاروں کی ہے تلاش
ماضی کے دلفریب نظاروں کی ہے تلاش
شاید اُٹھی ہے دل میں کوئی زندگی کی لہر
شدت سے ہم کو پھر جو کناروں کی ہے تلاش
مدت سے ان کا صحنِ چمن سے گزر نہیں
مدت سے جن حسین بہاروں کی ہے تلاش
دامن چلے تو کوئی رہِ گمشدہ سے ملے
دامن کو اس غرض سے شراروں کی ہے تلاش
ممکن نہیں کہ باعثِ تسکینِ دل بنیں
اس پر بھی ہم کو شوخ نظاروں کی ہے تلاش
ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں گُل بھی نہیں قبول
ایسے بھی لوگ جن کو بہاروں کی ہے تلاش
جن کو یہ زعم تھا کبھی تنہا رہیں گے ہم
ان کو بھی اب نجیب بہاروں کی ہے تلاش

ندرت (کانپوری)

مختلف طریقوں سے رنجِ عمر بھر پایا
زندگی تو کیا پائی ہم نے دردِ سر پایا

دوست سے توقع تھی کچھ کرم نمائی کی
میں طویل شکوے کو مختصر نہ کر پایا

واقعہ سہی لیکن، جرم ہے یہ کہنا بھی
میں نے اپنے عالم سے ان کو بے خبر پایا

بوالہوس میں اور مجھ میں فرق کچھ بتاؤ تو
کس کو دُور میں پایا کس کو کم نظر پایا

اس جہانِ رنگیں سے مطمئن نہیں کوئی
میں نے اہلِ دنیا کو عازمِ سفر پایا

دل میں ان کی آمد سے نُور کی کرن پھوٹی
رات کے اندھیرے نے جلوۂ سحر پایا

کاش ابھی حیات اپنی اور کچھ وفا کرتی
میں ترے تغافل کا شکر ادا نہ کر پایا

ہم نے کیا ترقی کی کسبِ علم و فن کر کے
باوجودِ کوشش بھی خود کو بے ہنر پایا

اب تو حادثے دل کے یاد بھی نہیں ندرت
کس مقام پر کھویا کس مقام پر پایا

شارق (جے پوری)

مجھ کو صیدِ غم و آلام تو ہو لینے دو
صبح راس آ نہ سکی شام تو ہو لینے دو

اور ابھی میں
پیار کی راہوں میں بدنام تو ہو لینے دو

زندگی تشنۂ تکمیل نہیں رہ سکتی
بے نقاب ان کو لبِ بام تو ہو لینے دو

کس طرح جیتے ہیں اک روز بتا ہی دیں گے
سفرِ زیست میں ناکام تو ہو لینے دو

بے گناہی کا مری راز بھی کھل جائے گا
مجھ کو تم موردِ الزام تو ہو لینے دو

مٹ ہی جائے گی یہ تاریکیٔ دوراں اک دن
صبح تو ہو گی مگر شام تو ہو لینے دو

اور نکھرے گا ابھی جوہرِ خودداریٔ دل
قصۂ غم کو ذرا عام تو ہو لینے دو

میرے نغموں سے لرز جائے گا ایوانِ ظلوم
مجھ پہ اشعار کا الہام تو ہو لینے دو

اک نئے دَور کا آغاز تو ہو گا شارق
پہلے اس دَور کا انجام تو ہو لینے دو

شفیقہ فرحت (لکچرار گرلس کالج بھوپال)

وہ لمحہ ـــ!

چاند طلوع ہو رہا تھا۔ مگر اتنا مدھم اتنا ہلکا کہ اندھیرا جوں کا توں باقی تھا ۔ ہائے یہ کیسا اندھیرا ہے جو چاند کے نور سے ـــ سڑک کی ٹمٹماتی بتیوں اور گھروں کی کھڑکیوں سے جھانکتی روشنیوں سے بھی دور نہیں ہوتا۔ بلکہ ان روشنی کے دھبوں کو دیکھ کر تو فضا کے تاریک سینے پر سلگتی چنگاریوں کا احساس ہوتا ہے ـــ

کیوں ـــ!

اللہ ـــ! یہ روح بے وجہ کیوں جلتی ہے۔ تیری اتنی بڑی دنیا میں سب کچھ تو ہے ـــ ایک سکون، ایک خوشی کیوں نہیں۔ تو نے اسے کن وادیوں میں بھٹکنا چھوڑ دیا ہے ـ یا پھر اسے اپنے ہی پاس چھپا رکھا ہے ـ شاید یہ آدم کی سب سے بڑی سزا ہے ـ اور اسے اولاد آدم صدیوں سے بھگت رہی ہے ـــ

خاموشی کے سینے کو چیرتا ہوا ایک نغمہ ابھرا ـ یہ درد کی کیسی لہر ہے جو دل میں اترتی چلی جا رہی ہے ـ یہ کون دل کو جیسے مسل رہا ہے ـ مجھے کون یاد آ رہا ہے ـــ؟ کوئی بھی تو نہیں جسے میں یاد کر سکوں ـــ زندگی تپتے ہوئے صحرا کی طرح ہے، جس میں احساسات کے پاؤں جل جل جاتے ہیں ـ اور جہاں پیار کا اتنا بھی تو سایہ نہیں کہ تصور لمحہ بھر کے لئے دم لے سکے ـ! پھر یہ مجھے کون آوازیں دے رہا ہے ـــ

کیا اطہر ـــ

ہاں ـــ آپا ـ میں نے اسے اپنے بچے کی طرح چاہا ہے ـــ اور اس شدت سے چاہا ہے کہ شاید اس کی اپنی ماں نے بھی اسے اتنا پیار نہ دیا ہوگا ـ

مگر وہ تو تم سے صرف پانچ چھ سال ہی چھوٹا ہوگا ـ

ہاں ـ

پھر ـــ

پھر کیا ـــ؟ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں نے اس کے لئے اپنے دل میں صرف ممتا ہی محسوس کی ہے ـــ

لیکن تمہیں اس کی آمد کا اتنی بے چینی سے انتظار کیوں رہتا تھا ـــ؟

بچہ اسکول جاتا ہے تو ماں بھی تو اسی بے چینی سے اس کے لوٹنے کا انتظار کرتی ہے ـ نظریں کبھی گھڑی کے آس پاس بھٹکتی رہتی ہیں کبھی در پر ـ اور دھیان ہوتا ہے ان چیزوں پر جنھیں وہ اس کے ناشتے کے لئے تیار کر رہی ہے

میرے کان بھی اس کے قدموں کی آہٹ پر لگے رہتے کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ دو گھنٹے پڑھانے کے بعد ٹھیک گیارہ بجے وہ یہاں آتا — اور آتے ہی گھر کا رخ کرتا — اور جس دن اس کے ناشتے پر کسی اخلاقی حملہ ہو جاتا اور دوپہر کے لئے کوئی معقول چیز نہ رہتی تو وہ مت پھلائے اخبار پڑھنے لگتا — تب دوسرے دن اس کی پسند کی کوئی چیز بنانے کا وعدہ کر کے اسے منا لیتی — ویسے وہ اس وعدۂ فردا کے سلسلے میں خاصہ بدگمان تھا — لہذا اکثر تو اس کی فرمائش اسی وقت پوری کرنی پڑتی —

تم اسے دیکھ کر کھلی کھلی بھی تو پڑتی تھیں —

کیوں نہیں — وہ میرا دوست بھی تھا ہمراز بھی — ہم لوگ دنیا بھر کی باتیں کر ڈالتے — وہ مجھ سے مشورے لیتا اور میں اس سے —

پھر یہ تڑپ کیسی —؟

کیا ماں اپنے بچے کے لئے نہیں تڑپتی — کیا اس کا جی نہیں چاہتا کہ وہ اپنے بچے کو سینے سے لگائے اور بے تحاشا چوم لے۔

اگر یہ صرف ممتا تھی تو تم اس رات خوشی سے دیوانی کیوں ہو رہی تھیں جب پیار سے اس نے تمہارے ہاتھوں کو دبا کر اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے —؟

مجھے یاد نہیں —

تم جھوٹ بولتی ہو — تمہیں اچھی طرح یاد ہے — اس رات کی ایک ایک بات تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے — مگر تم آنکھیں بند کرنے کی کوشش کر رہی ہو —

یہ غلط ہے —

نہیں یہ صحیح ہے — اس کے جانے سے کچھ دن پہلے تم اس سے کسی بات پر ناراض ہو گئی تھیں —

کس بات پر —؟

بہو مت — اس نے کہا تھا کہ لوگ اس کے یہاں آنے پر چہ میگوئیاں کرتے ہیں اس لئے وہ نہیں آیا کرے گا —

آہ —!

اور تم نے کہا تھا کہ لوگوں کو بکنے دو — کیونکہ تم اسے چھوٹا بھائی اور بچہ سمجھتی ہو — مگر وہ پھر بھی نہ مانتا — اور تم نے غصے سے منہ پھیر لیا — وہ خاموش بیٹھا مسلسل الائچیاں کھاتا رہا — کچھ دیر انتظار کے بعد وہ اٹھا ایک الائچی تمہارے ہاتھ پر رکھی — یہ دوستی کا پیغام تھا — مگر تم پھر بھی کچھ نہ بولیں — وہ مایوس چلا گیا —

ہاں ٹھیک ہے —

اور جب وہ سیڑھیوں تک پہنچا تو تم نے آواز دی — اس کے قدم وہیں رک گئے — تم بہت کی طرح اس کے

...کے پیکٹوں کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ اس دن بازار سے لائی تھیں۔

...

...م چلتے وقت روزانہ ایک پانکیٹ کھلایا کرتی تھیں — مگر اب وہ شاید روزانہ نہ آتا — اس لئے تم پورا پیکٹ
...ے دینا چاہتی تھیں —

...دل —

...سیڑھیوں کے موڑ پر تھا — نچلی سیڑھی پر — اور تم موڑ کے اوپر والی پر — بالکل آمنے سامنے — اور
...دونوں کے بیچ پلنگ کی دیوار تھی —

...د آرہا ہے — سب یاد آرہا ہے —

...م نے بغیر کچھ کہے پورا پیکٹ اس کی جیب میں ڈال دیا — وہ ایک لمحہ ٹھٹکا — مگر تمہاری آنکھوں کی یاسیت نے
...ں کے فیصلے کو بدل دیا — پیکٹ جیب سے نکال کے واپس کرتے ہوئے بولا — "رکھ لیجئے ہمیشہ کی طرح آ کے
...ھاؤں گا —"

...ں ہاں — مجھے یاد تو ایک ایک لفظ اور ایک ایک منظر ہے — مگر تم خدا کے لئے چپ ہو جاؤ — میں یہ سب
...ں سننا چاہتی —

...دل — ڈر تو رہی ہو اپنے آپ سے — ؟

...یں —

...پھر کس سے ڈر رہی ہو ؟ —

...ہ سے بھی نہیں —

...مگر یہ تمہارا رنگ کیوں اڑا جا رہا ہے — پسینے کے قطرے کیوں ماتھے پر چمک رہے ہیں — ؟

...تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں — اب اور کچھ مت کہو —

...بے نہ کہوں — داستان میں رنگ تو اب بھر رہا ہے — سنو — تمہارا غصہ ختم نہیں ہوا تھا — تم نے پیکٹ نہیں لیا —
...مارا ہاتھ پلنگ پر تھا — اس نے ہاتھ کھول کے پیکٹ تھمانا چاہا —

...ت خدایا — !

...چاہو سنتی جاؤ — تم نے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی — اس نے اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ پر رکھ دیا — بے کوئی
...بات نئی تھی — بیسیوں دفعہ تم نے اس کا سر دبایا تھا — اس نے تمہارا ہاتھ چھو کے بخار دیکھا تھا — ہاتھوں میں ہاتھ
...کے قسمت کی لکیریں دیکھی تھیں — لیکن اس دن اس کے ہاتھ رکھتے ہی تم لچکیلی شاخ کی طرح لرز گئیں — اس نے

سب میں بھی کوئی دکھ
اپنی گرفت اور مضبوط کر دی ۔۔۔ دباؤ اور بڑھ گیا۔ اور تم موم کی طرح سر سے پیر تک پگھل گئیں ۔۔۔ تم نے بھی بس اپنا دایاں ہاتھ اس کے اس ہاتھ پر رکھ دیا جو تمہارے بائیں ہاتھ کو پکڑے تھا ۔ پتہ نہیں وہ کونسی لہر تھی جو دل سے اٹھی اور اس کے دل سے ٹکرائی ۔ وہ تڑپ کے جھکا اور دو ہونٹ تمہارے ہاتھ پر جل رہے تھے ۔۔

بس کرو ۔۔ بس کرو ۔۔ میں پاگل ہو جاؤں گی ۔۔ وہ دو ہونٹ تو آج بھی میرے ذہن پر جل رہے ہیں ۔۔

۔"ہاں اور تم یقین مانو وہ ہمیشہ اسی طرح جلتے رہیں گے ۔۔ جلتے جلتے ناسور بن جائیں گے ۔۔ اور وقت کا کوئی مرہم انہیں اچھا نہیں کر سکے گا ۔۔

نہیں ۔ نہیں ۔ ایسا مت کہو ۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا ۔۔

تو کیا وہ ہونٹ بچے کے ہونٹ تھے ۔ اور تمہارا ہاتھ ممتا کا ہاتھ تھا ۔ بولو ۔ جواب کیوں نہیں دیتیں ۔۔ ؟

ہاں بچے کے ہونٹ ۔۔

مگر اس میں آگ کہاں ہوتی ہے ۔۔ !

ہاں ممتا کا ہاتھ ۔۔

مگر اس میں لرزش کب ہوتی ہے ۔۔ !

پھر کیا تھا ۔۔

تم اس لمحے بہک گئی تھیں ۔ اس ایک لمحے کے لئے تمہارے اندر کی ماں مر چکی تھی ۔۔ اور عورت جسے تم نے بڑے جتن سے سلایا تھا ۔ اور جو سوئی نہیں تھی صرف آنکھیں بند کئے پڑی تھی ، جاگ گئی ۔۔ اور یہی اُ لمحہ کہ جس کے انتظار میں اکثر صدیاں گذر جاتی ہیں ، حقیقت ہے اور باقی سب دھوکا اور فریب ۔۔

ذرا ایک منٹ ۔۔ !

لکھنے کے بعد احساس ہوا کہ یہ تاثر امرتا پریتم کی تیکنیک سے مشابہ ہو گیا ہے ۔ "سرقے" کا الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتی اور "توارد" کا درجہ دینے کی ہمت نہیں ۔۔

اب

"جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے ۔۔ !"

نقد و نظر

معتقہ حضرت نوشہ گنج بخش قادری قدس سرہ متوفی ۱۰۶۴ھ ۔ مرتبہ سید شرافت نوشاہی۔ گنج الاسرار :- نوشاہی ساہنپالوی ۔ ناشر انجمن سادات نوشاہیہ ۔ ساہن پال شریف ۔ ڈاکخانہ ٹھٹھہ عالیہ ضلع گجرات ۔

قطب الاقطاب شیخ الاسلام حضرت حاجی سید محمد نوشہ گنج بخش قادری قدس سرہٗ کے اجداد میں سید عبد القطب شاہ
صدی ہجری کے اوائل میں تبلیغ اسلام کے لئے بغداد سے ہندوستان آئے ۔ اور بے شمار لوگ آپ کی وجہ سے
بہ اسلام ہوئے ۔ حضرت سید محمد نوشہ گنج بخش کی ولادت یکم رمضان ۹۵۹ھ کو گھگانوالی ضلع گجرات میں ہوئی ۔
کی تحصیل کے بعد آپ نے علم باطن کے حصول کے لئے حضرت سخی شاہ سلیمان نوری بھلوالی کے دست اقدس پر بیعت کی اور
اسلام کا آغاز کیا ۔ آپ سے سلسلہ نوشاہیہ جاری ہوا اور آپ نے ۱۲ ربیع الاول ۱۰۶۴ھ کو بہ عہد شاہجہاں بمقام
ل ضلع گجرات وصال فرمایا ۔

آپ نے اپنے مریدوں اور معتقدین کے لئے تصوف کے اسرار و رموز کو رسالہ گنج الاسرار میں سمویا ہے اور اس کے علاوہ
ن چہار بہار، ذخائر الجواہر فی بصائر الزواہر المعروف ارشادات نوشاہیہ اور کلمات طیبات جواہر سکون اور لطائف الاشارات
ملفوظات کے مجموعے ہیں جس کو آپ کے مریدین یا خلفا نے مرتب کیا ہے ۔ یہ اصل مخطوطوں کی شکل میں کتب خانہ
یہ ساہنپال میں محفوظ ہیں ۔

صوفیائے کرام نے اپنے ملفوظات گرامی سے نہ صرف معتقدین کے قلوب کو منور کیا بلکہ ادب کو بھی گراں مایہ بنایا دکن میں
خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (وصال ۸۲۵ھ) سے اس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور آپ کے سلسلہ کے خلیفہ حضرت
شمس العشاق ان کے صاحبزادے برہان الدین جانم اور ان کے صاحبزادے حضرت امین الدین اعلیٰ اپنے دور کے
اغواث و اقطاب ہی رہے ہیں بلکہ ادب و شعر بھی ان کے زیر سایہ پروان چڑھتے رہے ۔ پھر ان سب کے خلفا اور جانشینوں
یل اور وسیع سلسلہ ہے جو شعر و ادب اور تصوف و عرفان کی خدمت انجام دیتا رہا ۔ ان کے علاوہ شاہ علی جیوگام دھنی اور شیخ
رین گنج العلم کے رسائل کے بھی اسا ملتے ہیں جو ہندی، ہندوی اور دکھنی زبان میں لکھے گئے ۔ زبان وہی رہی لیکن پیرایۂ
ت سے تغیرات ہوتے رہے ۔

زیر تبصرہ رسالہ گنج الاسرار بھی اس دور کے اور رسائل کی طرح کوئی ضخیم تصنیف نہیں (۱۰۹) اشعار کا رسالہ ہے فاضل
لناس کو بیاض نسخوں سے مقابلہ کر کے مرتب کیا اور اختلاف نسخ کی وضاحت کر دی ہے ۔ ساتھ ہی حاشیہ تدوین فرہنگ
اور تشریح بھی کر دی ہے اس سے اب یہ مثنوی عامۃ الناس کے استفادہ کے قابل ہو گئی ہے ۔
حضرت گنج بخش کا تعلق سرزمین پنجاب سے ہے اس لئے زبان پر پنجابی اثر زیادہ ہے ۔ یہی حال ہمیں دوسرے

علاقے کی زبان میں نظر آتا ہے اگر رسائل گجرات میں لکھے گئے ہوتے تو ان میں گجری کے الفاظ ہوں گے اور اگر دکن میں لکھے گئے ہوں تو ان پر دکنی کی چھاپ رہے گی اور اسی طرح شمالی علاقوں میں لکھے گئے تو برج، کھڑی بولی اور اودھی کا اثر نظر آئے گا تصوف کے مضامین بھی اکثر وہی ہیں جو دوسرے صوفیائے کرام کی تعلیم میں پائے جاتے ہیں لیکن تفہیم کا انداز علیحدہ ہے نمونتاً چند منتخب اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں جس سے قارئین کو اندازہ ہو سکے گا۔

جس ذات کا اللہ ناؤں اس کا تجھے بتاؤں ٹھاؤں
کم ایک سے تین ہزار اتنے نام دھرے کرتار
اتنے ہوؤں جس کے ناؤں کیوں کر چھپیا اس کا ٹھاؤں
وحدت کوں توں کر تحقیق اس کوں من سوں کر تصدیق

سر ہویت خوب پچھان یہ نکتہ توں دل میں مان
جے چاہیں بے رنگی بھیکھ سنگور کا توں چہرہ دیکھ
جو فرماوے تجھ کوں پیر اس پر چلیں تو ہو فقیر

ذکر غیب توں سن لے پیارے اللہ تیرے کام سنوارے
اچپا جاپ ہے جس نے کینا گت پراپت اس نے لینا
جلس ترکی اشغل پچھان عامل ہے سلطان جہان

ایڑا، پنگلا، پون کوں پیوے دس سوں چاڑ باندھ سکھ جیوے
اپنے شاہ کا نوبت خانہ سنے اپنے کانوں شاہانہ

غرض مری ہے بیاں شو اغل تقدیم تاخیر میں ناں ہو غافل
لیکن سمجھ نہ گور بن آوے سنگور دیا بجھ یہ سوجھ نہ پاوے

یہ چند اشعار زبان اور انداز بیان کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ اسی انداز بیان میں آئین عبدی امین کی کتاب فقہ ہندی طبق ہے جو انہیں کے معاصر تھے۔ راقم الحروف نے اس کو مرتب کر دیا ہے لیکن ابھی شائع نہ ہو سکی۔

چونکہ فاضل مرتب اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور مسند سجادگی پر متمکن ہیں اس لئے ذکر و اشغال کے طریقوں کی طرف بھی نہایت خوبی کے ساتھ اشارے کر دیئے ہیں جس سے مفہوم کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ تصوف و عرفان سے شغف رکھنے والوں کے لئے گنج الاسرار تو واقعی گنج شائگاں ہے لیکن علم لسانیات کے ماہرین کے لئے بھی گنج باد آورد سے کم نہیں۔ (ا۔ ص)

اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو مصنف ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ریڈر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی — ناشر آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی ۶۔ قیمت ۱۰.۹ روپیہ سکۂ ہند۔

ہماری زبان میں لسانیات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ اصل بحث کے لحاظ سے اس حد تک کم ہیں، جو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اُردو کے ماہرین لسانیات کو اس جدید علم کی اشاعت کی طرف خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ اُردو میں اس کا ذخیرہ بڑھے اور اہل اُردو اس سے واقف ہو سکیں۔

لسانیات میں گزشتہ نصف صدی میں یورپ میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ اس کے علمائے اصل موضوع کے علاوہ اس کے ذریعے تعلیم زبان کے طریق کار میں بھی جدید طریقے دریافت کر کے نئی نئی زبانوں کے سیکھنے اور سکھانے میں بڑی سہولت پیدا کی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نے اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو لکھ کر اُردو جیسی بے مایہ زبان میں علم اللسان کی ایک کتاب کا اضافہ کیا ہے جو قابل تحسین ہے۔ کتاب کا پیرایۂ بیان عام فہم اور سلجھا ہوا ہے، لیکن جو اصطلاحات اس میں استعمال کی گئی ہیں ہمیں ان میں بعض سے اختلاف ہے۔ یوں تو اُردو میں لسانیات کے لحاظ سے ڈاکٹر زور اور ابواللیث صدیقی جانے گئے ہیں۔ اس کے بعد ان کے قابل ہم درس پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی "زبان اور علم زبان" لکھ کر اس علم سے اُردو کو نوازا ہے۔ کتاب مذکور میں موصوف نے بعض قدیم اصطلاحوں کو، جن کا ذکر قواعد اور تجوید کی کتابوں میں موجود ہے، نظر انداز کیا ہے۔ ان کے بارے میں اہل علم سے تحقیق و دریافت کیے بغیر اپنی دانست سے لسانیات کی انگریزی اصطلاحوں کا اُردو ترجمہ کر کے شائع کر دیا ہے۔ آج کل لسانیاتی ادب میں یکے بعد دیگرے ان کی تقلید میں دوسروں نے بھی ان اصطلاحات کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح بعض غلط اصطلاحیں اُردو میں رائج ہو گئی ہیں۔ بہتر تو یہ تھا کہ قدیم اصطلاحوں کو جوں کا توں استعمال کیا جاتا، البتہ جدید اصطلاحوں کی حد تک وضع کر لیا جاتا، جیسا کہ ہندی والوں نے اپنے ہاں عمل کیا ہے۔ مثلاً Dental کو "دنتی" Labial کو "لبی" Palatal کو "تالوی" Voiced کو "مسموع" اور Voiceless یا Unvoiced کو "غیر مسموع" کہا گیا ہے، حالانکہ قواعد و تجوید کی کتابوں میں ترتیب وار سنیّہ، شفوی، لہویہ، مجہورہ اور مہموسہ جیسی اصطلاحیں مذکور ہیں۔ اسی قبیل کی بعض اصطلاحوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ حال ہی میں پاکستان میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے لسانیات سے متعلق اصطلاحات لکھی ہیں وہ اُردو میں رواج پانے کے قابل ہیں۔ کتاب زیر تنقید میں بعض امور قابل اعتراض ہیں، جن کی اصلاح ضروری ہے، تاکہ تعلیم یافتہ لوگ غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔

اُردو میں حروف تہجی دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک اکہری آواز والے، جو "مجرد" کہلاتے ہیں، مثلاً ا، ب، پ وغیرہ۔ دوسرے دوہری آواز والے ہیں جو "مخلوط" کے نام سے پکارے جاتے ہیں، جیسے بھ، پھ، تھ وغیرہ۔ یہ حروف تعداد میں دس نہیں بلکہ پندرہ ہیں۔ اس میں پانچ چھوٹ گئے ہیں، وہ یہ ہیں: رھ، ڑھ، لھ، مھ، نھ۔ ان کی

مثالیں علی الترتیب میرھا تا، پڑھنا، چولھا، کمھار اور ننھا ہیں۔ ان حرفوں کی نسبت اردو والے مرکب [illegible] تصور کرتے ہیں۔

اس کتاب میں س، ث، ص، ز، ذ، ظ اور ض جیسے حروف کو بجائے صوتیوں کے علامت قرار دیا گیا۔ وہ لائق غور ہے۔ واقعہ یہ ہو کہ یہ حروف عربی سے اُردو میں آئے ہیں اور ان کی آوازیں وہاں موجود ہیں جن کا مخرج مختلف ہے۔ گو عام اُردو بولنے والے ان حرفوں کی ادائی میں مخرج کا لحاظ نہیں کرتے، لیکن جو لوگ خاص اہل ہیں وہ ان کا تلفظ صحت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں محض عوام کے غلط تلفظ کی بنا پر مذکورہ بالا حروف (جن کا صوتیے ہونا مسلم الثبوت ہے) صوتیوں کے زمرہ سے خارج کرکے انھیں علامات میں شمار کرنا بعید از عقل و فہم یہ بات اہل علم کے نزدیک دقیانوسی سمجھی جائے گی۔ (غلام رسول)

جوالامکھی (نظموں کا انتخاب)

محکمۂ اطلاعات عامہ، حکومت آندھرا پردیش نے "جوالامکھی" کے عنوان سے چینی حملوں کے خلاف اُردو شعرا کی نظموں کا انتخاب شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ اُردو کے مشہور اور مقبول شعرا کی نظموں پر مشتمل ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں چین نے ہندستان پر سفاکانہ طور پر اچانک [حملہ] کر دیا تھا اس وقت سارے ملک میں چین کے خلاف نفرت و حقارت اور غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ پوری قوم جسد واحد کی طرح، چین کے اس جارحانہ اقدام کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کی تمام امن پسند اقوام [و] حکومتوں نے ہندوستان کی بھرپور تائید کی۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے شعرا کی طرح اُردو کے شاعروں نے بھی [ا]نظموں کے ذریعہ چین کے خلاف اپنے اور اپنی قوم کے دلی جذبات کی بھرپور ترجمانی کی۔

ان نظموں میں جہاں چین کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے وہیں اپنی قوم کے جوش و جذ[بہ] ابھارنے اور اہل ملک میں جرات و ہمت سے دشمن کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ اُردو کے شاعروں نے بھی حب الوطنی اور قومی یکجہتی اور اتحاد کے جذبات کو بیدار کرنے اور انھیں قائم رکھنے میں قابل لحاظ حصہ ادا کیا تھا، چنانچہ چینی جارحانہ حملے کے دوران، ہر طرح کے اختلافات کو بالکلیہ طور پر فراموش کرکے پوری قوم نے آزادی کے تحفظ اور بقا کے لئے اتحاد خیال او[ر] اتحاد عمل کا ناقابل فراموش مظاہرہ کرتے ہوئے چینی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا تھا۔

"جوالامکھی" ہماری قوم کی زندگی کے ان دنوں کی یادگار بن کر رہے گا جب افق ہند پر مصیبت کے کالے بادل منڈلانے لگے تھے۔ یہ حب الوطنی، قومی یکجہتی اور اتحاد کے جذبات کو ہمیشہ قائم و برقرار رکھنے اور قوم کی بقا اور ترقی، قومی عزت اور وقار، سخت جد و جہد و [illegible] حاصل کی ہوئی آزادی کے تحفظ کے سلسلے میں، اہل ہند کو مل جل کر کام کرنے کا اہم فرض بھی یاد دلاتا رہے گا۔

محکمۂ اطلاعات کے جو اس سال [illegible] ناظم مسٹر نریندر لوتھر واقعی لائق ستائش ہیں کہ ان کی توجہ اور گہری دلچسپی کی بدولت اُردو شاعری [illegible] مجموعہ کی صورت میں محفوظ ہو گئیں۔ کتاب نہایت عمدہ ٹائپ میں بے حد سلیقے کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور محکمۂ اطلاعات عامہ آندھرا پردیش سے (۲۵) پیسے میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ (محمد منظور احمد)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

۱۹۳۸ء فون ۵۲۰۹۰

شمارہ ۱۱ نومبر ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد دکن

پروفیسر عبدالمجید صدیقی

میر حسن۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

رمن راج سکسینہ۔ وقار خلیل

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

ہندو پاک سے ـــــــ چھ روپے

ـــــــ تین روپے

سے ـــــــ دس روپے

اہتمام ادارۂ ادبیات اردو سے

مشعل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپکر

ایوان اردو۔ خیریت آباد

حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

اس سال اکتوبر کا مہینہ اس وجہ سے خصوصیت کا حامل رہا ہے کہ اس کے پہلے ہفتے میں انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے جے پور میں کل ہند اردو کانفرنس منعقد ہوئی اور توقع کے مطابق صدر کانفرنس جناب پنڈت آنند نرائن ملا کا خطبہ اس کا حاصل رہا۔ پنڈت جی نے اپنے خطبے میں بہت سے مسائل کا جائزہ لیا ہے اور اس امر کی وضاحت کی کوشش کی ہے کہ اکثریت کے اردو سے مخالفت کے اسباب کیا ہیں اور انھیں کس طرح رفع کیا جا سکتا ہے۔ مذہب اور زبان کے بارے میں کتنی فطری بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"میرے ایسے غیر مذہبی آدمی کے لئے زبان مذہب سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن زبان نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ زبان میری ذات کا آئینہ ہے، میری میراث ہے، میری تاریخ ہے اور میری زندگی ہے۔"

اب بھی مذہب کروڑوں آدمیوں کا معبود ذہنی بنا ہوا ہے مگر اس کی مادری زبان نے اس طرح گوشہ نشینی اختیار نہیں کی۔ قومی یکجہتی کے بارے میں افراد قوم کی تقریریں بڑے زور و شور اور گرم گرمی سے ہوتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی تقریروں کے ذریعہ قومی یکجہتی پیدا کر کے رہیں گے خواہ عمل کچھ ہو۔ حالانکہ یگانگت اور اتحاد تالیف قلوب کے بعد ہی ممکن ہے۔ پنڈت جی نے اس سلسلے میں فرمایا ہے :-

"میں نے سچے دل سے ہندی کو قومی زبان تسلیم کیا ہے لیکن اگر ہندی تبلیغ کے لئے یگانگت اور یکجہتی کا خون جائز سمجھا جائے گا تو میں ہندی کے خلاف ہر محاذ میں شریک ہونے کو تیار رہوں گا کیونکہ قومی یکجہتی اور یگانگت کا برقرار رہنا ہندی کے قومی زبان ہونے یا نہ ہونے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔"

دونوں زبانوں کی ترقی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب تک تمہارے دل تعصب سے پاک و صاف نہ ہو جائیں اس وقت تک ہم اپنی زبانوں کو پروان چڑھانے کے قابل نہ ہو سکیں گے۔

"اس معاملے میں مجھے ہندی والوں سے شکایت زیادہ ہے کیونکہ کمزور دل کا تعصب اتنا خطرناک نہیں ہوتا جتنا طاقتور دل کا تعصب"

ظاہر ہے کہ اکثریت کے برتے پر یہ تعصب بہت رنگ لا چکا ہے اور لا رہا ہے لیکن زمانے کے امتداد کا اثر اس پر پڑ رہا ہے اور ممکن ہے کہ حالات بہتر ہونے کا وقت بھی آجائے۔

ہندوستان کی تمام ریاستوں میں حکومت کی جانب سے اگر اردو کے ساتھ مراعات برتی گئی ہیں تو ان احکام کی روشنی میں تعمیل بہت کم ہوئی۔ اس پر پنڈت جی نے بجا فرمایا ہے کہ :- "حکومت نے ان (دیگر جلیل القدر افسران) کے خلاف کیا کارروائی کی۔ کیا حکومت کا یہ فرض نہیں ہے کہ ماتحت افسران کو ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت سے (باقی برصفحہ ۴۲)

ڈاکٹر خلیق انجم

ڈاکٹر کنور محمد اشرف

ہندوستان کے تقریباً تمام اخباروں نے ڈاکٹر اشرف کی وفات کی خبر ایسے غیر اہم الفاظ میں دی تھی جن سے صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ مشرقی برلن میں ایک ہندوستانی پروفیسر کا انتقال ہو گیا ہے۔ حالانکہ یہ وہ انسان تھا جو سینکڑوں ان اخباروں کی سرخی بنتا تھا۔ تقریباً چالیس سال تک جس انسان نے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا اور اپنے تن من دھن کی بازی لگا دی، اس کا جب انتقال ہوا تو پریس نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ کسی سیاسی رہنما نے اظہار افسوس نہیں کیا اور عوام نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں یہ ستم ظریفانہ حقیقت مضحکہ خیز بھی ہے اور درد انگیز بھی۔ بعض خوشیاں اور ماتم سیاسی مصلحتوں اور ذاتی مفاد کے تابع ہیں۔ ممکن ہے ہندوستان کی تاریخ آزادی ان کی قربانیوں اور ایثار کو نظر انداز کر دے، اور ممکن ہے اس سلسلے میں کبھی ان کا نام بھی نہ آئے لیکن سیاسی مصلحتوں کی یہ دست درازیاں ان ہزاروں اور لاکھوں دلوں کا کچھ نہیں کر سکتیں جن میں ڈاکٹر صاحب کی محبت اور ان کا احترام ہے۔ ان لوگوں میں ڈاکٹر صاحب کے دوست، ساتھی، ہم پیشہ اور شاگرد سب ہی شامل ہیں۔ خدا نے کسی کو توفیق نہیں دی کہ ان کی وفات پر کسی رسالے کا خاص نمبر نکال دیتا یا ان پر کوئی کتاب مرتب ہو جاتی۔ البتہ مشرقی برلن میں ان کی اتنی قدر ہوئی کہ برلن کی جس یونیورسٹی سے ان کا صرف تقریباً دو سال تعلق رہا تھا، وہاں سے ان پر دو جلدوں میں ایک کتاب شائع ہو رہی ہے۔ پہلی جلد میں ان کے سوانح پر کچھ مضامین اور کچھ محققین کے تحقیقی مقالے ہوں گے۔ دوسری جلد میں ان کے جمع کئے ہوئے مسودے کو مرتب کیا جائے گا۔ یہ تو خیر ان کی وفات کے بعد ہوا۔ خود زندگی میں وہ ان بے اعتنائیوں اور بے انصافیوں کا شکار رہے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہونے پر وہ پاکستان چلے گئے۔ یہاں انھوں نے عملی سیاسیات میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا لیکن حکومت نے ان پر سازش کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا۔ جیل میں ان کی صحت بہت خراب ہو گئی! اس شرط پر آزاد کیا گیا کہ ہمیشہ کے لئے پاکستان کو خیرباد کہہ دیں گے۔ انھیں مجبوراً انگلینڈ جانا پڑا، اور چند سال بعد جب انھوں نے واپس آنا چاہا تو جس وطن کی آزادی کے لئے وہ سر سے کفن باندھے دار و رسن کی آزمائشوں سے گزرے تھے اس کے دروازے ان پر بند تھے۔ پاکستان میں تو خیر داخلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور وہ خود بھی وہاں واپس جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہندوستان میں بھی انھیں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ برٹش گورنمنٹ نے انھیں مستقل شہریت کی پیش کش کی تھی مگر انھوں نے قبول نہیں کی۔ پتہ نہیں یہ کہاں تک درست ہے، مگر سنا ہے کہ ابوالکلام آزاد نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی شہریت دی جائے اور آزاد کی وجہ سے پنڈت نہرو کو خاموش رہنا پڑا۔ خدا بھلا کرے [illegible]

ڈاکٹر صاحب ہندوستان واپس آگئے۔ یہ باتیں مجھے ان کے قریبی دوستوں سے معلوم ہوئی ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب نے کبھی نہیں بتایا۔ پہلے وہ کشمیر آئے، یہاں انھیں حکومت کی طرف سے کشمیر کی تاریخ لکھنے کا کام دیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں انھیں دہلی آنے کی اجازت دے دی گئی۔ ان کے لیے [illegible] ڈاکٹر [illegible] سنگھ نے کوشش کرکے کروڑی مل کالج میں ان کا تقرر کروا دیا۔ ان کے مرتبے، علمی تجربے اور سیاسی زندگی کی قربانیوں کو دیکھتے ہوئے یہ لیکچررشپ بہت معمولی چیز [illegible] لیکن وہ اس زندگی سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔

ڈاکٹر صاحب بہت مضبوط جسم کے اور تندرست آدمی تھے۔ اگرچہ پیٹ کے مستقل مریض ہو گئے تھے اور خصوصی کچھ نہیں کھا سکتے تھے۔ مرچوں اور مصالحے وغیرہ کا پرہیز تھا۔ اگر ان کو [illegible] بالکل آتا ہے [illegible] سانولا رنگ، چوڑا ماتھا، ڈاڑھی مونچھوں سے بے نیاز چہرہ، سر پہ چھوٹے چھوٹے سفید بال [illegible] سب سے زیادہ نمایاں اور متاثر کرنے والی چیز ان کی تمتماتی ہوئی آنکھیں تھیں جن میں غیر معمولی چمک تھی اور ذہانت جھلکتی تھی۔ ہنستے ہوئے تقریباً دونوں آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ لباس بہت معمولی ہوتا۔ اکثر شرٹ اور [illegible] پہنتے۔ کبھی کبھی سفید سلک کی شیروانی بھی پہن لیتے۔ ان کے پاس ایک براؤن گرم سوٹ بھی تھا جو خاص موقعوں پر پہنتے تھے۔ اس سوٹ کی پینٹ پر پیچھے پیوند لگا ہوا تھا، جو اچھا خاصا نمایاں تھا۔ وہ صرف یہ خیال رکھتے کہ کپڑے صاف ہوں، ورنہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ شیروانی بغل کے پاس سے مسکی ہوئی ہے، قمیص کا کالر یا بش شرٹ کا پھٹا ہوا ہے، یا پتلون کی موریاں گھستے گھستے ختم ہو گئی ہیں لیکن انھیں کوئی پرواہ نہیں۔ بارہا میں نے انھیں پونے چوڑی موری کے پاجامے میں دیکھا ہے۔ اکثر کالج چپل پہن کر آتے تھے۔ یہ دو چپلیں [illegible] بارہ آنے میں انھوں نے کب کہاں سے خریدی تھیں۔ وہ ایک عظیم انسان اور سچے علم دوست تھے۔ ان کے لیے لباس جسم ڈھکنے کا ذریعہ تھا، سماجی عزت و وقار حاصل کرنے کا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب تاریخ کے اسکالر تھے۔ ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔
Life and conditions of the people of Hindustan
تحقیقی مقالہ تھا جو انھوں نے پی ایچ ڈی کے لیے لندن یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں یہ مقالہ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں چھپا، اور پھر ۱۹۵۹ء میں جیون پرکاش [illegible] کتابی صورت میں شائع ہوا۔ انگلینڈ میں اپنی جلاوطنی کے زمانے میں وہ صبح سے شام تک برٹش میوزیم میں بیٹھے رہتے تھے [illegible] Social History under the Mughals [illegible] جمع کرتے تھے۔
جب ہندوستان واپس آئے تو ان کے ساتھ [illegible] کے [illegible] بھرے ہوئے تھے [illegible] جو چھپا [illegible]
[illegible]

ہفتہ وار "عوامی دور" میں شائع ہوتے رہتے تھے، ان کی وفات کے بعد ان تمام مضامین کو یکجا کر کے [illegible] "ہندوستانی مسلم سیاست" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ مشرقی پاکستان جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ان ترک اور مغول قبیلوں پر کام شروع کیا، جو ہندوستان آئے تھے۔ ان کی بڑی خرابی یہ تھی کہ کام کو اتنا پھیلا دیا کرتے تھے کہ وہ ایک آدمی کے بس کا نہ رہتا۔ ایک ایک موضوع کے لئے ہزاروں فارسی، انگریزی، اردو، عربی وغیرہ کی کتابوں کی فہرست بناتے، ان کا مطالعہ کرتے اور نوٹس تیار کرتے جاتے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ اتنا مواد جمع کر لیتے تھے کہ اس کا سمیٹنا ان کے بس میں نہ رہتا، اس لئے وہ دوسرے موضوع پر کام شروع کر دیتے۔

تاریخ تو خیر ان کا موضوع تھا ہی، انھیں اردو اور فارسی ادب پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ ان دونوں زبانوں کے قدیم اور جدید ادب پر ان کی گہری نظر تھی، اسی لئے اکثر اردو کے اسکالر ان کے پاس رہنمائی کے لئے آتے تھے۔ دہلی میں وہ ان دونوں زبانوں کے اس ادب کو مرتب کرنا چاہتے تھے جو دہلی میں تخلیق ہوا۔ اس سلسلے میں بھی انھوں نے اچھا خاصا مواد جمع کر لیا تھا۔

انھوں نے غالب کی زندگی پر ایک ڈرامہ لکھا تھا جس کا ایک حصہ بی۔ بی۔ سی لندن سے براڈکاسٹ ہوا۔ شیکسپیئر کے میک بیتھ کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا، مگر ان میں سے کوئی چیز شائع نہیں ہوئی۔ اب یہ بھی نہیں پتا کہ ان کے مسودے کہاں ہیں۔

ہندوستان کی سیاست میں ڈاکٹر صاحب کا بہت اہم رول رہا ہے۔ وہ مدتوں کانگریس میں شامل رہے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے سکریٹری رہے۔ وہ کانگریس کے بائیں بازو میں تھے، اس لئے اکثر لوگوں سے ان کے اختلافات بھی تھے، اور یہ اختلافات اتنے بڑھے کہ وہ کانگریس چھوڑ کر کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے۔ پارٹی کے اہم ترین رہنماؤں میں ان کا شمار ہوا۔ انگریزوں کی سازشوں سے جب بھی یو۔پی میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ڈاکٹر صاحب سینہ سپر ہو گئے۔ ان کا سب سے بڑا ہتھیار ان کی تقریر تھی۔ انھیں تقریر کرنے کا فن آتا تھا۔ ان کے بولنے کی رفتار اتنی تیز ہوتی تھی کہ معلوم ہوتا ہے جیسے تقریر کرتے ہوئے سانس بھی نہیں لیتے! اور جیسے انھیں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ خیالات خود ہی پیدا ہوتے اور خود ہی الفاظ کے سانچوں میں ڈھلتے جاتے۔ یہ حالت انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تھی۔ مجھے ایک دفعہ اپنے ایک پنجابی دوست کے چچا سے ملنے کا اتفاق ہوا جو عمر میں [illegible] کافی بڑے تھے، باتوں باتوں میں ڈاکٹر اشرف کا بھی ذکر آ گیا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے بہت مداح اور خاص طور سے ان کی تقریر کے بہت دل دادہ تھے۔ کہنے لگے تیس پچیس سال پہلے ڈاکٹر اشرف نے امرتسر میں "ہندو مسلم" اتحاد پر تقریر کی تھی، وہ گھنٹے بھر بولے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے سامعین پر جادو کر دیا ہو۔ [illegible] ایک جگہ [illegible] تھا، [illegible] ایسا اثر ہوا کہ تقریر ختم ہونے پر میرے [illegible] الا [illegible] آ گئے۔

یہ واقعہ تو عام طور پر مشہور ہے کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ایک وفعہ ڈاکٹر اشرف تقریر کر رہے تھے تو ڈاکٹر [illegible] نے اٹھ کر انھیں گلے لگالیا تھا، اور پھر اپنی تقریر میں ان کی تعریف کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا تھا کہ انھوں نے [illegible] اتنا اچھا مقرر نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر اشرف دل کے سچے اور بات کے کھرے تھے۔ ان کا کٹر سے کٹر مخالف بھی کوئی ایک ایسی مثال پیش نہیں کر سکتا جب انھوں نے موقع پرستی سے کام لیا ہو، یا ان کے عمل یا جد وجہد میں کسی ذاتی مقصد، صلے کی خواہش یا ستائش کی تمنا کو دخل ہو۔ وہ اپنے عقاید میں بہت سخت تھے اور اس سلسلے میں کسی سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ملک کے وزیر اعظم سے لے کر معمولی وزیروں تک بہت سے لوگ ایسے تھے جو ان کے ساتھ آزادی کی جنگ میں دار و رسن کی منزلوں سے گذر رہے تھے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اپنے عقاید اور نظریات میں ذرا بھی لچک پیدا کر لیتے تو انھیں بہت سے مادی فوائد حاصل ہو سکتے تھے، جس کی بارہا انھیں دعوت بھی دی گئی، مگر وہ ہمیشہ ان چیزوں سے بے نیاز رہے۔ وہ دروغ مصلحت آمیز کے قطعی قائل نہیں تھے۔ انھوں نے حق گوئی اور صداقت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کے سیاسی عقاید سے اختلاف ممکن ہے، لیکن ان کے خلوص، ایمان داری اور دیانت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ صداقت اور جذباتیت نے ان کے لب و لہجے میں ترشی اور تیزی پیدا کر دی تھی، جس میں طنز کی نشتریت بھی شامل ہوتی۔ انشا اللہ خاں انشا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے علم و فضل کو شاعری نے اور شاعری کو نواب سعادت علی خاں نے ڈبویا۔ ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر اشرف کے علم و فضل کو سیاست نے اور سیاست کو ان کی ایمان داری اور صداقت نے ڈبو دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے انگلینڈ میں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ وہاں کمیونسٹ پارٹی کے جلسوں میں بالکل شرکت نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر کالج کی ملازمت کی تھی کیونکہ انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ باقی تمام زندگی پڑھنے لکھنے میں گذاریں گے۔ ان کے لئے یہ پیشہ نیا نہیں تھا۔ وہ علیگڈھ یونیورسٹی میں بھی لیکچرر رہے تھے اور اگر انھیں منتقل کر دیا جاتا تو ممکن ہے وہ سیاست کے میدان میں بالکل نہ جاتے۔ انھیں یہ پیشہ بہت عزیز تھا۔ ایک دفعہ ہمارے کالج کے ایک لیکچرر گورنمنٹ سروس میں جا رہے تھے، کالج چھوڑ کر جانے کی بظاہر یہی وجہ تھی کہ انھیں تنخواہ زیادہ مل رہی تھی وہ لیکچرر ڈاکٹر صاحب کے بہت قریبی دوست تھے، ان کی الوداعی پارٹی کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے "آپ ہم کو اور ہمارے پیشے کو ذلیل کر کے جا رہے ہیں، میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ بھی وہاں سے ذلیل ہو کر نکالے جائیں" بظاہر یہ ایک مذاق تھا، لیکن حقیقت میں بڑی معنی خیز بات تھی۔ ان الفاظ سے ڈاکٹر صاحب کے نظریات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ علمی کاموں کے لئے انسان کو بہت سی قربانیاں دینی ہوتی ہیں۔ سچے علم دوست وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہوس جاہ و منصب سے نجات پا لیتے ہیں، اور اس مقصد کے لئے علمی درسگاہیں سب سے بہتر جگہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے ہمارے کروڑی مل کالج کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اس حقیقت پر تبصرہ کرتے ہوئے

[illegible]

سب سے [illegible]
کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ نے لکھا ہے :-

He placed K'rori Mal College not merely on the map of India: he has done very much more through him we are a part of history

کالج میں داخل ہوتے ہوئے ان کی کچھ عجب شان ہوتی تھی۔ ان کے ہاتھ میں چمڑے کا پرانا بیگ ہوتا جو کتابوں اور مختلف کاغذوں سے ہمیشہ بھرا رہتا، مسکراتے ہوئے تیز قدموں سے سٹاف روم میں داخل ہوتے، کسی کو سلام کیا، کسی کا مزاج پوچھا، کسی سے کوئی بات کی، کسی پر فقرہ بھی کس دیا۔ غرض سٹاف روم میں اچھی خاصی ہلچل مچ جاتی۔ ان کے چہرے پر متانت اور سنجیدگی کے قطعی آثار نہ ہوتے، جس نے انھیں کبھی نہ دیکھا ہو وہ اس حالت میں دیکھ کر تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ڈاکٹر اشرف یہی ہیں۔ سینیئر لیکچرر ہو یا جونیئر، یا کالج کا کوئی طالب علم، ان کا لب و لہجہ اور انداز گفتگو ایک ہوتا۔ وہ کسی سے مرعوب ہوتے اور نہ کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

خاص طور پر نوجوانوں کی ہمت افزائی میں وہ کسر نفسی اختیار کرتے۔ ان کی ہر ممکن مدد کرتے اور انداز گفتگو ایسا ہوتا جیسے ہمارے اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے، اور تھوڑی دیر کے لئے وہ ہمارے ذہنوں سے یہ بات بالکل نکال دیتے کہ اس سمندر کے سامنے ہماری حیثیت ایک قطرے کی بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب میرے استاد تھے، سرپرست تھے، دوست اور ساتھی تھے۔ مجھے گھنٹوں ان کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے، اور اس دوران میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب میں نے یہ محسوس کیا ہو کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مقابلے میں مجھے کم علم یا کم عمر سمجھتے ہیں۔ اگر انھیں کوئی بات سمجھانی ہوتی تو مذاق ہی مذاق میں سمجھا دیتے۔ بزرگوں کی طرح بیٹھ کر کبھی سنجیدگی سے نصیحتیں نہ کرتے۔ ایک دفعہ میں نے انھیں اپنے ایک مقالے کا مسودہ پڑھنے کے لئے دیا۔ مقالہ اردو کے ایک صوفی شاعر پر تھا جس میں احتراماً بہت سی ایسی باتیں تحریر کی گئی تھیں جو لکھی جانی چاہئے تھیں۔ مسودہ پڑھ کر واپس کیا تو کہنے لگے "آپ نماز روزے کے قائل ہیں؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں ہوں تو سہی!" ہنس کے کہنے لگے " تو جناب نماز روزہ ہی کافی ہے، آپ تحقیق کے ذریعے ثواب کمانے کی کوشش نہ کیجئے!"

اگر ان سے کوئی ملنے آتا تو میرا تعارف کراتے ہوئے مجھے اپنا ساتھی بتاتے۔ میں ان سے درخواست کرتا کہ "مجھے اپنا شاگرد بتایا کیجئے، میرے لئے زیادہ قابل عزت بات ہے!" ایسی باتوں پر وہ مسکرا کر صرف یہ کہتے کہ "علم و عشق کے میدان میں حسب و نسب اور استاد شاگرد نہیں ہوتے!"

ڈاکٹر صاحب بہت زندہ دل، ظریف الطبع اور شگفتہ مزاج تھے۔ چالیس سال کی [illegible]

[illegible]
مصائب و آلام [illegible] ذہنی و جسمانی تکالیف کا ان کے چہرے پر کوئی اثر نہیں تھا۔ اگرچہ ان کی صحت متاثر [illegible] لیکن ہر [illegible] وقت مسکراہٹ رہتی۔ کسی کی بے محل اور بے جوڑ چیز کو دیکھ کر ان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھتی اور پھر وہ فقرہ کسے بغیر نہ رہتے۔ مگر اس ظرافت میں بھی وہ کبھی ایسی بات نہ کہتے جس سے کسی کے جذبات کو ٹھیس [illegible]

ایک دفعہ میں اور ڈاکٹر صاحب اسٹاف روم میں بیٹھے تھے، ایک صاحب اسٹاف روم میں داخل ہوئے۔ چال ایسی تھی جیسے کوئی قدیم زمانے کا سپاہی میدان جنگ میں جا رہا ہو۔ انھیں دیکھتے ہی میں نے کہا "جی ان کے ہاتھ میں ننگی تلوار بھی ہوتی" ڈاکٹر صاحب بہت زور سے ہنسے اور کہنے لگے "جی ہاں، اور دو آدمی تلوار کی حفاظت کے لئے!"

ایک دفعہ کوئی نوجوان ان سے ملنے آیا۔ کسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا "اپنے گھر کا پتہ" انھوں نے انگریزی میں پتا لکھ کر دے دیا، اور کہنے لگے "معاف کیجئے میں نے انگریزی میں لکھ دیا ہے!" ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے برجستہ کہا "کوئی بات نہیں ہے، میں اپنے کسی ساتھی سے پڑھوا لوں گا!"

ایک دفعہ کالج میں ڈیڑھ بجا تھا، ڈیڑھ کے بعد ڈاکٹر سروپ سنگھ اور ڈاکٹر اشرف باتیں کرتے ہوئے کالج میں کھڑے تھے۔ جب میں سلام کر کے رخصت ہوا، اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھا، ڈاکٹر اشرف نے آواز دے کر بلایا۔ کہنے لگے "آج تو تھوڑا سا گھومنے کو جی چاہ رہا ہے!" میں نے کہا "ضرور، تشریف رکھئے!" وہ گاڑی میں بیٹھ گئے، میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنی چاہی، نہیں ہوئی، بہت زور لگایا، کچھ نہ ہوا، اتر کر دھکیلنے لگے، بیچ میں وہ۔ آخر دونوں اترے۔ میں اسٹیرنگ پر بیٹھ گیا، اور دونوں نے گاڑی کو دھکا دیا۔ ڈاکٹر صاحب چلتی ہوئی گاڑی میں چڑھ جائیں، تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ میں نے کہا "اچھے! اگر نہیں بیٹھے۔" بیٹھے اور کیا تو کہنے لگے "ان جسم میں بالکل طاقت نہیں ہے، اب کے بند ہو گئی تو کیا ہو گا۔" [illegible] ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی سے کالج کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے گاڑی روک لی۔ قریب [illegible] سنجیدگی سے کہنے لگے "میں تو اب بیٹھوں گا نہیں، آپ دو تین مزدور ساتھ رکھا کیجئے" ہنستے ہوئے پیدل ہی چلے گئے۔

انھیں اردو اور فارسی کے ہزاروں شعر یاد تھے۔ غالب کے بعد داغ، امیر مینائی اور ریاض [illegible] آتے۔ [illegible] شعر [illegible] سنا رہے تھے

[illegible] کوئی ... کچھ ہوئے [illegible]

[illegible]

[illegible]

گنگناتے رہے۔

ایک دفعہ نسیم سعیدی صاحب نے کالج کے مشاعرے میں یہ شعر پڑھا ؎

خود جس قدر بلند ہیں اپنی نگاہ میں
اتنا نہ گر سکیں گے تمہاری نظر سے ہم

ڈاکٹر صاحب کئی دن تک موقع بے موقع یہ شعر پڑھتے رہے۔ انھیں معاملہ بندی کے اشعار بہت پسند تھے۔ کالج کے مشاعرے میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے تھے اور معمولی معمولی اشعار پر جھومتے رہتے۔ چونکہ انھیں بہت زیادہ اشعار یاد تھے، اس لئے بعض اوقات ایسے برمحل شعر پڑھتے تھے کہ لطف آجاتا تھا۔

ایک دفعہ وہ اپنا براؤن سوٹ پہنے بس اسٹاپ پر کھڑے تھے، میرے پوچھنے پر بتایا کہ کسی سفارت خانے میں ڈنر پر جا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا "میں بھی چلوں؟"۔ کہنے لگے "وہ آپ کے سوداؔ کی ایک ہجو کا شعر ہے نا ؎

سنا یہ مجھ سے تو کہنے لگا کہ پوچ مگو
گرفتہ ایم اجازت ز باغباں تنہا"

انھیں ہندوستان واپس آنے کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ اگرچہ خود سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے، لیکن انھیں آزاد ہندوستان سے بہت سی توقعات تھیں جو پوری نہ ہوئیں، اور پھر خود بے اعتنائیوں کا شکار رہے۔ مشرقی برلن جاتے ہوئے الوداعی پارٹی کے اختتام پر انھوں نے عرفیؔ کا ایک شعر بڑے دردانگیز انداز میں پڑھا تھا ؎

از درِ دوست چہ گویم بہ چہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم، ہمہ حرماں رفتم

اسی طرح انھوں نے دو فارسی اشعار کا برجستہ استعمال کیا ہے۔ وہ ہندوستان سے صرف ایک سال کے لئے گئے تھے۔ ان دنوں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ کچھ عرصے کے لئے کروکشیتر یونیورسٹی گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر اشرف نے ایک سال بعد اپنی چھٹی میں توسیع چاہی، مگر کالج کے بعض ذمہ داروں کے ان سے اختلافات تھے، اور چونکہ ڈاکٹر سروپ سنگھ کالج میں تھے نہیں، اس لئے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی درخواست رد کر دی گئی، اور غصے میں ڈاکٹر صاحب نے کالج چھوڑ دیا۔ عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اب وہ ہندوستان واپس نہیں آئیں گے۔ ان کے ایک شاگرد ہربنس مکھیا نے انھیں خط لکھا، جس میں اس امر کی وضاحت چاہی۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ وہ ایک سال بعد ہندوستان ضرور واپس آئیں گے، اور پھر غالبؔ کے یہ دو شعر لکھے ؎

گفتمش چیست منشائے سفر
گفت جور و جفائے اہلِ وطن

گفتم اکنوں بہ گو کہ دہلی چیست
گفت جانست و ایں جہانش تن

ڈاکٹر صاحب کو بچوں اور جانوروں سے بڑی محبت تھی۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ کی صاحبزادی سے انھیں بڑی محبت تھی، انھیں وہ اپنی بیٹی کہتے تھے۔ جب وہ ان صاحبزادی سے باتیں کرتے اور انھیں طرح طرح سے تنگ کرتے تو معلوم ہوتا کہ وہ ایک صاحب ہوش لڑکی سے نہیں بلکہ سات آٹھ سال کی بچی سے کھیل رہے ہیں۔ (باقی برصفحہ ۴۴)

مولوی غلام رسول

اُردو رسمِ خط کا آغاز اور ارتقا

سامی زبان، سام بن نوح علیہ السلام سے منسوب ہے، جس کا ذکر انجیل مقدس اور قرآن شریف میں، اسی زبان سے دنیا کی قدیم و جدید حروف تہجی ماخوذ ہیں۔ سامی خط کی دو قسمیں تھیں، ایک شمالی سامی، جنوبی سامی خط۔ پھر شمالی سامی خط کی دو شاخیں ہوگئیں، ایک فنیقی، دوسری عبرانی۔ آگے چل کر فنیقی خط نام سے موسوم ہوا۔ آرامی خط سے دنیا کے بہتیرے خط پیدا ہوئے، جن میں عبرانی، پہلوی اور نبطی وغیرہ تھا۔ نبطی خط سے سینائی خط وجود میں آیا، اور سینائی خط سے نسخ خط، یعنی عربی خط نکلا۔ اسی سینائی خط سے ایک پیدا ہوا، جو کوفی خط کہلاتا ہے۔ یہ دونوں خط عرب میں ساتھ ساتھ رائج تھے۔ ان میں نسخ خط مکہ اور مدینہ میں اور کوفی خط نے کوفہ اور بصرہ میں ترقی کی۔ دونوں خط طرز و انداز کے لحاظ سے جداگانہ تھے، ایک میں نزاکت تھی، دوسرے میں آسانی اور روانی تھی۔ چونکہ نسخ خط، کوفی خط کے مقابلے میں سہل اور تیز رو تھا، اس لئے وہ جاری وساری ہوگیا۔

اشاعت اسلام کے ساتھ نسخ خط دوسرے ملکوں میں بھی پھیل گیا۔ نسخ خط جب ایران پہنچا تو اہل ایران نے بولی کے اعتبار سے اس میں چار حروف یعنے پ۔ چ۔ ژ اور گ کا اضافہ کیا۔ یہ خط وہاں فارسی نام سے نامزد ہوا۔ یہی خط ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد عرصہ دراز تک فارسی خط ہی کے نام سے اس میں ہندوستان کی مقامی بولیوں کی بعض آوازیں موجود نہ تھیں، ضرورت کے لحاظ سے اس میں ٹ اور ے حروف بڑھائے گئے۔

ہندوستان میں جب زبانوں کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو اُردو والوں نے ہندی والوں کے خلاف زبان کے خط کو اُردو خط سے مشہور کر دیا۔ بھارت میں ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ مل چکا ہے، آیندہ ملک میں سرکاری اور نجی کاروبار میں اپنا عمل دخل حاصل کرے گی۔ آیسے دن اُردو زبان میں ہندی کے اکثر الفاظ داخل ہوتے جا رہے ہیں۔ ان میں بعض آوازوں کی کمی اُردو میں محسوس کی جا رہی تھی، اس کا مجھے احساس ہے۔ اُردو رسم خط کی اصلاح کے لئے اپنی فکری تگ و دو شروع کر دی۔ اس سلسلے میں میرا غور و فکر اور کاوش کا مسلسل جاری ہے۔ ان کے ذریعے میں نے دو اہم اعراب، ایک رائے ممدودہ، جس کی علامت ( ) دوسرا ینمہ، جس کی علامت (ں) ہے، ایجاد کئے۔ رائے ممدودہ ہندی ری (रू) کا بد

رِتو کرپا اور پرتھوی جیسے سنسکرت الفاظ کی صحیح لکھاوٹ کے کام آتا ہے۔ ان کا جدید املا یوں ہے:- رِتو کرپا اور پرتھوی۔ دوسرا اعراب ینہ ہے، جو غیر زبانوں یعنی سنسکرت اور انگریزی کے بعض مخصوص لفظوں کی تحریر میں مدد دیتا ہے۔ یہ ایسے حرفوں کی نمائندگی کرتا ہے، جو آدھی یا ادھوری آواز دیتے ہیں۔ یہ ایک مفید اور کارآمد اعراب ہے۔ اس کے ذریعے اجنبی زبانوں کے بیسیوں الفاظ لکھے جا سکتے ہیں مثلاً:- ستان، نیایے، پریم (سنسکرت) اور سکوٹ، سٹار، سکالر (انگریزی) ان کو نئے املا میں یوں لکھا جائے گا:- ستان نیایہ۔ پریم اور سکوٹ سٹار، سکالر۔ اوپر کے اعرابوں کے علاوہ نون ثقیلہ (ण کا بدل) اور شین ثقیلہ (ष کا بدل) کے لئے، جن کا استعمال زیادہ تر سنسکرت الفاظ کی لکھاوٹ میں ہوتا ہے اور ان کی علامتیں ترتیب وار (نؕ) اور (شؕ) ہیں میرے مجوزہ اعراب ہیں۔ آج کل ان اعرابوں کی ہندی کے تعلق سے اردو میں ضرورت پڑتی ہے مثلاً:- نارائن کارن اور کوش، دوش انھیں جدید املا میں اس طرح لکھا جائے گا:-
نارائن، کارن اور کوش۔ دوش۔

مذکورۂ بالا جدید اعرابوں کی بدولت اہل اردو کو ہندی سنسکرت کے خاص خاص الفاظ کی اردو لکھاوٹ میں سہولت پیدا ہو گئی ہے، وہ ہندی کا برابر ساتھ دے سکتے ہیں، کسی قسم کی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ اس طرح اب اردو خط اصلاح کے بعد جامع بن گیا ہے۔

کشمیری، پشتو، سندھی اور انڈونیشی بولنے والوں نے بھی اپنے ہاں نسخ خط ہی کو اپنا لیا ہے۔ اس میں اپنی اپنی بولیوں کے لحاظ سے بعض آوازوں کے لئے حروف یا علامات کو وضع کر لیا ہے۔ اردو خط کا چلن ہندستان اور پاکستان میں ہے ان کے علاوہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بعض مقامات میں، جہاں بھارتی اور پاکستانی جا بسے اور وہ اردو بولتے ہیں یا جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے وہاں اسی خط کا رواج ہے۔

اردو خط میں جہاں تک زبان کا تعلق ہے، اس کی روح ہندستانی ہے لیکن چولا عربی فارسی ہے مسلمانوں کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ہندستان ہی کی پیدا شدہ دیسی زبان کو اپنا مذہبی رسم خط عطا کیا اور اس میں عربی، فارسی کے علوم و فنون کے قدیم ذخیرے کو منتقل کیا۔ مزید برآں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی اور ثقافتی ادبیات کو مالا مال کر کے اردو زبان کو ہر دو قوموں کا مشترکہ ورثہ بنایا۔ اس کے علاوہ یہ زبان سیاسی تحریکوں اور انتخابات کے چناؤ کے موقعوں پر مفید آلۂ کار ثابت ہوئی ہے۔ اس زبان سے ہندو مسلم اتحاد اور قومی یگانگت کو بڑی تقویت پہنچی، لہٰذا ایسی زبان اور اس کے خط کے ساتھ بھارتیوں کو رقیبانہ و تنگ نظرانہ سلوک نہیں کرنا چاہئے۔ اس کو بھی ہندستان کی دوسری دستوری زبانوں کے مانند پنپنے پھولنے کا موقع ملنا چاہئے۔

اردو خط صوتی اعتبار سے چینی، جاپانی، انگریزی یا فرانسیسی رسوم خط سے بہتر ہے۔ چنانچہ اس کی بعض خصوصیات کی بنا پر بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کا قول پیش کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:- "اردو خط میں، دو یا دو سے زیادہ حروف کو ملا کر ایک لفظ لکھا جاتا ہے جو تصویر کی طرح ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ جب ہم کسی اردو عبارت کو پڑھتے ہیں، تو اس کے الفاظ کو منفرد حرفوں والی زبان کے لفظوں کے مانند ایک ایک حرف دیکھ کر نہیں پڑھتے، بلکہ پورے لفظ کو ایک دم پڑھ جاتے ہیں، گویا تصویر کے مانند دیکھتے ہی فوراً سمجھ جاتے ہیں۔ ہمارے خط میں علاوہ اس خصوصیت کے حرفوں کی ملاوٹ کے سبب لکھاوٹ میں کاغذ بھی کم خرچ ہوتا ہے اور وقت کی بھی بچت ہوتی ہے۔ اس طرح سے اردو خط ایک قسم کا شارٹ ہینڈ ہے۔"

محمد اسحٰق ایوبی

بچپن۔ جوانی اور بڑھاپا

ظرف ہے خاک کا پُتلا یہ انساں
پر اس میں بولتا کیا جانے کیا ہے

بچپن، زندگی کی ریل گاڑی کا ایرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ، جوانی پہلا درجہ، ادھیڑ عمر دوسرا درجہ اور بڑھاپا تیسرا درجہ ہوتا ہے۔ یہ "درجہ بہ درجہ" "ترقیٔ معکوس" ہر ایسے مسافر کی قسمت میں لکھی ہے، جو زُلف کے "سر" بیننے "چندیا کے بے بال" بہ الفاظ دیگر بوڑھا ہونے تک جیتا ہے۔ زندگی کی ٹرین بچوں، جوانوں، ادھیڑوں اور بوڑھوں سے کھچا کھچ بھری چھک چھک کرتی شہر، دیہات، میدان، دریا، پہاڑ اور جنگل سے گذرتی آگے اور آگے بڑھتی ہی جاتی ہے۔ کچھ مسافر جن کا ٹکٹ ختم ہو جاتا ہے، درمیانی اسٹیشنوں پر اتر جاتے ہیں اور کچھ نئے لوگ سوار ہوتے ہیں۔ ادھر موت کا ٹکٹ چیکر قلب پر حملہ، انجکشن کی شیشی میں مکھی اور دوا کی بند بوتل میں مچھلی کی طرح غیر متوقع طور پر اچانک نمودار ہو جاتا ہے اور بے ٹکٹ مسافروں، بے لائسنس چاکروں اور معذور، نحیف و بیمار بھکاریوں کو چلتی گاڑی میں آن دبوچتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ بد دیانت ملازمین کی مانند موت کا ہرکارہ بھی رشوت لے کر کسی آدمی کو چھوڑ دے۔ یہ تو وفادار کتوں، تنخواہ یافتہ جاسوسوں اور جاں نثار شہیدوں کے جیسا دُھن کا پکا، کام کا چوکھا اور ڈیوٹی کا پورا ہے۔

کارخانۂ قدرت کے لمبے چوڑے سوال نامے کی متعدد گتھیوں کو سلجھانے کی کوششیں لاتعداد اہل فکر و نظر نے کی ہیں۔ مثلاً عالم رنگ و بو میں انسان کہاں سے آیا ہے، کیوں آیا ہے اور کہاں جائے گا؟ (آدمی سانپ تو نہیں کہ اندھیری رات میں بانبی سے نکلا، شکار کیا اور لپ جھپ دوبارہ بل میں جا گھسا) یہ وسیع و عریض کائنات کب وجود میں آئی، کیسے پیدا ہوئی اور کس وقت ختم ہو گی؟ (دنیائے آب و گل، رعد، برق تو نہیں کہ ابر کے چند ٹکڑے آپس میں ٹکرائے، بجلی کڑکی، بادل گرجے اور پھر مطلع صاف ہو گیا۔) کوئی آدمی طبیعت کا قلندر، کوئی قسمت کا سکندر اور کوئی صورت کا بندر ہے۔ آخر کیوں؟ (قدرت منافع خور بنیا تو نہیں کہ کبھی صحیح تول دے اور کبھی ڈنڈی مارے) جس طرح شادی بیاہ کے معاملات میں دخل اندازی کا حق صرف خاندان کے بزرگوں کو ہے، رسم و رواج کی تقدیس کی برقراری بوڑھی عورتوں کے فرائض میں شامل ہے اور اشیاء کے بھاؤ تاؤ کی ندی کے بہاؤ اور اُتار چڑھاؤ کا اختیار بیوپاریوں کو حاصل ہے، اسی طرح ارض و سماء کی ماہیت، اسرار اور رموز کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام صرف فلاسفہ، مفکرین اور علماء کو سونپا گیا ہے۔ یہ روگ پالنا ہمہ شما کے بس کی بات نہیں۔ پروفیسر کھیتوں میں گھاس کاٹیں اور گھسیارے کالجوں میں لکچر دیں، ایسا کبھی ہوا نہیں۔ جس کا کام اسی کو ساجے اور کرے تو ٹھینگا باجے۔

بچوں کی "ولادت باسعادت"، لڑکوں کی "جوانی دیوانی" اور بوڑھوں کا "انتقال پر ملال" ایسے حقائق ہیں
ہیں ہم زیادہ سے زیادہ بازیچۂ اطفال گردانتے ہیں، کیونکہ یہ تماشہ شب و روز ہماری آنکھوں کے سامنے
تا رہتا ہے۔ ہم "کُنْ فَیَکُوْن" اور "کون و مکان" کے مضمرات پر قطعی غور و فکر کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے۔
یسے ہی جیسے بدنی امراض کی تشخیص نہ تو پولیس حکام کر سکتے ہیں اور نہ ہی جرائم کی تفتیش ارباب طب کے بس کا
گ ہے۔ گھر گرہست لوگ "راگ، رنگ اور جھگڑے" کو بھول کر صرف "لون، تیل اور لکڑی" کو یاد رکھتے ہیں۔

بچہ پیدائش کے وقت کتنا مجبور، بے چارہ اور عاجز ہوتا ہے! وہ نہ تو خود کھا پی سکتا ہے اور نہ ہی اٹھنے بیٹھنے،
پھرنے، دوڑنے بھاگنے اور اچھلنے کودنے کی سکت رکھتا ہے اس کے سبھی چھوٹے بڑے کام دوسرے لوگ
ام دیتے ہیں! اس وقت کون جانتا ہے کہ یہی بے بس بچہ بڑا ہو کر دنیا میں جنگ کے شعلے بھڑکائے گا۔ بے یار و
دگار افراد کو پیروں تلے کچلے گا اور مختلف فرقوں میں تفرقہ بھی ڈالے گا، یا نئی نئی ایجادوں سے عوام دھواں کے لئے
ام و آسایش کے سامان فراہم کرے گا، روتی بلکتی دنیا کو امن و سکون کا پیغام دے گا اور قوم و وطن کی
حریت پر پروانہ وار فدا ہو جائے گا۔ ابھی تو یہ "چھوٹا سا فتنہ" پالنے میں پڑا پڑا کبھی ہنستا ہے، کبھی روتا ہے
کبھی "غوں غاں غاں" کرتا ہے! اس عمر کا معصوم بچہ دنیا کا سب سے کامیاب "ڈکٹیٹر" ہوتا ہے، جس کے
زبان" احکام کی تعمیل کرنا خاندان کا ہر چھوٹا بڑا فرد مقدس فریضہ سمجھتا ہے۔

دیکھتے دیکھتے بچہ آپ ہی آپ کروٹیں بدلنے، چت پٹ ہونے اور اٹھنے بیٹھنے لگا۔ اب وہ "غوں غاں" سے
ترقی کرکے "اماں" "ابا" اور "دادا" "دادی" تک آ پہنچا۔ پہلے جب مختلف چیزیں اس کے ہاتھوں میں تھما دی جاتی تھیں
ہی وہ انھیں گرفت میں لے سکتا تھا لیکن تدریجی نشو و نما کی بدولت بچہ پیٹ یا گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا
بہ خود ان تک رسائی حاصل کرنے لگا اب اس کی گرفت بھی مضبوط ہوتی جا رہی ہے! اسی طرح جیسے بہو آہستہ آہستہ
ں کی بیڑیوں سے آزاد ہونے، سسرال پر زیادہ سے زیادہ قبضہ جمانے اور شوہر کو پوری طرح بس میں کرنے کی
شش کرتی ہے۔ "مایا جال" یعنے "زر، زن اور زمین" کی اصلی فلم بعد میں شروع ہوگی۔ ابھی تو "پردۂ سیمیں" پر
روں، ایکٹرسیوں، پروڈیوسروں، ڈائرکٹروں، موسیقاروں، افسانہ نویسوں، مکالمہ نگاروں، شاعروں،
بیک سنگروں، فوٹو گرافروں، ایڈیٹروں، میک اپ کرنے والوں اور اسٹوڈیو کے نام بتائے جا رہے ہیں۔

پھر ایک دن بچہ اچانک اپنے آپ اٹھ کھڑا ہوا مستانہ چال کے ساتھ ٹانگیں آگے بڑھائیں، دو قدم چلا
دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ کوئی بات نہیں ؎

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں وہ طفل کیا لڑے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

جناؤ مو، بار، مزوا، دقابل، وتہ، سکار لیڈر، سالانہ امتحان مو فیل ہونے والا ذہین واللہ ۱۲۱ علم اور

انٹرویو میں ناکامی کا منہ دیکھنے والے لاوارث مگر باحوصلہ امید وار کی طرح اس کم سن بچے میں بھی ضد پیدا ہو جاتی ہے اور وہ "مے ولے افتاد مشکلہا" کا خیال کئے بغیر گرتا پڑتا آگے قدم بڑھا ہی دیتا ہے۔ اس وقت یہ ننھا بچہ پرانی داستانوں کے ہیروں کی طرح ہوتا ہے، جیسے دیو، پری یا جن سے ڈر نہیں لگتا اور وہ بڑی بڑی ندیوں، اونچے اونچے پہاڑوں اور گھور گھنے جنگلوں سے ہنستا کھیلتا گذر جاتا ہے اور آخر الامر گوہر مقصد بھی حاصل کر لیتا ہے۔

پانچ، چھ سال کی عمر تک یعنے اسکول میں داخل ہونے سے قبل اولاد "ماں کے مدرسہ" میں جس قسم کی تعلیم و تربیت پاتی ہے، وہ اس کو چھوٹا بڑا یا درمیانی؛ ڈرپوک، نڈر یا مصلحت بیں؛ اور انسانیت پرست، شیطان صفت یا دنیادار آدمی بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ "ماں کے مدرسہ" سے مراد ہے بچہ کی "نیو پڑنے" سے "ناؤ کنارے لگنے تک" کی مدت اور پیدائش سے پانچ، چھ سال کی عمر تک کا عرصہ۔ والدہ کی محبت، نگرانی و توجہ، گھر کا ماحول، بھائی بہنوں کا سلوک، باپ کی شفقت اور بیرونی اثرات تو تلوار کے زخم، زبان کے گھاؤ اور چیچک کے داغ سے بھی گہرے ہوتے ہیں۔ اس مدت کو "ماں کا مدرسہ" اس لئے کہنا چاہئے کہ والدہ بہ یک وقت پرنسپل، کلاس ٹیچر اور اسسٹنٹ مسٹریس سب کچھ ہوتی ہے، جب کہ باقی کیریکٹر صرف مانیٹر، اسکول کلرک، چپراسی، چوکیدار اور "مسکال و دمن" ہوتے ہیں۔ "ماں کے پاؤں تلے جنت" ہو یا نہ ہو لیکن اولاد کے حق میں دنیا کو جنت یا جہنم بنانے کی صلاحیت بڑی حد تک والدہ ماجدہ کو ودیعت کی گئی ہے۔ تعلیم، ماحول، مطالعہ کتب، سینما بینی اور دوست احباب کی صحبت وغیرہ زیادہ سے زیادہ صرف اس جنت یا جہنم کے فرسٹ، سیکنڈ یا تھرڈ کلاس کا تعین کرنے میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ جنت کا مطلب صرف بے شمار دولت، بے لگام اقتدار یا بے انتہا شہرت نہیں۔ ویسے زردہ، پلاؤ اور بریانی کا مزہ تو اسی میں ہے کہ شکم سیر ہو کر کھایئے، مگر بھوک سے زیادہ بھی ٹھونسنا، مہمانوں، میزبان دونوں کے لئے ضرر رساں ہے۔

پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کی تعلیم ہر لڑکے اور لڑکی کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس زمرۂ عمر میں بچے چاہے ہل جوتیں، بوجھ ڈھوئیں، برتن مانجھیں، رکشا کھینچیں، مشین چلائیں یا اسکولوں میں تعلیم پائیں۔ اس سے بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ عملی دنیا میں ہمارا رات دن کا مشاہدہ ہے کہ کئی کلرک، ٹیچر، پروفیسر، افسر، وکیل، انجینیئر اور ڈاکٹر بہت زیادہ فارغ البال نہیں ہوتے۔ ان میں سے بہتیرے تو عمر بھر ذاتی مکان سے بھی محروم رہتے ہیں اور وفات حسرت آیات کے بعد پس ماندگان کے لئے قرض کا ورثہ چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے مزدور، کسان، دست کار، اہل صنعت و حرفت اور چھوٹے موٹے دکان دار بڑے خوش حال ہوتے ہیں۔ جینے کا سلیقہ، خوشامد کرنے کا طریقہ اور دوستوں یا رشتہ داروں کو عاریتاً دی ہوئی بھاری رقوم کا وثیقہ حاصل کرنا منہ کا نوالہ نہیں ہے ؎

نہ آیا ہمیں عشق کرنا نہ آیا ٭ مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا

الغرض تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ افراد میں سبھی نہ تو دولت مند ہوتے ہیں اور نہ ہی غریب۔ دونوں زمرہ کے لوگ برسرِ روزگار بھی ہو سکتے ہیں، بے کار بھی۔ یہ بھی عزت و شہرت کے مالک بن سکتے ہیں، وہ بھی۔ یہاں بھی لوگ آئے دن بیمار پڑتے ہیں، وہاں بھی۔ ادھر بھی میاں بیوی لڑتے ہیں، ادھر بھی۔ اس طرف بھی "لو میریج" ہو جاتا ہے، اس طرف بھی۔ اول الذکر بھی خود کشی کر سکتے ہیں، موخر الذکر بھی۔

ذہانت، حُسن اور کسی فن سے خصوصی لگاؤ سو فی صدی وہبی چیزیں ہیں، اختیاری، نسلی یا خاندانی قطعی نہیں۔ اس سلسلے میں آدمی کی بے بسی اتنی ہی واضح ہے جتنا مرضی کے مطابق لڑکی یا لڑکا پیدا کرنا، حسبِ خواہش مٹی سے اونچا انعام پاتا اور جاگنے کے بعد حسین خوابوں کا تسلسل قائم رکھنا۔ البتہ تعلیم، تربیت، توجہ، شوق اور لگن سے ذہانت و فن میں نکھار اور بناؤ سنگھار سے حُسن میں تیکھا پن پیدا ہو سکتا ہے۔

جس وقت لڑکپن اور جوانی کی سرحدیں ملتی ہیں اس وقت دل و دماغ، جسم و جان اور فکر و نظر میں انتہائی عجیب و غریب تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ رعیت کو بادشاہ کی موت کا غم ہوتا ہے تو دوسرے بادشاہ کی تاج پوشی کی مسرت بھی۔ دولھن کو میکہ چھوٹنے کا دکھ ہوتا ہے تو دولھا ملنے کی خوشی بھی اور افسر کو تبادلے کا رنج ہوتا ہے تو ترقی سے طمانیتِ قلب بھی۔ لڑکپن اور جوانی کا ملاپ ایسی شرمیلی دوشیزہ ہے، جو ایک طرف مردوں کی چھیڑ چھاڑ کو دل سے پسند کرتی ہے اور دوسری طرف ان سے دور بھی بھاگنا چاہتی ہے۔ یہ سنگم ایسا غنچہ ہے، جو کھلنے کے لئے بے تاب ہے اور مآلِ گل سے ڈرتا بھی ہے۔ یہ دراصل آندھی اور آگ کا اتصال ہے، جس سے شعلے اور تیز ہوتے ہیں۔

روایت اور بغاوت، قدامت اور جدت، جوش اور ہوش میں ویسی ہی ازلی عداوت ہے، جیسی انسان اور شیطان کے درمیان از آدم تا ایں دم موجود ہے۔ جراثیمِ دق و سل کے حملے کی طرح یہ ٹکراؤ بھی جوانی میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اگر عہدِ طفولیت سراپا شور و غوغا، طوفانِ باد و باراں اور قہقہہ و خندہ زنی ہے تو شباب ساز د آواز کا منظم راگ، سیلابی دریاؤں کا پشتہ اور تبسم کا حسین شگوفہ ہے۔ یہ راگ دیپک بھی ہو سکتا ہے اور میگھ ملہار بھی۔ باندھ کا پانی ترقی و خوش حالی لاتا ہے تو ٹوٹنے کی صورت میں ناقابلِ تصور تباہی و بربادی بھی پھیلا سکتا ہے۔ گلاب کی کلی دیکھنے میں بڑی بھلی لگتی ہے مگر اس کے کانٹوں کی زہرناکی سے کون واقف نہیں۔

پیار اور محبت، شادی بیاہ اور سیر و سیاحت کا بہترین زمانہ جوانی ہے۔ بڑھاپے میں کسی سے عشق کی پینگیں بڑھانا ایسا ہی ہے، جیسے چھو گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر، پیری میں ازدواجی زندگی کا آغاز کرنا بے معنی بنتا ہے اور کم سنی میں "جہاں دیدہ جہاں گشتہ" کی حیثیت سے رختِ سفر باندھنا بیل گاڑی سے قطب شمالی سے قطب جنوبی کی مسافت طے کرنا ہے۔

انسان لڑکپن تک خام لوہا ہوتا ہے۔ پھر یہ لوہا جوانی کی بھٹی میں تپ کر سُرخ ہو جاتا ہے اور زندگی کے

تھپیڑے تجربہ کار لوہار کی طرح کوٹ پیٹ کر اس سے مناسب اوزار، گھریلو سامان اور اسلحہ ساخت کرتے ہیں اب کہیں جا آدمی آدمی بنا! اس تیار مال کو منڈی میں بھیجئے، دکان پر رکھئے، خوانچے میں لئے لئے پھرئیے، فٹ پاتھ پر ڈھنگ سے لگائیے گھر میں سجائیے، کارخانے کی مشینری میں فٹ کیجئے، دفتر کی کرسیوں پر بٹھائیے ـــ جس طرح جی چاہے برتئیے۔

یوں تو بچپن ہی میں لڑکوں اور لڑکیوں کی جسمانی بناوٹ، رجحان اور پسند کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے لیکن جوانی میں جنسی اختلاف جتنا شدید ہوتا ہے، اسی شدت سے باہمی اختلاط کا جذبہ بھی پروان چڑھتا ہے۔ گویا دونوں کی امتیازی خصوصیتیں صرف دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتی ہیں بلکہ خاندانی گوالے کی طرح دودھ اور پانی کے ملاوٹ کی آرزومند بھی رہتی ہیں

موسم سرما کے بعد آتا ہے موسم گرما، دن کے بعد آتی ہے رات اور جوانی کے بعد آتا ہے بڑھاپا۔ لیکن جس طرح جنت دوزخ کے مابین عالم برزخ ہے اسی طرح منزل شباب اور مرحلۂ پیری کے درمیان بھی ایک سرائے ہے اور وہ ہے ادھیڑپن۔ عالم جوانی اور عہد پیری کی درمیانی مدت ریلوے جنکشن کے ویٹنگ روم کی حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ ا لائن بدل جائے گی۔ ہم خطۂ جوانی سے علاقۂ کہن سالی میں جو مال اسمگل کرنا چاہتے ہیں، اس کی کڑی چیکنگ ادھیڑ کسٹم ہاؤس میں کی جاتی ہے۔ یہاں ہمیں جوانی کے پاپ اور پن کا پورا پورا محصول ادا کر کے آگے بڑھنا ہے۔

ادھیڑ عمر کا گلابی جاڑا ختم ہوتا ہے تو بڑھاپے کی کڑاکے کی سردی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں بچپن، جوانی اد ادھیڑ عمر کا سب کھایا پیا اگلنا پڑتا ہے۔ ہم نے عہد طفولیت، عالم جوانی اور ادھیڑ عمر سے تجربات اور مشاہدات کے بورے سینت رکھے ہیں وہ ہمارے عرق انفعال کی وجہ سے بھیگی ہوئی روئی کی طرح اتنے وزنی ہو جاتے ہیں کہ ان کا ادھیڑ پر اٹھائے اٹھائے پھرنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ جوں جوں بیگانوں کی فریب کاریاں، اپنوں کی دغا بازیاں، میٹھی باتوں کے پیچھے چھپی گھاتیں، اُجلے تن اور کالے من والوں کے سنہری کارنامے، خیر خواہوں اور بدخواہوں کے نقلی روپ عملی زندگی کے رنگ منچ کی تیز روشنی میں نظر کے سامنے آتے جاتے ہیں، توں توں ہم ظاہر و خفیہ "جانی دشمنوں" سے بچاؤ کے لئے اپنے آپ کو خود، خذہ، بکتر، تلوار، ڈھال، تیر، کمان اور نیزے سے لیس کرتے جاتے ہیں۔ مگر جب ہمارا پورا جسم و دیگر ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ہو جاتا ہے تو ہم زندگی کے ایسے مرحلے پر پہنچ چکے ہوتے ہیں، جب کہ ہماری نحیفی و ا اتنے ڈھیر سارے ساز و سامان کا بوجھ سہار نہیں سکتی، ہمارے ہاتھ پاؤں نئے نئے چور کے اعضاء کے جیسے تھر تھر کانپنے لگتے اور یہ اس لئے خود بہ خود ہماری گرفت سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑتے ہیں۔ گویا قوت دماغ کی محبوبہ ہمارے دست ناتواں "دامن جھٹک کر" نو، دو، گیارہ ہو گئی ہے۔ اور پھر ـــ

ہوش و حواس تاب و تواں پہلے جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

دکن اور دکنی کا آغاز

(بہ سلسلۂ گذشتہ)

احمد نگر کے بعد تمدنی نشو و نما اور مرفہ حالی کے اعتبار سے بیجاپور کا نام لیا جا سکتا ہے۔ بیدر بہمنی خاندان کے عہد ہی میں [illegible] گیا تھا۔ بیدر جب [illegible] کے زمانے میں اس کی حالت ابتر ہو گئی تھی گولکنڈے نے سب کے بعد میں ترقی کی طرف قدم اٹھایا۔ [illegible] نے بھی [illegible] پوری کرلی۔

احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈے کے حکمران دلی کے حکمرانوں سے اس بات میں بالکل مختلف تھے کہ عربی اور [illegible] ثقافتوں میں دلچسپی اور اعتقاد رکھنے کے باوجود مقامی عادات اور رسم و رواج سے ان کا تعلق [illegible] اعزاز بخشتے ہوئے بھی یہاں کے شاہی خاندانوں نے دکنی سماج کو فطری طور پر نشو و نما کا موقع عطا کیا۔ اس زمانے کے ماحول نے دکن میں مذہب، ثقافت اور ادب کے میدانوں میں ایک امتزاج پیدا کرنے کی جو ذمہ داری انھیں سونپی تھی ان حکومتوں نے اسے اچھی طرح نبھایا۔ بیجاپور کے حکمرانوں کو [illegible] کے تصادموں میں بیجانگر کے راجاؤں سے اور تصادم آخر میں مرہٹوں سے مقابلہ کرنا پڑا، ان کی تعمیری [illegible] میں [illegible] تعمیر کا اثر احمد نگر اور گولکنڈے سے زیادہ ہے۔ یہ تعجب خیز بات ہے کہ بیجاپور میں [illegible] عناصر یہاں کے اصلی باشندوں میں جس طرح گھل مل گئے ہیں، اسی طرح دکن کی دوسری [illegible] میں نہ ہو سکا۔ بیجاپور میں دکنی کا جو ادب لکھا گیا اس میں سنسکرت کے تتسم زیادہ ہیں۔ [illegible] استعمال کر کے نئے اسلوب کی تخلیق کرنے والا پہلا شاعر [illegible] لیکن [illegible] کی تشبیہیں بھی سنسکرت کے تتسم اور تدبھو استعمال ہوئے ہیں۔

(۵) جب ملک کے [illegible] مغل خاندان کے بادشاہ [illegible] ہوئے، دکن کی سیاست میں بہت بڑا تغیر ہوا تھا۔ [illegible] اقتدار حاصل کرنے کے لئے تین قوتیں مقابلہ کر رہی تھیں۔ اس تصادم میں ہندوستان کی [illegible] دکن کے مسلم حکمرانوں پر اس مقابلہ کا اثر پڑا۔

ان دنوں میں مغربی اور وسط ایشیا کے مسلم حکمران تین حصوں میں بٹے ہوئے تھے (۱) عثمانی گروہ (۲) ترکی گروہ (۳) ایرانی گروہ۔ مغلوں نے اپنی بادشاہت کی بنیاد عباسی خلافت کی زوال شدہ باقیات پر رکھی تھی اس کے علاوہ مغل اور ترک سنی تھے، جب کہ ایران کے حکمران شیعہ تھے سنیوں کے پاس ان دنوں بڑی قوت تھی ایران کے جاہ وجلال کا ٹھکانا نہ تھا۔ سولھویں صدی میں دلی کے مسلم شہنشاہ ایک طرف کل ہند پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے، دوسری طرف ہندستان سے باہر وہ اپنے آباؤ اجداد کی کھوئی ہوئی حکومت کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتے رہے تیمور کی اولاد وسط ایشیا کی حکمران بننے کا خواب دیکھتی تھی جو فطری بات تھی۔ بابر نے سمرقند اور بخارا کو دوبارہ حاصل کرنا چاہا، ہمایوں بدخشاں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اکبر کابل ہی تک پہنچا۔ جہانگیر کے دل کی تمنا دل ہی میں رہ گئی۔ ایرانی بادشاہوں اور مغل حکمرانوں میں قندھار کے لئے عرصے تک مقابلہ چلتا رہا۔ بابر قندھار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا، مگر جہانگیر کے عہد سلطنت میں شاہ عباس (اول) نے اسے دوبارہ فتح کرلیا۔ شاہ جہاں کی عمل داری میں اورنگ زیب نے دو مرتبہ اور دارا نے ایک مرتبہ قندھار کے لئے جان توڑ کوششیں کیں لیکن دونوں ناکام رہے۔ ویسے ایران کی نسبت مغل بادشاہوں نے ہمیشہ اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ نمائش کے لئے ایرانی حکمرانوں نے بھی یہی عمل کیا، لیکن اندر ہی اندر دونوں جانب عناد تازہ ہی رہا۔ ایران کے شاہوں نے مغلوں کی لمبی چوڑی تعریف کو پسند نہ کیا۔ وہ لوگ ایران کی طرف سے بابر کو دی گئی امداد اور ہمایوں کو شاہ طہماسپ کے ذریعے عطا کردہ حفاظت کا ذکر بار بار کرتے رہے۔

ادھر مغل شہنشاہ ایرانی بادشاہوں کی شان وشوکت کو اپنے ہم مرتبہ نہیں مانتے تھے۔ حکومت رقبے اور دولت وثروت کے نقطہ نظر سے مغلوں اور ایرانی بادشاہوں کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایران کے بادشاہ قوت بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔ ہندستان میں بیجاپور اور گولکنڈے کے شاہی خاندان شیعہ تھے، لہذا بہت دور ہونے پر بھی ان حکومتوں میں ان کی خاص دلچسپی تھی۔ ایشیا کے گذشتہ دستوروں پر نظر رکھنے والے مغل فطرۃً ان دونوں حکومتوں کا انتشار وافتراق مفید نہ سمجھتے تھے مغلوں سے خوف زدہ ہو کر ان حکومتوں کا ایرانی شاہوں اور دکن کے ہندو مسلم عوام سے تعاون حاصل کرنا بھی فطری بات تھی۔ اسی وجہ سے کل ہند پر اقتدار اور غلبہ پانے کی تمنا مغلوں میں اجاگر ہوئی۔ شمالی ہند سے دکن کی طرف آنے والی شاہراہ سے اجین دیوگری شاہراہ پر سب سے پہلے احمد نگر کی سرحد پڑتی تھی۔ گجرات، خاندیس اور برار کے لئے بھی احمد نگر کو تسخیر کرنا ضروری تھا۔ انہی وجوہ کی بنا پر اکبر نے دکنی حکومتوں میں سب سے پہلے احمد نگر پر حملہ کیا۔ اس حملے کا قابل ذکر واقعہ یہ تھا کہ ہندی کے مشہور شاعر خان خاناں عبدالرحیم رحیم شاہزادہ دانیال کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ اس کے قبل خان خاناں شہزادہ مراد کے ہمراہ احمد نگر پر حملہ کر چکے تھے مگر خان خاناں اور

مرہٹوں میں چند باتوں میں اختلاف پیدا ہوگیا اور احمد نگر کی طرف سے چاند بی بی نے ایسی قیادت کی کہ مغلوں کو کامیابی مطلب نہ ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد احمد نگر فتح ہوگیا اور دانیال دکن (احمد نگر، برار، خاندیس، مالوہ اور گجرات) کے صوبہ دار بنے اور خان خاناں بہت دنوں تک دکن میں رہے۔

پورے دکن پر تسلط جمانے کے لئے شاہ جہاں بھی کوشاں رہا لیکن ۱۵۹۱ء میں خاندیس، احمد نگر، بیجاپور اور گول کنڈے کو ماتحتی قبول کرنے کے لئے ایلچی بھیج کر جو کارروائی اکبر نے شروع کی تھی اس کی تکمیل اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہوئی۔

بیجاپور اور گول کنڈے کی شکست کے بعد اورنگ زیب دکن کی سیاست میں بری طرح الجھ گیا۔ دکن کی ان دونوں حکومتوں کے زوال کے بعد سارے ہندستان کی سیاست کا توازن بگڑ گیا۔ نتیجے کے طور پر مرہٹہ قوت ابھری۔ مرہٹوں سے نمٹنے کے لئے اورنگ زیب نے (۸۰) برس کی عمر میں پنڈھرپور سے اسی میل بھیما کے کنارے برھما پوری نامی مقام کو اپنی آخری اقامت گاہ کے لئے انتخاب کیا۔ برھما پوری کا نام اسلام پوری رکھا گیا۔ اورنگ زیب ۲۱ مئی ۱۶۹۵ء سے ۱۹ اکتوبر ۱۶۹۹ء تک یہیں سے حکومت کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ مرہٹوں کے خلاف آخری مہم کے لئے وہ یہیں سے کوچ کیا اور اس مہم سے وہ ۲۰ جنوری ۱۷۰۶ء کو واپس ہوا۔ ایک سال ایک ماہ کے بعد ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو اس کا انتقال ہوا۔ برھما پوری سے پہلے اورنگ زیب کچھ عرصے کے لئے اورنگ آباد میں رہ چکا تھا۔ ان دنوں اورنگ آباد فوجی چھاؤنی ہی نہیں حکومت کا انتظامی مرکز بھی تھا۔ شمالی ہند سے آئے ہوئے ہزاروں سپاہی، تاجر، انتظامی عہدہ دار اور محنت کش لوگ اورنگ آباد اور اسلام پوری میں رہتے تھے۔ اورنگ زیب کی یہ مہم "دکھنی" کی نشو ونما میں معاون ثابت ہوئی۔

اورنگ زیب کے بعد مغل شہنشاہیت کمزور ہوگئی، مرہٹے دکن پر مسلط ہوگئے، کرناٹک میں میسور کی جدید حکومت طاقتور ہوگئی اور حیدرآباد میں آصف جاہی خاندان کی حکومت قائم ہوئی ان بڑی بڑی حکومتوں کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں انگریزی حکومت کے سبب حیدرآباد اور میسور کی ریاستیں بچ گئیں، باقی حکومتیں بمبئی اور مدراس میں ملا لی گئیں۔

انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد حکومتوں کی دوبارہ تنظیم ہوئی۔ کنڑی بولنے والوں کی میسور، اور تلگو بولنے والوں کی آندھرا حکومتیں قائم ہوئیں اور مرہٹی بولنے والے بھی ایک حکومت کے تحت محکوم بن گئے۔ گجرات اور مہاراشٹرا کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح کاکیتیوں اور یادووں کے بعد گوداوری، کرشنا اور تنگ بھدرا کے دلٹی علاقے اور مرہٹی زبان والوں کے علاقے کی جو حالت تقریباً آٹھ سو برس تک رہی وہ بہت کچھ تبدیل ہوگئی۔ یہاں بڑے بڑے شاہی خاندانوں کی فہرست دی جا رہی ہے تاکہ اس زمانے کے ...

بہمنی خاندان

(۱) علاؤالدین بہمن شاہ (سال حکومت ۱۳۴۷ء – ۱۳۵۸ء)
(۲) محمد (اول) (۱۳۵۸ء – ۷۷ء)
(۳) مجاہد (۱۳۷۷ء – ۷۸ء)
(۴) داؤد (۱۳۷۸ء)
(۵) محمد (ثانی) (۱۳۷۸ء – ۹۷ء)
(۶) غیاث الدین (۱۳۹۷ء)
(۷) شمس الدین (۱۳۹۷ء)
(۸) فیروز (۱۳۹۷ء – ۱۴۲۲ء)
(۹) احمد (۱۴۲۲ء – ۳۵ء)
(۱۰) علاؤالدین ثانی (۱۴۳۶ء – ۵۸ء)
(۱۱) ہمایوں (ظالم) (۱۴۵۸ء – ۶۱ء)
(۱۲) نظام شاہ (۱۴۶۱ء – ۶۳ء)
(۱۳) محمد (ثالث) (۱۴۶۳ء – ۸۲ء)
(۱۴) محمود (۱۴۸۲ء – ۱۵۱۸ء)
(۱۵) احمد (ثانی) (۱۵۱۸ء – ۲۱ء)
(۱۶) علاؤالدین (۱۵۲۱ء)
(۱۷) ولی اللہ (۱۵۲۱ء – ۲۴ء)
(۱۸) کلیم اللہ (۱۵۲۴ء – ۲۷ء)

برید شاہی (بیدر)

(۱) امیر قاسم برید (۱۴۸۷ء – ۱۵۰۴ء)
(۲) امیر علی برید (۱۵۰۴ء – ۴۲ء)
(۳) علی برید شاہ (اول) (۱۵۴۲ء – ۷۹ء)
(۴) ابراہیم برید شاہ (۱۵۷۹ء – ۸۶ء)
(۵) قاسم برید شاہ (۱۵۸۶ء – ۸۹ء)
(۶) امیر برید شاہ (۱۵۸۹ء – ۱۶۰۱ء)
(۷) مرزا علی برید شاہ (۱۶۰۱ء – ۱۶۰۹ء)
(۸) علی برید شاہ (ثانی) (۱۶۰۹ء – ۱۶۱۹ء)

۱۶۱۹ء میں بیدر بیجاپور کے قبضے میں چلا گیا۔

نظام شاہی (احمد نگر)

(۱) احمد نظام شاہ (۱۴۹۰ء – ۱۵۰۹ء)
(۲) برہان نظام شاہ (۱۵۰۹ء – ۱۵۵۳ء)
(۳) حسین نظام شاہ (اول) (۱۵۵۳ء – ۱۵۶۵ء)
(۴) مرتضیٰ نظام شاہ (اول) (۱۵۶۵ء – ۱۵۸۶ء)
(۵) حسین نظام شاہ (ثانی) (۱۵۸۶ء – ۸۹ء)
(۶) اسماعیل نظام شاہ (۱۵۸۹ء – ۱۵۹۶ء)
(۷) احمد (۱۵۹۶ء – ۱۶۰۳ء)
(۸) مرتضیٰ نظام شاہ (ثانی) (۱۶۰۳ء – ۱۶۳۰ء)
(۹) حسین نظام شاہ (ثالث) (۱۶۳۰ء – ۱۶۳۳ء)

۱۶۳۳ء میں مغلوں کی فوج نے احمد نگر پر قبضہ کر لیا اور کل حکومت مغل شہنشاہیت میں ضم کر لی گئی۔

عادل شاہی (بیجاپور)

(۱) یوسف عادل شاہ (۱۴۹۰ء – ۱۵۱۰ء)
(۲) اسماعیل عادل شاہ (۱۵۱۰ء – ۱۵۳۴ء)
(۳) ملو عادل شاہ (۱۵۳۴ء)
(۴) ابراہیم عادل شاہ (اول) (۱۵۳۴ء – ۱۵۵۸ء)
(۵) علی عادل شاہ (اول) (۱۵۵۸ء – ۱۵۸۰ء)
(۶) ابراہیم عادل شاہ (ثانی) (۱۵۸۰ء – ۱۶۲۷ء)
(۷) محمد عادل شاہ (۱۶۲۷ء – ۱۶۵۷ء)
(۸) علی عادل شاہ (ثانی) (۱۶۵۷ء – ۱۶۷۲ء)

(۹) سکندر عادل شاہ (۱۶۷۲–۱۶۸۶ء)
۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب کے حملے کے نتیجے میں بیجاپور کو شکست ہوئی اور حکومت کا بڑا حصہ مغل شہنشاہیت میں شامل ہوگیا۔

قطب شاہی (گول کنڈہ)

(۱) سلطان قلی قطب شاہ (۱۵۱۲–۱۵۴۳ء)
(۲) جمشید قطب شاہ (۱۵۴۳–۱۵۵۰ء)
(۳) سبحان قلی قطب شاہ (۱۵۵۰ء)
(۴) ابراہیم قطب شاہ (۱۵۵۰–۱۵۸۰ء)
(۵) محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰–۱۶۱۲ء)
(۶) محمد قطب شاہ (۱۶۱۲–۱۶۲۶ء)
(۷) عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۶–۱۶۷۲ء)
(۸) ابوالحسن قطب شاہ (۱۶۷۲–۱۶۸۷ء)
۱۶۸۷ء میں مغلوب ہونے کے باعث گول کنڈے کا علاقہ مغل شہنشاہیت میں مل گیا۔

دکن کی ان حکومتوں کے علاوہ قرب و جوار کی حکومتوں کے آغاز اور خاتمے کے سنین دکھنی کی نشو و نما کے عمل کے جاننے میں معاون ثابت ہوں گے۔ گجرات میں ۱۳۹۶ء میں آزاد حکومت قائم ہوئی۔ مغل حملے کے سبب ۱۵۷۲ء میں اس حکومت کا خاتمہ ہوا۔ مالوے میں آزاد حکومت کا قیام ۱۳۹۲ء میں اور خاتمہ ۱۴۳۶ء میں عمل میں آیا۔ یہاں ایک نئے شاہی خاندان نے حکومت کی ابتدا کی۔ ۱۵۳۱ء میں گجرات کے بادشاہ نے مالوے کو گجرات میں ملا لیا۔ خاندیس میں ۱۳۸۲ء میں جو آزاد حکومت قائم ہوئی تھی وہ ۱۵۵۷ء کے کچھ دنوں تک گجرات کے ماتحت رہی۔ ۱۶۰۱ء میں اس صوبے پر مغلوں کا اقتدار ہوا۔

مسلم عہد کے بڑے بڑے واقعات کا توقیت نامہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) علاؤالدین خلجی کا دیوگری پر حملہ (۱۲۹۵ء)
(۲) 〃 〃 گجرات پر قبضہ (۱۲۹۷ء)
(۳) دیوگری پر ملک کافور کا حملہ (۱۳۰۶–۷ء)
(۴) ورنگل کے پرتاپ رودریو (ثانی) کی شکست (۱۳۰۸ء)
(۵) ورنگل کی دوبارہ شکست اور زوال کامل (۱۳۲۳ء)
(۶) محمد تغلق کے ذریعے دلی سے دولت آباد کو پایۂ تخت کا تبادلہ (۱۳۲۷ء)
(۷) دلی کے باشندوں کو دولت آباد جانے کا حکم (۱۳۲۹ء)
(۸) مالوے کے محمود (اول) نے بہمنیوں پر حملہ کیا۔ گجرات کا محمود بیگڑہ نظام شاہ (بہمنی) مدد کے لئے گیا (۱۴۶۲ء)
(۹) محمود کے زمانے میں گجرات کے حکمران بہادر شاہ کی شکست۔ (۱۵۲۹ء)
(۱۰) اکبر کے زمانے میں مالوہ اور گجرات پر مغلوں کا حملہ (۱۵۶۸ء)
(۱۱) گجرات پر مغلوں کا دوبارہ حملہ (۱۵۷۲ء)
(۱۲) اکبر کے زمانے میں خاندیس پر مغل فوج نے قبضہ کیا۔ (۱۵۷۷ء)
(۱۳) اکبر نے برار پر قبضہ کیا۔ (۱۵۹۶ء)

(۱۴) جہانگیر کے زمانے میں دکن پر چڑھائی (۱۶۰۸ء)
(۱۵) خرم (آگے چل کر شاہ جہاں) دکن کا صوبہ دار بنا (۱۶۱۶ء)
(۱۶) شاہ جہاں نے احمد نگر کو دوبارہ تسخیر کیا (۱۶۳۰ء)
(۱۷) شاہ جہاں کے زمانے میں مغلوں کا بیجاپور پر حملہ (۱۶۳۲ء)
(۱۸) اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار بنا (۱۶۳۷ء)
(۱۹) اورنگ زیب نے گولکنڈے پر حملہ کیا (۱۶۵۵ء)
(۲۰) اورنگ زیب کے ایک لڑکے سے گولکنڈے کی شہزادی کی شادی۔ (۱۶۵۶ء)
(۲۱) اورنگ زیب نے بیدر، کلیانی ا
گلبرگہ پر قبضہ کیا۔ (۵۷
(۲۲) بیجاپور پر مغلوں کا کامیاب حملہ (۷۹:
(۲۳) اورنگ زیب کا بیجاپور پر محاصرہ (۸۵
(۲۴) بیجاپور کا سقوط (۸۶
(۲۵) اورنگ زیب کی وفات (۷۔
(۲۶) نظام الملک آصف جاہ نے آصف جاہیٔ
قائم کی (۲۴

دکھنی زبان

جس طرح عہد وسطیٰ میں نو واردوں کے میل ملاپ سے دکشنا پتھ میں معیاری مہاراشٹری پراکرت کی شکل نمودار ہوئی اسی طرح جدید ہند آریائی زبانوں میں اہم زبان ہندی کی فصاحت و شستگی میں اس نے تعاون کیا۔ اوپر جن واقعات کا اظہار کیا گیا ہے، ان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی دور سے شمال و دکن میں گہرا تعلق رہا۔ پانڈے اور کیرل کے حکمرانوں کے تعلقات ہمیشہ وسط کے حکمرانوں کے ساتھ قائم تھے اور وسط دکن کے شاہی خاندان شمالی اور مغربی ہند کے ساتھ مربوط رہے۔ سیاست کے علاوہ مذہبی اور ثقافتی اتحاد بھی زبردست رہا۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے زمانۂ قدیم سے شمال و دکن میں مختلف زبانوں کی موجودگی میں بھی ایک عام زبان کا استعمال ہوتا تھا۔ کئی صدیوں تک سنسکرت مذہبی زبان ہی نہیں ثقافتی اور سرکاری زبان بھی بنی رہی۔ آٹھویں صدی تک دکن کے حکمرانوں کے تامبر پتر (عطیۂ انعام کی تانبے کی تحریر) اور فرامین سنسکرت ہی میں لکھے جاتے تھے۔ بودھ اور جین دھرم کی اشاعت کے سبب اور شمالی ہند میں پراکرت کو ثقافتی اور ادبی زبان کے طور پر اختیار کرنے سے دکن میں بھی پراکرت اپنائی گئی۔ اپ بھرنش کے زمانے میں دکن کے لوگ پیچھے نہیں رہے۔ راشٹرکوٹہ کے درباری شاعر پشپ دنت وغیرہ نے کئی تصانیف اپ بھرنش میں پیش کیں۔ ہر لحاظ جدید ہند آریائی زبانوں کے استعمال میں بھی معاون ثابت ہوا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد چودھویں صدی میں زیادہ تر علاؤالدین خلجی سے لے کر آصف جاہ (اول) تک جتنے شہنشاہوں اور فوجی افسروں کی قیادت میں دکن پر حملے ہوئے۔ ان میں سے چند کو چھوڑ کر سبھی مہموں میں ہزاروں خاندان شمالی ہند

دکن پہنچے اور ان میں سے بہتیرے خاندان یہیں بس گئے۔ کئی بڑی تمنا والے قسمت آزما نوجوانوں نے دکن ہی کو اپنا میدانِ عمل منتخب کیا۔ زیادہ تر سپاہی ہندو تھے یا ایسے شخص تھے جنھوں نے کچھ عرصہ پہلے اسلام قبول کیا تھا (نومسلموں)، ہندو سپاہیوں اور محنت کشوں کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے فوجی افسروں کی ثقافتی زبان فارسی اور مادری زبان عربی، ترکی، پشتو وغیرہ کو اپنی زبان بناتے۔ یہ عام سپاہی اور مزدور پیشہ ایک ہی مقام سے نہیں آئے تھے۔ کسی کا تعلق بہار سے تھا، کسی کا اودھ سے اور کسی کا راجستھان سے۔ ان فوجیوں کے سرداروں میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی، جو دلّی میں بس گئے تھے یا دلّی میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ لوگ کھڑی بولی سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان دنوں کھڑی بولی اردو کی طرح معیاری اور صاف نہ تھی۔ کھڑی بولی میں ہریانہ، میوات اور شیخاواٹی اور برج سے متعلق بولیوں کا اثر تھا۔ شمالی ہند کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے یہ خاندان گھریلو زندگی میں اپنی بولی بولتے تھے اور دوسرے علاقے کے لوگوں سے ملتے وقت کھڑی بولی استعمال کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ دلّی کے قرب وجوار کی بولی ثقافتی زبان کی شکل میں اختیار کی جانے لگی اور ایسے لفظوں اور ان کی شکلوں کا استعمال بتدریج کم ہوتا گیا، جو کسی خاص علاقے میں مستعمل تھے۔

ان مہموں کے کمان داروں میں خاندانی طبقے کے مسلمان تھے۔ اس طبقے کے مسلمان دو چار نسل پہلے عرب، ایران، ترکی اور افغانستان سے نقل مقام کر کے دلّی پہنچے تھے۔ ان خاندانوں نے اپنے آبا و اجداد کی زبان کو بہت عرصے تک محفوظ رکھا۔ جو مسلمان خاندان سیدھے دکن آئے، یہ لوگ مذہبی اعتبار سے عربی کی طرف اور ادبی لحاظ سے فارسی کو اہمیت دیتے تھے۔ دکن کے آفاقیوں اور دلّی سے آئے ہوئے معزز طبقے کے مسلم خاندانوں کے سامنے بڑی دشواری یہ تھی کہ چند بہت سی زبانیں جاننے والوں کو چھوڑ کر ایران کا باشندہ ترک سے کس زبان میں بات چیت کرے، عربی بولنے والا شخص افغان کو اپنے خیالات سے کیسے آگاہ کرائے؟ ان غیر ملکی مسلمانوں نے ثقافتی نقطۂ نظر سے فارسی کو قبول کر لیا۔ معزز طبقے کے لوگوں کے روبرو دوسرا سوال یہ تھا کہ عوامی لوگوں سے کس زبان میں بات چیت کریں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کھڑی بولی پر غور کیا گیا، جو قواعد کے لحاظ سے سہل تھی اور وسیع علاقے میں سمجھی جاتی تھی۔ علاقائی اثرات کی موجودگی میں بھی کھڑی بولی میں اس طرح کی خصوصیت تھی کہ راجستھان سے لے کر بہار کی آخری سرحد تک اسے سمجھ سکتے تھے۔ ہندی بولنے والے علاقے میں ادبی اور ثقافتی اعتبار سے راجستھانی کے بعد اودھی اہم زبان تھی۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد برج نے اودھی کی جگہ لے لی۔ برج کے بعد کھڑی بولی نے یہ مقام حاصل کر لیا ہے۔ نو وارد مسلمانوں نے کھڑی بولی کو اہم سمجھا تھا۔ عوام سے ربط پیدا کرنے کے لئے انھوں نے اسے اختیار کر لیا۔ معزز طبقے کے جو مسلمان ہندستانی ادب میں دلچسپی رکھتے تھے انھوں نے اودھی اور برج کا مطالعہ کیا۔

تب رس [illegible] کتاب میں امیر خسروؒ کا لکھا ہوا کھڑی بولی کا ایک دوہا درج کیا گیا ہے اسی طرح پورے کے دو دو مضمون کا دل چسپ بنانے کے لئے لکھے گئے ہیں۔

بہمنی بادشاہت کے قیام کے بعد عرب، ایران اور ترکی سے کئی خاندان راست دکن میں جا کر بسے اورنگ زیب کی فتح کے بعد بیرونی لوگوں کا راست دکن میں آنا بند ہو گیا تھا ان نو واردوں کے حق میں زبان کی دشواری بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ مقامی زبانیں۔ تلگو، مرہٹی اور کنڑی ان کے لئے بہت مشکل تھیں۔ پھر دلی سلطنت و الملک [illegible] شخص ایک برس دکن میں رہتا تھا، دو برس گجرات میں اور چھ مہینے بنگال میں۔ اسی طرح دکن کا آفاقی کبھی مرہٹی بولنے والے علاقے میں مامور ہوتا، کبھی تلگو زبان بولنے والے پردیش میں، کبھی کرناٹک میں۔ یہی وجوہ ہیں کہ آفاقی لوگوں نے بھی کھڑی بولی کو بول چال کے لئے اختیار کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ دکنی میں فارسی کے زیادہ تر اور عربی کے کم الفاظ رل مل گئے۔ کھڑی بولی بولتے وقت عوام نے بھی عربی و فارسی کے ثقیل اور بگڑے لفظوں کا استعمال ہی فخر سمجھا۔ محمد تغلق سے لے کر اورنگ زیب تک دکنی حکومتوں کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں دلی سے رہا لہٰذا کھڑی بولی جس طرح بدلتی گئی اس کا بہت کچھ اثر دکنی پر بھی پڑا، مگر اس کا ڈھانچا وہی رہا جو محمد تغلق کے زمانے میں تھا۔ پنجاب، راجستھان، اودھ اور بہار کے باشندے کھڑی بولی کا استعمال اپنے ڈھنگ سے کرتے تھے۔ وہی دکنی میں بھی یہ اثر موجود رہا۔ اس باب میں مسلمان مبلغین، اولیائے کرام اور اہل شریعت کا ذکر اہم اور ضروری ہے۔ دکن کے اصلی باشندوں میں مذہب کی اشاعت کرنا ان لوگوں کی غرض و غایت تھا۔ ان مبلغین کا خاص مقصد یہ تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں جو مسلمان اور نو مسلم دکن میں جا کر بس گئے تھے انھیں مذہبی نقطۂ نظر سے مرکزی خیالات کے دھارے سے الگ نہ ہونے دیا جائے۔ اسلام کے اولین بڑے مبلغ خواجہ بندہ نوازؒ اسی لئے (۹۰) برس کی عمر میں باطنی تحریک کی بنا پر دکن آئے تھے۔ خواجہ بندہ نوازؒ کے بعد گزشتہ چھ سو برس میں کئی دفعہ ہزاروں مریدوں کے ساتھ مسلمان اولیاؒ اور صوفیؒ یہاں آتے رہے اور گلبرگہ، بیجاپور، اورنگ آباد اور کئی شہروں کو مذہبی اشاعت کا مرکز بنا کر اپنا کام کرتے رہے۔ یہ صوفیا بزرگان دینؒ جن عوام لوگوں میں تبلیغ کرنے آئے تھے اس کے لئے کھڑی بولی ہی ذریعہ بن سکتی تھی۔ نتیجے کے طور کھڑی بولی کا استعمال ان بزرگوںؒ نے کیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس گزرنے پر ادب کے لئے دکنی کا استعمال شروع ہوا۔ اولیائے کرامؒ اور مذہبی کتابوں کے سبب دکنی میں تصوف و سلوک اور فقہ سے متعلق کئی عربی اصطلاحیں استعمال ہونے لگیں۔

(باقی آئندہ)

ملک اسمٰعیل حسن خاں

اصغر کی رجائی شاعری

بیسویں صدی کے اُردو غزل گو شعرا کی فہرست کافی طویل ہے، لیکن اگر آپ اس میں صاحب طرز اور منفرد غزل گو شعرا کو منتخب کرنا چاہیں تو پھر یہ فہرست بے حد مختصر ہو جائے گی، یہاں تک کہ آپ ان صاحب طرز شعرا کو دونوں ہاتھ کی انگلیوں پر شمار کرلیں گے۔ ان شعرا میں اقبال۔ فانی۔ اصغر۔ فراق اور یگانہ کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں جنھوں نے اُردو غزل کو نفس مضمون (مواد) کے علاوہ ایک خاص اسلوب بھی دیا ہے۔

اس صحبت میں جدید اُردو غزل کے ایک معروف و مقتدر شاعر کی شاعری کے ایک رخ کو اہل نظر کے سامنے پیش کرنا ہے، جس پر اب تک زمانے کی چشم پوشی کا نقاب پڑا ہوا تھا، لوگ آج اس کے اس خاص وصف پہ بہت کم توجہ دیتے اور غور کرتے ہیں اور اس کو محض ایک "صوفی شاعر" کی حیثیت سے جانتے ہیں، حالانکہ اس کا تصوف ایک نصب العین رکھتا ہے، وہ زندگی سے بیزار یا اس سے فرار پر تیار نہیں بلکہ اس کو ایک مطمح نظر کے تحت نباہنے کا حوصلہ رکھتا ہے، اس کا تصوف بے ثباتیٔ دنیا سے دل تنگ ہو کر گوشہ نشینی، ترک دنیا، اور بے رغبتی و رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ دنیا کی لذتوں کو محسوس کرکے حادثات زندگی سے آنکھیں ملانے اور پامردی سے ان کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتا اور دنیا کو ایک نظریے کی روشنی میں نباہنے کا راستہ دکھاتا ہے اس لحاظ سے اس کا تصوف اردو کی قدیم صوفیانہ شاعری سے مختلف ہے اور اس کا یہ انداز نظر اُردو کی صوفیانہ شاعری پر ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اصغر گونڈوی کو اب تک محض ایک قدیم روایتی نظریہ کا حامل صوفی شاعر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، انھوں نے جس شدت سے حقایق دنیا کو محسوس کیا ہے اور جس طرح اپنے کلام میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے، اقبال نے جس طرح تصوف کے قدیم تصور پر ضرب لگائی اور اس کو بالکل الٹ دیا، اسی طرح اصغر نے تصوف میں "فلسفۂ جمالیات" اور زندگی کے رجائی عناصر کو شامل کرکے غزل کی داستان میں وسعت اور تازگی پیدا کی۔ اور مجاز و حقیقت میں ایک ربط یا سمجھوتہ قایم کرنے کی کوشش کی ہے، مجنوں[1] صاحب نے ان کے متعلق

---

[1] اُردو میں اب تک اصغر پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جتنے مضامین لکھے گئے ہیں، ان میں صرف دو ایک کے علاوہ کوئی ان کے خیالات یا ان کے نقطۂ نظر کی روح یا گہرائی تک نہ پہنچ سکا، مجنوں گورکھپوری نے ان پر ایک مختصر سا مضمون لکھا ہے لیکن اس میں انھوں نے ان کی شاعری کی جن خوبیوں کی طرف اشارے کیے ہیں، وہ بڑے قابل غور اور خیال انگیز ہیں۔ (اسمٰعیل)

یہ بڑی خیال [illegible] بات کہی ہے کہ —

"مجاز میں حقیقت دیکھنا بہت پرانی رسم ہے، مگر حقیقت میں مجاز کی رنگینیاں قائم رکھنا نئی بات ہے۔ اصغرؔ نے شاعری میں یہی کیا ہے۔ وہ ہماری مادی اور جسمانی زندگی کو بے اصل و بود نہیں بناتے اور نہ وہ حقائق اور رموز کی دنیا کو ہمارے عالم احساس و ادراک سے باہر کوئی دنیا تسلیم کرتے ہیں۔ وہ نظر، ناظر اور منظور تینوں کی وحدت ———— کا پیغام دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اس اعتبار سے

اگر کہیں ان کا کوئی ہم خیال و ہم نوا ملتا ہے تو مغربی ممالک میں وہ ہم کو کبھی ہیگل جیسے حکماء اور انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے

مائل بہ تصوف شعراء کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کی شاعری نہ مجاز کی شاعری ہے نہ حقیقت کی بلکہ دونوں کو ایک کر کے پیش کرتی ہے۔"

اُن کا تصوف دنیا سے ہار کر منھ موڑنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ مراحل دنیا سے مقابلہ کرنے اور کارزار حیات میں نبرد آزمائی کی تعلیم دیتا ہے، "تگاپوئے دمادم" اور "ذوقِ عمل" ہی سے ان کے نزدیک دنیا کی رونق کا بازار گرم ہے، جد و جہد میں زندگی کا راز مضمر ہے، کش مکش زندگی کے لئے لازمی ہے، ورنہ یہ کارخانۂ عالم قائم نہیں رہ سکتا، ہر شخص اپنے مقصد کے حصول کا جویا ہے اور اس کے لئے وہ سعی و عمل سے کام لیتا ہے، تمام دنیا جس مرکز پر گھومتی ہے وہ "عمل و محنت" کا مرکز ہے، قرآن میں ایک جگہ مرقوم ہے کہ خَلَقَ الْاِنسَانَ فِی کَبَدٍ (ہم نے انسان کو محنت کے لئے پیدا کیا ہے) انسان کی زندگی اور دنیا کا نظام محض اسی ایک رمز کی تفسیر ہے، بہ قول اصغرؔ ؎

وہ شورشیں نظامِ جہاں جس کے دم سے ہے ۔۔۔ جب مختصر کیا اُنھیں انساں بنا دیا

اصغرؔ جدید اُردو غزل میں وہ واحد شاعر ہیں، جن کا کلام از اول تا آخر رجائیت سے معمور ہے، اُنھوں نے اُردو شاعری کو تازہ دلی، شگفتگی، رجائیت اور ترانہ بار اور ترنم ریز فضا عطا کی اور اردو شاعری کی محرومی، ناکامی، اداسی، کو اپنے رجائی نغموں سے خوشگوار بنا دیا، ان کے معاصرین میں یہ کیفیت اس انداز اور اس زاویۂ فکر سے کسی کے ہاں نظر نہیں آتی۔ بے دلی، مایوسی اور قنوطیت اصغرؔ کے مسلک میں گناہ ہے، وہ زندگی کی ہلچل اور حادثاتِ دہر سے کسی طرح نہ گھبراتے ہیں نہ ان سے کنارہ کشی پر آمادہ ہو سکتے ہیں، ان کا ایک شعر ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے ۔۔۔ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

انھوں نے اردو غزل کو جو توانائی، رجائیت اور نغمگی دی ہے وہ ان کا بہت بڑی دین ہے۔

ان کے یہاں ایک مستقل و مکمل نظریۂ جمالیات ملتا ہے، لیکن جمالیات کا یہ نظریہ قدیم صوفی شعروں کے "نظریۂ جمالیات" سے

تلخ ہے اصغر کو زندگی بھی اتنی ہی روشن اور پرنور معلوم ہوتی ہے جتنی کہ وہ خدا کی صفات میں روشنی اور نور دیکھتے ہیں یا ندگی کی صعوبتیں، پریشانیاں، کلفتیں بھی ان کی نظر میں حسین بن جاتی ہیں اکروچے CTOCE کے بہ قول ن اصل میں دیکھنے والے کے وجدان میں ہوتا ہے نہ کہ حسین شے میں اگر نظر "احساسِ حُسن" رکھتی ہے تو پھر وہ ہر گوشہ میں بی بصیرت کے لحاظ سے حُسن تلاش کر لے گی، اور اگر وہ "احساسِ حُسن" سے عاری ہے تو تاج محل جیسا پیکرِ حُسن بھی اس کو بین وجمیل نظر نہ آئے گا۔ اصغر نے شاعری کو زندگی کا جو عرفان دیا اور زندگی کو رجائی شاعری کا جو نعمت عطا کی وہ بیاتِ اُردو میں ان کا خاص کارنامہ ہے۔ انھوں نے اُردو غزل کو جو نظم وضبط، ٹھہراؤ، صاف ستھرا پن، نایستگی اور صحت و نفاست پسندی عطا کی وہ ان کی شخصیت کا خاص وصف تھا گویا ان کی شخصیت ان کی ناعری پر عکس بن ہے اور ان کی شاعری ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔

اصغر کو "حُسن" اور "حرکت" سے بے انتہا عشق ہے اور یہی جذبہ ان کی شاعری کا سنگِ بنیاد ہے۔ ان کا پہلا شعر ہے ؎

ذرّوں کا رقص مستئِ صہبائے عشق ہے   عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے

ان کی شعریت میں جمود و سکوت گناہ بلکہ کفر کے مترادف ہے، اور اسی وجہ سے آہ و زاری اور نالہ و شیون جو جمود اور بے حرکت "زندگی کا لازمہ یا اقبال کے الفاظ میں "عرقِ انفعال" ہے ان کے یہاں نا پید ہے، اصغر کے یہاں ہر جگہ امید و حوصلہ کے چراغ روشن ہیں، وہ خود فرماتے ہیں ؎

خروشِ آرزو ہو نغمۂ خاموشِ الفت بن   یہ کیا اک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں برسوں

غزل میں درد رنگیں تو نے اصغر بھر دیا ایسا   کہ اس میدان میں روتے رہیں گے نوحہ خواں برسوں

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر   یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

شعر میں رنگینئ جوشِ تخیل چاہیے   مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

بیں وہ غزل میں صرف "رنگینئ جوشِ تخیل" ہی کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ ؎

اصغر غزل میں چاہیے وہ موجِ زندگی   جو حُسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

اصغر کو اگر "شاعرِ حیات" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، اُردو غزل میں اقبال کے علاوہ اصغر اور صرف اصغر ہی وہ

واحد شاعر ہیں جنہوں نے شاعری کو زندگی کا عرفان عطا کیا، اور زندگی سے دہارنے اور اس میں ابھرنے کا
شعور و ولولہ دیا۔ مجنوں صاحب کے بقول "وہ زندگی کے دردناک سے دردناک حقائق کی طرف بڑھتے ہوئے لہجے میں اشارہ کرتے ہیں اور ہم کو زندگی سے برداشتہ خاطر یا بیزار نہیں ہونے دیتے ہستی کے آغاز و انجام اور اس کی ناگزیر رفتار کا درک پیدا کر کے دلوں میں زندگی کی ایک نئی نشاط آفریں کرتے ہیں اور اس سے ہم اپنی روح میں ایک بالیدگی محسوس کرنے لگتے ہیں"۔ ان کے یہاں بلند ہمتی، عالی کشاکشِ حیات میں زندگی گذارنے کا درس ملتا ہے۔ وہ "ضمیرِ اہلِ مناجات کے تعطل" میں "خروشِ جنوں" پیدا کرنا چاہتے ہیں، زندگی ان کے یہاں اقبال کی طرح ہر وقت رواں، دواں اور جواں ہے ؎

شمیمِ گلشن، نسیمِ صحرا، شعاعِ خورشید و موجِ دریا
ہر ایک گرمِ سفر ہے ان میں مرا کوئی ہم سفر نہ

وہ عمل اور سخت کوشی کے موید ہیں، اور ہر انقلاب کو حیاتِ نو کا پیغام سمجھتے ہیں ؎

کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں
اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

مئے خانۂ ازل میں جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

وہ مجبوریٔ حیات سے مایوس نہیں، بلکہ زنداں میں بھی روزن بنا سکتے ہیں، اور قفس میں "موجِ خونِ گلستاں" تعمیر کر سکتے ہیں ؎

مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے

اقبال نے غالب کے اس شعر ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کے جواب میں یہ کہا تھا کہ ؎ خوش پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

اصغر بھی الگ کے مدہوش بہ دوش یہ فرماتے ہیں ؎

اڑا لے گی مجھے عافیتِ کنجِ چمن جوشِ پرواز کہاں جب کوئی صیاد نہ ہو

زندگی کا ہمہمہ اور رونق مقصد کے حصول کی تگ و دو پر قایم ہے، اگر آرزو و حسرت نکل جائے تو پھر دنیا کے تمام مرحلے اور مسایل سرد پڑ جائیں، فراق میں جو لذت ہے وہ وصال میں کہاں؟ اقبال نے اپنی نظم "ذوق و شوق" میں کہا ہے ؎

گرمیٔ آرزو فراق، شورشِ ہائے و ہو فراق موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق

اصغر بھی اس نکتے سے خوب واقف ہیں ؎

جستجو ہے زندگی، ذوقِ طلب ہے زندگی زندگی کا راز لیکن دوریٔ منزل میں ہے

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے جو عمر رایگاں ہے وہی رایگاں نہیں

انسان ان کی نظر میں خود اپنی قسمت کا خالق ہے، اگر "ذوقِ عمل" میں ذرا کمی ہو تو پھر آلام و مصائب میں گرفتار ہونے میں دیر نہیں لگتی، زندگی "ذوقِ عمل" سے عبارت ہے ؎

یہاں کوتاہیٔ "ذوقِ عمل" ہے خود گرفتاری جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

غم، سرشتِ کائنات کا جزو ہے جس سے کسی کو نجات یا مفر نہیں، غم، غم ہی کا نتیجہ نہیں، غم خوشی کا بھی نتیجہ ہے، ہر تبسم آنسو کے افق سے طلوع ہوتا ہے، تکلم فریاد کی ایک لے ہے۔ Keats کہتا ہے :-

where but to think is to be full of sorrow

لیکن کش مکشِ حیات میں انسان کو اس سے گذرنا ہی پڑتا ہے، اور وہ ایسا اضطراب پیدا کرتا ہے جس میں اسے سکون ملے، ورنہ اگر غم ہی غم ہو تو زندگی دوبھر ہو جائے، کاہشِ حیات کے غم کی نوعیت دوسری ہے، جو زندگی کی لے کو تیز کرتا اور ان کے لئے مہمیز کا کام دیتا ہے، شیلی Shelley نے ایک جگہ لکھا ہے :-

Our sweetest songs are these that tell of saddest thought

اصغر کا نظریہ بھی اس بارے میں یہی ہے، وہ فرماتے ہیں ؎

اضطرابِ غم سے ہے نشو و نمائے زندگی ہر نفس میں ایک تازہ درد پیدا کیجئے

لیکن اس کے باوصف وہ کہیں سے قنوطی نہیں ہیں، جذبہ قنوطیت کی طرف لے جاتا ہے، ذہن رجائیت کی طرف،

یہ [illegible] ہی زندگی کی لے کو تیز کر دیتی ہے، اور وہ "آلام روزگار" کو "غم جاناں" سمجھ کر برداشت کر لیتے ہیں ؎

آلام روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

لیکن بڑے زہر پینے اور ہضم کرنے کے بعد یہ آبِ حیات ملتا ہے، اصغر کہتے ہیں ؎

اس جہانِ جبر میں آرام کب راحت کہاں — لطف جب ہے اپنی دنیا آپ پیدا کیجئے

آغوش میں ساحل کے کیا لطفِ سکوں اس کو — یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

یہاں تو عمر گذرتی ہے اسی موج و تلاطم میں — وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے

غرضکہ وہ کسی جگہ زندگی سے شکست خوردہ، یا مایوس نظر نہیں آتے، وہ میدان حیات میں اترنے اور اس سے نباہنے کا راستہ بتاتے ہیں، وہ سکوت وجمود کے مخالف اور عمل وحرکت کے موید ہیں، کیونکہ ان کی نظر میں انسان کی بہتری کا راز "مثبت عملی طاقتوں" میں پنہاں ہے، دنیا جس صناع کی صنعت کا شاہکار ہے وہ عمل وحرکت ہی کی بنیاد پر قایم ہوئی ہے، اس کا جمال انسان کو "مادیت وروحانیت" دونوں میں عمل وہمت پر اکساتا اور اپنے قریب بلاتا ہے، بس یہی خیال اصغر کو ایک نصب العین دے کر "پیامِ آسودگی" بن جاتا ہے، ان کے ذیل کے نغموں میں بھی یہی "رجائی لے" بکھری ہوئی ہے ؎

شعاعِ مہر خود بے تاب ہے جذبِ محبت سے — حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں — تم چیر کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

برگِ گل کے دامن پر رنگ بن کے جمتا کیا — اس فضائے گلشن میں موجۂ صبا ہو جا

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو — پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

یہ دین ہے وہ دنیا، یہ کعبہ وہ بت خانہ — اک اور قدم بڑھ کر اے ہمتِ مردانہ

مرنا تو ہے ابتدا کی اک بات — جینا ہے کمال منتہی کا

میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی — تو کمالِ زندگی کہتا ہے مر جانے میں ہے

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے نہ جل کر خاک ہونا ہے — یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

ہیجان واضطراب ہے، امیدِ وصل ہے — رازِ حیات شورشِ بیجائے عشق ہے

بندشوں سے اور بھی ذوقِ رہائی بڑھ گیا — اب قفس بھی ہم اسیروں کو پرِ پرواز ہے

میری محرومی کے اندر سے یہ دی اس نے صدا — قرب کی راہوں میں میری راہ اک دوری بھی ہے

میر یٰسین علی خاں

نذرِ زورؔ

تیرے ایوان میں مصروفِ فغاں ہیں کچھ لوگ — ان میں کچھ پیر ہیں، بچے ہیں، جواں ہیں کچھ لوگ
میرے اس دیدۂ غم ناک نے یہ بھی دیکھا — قصر و ایواں سے پرے اشک فشاں ہیں کچھ لوگ
ڈھونڈھنے والے تری راہ میں قدموں کے نشاں — اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ زباں ہیں کچھ لوگ
ساکنِ دیر بھی ہیں، اہلِ حرم بھی ان میں — مہرِ میدانِ عمل مرتبہ داں ہیں کچھ لوگ
صفِ ماتم میں شریکِ غمِ جاناں اے دوست — اہلِ دکھن ہی نہیں، اہلِ جہاں ہیں کچھ لوگ
دوست تو دوست ہیں، دشمن جسے رؤیں برسوں — اس زمانے میں بھلا ایسے کہاں ہیں کچھ لوگ
پئے تحقیقِ نوادر، پئے تالیفِ کتب — تیرے ایوان کی جانب نگراں ہیں کچھ لوگ
وہ جو کہتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں دکھنی کی بساط — کتنے بے درد، کم اندیش یہاں ہیں کچھ لوگ
حال کا غم ہے انھیں اور نہ فردا کا خیال — دورِ ماضی کی طرف کیوں نگراں ہیں کچھ لوگ
ہم کو یہ فکر کہ مل جل کے کریں فکرِ بہار — اور ادھر موجدِ اسبابِ خزاں ہیں کچھ لوگ
سچ تو یہ ہے کہ ولیؔ، وجہیؔ و معنیؔ تا زورؔ — ابھی تاریخ کے پردوں پہ عیاں ہیں کچھ لوگ
زورؔ کا شعر انھیں پڑھ کے سنا دے یٰسیںؔ — تجھ سے پھر طالبِ یک شرح و بیاں ہیں کچھ لوگ

"بانیِ فکرِ جدید آذرِ طرزِ فردا
ان ہی گمنام غریبوں میں نہاں ہیں کچھ لوگ"

صلاح الدین نیّر

زینتِ شہرِ وفا، کوئے بتاں ہیں کچھ لوگ
نقش دھندلے ہی سہی سجدہ کناں ہیں کچھ لوگ

صاف گو، پاک نظر، نرم زباں ہیں کچھ لوگ
طبعِ نازک پہ مگر پھر بھی گراں ہیں کچھ لوگ

شمعِ احساس کی لَو اور ذرا تیز کرو
دور رہ کر بھی قریبِ رگِ جاں ہیں کچھ لوگ

آپ کی میری وفاؤں کا یہاں ذکر ہی کیا
مٹ گئے ایسے کہ قدموں کے نشاں ہیں کچھ لوگ

دور تک کوئی تسلی نہ کسی کا دامن
کس توقع پہ بھلا اشک فشاں ہیں کچھ لوگ

اپنی مرضی سے نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں
آپ کی بزم میں ایسے بھی یہاں ہیں کچھ لوگ

کیسا ہے وقت کا یہ فیصلہ سوچو تو سہی
ہیں تو ساحل پہ مگر تشنہ لباں ہیں کچھ لوگ

کس کو اندازہ ہے مجروح دلوں کا یارو!
بزمِ عشرت میں بھی مائل بہ فغاں ہیں کچھ لوگ

جیتے جی نام نہ لوں گا کبھی ان کا نیّر
خونِ تازہ کی طرح دل میں رواں ہیں کچھ لوگ

انوار ظہوری

دل کا آئینہ مکدّر تھا جلا سے پہلے
تجھ کو پوجا ہے صنم یادِ خدا سے پہلے

مرحمت کے ہیں طلبگار سدا سے لیکن
اشک آنکھوں میں نہ تھے جرم و خطا سے پہلے

یہ جفا پیشہ جو پی جاتے ہیں رگ رگ سے لہو
پیار کی آنکھ سے دیتے ہیں دلاسے پہلے

کس کو منظور ہوا اس حال میں اچھا ہونا
کچھ وہ آنکھوں سے پلاتے ہیں دوا سے پہلے

دی انھیں میری محبت نے یہ تعلیم ستم
تھے نہ آگاہ وہ تہذیب جفا سے پہلے

اب تو ہر شخص پہ ہے منزلِ الفت آساں
راہ سنسان تھی کچھ آبلہ پا سے پہلے

اب وہ خوش ہیں مری نظروں سے سہارا پاکر
ربط ان سے نہ بڑھا لغزشِ پا سے پہلے

اب تو ہر شعر پہ لیتے ہیں بلائیں میری
یہ حسیں لوگ جو رہتے تھے خفا سے پہلے

نام لیتا ہے ظہوری یہ تمہارا لیکن ۔۔!
حمد پڑھتا ہے لب نغمہ سرا سے پہلے

حامد بھکاوی

عزم منصور بھی ہے حوصلۂ دار بھی ہے
حسرتِ شوق بتا جراَتِ گفتار بھی ہے

یہ مرا عجزِ وفا آپ اسے کچھ بھی کہیں
میرے پندار کی گرتی ہوئی دیوار بھی ہے

دشتِ غربت ہیں جسے چھوڑ چکے تھے ہم لوگ
اب وہی دھوپ پسِ سایۂ دیوار بھی ہے

سہل انکار نہیں عشقِ جفا کش کہ ابھی
راہ میں مرحلۂ طور بھی ہے دار بھی ہے

داغِ حسرت ہے نہ اب زخمِ تمنا حامد
کتنا ویران دلِ غم دیدہ کا گلزار بھی ہے

حامد کمال رام پوری

کس طرح اس سے دل کے تاب آئے
جو قیامت کے ہمرکاب آئے
زندگی رہ گئی اندھیرے میں
آفتاب آئے ماہتاب آئے
بارہا رات ہو گئی دن میں
جاگتے میں نظر وہ خواب آئے
عقدہ ہائے حیات کھل نہ سکے
ایں جناب آئے آں جناب آئے
دلِ گُم گشتہ یاد آتا ہے
سامنے جب کوئی گلاب آئے
میکدے سے قضا نکل جائے
زہر آب آئے یا شراب آئے
غازۂ عونِ دل بھی ہو حامد
رُخِ ہستی پہ جب شباب آئے

مظفر حنفی ہسوی

تکرار بے مزا ہے تری اے پری جمال
لہجہ بدل۔ لبوں کا ذرا زاویہ سنبھال
یہ سوچ کر سوال نہ ان سے کیا کوئی
پورا کریں سوال نہ پورا کریں سوال
دھوکے غریب مُرغِ چمن کس طرح نہ کھائے
پھولوں میں باغبان نے پھیلا رکھے ہیں جال
ہر سعیٔ کامیاب پہ بڑھتی رہی ہوس
کچھ اس طرح کہ جیسے جئیں گے ہزار سال
کم ظرف ہے تو اپنی حقیقت پہ جائے گا
ذرّے کو آفتاب کی لازم نہیں مثال
ان حرکتوں سے بات بگڑ جائے گی تری
باتوں کو چھوڑ اور کوئی راستہ نکال
کیا سوچ کر قیام کریں ہم غریب لوگ
تیری گلی میں کون بھلا ہو گیا نہال!
اس وقت ٹل گئی تو نہ آئے گی یہ گھڑی
مجھ سے نظر بچا کے مری بات کو نہ ٹال
پالا نہیں پڑا کسی آشفتہ حال سے
بن بن کے پوچھتے ہیں تبھی وہ ہمارا حال
فطرت لچک سکی نہ مظفر کی دوستو
اس کو نہ دھن کی چوٹ نہ تن کا کوئی خیال

ممتاز راشد اجمیری

آرزو کا نظارہ مہیب ہے

ہاتھوں میں زندگی کے غموں کی صلیب ہے

ہوئے نظر سے ستاروں کے سنگ میل

شاید نگارِ صبح کی منزل قریب ہے

ے جسم موجِ صبا ڈھونڈنے چلی

وہ یارِ خوش جمال گلوں کا نصیب ہے

نہ میں نہیں ترے رخسار کی چمک

اب کیا بتائیں کون ہمارا رقیب ہے

بِ دلبری مہوشاں سہی

پھر بھی وہ فکرِ محنت و زر کا نقیب ہے

جمیل قریشی

سر کو جھکائے شاخِ ثمردار کی طرح
انکار کر رہے ہیں وہ اقرار کی طرح

اک بات بھی جب اہلِ جہاں نے نہیں سنی
ہم بھی خموش ہو گئے دیوار کی طرح

تیری گداز باہوں کو بھولے نہ تھے کہ پھر
طوقِ رسن گلو کو ملا "ہار" کی طرح

ہم پنجۂ الم میں رہے قید مدتوں
مشتِ بخیل میں کسی "دینار" کی طرح

وہ لوگ تیرے شہر میں نیلام ہو گئے
آئے تھے شان سے جو خریدار کی طرح

شعر و سخن کے تیرہ اُفق پر جمیل ہم
ظاہر ہوئے ہیں مطلعِ انوار کی طرح

باقر منظور

جہانِ درد کی راس آگئی فضا مجھ کو
سمجھ رہا ہے زمانہ غم آشنا مجھ کو
نگاہِ دوست کا کیا آسرا ملا مجھ کو
فریبِ حُسن تھا اک جس نے کھو دیا مجھ کو
جو میرے ساتھ کبھی دو قدم بھی چل نہ سکے
وہ کیا بتائیں گے منزل کا راستہ مجھ کو
میں شاہکارِ محبت سمجھ رہا ہوں تجھے
خدا گواہ نہیں اس میں شک ذرا مجھ کو
مزاجدارِ محبت ہوں فطرتاً اے دوست
طریقِ عشق سکھائے گا کوئی کیا مجھ کو
شعورِ فکر نے اُلٹی ہے بیخودی کی نقاب
دکھا رہا ہے مرا حال آئینہ مجھ کو
سکوں پسند فضا میں نہیں ہے لطفِ حیات
سُنائی دیتی ہے یہ وقت کی صدا مجھ کو
خدا کا شکر ہے لذت شناسِ درد ہوں میں
زہے نصیب ملا دردِ جانفزا مجھ کو
خفا ہیں مجھ سے وہ حُسنِ طلب پہ اے باقرؔ
نہیں ہے جن کے تغافل سے بھی گلہ مجھ کو

جلو میں حُسنِ فطرت لے کے جب سورج نکلتا ہے
یہ منظر دیکھ کر تاریکیوں کا دل دہلتا ہے
گذر گاہِ محبت میں چراغِ حُسن جلتا ہے
اسی کی روشنی میں کاروانِ عشق چلتا ہے
خوشی سے میری آنکھوں کے چھلک جاتے ہیں پیمانے
کوئی راہِ وفا میں گرتے گرتے جب سنبھلتا ہے
نہ ہو اظہارِ دردِ دل اگر ہنگامۂ غم میں
محبت کا یہ جوہر حُسن کے سانچے میں ڈھلتا ہے
خدا رکھے مرے جذبِ محبت کا اثر ہوگا
تمہارا دل بھی تو اب شمع کی صورت پگھلتا ہے
گذر جاتا ہے جب انساں مقامِ آدمیت سے
شعورِ آدمیت بھی کفِ افسوس ملتا ہے
بدلنے ہی کو ہے ذوقِ محبت کی روش باقرؔ
نہ جانے ذہنِ انساں کونسی کروٹ بدلتا ہے

جاوید انصاری (برہان پوری)

طف ہے اس میں سیرِ عالم کا
دل نمونہ ہے ساغرِ جم کا

ہے بہارِ چمن کا پس منظر
عارضِ گل پہ اشک شبنم کا

سکوں آشنا ہو دل ہی نہیں
دل ہے نام اضطرابِ پیہم کا

امِ ہجر اں، شریکِ غم ہے مری
ہے سیاہی لباس ماتم کا

کو کہتے ہیں لوگ روزِ ازل
"یومِ تاسیس" ہے مرے غم کا

کے دم سے یہ دل ہے رشکِ چمن
ہے خیال اس گلِ مجسم کا

میں ہوں جاوید لوحِ گیتی پر
شاہکار اک مصورِ غم کا

صابر شاہ آبادی

اس دورِ ہوس میں کوئی گم نام نہیں ہے
اظہارِ جنوں عام، جنوں عام نہیں ہے

حاصل ہے جو مجھ کو تری مخصوص نظر سے
اس عالمِ راحت کا کوئی نام نہیں ہے

تیرا بھی تو کچھ فرض ہے اے شعلۂ خاموش!
پروانہ اگر واقفِ انجام نہیں ہے

جو قامتِ زیبا پہ تجھے زیب دے اے دوست
اتنا طرب انگیز کوئی نام نہیں ہے

میں جام کو پیراہنِ صہبا بھی کہوں گا
ہر چند یہ تشبیہ ابھی عام نہیں ہے

منزل کا یہاں ذکرِ مسلسل بھی ہوس ہے
یہ راہِ وفا ہے، روشِ عام نہیں ہے!

ہے میری گئی گذری ہوئی جاں کا سہارا
اے دوست، ترا نام فقط نام نہیں ہے!

زنداں میں مجھے کوئی سکوں ہو تو ہو لیکن
گلشن کی طرح دغدغۂ دام نہیں ہے

صابر کے لئے تیرا سلامِ پس پردہ
سب کچھ ہے مگر شوق کا انعام نہیں ہے!

جبار جمیل

دریوزہ گری

مولسریوں کے درختوں کی گھنی چھاؤں میں
آج پھر میں تری چاپوں کی صدا سنتا ہوں

٥

کاروبارِ غمِ دنیا نے اجازت دی ہے
چند لمحے تری قربت میں بتانے کے لئے
جن کی آغوش میں خوابیدہ ہیں افسانے کئی
ہاں انھیں یادوں کی قندیل جلانے کے لئے

٥

تجھ سے ملنے کا جو احساس ہے کومل کومل
اسی احساس کی خوشبو سے معطر ہے دماغ
آج پھریا ہوں کی پہنائی بھی ہے مضطر سی
آج پھر جل اٹھے نادیدہ نگاہوں کے چراغ
گیت بے چین ہیں ہونٹوں پہ مچلنے کے لئے
نطق بے تاب ہے جذبات اُگلنے کے لئے
آ بھی جا دیر نہ کر وقت بہت کم ہے ندیم!!

٥

آ بھی جا دیر نہ کر وقت بہت کم ہے ند
کہیں ایسا نہ ہو امریکا کوئی پھر ابھ
اور ہو جائے بھسم پھر کوئی ہیرو
سرحدوں سے کوئی راون بھی ابھر سکتا
پھر تمناؤں کا شیرازہ بکھر سکتا ـ
آج ہر چیز ہے ممکن یہ حقیقت ہے:

٥

ہائے دنیا کا چلن! وائے زمانے کا طریق
آج ظلمات کے دشمن ہیں اہرمن کے رف
آج گہوارۂ راحت کی سہانی دھو
ہر شہریار کو ہے خواہشِ دریوزہ گ
آج پھر میں تری چاپوں کی صدا سنتا ہ
چہ علاج ہوس و حرص، چہ درماں طلبی:
آ بھی جا دیر نہ کر وقت بہت کم ہے ند
مولسریوں کے درختوں کی گھنی چھاؤں:

٥

اختر فاروقی

نقش برآب

خدا کے لئے تم تو ایسی باتیں نہ کرو۔ تمہاری تحریر میری جان لینے کے لئے بہت ہے۔ تمہاری ایک ایک سطر کے ساتھ ں سانسوں میں تلاطم پیدا ہو جاتا ہے اور مجھے اپنی زندگی چند لمحات کی مہمان نظر آتی ہے۔ خدا کی قسم میں یہ غم برداشت سکوں گی۔ میں غم کی سنگلاخ چٹانوں کو اپنے سینے پر رکھ چکی ہوں۔ دکھ اور آلام کے اتنے طوفان میری زندگی میں ، ہیں کہ میں بڑے سے بڑا غم برداشت کرنے کی عادی ہو گئی ہوں۔ اور غم جیسے میری زندگی کا دوسرا نام ہو گیا ہے ، تاریک و سیاہ زندگی کی پر خار راہوں میں تمہارا سہارا ایک دیئے کی روشنی کے مانند میرا ضامن ہے۔ میری اس بات پہ ن کرو کہ میں یہ غم سہہ نہ سکوں گی۔ کیا تم میری زندگی کا آخری باب بن کر میری حیات کی کتاب کو بند کرنا چاہتی ہو! کے لئے ایسا غضب نہ کرو۔ میں تم سے منت کرتی ہوں۔ اپنی روشنی کی بھیک مانگتی ہوں۔ تم تو ایسی بے وفائی نہ کرو۔ زندگی کی عزیز ترین امانتوں میں سے تم ایک ہو۔ پھول کی مانند شگفتہ اور چاندنی کی سی پاکیزگی رکھنے والی تمہاری ت کبھی بھی ایک لمحہ، کسی پل میرے دل و دماغ سے محو نہیں ہوتی۔ سچ مانو میں تو یوں سمجھتی ہوں جیسے میری بوجھل اور ہوئی زندگی کو تمہارے سہارے کی وجہ سے عزم حاصل ہوا ہے اور میں جوں توں کر کے اسے آگے بڑھانے کے قابل ی ہوں۔ تمہاری جذبات میں ڈوبی ہوئی تحریر کو میں ٹک ٹک دیکھتی اور سوچتی کہ ہائے خدا اس پھول جیسی نازک اور ن جیسی مضبوط عزم والی فرحت کو کیا ہو گیا ہے۔ بے اختیار میرے آنسو نکل آتے۔ زندگی میں یوں تو کئی بار آنکھیں ہیں مگر اس وقت میں نے جو کرب اور تکلیف محسوس کی اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتیں۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری اتی تحریر میرے دکھوں اور غموں کو کریدنے کا باعث ہوئی ہے۔ میں گھنٹوں روتی رہی۔ تمہارا تصور میرے ذہن میں ا اور سسکیاں دیر تک دم نہ توڑ تیں۔ ہائے کس قدر بے کسی اور بے بسی تھی کہ آہیں سننے والا بھی کوئی نہ تھا۔ کوئی تو ا "بس کرو آنسو نہ بہاؤ۔ کب تک یوں غم کرتی رہو گی"۔ کاش تم ہی میرے پاس ہوتیں۔ کم از کم میں تمہیں لر رو لیتی اور غم کا بار ہلکا ہو جاتا۔

میرا تو یہ ایمان ہے کہ ہم بہت جذباتی ہوتے ہیں اور ہماری جذباتیت ہی وہ وہ کام ہم سے کروا لیتی ہے جو ں زندگی میں سنگلاخ چٹانوں کی طرح آڑے آ جاتے ہیں اور پھر تاریکی اور سیاہی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ روشنی کی ایک کرن کو ترس ترس جانا پڑتا ہے۔ سلیمہ کے واقعات ہی کو لو نا۔ جیشرار کی اکلوتی لڑکی کالج میں کیا شان تھی۔ ن کالج میں رجسٹرار ہو وہیں اس کی شان نہ ہوتی تو پھر کہاں ہوتی؟ مگر سلیمہ نے جو کیا وہ کسی کے

وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔۔۔ کالج کے راجہ کو رنگ دار اور بھڑکیلے کپڑوں میں دیکھ اور
اس کی ایسی ہی رنگین حرکتوں پر اس نے انجام اور نتیجہ کی پروا کیے بغیر اس سے راہ و رسم بڑھالی۔ کیا تم اس بات پر
یقین کرلوگی کہ سلیمہ محض اس لئے راجہ سے وابستہ ہوگئی کہ وہ خوب سج دھج کے رہتا تھا!؟۔۔۔ مگر یہ سچ ہے۔۔۔ اس کی
جوانی کی چھاؤں تلے کتنے زہریلے ناگ بیٹھے ہوئے تھے، اس کا اندازہ سلیمہ نہ کرسکی۔ وہ صرف پیار کی چھاؤں میں
بسیرا کرنا چاہتی تھی۔۔۔ راجہ صاحب کی طرح ڈس کر الگ ہوگیا۔۔۔ اور جب رجسٹرار صاحب کو پتہ چلا کہ ان کی عزت،
ان کا وقار، ان کی آبرو، ان کی چہیتی سلیمہ بہت سستے داموں میں جال میں پھنس گئی تو وہ دور وز بھی تو جی نہ سکے۔
بہت زیادہ غیرت والے تھے نا۔۔۔!؟ سلیمہ اور راجہ کی حقیقت نے انھیں دو ہی روز میں بے جان کر دیا۔۔۔ وہ
دنیا والوں کی باتیں بھی تو جی بھر کے دہ سن سکے!۔۔۔ میں کہتی ہوں فرحت اپنی ایک سلیمہ ہی کیا، ایسی کتنی بہنیں ہوں گی جو
جذبات کے دھارے میں نہ صرف اپنی زندگی کی نیا ڈبو بیٹھیں بلکہ انھوں نے کئی خاندانوں کو نیست و نابود کر کے
رکھ دیا۔ ہماری یہ تنگ نظری و ناعاقبت اندیشی ہمیں برسوں سے مجبور کئے ہوئے ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ اگر
یہی رفتار رہی تو مریم و سیتا کی تقدیس کی روایت بھی ہم سے جاتی رہے گی۔

تمہاری تحریر نے میرے دبے ہوئے جذبات اور غموں کے راکھ کے ڈھیر میں سے چنگاریاں نکالی ہیں۔
میں سلیمہ کا کیوں ذکر کروں۔ میں تمہیں خود اپنی بات بتانے جا رہی ہوں۔ میں بھی ان کم نصیبوں میں سے ایک ہوں جو
جذبات کی سطح سے اوپر نہ آسکے۔ تمہارے بعد میں نے اپنی زندگی میں صرف اپنی چہیتی ماں اور انور سے پیار کیا۔
ماں سے مجھے بے حد پیار تھا۔ میں ان کی ایک ایک بات پر اپنی جان تک نچھاور کرنے کو تیار رہتی۔ زندگی کا یہ عزم
اور استقلال، جو آج مجھے سہارا دیئے ہوئے ہے انھیں کی دین ہے۔ مگر میں کیسے بتاؤں فرحت۔ میں اپنی چہیتی ماں کی
دشمن ثابت ہوئی اور انھیں میرے ہی کارن اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ غم کی یہ چٹان جب گری تو میں سنبھل نہ سکی۔
میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ رسوائی اور بدنامی کا یہ داغ میرے ماتھے پر لگے گا۔ جب بھی میرے ذہن میں یہ بات
آتی ہے تو میں لرز اٹھتی ہوں۔ میرے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا ہے اور دل بیٹھتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔۔۔ انور،
جسے میں نے چاہا، اور ماں، جس نے انور کی وجہ سے جان دے دی۔ انھوں نے میرا بھی تو خیال نہیں کیا کہ میں
اس گہرے تاریک سمندر میں اکیلی ہی غلطاں و پیچاں رہ جاؤں گی۔ دیکھو نا وہ اپنی اکلوتی اور لاڈلی کو چھوڑ کر
چلی گئیں!!۔۔۔ انور میری زندگی میں بالکل ایک طوفان کی طرح داخل ہوا، اور اس کے بعد ایسے ایسے طوفان
آئے کہ اب مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ ان طوفانوں کی نذر کیا کیا ہوا۔ انور کو رنگ دار اور بھڑکیلے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا
وہ بالکل فلم زدہ تھا۔ بال ایسے جمانا جیسے کسی فلم کا ہیرو۔۔۔ پڑھنے لکھنے میں کالج بھر میں اس کی شہرت تھی۔ اس نے
کوئی بھی امتحان دو چار سال کی بربادی کے بغیر پاس نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ قمیص کی کالر کھڑی رکھتا۔ اس کی فطرت ثانی

بن چکی تھی ۔ چلتا تو جیسے زمین پر احسان کر رہا ہو ۔ متانت اور سنجیدگی سے کبھی اسے واسطہ نہیں پڑا تھا ۔ ہماری طرف گھور گھور کر دیکھنا اور فقرے کسنا اس کی عادت سی بن کر رہ گئی تھی ۔ ہم میں سے اکثر اس کے لباس اور اس کی چال کا ذکر کرتیں ۔ اس حد تک کہ وہ اپنے دلوں کے قابو میں نہ رہنے کی شکایت کرتیں ۔ میرے خدا ۔ اب میں سوچتی ہوں تو اپنی کم نظری اور نادانی پر گھنٹوں خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں ۔ کیا ہمارے جذبات ظاہری رکھ رکھاؤ سے اس قدر مغلوب ہو جاتے ہیں !؟ ۔ لڑکیاں کیسے کیسے قصیدے اس کی شان میں پڑھتیں ۔ کبھی چال کا ذکر تو کبھی اس کے لباس کی رنگینیوں پر تبصرے اور پھر بات فوراً کسی فلمی ہیرو تک پہنچ جاتی ۔ میں خود بھی اچھی طرح نہیں بتا سکتی کہ میں کس طرح اس سے قریب ہو گئی ۔ وہ روزانہ مجھ سے ملنے آیا کرتا ۔ ہم کبھی کبھار چوری چھپے مل لیتے ، اور گھنٹوں ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں اور آہستہ آہستہ یہ بات کالج کے در و دیوار سے نکل کر باہر کی فضاؤں میں سانس لینے لگی ۔ مگر ہم نے اس کی پرواہ نہیں کی ۔ میں اسے بے پناہ چاہنے لگی تھی ۔ میں اس کے وفا کے عہد و پیماں پر مرمٹنے کو تیار تھی ۔ ان دنوں مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے زندگی بجز رنگ رلیوں کے کچھ بھی نہیں ۔ بالکل انور کے ان رنگین لبادوں کی طرح جنھیں وہ روز تبدیل کیا کرتا تھا ۔ مگر آہستہ آہستہ یہ رنگ پھیکے پڑنے لگے ۔ ہمارا مختصر سا خاندان بہت جلد ان باتوں سے واقف ہو گیا ۔ میری ماں ، میرا اکلوتا بھائی اور میرے پتاجی نے مجھے سمجھایا ۔ خاندان کی عزت و ناموس کے حوالے دیئے ۔ ہمارا گھرانا پورے شہر میں نمایاں مقام رکھتا تھا ۔ پتاجی اپنے اصولوں کے دھنی تھے ، ان کی بات کا سب ہی احترام کرتے تھے ، اور اگر شہر میں کوئی مشکل مسئلہ آن کھڑا ہوتا تو پتاجی اس کا حل ڈھونڈ نکالتے ۔

ماں دن رات ہمیں مزے مزے کے کھانے کھلاتی ۔ وہ تو بس ہم سب کو خوش دیکھنا چاہتی تھی ۔ میرا اکلوتا اور تنہا بھائی مجھے کس قدر اسے چاہتی تھی ، اس کی ایک ایک بات پوری کرتی ، وہ لڑتا جھگڑتا تو میں اسے ہزار ترکیبوں سے منا لیتی ۔ مگر جب انور کے معاملہ میں اس نے مجھے کہا تو میں صاف انکار کر گئی ۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ میں انور سے اپنی زندگی کے بندھن باندھنا چاہتی ہوں ، وہ میرے ارمان و جذبات کو جانتا تھا ، اس نے مجھ سے بحث نہیں کی ۔ وہ میرا جواب سن کر خاموشی دبے پاؤں میرے کمرے سے چلا گیا ۔ پورے گھر کا ماحول بدل چکا تھا ۔ ماں کی ممتا سے میں محروم ہو گئی تھی ، اور پتاجی کا بس چلتا تو مجھے جیتے جی اس دنیا سے اٹھا دیتے ۔ میں پوری طرح ان حالات کا مقابلہ کر رہی تھی ۔ میں انور سے کئے ہوئے عہد و پیماں کو توڑنے تیار نہ تھی ۔ وفا نبھانے کی میں نے قسم کھائی تھی بھیا کو مجھ سے بہت ہمدردی تھی ، وہ میرے غم سمجھتے تھے ، مگر ایک روز دوپہر سے جب میرے کمرے میں داخل ہوئے تو ان کی آنکھیں خون سے بالکل رچی تھیں اور غصے کی شدت سے وہ کانپ رہے تھے ۔ میں تو اس حالت کو دیکھ کر جیسے مر ہی گئی ۔ انھوں نے بہت مشکل سے وہ باتیں بتلا دیں جو ان کے اور انور کے درمیان ہوئی تھیں ۔ انھوں نے جب یہ کہا کہ " انور تمہیں ایک کھلونا سمجھتا ہے اور تمہیں روزانہ بدلنے والے رنگین کپڑوں سے زیادہ ترجیح نہیں دیتا " تو میرے تن بدن میں

ایک آگ سی لگ گئی۔ میں بے کل ہو اٹھی۔ میں نے چیخ کر کہا "نہیں بھیا ایسا نہیں ہو سکتا"
"ہاں ہاں تم تو وفا کا پیکر ہو۔ تم کیوں یقین کرنے لگیں۔ مگر یہ بھی سن لو کہ وہ اس معاملہ کو کہتا ہے تجارت"۔ بھیا نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا ان کی آنکھوں سے غصہ برس رہا تھا۔ وہ چپ چاپ میرے کمرے سے نکل گئے میں انور کے اس رویہ سے بے چین سی ہو گئی۔ بھیا جنھوں نے کبھی مذاق میں بھی جھوٹ نہیں کہا تھا، درد نہیں دیکھ سکتے تھے، میری خاطر انور کے پاس گئے، تاکہ اس کی جرأت کا اندازہ کر سکیں، مگر انہ رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آستین میں پل رہا تھا اور اس نے ڈس لیا ہو۔ اب پچھتاوے سے کچھ حاصل ہونے والا نہ تھا پابندیاں میں خود بھی اس قدر بد دل ہو گئی تھی کہ مجھے چاروں طرف تاریکیوں اور اندھیروں کے سوا کچھ نہ دکھ ایک بار انور سے ملنے کی خواہش میرے دل میں طوفان خیز لہروں کی طرح موجزن تھی، تاکہ میں اس محبت میں تجارت کیا ہوتی ہے؟ اس نے میرے معصوم اور آئینہ جیسا شفاف دل رکھنے والے کیوں ذلیل کیا!؟ یہ گھڑی جلد ہی آگئی۔ وہ ایک دن چھپتا ہوا ہمارے گھر کے پاس آگیا کپڑے رنگین تھے اور قمیص کی کالر بھی کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور دوڑ کا اور ایک ہی سانس میں بھیا کی ساری باتیں کہہ ڈالیں تاکہ میں بھی اس کی زبان سے سنوں کہ "محبت کیا رشتہ ہوتا!؟ ہے" اور اس نے جب ان باتوں کو قبول کر لیا کہ لڑکیوں کے جذبات رنگین ہوتے ہیں جنھیں کسی بھی وقت بدلا جا سکتا ہے اور ان کے جذبات سے کھیلنا اس کا ایک مشغلہ ہے۔ میں نے ایک زوردار طمانچہ اسے دے مارا۔ اسے ہزار گالیاں دیں۔ غنڈا، کمینہ اور نہ جانے کیا کیا۔ طوفان جو میرے دل کی تہہ میں دبا بیٹھا تھا، ابھر آیا۔ مگر اس طوفان کے بعد بھی ایک طوفان کا ایک ایسا طوفان جو مکمل تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ ابھی ہماری بات چیت جاری اپنے دوستوں کے ہمراہ وہاں آپہنچے۔ ان کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔ پتا جی، جن زندگی میں تیز گفتگو نہ کی تھی اور جنھیں غصہ نام کی کوئی چیز معلوم ہی نہ تھی، اس وقت ایسے دکھائی جیسے کوہ آتش فشاں ہوں۔ انھوں نے ہاتھوں ہاتھ انور کو اٹھا لیا اور گھر کے اندرونی حصے میں روح کانپ گئی۔ میں لرزنے لگی۔ مجھے بھی وہ گھسیٹ کر لے آئے۔ جب ہم اندرونی حصے پر بھیا بھی سامنے کھڑے تھے جن کی طرف دیکھنے کی میری ہمت نہ ہوئی۔ میں کس طرح ان سے نظریں غم و غصہ کی تپش کے رد عمل نے انور کو جھلس کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گیا اگر غصے

دل میں رحم کی کوئی کرن پیدا نہیں ہوئی ۔ یہ منظر مجھ سے نہیں دیکھا گیا ۔ ماں اپنی چھاتی پیٹتی ہوئی وہاں سے چلی آئیں ۔ دیر تک کرب اور تکلیف میں ڈوبی ہوئی آہیں کمرے میں گونجتی رہیں ۔ جب مجھے ہوش آیا تو دنیا ہی بدل چکی تھی ۔۔ انور جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا ۔ ماں کا موم سا نرم دل اپنی بیٹی کی رسوائی و ذلت کا صدمہ برداشت نہ کر سکا ۔ وہ میرے ہوش میں آنے سے پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں ۔ بھیا شہر چھوڑ گئے ۔ وہ کیوں کر شہر میں رہتے !؟ ۔۔ دوسرے روز جب "یہ کہانی" مشہور ہوئی تو زندگی ہمارے شہر سے چلی گئی اور درندگی و وحشت نے یہاں ڈیرہ ڈال دیا ۔۔ بھلا شہر کے لوگ اس بات کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے ؟! ۔۔ حقائق و واقعات معلوم کرنے کی انھیں ضرورت ہی کیا تھی ۔ پتاجی تو بالکل پاگل ہو گئے تھے ۔ جب انھوں نے بھی "گناہ آلود" بیان دے دیا تو پھر ایسے ایسے واقعات ہوئے کہ بیان کی مجھ میں سکت نہیں ۔ انسان وحشی بن گئے ۔ قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا ۔ جذبات آگ کی مانند بھڑک رہے تھے ، انسانیت دم توڑ چکی تھی ۔ شہر معصوموں کی آہ و بکا اور بے گناہوں کی آہ و زاری سے ویران ہو گیا تھا ، برباد ہو گیا تھا ۔ انسانیت ہمارے شہر سے بہت دور چلی گئی تھی ۔ بسا بسایا شہر کھنڈر بن گیا اور میں یہ کیسے بتاؤں فرحت کہ یہ سب میری ہی خاطر ہوا ۔ یوں لگتا تھا ، سماج کی یہ لڑائی کبھی سرد نہ ہونے والی آگ کی طرح بھڑک اٹھی ہو اور ساری دنیا کو جھلس کر رکھ دینا چاہتی ہو ۔۔ میری گردن پر ان سب کا خون ہے ۔ قتل و غارت گری اور لوٹ مار کی ذمہ دار میں ہوں ۔ پتاجی کی خودکشی نے مجھے اس دنیا میں بالکل ہی تنہا چھوڑ دیا ۔ کاش وہ مجھے بھی ختم کر دیتے ۔ انور کی زخمی روح پھڑ پھڑا کر جیل کی چار دیواری سے آزاد ہو گئی ۔ اس کے سارے رنگ چھوٹ گئے ، میں اکیلی رہ گئی تاکہ غموں و دکھوں کے بار ڈھو سکوں ۔ اپنی آنکھوں سے ویرانی کا نظارہ کروں اور زندگی کا ماتم کرتی رہوں ۔ میں نے کیسے کیسے غموں کے کوہِ گراں اٹھائے ہیں فرحت !؟ ۔۔ جذبات کی ان رنگینیوں کے پیچھے جو تباہی و بربادی پوشیدہ ہوتی ہے ہماری نظر وہاں تک نہیں پہنچی ۔ جذبات میں اٹھایا گیا ہر قدم غلط پڑتا ہے جس کی منزل بجز تباہی و بربادی کے کچھ نہیں ۔۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہم سب ہی ایسے ہیں ، مگر ہماری اکثریت ظاہری حسن اور رکھ رکھاؤ کا شکار رہتی ہے ۔ میں نے یہی طے کر لیا تھا کہ اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دوں اور اپنی اس زندگی کا خاتمہ کر دوں جو تباہی و بربادی کی ایک مکمل داستان ہے ۔۔ مگر انھی دنوں اچانک تمہارا خط ملا ، عزم و استقلال کی ایک نئی قندیل میں نے اپنے دل میں جلائی ۔ اور بوجھل قدموں کے ساتھ ایک نئی منزل کی طرف سفر شروع کیا ۔ میں رنگین لبادوں سے اپنی معصوم بہنوں کو بچانے کی تحریک میں ان دنوں مصروف ہوں ۔۔ وہ رنگ جو چھوٹ جاتے ہیں ۔ وہ رنگ جن میں دنا نہیں ہوتی ۔ وہ رنگ جو پھیکے ہوتے ہیں ۔۔ وہ رنگ جو ہلکے ہیں ، دکھاوا ہیں ۔۔ وہ رنگ جن کے بکھر جانے سے انسانیت مر جاتی ہے ۔۔ تمہیں یہ بتا دوں کہ اب تک اس تحریک کے ذریعے ہزاروں معصوم زندگیوں کو محفوظ کر چکی ہوں ۔

میری زندگی میں کیا رہ گیا ہے ـــ اگر اس طرح عمر پوری کرلی تو سمجھوں گی کہ کسی حد تک اپنی غلطیوں و گناہ کر لیا ـ کچھ تو مداوا ہوگا ـــ ویسے میں وہ قیمت ادا نہیں کرسکتی جو الگت معصوم انسانوں نے ادا کی ہے ـــ پچھلے دنوں میں بے حد مصروف رہی اس لئے تمہیں مخاطب نہ کرسکی جس پر تم نے اتنا بڑا الزام لگایا ہے! میری محبت جھوٹی ہے! میں بے وفا ہوں ـــ تم تو میری محبت کو طعنہ نہ دو فرحت! ـــ میں تمہاری نئی زندگی کا ضرور تمہارے پاس آؤں گی اور اپنے ہاتھ سے تمہیں دلہن بناؤں گی ـــ اگر تم نے اس طرح منہ پھیر لیا تو یہ سنسان اور ویران راہوں میں مکمل تاریکی چھا جائے گی ـــ اب میرا اس دنیا میں کون رہ گیا ہے جسے میں گھاؤ دکھا سکوں ـــ تمہارے سوا کون ہے! ـــ میری اس بے رنگ زندگی میں تم ہی تو ایک امید و آشا جسے ہمیشہ میں اپنی سانسوں میں محسوس کرتی ہوں ـــ فرحت! تم اپنا الزام واپس لے لو ـــ فرحت غضب نہ کرو! بخدا میں یہ غم برداشت نہیں کرسکتی ـــ تمہاری اندرا جو انور جیسے انسان سے بے وفا تم جیسی معصوم، نازک دل، حساس و پھول کی طرح شگفتہ موم کی گڑیا سے کیسے بے وفائی کرسکے گی ـــ مقناطیسی شخصیت سے میں کسی طرح الگ نہیں ہوسکتی ـ تمہاری باجی سے تو ایسی امید نہ رکھو! ـــ

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۹)

انھوں نے دو بلیاں پال رکھی تھیں ـ ایک بلی کو اپنے ساتھ برلن لے گئے تھے ـ ائیر انڈیا والوں نے جانے کی اجازت نہیں دی، تو انھوں نے ایک اور کمپنی کے جہاز سے سفر کیا، لیکن اسے ضرور ساتھ. دوسری بلی کے لئے ہمیشہ پریشان رہتے ـ دہلی میں جس کو بھی خط لکھتے اس بلی کی خیر و عافیت ضرور در وطن کے ہر ذرے کو دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرنے والا یہ عظیم انسان اپنے وطن سے بہت دور جا کر موت کی وادیوں میں کھو گیا، اور اس طرح خدا نے اس کی بے کسی کی شرم رکھ لی.

(بہ سلسلہ صفحہ ۲) اردو کے اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان سے باز پرس کی جائے لیکن جب حکومت کی منشا ہوتی ہے ا، افسران کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں" یہ کتنی تلخ حقیقت ہے کہ حکومت کہے کچھ اور کرے کچھ ـ اگر خطبہ کی ر ریاستیں اردو کے تعلق سے جائزہ لیں اور اردو کے نام لیوا بھی غور کریں تو حالات بہت کچھ سنبھل سکیں

نقد و نظر

مجلۂ عثمانیہ کا دکنی ادب نمبر

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد معین الدین قریشی اور ڈاکٹر زور کی کوششوں سے جامعہ عثمانیہ کے طلبا کا سہ ماہی ترجمان مجلۂ عثمانیہ پروفیسر وحید الدین سلیم کی نگرانی میں جاری ہوا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۹۲۷ء میں نکلا، اور اس کے بعد عرصہ دراز تک اس نے اپنا بلند معیار قایم رکھا، لیکن ۱۹۴۸ء کے کچھ پہلے ہی سے اس میں زوال کے آثار رونما ہوئے۔ اس کا ایک سبب مالی دشواریاں اور دوسرا سبب طلبا اور اساتذہ کی اس سے عدم دلچسپی۔ اب تقریباً بیس سال کے بعد ایک ضخیم نمبر ہمارے پیش نظر ہے اور اس میں ترتیب و تدوین کا جو سلیقہ پیش کیا گیا ہے وہ نہایت حسین اور موثر ہے۔ مجلہ کے مدیر سید مصطفےٰ کمال۔ اس کی تیاری میں شبانہ روز محنت کی اور دکنی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اس میں ابتدائی دو مضمون لسانیات سے متعلق ہیں، اس میں جو نظریے پیش کئے گئے ہیں انھیں حرف آخر نہیں کہا جاسکتا، اہل علم کے لئے یہ بحث کا موضوع بن سکتے ہیں۔ تیسرا مضمون دکنی زبان کی خصوصیت پر ہے اور چوتھا میسور کی دکنی اُردو پر نصیر الدین ہاشمی صاحب نے دکن کا تہذیبی پس منظر پر لکھا ہے اور سید مبارز الدین صاحب رفعت نے ادبی مرکز بیجاپور پر۔ اس کے بعد اُردو نثر کا ارتقا، تذکرہ نویسی اور دکنی ادب عالیہ پر سیر حاصل مقامین ہیں۔ اصناف سخن میں مثنویاں، غزلیں، قصائد، مراثی، رزمیہ شاعری، ریختی اور رباعی پر علحدہ علحدہ تفصیلی مضامین پیش کئے گئے ہیں۔ آہنگ شعر اور دکنی تلفظ کے عنوان پر جو مضمون پیش کیا گیا ہے وہ محل نظر ہے اور تبصرہ کے لئے زیادہ فرصت طالب۔ ڈاکٹر ایس آر کلکرنی نے مرہٹی رسم خط میں لکھی ہوئی دکنی مثنوی "سدام چرتر" کا تعارف کرایا ہے اور دکنی گیت پر محترمہ زینت ساجدہ نے بڑے پیارے انداز میں اور رنگین گل کھلائے ہیں اور حق تحقیق ادا کر دیا ہے آخر میں دکنی شعرا عصر حاضر کے کلام کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد کتابیات کے زیر عنوان دکنی ادب کے تعلق سے جتنی کتابیں شایع ہو چکی ہیں ان کی فہرست دے دی گئی ہے اور آخری عنوان مقالہ نما کے تحت اس سلسلے میں جو مضامین شایع ہوئے ہیں ان کی فہرست حوالے کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اور وسیع کام تھا۔ فاضل مرتب مدیر اعلیٰ نے اس کو حتی الامکان مکمل بنانے کی کوشش کی ہے۔ دکنی ادب کا یہ خاص شمارہ اس قابل ہے کہ کوئی کتب خانہ اس سے خالی نہ رہے۔ اس کی کتابت، طباعت، سرورق نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ اس کی قیمت پانچ روپے ہے اور شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی سے مل سکتا ہے۔

جمال صابر" حضرت علاؤالدین صابر پیر کلیر کے ایسے حالات پر مشتمل ہے جو شریعت اور طریقت کی روشنی میں
ے گئے ہیں۔ عام طور پر اس قسم کی کتابوں میں عقیدت کا جذبہ زیادہ کارفرما ہوتا ہے اور کرامات کے واقعات سے
ب کے صفحات پر ہو جاتے ہیں۔ لیکن پیشِ نظر کتاب میں پیر کلیر کے خاندان، ان کا کلیر میں قیام اور وصال وغیرہ کے
ے تحقیقی معلومات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخری صفحہ پر شجرہ بھی دیا گیا ہے، لیکن اچھے ڈھنگ سے لکھوایا نہیں گیا۔
س کو صحیح طریقے پر لکھوایا جاتا تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی۔ موجودہ صورت میں کس بزرگ کا تعلق
سے ہے، مشتبہ ہو گیا ہے۔ صابری خاندان کے ارکان یہاں بھی موجود ہیں ان کے شجروں سے تصحیح بہ آسانی
سکے گی اور آیندہ کتاب یا اسی کے نئے ایڈیشن میں تصحیح کا خیال رکھا جائے گا۔

ذکرہ اسلاف تصنیف بہار الحق قاسمی خطیب جامع مسجد ماڈل ٹاؤن لاہور۔ صفحات (۱۹۲) قیمت ایک روپیہ

مولانا بہار الحق قاسمی نے اپنے اسلاف کا تذکرہ قلمبند کیا ہے اس میں پہلا تذکرہ قاضی القضاۃ
انا قاضی جمال الدین بندشاہی کا ہے جو آگرہ سے کشمیر پہنچے اور سلطان وقت سلطان زین العابدین بادشاہ
۸۲۶ھ۔ ۸۷۸ھ) نے علم و فضل کی بنا پر انھیں عہدۂ قاضی القضاۃ پیش کیا۔ نویں صدی ہجری سے آج تک کی
خ پر نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے علمِ دین کی اشاعت کے لئے اس گھرانے کی مقدس ہستیوں کو
منظورِ نظر بنا لیا تھا۔ گذشتہ پانسو سال کے عرصے میں اس خاندان کا ایک نہ ایک فرد علم کی شمع روشن کئے رہا
ر آج بھی یہ فرض فاضل مصنف کے ہاتھوں ادا ہو رہا ہے۔

اس تذکرہ کی پہلی اشاعت پر جناب سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم نے جو تبصرہ فرمایا ہے اس سے فاضل مصنف کے
ے میں بھی علم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :-

"دس بارہ سال سے موصوف (مولانا بہار الحق قاسمی) کے اخلاص و تقویٰ، علم و فضل اور
خطابت کے مظاہر دیکھے .... اس مختصر تالیف سے محض ایک خاندانی فرض ہی ادا نہیں کیا بلکہ
مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ میں ایک فصل تازہ کا بھی اضافہ کیا ہے۔"

میں متعدد قلمی کتب اور قدیم تاریخوں کے حوالے موجود ہیں جس سے مصنف کی وسعت و دقتِ نظر کا اندازہ
ا ہے۔ یہ تذکرہ مولانا کے آباؤ اجداد کا ہے لیکن کہیں بھی عقیدت کی بنا پر قلم فخر و مباہات کا انداز اختیار
کرتا بلکہ نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جو واقعات قدیم تاریخوں میں ملے یکجا کر دیئے ہیں اور اگر مورخین نے
غلطیاں کی ہیں تو ان کی اصلاح کر دی گئی ہے اور اس طرح علمائے اسلام کے کارناموں کا ایک گوشہ منظرِ عام پر
ہے۔ (ا۔ ص)

نامہ فیض الاسلام راولپنڈی (پاکستان) عثمان غنی رضؓ نمبر ۱۳۸۳ھ) ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی نے

عہد نبوت اور خلافت راشدہ پر ایک اچھا سلسلہ شروع کیا ہے! اس سے پہلے وحی نمبر، سیرت نمبر، صدیق اکبرؓ نمبر، فاروق اعظمؓ نمبر کے نام سے کئی اشاعتیں منظر عام پر آچکی ہیں اور یہ پانچویں اشاعت عثمان غنیؓ نمبر کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ یہ ایک قابل قدر کام ہے! اس اشاعت میں حضرت عثمان غنی ذی النورینؓ پر اس قدر شرح وبسط کے ساتھ عالمانہ مواد جمع کیا گیا ہے وہ ہر طرح قابل تحسین ہے اس عہد پر اب تک ایسا مواد جمع نہیں ہوا تھا۔ نہ صرف یہ مواد مستند تاریخوں سے حاصل کیا گیا ہے بلکہ نتائج کے استنباط اور اظہار رائے میں سنجیدگی اور صحیح توازن سے کام لیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کا عہد خلافت بے سروپا روایات اور غلط استنباط کی وجہ سے الجھ گیا ہے کہ اس الجھاؤ میں صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے نہیں آتی۔ بات یہ ہے کہ اس عہد میں غیر معمولی واقعات رونما ہوئے تھے اور ہر طبقہ ان واقعات اور محرکات کو اپنے رنگ میں بیان کرتا رہا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی واقعہ کئی صورتوں میں پیش ہوتا رہا اور اختلافات کا حجم بڑھتا گیا اور مسلمانوں کے کئی طبقے پیدا ہو گئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ محرکات اور واقعات کا بالکل بے لاگ جائزہ لیا جائے اور صحت مندانہ استنباط کیا جائے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ عثمانؓ نمبر کے مضمون نگاروں نے بڑی احتیاط سے یہ تمام مضامین لکھے ہیں اور حقائق کی روشنی میں اس عہد کی صحیح تصویر پیش کی ہے! اس نمبر میں (۴۲) مضامین ہیں جو (۱۹۰) صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان مضامین میں حضرت عثمانؓ کی زندگی، کارنامے، سیاست، معاشرت کے تمام پہلوؤں پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔ یہ انجمن فیض الاسلام کا قابل تحسین کام ہے۔

لیکن ساتھ ہی یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ مضامین کی ترتیب میں تاریخی تناسب اور تسلسل واقعات کا لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ تمام مضامین بلا لحاظ تاریخ و تسلسل مناسبت کے جوڑ دئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر پہلا مضمون امام صوفیہ اور اس کے بعد دوسرا عظمت عثمانؓ اور اس کے بعد اعتراضات اور ان کے جوابات دئے گئے ہیں۔ منطقی ترتیب کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے خاندان، ابتدائی زندگی، اسلام سے وابستگی، مکی زندگی، مدنی زندگی اور ان کا خلافت پر فائز ہونا اور اس کے بعد خلافت کے واقعات یکے بعد دیگرے لکھے جائیں اور اس کے بعد ان کی عظمت و فضائل اور کارنامے ہونے چاہئیں اور آخر میں حضرتؓ سے متعلق مشاہیر کی رائیں اور خیالات اور آخر میں اعتراضات اور ان کے جوابات درج کئے جائیں۔ موجودہ ترتیب میں کوئی آہنگ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ تمام مضامین قابل قدر ہیں اور کتب خانوں میں رکھنے کے قابل ہیں۔ (عبدالمجید صدیقی)

ماہنامہ "افکار" کراچی (حفیظ نمبر) آج کل کی ادبی نسلیں مردہ پرستی کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہیں اور یہ سرکشی اب رفتہ رفتہ ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔

ابھی اس تحریک کا کوئی محاسبہ تو نہیں ہوا ہے لیکن جب ہوگا تو ہراول کے جاں نثاروں میں جناب صہبا لکھنوی مدیر افکار کا نام بھی ان ناموں میں سر فہرست ہوگا جنھوں نے اپنی صلاحیتیں، اپنا وقت، اپنا سرمایہ اس تحریک کی نذر کر دیا اور تمام عمر کی پونجی کو اس بغاوت کی کامیابی کے لئے وقف کر دیا۔ ماضی پرستی اور مردہ پرستی میں فرق ہے۔ صہبا صاحب ماضی پرستی کو برا نہیں سمجھتے کیونکہ "افکار" کے زیر نظر شمارہ یعنی "حفیظ نمبر" میں حفیظ صاحب کا ماضی بھی اسی فراخدلی کے ساتھ انھوں نے پیش کیا ہے جس فراخدلی کے ساتھ شاعر پاکستان کا حال اس میں سمو یا گیا ہے۔ ان کی یہ کوشش بہت کامیاب ہے اور اس کے لئے وہ صرف مبارکباد کے مستحق ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس اچھے اقدام پر ان کی تقلید بھی کی جانی چاہئے مستقبل، ماضی اور حال ہی سے بنا کرتا ہے، دونوں کو مربوط کرکے پیش کر دینا ایک خوبی ہے، لیکن اگر ماضی اور حال کو اس طرح پیش کیا جائے کہ مستقبل تاریک نہ ہو، بلکہ اور زیادہ اجاگر ہو جائے تو یہ محض خوبی ہی نہیں، بڑائی بھی ہے۔ صہبا صاحب نے یہی کیا ہے اور اس سے ان کا وہ جذبہ آشکارا ہوتا ہے جو وطن اور ادب کی صحیح خدمت کرنے کے لئے ان میں موجزن معلوم ہوتا ہے۔ دیگر ادبی اداروں، انجمنوں، کارکنوں اور رسائل کو اس رہنمائی پر نہ صرف خوش ہونا چاہئے بلکہ اس کو اس حد تک اپنانا بھی چاہیے کہ ایسی کوششوں کو ان کا مناسب مرتبہ اور مقام بھی مل جائے۔ ہمیں یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی کہ اس کام میں رائٹرز گلڈ نے بھی صہبا صاحب کا ہاتھ بٹایا ہے۔ یہ ایک نیک فال ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ایک گلڈ ہی نہیں باقی سب بھی اگر ایک دوسرے سے ایسے معاملات میں تعاون کرنے لگیں (قطع نظر اس کے کہ ان کا مسلک کچھ ہی کیوں نہ ہو) تو ادب دور پہنچ سکتا ہے اور بہت بلند ہو سکتا ہے۔

"حفیظ نمبر" (۶۲۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ سر ورق، مصور پاکستان جناب چغتائی کا بنایا ہوا ہے جس پر "افکار" چھوٹا، ہلال ٹیڑھا بیڑھا، اور "حفیظ" بہت جلی اور نمایاں ہے۔ میں اس اشاریت کو ٹھیک سمجھتا ہوں اور قارئین سے صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سر ورق ہی سے وہ اندازہ لگا لیں گے کہ "حفیظ نمبر" کے اندر جناب حفیظ جالندھری اس قدر کر و فر کے ساتھ اور یہ تمام و کمال موجود ہیں کہ ہمیں شائد ہی کہیں اور مل سکیں۔ یہ حفیظ وہی حفیظ ہیں جو "رقاصہ" کے خالق ہیں، یہ نظم اس شمارہ میں موجود ہے۔ موجودہ "ابھی تو میں جوان ہوں" بھی ہے اور "جاگ سوز عشق جاگ" بھی حفیظ نمبر میں آپ کو مل جائے گی، لیکن جس ایک شعر کے لئے دس روپے جو اس نمبر کی قیمت ہے مجھے بہت حقیر معلوم ہوئے، وہ یہ ہے ؎

رتاقِ دو جہاں کے خزانے کو کیا ہوا

ملتا ہے رنج وہ بھی کسی کا دیا ہوا!

(حکیم یوسف حسین خاں)

بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء   فون ۳۵۲۰۹

جلد ۲۷ شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۴ء

(ماہنامہ)

سب رس

(حیدرآباد دکن)

نگران — پروفیسر عبدالمجید صدیقی

مجلس مشاورت — میر حسن - ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

رمن راج سکسینہ - وقار خلیل

(معتمد)

محمد اکبر الدین صدیقی

زرِ سالانہ ہند و پاک سے ــــــــ چھ روپے

ششماہی ــــــــ تین روپے

غیر ممالک سے ــــــــ دس روپے

مہتمم ادارہ ادبیات اردو کے

اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر

ایوان اردو خیریت آباد

(حیدرآباد دکن)

سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

گذشتہ مہینے میں میر اکبر علی خاں صاحب ایم۔پی ادارہ ادبیات اردو تشریف لائے تھے۔ ادارہ کا میوزیم، کتب خانہ اور دارالمطالعہ دیکھنے کے بعد اظہار خوشنودی فرمایا اور وعدہ فرمایا کہ ادارہ کے تعلق سے وہ مرکزی حکومت میں پوری پوری نمائندگی فرمائیں گے۔ اس کے ہفتہ عشرہ بعد ہی حکومت آندھرا کے ہردلعزیز وزیر اوقاف نواب میر احمد علی خاں صاحب بھی ادارہ تشریف لائے اور میوزیم کی تمام اشیا کا بہ تفصیل معائنہ کیا۔ کچھ وقت کتب خانہ اور پھر دارالمطالعہ میں گذارا۔ سب رس کے تبادلے میں آنے والے رسائل کی تعداد سے متاثر ہوئے اور ساتھ ہی مطالعہ کرنے والوں کی تعداد سے بھی۔ نواب صاحب معزوصوف ادارہ کی اہم تقاریب میں شرکت فرماتے ہیں اور آزاد انسٹی ٹیوٹ کے اجلاسوں میں بھی تشریف لاتے ہیں، لیکن تفصیلی معائنہ کا موقع نہ مل سکا تھا۔ اس دفعہ نواب صاحب نے ادارہ کے کام کی رفتار پر خوشی کا اظہار کیا۔ جناب پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے ادارہ کی تازہ کتاب پروفیسر عبدالمجید صاحب کی تاریخ گولکنڈہ (دوسرا ایڈیشن) نواب صاحب کی نذر کی۔

ڈاکٹر سری رام شرما کے مقالے "دکن اور دکنی زبان کا آغاز" کا پہلا باب جو گذشتہ دو شماروں میں قسط وار شایع ہو رہا تھا، اس شمارہ پر ختم ہو رہا ہے۔ ہم ارباب فکر و نظر سے درخواست کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ سب رس کے صفحات ان کے منتظر رہیں گے۔

جنوری ۱۹۶۵ء سے سب رس کا اٹھائیسواں سال شروع ہوگا اور اس کا پہلا شمارہ "ہاشمی نمبر" ہوگا جس میں نصیرالدین ہاشمی مرحوم پر تاثراتی اور تنقیدی مضامین پیش کئے جائیں گے۔ ہاشمی مرحوم ادارہ کے مؤسسین میں تھے اور یہ شمارہ ادارہ کی جانب سے ہاشمی مرحوم کی خدمت میں ایک خاموش نذر عقیدت ہوگا۔

یہ خبر انتہائی حزن و ملال اور رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ حیدرآباد کے مقبول عام اور ہر دلعزیز شاعر سرور ڈنڈا نے عمر کی صرف چالیس بہاریں دیکھنے کے بعد ۲۰ نومبر کو سوا چھے بجے انتقال کیا۔ ۲۱ نومبر کو درگاہ یوسفین میں بعد ظہر نماز جنازہ ادا ہوئی اور درگاہ شریف کے سامنے تکیہ مبارک گلی میں سپرد خاک کئے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ سرور ڈنڈا نے کالج آف فائن آرٹ سے ڈپلوما لیا تھا لیکن ان کا اصل مشغلہ مطالعہ اور شعر گوئی تھا۔ جنوبی ہند میں جہاں وہ مشاعرہ میں شرکت کرتے اپنی منفرد شاعری کی بنا پر چھا جاتے۔ ان کی شاعری میں کہیں ظرافت چھا جاتی اور کہیں طنز ہی طنز ہوتا۔ وہ ایک خدا ترس، متقی صوم و صلوٰۃ کے پابند شاعر تھے اور فریضہ حج بھی ادا کیا تھا۔ اس طرح وہ "دامن تر مکن ہشیار باش" کی تعبیر تھے ؎ حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد + کہ بہار تھی نہ دیدیم بہار آخر شد۔

نورالحسن

آپ سے ملیئے!

سید نظام الدین صاحب خلف سید الدولہ مرحوم نبیرہ آصف نواز الملک معتمد صرف خاص مبارک ـــ یہ خاندان بغداد شریف سے جنیتر آیا جنیتر پونا سے تقریباً (۶۶) میل پر واقع ہے۔ وہاں ایک درگاہ سید اسحاق حسن قادری قبلہ کی ہے۔ یہ بزرگ وہیں دفن ہیں اور وہ محلہ پیرزادوں کا باڑا کہلاتا ہے۔ خانقاہ کے اوپر کندہ ہے ـــ

اگر مخلد بریں خواہی در آفاق   بہ بیند خانقاہِ سید اسحاقؒ

سید نظام الدین صاحب کے آبا و اجداد بغداد شریف کے سجادوں کے سلسلے سے ہیں۔ یہ خاندان شروع سے ترپ بازار ہی میں سکونت پذیر ہے۔

تراب علی خاں سر سالار جنگ مرحوم نے جب ۱۲۸۴ھ ہجری میں (Constitutional Government) آئینی حکومت قائم کی تو انتظام مملکت میں تعلقہ بندی، ضلع بندی ہوئی اور مولوی سید سعد الدین صاحب پہلے معتمد مالگزاری مقرر ہوئے۔ ان کے فرزند آصف نواز الملک صدر تعلقدار گلشن آباد میدک مقرر ہوئے اور پھر بعد میں معتمد صرف خاص مبارک کے عہدہ پر سرفراز ہوئے اور ان کے فرزند سید الدولہ بھی معتمد صرف خاص رہے ہیں۔

سید نظام الدین صاحب کی پیدائش محلہ شاہ گنج میں تقریباً ۱۸۹۰ء کی ہے۔ اب موصوف کی عمر تقریباً (۷۴) سال ہوگی لیکن ماشاءاللہ قویٰ ایسے مضبوط ہیں کہ اب بھی پانچ چھ میل چلتے پھرتے ہیں۔ دو چار دانت ابھی باقی ہیں۔ پرانی وضع کا تنگ مُسا ہوا میدر آبادی پائجامہ پہنے، سر پر کبھی کالی رام پوری ٹوپی کبھی تنگے سر، شیروانی پہنے گلے میں بس ایک رومال ڈالے اور بانس کی پتلی سی چھڑی بغل میں دبائے چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں ـــ قد (۵) فٹ (۷) انچ۔ رنگ گندمی، جسم کسرتی اور بھرا ہوا۔ زندہ دلی اس سے ظاہر ہے کہ ڈاڑھی مونچھ منڈاتے ہیں ـــ مذہب کی بابت جب میں نے دریافت کیا تو کہنے لگے کہ :ـ "میاں کیا پوچھتے ہو، چاروں راستے چار مینار کو جاتے ہیں ـــ!" مرنج و مرنجان، دوست فش، کشادہ دل آدمی ہیں۔ ہر وقت لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ میں نے موصوف کو کبھی غمگین اور افسردہ نہیں دیکھا، بلکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ ان کی صحبت میں دق گرفتہ بھی اپنے رنج کو بھول جاتا ہے۔ بڑے مزے کی باتیں کرتے ہیں اور پرلطف ادبی محفلوں کا تذکرہ مزا لے لے کر کرتے ہیں ـــ اُردو اشعار جو انھیں یاد ہیں اور مذاق نہایت ستھرا ہے ـــ ان سے سب سے پہلے میری ملاقات میرے مشفق بزرگ غلام پنجتن صاحب نے یہ کہہ کر کرائی تھی کہ :ـــ "اگر اردو ادب کے چوٹی کے شعر سننا ہیں تو ان کی صحبت عین اللہ بخش ـــ!"

مرزا داغؔ کا ہے میرے جب بھی ملاقات نظام الدین صاحب سے ہو جاتی تو وہ دو ایک شعر پیش کرتے ہوئے سر کرتے اور میں فوراً ان کو قلم بند کر لیتا۔ مجھے خیال پیدا ہوا کہ ایک مرتبہ ان کو پکڑ کر گذشتہ واقعات اور قصے لکھو کیوں نہ لیا جائے تاکہ دوسرے بھی ان سے مستفید ہو سکیں۔ لہذا میں نے ان سے درخواست کی کہ اپنے چند لمحے مجھے دیں اور انھوں نے بصد مہربانی میری استدعا کو قبول فرمایا۔ اب میں آپ کے اور ان کے بیچ میں زیادہ حائل رہنا نہیں چاہتا۔۔۔! سنیئے! اور لطف اندوز ہوئیے! ایسے بزرگ ہمارے لئے مایۂ ناز ہیں اور جو کچھ ان سے حاصل کر سکیں ہمارے لئے سعادت ہے۔

نظام الدین صاحب کی زبانی :۔۔۔

"بچپن ہی سے میرا ماحول شاعرانہ تھا، اور اسی ماحول کا اثر مجھ پر غالب رہا۔ گھر پر ہی بڑے بڑے نامی گرامی شاعر جمع ہوتے تھے اور ہفتہ میں ایک دن شعر و شاعری کی محفل آراستہ ہوتی تھی۔ گرامی بزرگ امراؤ مرزا ناداںؔ مرحوم، مولوی مسعود علی محویؔ، احمد علی شوقؔ دہلوی، رضی الدین حسن کیفیؔ، غلام مصطفےٰ محمد طاہر طاہرؔ، جمال الدین نوریؔ، غلام نبی نظمیؔ وغیرہ کے کلام سے مستفید ہوتا رہا، اور دل میں اچھے اچھے شعر یاد کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اعلیٰ درجے کے شعر سنتے سنتے کچھ ایسی عادت پڑ گئی کہ معمولی شعر نظر ہی میں نہیں جچتا۔ جب کچھ اور بڑا ہوا تو داغؔ، امیرؔ وغیرہ کے کلام سے استفادہ کیا۔ جوانی میں داغؔ کا کلام دل کو تڑپا دیتا تھا، اور داغؔ سے ایک قسم کا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔"

یہاں داغؔ کے متعلق چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں جو لطف سے خالی نہیں، اور ان محفلوں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو اب خواب و خیال ہو گئیں :۔

مولوی رضی الدین حسن کیفیؔ کے داغؔ کے شاگرد ہونے کا واقعہ خود کیفیؔ ہی نے بیان کیا ہے۔ کیفیؔ کی غزل

ترکِ الفت کا ارادہ قصدِ روپوشی بھی ہے ۔۔۔ میرے دل میں پھر تمنائے ہم آغوشی بھی ہے

داغؔ مرحوم نے سنتے ہی فرمایا کہ "کیفیؔ! دوسرے مصرعے کو یوں بدل دو۔

اور پھر دل میں تمنائے ہم آغوشی بھی ہے"

اس اصلاح پر کیفیؔ صاحب پھڑک گئے اور فوراً داغؔ کے شاگرد ہو گئے۔

امراؤ مرزا ناداںؔ مرحوم داغؔ کے عزیز قریب تھے۔ ناداںؔ کی بیوی کے انتقال کے بعد لوگوں نے انھیں آتشِ سیال پر لگا دیا تھا جس کی وجہ سے وہ دن رات مست رہتے تھے اور بیوی کے غم کو غرقِ مئے ناب کر دینا چاہتے تھے۔ داغؔ بدمستی اور اتنی مئے نوشی کو پسند نہیں کرتے تھے اس لئے ناداںؔ سے کچھ خفا رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مغرب کی نماز سے پہلے ناداںؔ مرحوم داغؔ کی خدمت میں حاضر ہوئے ا

حالتِ سرور میں کہا کہ :۔ "استاد! آج غزل دکھا لیتا ہوں!" ۔ داغ صاحب نے ٹالنے کی خاطر کہا کہ :۔ "جاؤ میاں، سو رہو، صبح کو دیکھا جائے گا!" ۔ مگر نادان مصر ہوئے تو داغ نے اپنی غزل کا مطلع سنایا ؎

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے — مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

یہ مطلع سنتے ہی نادان نے کہا کہ :۔ "استاد! بس اب اس غزل کو رکھ دیجئے" ۔ اور اپنا مطلع سنایا ؎

یہ کیا کہتے ہو ہم سا دلربا مشکل سے ملتا ہے — خدا ملتا ہے بندہ سے جو بندہ دل سے ملتا ہے

داغ، بہت صداقت پسند آدمی تھے اور جوہر شناس تھے، نادان کی بہت تعریف کی اور کہا کہ :۔ "واقعی تیرا مطلع میرے مطلع سے بڑھ گیا!"

ایک مرتبہ حیدرآباد میں فصاحت لکھنوی آئے تھے، ان کی آمد پر محفل شعر و سخن ترتیب دی گئی۔ مشاعرہ برپا ہوا، اور "انگڑائی" کا قافیہ لازمی قرار دیا گیا۔ اس مشاعرہ میں جلیل مرحوم بھی شریک تھے۔ فصاحت نے اپنے شعر میں "انگڑائی" یوں باندھی ؎

سو کے اٹھنے کی ادا نے ہائے گھائل کر دیا — اک کھنچی تلوار تھی ظالم کی انگڑائی نہ تھی

نادان مرحوم کا شعر تھا ؎

بن گئی میرے گلے کا ہار جو صبحِ وصال — وہ کمندِ ناز کا پھندا تھی انگڑائی نہ تھی

ورنگل میں ایک مشاعرہ عبدالولی فروغ کی صدارت میں ہوا تھا، فروغ بھی داغ کے شاگرد تھے، فروغ کا مطلع تھا ؎

مشتاقِ شہادت بھی ہوں اور سخت گلو بھی — اس طرح سے تڑپوں کہ تڑپنے لگے تو بھی

مشاعرہ میں ایک تیرا چودہ برس کا لڑکا تمنا بھی محفل میں شریک تھا، اس نے جب اپنا مقطع سنایا تو ساری محفل پھڑک اٹھی اور خود فروغ نے اس کم سن شاعر کو گلے لگا کر بہت تعریف اور حوصلہ افزائی کی۔ مقطع ملاحظہ ہو ؎

ان ہاتھوں کو کیا کیا ہنر آتے ہیں تمنا — یہ چاک گریباں بھی کرے اور رفو بھی

نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کے زمانے میں دربار میں مشاعرے ہوتے تھے جن میں نواب صاحب چلمن کے پیچھے مسند پر بیٹھے رہتے تھے اور وہیں سے شعرائے کرام کا کلام سنتے تھے۔ ایک مرتبہ مشاعرہ کی محفل گرم تھی۔ داغ، امیر، امیر اللہ تسلیم وغیرہ موجود تھے۔ داغ نے جب اپنی غزل کا مطلع سنایا تو نواب صاحب رامپور تڑپ کر چلمن کے باہر نکل آئے اور داغ سے کہا کہ "استاد! یہ مطلع پھر ارشاد ہو!" وہ مطلع یہ ہے ؎

شوخی سے ٹھہرتی نہیں قاتل کی نظر آج
یہ برق بلا دیکھئے گرتی ہے کدھر آج

اسی غزل کا ایک اور شعر سنئے اور سر دھنئے

وعدہ پہ مرے ان کے قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ ادھر کل ہے ادھر آج

دو مصرعوں کے درمیان کچھ عبارت شاعر چھوڑ دیتا ہے اور شعر سننے کے بعد سامع کا اشتعال تیز ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو

مے خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر شخص پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

داغ کے اور شعر سنئے۔ اگر پاسباں سے یہ کہا جائے کہ فلاں کو آنے نہ دو تو وہ خود سمجھتا ہے

یہ مرے واسطے تاکید ہے دربانوں کو
کہ اسے میں بھی بلاؤں تو نہ آنے پائے

پاسباں نے مرے دھوکے میں عدو کو روکا
حکم تھا ان کا وہ آئے یہ نہ آنے پائے

داغ کا ایک اور مطلع سن لیجئے

لختِ دل کونسے دن پنجۂ مژگاں میں نہیں
یہ وہ پھول چنے ہیں جو گلستاں میں نہیں

خار ہیں بلبل و پروانہ سرِ بزم و چمن
یہ کھٹکتے ہوئے کانٹے تو بیاباں میں نہیں

اتفاقِ قافیہ اور اختلافِ جذبات پر جو اشعار نظام الدین صاحب نے سنائے وہ واقعی قابل سننے اور لطف اٹھائیے!

غالب کا مشہور شعر ہے

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

منشی صدرالدین صاحب آزردہ کا شعر اسی قافیہ ردیف میں ملاحظہ ہو

آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گئے
دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

امام علی بحر کا شعر سنئے اور سر دھنئے

جانے دے اے تصورِ جاناں نہ کر تلاش
ایسا نہ ہو کہ وہ کسی دشمن کے گھر ملے

داغ کا مشہور شعر ہے

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

ظہیر دہلوی کا شعر اسی قافیہ اور ردیف میں ملاحظہ ہو ؎

رہنے دے جھگڑے ہی میں اے شیخ اب نہ چھیڑ
جاتا رہوں نہ کفر سے ایمان تو گیا

رفیع الدین حسن کیفی کی جانشینی کا مشاعرہ ہوا، اس میں صفی اورنگ آبادی کی غزل تھی، ؎

ادا پیدا نظر سے، آن رخ سے، شان تیور سے
ترے قربان آخر دل ہے کس کس کے لئے تر سے

کسی کا رزق رکتا ہے کہیں خلاق اکبر سے
صفی پتھر کے کیڑے کو غذا ملتی ہے پتھر سے

یہ سنتے ہیں وہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے کب دے گا؟
جب آنکھیں لگ گئیں چھت سے تو کیا امید چھپر سے

مشہور شعر ہے ؎

ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا
بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

اس مشاعرے میں علی حیدر نظم طباطبائی بھی موجود تھے، ان کی غزل میں پتھر کا قافیہ ملاحظہ ہو ؎

عدو کی آڑ میں چھپتے ہو، بس بس ہو گیا پردہ
نظر کو جانتے ہو پار ہو جاتی ہے پتھر سے

داغ کی یہ غزل تو بھلائے نہیں بھولتی ؎

عشق میں جی سے گزرتے ہیں گزرنے والے
موت کی راہ نہیں دیکھتے مرنے والے

یہی اقرار، یہی قول، یہی وعدہ تھا
او دغاباز، فسوں ساز، مکرنے والے

آخری وقت بھی پورا نہ کیا وعدۂ وصل
آپ آتے ہی رہے، مرگئے مرنے والے

ایک مرتبہ داغ نے اپنی داشتہ کو بلوایا، لیکن وہ نہیں آئی اور کہلا بھیجا کہ "میری بلا بھی نہ آئیگی"
داغ نے فوراً یہ شعر لکھ کر بھیج دیا ؎

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

(سلسلہ صفحہ ۱۶)
ایک رسالہ کا انتظام کرا دیا جائے، اور کوئی وجہ نہیں کہ عمدہ انتظام کے بعد رسالہ "الندوہ" کا مقابلہ نہ کر سکے جو اس وقت اکرام اللہ خاں کی ادارت میں نکل رہا تھا۔

مولانا کی زندگی کی مہلت کم سے کم ہوتی جارہی تھی مگر مصروفیت میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔
یہ تھی ایک مصروف انسان کی زندگی، جس کا ہلکا سا خاکہ جولائی ۱۹۱۴ء کے ضمن میں کیا گیا، اگسٹ ۱۹۱۴ء کی مصروفیات انشاءاللہ آئندہ۔

پروفیسر … احمد ہاشمی

ایک ماہ مولانا شبلی کے ساتھ (جولائی ۱۹۱۴ء)

جون ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی کی معروفیات کو بیان کیا جا چکا ہے۔ مولانا شبلی نے جولائی ۱۹۱۴ء میں جن مصروفیتوں میں وقت گزارا وہ ناظرین کے سامنے ہے۔ اس میں ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے کہ جن لوگوں کے دل میں کام کی لگن ہوتی ہے وہ زندگی کے آخری لمحوں تک مصروف رہتے ہیں، اور ان کی یہی مصروفیت اور خاموش خدمت ان کی شہرت کا سبب ہوتی ہے۔ وہ تو رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن ان کے کام اور شہرت ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہتی ہے۔ مولانا شبلی ایسے ہی لوگوں میں تھے اور یہ مقالہ ان کی ان تھک محنت کو پیش کرتا ہے۔

مولانا شبلی کا قیام ابھی بمبئی میں تھا، اور "سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم" لکھنے میں مصروف تھے۔ سید سلیمان ندوی سے حضرت عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہراتؓ پر ایک مستقل کتاب کی فرمائش کی[1] اور ارادہ کیا کہ اس کو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل کر دیں۔ لیکن یہ جز سید صاحب کے نام ہی سے رکھنے کا ارادہ تھا اور اس کتاب کی اشاعت اور اس کا نفع بھی سید صاحب سے متعلق رکھنے کا خیال تھا، لیکن مولانا اتنا ضرور چاہتے تھے کہ صاف شدہ مسودہ ایک نظر ان کو ضرور دکھلا لیا جائے۔ مولانا اس کے لئے بھی تیار تھے کہ اگر ازواجؓ کا حال الگ سلسلہ میں ہو تو مولانا اس حصہ کو سیرت سے الگ کر دیں۔ سیرت عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہراتؓ کی سیرت کا کام مولوی عبدالسلام ندوی سے نہ لینا چاہتے تھے، کیوں کہ ان پر زیادہ بار پڑ جاتا، پھر ان کا طرز تحریر سیدھا سادا تھا، اس میں ادب کی چاشنی نہ تھی جس سے پڑھنے والے کو دلچسپی ہوتی۔ مولوی حمید الدین فراہی[2] حیدرآباد دکن پہنچ چکے تھے اور مولوی شیر علی صاحب[3] کے تقرر کا بھی ریاست میں امکان پیدا ہو گیا تھا۔

ندوہ کے ہنگاموں اور مولانا کی مخالفت کا زور ابھی باقی تھا، اور مولانا کا اس سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ مولانا چونکہ ندوہ کو دل سے چاہتے تھے اس لئے اس کی ردّی حالت اور منتظمین کی ندوہ کے آئین سے

---

[1] مکاتیب شبلی، حصۂ دوم صفحہ ۱۱۱۔ بمبئی سے ۲ر جولائی ۱۹۱۴ء۔

[2] دارالعلوم کے پرنسپل۔

[3] بعد کو مولوی شیر علی صاحب بھی حیدرآباد دکن میں ملازم ہو گئے تھے۔

.دگردانی اور من مانی ان سے دیکھی نہ جاتی تھی ۔ لہذا سوچتے سوچتے مولانا اس نتیجہ پر پہنچے کہ ندوہ کو جیسا ندوہ
ولانا بنانا چاہتے تھے ۔ مولویوں (یہاں پر مراد منتظمین ندوہ سے ہے جو نصاب میں تبدیلی پر کسی طرح تیار نہ تھے ۔
وجود اس کے کہ نصاب کی تبدیلی سالانہ جلسہ میں منظور کرلی گئی تھی) کی مخالفت اس کو بننے نہ دے گی اور ندوہ سے مراد
ندوہ کے در و دیوار نہ تھے بلکہ وہ حضرات تھے جو مذہبی علوم و فنون میں ماہر ہوں، اور مغربی علوم سے بھی آشنا ہوں تاکہ
ین کی برتری کا لوہا مغربی طرز پر بھی منوالیں اور مغربی تعلیم کے دل دادہ حضرات پر بھی اپنا سکہ جما ئیں ۔ یہی مشورہ
لانا کے احباب نے بھی دیا ۔ چنانچہ مولانا نے طے کیا کہ کچھ لوگوں کو ساتھ رکھیں اور تصنیف و تالیف میں ان کی تربیت کریں
ور ندوہ کے مثالی انسان، یعنی سید سلیمان جیسے اشخاص بنائیں جو نہ مغربی علوم و فنون سے مرعوب ہوں اور نہ اپنے
لوم و فنون سے شرمندہ ۔ اس سلسلہ میں مولوی ابوالکلام آزاد نے دو آدمیوں کو کلکتہ سے بھیجنے کا ارادہ کیا تھا ۔
ذا مولانا کو یہ بھی فکر تھی کہ ایسے اشخاص کے لئے انگریزی کا بھی انتظام کیا جائے ۔ چونکہ مولوی مسعود علی نے بڑے بڑے
مار کے مقابلے اور زبردست مخالفت کے باوجود طلبائے ندوہ کی مدد کی تھی اور اسٹرائک میں جان ڈال دی تھی
ر اسی وجہ سے ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں ندوہ کے معاملات سے دلچسپی پیدا کرادی تھی ۔ ان کا عزم و حوصلہ
نظامی صلاحیت اور مستقل مزاجی مولانا کے نزدیک مسرت کا باعث ہوئی ۔

مولانا اس بات کو بھی سمجھ گئے تھے کہ منتظمین ندوہ کی اگر مخالفت کی جائے تو مخالفین کچھ نہ کچھ اصلاح کی
شش کرتے ہیں اور بڑے بڑے لوگوں کو ندوہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور سالانہ جلسہ میں عوام کو بھی اکٹھا کر کے
ثریت کے بل بوتے پر اپنی تجاویز پاس کرالیتے ہیں جو مناسب نہیں ہوتیں، اور اگر مخالفت نہ ہو یا اس کا
ندیشہ نہ ہو تو پھر کمزوری چلی جاتی ہے اور جمود طاری رہتا ہے ۔

نواب علی حسن خاں کا خط نہ آنے سے مولانا ان دنوں فکرمند رہے، کیونکہ ان کو چند ضروری خطوط لکھے تھے ۔
ن ضروری مسودات کا انتظار بھی تھا، وہ بھی اب تک وصول نہیں ہوئے تھے ۔ پیارے صاحب کو بار بار
کہ رہے تھے، اگر وہ جواب نہ لکھ سکے تو مسعود علی کو لکھوا کہ وہ یاد دہانی کردیں ۔

سید سلیمان ندوی کو سیرت عائشہ رضی کے سلسلہ میں مسند عائشہ کی ضرورت تھی، مولانا کے پاس تھی، لہذا مولانا نے
د صاحب کو اسے دینے کا وعدہ کیا، اور سید صاحب کے استفسار کے جواب میں لکھا کہ طبقات ابن سعد میں زیادہ
واد نہ ملے گا ۔ بخاری، مسلم اور ابو داؤد میں خاصا مواد مل جائے گا، اور یہ کتابیں بمبئی کی کسی انجمن سے مل جائیں گی یا
وفیسر شیخ عبدالقادر اپنے وسیع تعلقات کی بنا پر حاصل کردیں گے ۔

ہ مکاتیب شبلی، حصہ دوم صفحہ ۱۱۱ ـــ ۱۱۲ ـــ ۳ر جولائی ۱۹۱۴ء ۔

سید صاحب کے ایک اور استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے مجتہدات کے متعلق سید صاحب کے نوٹ کو پڑھ کر بتایا جا سکتا ہے کہ اسی عنوان کے تحت مزید کیا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا نے فن درایت کی حضرت عائشہؓ کو موجد قرار دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس عنوان پر علم نقد اور اعتقادیات میں حضرت عائشہؓ کی خدمات کو مولانا نے بہت سراہا، اور سید صاحب کو توجہ دلائی کہ اس مجوزہ کتاب (سیرت عائشہؓ) کا خاکہ بنا کر مولانا کو بھیجیں تاکہ اس پر مولانا صحیح مشورہ دے سکیں۔ چونکہ سیرت عائشہؓ سے قبل اسلم جیراج پوری[1] نے سوانح عائشہؓ لکھی تھی، لہٰذا اس کو پڑھنے کا بھی مشورہ دیا تاکہ زیر تحریر کتاب اس سے ہٹ کر اور معلومات کے لحاظ سے بہتر ہو۔

مولوی حمید الدین فراہی کے خط کا ذکر سید صاحب کے خط مورخہ ۳ر جولائی ۱۹۱۴ء میں کرتے ہوئے مولانا نے لکھا کہ مولوی شیر علی صاحب کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرری کا حیدر آباد (دکن) میں یقین دلایا گیا ہے۔

مولانا چاہتے تھے کہ ندوہ کے طلبہ ملک کے مختلف مقامات میں پھیل جائیں تو مقاصد ندوہ کے لئے مفید ہو۔ تین یا چار مہینے کے لئے مولانا، سید سلیمان کی ضرورت محسوس کر رہے تھے[2] اور سید صاحب کے لئے مختلف کوششوں میں مصروف تھے۔ ندوہ کے انتظامی جلسہ میں سالانہ جلسہ کی تاریخوں کا تعین ہونے والا تھا، اس لئے مولوی معین الدین ندوی کو لکھا کہ تار پر اس کی اطلاع دیں۔ مولوی مسعود علی، مولانا پر زور دے رہے تھے کہ وہ ندوہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے آئیں، اور مولانا کا خود بھی خیال تھا کہ لکھنؤ آئیں، مگر اس بات کا اندیشہ تھا کہ مزاج کے خلاف باتوں سے سکون میں فرق آئے گا، اور اب مولانا میں برداشت کی طاقت نہیں رہی تھی، پھر اب تو اپنے کو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وقف کر دیا تھا، اس لئے دنیوی جھگڑوں میں پڑنے سے اور بھی پرہیز کر رہے تھے۔

ایران[3] کا خاتم الخطاطین احمد تبریزی نام کا ایک شخص تھا، آغا خاں اول کے بھائی نے اس کو ایران سے بلوا کر حمائل شریف لکھوائی تھی۔ اول سے آخر تک مطلا تھی یعنی ہر سطر پر طلائی لکڑے تھے اور تقطیع نہایت موزوں تھی۔ یہ حمائل مولانا نے ۲۵ جولائی کو دو سو پچاس روپیہ نذرانہ دے کر لے لی۔ اگرچہ کل ۲۴ برس کی لکھی ہوئی تھی، لیکن اس کی اہمیت کی وجہ سے مولانا نے گراں قیمت دے کر لینا پسند کیا۔

---

[1] جیراج پور، مولانا کے آبائی وطن "بندول" سے شمال مغرب میں دو یا تین میل پر واقع ہے۔
[2] مولوی معین الدین ندوی کے نام صفحہ ۱۶۲۔ جلد ۲۔ ۴ر جولائی ۱۹۱۴ء
[3] شروانی کے نام ۔ ۶ر جولائی ۱۹۱۴ء صفحہ ۲۱۱ حصہ اول۔

سید صاحب کو متوجہ کیا کہ ترمذی میں اکثر مسائل میں حضرت عائشہؓ کے اجتہادی مسائل کی تصریح ہے لہٰذا ان کو الگ یکجا جمع کر لینا چاہئے۔ مولانا کے پاس سید صاحب کی لکھی ہوئی ایک فہرست تھی جس میں حضرت عائشہؓ کی معلومات تھیں، مولانا نے توجہ دلائی کہ ان پر جو اعتراضات ہیں ان کے تفصیلی جوابات کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا نے خواہش کی کہ سید صاحب، کا جمع کیا ہوا مواد اگر اجمالاً ہی پیش نظر ہو تو کچھ اضافہ کے لئے مشورہ دے سکیں۔[1] عائل شریف دو سو پچاس (۲۵۰) پر ہدیہ لینے کی سید صاحب کو بھی اطلاع دی۔

اگرچہ مولانا کی اب دنیوی جھگڑوں سے خاصا دور رہنے کی کوشش تھی، پھر بھی کبھی کبھی ندوہ سے دلچسپی کا اظہار کرتے تھے، چنانچہ کچھ ترمیمات نواب علی حسن خاں صاحب کو لکھ کر بھیجی تھیں، ان کے متعلق ان سے دریافت کیا کہ اس پر کیا کیا گیا۔ ندوہ کے سلسلہ میں اصلاحی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ندوہ والوں نے اپنے قواعد اخبارات میں شائع کر دیئے۔ مولانا اس وقت کی کمیٹی اور ارکان کو باضابطہ خیال کرتے تھے اور اس کو باضابطگی کی وجہ سے قائم رکھنے کے حق میں تھے۔ ہاں، ایک بے ضابطگی ضرور ہو گئی تھی اور مولانا اسی کے مخالف تھے، اور وہ بے ضابطگی یہ تھی کہ ارکان کی (۳۵) ممبروں کے بجائے (۵۱) تعداد کر دی گئی اور (۱۵) ممبر فوری طور پر منتخب کر لئے گئے۔ چونکہ وہ ایک خاص پارٹی کے تھے اس لئے اس پارٹی کی اکثریت قائم ہو گئی، لہٰذا ممبروں کی جگہ خالی ہوتے پر جدید قاعدہ کے موافق ان کی جگہ نئے ممبر اکثریت کے بل بوتے پر منتخب ہونے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ کارروائیاں یک طرفہ ہونے لگیں اور قواعد کی رو سے اس اکثریت کا کوئی علاج نہ تھا۔ پیرزادہ صاحب کے دستور العمل میں کسی حد تک اس کا علاج تھا، مگر نواب علی حسن صاحب کی طرف سے اس پر کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ نواب صاحب کو اپنا دستور العمل غور اور مشورہ کے بعد شائع کرنا چاہئے اور اخبارات کو بھی توجہ دلانے کی ضرورت پر زور دیا۔[2] ندوہ نے چونکہ دستور العمل کا ایک جز شائع کیا تھا اس لئے اس کے پورے چھپنے کے انتظار میں مولانا نے اپنی رائے دینے سے پرہیز کیا، مگر اتنا خیال ضرور ظاہر کیا کہ قومی قوت پر جدید دستور العمل سے ضرب لگتی ہے، اس لئے کہ چند ارکان کے ہاتھ میں اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔ اصل چیز کلی امور، ممبران کا تقرر، ناظم کا تقرر ہیں جو قوم کے ہاتھ میں ہونا چاہئیں اور یہی اختیارات قوم سے چھین لئے گئے ہیں۔ نواب صاحب کو مشورہ دیا کہ مولانا ابو الکلام آزاد کو بھی اس بارے میں لکھیں۔

اسی زمانے میں سید نظیر الحسن نے مولانا کو اطلاع دی کہ وہ حضرت امام حسنؓ کے حالات لکھ رہے ہیں اس پر مولانا نے[3]

---

[1] سید صاحب کے نام مکاتیب دوم صفحہ ۱۱۲ — ۶ر جولائی ۱۹۱۲ء۔

[2] نواب علی حسن کے نام مکاتیب دوم۔ صفحہ ۱۷۶ تا ۱۷۷ — ۱۶ر جولائی ۱۹۱۲ء۔

[3] مکاتیب شبلی، اول صفحہ ۲۰۸ — ۱۲ر جولائی ۱۹۱۲ء۔ نظیر الحسن کے نام۔

جواب دیا کہ مواد کے ملنے کی امید ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کام میں اجر ضرور ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی لکھی جائے، اس لئے کہ حضرت علیؓ پر کوئی جامع تصنیف نہیں۔ دوسرے یہ کہ جنگی کارناموں کے علاوہ حضرت علیؓ علمی کارنامے بہت ہیں۔ مولانا نے یہ بھی لکھا کہ اکثر اہل سنت حضرتؓ کے فضائل سے واقف نہیں، اور یہ بھی خیا پھیلا ہوا ہے کہ حضرت علیؓ کے سیاسی اصول کامیاب نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا اس خیال کو دور کرنا چاہیے، اور عربی سے موصوف واقف ہوں تو مولانا اس تصنیف میں مدد دینے کو تیار ہیں۔ مولانا نے ایک بڑی دلچسپ لکھی کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں ''میں سنی اور حضرت علیؓ کے بارے میں شیعہ ہوں''۔ مراد یہ تھی کہ عقائد میں وہ کس فضیلت و بزرگی کو کم سمجھنے کو تیار نہ تھے۔ مشرق[1] گورکھپور میں ایک صاحب نے مولانا کے خلاف اعتراضات کا سل شروع کیا تھا، اس کے جواب میں سید صاحب نے مضمون لکھا تھا، اس کو مولانا نے پسند کیا، مگر ایک غلطی کی طر اشارہ کیا کہ اس کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ مولانا نے ایک موقع پر (۶۰۰) چندہ دیا تھا، او غلطی سے (۶۰۰۰) چھپ گیا تھا، اگر یہ غلطی باقی رہ جاتی تو پورا مضمون مبالغہ آمیز ہو جاتا، لہٰذا اس کی اصلا مشورہ دیا، اور اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ ممکن ہے کہ یہ خود مشرق کا تصرف ہو۔

مولانا[2] چاہتے تھے کہ دونوں دستور العملوں کو سامنے رکھ کر مقابلہ کیا جائے اور نقص کے وجوہ بتلائے ج اصلاحی کمیٹی سے زیادہ امید نہیں تھی، کیوں کہ وہ اتنا بھی نہ کر سکی کہ اپنا مسودہ شائع کرتی۔ نواب علی حسن خاں ممبروں کو تار پر تار دیتے رہے مگر جواب نہ ملا۔ ۷ / جولائی کو مخالف پارٹی کا جلسہ ہونے کی اط سید صاحب کو دی اور لکھا کہ جو کچھ طے ہو گا شائع کیا جائے گا۔ مخالف پارٹی نے اپنے مسودہ میں بیلک مداخلت کا حق بھی ختم کر دیا۔ مثلاً نظامت کے انتخابات میں جلسۂ عام کی منظوری یہ جلسۂ عام کی کوئی اہمیت ممبروں میں بھی (۳۵) آدمیوں سے کورم پورا کرا لیا جانا طے ہو گیا۔ سب سے اہم بات یہ تھی جس پر اصلاحی کمیٹی نگاہ بھی نہ پڑی کہ جو پارٹی جولائی میں منتخب ہوئی وہ بے قاعدہ تھی، کیوں کہ ان ممبروں نے منتخب کی جن کی میع دو ماہ قبل ختم ہو چکی تھی، وہ ویسے کے ویسے قائم رہے اور وہی لوگ جدید ممبروں کا انتخاب کرنے والے نتیجہ یہ کہ ارکان کی نوعیت ہمیشہ وہی باقی رہی۔ مخالفین میں ضابطہ اور قاعدہ کی پابندی نہیں، اور قانون اور قاعدہ کو نہ کوئی پڑھنے والا، اور نہ قانونی حیثیت سے اعتراض کرنے والا، سب لفاظی ہیں، بر اصل ضابطہ سے واسطہ نہیں۔ ابو الکلام نے تار سے اطلاع دی کہ سید صاحب ہی لکھ کر بھیج دیں، ان کا لکھنے میں نہیں لگتی۔ لہٰذا سید صاحب کو اطلاع دی کہ وہی آرٹیکل لکھ کر وکیل امرتسر میں چھپنے کو بھیج دیں

---

[1] سید صاحب کے نام صفحہ ۱۱۳ جلد دوم۔ ۱۵ / جولائی ۱۹۱۳ء بمبئی سے۔
[2] ″ ″ ″ ۱۱۲ - ۱۱۴ / ۱۱۳ - ۱۶ / ″

یہ لکھنے کی ضرورت ہے کہ اصلاح کے لئے جو ذرائع ممکن تھے وہ بھی مسودہ دستور العمل سے ناممکن ہو گئے کیونکہ
نے والی کمیٹی باوجود بے قاعدگی کے باقی رہی، جلسۂ عام کا کوئی حق نہیں رہا، اور ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے
رات لامحدود کر دیئے گئے۔ ایک دلچسپ بات کی طرف مولانا نے توجہ دلائی کہ مخالفین کے دستور العمل میں ہے کہ
ندوۃ العلماء مشاہیر علماء میں سے ہو۔ چونکہ مولوی خلیل الرحمن سہارن پوری اس زمانے میں ناظم ندوۃ العلماء تھے،
مطلب یہ ہوا کہ مولوی صاحب موصوف مشاہیر علماء میں سے ہیں تو یہ تصور خود ان کا اپنا ہے، یا واقعی وہ
علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا نے ماسٹر دین محمد کے بمبئی پہنچنے کی اطلاع بھی سید صاحب کو دی۔ ندوہ کے
لعمل اور وہاں کی اندرونی خرابیوں پر پوری توجہ کے باوجود مولانا سیرتؐ کے کام میں مصروف تھے۔
شاید شروانی صاحبؒ کو لکھا کہ سیرتؐ کو مکمل کرنے کے لئے خاموشی اور سکوت درکار تھا اور وہ بمبئی میں
تھا اس لئے کہ دن بھر لوگوں کی آمد و رفت بالکل نہ تھی۔ یہ بھی ارادہ تھا کہ جلد اول مکمل کر کے بمبئی سے
ہوں۔ چونکہ ہمہ تن سیرتؐ میں مصروف تھے اس لئے تاریخی اور تحقیقی راز افشا ہو رہے تھے اور مشکلات
تی جا رہی تھیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ جب شروانی صاحب سے ملاقات ہو تو سیرتؐ کا تیار مسودہ دکھلائیں۔
ن مولانا نے خوش نویس کو بمبئی بلوا لیا تھا، لیکن کسی رکاوٹ کی وجہ سے مسودہ مطبع میں نہ جا سکا۔ غالباً یہ رکاوٹ
ل سرکار کی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ مسودہ کو کوئی مستند عالم دیکھ لے کیوں کہ ان کو یہ سمجھایا گیا تھا کہ مولانا کی
رہ حا سیرتؐ میں بہت سی غلطیاں ہیں، اور اس سلسلہ میں جو مالی امداد دی جا رہی ہے اس سب کے ضائع ہونے اور
بھوپال سرکار کی بدنامی کا اندیشہ ہے کہ ایسے کی سرپرستی کیوں کی گئی جو بدنامی کا سبب بنا۔ ریاست پر مختلف
ے زیادہ دباؤ ڈلوایا جا رہا تھا کہ سیرت چھپنے نہ پائے، اس لئے کہ اگر چھپ گئی تو مولانا کی قدر و منزلت اور
ما ئے گی۔ حبِ علیؓ نہیں بلکہ بغضِ معاویہؓ کی کتنی اچھی مثال تھی۔ مولوی مسعود علی ندوی اس زمانے میں بےکار تھے،
ہی ان کی بے شغلی سے متفکر تھے، لہذا مولانا نے مولوی مسعود علی کے پچھلے خط کا حوالہ دے کر دریافت کیا کہ وہ جو
وع کرنے والے تھے وہ کیا تھا۔ قاری عبدالولی صاحب ان دنوں پریس کی مشین خریدنے بمبئی گئے تھے، مولانا کو
ہوا کہ اگر ایک ماہنامہ جاری ہو جائے تو بہتر ہے، اس لئے کہ علمی معیار پست ہو رہا تھا، اور انگریزی تعلیم بھی
ہوتی جا رہی تھی۔ دارالعلوم ندوہ کے اختلافات کو اصلاح کی خاطر اونچے ہاتھوں میں جانے کو
ں سمجھتے تھے کیوں کہ نہ لوگوں کو دلچسپی تھی نہ فرصت۔ اب مولانا کی کوشش یہ تھی کہ دارالمصنفین کے قیام کا
مت ہو جاتا تو بہتر تھا۔ اس کے لئے راجہ صاحب محمود آباد کے توسط سے امام باڑہ شاہ نجف لکھنؤ کے قریب

وانی کے نام صفحہ ۲۱۱ — ۲۱۳ جلد اول — ۶ ارجولائی ۱۹۱۴ء بمبئی سے۔
عود علی کے نام صفحہ ۱۲۸ — ۱۲۹ جلد ۲۔ بمبئی سے — ۸ ارجولائی ۱۹۱۴ء۔

لینے کا ارادہ کر رہے تھے اور اس کا منتظم مولوی مسعود علی ندوی کو بنانا چاہتے تھے۔ تزئین کے طے پر ہوا تھا کا ارادہ تھا کہ
وع میں مختصر پھوس کا بنگلہ اور چھپر کے کمرے بنوا لیے جائیں، بعد کو تو حسب ضرورت توسیع ہوتی رہے گی۔
بنگلہ کے قیام میں صحت بھی بہتر رہنے کا امکان تھا۔ اس زمانے میں دو کاتب سیرتؐ کے مسودہ کی نقل میں
مصروف تھے۔ مولانا نے ۱۸ر جولائی ۱۹۱۴ء کو ابن تیمیہ کی منہاج السنۃ پڑھی تو اس میں جواہر خمسہ کی صراحت
تھی، مولانا کو اگرچہ معلوم تھی مگر بھول گئے تھے، لہٰذا سید صاحب کے قبل کے ایک استفسار کا جواب دیا اور
تھا کہ شیخ عبدالقادر (پروفیسر) کو بھی بنا دیا جائے۔ مولانا کا شروع سے یہ خیال تھا کہ کام کرنے والے
بس دو آدمی ہوتے ہیں اور باقی لوگ برائے نام ہوتے ہیں۔ پہلی چیز وہ ندوہ کے سلسلہ میں سمجھتے تھے،
چنانچہ مولوی مسعود علی ندوی صاحب کو مشورہ دیتے ہیں کہ اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں جس قدر رائیں آگئیں تھیں
اب علی حسن خاں کو چاہئے تھا کہ ارکان لکھنؤ سے مل کر ان کی رائیں لکھوا لیتے، اگر وہ نہ لکھتے تو خود رایوں کا
خلاصہ لکھتے اور اس کے مطابق دستور العمل کو درست کر کے اخباروں میں بھیج دیتے اور وہ اصولی امور
بتا دیئے جاتے جو ندوہ کے دستور العمل کے خلاف تھے۔ اگرچہ یہ نہ ہو سکا، پھر بھی نواب صاحب سے کہہ کر
دونوں دستور العملوں میں جو اہم اصولی اختلاف ہوں ان کو اخبارات میں شائع کر دیں اور ارکان کا متفق علیہ
دستور العمل خود شائع کر دیں، اور اگر دلی جانے کی ضرورت پیش آئے تو فوراً چلے جائیں، کیونکہ
نقصان شریعت میں زیادہ کام ہونے کی امید نہیں۔ اس زمانے میں عبدالباری (ندوی) کے لئے بھی ایک
بھیجا تھا، اس کی رسید مانگی۔

اسی زمانے میں سید سلیمان ندوی حیات مالکؒ لکھ رہے تھے اس کے متعلق مولانا نے لکھا کہ امام مالکؒ کے
اجتہادیات پر کیا کیا لکھا گیا۔ اجتہادیات پر موطا کی شرح زرقانی بڑی مفید ہے، بمبئی میں ملتی تھی لیکن
ان خاص تھی۔ اس زمانے میں مولانا کو حمید الدین فراہی نے اطلاع دی کہ سید علی زینبی امروہی مدرس ادب
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا تقرر عثمانیہ کالج حیدر آباد (دکن) میں ہو گیا، اور مولوی شیر علی کا تقرر ہو گیا
ہو چکا تھا۔ ایک دو جگہ اور خالی تھیں، ان کے لئے مولانا نے سید صاحب سے دریافت کیا کہ کس کے لئے
تحریک کی جائے۔ دینی زبان سید صاحب سے بھی دریافت کیا کہ کہیں ان کا ارادہ تو نہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ
یہ بھی لکھا کہ وہاں کے مصارف بہت ہیں، فائدہ کم اور علمی مذاق ختم ہونے کا اندیشہ۔

سید صاحب کے نام صفحہ ۱۱۴–۱۱۵ جلد ۲ – ۵ر جولائی ۱۹۱۴ء بمبئی سے۔
مولوی مسعود علی کے نام صفحہ ۱۲۷–۱۲۸–۳ – ۱۲ر جولائی ۱۹۱۴ء۔
سید صاحب کے نام۔ صفحہ ۱۱۵ جلد ۲ – ۲۵ر ،، ،، ،،۔

مولوی مسعود علی ندوی چاہتے تھے کہ دارالمصنفین ندوہ میں قائم ہو۔ مولانا بہت پہلے سے یہی چاہتے تھے مگر ندوہ کے ارباب اقتدار مولانا کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھتے تھے، لہذا مولانا کے لئے رکاوٹیں پیدا کرتے تھے۔ ندوہ میں دارالمصنفین کے قیام کی خواہش کا اظہار مولوی مسعود علی سے کرتے ہوئے لکھا کہ اگرچہ ندوہ والوں کا اس میں فائدہ ہے، مگر قائم نہ کرنے دیں گے۔ چونکہ قاری عبدالولی بمبئی جاکر پریس کی مشین کے لئے بات پکی کر آئے تھے بلکہ پیشگی رقم بھی دے آئے تھے، اس لئے مولانا کا خیال تھا کہ علمی رسالہ کا اجرا ہو سکتا ہے اور امید تھی کہ وقت پر اس کا نکلنا آسان رہے گا۔[1]

مولانا کے پاس جہاں آرا بیگم کی تصنیف مونس الارواح (قلمی) اور عالمگیر کا فرمان تھے، ان کو لوہے کے صندوق میں رکھ کر منشی محمد علی کے پاس رکھوا دیا تھا۔ مولوی مسعود علی سے خواہش کی کہ وہ ان کو اپنی نگرانی میں نواب علی حسن خاں کے پاس کسی محفوظ جگہ رکھوا دیں اور آئندہ پھر لکھا جائے گا کہ کہاں بھیجی جائیں۔[2]

اب مولانا کو سیرت النبیؐ کی فکر تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کوئی عالم اس کو دیکھ لے تاکہ اس کے خلاف جو پروپگنڈا ہو رہا تھا اس کی قلعی کھل جائے لیکن پروپگینڈا اتنا منظم تھا کہ کسی عالم کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ دیکھنے ہی کی حامی بھرے۔ پھر بھی مولانا نے سیرتؐ کا مسودہ مولانا عبیداللہ سندھی ناظم دائرۃ المعارف القرآنیہ دہلی کو بھیج دیا کہ وہ دیوبند لے کر جائیں اور شیخ الہند محمود حسن کو دکھلائیں۔ مگر دیوبند کے علماء کو بھوپال سے پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی، لہذا انھوں نے شیخ الہند محمود حسن کو مسودہ دیکھنے سے باز رکھا۔ مولانا کو بڑا اعتماد تھا کہ اگر شیخ الہند مسودہ کو دیکھتے تو وہ غیر جانب داری اور دیانت داری سے رائے دیتے، اور غیر جانب دار اور دیانت دار کی رائے ہی مفید ہو سکتی تھی۔ ایک چیز اور بھی تھی کہ شیخ الہند اپنی ایک الگ رائے رکھتے تھے اور دوسروں کی رائے سے کم متاثر ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر علماء نے مولانا عبیداللہ سندھی کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا، مگر شیخ الہند نہ صرف فتویٰ بازی سے الگ رہے بلکہ مولانا مرحوم نے مولانا سندھی سے تعلقات بھی قائم رکھے، لیکن مولانا کی کوشش بہرحال بے کار گئی اور کسی عالم کی رائے نہ حاصل کی جا سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا شبلی اور سیرت النبیؐ کے خلاف علماء کا پروپگنڈا کام کر گیا، لہذا مولانا کو فکر ہوئی کہ جب شیخ الہند نے مسودہ دیکھنے کی ہمت نہ کی تو کوئی دوسرا عالم کہاں سے ہمت کرے گا، اور اگر ہمت کی بھی تو علماء کے زمرے سے خارج ہوتا پڑے گا، اور ایسی صورت میں بھوپال سے وظیفہ بند ہو جائے گا تو کیوں نہ اس وظیفہ سے خود ہی دست بردار ہو جائیں، اور خود ہی کش مکش سے نجات پا جائیں اور مسودہ کو

[1] مسعود علی کے نام صفحہ ۹۲ جلد دوم ۲۹ر جولائی ۱۹۱۴ء بمبئی سے۔

[2] زبیری کے نام صفحہ ۲۵۹ گ ۲۶۵ جلد اول ۲۸ر ۲۷ر ۱۲۹ " " "

مطبع بھیج دیں تاکہ چھپ جائے، اور چونکہ اپنے طور پر چھپواتے اس لئے بھوپال سرکار کی بدنامی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نہ گیا مولانا کی بدنامی تو جو بدنامی ہونا تھی وہ ہو چکی تھی، یعنی کفر کا فتویٰ مل چکا تھا، بلکہ اس کا زیادہ امکان تھا کہ سیرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھپنے کی نیک نامی سے بدنامی ہلکی ہو جائے۔ اگرچہ قدر تو اس کے پڑھتے جانے کے بعد ہی ہوتی۔ مولانا نے منشی محمد امین زبیری کے ذریعہ سرکار بھوپال سے چاہا کہ یا تو صوبے سے رقم بند کر دی جائے یا وہ رقم دار المصنفین کے نام سے کر دی جائے، یا جیسی مرضی ہو۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ مولانا بجائے دل شکستہ ہونے کے کام کرنے پر اور زیادہ مستعد ہو گئے تھے اور مصارف کو خود ہی برداشت کرنے کی ٹھان لی تھی! اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مولانا کی علمی کاموں میں محنت اور سیرت النبیؐ لکھنے کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی کہ اگر کسی مسلم ریاست میں وظیفہ کی تحریک کی جاتی تو مالی امداد مل سکتی تھی۔ بہرحال مولانا کشمکش سے جلد نکلنا چاہتے تھے، اس لئے بھوپال کے فیصلہ کے جلد منتظر تھے تاکہ آمدنی کی کمی کے لحاظ سے خرچ میں کمی شروع کر دیتے۔

امام مالکؒ[1] کی فقہ کے سلسلہ میں سید صاحب کو ہدایت کی کہ "بدایۃ المجتہد از ابن رشد" اور "احکام القرآن از ابوبکر عربی" منگوا کر پڑھیں۔ ان کتابوں سے بڑی مدد ملنے کی امید تھی، اور یہ بھی مشورہ دیا کہ امام ابن تیمیہؒ کی سوانح عمری لکھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا اس زمانے میں ابن تیمیہ سے بہت متاثر تھے اور امام رازیؒ اور امام غزالیؒ سے بڑھ کر سمجھتے تھے، ان کی تصنیفات میں نئی نئی چیزیں پاتے تھے، چنانچہ ان کی تصنیفات کو بار بار پڑھنے پر زور دیا اور ابن تیمیہ کی یہ رائے بھی لکھی کہ اگر یہود و نصاریٰ تثلیث چھوڑ کر اپنے اصل مذہب پر قائم ہو جائیں اور اعمال حسنہ بجا لائیں تو اسلام ان کی اجازت دیتا ہے، مگر نتیجہ ذرا ہلکا نکالا ہے۔ اس دعویٰ پر قرآن مجید سے استدلال کیا ہے۔

مولاناؒ[2] کا خیال تھا کہ اگر شیخ الہند مولوی محمود الحسن مولانا کی لکھی ہوئی سیرتؐ کو دیکھتے تو تعریف کرتے، اس لئے کہ انھوں نے بڑی تحقیق و تدقیق سے لکھی تھی، مگر اس کا افسوس رہا کہ مخالفین نے ان کو دیکھنے پر آمادہ نہ ہونے دیا۔ بہرحال مولوی عبید اللہ سندھی کا مسودہ دیکھ لینا ہی غنیمت معلوم ہوا، اور سرکار بھوپال کو ان کی رائے بھیجنے کا ارادہ تھا۔ سرکار بھوپال کے مزید اطمینان کے لئے مولانا نے مولوی عبد اللہ ٹونکی کا نام تجویز کیا کہ اگر سرکار کو ان پر اعتماد ہو تو ان کی رائے بھی معلوم کر لی جائے، یا جیسا سرکار بھوپال کی مصلحت ہو، یا ان جھگڑوں کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔

ان ہی دنوں "الندوہ" نکلا، جس کی کتابت و طباعت مولانا کو پسند آئی۔ چونکہ مولوی مسعود علی ندوی بڑے منتظم تھے، اس لئے موصوف سے مولانا نے دریافت کیا کہ اگر وہ اتنی اچھی کتابت اور طباعت کا انتظام کر سکتے ہوں تو

---

۱ سید صاحب کے نام مکاتیب جلد ۲ صفحہ ۱۱۵–۱۱۶ — ۱۸؍جولائی ۱۹۱۴ء۔

۲ زبیری کے نام 〃 ۲۶۱؍۲ — ۲۹؍جولائی ۱۹۱۴ء۔

مسعود علی کے نام 〃 ۱۲۶ 〃 〃 〃 〃 (بقیہ کے لئے صفحہ ۷ ملاحظہ ہو)

ڈاکٹر سری رام شرما
مترجمہ مولوی غلام رسول

دکن اور دکنی کا آغاز

(بہ سلسلۂ گذشتہ)

دکھنی پر مرہٹی اور گجراتی کا اثر

دکھنی پر مقامی بولیوں کا اثر پڑا۔ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے دیوگری میں ہوئی۔ اس زمانے میں دیوگری مہاراشٹر کا پایہ تخت ہی نہ تھا بلکہ دیوگری کے قریب میں پیٹھن (پرتش ٹھان) علمی مرکز بھی تھا۔ مرہٹی آریائی زبان ہے۔ کھڑی بولی اور مرہٹی میں کئی باتوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ملک کافور اور محمد تغلق کے زمانے میں جو شمالی ہند کے خاندان دیوگری پہنچے وہ بڑے دھارے سے دور جا پڑے تھے۔ ساٹھ ستر برس میں انھوں نے اپنی زبانوں کے بڑے دھارے سے ہٹ کر جو عام بولی اختیار کی، اس کی تشکیل اسی عرصے میں متعین ہوئی۔ مرہٹی نے ان دنوں دکھنی پر جو اثر ڈالا وہ اٹ رہا۔ اورنگ زیب کے حملے کے وقت بڑی تعداد میں شمالی ہند کے باشندے دکن آئے۔ دیوگری کے قریب اورنگ آباد میں پھر ایک بار دکھنی اپنے اصلی دھارے سے جا ملی اور یہاں اس نے کئی نئے عناصر حاصل کئے۔

دولت آباد کے بعد شمالی ہند کے باشندے گلبرگہ پہنچے، وہاں بھی دکھنی کی نشو و نما ہوتی رہی۔ اس نے مرہٹی کے اثر کو محفوظ رکھا لیکن ورنگل کی خاندان کی زبان کنڑی سے اس نے قابل ذکر اثر قبول نہیں کیا۔ جب بیجاپور میں مسلم حکومت قائم ہوئی تو وہاں بڑے بڑے عہدوں پر مرہٹی زبان بولنے والے مقرر کئے گئے۔ اعلا درجے کے لوگوں میں مسلمانوں کے بعد مرہٹی زبان والوں کا شمار ہوتا تھا۔ بیجاپور کی سرکاری زبان بہت دنوں تک مرہٹی ہی رہی۔ اس تعلق سے بھی دکھنی میں مرہٹی اثر کو قائم رکھنے میں مدد ملی۔ مرہٹی آریائی زبان ہے، اس کے الفاظ کھڑی بولی میں آسانی سے گھل مل جاتے ہیں، لیکن نہ تو گلبرگہ اور بیجاپور میں اور نہ گول کنڈے ہی میں کنڑی اور تلگو کے الفاظ ادبی دکھنی میں جگہ پا سکے۔ پانچ دس الفاظ ہی ادبی دکھنی میں ان دونوں زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ بول چال کی دکھنی میں بیجاپور کے آس پاس کنڑی کے اور گول کنڈے کے قرب و جوار میں تلگو کے کئی الفاظ ضرور استعمال ہوتے ہیں۔

الفاظ کے تعلق سے مذکورہ بالا اصول کے مدنظر دکھنی لہجہ اور تلفظ علاقائی زبانوں سے دور نہ رہ سکی! اونگ آباد یہ دکھنی بولنے کا ڈھنگ، حروفِ علت کا اتار چڑھاؤ، ہائیہ اور غیر ہائیہ تلفظ، جملے میں لفظوں کی حالت کو ظاہر کرنے والی لے دہلی سے جتا نہ اسی طرح کرناٹک میں کنڑی اور آندھرا میں تلگو کا اثر دکھائی ۔۔۔۔۔۔ دیتا ہے تلگو، مرہٹی اور کنڑی کا تلفظ جس ڈھنگ سے خاص علاقے کے مطابق تبدیل ہوتا ہے اسی طرز سے دکھنی کا تلفظ بدلتا ہے۔ حیدرآباد میں دکھنی بولنے کا جو ڈھنگ ہے وہ سو میل دور کرنول میں نہیں ہے۔ اسی طرح بیجاپور اور گلبرگے کے تلفظ میں بہت فرق ہے۔ تلفظ کے تعلق سے ان تبدیلیوں کی تحقیق دکھنی ہی کے لئے نہیں علاقائی زبانوں کے واسطے بھی اہم ہے۔

مرہٹی کے بعد دکھنی پر گجراتی کا اثر قابل ذکر ہے مغلوں نے سنہ ۱۶۰۱ء میں گجرات پر قبضہ کرلیا۔ وہاں کے علماء خاندانی اشخاص یعنے شرفا بیجاپور چلے آئے۔ ان میں کئی صوفی بزرگ تھے پندرھویں اور سولھویں صدی میں احمدآباد صوفیوں کا مشہور مرکز تھا۔ وہاں جو کچھ غور و فکر ہوا، اس کا بہترین حصہ بیجاپور کو آسانی سے مل گیا یہاں کے روحانی علوم پہلے بیجاپور پھر گولکنڈے کو سہولت کے ساتھ مل گئے۔ گجرات سے منتقل ہونے والوں کے باعث بیجاپور ہی کی نہیں گولکنڈے کی دکھنی میں بھی گجراتی کے بعض الفاظ استعمال ہونے لگے۔

میواتی - ہریانی - برج - اودھی وغیرہ

کھڑی بولی جہاں بولی جاتی ہے اس علاقے کے آس پاس میواتی ہریانی، پنجابی اور برج بھی بولی جاتی ہے ان زبانوں کے اثرات دکھنی میں آج بھی موجود ہیں۔ کھڑی بولی پر پوربی بولیوں کا اثر بہت کم ہے، مگر دکھنی اس باب میں کھڑی بولی کی تقلید نہیں کرتی۔ لفظوں کی جمع، فعل، ماضی، فعل کی تانیثی شکلیں اور متعلقات فعل پر راجستانی کا اثر مسلم ہے یہ قابل ذکر بات ہے کہ راجستھانی، نیپال اور ہمالیہ کے دوسرے دامنوں میں اپنے خاص دھارے سے ہٹ کر جو روپ اختیار کرتی ہے، اس کی کچھ جھلک دکھنی میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ یک رنگی اور یکسانیت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ جب کوئی زبان اپنے بڑے دھارے سے جدا ہوتی ہے اور دو الگ الگ سمتوں میں بٹ جاتی ہے اس کے کچھ نقائص دونوں میں یکساں رہتے ہیں۔ شمال میں (نیپال) اور اس کے بالکل برعکس جنوب میں گولکنڈے کی دکھنی میں راجستھان کے لفظی اشکال میں کئی مقامات پر حیرت انگیز یک رنگی ہے۔ اثر کے لحاظ سے راجستھان کے بعد پنجابی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ دکھنی میں راجستھانی اور برج کے مانند (آ) پر ختم ہونے والی صفتوں اور فعلوں کو (او) پر ختم کرنے کا رجحان نہیں ہے۔ اس بات میں کھڑی بولی اور پنجابی میں یکسانیت ہے۔

مغربی ہندی ـــ کھڑی بولی ـــ سے تشکیل پائی لیکن اس کے باوجود دکھنی نے پوربی کی بولیوں سے اپنا تعلق قائم رکھا۔ کھڑی بولی نے اس قسم کا کوئی تعلق پوربی بولیوں سے کبھی رکھا یا نہیں؟ اس کے بارے میں کافی مثالیں

نہیں ملتیں۔ افعال کے تعلقوں کے علاوہ دوسری باتوں میں دکھنی نے پوربی بولیوں کے اثر کو محفوظ رکھا ہے۔ جہاں تک اودھی کا سوال ہے، اس کے اثر کا بڑا سبب یہ ہے کہ سولھویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں اودھی شمالی ہند کی ادبی اور فکری زبان تھی، اسی لئے صوفیوں نے اسے شاعری میں ذریعہ اظہار بنایا۔ جائسی کی پدماوت کے ساتھ اودھی کی وہ خصوصیت ختم نہیں ہوئی۔ اودھ صوفیوں کا مرکز تھا اور اودھی میں صوفیائے کرام نے کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ دکھن میں آنے والے کئی علما اور صوفی بزرگ اودھی کے اس ادب سے متعارف تھے۔ دکھنی میں پدماوت اور اودھی کی دوسری مثنویوں کے تراجم اس اثر کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس زمانے میں لوک بھاشا، یعنی عوامی زبان کے تعلق سے اودھی کا جو عوامی ادب تھا اس سے بھی دکھن کے کچھ مصنف واقف تھے۔ اودھی کے عوامی ادب میں ہر دل عزیز اور مقبول قصہ "چُن چپ داین" "یا چندا لورک" کا قصہ دکھنی میں بھی لکھا گیا اور عوام نے اس کی تعریف کی۔

پوربی بولیوں کا اثر دکھنی پر پڑا اس کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مسلم عہد میں دلّی سے ہٹ کر جہاں جہاں آزاد مسلم حکومتیں قائم ہوئیں، دلّی نے موقع آنے پر ان کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ جب کبھی ایسے مقاموں پر مرکزی سرکار کے مقابلے میں علاقائی حکمران شکست پاتا تھا، وہاں کے فوجی افسر، علما اور شرفا دلّی کی طرف اندرونی علاقے میں جاکر بیرونی علاقے میں جانا مناسب سمجھتے تھے۔ جب گجرات کے مسلم حکمرانوں کو زوال آیا تو وہاں کے معزز لوگ دلّی جانے کی بجائے بیجاپور اور گول کنڈہ پہنچے۔ اسی طرح جون پور اور پورب کے مسلم مرکزوں کے سقوط پر وہاں کے فوجی افسر اور علما قسمت آزمائی کے لئے پہلے گجرات پھر وہاں سے بیجاپور اور گول کنڈہ گئے ہوں گے۔ پورب میں جون پور مسلمانوں کا بڑا مرکز تھا۔ ودیاپتی جیسے مہاکوی یہاں کے ماحول سے متاثر ہوئے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مسلم فوج ایک مقام پر نہیں رہتی تھی۔ پورب میں رہنے کی وجہ سے وہاں کی زبان کا اثر انھوں نے قبول کیا ہوگا۔ تیسرا اور بڑا سبب یہ ہے کہ ہندی کے نرگن[1] دھارے کے تقریباً سبھی شعرا پورب کے تھے اور وہاں کی بولی بولتے تھے۔ ان کی شاعری میں پوربی بولیوں کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی تصانیف کا لسانیاتی مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ان کی زبان پر نہ تو پوربی بولیوں کا اثر ہے نہ گجراتی کا۔ اس کا ایک سبب یہی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے نوے برس دلّی میں

---

[1] ہندی شاعری میں بھکتی کال کے دو حصے ہیں (۱) نرگن دھارا (۲) سگُن دھارا۔ نرگن دھارا کے شعرا خدا کو واحد مانتے تھے، اس کی شکل و صورت پر کوئی اعتقاد نہ تھا۔ نرگن دھارا کی دو شکلیں ہیں، ایک گیان مارگ، دوسرا پریم مارگ۔ پریم مارگ کے پیرو سبھی شعرا مسلمان اور پورب کے رہنے والے تھے۔ اس مسلک پر صوفی خیالات کا بہت اثر ہے۔

گزارے تقصان ایام میں دلّی میں جو زبان بولی جاتی تھی اسی میں انھوں نے لکھا۔ شاہ میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم کی تصانیف پر مرہٹی اور گجراتی کے علاوہ برج بھاشا کا بھی اثر ہے۔ گول کنڈے کے وجہی راجستھانی سے متاثر ہیں۔ یہی حالت دوسرے شاعروں کی ہے لیکن ان بیرونی اثرات کے باوجود ایک بات نمایاں ہے کہ جلد ہی دکھنی کا ادبی معیار معین ہوگیا۔ تھوڑے بہت فرق سے بیجاپور اور گول کنڈے میں وہی انداز مستقل تھا۔ شاعروں اور مصنفین نے معیار کا خاص خیال رکھا۔

دکھنی کا علاقہ

بول چال کی دکھنی کے کئی روپ ملتے ہیں اس میں تلگو۔ مرہٹی اور کنڑی سے تعلق رکھنے والے ذیلی زبانوں کے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ بول چال کی دکھنی اور شمالی حد کی نسبت ڈاکٹر گریرسن نے لکھا ہے:۔

" گو کوئی معین سرحدی خط نہیں کھینچا جاسکتا، تاہم ست پڑے کے سلسلے اور ان سے متعلق پہاڑیوں کو معیاری ہندستانی اور دکھنی کی حد مان سکتے ہیں۔" (جی۔ اے گریرسن لنگوسٹک سروے آف انڈیا۔ جلد نہم ص ۲۱۲ ملاحظہ ہو)۔

گریرسن دکھنی کی جنوبی اور مغربی سرحد ساحل سمندر تک مانتے ہیں، اس لئے انھوں نے بمبئی اور مدراس کے باشندوں کے ذریعے مستعملہ دکھنی کی مثالیں دی ہیں۔

بول چال کی دکھنی کا استعمال وندھیاچل سے ساحل سمندر تک دو قسم کے لوگ کرتے ہیں:۔

(۱) ایسے خاندانوں کے لوگ جن کی مادری زبان ہندی ہے اور نسلوں سے دکھن میں رہتے ہیں۔

(۲) ایسے لوگ جن کی مادری زبانیں تلگو۔ تامل وغیرہ دکھنی زبانیں ہیں۔ اس کتاب کا مقصد بول چال کی دکھنی کی تحقیق کرنا نہیں ہے۔ معیاری دکھنی کی تحقیق کا خیال کرکے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ معیاری اور ادبی دکھنی کا علاقہ بیجاپور۔ گلبرگہ اور حیدرآباد تک محدود ہے۔ خاص وجوہ سے معینہ حد اورنگ آباد تک وسیع ہوئی۔ اس علاقے کے جو لوگ مادری زبان یا عام زبان کی صورت میں جس دکھنی کا استعمال کرتے ہیں اور یہاں کے ادب میں جس دکھنی کا استعمال کیا گیا ہے، اس کی مثالوں کی بنیاد پر یہ کتاب پیش کی جارہی ہے۔ بول چال کی دکھنی کا علاقہ بہت وسیع ہے اس وسیع علاقے کی مثالوں پر غور کرنا ممکن نہ تھا۔

دکھنی کی وجہ تسمیہ

قدیم مصنفین نے دکھنی کو "ہندی" لکھا ہے۔

(میراں جی شمس العشاق)

ہیں عربی بول کیرے	اور فارسی بہتیرے
یہ ہندی بولیں سب	اس ارتھوں کے سبب

سیے بھاکا بعل سو بولے — پن اس کے بھاوت کو لے
یے گرو مکو پند پایا — تو ایسے بول چلایا
ہے کوئی اچھے خاصے — اس بیان کے پاسے
وسے عربی بول نہ جانے — نا فارسی پچھانے
یے ان کوں وچن ہیت — سنت بوجھیں ریت
یے مرض میٹھا لاگے — تو کیوں من اُس تھے بھاگے[1]

(وجہی)

جتے فہم داراں، جتنے گُن کاراں سو آج تلک کوئی اس جہاں میں، ہندستان میں ہندی زبان سوں، اس لطافت چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر یوں نئیں بولیا . . .[2]

(بحری)

ہندی تو زبان ہے ہماری — کہنے نہ لگے ہمن کوں بھاری
ہور فارسی اس تے ات رسیلا — ہر حرف میں عشق ہے نہ حیلہ
ہر بول میں معرفت کی باتی — سیتا کی نہ رام کی کہانی[3]

"ہندی" اور "دہلوی" نام بھی دکھنی کے لئے استعمال ہوتے تھے۔

(عبدل)

سو یوں بچن سوں شاہ استادگان — پوچھیا جگت گُر شعر کہہ کس زبان
زبان ہندوی مج سوں ہور دہلوی — دجا نوں عرب ہور عجم مثنوی[4]

اورنگ زیب کے حملے کے وقت ہندی اور دکھنی کو الگ الگ بتلانے کی ضرورت پڑی اور اس کو دکھنی کہنے لگے۔ اس وقت سے کھڑی بولی کے اس خاص اسلوب کے لئے 'دکھنی' نام ہی استعمال ہوا ہے۔ دکھن کی بولی اور 'دکھنی' ناموں کا استعمال ابن نشاطی اور وجہی نے بھی کیا ہے۔

دکھن میں جو دکھنی مٹھی بات کا — ادا نئیں کیا کوئی اس دھات کا[5]
بساتیں جو حکایت فارسی ہے — محبت دیکھنے کی آرسی ہے

---

[1] میراں جی شمس العشاق "خوش نامہ"۔ [2] وجہی سب رس۔ [3] بحری۔ من لگن [4] عبدل۔ ابراہیم نامہ۔ [5] وجہی۔ قطب مشتری۔

وہاں مشکل عبادت کس کوں سمجھا — عبارت سب کسے وو نئیں سمجھا
تجے ہے فارسی میں دست گاہ آج — ذکر سے ترجمہ بھی کوئی تج باج
اُسے ہر کس کے تئیں سمجھا کونویں — دکھن کی بات سوں سریاں کوں کھولوں
کہ اس میں سربسر مل یار سوں یار — کرے سو ہے پست کا گرم بازار[1]

اس کتاب میں جن بڑے مصنفین اور شعرا کی تصانیف کو اساس بناکر مطالعہ کیا گیا ہے ۔ ان کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے :۔

(۱) حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (پیدایش ۳۲۱ھ وصال ۸۲۵ھ) اصلی نام سید محمد ابن سید عارف ۔ ان کے آبا و اجداد خراسان سے دلی آئے تیمور لنگ کے حملے کے وقت حضرت بندہ نوازؒ دلی چھوڑ کر گجرات چلے گئے، وہاں سے دلی واپس ہوئے ۔ نوے برس کی عمر میں تبلیغ دین کے لئے گلبرگہ پہنچے ۔ یہاں تو صال ہوگیا اپنے مذہب کی تعلیم و تلقین ہندی (دکھنی) میں کرتے تھے جسے ان کے مرید یں لکھ لیتے تھے ۔ ان کی لکھی ہوئی فارسی اور دکھنی کی کچھ کتابیں شائع ہوچکی ہیں ۔ "معراج العاشقین" کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔ میرے دوست اور رفیق جناب مبارز الدین رفعت لکچرر گورنمنٹ کالج گلبرگہ کو ان کے لکھے ہوئے سات رسالے دست یاب ہوئے ہیں ۔ رفعت صاحب نے حضرت بندہ نوازؒ کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف "شکار نامہ" کے کچھ حصے مجھے بھیجے تھے جن سے میں نے استفادہ کیا ہے ۔

(۲) شاہ میراں جی شمس العشاقؒ (وصال ۹۰۲ھ) مقام پیدایش مکہ معظمہ (حجاز) تبلیغ دین کے لئے ہندستان آئے اور بیجاپور پہنچے "خوش نامہ" اور "شہادت الحقیقت" ان کی تصانیف ہیں

(۳) شاہ برہان الدین جانم (ولادت ۹۳۳ھ وفات ۹۹۰ھ) شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کے فرزند بیجاپور میں پیدا ہوئے ۔ والد نے پڑھایا اور تصوف کی تعلیم و تلقین دی ۔ "وصیت الہادی" "ارشاد نامہ" کئی کتابوں کے مصنف ہیں ۔

(۴) محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ ۔ ۱۰۲۰ھ) گولکنڈے کے بادشاہ ابراہیم قطب شاہ کے بیٹے اور حیدرآباد کے بانی تھے، یہیں پیدا ہوئے اور یہیں انتقال کیا، صرف ایک تصنیف کلیات محمد قلی قطب شاہ موجود ہے ۔

(۵) وجہی نے ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ھ ۔ ۹۸۸ھ) کے زمانے میں تصنیف و تالیف شروع کی ۔ عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ ۔ ۱۰۸۳ھ) کے زمانے میں انتقال کیا ۔ عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر

---

[1] ابن نشاطی ۔ پھول بن صفحہ ۲۲ ۔

محمد قطب شاہ کے دربار میں بھی قابل احترام تھا۔ "سب رس" اس کی اہم تصنیف ہے یہ کتاب ۱۶۳۶ء میں ختم ہوئی۔
مثنوی قطب مشتری اس کی منظوم تصنیف ہے۔

(۶) غواصی (وفات ۱۶۵۰ء) محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ء - ۱۶۲۶ء) کی حکومت کے زمانے میں گولکنڈے میں موجود تھا۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ سیاس بھی تھا۔ گول کنڈے کا ایلچی بن کر بیجاپور گیا۔ "سیف الملوک و بدیع الجمال" "طوطی نامہ" اور کلیات اس کی اہم تصانیف ہیں۔

(۷) محمد امین ایاغی صوفی اور عابد تھے ان کی تصنیف "نجات نامہ" سے اس مقالے میں مدد لی گئی ہے۔
یہ کتاب ۱۶۴۲ء کی تصنیف ہے۔

(۸) نصرتی۔ اصلی نام محمد نصرت، تخلص نصرتی۔ بیجاپور میں پرورش ہوئی۔ محمد عادل (۱۶۲۶ء - ۱۶۵۶ء) علی عادل (ثانی) (۱۶۵۶ء - ۱۶۷۲ء) اور سکندر (۱۶۷۲ء - ۱۶۸۶ء) کے عہد حکومت میں درباری شاعر رہا ہے۔ علی عادل شاہ (ثانی) کی سرپرستی حاصل رہی۔ تین تصانیف موجود ہیں:۔
(۱) گلشن عشق (سال تصنیف ۱۶۵۸ء) (۲) علی نامہ (سال تصنیف ۱۶۶۶ء) (۳) تاریخ اسکندری (سال تصنیف ۱۶۷۰ء) ان کے علاوہ کچھ قصیدے بھی ملتے ہیں۔

(۹) علی عادل شاہ ثانی (۱۶۵۶ء - ۱۶۷۳ء) صرف ایک تصنیف "کلیات شاہی" ہے۔
یہ کلیات "علی عادل شاہ کا کاویہ سنگرہ" کے نام سے آگرہ یونیورسٹی نے شایع کیا ہے۔

(۱۰) ابن نشاطی۔ (۱۶۱۱ء - ۱۶۶۰ء) عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں گول کنڈے میں موجود تھا۔
آخری قطب شاہ ابوالحسن کے قریبی زمانے میں انتقال کر گیا، اہم تصنیف "پھول بن" ہے۔

(۱۱) قاضی محمود بحری۔ گوگی (ضلع گلبرگہ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۶۸۵ء میں بیجاپور گئے۔ اورنگ زیب کے حملے کے باعث بحری حیدرآباد پہنچے، سفر میں ان کی تمام تصانیف چوری چلی گئیں۔ حیدرآباد میں "من لگن" نامی کتاب لکھی ۱۷۰۰ء میں یہ کتاب اختتام کو پہنچی۔

(۱۲) وجدی۔ مقام سکونت کرنول (آندھرا) تین منظوم قصے لکھے:۔ (۱) تحفۂ عاشقاں (سال تصنیف ۱۷۰۶ء)
(۲) پنچھی نامہ (سال تصنیف ۱۷۱۹ء) (۳) باغ جاں فزا (سال تصنیف ۱۷۳۳ء)۔

(۱۳) ولی دکنی۔ پورا نام ولی محمد "ولی" تخلص ہے۔ احمد آباد میں مرید ہوئے اور تعلیم و تلقین حاصل کی۔ کچھ دنوں تک گجرات میں رہے۔ مقام سکونت اورنگ آباد ہے۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں دلی کا سفر کیا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں اورنگ آباد پر زبان سے متعلق جو اثر پڑا، ان کے کلام میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگ ان کا انتقال ۱۷۳۱ء میں مانتے ہیں اور کچھ لوگ ۱۷۴۳ء میں۔

[illegible] مقالے کے لئے حضرت خواجہ بندہ نوازؒ سے لے کر اورنگ زیب کی وفات تک لکھی ہوئی ایسی کتابوں کا انتخاب [illegible] ہے، جو زبان کے نقطۂ نظر سے اپنے زمانے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ تصانیف کرناٹک، مہاراشٹرا اور آندھرا میں مستعملہ دکھنی کی تشکیل کا تعارف کراتی ہیں۔ آج کل بھی بہت سے شاعر اور ادیب دکھنی میں لکھتے ہیں۔ شاعروں میں سلیمان خطیب اور افسانہ نگاروں میں پدم نابھن کی مثالیں لی گئی ہیں۔ سلیمان خطیب اور پدم نابھن کی نظمیں اور افسانے "دکھنی کا پدیے اور گدیے" میں شایع ہو چکی ہیں۔

موجودہ بول چال کی دکھنی کی حالت کے جاننے کے لئے ضعیف العمر خواتین سے مختلف کہانیاں اور گیت سنے گئے اور انھیں جوں کا توں لکھنے کی کوشش کی گئی۔ گیت اور کہانیوں کا انتخاب زیادہ تر حیدرآباد، گلبرگہ، بیجاپور اور کرنول میں کیا گیا ہے۔ ٹیپ ریکارڈ پر مختلف طبقوں اور عمروں کے مرد اور عورتوں کی بات چیت کی صدا بندی کی گئی اور ان صدابند آوازوں سے جہاں تہاں مدد لی گئی ہے۔

شعیب اعظمی

نہرو، نائڈو کی نگاہ میں

جواہر لال کی شخصیت گوناگوں خصوصیات کی حامل رہی ہے، ان کی مقبولیت اور محبوبیت کا اندازہ زندگی کے کسی ایک مخصوص گوشہ یا طبقہ میں، لگانا مشکل ہے ان پچھلے پچاس برسوں میں ہندوستان میں اتنی محبوب اور پرکشش شخصیت شاید مشکل ہی سے کوئی اور رہی ہو اس معاملہ میں، اپنے سے پچھلے اور ہمعصروں میں انھیں سب پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ وہ جہاں جاتے ایک خلقت امنڈ آتی۔ عوام کا بے پناہ ہجوم ان کو دیکھنے اور ان کے پاس پہنچنے کے لئے بے قرار رہتا کیا بچے، کیا بوڑھے اور جوان، عورتیں، مرد قطار اندر قطار، جوق در جوق جواہر لال کی دید کے لئے طول طویل سفر سے بھی گریز نہ کرتے اور جدھر سے وہ گزرنے والے ہوتے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ لوگ بھیڑ میں کچلتے، ڈنڈے کھاتے، گرمی اور سردی برداشت کرتے لیکن ان کو دیکھے بغیر مطمئن نہ ہوتے۔

جواہر لال کا خود یہی حال تھا کہ وہ عوام کے پاس پہنچنے کی کوشش کرتے۔ وہ بوڑھوں میں ایک معزز شخصیت، جوانوں میں ایک شوخ و شنگ اور امنگ سے بھرے ہوئے جوان اور بچوں کی دنیا میں ایک دوست اور شفیق بن جاتے۔ بچے انھیں بہت پیارے ہوتے۔ بچے ان کو اپنے بیچ پاکر پھولے نہ سماتے اور نہ جانے کتنی نیک تمنائیں اور مستقبل کی خوشیاں نہرو کی جھولی سے لے کر آتے، لیکن جواہر لال کی مقبولیت اور محبوبیت کا ایک اور گوشہ بھی ہے جہاں انھیں، نہ جانے کس کس روپ میں دیکھا اور جانا جاتا ہے، اور وہ طبقہ ہے صنف نازک کا۔ عورتوں کے لئے ان کی شخصیت، دیوتا، پیغمبر اور وقت کے عظیم انسان کی مانند ہے۔ کوئی انھیں اپنا بھائی سمجھتی، کوئی اپنا بزرگ اور کوئی ایک شوخ اور مسحور کن ہستی جس کے حسن، تقدس اور جاذبیت میں کھو کر وہ اپنے آپ کو بھی بھول بیٹھتیں۔

ان کے تعلقات بھی ایسے اور اتنے رہے ہیں کہ دنیا میں ایسے بے مثال لوگ کم ملیں گے جن کے جاننے والے اور جن سے خط و کتابت کرنے والے شاعر، ادیب، مفکر، فلسفی، مصلح، سیاست داں، سائنس داں، فن کار، کسان، مزدور اور دستکار اتنی بڑی تعداد رکھتے ہوں دنیا کا کوئی ملک اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں ان کا نام نہ سنا گیا ہو اور وہ جگہیں جو سیاست کا مرکز رہی ہیں، وہاں تو ان کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے وہ وہاں کے باشندے ہو گئے ہوں اس معاملہ میں جواہر لال ایشیا تو کیا دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

جواہر لال کی اس مقبولیت کا اندازہ ان کے مرتب کئے ہوئے چند پرانے خطوط کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا تعلق دنیا کے کس گوشہ میں نہیں ہے، اور وقت کا کون سا ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے جو ان کے سامنے

عصر جدید کے سربراہوں نے مشورہ اور حل کے لئے پیش کیا ہو۔ انھیں خطوط میں ہیں چند ایسے خطوط بھی ملتے ہیں جو عورتوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ یوں تو ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک کی خواتین کے خطوط بھی ان کے نام ہیں لیکن فی الحال ہم اس موضوع میں صرف ہندوستانی خواتین کے خطوط کا تذکرہ کریں گے۔ ان سے خط وکتابت کرنے والی ہندوستانی خواتین میں کرشنا کرپلانی۔ ارونا آصف علی۔ پورنیما بنرجی۔ امرتا شیرگل اور بلبل ہند سروجنی نائڈو کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب میں سروجنی نائیڈو ہی ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے متعدد اور دلچسپ خطوط ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ بقیہ دوسری خواتین کے خطوط ایک یا دو سے زائد نہیں ہیں جن میں نہرو کے لئے جذبۂ تقدیس واحترام کا عنصر بہ درجہ اتم نمایاں ہے۔

سروجنی نائیڈو اپنے وقت کی عظیم ترین ہندوستانی خواتین میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان کا خاندان حیدرآباد کی مشترکہ مہذب تہذیب کا پروردہ تھا، جہاں علم وادب، نفاست، وضعداری اور رواداری، اعلیٰ خاندانوں اور شرفا کی گھٹی میں شامل تھی اسی لئے ان کے تعلقات ہندوستان کی ان بہترین شخصیتوں سے بھی رہے جو اپنے دور کے چیدہ چیدہ لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ انھیں لوگوں میں شمالی ہند میں نہرو خاندان بھی تھا جو اپنی ہر روایت کے لئے ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ چنانچہ آزادی کے سیاسی پلیٹ فارم پر جو لوگ اکٹھا ہوئے ان میں سروجنی اور جواہرلال کے نام قابل ذکر ہیں، اور پھر ان دونوں کے تعلقات میں ایک دوسرے کے لئے محبت، خلوص، احترام اور ایثار کے انتہائی جذبات کا باب کھل گیا۔ سروجنی نائیڈو ان کے لئے ایک سیاست داں، ایک بہن، ایک ہمراہی اور سب سے بڑھ کر ایک شاعر کی حیثیت سے۔ غرض مختلف روپ میں جلوہ گر ہیں۔ سروجنی نائیڈو کی پیاری اور شاعرانہ زبان نہرو کی شخصیت کو ایک دیومالائی اور بہت ہی پرکشش بنا کر پیش کرتی ہے۔

سنہ ۲۹ - ۱۹۲۸ء کا زمانہ ہے، ملک میں خلافت تحریک کے بعد سائمن کمیشن کی آمد آمد ہے لیکن ہندو مسلمان کا مسئلہ اپنی جگہ پر ہے۔ سارے ملک میں سابقہ روایت کے مطابق فرقہ وارانہ ہنگاموں کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسے میں سروجنی نائیڈو ان کو لکھتی ہیں:۔

"بہرحال آؤ ہم سمندر کو اس وقت تک بلوتے رہیں جب تک کہ ہم اتفاق واتحاد کا ماکوئی عطیۂ الٰہی سطح تک نہ لاسکیں۔ مگر آؤ پہلے ہم بقرعید سے سلامتی کے ساتھ گزر جائیں اور انشاءاللہ ہم ایسا ہی کریں گے۔

محبت اور پیار۔ تمہاری محبت آگیں بہن سروجنی" ص ۴۶ - ۴۷۔

جب جواہرلال سنہ ۱۹۲۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوتے ہیں تو سروجنی نائیڈو کی خوشی

اور پریشانی کا حال نہ پوچھیے۔ وہ متفکر بھی ہیں اور شادماں بھی۔ وہ انھیں کس قدر عزیز ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کیجیے :۔

"رات میں بہت دیر تک جاگتی اور سوچتی رہی کہ میرے وہ الفاظ جو تمہارے متعلق اکثر میری زبان سے نکل جایا کرتے تھے کہ تمہارے لئے کوئی عظیم الشان شہادت مقدر ہے، کتنے پر معنی ثابت ہوئے۔ تمہارے صدر کانگریس منتخب ہونے پر جب پرشور نعرہ ہائے تحسین کے ساتھ تم کو مبارک باد دی جا رہی تھی، تب میں تمہارے چہرہ کو غور سے دیکھ رہی تھی اور کچھ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ گویا میں کسی بادشاہ کی رسم تاجپوشی اور مسیح کا سولی پر چڑھایا جانا بہ یک وقت دونوں مناظر دیکھ رہی ہوں۔

تمہاری محبت آگیں بہن اور دوست سروجنی"۔ ص ۱۱۹

یہ مکمل خط بہت دلچسپ اور پر اثر ہے جس میں وہ نہرو کو سیاست کے داؤ پیچ اور بحران فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور ملوث نہ ہونے کے اسباب بتاتی ہیں اور بحران کی ہمت افزائی بھی کس قدر حسین پیرائے میں کرتی ہیں :۔

"تمہارے اس سخت جاں کاہ اور تقریباً ہولناک دائرہ خیز کام میں جس طرز پر بھی تمہاری کوئی مدد یا خدمت ممکن ہوگی تو تم جانتے ہو کہ تمہارے صرف زبان ہلانے کی دیر ہوگی۔ اگر مجھ سے تمہاری کوئی ٹھوس قسم کی مدد نہ بھی بن آئی تو کم از کم میری محبت اور ہمدردیاں تمام تر تم پر نثار ہوں گی اور گو بہ قول مصری شاعر خلیل جبران کے "ایک شخص کا بلند تخیل کسی دوسرے شخص کو قوت پرواز نہیں دیا کرتا" تاہم میرا یہ عقیدہ ہے کہ ایک شخص کی روح کا ناقابل تسخیر ایمان وایقان دوسرے کے اندر بھی ایمان وایقان کے ایسے شعلے بلند کر سکتا ہے جس سے ایک عالم منور ہو جائے"۔ (ص ۱۱۹ جلد اول چند پرانے خط)۔

سروجنی نائیڈو اپنے شاعرانہ ماحول اور اپنی شاعرانہ نفاست سے جواہر لال کو بھی محظوظ کرنا چاہتی ہیں، چنانچہ بعض اوقات وہ اپنے گرد و پیش کا مرقع نہرو کے سامنے صرف اس لئے کھینچتی ہیں کہ نہرو بھی ان کی اس ادا اور نفاست کے شیدائی ہیں۔ دیکھئے کیا منظر نگاری ہے :۔

"عزیزی جواہر! میں "تھیش گولڈن تھرش ہولڈ" سے اپنی منبت کار کوچ پر بیٹھی ہوئی لکھ رہی ہوں اور راس نقاری یا دد لوری، نکولو پادا اور ڈک ڈک ہو جونگ گورکے تین پائے حکمران میرے چاروں طرف لیٹے آرام فرما رہے ہیں اور چڑیاں، سن برڈز اور بتی برڈز باغ میں گل پھر اور

سرخ گلاب کے جوش گل سے دہکتی ہوئی کیاریوں میں نغمہ سرا ہیں" (ص۲۷).

سروجنی اپنے گھر چھٹیاں منانے آئی ہیں اور بیرونی تفکرات سے آزاد رہ کر سکون کے تھوڑے لمحات گزارنا چاہتی ہیں، اور حیدرآباد کی روایاتی سوسائٹی کی ہم مشربی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ عثمان ساگر کشتیوں کی سیر و تفریح کا پروگرام بناتی ہیں تو جواہرلال کو یاد کئے بنا نہیں رہ پاتیں لکھتی ہیں :۔

"مگر اس اثنا میں جی چاہتا ہے کہ ہماری اس عید مسرت میں تم بھی شریک ہوتے۔ بناوٹی نہیں ایک عید مسرت کی ابتہاج ہے۔ حیدرآباد میں آکر میر عالم میں کشتیوں کی سیر و تفریح اور ادھر ادھر کی چہل قدمی اور سیر گشت اور آوارہ گردی اور یہاں کی حقیقت میں ملت و وطن کے تمام تعصبات سے پاک پردیسی اور وسیع المشرب لوگوں سے ملنا جلنا۔ ایسی صلح کل اور اتنی بے تعصب سوسائٹی تم کو ہندوستان میں کہیں اور نہ ملے گی" (چند پرانے خط۔ جلد اول).

اور پھر نہرو کے ساتھ ساتھ سارے گھر کی خیریت پوچھنے بیٹھ جاتی ہیں :۔

"مجھے امید ہے کہ پاپا جی اور پیاری ماما جی بخیر ہوں گی، کملا بھی امید ہے اب بالکل توانا ہوں گی اور اندرا اپنی آنکھوں میں طلوع سحر کی سی روشنی لئے اٹلانٹا جیسی سبک رو اب بھی ہوگی" (ص۲ جلد اول)

اور ٹھیک اسی طرح اپنے خاندانی حالات لکھنے لگتی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تعلقات بالکل خاندانی سے ہو گئے تھے کہ ایک ایک فرد اور چیز کا تذکرہ ان کے خطوں میں ملتا ہے۔ دیکھئے :۔

"پدمجا سب کو محبت اور پیار کا پیام بھیج رہی ہے، خصوصاً خوب صورت آنکھوں والی بٹی کو۔ لیلامنی آکسفورڈ بین فضا میں پھر کھو گئی ہے اور بالکل خوش و خرم" (ص۲۲ چند پرانے خط جلد اول).

نہرو ہمہ زندگی مصروف رہے اور ان کی اس مصروفیت کا اثر ان کی صحت پر بار بار پڑتا رہا۔ پھر وہ اپنی بیوی کملا نہرو کے سلسلہ میں زیادہ متفکر ہیں اور یوروپ بہ غرض علاج اور صحت گئے ہیں۔ سروجنی پہلے تو انھیں اس سفر پر مبارک باد دیتی ہیں، اور وہ بھی اس طرح :۔

"میں تمہاری نسبت ہر قسم کی خوشگوار اور خوش آیند افواہیں سن رہی ہوں۔ ایسی باتیں جن کو سن کر جی خوش ہوتا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تمہاری زندہ دلی لوٹ آئی ہے اور زندگی کی مسرتوں سے تم نے پھر لطف اندوز ہونا شروع کر دیا ہے ... مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ تم نے ہندوستان کی سست اور کاہل زندگی کے گھناؤنے پن سے اتنی طویل چھٹی پائی ہے۔ یوروپ میں تم نے اپنی خودی کے لئے ایک تازہ اظہار اور روح کی بیماریوں کے واقعی شفایابی کا موقع پایا ہوگا"

(ص۲۷ چند پرانے خط جلد اول)

اور چلتے چلتے اندرا کے بارے میں بھی لطیف جملے لکھ جاتی ہیں۔ اسی خط میں لکھتی ہیں:۔

"اندو تو اب ایک ننھی سی ماد موازیل ہوگی جو فرنچ میں بُد بدایا، بڑبڑایا کرتی ہوگی۔" (دیکھو پرانے خط جلد اول ص۸۲)۔

نہرو جہاں کہیں بھی ہوتے ہندوستان کے حالات سے باخبر رہتے۔ ان کے پاس جن لوگوں کے خطوط آتے ان میں یہاں کے احوال و کوائف ضرور ہوتے۔ سروجنی نائیڈو بھی انھیں لوگوں میں سے تھیں جو ان کو یہاں کے دوسرے ساتھیوں کے حالات سے مطلع کرتی رہتیں، مگر ان کا انداز کس قدر دلچسپ اور پُر مزاح ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"حجاز کے حاجی وہاں سے کس قدر بیزار واپس آئے ہیں۔ مولانا شاہ سعود سے بہت خفا ہیں اور ان کے خلاف بڑی لمبی لمبی تقریریں کر رہے ہیں۔ شعیب بھی خوش نظر نہیں آتے۔ انصاری ان تمام مہینوں میں دودمان شاہی کی آیا کھلائی کا پارٹ ادا کرتے رہے ہیں۔ وہ اس مشغلے سے نہایت بیزار نظر آتے ہیں گویا قید خانے میں ڈال دیئے گئے ہیں۔" (دیکھو پرانے خط۔ جلد اول ص۸۳)۔

ان کے خطوط میں صاف ستھرے مزاح کا پہلو بعض اوقات خاصا نمایاں نظر آتا ہے، مگر وہ نہرو کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنی ہی ذات تک کے لئے۔ اگرچہ وہ نہرو سے عمر میں بڑی تھیں اور انھوں نے دوسروں کے بارے میں کچھ تیکھے اور دلچسپ جملے لکھے ہیں، مگر نہرو کے بارے میں ان کا خلوص اور پیار اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اگر ہنستی بھی ہیں تو اپنے آپ پر۔ ملاحظہ ہو:۔

"گھسیٹنے کو میں گھسیٹ دیا کرتی ہوں، مگر سوچا کرتی ہوں کہ تم میری بدخط تحریر پڑھ بھی لیتے ہو۔ میری کلائی درد سے اکڑی ہوئی ہے۔ بہ قول اقبال، انھیں کے لفظوں میں سراپا درد ہوں۔" (ص۸۳)۔

سروجنی کی کہیں کہیں ظرافت بھی بڑے پُرمعنی انداز میں ہوتی ہے۔ وہ اس قدر موزوں اور چچے تلے الفاظ استعمال کرتی ہیں کہ بے ساختہ ان کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ سودیشی تحریک کے حامیوں میں ہی نہیں بلکہ اس کی روح رواں ہیں۔ مگر اس کے برتنے میں جو دشواریاں حائل ہوتی ہیں ان کا اظہار اس شکل میں ہوتا ہے:۔

"چاہا تو میں نے یہ تھا کہ ایک مختصر سا اور صاف ستھرا خط تمہاری خیریت دریافت کرنے کو لکھوں گی، مگر جب لکھنے لگی تو وہ بے تکی اور ٹھیک سے نہ پڑھی جانے والی دستاویز بن گیا۔ یہ سو فی صدی سودیشی کاغذ لکھنے والے کے جذبۂ وطن پرستی کی آزمایش کے لئے اچھی چیز ہے، مگر اس پر لکھنا اُف، کیا قیامت ہے؟" (ص۵۶۔ کچھ پرانے خط۔ جلد دوم)۔

ملک کے حالات ایسے تھے کہ ہر آن کوئی نہ کوئی مسئلہ سامنے آتا ہی رہتا۔ نائیڈو اپنے ان خطوط میں نہرو کو مفصل اطلاعات دیتی ہی رہتیں، انھیں مشورے دیتیں۔ خود ان سے ایسی ہی صلاح کی طالب ہوتیں۔ چنانچہ اردو، ہندی کے جھگڑے سے متعلق نہرو کو لکھتی ہیں:۔

"زبان سے متعلق تمہارا رسالہ معجز نما ثابت ہو رہا ہے۔ جو لوگ نہایت ہی آزردہ خاطر اور برہم تھے اس رسالے نے ان کے اندر بھی جو ضیابار سکون پیدا کر دیا ہے وہ قابل دید ہے۔ میں نے ایک نسخہ مولوی عبدالحق کو بھی بھیجا تھا جن کی رائے اردو ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ وہ اسی وقت سے راجن بابو سے مشورہ کر رہے تھے اور اب واپس آئے ہیں تو نہایت خوش اور مطمئن ہیں۔ ایک بڑا اور ضروری قدم اٹھا ہے۔ کیا مجھے چند نسخے اور مل سکتے ہیں؟ پنجاب اور بعض دوسرے مقامات کے جن لوگوں سے اس مسئلہ پر مجھ سے باتیں ہوئی ہیں، میں ان کو بھی یہ رسالہ بھیجنا چاہتی ہوں۔" (صفحہ ۱۶۰۔ کچھ پرانے خط۔ جلد اول)۔

سروجنی نائیڈو، جواہر لال کی ہمراز، خوشی اور غم کی ساتھی بننا چاہتی ہیں۔ وہ ان کے کرب، تکلیف اور الم کو محسوس کرتی ہیں۔ ان کی بھاری ذمہ داریوں کا خیال کرتی ہیں اور پھر اپنے پرخلوص لہجے میں ان کے تمام درد کا مداوا بن جاتی ہیں۔ چنانچہ سال نو کی دعائیں نہرو کو یوں دیتی ہیں:۔

"سال نو میں تمہارے لئے کس چیز کی تمنا کروں؟ مسرت کی! امن و آشتی کی، فتح و ظفر کی! یہ تمام چیزیں جن کو لوگ نہایت ہی عزیز رکھتے ہیں تمہارے لئے ثانوی درجہ کی چیزیں ہیں۔ تقریباً ضمنی اور اتفاقی۔ میرے عزیز! میں تمہارے لئے تمنا کروں گی غیر متزلزل ایمان اور ثابت قدم جرأت اور جسارت کی۔ تمہاری اس راہ آزمائش اور امتحان میں جس سے ہر اس طلبگار آزادی کو گزرنا پڑے گا جو اس متاع کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ شخصی آزادی نہیں بلکہ قید غلامی سے پوری ایک قوم کی نجات۔ اس بلا کی ڈھلوان پر اور پرخطر راہ پر ثابت قدمی کے ساتھ گامزن رہے۔ اگرچہ تمہاری قسمت میں رنج و غم، تکلیف و اذیت اور تنہائی ہی کیوں نہ آئے! یاد رکھو کہ تمہاری تمام جد و جہد کا آخری ثمر تاج آزادی ہی ہے، مگر تم اس راہ میں تنہا گامزن نہ رہو گے۔" (صفحہ ۱۱۲ جلد دوم)۔

وہ نہرو کو کسی دیوتا اور پیغمبر سے کم نہیں سمجھتی ہیں۔ ایک تو ان کا اپنا جذبۂ خلوص اور پھر شاعرانہ تخیل دونوں نہرو کو ایک آسمانی روپ دے دیتے ہیں۔ دیکھئے جب نہرو پہاڑوں سے قریب ہیں تو وہ کیا سوچتی اور کیا لکھتی ہیں:

"مجھے امید ہے کہ عصر قدیم کے مصنف زبور کی طرح تم نے بھی جب پہاڑوں کی طرف آنکھیں اٹھائی ہوں گی تو اس اتحاد فطرت سے تم نے بھی تسکین قوت اور فیضان روحانی حاصل کیا ہوگا، اور اسی مصنف کے عہد جوانی جیسی توانائی اپنے اندر پائی ہوگی کہ نہر سے پانچ کنکر اٹھا کر ہر دیو پایمن کو قتل کر ڈالے اور تم اتنے سارے اور خاص قسم کے دیو رکھتے ہو جنہیں تم قتل کرو گے۔" (صفحہ ۹۵۔ کچھ پرانے خط۔ جلد دوم)۔

سروجنی، نہرو کی رائے اور فیصلہ کی ہر آن منتظر رہتی تھیں۔ کوئی موقع آتا وہ ان سے پوچھے بنا خاموش نہ ہوتی

ملک کی فرقہ وارانہ فضا پھر مسموم ہو چلی ہے اور سارے ملک میں اس کا چرچا ہے۔ سروجنی یہ خبریں سن کر کبیدہ خاطر ہیں اور گاندھی جی کی کوششوں کے ساتھ ساتھ جواہرلال کے ردعمل کی منتظر معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ ان کو لکھتی ہیں:۔

"جب کہ وہ ننھا سا آدمی دوسرے معاملات سے متعلق اپنا گاندھیائی جادو جگا رہا ہے تم مجھے یہ بتاؤ کہ "نہرو کے اعصاب" فرقہ وارانہ ترتیب کی ترقی کے لئے کیا ردعمل دکھا رہے ہیں۔ میں اس معرکتہ الآرا مسئلے پر چیست و موزوں سا فقرہ سننے کے لئے بے تاب ہوں۔" (ص ۵۹۔ جلد دوم)۔

نہرو کا یوم پیدائش آ گیا ہے، ملک بھر سے ان کو اپنی زندگی کے پچاس برس پورے ہونے پر تہنیت و مبارکباد کے پیغامات موصول ہو رہے ہیں، لیکن سروجنی نائیڈو اپنے خطوط میں ان جذبات کا اظہار کرتی ہیں جن کے سامنے لوگوں کی عقیدت اور محبت پھیکی پڑ جاتی ہے۔ ان کے دل کے تار بج اٹھتے ہیں اور نہرو کو لکھتی ہیں:۔

"تمہاری زندگی کی پہلی نصف صدی تاریخ، گیت اور داستان بن چکی، خدا کرے کہ دوسری نصف صدی کے ابتدائی سال تمہارے عظیم الشان خوابوں اور عیاں منصوبوں کی تعبیریں تمہارے سامنے لے آئیں اور ارتقائے انسانی کی تاریخ میں تم کو ایک بلند ترین نجات دہندہ کی حیثیت سے غیر فانی بنا دیں۔" (ص ۲۵۶۔ کچھ پرانے خط۔ جلد دوم)۔

اور پھر اسی سلسلہ میں آگے چل کر لکھتی ہیں:۔

"میں تمہارے لئے رواجی، اچھے عطیئے کی تمنا نہیں کر سکتی۔ میں نہیں سمجھتی کہ شخصی مسرت، راحت و آسائش، فرصت، دولت و ثروت جیسی چیزیں جو ایک معمولی مرد و عورت کی زندگی کے قدرتی اثاثے ہوا کرتے ہیں، تمہاری زندگی میں کچھ قدر و قیمت رکھ سکیں گے۔" (ص ۲۵۷۔ کچھ پرانے خط۔ جلد دوم)۔

وہ جواہرلال کی عظمت اور اہمیت سے واقف تھیں۔ انھوں نے ان کے اندر وہ خصوصیات دیکھ لی تھیں جو وقت کے دھارے کو موڑ دیا کرتے ہیں اور صفحۂ ہستی پر اپنے غیر فانی نقوش چھوڑ جایا کرتے ہیں۔ زمانے کے پیغمبروں، ولیوں، رشیوں اور عظیم انسانوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ نہرو کو اس کی یاد دلاتی ہوئی لکھتی ہیں:۔

"رنج و غم، مصیبت، قربانی، اذیت، کشاکش، ہاں یہی وہ چیزیں ہیں جو تمہارے لئے پہلے سے زندگی کے مسئلے کے طور پر مقدر ہیں۔ تم انھیں چیزوں کو کسی نہ کسی طرح وجد و انبساط، فتح و کامرانی اور آزادی کی حقیقت میں تبدیل کر لو گے۔" (ص ۲۵۷۔ دوسری جلد)۔

جواہرلال احمد نگر کی طویل اسیری سے رہا ہو کر باہر آئے ہیں اور پورے ملک میں ایسی نازک صورت حال میں ان کی رہائی پر خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ سروجنی نائیڈو بھی اس بے پایاں مسرت سے سرشار ہیں اور بچوں کی طرح خوش ہو کر ان کو لکھتی ہیں:۔

"جیل جانے سے تمہارا خوب صورت خط اور اس سے بڑھ کر خوب صورت تمہارا وہ بیان جو تم نے جیل خانے سے باہر آکر دیا یہ دونوں چیزیں میری اذیت رسیدہ روح کے لئے بڑی ہمت افزا فیضان بخش اور تسکین دہ ثابت ہوئیں" (ص ۳۶۱ - کچھ پرانے خط جلد دوم)۔

سروجنی نائڈو کسی عالم یا حالت میں ہوں نہرو کو یاد کئے بنا نہ رہتیں۔ ان کا سارا خاندان نہرو کا شیدائی تھا۔ وہ ایوا کی بیماری سے سخت متفکر اور پریشان ہیں، مگر اس وقت بھی وہ جواہر لال کو خط لکھنے سے باز نہیں آتیں لکھتی:

"میں شب و روز اس کی خدمت کرتی رہی ہوں۔ تم کو بھی جس سے میں دل و جان سے محبت کرتی ہوں بیٹھی ہوئی خط لکھ رہی ہوں، اس لئے کہ تمہیں خط لکھنا ہی میرے لئے باعث تسکین ہوا کرتا ہے۔ کاش آپ ایوا سے کبھی ملے ہوتے۔ اب بھی جب کبھی وہ اپنے تنفس کے دوروں کے وقت دو ایک لفظ بول جاتی ہے تو وہ کہا کرتی ہے "کاش میں نے جواہر لال کو دیکھا ہوتا؟ وہ کیسے ہیں؟ تم ان کو خط لکھوگی تو میری طرف سے میری خیریت دریافت کرنے پر ان کا شکریہ ادا کرنا"۔ (ص ۳۶۲)۔

سروجنی نائیڈو اپنے خطوط کے آخر میں بڑے دعائیہ اور بزرگانہ خیالات کا اظہار کرتی ہیں لکھتی ہیں:-

"خدا کرے تمہاری جوئندہ روح اپنی منزل تک پہنچ جائے اور اپنی حقیقت و عظمت و رفعت اور حسن و تربائی کے ساتھ پالے"۔ (ص ۲۵۷)۔

پھر دوسری جگہ:- "یہی آشیر باد ہے۔ تمہاری شاعرہ بہن اور جستجو ئے منزل میں تمہاری ایک رفیق کی"۔ اور بعض اختتامئے کتنے پُر اثر ہیں۔ ایک خط میں خاتمہ یوں کرتی ہیں:-

"شب بخیر عزیزی جواہر! مجھے یہ سوچ کر کس قدر مسرت ہوتی ہے کہ تم ہندوستان سے دور ہو اور تمہاری روح کو اپنے شباب اور عظمت اور جمال سرمدی کے تصور کی تجدید کا ایک موقع ہاتھ آگیا ہے"۔ (ص ۳۱۳)۔

ہندوستان آزاد ہوا، مگر سروجنی نائڈو اپنے عزیزی جواہر کا اصلی روپ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہیں۔ ان دیو مالائی کردار ہندوستان کے نئے خاکوں میں رنگ بھرتا رہا، دیووں سے لڑتا رہا، کامیاب بھی ہوا ناکام بھی، مگر ہمت نہ ہارا اور اپنی منزل پر رواں دواں ہوتا ہوا درخشاں ستارے کی مانند ہندوستان کے آسمان آزادی پر چمکا اور بجھ بھی گیا، مگر سروجنی نائڈو کے یہ خطوط نہرو کی شخصیت کی رنگینی لیے ادب و شاعری کی دنیا میں ایک بے مثال یادگار رہیں گے۔

جگناتھ سنگھ

پنجابی کی جدید شاعری

ہماری نئی پود کے شاعر ایس۔ ایس میشا۔ سکھبیر۔ تارا سنگھ۔ سکھ پال ویر حسرت۔ وندجیر سنگھ چند۔ جگجیت پیارا۔ بیت۔ وریام اختر۔ سورن۔ کرشن اشانت۔ رو ندر روی۔ سریندر گل اور ست کمار ہیں۔ ان شعرا نے پیارے …رکے شعرا جناب موہن سنگھ۔ امرتا پریتم۔ باوا بلونت۔ پریتم سنگھ سفیر۔ دیویندر ستیارتھی اور اوتار سنگھ آزاد کی …سے ہٹ کر نئی شاعری کی داغ بیل ڈالی ہے۔ انہوں نے پنجابی شاعری کو رومانی اور اشتراکی شاعری سے آزاد کر کے …ن کی فراوانی پیدا کی ہے۔ اور پرانی بندشوں کو توڑ کر نئے خد و خال کو ابھارا ہے۔

ہمارے موجودہ ماحول کی … سے ٹوٹنے والے تانے بانے۔ جنسیاتی اور نفسیاتی حالات سے پیدا ہونے والی …ش مکش۔ میکانکی حالات سے بڑھتی ہوئی بیگانگت۔ سماجی اور اقتصادی تنگیوں سے پیش آنے والے مراحل اور دن بدن …ہوئی یاسیت کے سبب زندگی کے بہاؤ میں آنے والے ٹھہراؤ نے ہماری شاعری کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ تبدیلی حالات کے ساتھ ہم دوسری زبانوں کی طرح انگریزی۔ فرانسیسی۔ جاپانی۔ اردو اور ہندی کی جدید شاعری سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ …ے ہماری شاعری میں نئے اسلوب تو ضرور آ گئے لیکن موسیقیت اور ندرت کسی حد تک غائب ہوتی جا رہی ہے۔

ایس۔ ایس۔ میشا۔ کی شاعری میں یاسیت اور قنوطیت حاوی ہے لیکن پھر بھی امید کی مدھم سی لکیر اس کی شاعری میں …سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اس نے پیار و محبت کے مضامین کو نئے سرے اور نئے اسلوب سے پیش کیا ہے۔ اس کے …شعوری اور جذباتی رنگ کی ہم آہنگی ہے۔

موہن جیت بھی اسی معیار کا شاعر ہے لیکن اس کے کلام میں ابھی تک وہ پختگی نہیں ہے جو ایک باشعور شاعر کے …ہونی چاہئے! اس کی چند ایک نظمیں بہت خوبصورت اور ابدی ہیں۔

سکھ پال ویر حسرت مغربی تہذیب و تمدن سے زیادہ متاثر ہے اسی لئے اس کی شاعری میں جنسیاتی … سے …ہے جس نے اس کے کلام میں عریانی پیدا کر دی ہے، شاید اسی وجہ سے اس کی شاعری میں خشکی اور موسیقیت کا بھی …ہے لیکن اس کے چند ایک تجربے بہت خوبصورت اور فنی لحاظ سے کامیاب ہیں۔

تارا سنگھ۔ گربچن رام پوری۔ سکھبیر۔ سنتوکھ سنگھ دھیر اور سرجیت رام پوری رومانی شاعر ہیں۔ ان سب کی …ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پروان چڑھی ہے۔ لیکن تارا سنگھ اور سکھبیر نے کچھ نئی قسم کی نظمیں لکھ کر … …روایتی شاعری کے درمیان ایک اہم کڑی ہیں۔ سنتوکھ سنگھ دھیر کی شاعری میں نئے عناصر بہت کم ہیں …

اس میں جذبہ کی گہرائی اور عوام کے لئے ایک ڈھارس ہے۔

نئی پود میں وند میر سنگھ چند غالباً پہلا شاعر ہے جس کی شاعری میں ماحول اور موجودہ دور کی عکاسی کے ساتھ موسیقیت اور نغمگی شانہ بہ شانہ چل رہی ہے۔ جو کرب و درد اس کی شاعری میں ہے بہت کم شعرا کے کلام میں ہے۔ شاید اس کے اسباب یہی ہوں کہ وہ ایک غزل گو بھی ہے۔ اس کے کلام میں جذبہ کی گہرائی، ذہانت زیادہ نظر آتی ہے۔

جگجیت براڑ نے بہت تھوڑے عرصے میں اپنا مقام بنا لیا ہے! اس کی شاعری صحیح معنوں میں ہمارے آج کے ماحول کی نمایندہ ہے! اس نے عصر حاضر کے انسان کی ذہنی حالت کو بہت خوبی اور کامیابی سے منظر عام پر پیش کیا ہے۔ وہ نئے دور کے آدمی کے جنسیاتی اور نفسیاتی پہلو اور کمزوریوں سے خوب آشنا ہے۔ دریام اتر کی شاعری میں روایتی اور جدید عناصر کی یکسانیت ہے، لیکن وہ ماحول کی تصویرکشی بڑی خوبی سے کرتا ہے۔

ان کے علاوہ پاکستان میں منیر نیازی۔ عباس اطہر۔ افضل پرویز۔ سلیم الرحمن۔ شریف کنجاہی۔ افضل احسن۔ عظیم بھٹی۔ شہزاد احمد۔ شفقت تنویر مرزا۔ سلیم کاشر۔ انیس ناگی وغیرہ بھی پنجابی کے اچھے شاعر ہیں۔ ان میں سے منیر نیازی۔ شریف کنجاہی۔ سلیم کاشر اور ظفر اقبال کے مجموعے بھی شایع ہو چکے ہیں۔ منیر۔ عباس اطہر اور ظفر اقبال نئے عناصر سب سے زیادہ ہیں، لیکن ان کا صحیح مقام اردو شاعری میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ نمونتاً تین نظمیں پیش ہیں:

چوراہا

از ایس ایس میتا

(۱) رات ہے کتنی سیاہ
بجھ گئے سارے چراغ
چوک کی مدھم سی بتی کے بغیر
روشنی کا اب نہیں کوئی پتا
سانپ ظلمت کا اس کو ڈس گیا
سو گیا، یا مر گیا ہے شہر یہ؟
جیسے ماتم میں کوئی
گھومتے پھرتے ہیں یاں اتر درد و غم ہر طرف
اور فضا میں ہر طرف پھیلا ہوا اک زہر ہے
قہر ہے ہر سو قہر ہے
. . . .

(۲) رات کتنی سست ہے
کنج دل میں کوئی چنگاری بھی اب روشن نہیں
اب نہ کوئی راز ہی ہے اور نہ ہے افشا کا ڈر
مردنی چھائی ہے اب احساس پر
چیتنا یخ بستہ ہے
ایسی تاریکی میں اٹھیں اور بڑھیں کیسے قدم
اف، ہے ناممکن کہیں یاں سے ہٹوں
چھوڑ کر چوراہا ڈھیے کون اب ظلمات میں
عقل پر پردہ سیاہ
سچ کا پیراہن سیاہ

چوک کی مریل سی بتی
کیا کسی کو یہ دکھا سکتی ہے راہ
یونہی ہمدردی سی ہے بتلا رہی
جیسے کہتے کہتے ہے تتلا رہی
. . . .
موت کا پہرہ ہے بے شک
پھر بھی آخر شہر ہے
اے مرے دل چل کہیں اک کھلی ٹھائیں کو
تو ذرا کوشش تو کر
تو ذرا کوشش تو کر

نذر

از موہن جیت

میں کروں نذرِ غروبِ آفتاب
شام ہے میرے لئے ڈر کی گھڑی
روز و شب جو دھوپ جاتے ہی کرے مجھ سے سوال
کس فضا کو آج تم نے مات دی ؟
تب نظر نیچی کئے
دیکھتا ہوں میں زمیں
اور پھر اگلی سحر
میں کوئی رنگین نغمہ — دینے کا وعدہ کروں
ایسی حالت میں نہ جانے کتنے دن
آئے اور چپ چاپ ہی یاں سے گئے
کیسی نظمیں تھیں وہ ہمدم
میں نے جو اکثر کہیں
ضو فشاں ہونے سے پہلے مر گئیں
کونسا نغمہ کروں
نذرِ غروبِ آفتاب
شام ہے میرے لئے ڈر کی گھڑی

قید

از دتہ مہیر سنگھ چند

ایک مدت سے میں اس پتھر کے گھر میں قید ہوں
اور باہر کی جانب
قفل ہے اندر لگا
جان نکلی جا رہی ہے
ہر گھڑی اک سانپ ہے پھنکارتا
اور میں جیسے دھوئیں کے بادلوں میں گھر گیا
پاؤں من من بھر کے ہیں
قدِ آدم آئینے میں جب میں خود کو دیکھتا ہوں
زرد چہرہ ، بال بکھرے ، رنگ فق
بت ہو جیسے ، بدحواسی کا کھڑا

. . . . .

گھر کی رونق کو ملا بن باس ہے
مردنی چھائی ہے ہر اک چیز پر
دن کو بھی تاریکیاں ہیں رات کی
پھر بھی مجھ کو ہے نکلنے کا گماں
اور تصور میں رہائی کا سماں
ایک مدت سے میں اس پتھر کے گھر میں قید ہوں

سیدہ اختر

سہارے!

محرومیِ طلب کے سہارے چلے گئے!
دریا نہ مل سکا تو کنارے چلے گئے!

اُن کے غمِ حسیں کے سہارے چلے گئے!
شعلوں میں زندگی کو سنوارے چلے گئے!

گو آج یک بیک وہ سدھارے، چلے گئے!
پُرکیف زندگی کے نظارے چلے گئے!

اُن مست انکھڑیوں کے اشارے، چلے گئے!
پیتے ہوئے سُرور کے مارے چلے گئے!

یادِ حبیب، اور شبِ غم، خدا پناہ!
نشتر کو جیسے دل میں اُتارے چلے گئے!

پھر کی نظر تو کوئی نہ تھا راہِ شوق میں!
کچھ دُور تو یہ چاند ستارے چلے گئے!

رُودادِ ہجرِ یار نہ سُن! مختصر یہ ہے!
بے کیف زندگی کو گذارے چلے گئے!

جو بامقام تھے وہ رہے بحرِ عشق میں!
جو بے مقام تھے وہ کنارے چلے گئے!

پھولوں میں جو نہ رہ سکے، مثلِ شمیمِ گل!
کانٹوں میں زندگی کو گذارے چلے گئے!

اُن کی حریمِ ناز کہاں، اور ہم کہاں؟
اک آرزو تھی جس کے سہارے چلے گئے!

اختر! کسے خبر! کہ یہ لیلائے ذوق و شوق!
کیا کیا جنونِ عشق کے مارے چلے گئے!

انوار ظہوری

صاحبو! فنکار کی قسمت میں آزادی کہاں
فاصلے، جغرافیائی، مذہبی حد بندیاں

یوں مرے سینے میں آوارہ ہے آوازِ فغاں
جیسے جلنے میں دھواں دیتی ہوں بھیگی لکڑیاں

کچھ معاشی مسئلے ہیں، کچھ تقاضے وقت کے
عشق کی فرصت کسے اب حُسن کی باتیں کہاں

موسمِ گُل بھی یقیناً جی لُبھا سکتا نہیں
جب نگاہوں میں بسا لے خودکشی، ویرانیاں

قیس کو جنگل بسانے کی ضرورت ہی نہیں
عام ہیں جب انجمن در انجمن تنہائیاں

لے چکا ہے اپنے گھیرے میں غمِ دوراں اُسے
دل میں سامانِ تمنا کی بھی گنجائش کہاں

وقت کی باہوں میں جینا سب سے مشکل کام ہے
زیست کے تیور تو سمجھو، ہوش میں آؤ میاں

جنگلوں میں چیختی پھرتی ہے دیوانی صبا
ہوگئیں پت جھڑ میں چُپ ساری برہنہ ٹہنیاں

راستے دل میں نکالے یوں کسی کی یاد نے
گاؤں میں ہوں جیسے بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں

دل کی نیت ہی بدل دی پھول جیسے رُوپ نے
اک نظر نے ختم کر دیں عمر بھر کی نیکیاں

لوٹتی ہیں سوز میں ڈوبے ہوئے اشعار پر
روز پڑھتی ہیں مری غزلیں کنواری لڑکیاں

شرم تالا ڈال دیتی ہے زبانِ حُسن پر
صاف کہہ دیتی ہیں رازِ دل دھڑکتی چھاتیاں

چلتے چلتے اس دوراہے پر چلا آیا ہوں میں
کس طرف جاؤں، اِدھر دُنیا، اُدھر اُن کا مکاں

اب تمہاری یاد سے آباد ہے سینہ مرا
تلملاتی آرزوئیں سر چھپائیں گی کہاں

اچھے اچھے کر گئے توبہ، دیارِ حُسن میں
دل کے بدلے ہاتھ آئیں مستقل بے چینیاں

درد کی ٹیسیں اُٹھی ہیں سینۂ تاریخ میں
قوم کو اب تک نہیں انورؔ احساسِ زیاں

منشاءالرحمٰن خاں منشاء

[illegible] پہ نازاں تھے ماہ وکہکشاں والے
بن گئے حریف اُن کے آج خاکداں والے

رہ گئے ہیں سب راہی راہ میں تھکے ہارے
منزلوں کو چھو آئے ہمتِ جواں والے

حادثاتِ ہستی کا۔ انقلابِ دوراں کا
غم کبھی نہیں کرتے عزمِ بیکراں والے

پُرخطر مراحل سے بےخطر گذرتے ہیں
جُرأتِ یقیں والے۔ جذبِ کامراں والے

لُطفِ زندگانی تو اصل میں اُٹھاتے ہیں
دردِ بے اماں والے سوزِ جاوداں والے

آبروئے گلشن ہیں۔ نازشِ بہاراں ہیں
قلبِ خونچکاں والے چشمِ خوں فشاں والے

عظمتِ قلم کی جب کھاکے ہم قسم اُٹھے
دل شکستہ ہو بیٹھے خنجر و سناں والے

خامشی میں جب اپنا حال ہم سُناتے ہیں
مُنہ ہمارا تکتے ہیں قوتِ بیاں والے

دوستی کے پردے میں دشمنی برتتے ہیں
کیا عجیب ہیں منشاء لوگ یہ جہاں والے

مظفر حنفی

باغباں نے لوٹا ہے، آندھیوں نے گھیرا ہے
آج ہر نشیمن میں، خوف کا بسیرا ہے

تو جفا پہ نادم ہے، میں وفا پہ نازاں ہوں
ایک ظرف تیرا ہے، ایک ظرف میرا۔

روشنی کرد لوگو! سازشوں کی محفل میں
کون کس کو پہچانے، ہر طرف اندھیرا۔

دن پہ رات کا غلبہ، سوچ کر ہنسی آئی
رات کے تعاقب میں اور اک سویرا۔

مشتعل مزاجوں میں "انتشار" کیا معنی
بارہا یہ شیرازہ، آپ نے بکھیرا۔

دوستو! ہنسو بولو، ہم، سفر پسندوں سے
اس دیار میں اپنا چار دن کا ڈیرا۔

اک سکون ملتا ہے، دھوپ کی تمازت میں
گیسوؤں کا سایہ تو آج بھی گھنیرا۔

آپ اور نعروں میں یہ "بلند آہنگی"!
یوں دماغ اونچے ہیں ہاتھ میں بھریرا

میرے مسکرانے پر، منہ بنا رہا ہے تو
وہ سوال میرا تھا، یہ جواب تیرا۔

طنز ہے کہ نشتر ہے، حضرتِ مظفر کا
سر پہ تنگ دستی نے جب سے ہاتھ پھیرا

اختر حمیدی

کرتے ہیں جو کرنے دو انھیں یورشِ غم بھی
تنقید کے پہلو پہ نظر رکھتے ہیں ہم بھی

ہم کو تو یہاں جشن منانا ہے بہرحال
کیا ڈر ہے اگر دیکھ لیں اربابِ ستم بھی

یہ دیکھنا ہے کس کے مقدر میں ہے منزل
گردش میں ستارے بھی ہیں اور ساغرِ جم بھی

اس بات کے شاہد ہیں بہاروں کے فسانے
ہم چومتے آئے ہیں صلیبوں کے قدم بھی

ہیروں کی چمک ہو کہ ہو زنجیر کی جھنکار
اختر کبھی جھکتا نہیں شاعر کا قلم بھی

نصیر پرواز

جمال صبح کی صورت رُخِ حسیں کی طرح
مری وفا ہے منوّر تری جبیں کی طرح

وہ آرزو کہ جسے کہئے دل کی انگڑائی
رچی ہے آنکھوں میں اک خوابِ دلنشیں کی طرح

تصورات کی باہوں میں تیری یاد کا جسم
سُلگتا رہتا ہے شب بھر دلِ حزیں کی طرح

خیالِ دوست ہے رقصاں کہ یادِ یار کی موج
ٹھہر گئی ہے نظر لمحۂ یقیں کی طرح

کہاں کہاں نہ گئی دیدۂ طلب کی نمی
کہیں سکوں نہ ملا دامنِ یقیں کی طرح

وہ پیرہن کہ جسے ہم حیات کہتے ہیں
اسے بھی چاک کرو جیب و آستیں کی طرح

کوئی کٹھن تو نہیں آسماں پہ چھا جانا
زمیں ملے تو ترے غم کی سرزمیں کی طرح

ترا خلوص بھی ہمراہ لے گئے شاید
وہ چند لمحے جو آئے تھے اک امیں کی طرح

جھلس رہا ہے وجودِ خیال اے پرواز
رواں ہے باد کوئی موجِ آتشیں کی طرح

فضیل جعفری

...ہو گا نہ ارمانوں کا خوں شہر سے باہر
بہتر ہے رہیں اہلِ جنوں شہر سے باہر

...شخص نے یہ کہہ کے مجھے روک لیا تھا
جاؤ نہ ہمیں چھوڑ کے یوں شہر سے باہر

...چھ اور بھی سُلگیں شجرِ درد کی شاخیں
کچھ اور بڑھا سوزِ دروں شہر سے باہر

...دالوں میں سجتے ہیں نہ زلفوں میں مہکتے
حالت ہے گُلابوں کی زبوں شہر سے باہر

...وارہ ہوا، اُڑتی ہوئی ریت، دِوانے
آباد ہے اک شہرِ جنوں شہر سے باہر

یا اُس سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہے تم نے
رہتے ہو سدا جعفری کیوں شہر سے باہر

روشن نگینوی

انساں جب ٹھوکر کھاتا ہے، ہوش ٹھکانے لگتے ہیں
ہم جن کو اپنا سمجھتے تھے وہ بیگانے لگتے ہیں

ذہن میں جن کو رہنا تھا، وہ یادیں بھی اب محو ہوئیں -
غور کیا تو کل کے حقائق، آج افسانے لگتے ہیں

غنچے چٹکے، آنسو ڈھلکے، پھول کھِلے، دل مُرجھائے
فرزانوں کی سی باتیں ہیں اور دیوانے سے لگتے ہیں!

آنکھیں پُرنم، بال پریشاں، آخر کوئی بات تو ہے
اُن کو کچھ نہیں کہتے مجھ کو سب سمجھانے لگتے ہیں

کون ہمارا درد بٹائے، کس سے طالبِ درماں ہوں
مرہم مانگو تو چارہ گر زخم دکھانے لگتے ہیں

عشق کہیں بن جائے نہ خود ہی ہر سو ہے تصویرِ جنوں
گھر کے بام و در بھی مجھ کو آئینہ خانے لگتے ہیں

کوئی اگر مائل بہ ستم ہے اپنی خطا ہے یہ روشن
ہم بھی تو بے سوچے سمجھے ناز اٹھانے لگتے ہیں

واحد پریمی

ردو غم، سوز و خلش، افتادگی
اللہ اللہ یہ متاعِ دوستی

ج ان کو بھی سکوں کی ہے تلاش
روشنی کو ڈھونڈھتی ہے روشنی

س کو دنیا کا نظارا ہوگیا
اپنی صورت آپ جس نے دیکھ لی

ے خرد مندو تمہیں معلوم کیا
ہے جنوں کا نام ہی تو آگہی

سن بھی خود آج محوِ دید ہے
اُف یہ دیوانے کی آشفتہ سری

ب میں چاہوں دیکھ سکتا ہوں جمال
اُن کے پردے میں بھی ہے بے پردگی

ن کا غم پاکر ہے نازاں اس طرح
جیسے دل کو مل گئی ہے ہر خوشی

س لبِ نازک پہ میرا تذکرہ
آخرش کام آگئی دیوانگی

رے دیوانے ابھی موجود ہیں
مضمحل کیوں ہے نگارِ زندگی

س میں واحد حسنِ فکر و فن نہ ہو
شاعری وہ بھی ہے کوئی شاعری

سید غوث یقین حیدرآبادی

امنگوں سے بھرپور کا فر جوانی
چلو آگئی آفتِ ناگہانی

کروں وصف کیا اپنے مرحوم دل کا
یقیناً بڑے نیک تھے آنجہانی

کہیں بکھرے بکھرے ہوئے حادثے ہیں
کہیں سہمی سہمی ہوئی زندگانی

سناتا ہوں رودادِ حسن و محبت
نہ قصہ تمہارا نہ میری کہانی

محبت میں رنگت بدلتے ہیں آنسو
لہو کا لہو اور پانی کا پانی

محبت میں ایسا بھی اک وقت آیا
نہ دن ہی سہانا نہ راتیں سہانی

یقیں اپنے روٹھے ہوئے کو منالو
محبت کی معراج ہے بدگمانی

دو آتشہ

ذیل میں امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کی نظم کا ایک بند شعرا کے ترجموں کے ساتھ پیش ہے اس بند کو پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی آخری تحریر کے طور پر لازوال بنا دیا ہے۔ (ادارہ)

کرشن موہن

یہ جنگل سہانے ہیں تیرہ ہیں گنجان ہیں
مگر میرے کچھ عہد و پیمان ہیں
کہ سونے سے پہلے کئی میل جانا ہے مجھ کو
کئی میل جانا ہے مجھ کو

ضیاء الدین احمد شکیب

سہانا اندھیرا گھنیرا ہے جنگل
مگر ایک وعدے کا ہے پاس مجھ کو
کئی میل جانا ہے سونے سے پہلے
کئی میل جانا ہے سونے سے پہلے

ڈاکٹر سید اختر احمد

دعوتِ خواب ہے جنگل میں یہ شب کا منظر
پُرسکوں نیند میں مخمور ہیں گنجان شجر
اپنے وعدے مجھے پورے ابھی کرنا ہیں مگر
منزلوں اور بھی رہنا ہے یونہی گرمِ سفر

حکیم یوسف حسین خاں

جنگل گھنا ہے
جنگل حسیں ہے
خوابوں کی جنت اے دل یہیں ہے
سبزہ پہ سایہ پھیلا ہوا ہے
سو جاؤں ایسا جی چاہتا ہے
لیکن یہاں میں منزل نہیں ہے!
کوسوں چلوں گا
تب سو سکوں گا
میں نے کسی سے وعدہ کیا ہے
میں نے کسی سے وعدہ کیا ہے

رابرٹ فراسٹ

The woods are lovely dark and deep,
But I have promised to keep,
And miles to go before I sleep,
And miles to go before I sleep.

میر یٰسین علی خاں

سہانے اور گہرے گھنے جنگل
ذرا سی دیر سستانے کو کہتے ہیں
مگر میں وہ مسافر ہوں کہ جس کو
اپنے وعدے پورے کرنے ہیں
بہت ہی دور ہے منزل
ہزاروں میل جانا ہے
ہزاروں میل جانا ہے
مجھے اس نیند سے پہلے
جسے یاں موت کہتے ہیں

وقار خلیل

یہ منظر، یہ ماحول، یہ تیرگی
یہ جنگل سجل اور سہانے مہیب اور منوّر
وہ اک ساعتِ عہد و پیماں
وہ اک لمحۂ قرب تابندہ روشن
جدائی کی گھڑیاں، وہ فرقت کے لمحے
مسافت طویل اور پُرپیچ لیکن
مجھے اپنے سونے سے پہلے
ضروری ہے اس ہفت خواں سے گزرنا

نقد و نظر

ماہنامہ "افکار" کراچی (افسانہ نمبر)

اُردو میں افسانوی ادب سے زیادہ پسندیدہ غالباً دوسری کوئی صنف نہیں ہے۔ افسانے اگر متنوع ہوں تو روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے بڑے بین الاقوامی سیاسی رجحانات کی نمایندگی کر سکتے ہیں، اور ان کو پڑھ کر ہم نہ صرف ایک دوسرے کے دُکھ درد سے قریب ہو سکتے ہیں، بلکہ اپنے اپنے اذہان کو ہمہ گیری بھی دے سکتے ہیں۔ ہند و پاک کے تقریباً تمام ادبی رسائل، سال نامے یا خاص نمبر شائع کیا کرتے ہیں، "افکار" نے ۱۹۶۴ء کا افسانہ نمبر شائع کیا ہے اور اس میں قریب قریب ہر قسم کے افسانے لکھنے والوں کو یکجا کر دیا ہے، اس میں ہندستانی بھی ہیں اور پاکستانی بھی۔ ادب کی خدمت کرنے اور اس کو فروغ دینے کے علاوہ یہ افسانہ نمبر دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کا خوشگوار فریضہ بھی انجام دے گا۔

جہاں تک افسانوں کا تعلق ہے، وہاں تک اگر سب افسانوں کی تعریف نہیں کی جا سکتی تب بھی اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ سب تازہ ہیں اور پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ اس میں بعض ایسے بھی ہیں جو کئی بار ڈائجسٹ ہوں گے، اور ایسے بھی ہیں جو نقشِ ثبات ہو کر رہ جائیں گے۔ ان کے علاوہ اس میں ایک ناولٹ بھی ہے اور دو مقالوں کے علاوہ اردو افسانے پر ایک قابل لحاظ مذاکرہ بھی شریک ہے جس میں ادیب اور ادیب گر بھی شامل ہیں، اور بعض نامی گرامی نقادانِ فن بھی پورے انہماک کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔ افسانہ نمبر کی افادی حیثیت سے ظاہر ہے کہ انکار نہیں کیا جا سکتا، اور چونکہ اس کی قیمت صرف (۳) روپے رکھی گئی ہے، اس لئے یہ مشورہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ اس کو خرید کر پڑھنے میں کسی نقصان کا اندیشہ نہیں!" (ملنے کا پتہ:- رابسن روڈ۔ کراچی) (ی - ح - خ)۔

نسیمِ مغرب

جناب اے۔ بی۔ بہار نے انگریزی کی تمام معروف اور اچھی اچھی نظموں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ جو لوگ انگریزی سے واقف ہیں اور انھوں نے یہ نظمیں انگریزی ہی میں پڑھی بھی ہیں وہ تو خود اس کا اندازہ کریں گے کہ ترجمہ کہاں تک کامیاب ہے۔ لیکن انگریزی سے ناواقف قارئین بھی اگر ان منترجمہ نظموں کو پڑھیں گے تو بڑی حد تک مستفید ضرور ہوں گے، اور ان میں احساس بڑھ جائے گا اردو نظم کے میدان سے نکل کر اب ہم ایک باغ و بہار مقام پر آ گئے ہیں اور وہاں جو رنگا رنگ اور دلفریب نظارے انھیں مسحور کر رہے ہیں وہ بالکل جداگانہ طرز کے ہیں۔ یہ نئی دنیا انھیں اسی طرح خوش کن معلوم ہوئی جس طرح کولمبس کو امریکہ دریافت کرکے خوشی ہوئی تھی۔ انگریزی ادب نے اردو کو کافی متاثر کیا ہے۔ اردو ادب انگریزی سے [illegible]

بہار صاحب کے ان ترجموں کو پڑھ کر اپنے ادب کے متعلق ہمارا تاثر اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے اور ہم اس ۔
قائل ہو جاتے ہیں کہ ہمارے ادب میں کسی دوسرے ادب کو ترجمہ کے ذریعہ ڈھال لینے کی صلاحیت بھی موج
رہا رعب کا عنصر تو بہار صاحب کے ترجمے پڑھ کر ہم پر وہ عنصر غالب نہیں رہتا ۔ ویسے میرا اپنا خیال
اس سے پہلے بھی انگریزی کی بعض مشہور نظموں کے کامیاب تراجم کئے جا چکے ہیں اور وہ ہمارے
اب تک باقی چلے آرہے ہیں، اگر ان ترجموں کو "نسیم مغرب" ہی میں شامل کر دیا جاتا، یا ان کا ایک علحدہ
ساتھ ہی شائع کر دیا جاتا تو بہار صاحب کے اقدام کی اہمیت اور بڑھ جاتی ۔ پڑھنے والے موا
کر سکتے اور ان کی تنقیدی صلاحیت بھی چمک جاتی، کیوں کہ انھیں کو یہ فیصلہ بھی کرنا پڑتا کہ کس نے
زیادہ کامیاب ترجمانی کی ہے اور نظم کی روح کو اپنی زبان میں کس نے سب سے بڑھ کر صحت کے سا
کیا ہے ۔ ترجمہ میں یہی ایک جزو مشکل ترین ہوا کرتا ہے !

"نسیم مغرب" (۱۴۰) صفحات پر مشتمل ہے اور (۴۶) نظمیں اس کتاب میں شامل ہیں انجمن ترقی اردو ع
اسے چھاپا ہے اور بہ حیثیت مجموعی یہ ایک مفید پیش کش ہے قیمت دو روپے پچاس پیسے زیادہ نہیں ۔ (ی ۔

"زرِ گل" (مجموعہ کلام عظمت عبدالقیوم خاں) ملنے کا پتہ: "خیابان" ایرپیٹھ، حیدرآباد دکن (اے پی)

پھول چاک ہ

گلستاں کو زرِ گل بخش دیتا ہے، تاکہ آیندہ فصل بہار میں اور پھول کھلیں، باغ اور زیادہ لالہ زار ہو ۔ ا
پھول پچھلی بہار کا المیہ ہوتا ہے اور اگلی بہار کا نقیب ۔ اگر وہ صرف ٹریجڈی ہوتا تو ہمیں اس کی شگفتہ
یاس ہی یاس نظر آتی، مگر وہ تو بے ثبات ہوتے ہوئے بھی تو حسن اور زندگی کا ایک ایسا تسلسل ہو
کہیں بھی ختم نہیں ہوتا ۔ شائد اسی لئے غم کو بھی حیات انسانی کا زرِ گل ہی سمجھنا چاہئے ۔ ہم زخم کھا
زندہ رہتے ہیں ۔ یہ زخم اگر کرب اور کسک پر ختم ہو جائیں تو انسان جو اشرف المخلوقات ہے بجو
بدتر مخلوق بن جائے لیکن انسان کے وجود کے زخم درد و اذیت کے علاوہ اس کو ایک کسوٹی ایا
بخش دیتے ہیں جس سے زندگی کے اقدار سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور ایک بہتر زندگی بسر کرنے میں مد
عظمت عبدالقیوم کے ساتھ بھی اغلباً یہی ہوا ہے ۔ انھیں زندگی نے جراحت کے لئے چنا، اور انھ
اس جراحت سے چیخنا چلانا نہیں سیکھا، نہ دوسروں کی زندگی اجیرن کی ۔ انھوں نے اپنے زخموں کو خو
ان کا تجزیہ کیا، اور بڑے سلیقے سے ایک گلدستہ کی مانند اسے ترتیب دے کر پیش کیا تاکہ پچھ پچھ، بونے
کوئی ایسا نتیجہ اخذ کریں جو زندگی کو بہتر طور پر بنانے میں کام آئے ۔ ان کا درد حد سے بھی گذر
العا کے حق میں (اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ان کا کلام پڑھنے والوں کے حق میں بھی) دو

واردات قلب اور اس کی ٹیس کو عظمت نے اشعار کی شکل دے دی ہے اور شعوری طور پر کہئے یا لاشعوری طور پر عظمت کو یہ بھی اصرار ہے کہ ان اشعار کے مجموعہ کو "زرگل" کہہ کر پکارا جائے ۔ اس مجموعہ میں غم ہی غم ہے اور احساس کی شدت، اور اذیت اتنی ہے کہ ہر صفحہ خونچکاں ہونا چاہئے تھا لیکن جو باغبانیٔ صحرا کے فن پر حاوی ہوتا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کچے خون سے انسان کو کراہت ہوتی ہے ۔ عظمت نے خون جگر کے ایسے لیپنے پوتنے سے احتراز کیا ہے اور اس کی بجائے اس سے نہایت خوش نما، خوش رنگ اور ایسے ایسے جاذب نظر بیل بوٹے بنادئیے ہیں کہ مجھ جیسے لوگ جنھیں قنوطیت پسندی ایک آنکھ نہیں بھاتی وہ بھی قائل ہو کر رہ گئے ہیں ۔ ویسے یہ واقعہ بھی ہے کہ آرائش و زیبائش خواتین ہی کا حصہ ہوتے ہیں اور عظمت پہلے خاتون ہیں، پھر غم نصیب، شاعرہ وہ اس کے بھی بعد میں ہیں ۔

"زرگل" میں پچاس غزلیں، سترہ نظمیں اور ایک قطعہ ہے ۔ ان میں غم کا عنصر غالب ہے، لیکن غم کو صرف غم کہہ دینے سے وہ غم نہیں ہو جاتا ۔ عظمت نے زبان کی شیرینی اور بیان کی حلاوت کا اتنا خیال رکھا ہے کہ فانی مرحوم کی پیروی کا ان پر الزام آ ہی نہیں سکتا، بلکہ "زرگل" کو پڑھتے پڑھتے اپنے غم کی شدت میں بھی پڑھنے والا کمی محسوس کرنے لگتا ہے ۔ پھول کا سینہ چاک ہو کر زرگل نکلتا ہے، مگر غور سے دیکھئے تو اس میں بھی آمد بہار کا مژدہ کانوں میں گونجتا ہے ۔ اس مجموعہ کو انھوں نے خود چھپوایا ہے ۔ کتابت اور طباعت بھی حسین ہے اور گرد پوش بھی ذوق سلیم کی غمازی کرتا ہے ۔ یہ گرد پوش حسینی کا بنایا ہوا ہے ۔

اس کتاب کی قیمت چار روپے مقرر کی گئی ہے جس کو ممکن ہے کہ زیادہ سمجھا جائے، لیکن یہ خیال رہے کہ "زرگل" ایک خاتون کا کلام ہے اور خاتون کی حرمت ہمیشہ زیادہ ہی ہوا کرتی ہے ۔

(حکیم یوسف حسین خاں)

خلش | سیفی پریمی صاحب کی غزلوں کے اس مجموعے کے لئے کلام اور نام کے انتخاب کی مہم میں ان کے نصف درجن سے زیادہ احباب نے حصہ لیا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ نام بہت ہی اچھا منتخب ہوا ہے ۔ ایک سو چار صفحوں کی یہ کتاب کوئی پچاس غزلوں، دو نظموں اور چند مفردات پر مشتمل ہے ۔ پریم نے مارگ پر پریمی کے اس پہلے قدم کو کامیاب ہی سمجھنا چاہئے، گو اس مجموعہ میں حسب ذیل قسم کے اشعار بھی نظر آتے ہیں ۔

رنگین شوخیوں سے اور پریم رس میں ڈوبی — روئے حسیں سے نظریں ابھریں نکھر نکھر کر
پہلے بھی حشر زا تھا ان انکھڑیوں کا عالم — کچھ اور ہو گئی ہیں اب نیند میں وہ بھر کر

ان اشعار کا جو تغزل کے خام مواد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اردو غزل میں کوئی مقام نہیں ہے لیکن مقام مسرت ہے کہ اس قسم کے نقوش مجموعہ کے نصف اول ہی میں نظر آتے ہیں ۔ بعد کی چند غزلوں کے

حسب ذیل اشعار بہت ہی خوب ہیں، جن کے مطالعہ سے شاعر کے فن کا مستقبل خاصا روشن نظر آتا ہے:-

جبین و کاکلِ برہم کی ہر شکن میں رہے ‏ ‏ نظر وہی ہے جو رخسار کے چمن میں رہے

آج مہماں ہے ایک شب افروز ‏ ‏ آرزوؤں کا ہر چراغ جلے

وسعتِ زندگی میں غموں کے سوا ‏ ‏ در دمندی بھی ہے، کچھ تقاضے بھی ہیں
دل فگاروں میں خوش بوئے زلف آگئی ‏ ‏ نامرادوں میں ابرِ بہار آگیا

کتنی بدلی ہے شبِ ماہ، شبستانوں میں ‏ ‏ آج وہ قدرِ جنوں ہے نہ تقاضائے جمال

یہ حرفِ تلخ سہی حلقۂ احباب تک پہونچے ‏ ‏ بہ قیدِ مصلحت ہرگز طاقانیں نہیں اچھی

اس ابنِ خاک کو پھر ایک سجدۂ تعظیم ‏ ‏ کہ ماہ و مہر ہیں فکرِ رسا کے رستے میں

گمانِ شب سے کہو راستے سے ہٹ جائے ‏ ‏ پہونچ رہا ہے دلوں تک یقینِ نورِ سحر

پریمی اپنے ماحول اور حالات کے تقاضوں سے باخبر معلوم ہوتے ہیں اور زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر رجائی ہے۔

"خلش" کی قیمت دو روپے ہے اور ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی (۲۵)۔

(میر حسن ایم۔اے (عثمانیہ)

ماہنامہ "تلاش" خاص نمبر۔ پتہ :- پوسٹ بکس ۲۵۶۸۔ نئی دہلی (۵) "تلاش" کا خاص نمبر جنوری تا اپریل ۱۹۶۳ء کے شماروں پر مشتمل ہے۔ یہ شمارہ مدیر نے اس ادعا کے ساتھ پیش کیا ہے کہ مشہور و معروف ناموں کا انھوں نے سہارا نہیں لیا ہے، اور یہ سچ بھی ہے۔ تاہم اس میں ہمیں علی عباس حسینی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، دیویندر ستیارتھی، وزیر آغا، عادل رشید وغیرہ کے نام بھی ملتے ہیں۔

اس نمبر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے حقیقی معنی میں نئی نسلوں کی آواز کی اشاعت کی کوشش کی ہے۔
س محفل میں راہی معصوم رضا۔ وحید اختر۔ عزیز تمنائی۔ شفیق فاطمہ شعریٰ اور احمد جلال پاشا کے علاوہ بہت سے معروف و غیر معروف اصحاب ملتے ہیں۔

یہ نمبر مضامین، افسانوں، منظومات، غزلیات اور طنز و انشاء کے جدا جدا شعبوں پر مشتمل ہے اور ہر شعبہ پنے وزن و وقار اور تنوع و معیار کے اعتبار سے قابل قدر ہے لیکن اس میں مضامین کا حصہ سب سے زیادہ قابل توجہ ہے۔ ہر مضمون بحث و نظر کے کئی کئی ابواب کھول رہا ہے۔ ان میں افتخار جالب کا مضمون "لسانی تشکیلات" ور راہی معصوم رضا کا مضمون "پرانی کسوٹی" بے باک سچائیوں کے حامل ہیں۔ راہی معصوم رضا کے نقاط نظر پر اب بھی توجہ نہ دی جائے تو یقین ہے کہ نئی نسلیں کبھی جواں نہ ہو سکیں گی اور انھیں شباب سے پہلے ہی موت آجائے گی۔ بحیثیت ادبی نقطۂ نظر سے شمارہ خاصہ کی چیز ہے۔

(ضیاء الدین احمد شکیب (ملیگ))

ہندوستان کا معلوماتی جائزہ | پبلیکیشنز ڈیویژن دہلی۔ ڈیمی سائز۔ صفحات (۲۷۶) قیمت تین روپے۔

حکومت ہند نے ہندوستان کے بارے میں مختلف قسم کی معلومات بہم پہنچانے کے لئے یہ کتاب تیار کی ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ عام باتوں یعنی ملک اور قوم۔ تاریخ۔ دستور ہند۔ عدلیہ۔ ریاستوں کی از سر نو تنظیم۔ عام انتخابات اور دفاع پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں اقتصادیات کے عنوان کے تحت (۱۸) ذیلی عنوانات ہیں، جس میں منصوبہ بندی۔ صنعت۔ تجارت۔ مالیات۔ سائنسی تحقیقات۔ تعلیم۔ صحت۔ مزدور۔ رسل و رسائل اہم ہیں اور ان کے تحت گراں قدر معلومات دی گئی ہیں تعلیم کے عنوان کے تحت ہندی کی ترقی کے تعلق سے کہا گیا ہے کہ:۔

"پندرہ سالہ پروگرام کے تحت سائنسی اور مختلف اصطلاحوں کا ترجمہ کرنے کے لئے (۲۳) سب کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ ہندی ٹائپ رائٹر اور ٹیلی پرنٹر کے لئے معیاری کلیدی بورڈ بھی مرتب کرلئے گئے ہیں۔"

تیسرا حصہ تہذیب و تمدن پر ہے، جس میں چودہ عنوانات ہیں۔ اس میں فن تعمیر، زبان و ادب، براڈ کاسٹنگ اخبار اور رسالے، کھیل کود، تہوار وغیرہ ہیں، اور آخری عنوان مرکزی حکومت کے ارکان ہے۔ فن تعمیر کے ذیل میں حیدرآباد کی کسی عمارت کا ذکر نہیں، نہ چارمینار ہے نہ قطب شاہی مقابر۔ زبان اور ادب کے تحت اردو کے تعلق سے لکھا ہے کہ:۔

"دہلی اردو کا مرکز رہا ہے، محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کے وقت یہ وجود میں آئی اور سلاطین دہلی کے زمانہ میں پروان چڑھی۔ فارسی اور مقامی زبانوں کے اتصال نے اردو کو جنم دیا۔"

اس کا رسم الخط فارسی ہے۔ یہ زبان شمال مغربی ہندوستان گنگا کے اوپری میدانی علاقے اور بعد میں
دکن میں پھلی پھولی۔"

لیکن یہ تو ماضی تھا، حال کے بارے میں کتاب ساکت ہے۔ صفحہ (۲۱۸) پر بھی اردو کے گذشتہ دور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسی طرح اخبارات کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۶۰ء کی رپورٹ کے مطابق ہندی کے اخبارات سب سے زیادہ چھپتے (۱۱۶) اور اردو کے (۳۷) شائع ہوتے ہیں اور بہ لحاظ تعداد انگریزی میں تقریباً (۳۱٫۵) لاکھ، ہندی ۶ ملین) لاکھ اور اردو میں (۵٫۱۰) لاکھ۔ حیدرآباد سے چھپنے والے اخبارات میں ملاپ اور سیاست کے ساتھ نام کا بھی ذکر ہے۔ یہ ہماری معلومات میں اضافہ ہے اور رہنمائے دکن فہرست میں شامل نہیں ہے۔ معلوم نہیں اور کتنے ایسے مرحوم اخبار اس فہرست میں شامل ہیں جو ملک کے مختلف حصوں اور زبانوں میں نکلتے ہیں، اور کتنے اخبارات اپنی اشاعت رکھنے کے باوجود چھوٹ گئے۔

اس کے باوجود ہندوستان کے اس معلوماتی جائزہ کا ہر ہندوستانی کو مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنے ملک کی نمایاں ترقیوں سے واقف ہو۔ ان طلبا کے لئے یہ کتاب تو انسائیکلوپیڈیا کا کام دے گی جو مقابلوں کے امتحانات میں شرکت کرتے ہیں، اور ان لوگوں کو تو اس کا ایک نسخہ ضرور ہی ساتھ رکھنا چاہئے جو غیر ممالک میں تعلیم کے لئے جاتے ہیں تاکہ جب کوئی اجنبی ان سے ان کے ملک کے بارے میں سوال کرے تو بغلیں جھانکنے کی نوبت نہ آئے۔

(ا۔ص)

سہ ماہی "نخلستان" اودے پور | ساہتیہ اکاڈمی راجستھان نے [illegible] میں ایک مجلہ "نخلستان" جاری کیا ہے، جس کا پہلا شمارہ اپنے دامنِ صد رنگ میں معیاری تحریریں رکھتا ہے۔ سمت پرکاش شوق، فراق والے انٹرویو کے علاوہ دیگر تمام چیزیں غیر مطبوعہ ہیں۔ اختر شیرانی کی نثر نگاری، راجستھان کے قدیم اخبارات دو بیحد معیاری اور معلوماتی مضامین اس رسالے کی زینت ہیں۔ راجستھانی فن کاروں کی اکثر تحریریں اس رسالے میں ہیں جس کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ادب کا مستقبل اس خطۂ بے برگ و بار میں تاریک نہیں۔ یہ رسالہ جس نیک مقصد کے تحت شائع کیا جا رہا ہے اُس کے پیش نظر ضروری ہے کہ اسے جاری رکھا جائے اور راجستھانی ادیبوں کی ترجمانی کا صحیح طور پر حق ادا ہو۔ راجستھان جیسی سنگلاخ اور بنجر زمین سے ابھرنے والے فن کار گیسوئے اردو کو سنوار رہیں۔ اکتوبر میں اسی سرزمین پر کل ہند اردو کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی۔ یقین ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس رسالے کے مرتبین نے بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے ربط ضبط پیدا کر لیا ہوگا۔

رسالہ "زفرق تا بہ قدم" خوب صورت، ستھرا اور قابل قدر ہے۔ صفحات (۱۰۸) قیمت دو روپے۔ سالانہ چار روپے۔ دفتر "نخلستان" ساہتیہ اکاڈمی آفس۔ اودے پور (راجستھان)۔ (وقار خلیل)

Reg. No. A. 43.

ادارہ کی اہم مطبوعات

تذکرہ اردو مخطوطات

کتب خانہ کے مخزونہ مخطوطات
کا تفصیلی تذکرہ پانچ جلدوں میں
مرتبہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم
فی جلد ۶=۰۰

ادبی تحریریں

ڈاکٹر زور مرحوم کے
مضامین کا مجموعہ
مرتبہ
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
قیمت ۲=۰۰

کیف و کم

یوسف ناظم کے مزاحیہ
مضامین کا مجموعہ
قیمت
۲=۰۰

میر محمد مومن

سلطنت قطب شاہیہ
کے عظیم المرتبت وزیر کے
مکمل حالات
مرتبہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم
قیمت ۳=۰۰

تاریخ گولکنڈہ

سلطنت قطب شاہیہ کی
مکمل اور مستند تاریخ
مرتبہ
پروفیسر عبدالمجید صدیقی
قیمت ۶=۰۰

فہرست مطبوعات

کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو
اجمالی فہرست تین جلدوں میں
مرتبہ - محمد اکبرالدین صدیقی
اوّل - دوم - سوم
۳=۰۰ ۲=۵۰ ۳=۵۰